مرحوم جناب خضر بہری

دُعاء

سُن لے دُعا خدایا اک روشنی دکھا دے   حُسنِ کرم سے اپنے تقدیر جگمگا دے

ننھّے سے دل میں اپنے ہم حسرتوں کو لائے   کلیوں کا رُوپ پا کر اِس گلستاں میں آئے

ہم سب کے کام آئیں ایسا ہمیں بنا دے   توفیق کر عطا کچھ، علم و ہُنر سکھا دے

خوشیاں ہزار ہم بھی لیل و نہار دیکھیں   پھولیں پھلیں جہاں میں رنگیں بہار دیکھیں

گلشن میں آشیانے اپنے نئے بنائیں   کلیوں کی مثل مہکیں پھولوں کا رنگ پائیں

ہر ہر قدم پہ کر دے تو مشکلوں کو آساں   ہم کو نہ کر سکیں پھر حالات کچھ ہراساں

کر حوصلوں کو زندہ، منزل نئی بنائیں   نیکوں کی راہ چل کر آگے قدم بڑھائیں

تیرے کرم سے گرچہ مل جائے راہداری   روکیں نہ راستے کو دشواریاں ہماری

مل جائے ایسی دولت علم و ہنر ہوں زیور

انسانیت کے جوہر مالک ہمیں عطا کر

سید خواجہ معین الدین ایم اے، بی ایڈ

چارلس ڈکنس

(انگلستان کا ایک مشہور ادیب)

دنیا میں جتنے بڑے اور مشہور لوگ ہوئے ہیں اُن میں سے بہتوں کا بچپن بڑی تنگی ترشی میں گزرا ہے۔ لڑکپن میں بھی انھیں ایک وقت کا کھانا پیٹ بھر کر نہ ملا۔ وہ دن رات محنت کرتے رہے، جی لگا کر پڑھتے رہے، مصیبت پر مصیبت اُٹھا کر کوئی نہ کوئی ہنر سیکھتے رہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ اللہ میاں کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں کرتے۔ محنت کا پھل ضرور دیتے ہیں۔ اس لیے وہ دیکھتے دیکھتے بڑے آدمی بن جاتے ہیں۔ اُن کا نام رہتی دنیا تک زندہ رہتا ہے۔ اور اُن کے مکان جہاں وہ رہتے تھے بعد میں آنے والوں کے لیے مقدس زیارت گاہ بن جاتے ہیں۔ ایسے ہی چند لوگوں میں چارلس ڈکنس کا شمار ہے۔

چارلس ڈکنس کا شمار انگلستان کے بہت بڑے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ اُس نے لکھنے اور [illegible]

کے ساتھ اپنی تحریروں میں نوٹ کیا ہے اس سے بہتر کسی اور انگریز ادیب نے نہیں کیا۔ آج بھی اس کی تحریروں کو پڑھتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم بھی پُرانے لندن کی گلی کوچوں سے گزر رہے ہیں۔ اُس وقت کے لوگوں کی تصویریں ہمارے سامنے سینما کی ریل کی طرح گھوم رہی ہیں۔

اُس نے مختلف حیثیتوں سے لندن کے رہنے والوں کو دیکھا ہے اور اُن کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ پہلے تو اس نے ایک آوارہ لڑکے کی طرح لندن کی ہر گلی اور کوچے کی خاک چھانی، پھر اخبار کے رپورٹر کی حیثیت سے لندن کی کوئی سڑک دیکھی

بعد میں وہ بڑا لکھنے والا اور واقعہ نگار بن گیا وہ اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھتا تھا اُسے ہو بہو [illegible]

[illegible] تھا۔ یہ [illegible] والے کا کمال اور اس کی خوبی ہے سب کو نصیب نہیں ہوتی۔

ڈکنس ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے غریب ماں باپ کے ساتھ "کیام ڈن ٹاؤن" کی "بے ہیام سٹریٹ" میں رہتا تھا۔ وہ اپنے گھر میں سب سے چھوٹی اولاد تھا۔ باپ غریب تھا۔ بلا کا مصروف اور اُبالی ڈکنس کو لڑکپن ہی میں اچھی طرح محسوس ہو گیا تھا کہ غریبی کیا بلا ہوتی ہے۔ اُس کا زیادہ وقت تو گھر کے کام کاج میں گزر جاتا تھا لیکن وہ کبھی کبھار یکا و تنہا لندن کی سڑکوں پر ایک آوارہ لڑکے کی طرح گھوما کرتا تھا۔ انہی دنوں میں اُس کے دل میں لندن سے اور لندن والوں سے خاص لگاؤ اور محبت پیدا ہو گئی تھی۔

تنگدستی سے گذر بسر کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ڈکنس خاندان نے اپنا قدیم گھر چھوڑ کر ایک اور محلے میں رہنے کا منصوبہ بنایا۔ وہاں پہنچ کر ڈکنس کی ماں نے ایک مدرسہ چلانے کی اسکیم بنائی۔ باپ اور بیٹے نے اس مدرسہ کی خوب تشہیر کی، گلی کوچوں میں گھوم پھر کر گھر گھر اس کی خبر کر دی اور بازاروں میں اشتہار بھی لگائے مگر وائے قسمت کہ انہیں طالب علم نہ ملنے تھے نہ ملے۔ اِکّا دُکّا بھی آیا چند ہی دنوں میں مدرسہ کو خیرباد کہہ کر چلتا بنا۔

گھر کے حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ قرضے کا بوجھ بڑھتا ہی گیا۔ باپ کو جیل کی صورت بھی دیکھنی پڑی۔ چارلس کو مجبور ہو کر بوٹ پالش کے ایک کارخانے میں [illegible]

پڑی۔ بچپن تو بڑی [illegible] میں گزارا ہی تھا، لڑکپن کے دن بھی بڑی مصیبت میں کٹے لیکن امیری یا غریبی سدا رہنے والی چیز نہیں، یہ تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے کبھی اندھیرا ہے تو کبھی اُجالا، ڈکنس کے دن پلٹے۔ اس کے ماں باپ جیسے تیسے اسے مدرسے بھیجنے کے قابل ہوئے۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ پڑھ لکھ کر اس قابل ہوا کہ ایک وکیل نے اس کو اپنے پاس منشی کی خدمت دی۔ اس دوران میں وہ شارٹ ہینڈ بھی سیکھ چکا تھا۔ اس لیے اس کو دارالعوام میں رپورٹر کی نوکری ملی۔ تھوڑے ہی دنوں میں بہترین رپورٹر کی حیثیت سے اسے سبھی جاننے لگے۔ اب خیر سے وہ بیس برس کا ہو چکا تھا۔

اب اس میں ایک ادیب کی سی صلاحیتیں اُبھرنے لگیں۔ وہ لندن اور لندن والوں کے عمدہ خاکے پیش کرنے لگا۔ ایک دن اُسے بیٹھے بیٹھے یہ سوجھی کہ کیوں نہ ان خاکوں کو پریس کے حوالے کیا جائے۔ چنانچہ وہ ایک اندھیری رات میں اپنا لکھا ہوا خاکہ ہاتھ میں لیے گھر سے نکلا۔ اور ایک تنگ و تاریک گلی میں پہنچ کر لیٹر بکس میں اُسے ڈال دیا۔ پتہ نہیں کہ اُس نے اندھیری رات اور تنگ و تاریک گلی کا انتخاب کیوں کیا مگر دوسرے دن اس کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ اُس کا مضمون مقامی اخباروں میں چھپ چکا ہے۔ اب اس کی ہمت بندھی، وقفے وقفے سے وہ اپنے مضمون اور خاکے اخباروں میں بھیجنے لگا۔ عوام نے [illegible] پسند کیا اور [illegible]

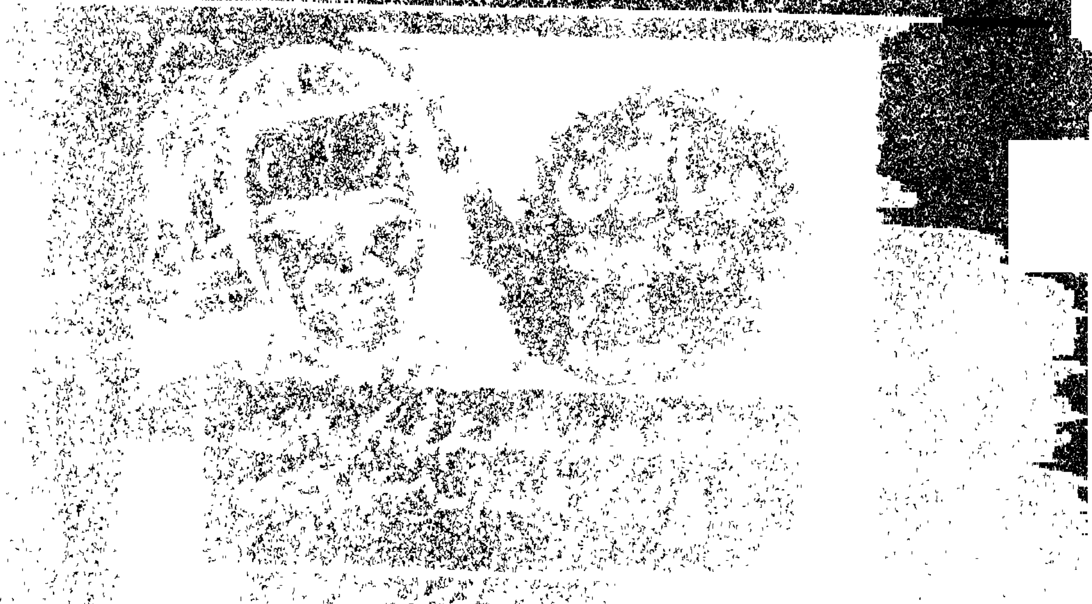
اور زبان پر اس کا نام چڑھ گیا۔

نوبت یہاں تک پہنچی کہ کئی اخبار کے مالک اس کے گھر پر پہنچ کر اُس سے مضمون مانگنے لگے اور پیشگی معاوضہ دینے لگے۔ ایک اخبار والے نے ٹھیکہ ہی لے لیا کہ وہ ڈکنس کے مضمون اور خاکے اپنے اخبار میں مسلسل چھاپتا رہے گا۔ اس طرح اُس کے "پک وک پیپرس" کی ابتدا ہوئی۔ یہ ڈکنس کی سب سے پہلی اور بڑی کامیابی تھی۔ "پک وک پیپرس" "سیمول پک وک" نامی ایک فرضی شخص کے کارناموں کے مزاحیہ خاکے تھے۔ جن میں وہ لندن کے امیروں اور غریبوں کی خامیوں کا مذاق اڑاتا تھا اور خوبیوں کو سراہتا تھا۔ اُن کی مانگ اتنی بڑھی کہ لوگ اسٹالوں اور اخبار گھروں پر انھیں لینے کے لیے آپس میں لڑ پڑتے تھے۔ جگہ جگہ "پک وک کلب" قائم ہوئے، کئی زبانوں میں اُن کے ترجمے ہونے لگے۔ "پک وک پیپرس" ایک مسلسل کہانی تھی، جو ڈکنس کے نام کو لافانی کر گئی۔

وہ اب نئی نئی کہانیوں کی طرف رجوع ہوا۔ راستے سے گزرتے ہوئے جب اُس کی نظر کسی ایک منظر پر پڑتی۔ یا کوئی واقعہ اُس کی آنکھوں کے سامنے ہو جاتا تو وہیں اس کے دماغ میں کہانی جنم لے لیتی، نئے نئے خیالات پیدا ہوتے اور اسی جگہ نئے نئے کردار بھی اُبھر آتے۔ پھر وہ کہیں بیٹھ کر اس کہانی کو پورا کر کے کسی اخبار کے حوالے کر دیتا تھا۔ اگر اسے کہانی کو پورا کرنے میں کوئی رکاوٹ پیش آتی تو راستے سے گزرنے والوں کو ٹھہراتا۔ ان سے کھڑے کھڑے ہی دو چار باتیں کر لیتا، اور آگے بڑھ جاتا۔ اس طرح وہ اپنے مطلب کی بات اُن سے اخذ کر لیتا۔ وہ لندن میں تمام دن گھومتا رہتا تھا۔ کبھی راتوں میں بھی گھر سے نکل جاتا۔ دیکھنے والے اُسے آوارہ سمجھتے لیکن وہ اپنی دُھن کا پکا تھا۔ وہ بے مقصد نہیں گھومتا تھا بلکہ اس کی نظر اور دماغ نئی نئی کہانیوں کے لیے مواد فراہم کرتے تھے۔

۱۸۳۷ء میں جب وہ پچیس برس کا ہوا تو اُس نے اپنا پرانا مکان چھوڑ کر "ڈوٹی اسٹریٹ" میں تین منزلہ مکان کرایہ پر حاصل کیا۔ وہاں اُسے ایک طرح کا سکون نصیب ہوا۔ وہ اپنے وقت کا بڑا حصہ کہانیاں اور کتابیں لکھنے میں صرف کرنے لگا۔ "پک وک پیپرس" دن رات کا مشغلہ بن گیا۔ اُس کے علاوہ اس نے "اَلیور ٹوسٹ" اور "نکولاس نکل بی" جیسے ادبی شہپارے پایۂ تکمیل کر لیے۔

"ڈوٹی اسٹریٹ" کا وہ تین منزلہ مکان جہاں چارلس ڈکنس رہتا تھا آج عالمی شہرت کا مالک ہے۔ اُس کی حیثیت ایک مقدس درگاہ یا مندر کی ہے۔ جہاں ہر سال اس کے چاہنے والے ہزاروں کی تعداد میں زیارت کے لیے آتے ہیں اور اس کے قلمی نسخوں کو دیکھ کر اُسے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اس کا ایک اور مکان تھا جسے وہ سب سے زیادہ چاہتا تھا، اور جہاں اُس نے ۱۸۳۹ء سے ۱۸۵۰ء تک قیام کیا۔ یہاں وہ موسم گرما میں اپنی آنکھوں پر کپڑا ڈال کر



ناوک حمزہ پوری

نیا برس

نیا برس آگیا ہے، یارو! نئی اُمنگیں لئے جلو میں
نیا نکھار آگیا ہے گلشن کے غُنچے غُنچے کے رنگ و بو میں

سحر کی دیوی جبیں[1] پہ بندی لگائے سُورج کی آگئی ہے
جھڑے ہیں زُلفِ سیہ سے موتی نہا کے نکلی ہے آبجو[2] میں

چمن چمن مُسکرا رہا ہے، کلی کلی گیت گا رہی ہے
اُٹھایا ہے کونپلوں نے بھی سر، وہ دیکھئے جوششِ نمو میں

یہ لے کے پیغامِ شاہِ خاور[3] کا آئی ہیں آسماں کی کرنیں
گزارو ہر لمحہ زندگی کا بلند ہونے کی آرزو میں

مسرّتوں کے فسانے چھیڑو، محبّتوں کے ترانے گاؤ
نہ کوئی پہلو نکالنا دُکھ کا درد کا آج گفتگو میں

قسم یہ کھاؤ کہ ایک ہیں ہم بس آج کے دن سے نیک ہیں ہم
کہ حوصلے دشمنوں کے ہوں پست، کھلبلی ہو صفِ عدو میں

یہ آج جی چاہتا ہے گائیں جنابِ ناوک سبھی گنگنائیں
تمام دن اُچھلیں کُودیں ناچیں، تمام دن دوڑیں پُھدکیں گھومیں

---

[1] پیشانی [2] چشمہ [3] سورج

کوثر اعظمی

نہیں اچھا

بچّہ نہیں اچھا وہ سیانا نہیں اچھا
اچھوں کا کہا جس نے نہ مانا نہیں اچھا

سچ یہ ہے کہ خود لوگ ہی اچھے نہیں ورنہ
کہنے کی ہے اک بات، زمانہ نہیں اچھا

بہتر ہے وہ ناداں کہ جو دُکھ دے نہ کسی کو
فتنہ جو بپا کردے وہ دانا، نہیں اچھا

دُکھ سہہ کے ستم جھیل کے مرنا تو بھلا ہے
کم ظرف کا احسان اُٹھانا، نہیں اچھا

ہے وقت اک انمول سی اور مفت کی دولت
ہاں! اس کو مگر مفت گنوانا، نہیں اچھا

اچھا تو یہی ہے کہ ہو اچھا بھی کوئی کام
بیکار محض بات بنانا نہیں اچھا

انساں ہے وہی کام جو انسان کے آئے
کوثر یہ بھلی بات بھلانا نہیں اچھا

محمد شفیع تمنا

مبارک ہو نیا سال

رحمت کی گھٹا چھائے ہر اک فرد ہو خوشحال
اللہ کرے سب کو مبارک ہو نیا سال

دل پیار سے بھر جائیں نہ باقی ہو کوئی بیر
سمجھے نہ زمانے میں کسی کو بھی کوئی غیر

گونج اُٹھے ہر اک دل میں محبت کا ترانہ
اے کاش! اسی روپ میں ڈھل جائے زمانہ

آجائیں سبھی ایک ہی مرکز پہ پلٹ کر
جب ہی تو کوئی کام ترقّی کا ہو بہتر

انساں پہ نہ انسان کی نفرت کا ستم ہو
برباد نہ گاندھی کی "اہنسا" کا بھرم ہو

ذہنوں پہ نہ شیطاں کی بغاوت کے ہوں پھیرے
رہ جائیں نہ سینوں میں عداوت کے اندھیرے

آجاؤ اے بچو کہ یہی عہد کریں آج
اس رام کی دھرتی پہ نہ راون کا رہے راج

غالب کا ایک شعر

(روحِ غالب سے معذرت کے ساتھ)

مقام :- کلاس روم   استاد :- کلاس ٹیچر

طلبائے جماعت:
فرید اظہر۔ انور اسعد۔ اظہر اللہ۔ عنایت الرحمٰن
انور لطیف، خالد عتیق۔ ہما زاہد۔ رضی الرحیم
جاوید اکرم۔ احمد رضی۔ مغیث الحیات۔ سرفراز عالم

[استاد کلاس میں داخل ہوتے ہیں، عینک صاف کرکے اپنی آنکھوں پر لگاتے ہیں۔ اور اگلا سبق پڑھانے کے انداز میں لڑکوں سے مخاطب ہوتے ہیں]

استاد :- بچّو! کل میں تمھیں غالب کے اس مقطع کے معنی مکمل طور پر سمجھا چکا ہوں۔ ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

مجھے لوگ "ماہرِ غالبیات" سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب کو سمجھ لینا بہت بڑی بات ہے۔ غالب کے کلام میں ہر لفظ کی نشست بہت بامعنی اور پُرلطف ہوتی ہے، ایسی کہ اگر اس لفظ کو وہاں سے ہٹاکر کوئی اور مترادف (ہم معنی) لفظ رکھ بھی دیں تو نہ تو وہ بات پیدا ہوگی نہ وہ مفہوم ادا ہوسکے گا۔ اسی لئے غالب کے شعر کو سمجھنے کے لئے ہر ہر لفظ پر غور کرنا چاہئے۔ ہر لفظ ایک گنجینۂ معنی کی حیثیت رکھتا ہے، اے لو۔ آج بھی میں نے تمھیں اوپر کہے ہوئے شعر کا (جو مقطع ہے) مطلب بخوبی سمجھا دیا۔

اچھا، ہم اب تمھارا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ امتحان اِس بات کا کہ تم غالب کو کس حد تک سمجھ پائے ہو۔ ہم ایک شعر بتاتے ہیں۔ تم سب اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اِس کا مطلب اپنی اپنی کاپیوں میں لکھو اور پھر باری باری سے سناؤ۔ جو شعر کا مطلب اچھے انداز میں بیان کرے گا۔ اُسے انعام بھی دیا جائے گا۔

اور ہمیں کوئی شعر بتانے سے پہلے یہ بہتر ہے کہ دیوانِ غالب کو یکایک کھلوا کر دیکھا جائے۔ اپنے درجے کے سب سے چھوٹے طالب علم فرید اظہر کو بلاتا ہوں۔ اور اس سے شعر نکلواتا ہوں۔

[فرید اظہر آکر دیوانِ غالب کو کھولتا ہے اور ایک شعر پر انگلی رکھ دیتا ہے۔ استاد پھر جماعت سے مخاطب ہوتے ہیں]

لو بچّو! اتفاق سے شعر بھی وہ نکلا ہے جس میں مرزا صاحب نے اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ یہ یقیناً تمھاری دلچسپی کا سبب ہوگا۔ اچھا اپنی کاپیوں میں یہ شعر نوٹ کرو۔ آدھے گھنٹے کا وقت دیا جاتا ہے۔ پھر باری باری سے اِس شعر کا مطلب اور مفہوم ہمیں سنانا۔

غالب کا یہ مقطع میاں فرید نے نکالا ہے ؎

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ

سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

[سب بچے یہ شعر اپنی اپنی کاپی میں نوٹ کر لیتے ہیں اور مطلب لکھنے میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ آدھے گھنٹے کے بعد ہر طالب علم اپنے اپنے نمبر پر اس شعر کا مفہوم اپنی کاپی میں سے پڑھ کر سناتا ہے]

انور اسعد :۔ غالب امیرزادے تھے۔ بمبئی میں ایک روز اپنی کار خود ہی چلا رہے تھے کہ مجنوں میاں کار کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ غالب نے اُنھیں پُچکار کر، للکار کر ہر طرح ہٹانا چاہا۔ لیکن مجنوں میاں نے ہٹنے کا نام نہیں لیا۔ آخر غالب نے اُنھیں مارنے کے لیے پتھر اُٹھایا اور مجنوں پر پھینکنا ہی چاہتے تھے کہ انھیں کار کے سر (یعنی چھت) کا خیال آ گیا۔ چھت بھی سر کی طرح گولائی لیے ہوئے ہوتی ہے۔ اسی مناسبت سے غالب نے چھت کو سر سے تشبیہ دے کر بڑی بلاغت سے کام لیا ہے اور اُسے ٹوٹ پھوٹ سے بچایا ہے۔

ظہیر اللہ :۔ غالب کے ایک دوست تھے مرزا اسد اللہ خاں۔ لڑکپن میں دونوں ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ ایک دن کا واقعہ غالب نے اپنے دوست کو آ کر سنایا کہ آج بازار میں سبھی بچے مجنوں پر پتھر پھینک رہے تھے، میں نے بھی پتھر اُٹھایا ہی تھا کہ خیال آ گیا کہ بے چارے کے سر میں لگ جائے گا تو خون کا فوارہ پھوٹ بہے گا۔ اِس لیے ترس کھا کر میں اِس ارادے سے باز رہا۔ میاں اسد اللہ خان نے غالب کی رحم دلی کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ دوست تم شاعر ہو اِس واقعہ کو نظم کر دو۔ لیکن سجھاؤ میں دے رہا ہوں اِس لئے اِس میں میرا نام بھی ہونا ضروری ہے۔ غالب نے یہ شعر کہہ دیا اور اپنے دوست اسد کا نام بھی اس میں شامل کر دیا۔

غیاث الرحمٰن :۔ غالب حقیقت میں اِس شعر کے ذریعے اپنی حساب دانی کا رعب جمانا چاہتے تھے۔ یہ شعر ادبی نہیں، ریاضی کا اُتار چڑھاؤ لئے ہوئے ہے، غالب خود حساب میں اتنے کمزور تھے کہ مادۂ تاریخ نکالنے سے ہمیشہ دامن بچاتے تھے۔ سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا بس پلک جھپکنے میں یہ سب کچھ ہو گیا۔ اِدھر ہاتھ پتھر کی طرف بڑھا اور ہاتھ میں پتھر کا آنا تھا کہ برقی رَو کے ساتھ دماغ میں اپنے سر کا خیال آ گیا۔ یہ وقفہ گھڑی پلک اور لمحہ و ثانیہ کا کتنا کم سے کم جزو ہو سکتا ہے۔ غالب اسی کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

انور لطیف :۔ غالب کے زمانے میں ہندوستان پر خلیفہ ہارون الرشید کی حکومت تھی۔ اُس نے ہر گلی کوچے میں پٹوا رکھا تھا۔ سڑکیں سیمنٹ کی بنی ہوئی تھیں۔ کنکر پتھر نظر ہی نہیں آتے تھے۔ ہوا یہ کہ غالب کے سامنے مجنوں آ گیا تو انھیں اِس پاگل سے اپنے بچاؤ کی فکر ہوئی۔ سامنے سے کُتّے کا پِلّا آ رہا تھا۔ اسی کو پچھلے دونوں پاؤں سے پکڑ کر مجنوں پر وار کرنا چاہتے تھے کہ اس پلّے نے چلّا کر پیچ کر اپنے اگلے دونوں پاؤں غالب کے سر پر جمائے۔ انھیں اپنے سر کی پڑی اور مجنوں میاں یہ دیکھ کر رفو چکّر ہو گئے۔ شعر میں "سنگ" نہیں ہے۔ "سگ" ہے

کاتب کی غلطی نے یہ فتنہ برپا کیا ہے۔ ورنہ غالب نے گملے کا پلا اٹھایا تھا۔ پتھر نہیں اٹھایا تھا۔

خالد عتیق:۔ غالب شاعر ہی نہیں تھے۔ بڑے ماہر نفسیات بھی تھے۔ اِس شعر میں اُنھوں نے اپنی سائیکالوجی کا اظہار کیا ہے۔ کہ مجنوں پہ مارنے کے لئے پتھر ہاتھ میں لیتے ہی ازراہِ ہمدردی اُنھیں سر یاد آ گیا۔ بُرا کرنے والے کے ساتھ بُرا کیا جاتا ہے۔ مارنے والے کو مار ابھی جاتا ہے۔ کہاں تو مجنوں پر وار کرنے والے تھے۔ اور ر احساسات نے یہ کروٹ لی کہ فوراً اُس سے باز آ گئے۔

نیاز احمد:۔ غالب کئی فنون سے واقف تھے۔ وہ فقیری کے بھی دل دادہ تھے۔ وہ شاعری کے ساتھ مصوری بھی کرتے تھے۔ ع

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوری

فن کاشتکاری کے بھی مشتاق تھے۔ ع

ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

سپہ گری تو اُن کا خاص خاندانی پیشہ تھا۔ ع

سَو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

مجنوں کو مارنے کے لئے پتھر اُٹھا کر وار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ سوچ رہے تھے کہ کس جگہ پتھر مارا جائے۔ سینے، بازو، کمر، ران، وغیرہ پر مارنے سے اندیشہ تھا کہ مجنوں پورے طور پر زخمی نہ ہو سکے گا۔ آخر خاندانی سپہ گری نے اُنھیں سمجھایا کہ مجنوں کے سر پر چوٹ کی جائے اور وہ پتھر اُنھوں نے مجنوں کے سر پر مار دیا۔

رضی الرحیم:۔ مجنوں کا اس جگہ لغوی حیثیت سے استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ نہ اس کا استعمال تاریخی حیثیت سے قیس کے متعلق ہے۔ اُنھوں نے لڑکپن میں ایک سرمہ بنایا تھا۔ "سرمۂ مفت نظر" اُس کا نام رکھا تھا۔ ان کے دوست "چشم خریدار" المتخلص بہ مجنوں کو یہ سرمہ اُنھوں نے دیا۔ وہ کھرے انسان تھے۔ انھیں قیمت دینا چاہتے تھے۔ کسی کا احسان اپنے سر لینا نہیں چاہتے تھے۔ غالب وضعدار انسان تھے ان سے قیمت لینا نہیں چاہتے تھے۔ اسی بات پر معاملہ بڑھ گیا۔ قدرے باہم سنگ باری کی نوبت آ گئی۔ اِس شعر میں اسی واقعہ کا اظہار ہے۔ "سرمۂ مفت نظر" اور "چشم خریدار صاحب" کی تائید اِس شعر سے ہوتی ہے ؎

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے

کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

مجنوں جو زیرِ مشق شعر میں ہے وہ انھیں "چشم خریدار" صاحب کا تخلص تھا۔ ہمیں غالب کے اشعار کی تشریح اسی طرح دوسرے اشعار سے ملا کر کرنی چاہیئے۔ ورنہ مطلب خاک سمجھ میں آئے گا۔

جاوید اکرام:۔ غالب اس مقطع کے ذریعے ہمارا تاریخی امتحان لینا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی ہنسوڑ طبیعت نے محض دل لگی کے لئے یہ شعر کہلوایا ہے۔ ع

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ

ورنہ یہ سب جانتے ہیں کہ مجنوں افریقہ کا رہنے والا تھا۔ جبھی تو اُس نے لیلیٰ جیسی کالی کلوٹی

وقت سے پہلے گیا تھا۔ غالب ہندوستان کے
رہنے والے تھے۔ پھر غالب مجنوں سے صدیوں
بعد پیدا ہوئے۔ اُن کی آپس میں ملاقات
کیوں کر ممکن تھی؟ لڑکین غالب کا ہو یا
مجنوں کا۔ اس میں بھی بڑا فرق ہے۔

حمد رضی :۔ غالب کی مجنوں کی ایسی کیا چھڑ گئی تھی کہ
پتھر اُٹھا کر مار کرنے کی نوبت آگئی۔ اس شعر
میں تو وجہ مخاصمت کا پتہ نہیں چلتا۔ دوسرے
اشعار سے کچھ اشارات ملتے ہیں۔ غالب فقیر
بھی تھے۔ وہ خود کہتے ہیں۔ ؎

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

میرا خیال ہے "بنا کر" کی جگہ "بدل کر" ہو گا۔
کیونکہ وہ فقیروں کے مختلف سوانگ بھرنے
میں کامل تھے۔ اسی فقیری روپ میں ایک روز
یہ الا پتے ہوئے جا رہے تھے کہ ؎

تو بھلا کر، ترا بھلا ہو گا
اور درویش کی صدا کیا ہے

کسی شخص نے دس پیسے اُن کی طرف پھینکے۔
غالب نے یہ دس پیسے کا سکّہ غنیمت سمجھا کیونکہ
؎

درم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

مگر وہ دس پیسے والا سکّہ مجنوں کے پاس
جا گرا اور اُس نے اُٹھا لیا۔ یہی واقعہ دونوں
میں پتھر پھینکنے کا سبب تھا۔ مجنوں کے
پاس تلوار کہاں تھی۔ وہ بے چارہ پتھر کا وار
سہہ رہا تھا۔ غالب کا یہ شعر بھی اسی لڑائی
کے وقت کا ہے ؎

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مغیث الحیات :۔ غالب کا ایک شعر ہے۔ غالب کا نہیں
تو اُن کے استاد مرزا دبیر کا ہو گا ؎

حافظا گر وصل خواہی صلح کُن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

وہ صلح و صفائی کے انسان تھے۔ مزاج کے لحاظ سے
کچھ جنون ضرور تھا یا شاید نہ ہو، لیکن وہ خود
کہتے ہیں ع

دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

مجنوں کو مارنے کے لئے پتھر اُٹھا تو لیا لیکن
اُنھیں پھر اپنا شعر یاد آگیا ؎

نہ سُنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

اور پھر ع

بخش دو گر خطا کرے کوئی

کے مطابق مجنوں کو انھوں نے فوراً بخش دیا۔
غالب کے شعر میں کاتب کی غلطی سے "سر"
لکھ دیا گیا ہے۔ ورنہ اس جگہ "شعر" ہے۔
یعنی ع

سنگ اُٹھایا تھا کہ "شعر" یاد آیا

سرفراز عالم :۔ غالب جنگ جو طبیعت کے آدمی تھے۔
کہتے بھی تو ہیں ؎

دھول دھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] تیزی سے منزل کی طرف
قوم کی کشتی چلی طوفان سے ساحل کی طرف

بھائی بھائی سب ہو گئے یکساں بھلا کر ذات پات — جڑ گئے ٹوٹے ہوئے رشتے مٹی سب چھوت چھات
سب پرانی لعنتوں سے مل گئی ہم کو نجات — بھر گئی امید کے پھولوں سے آغوشِ حیات

نعمتیں کھوئی ہوئی پھر ہم کو حاصل ہو گئیں
رحمتیں اللہ کی دوبارہ نازل ہو گئیں

کیجئے دنیا کے سب دھرموں کا یکساں احترام — لیجئے ہر دم اہنسا، امن، سچائی سے کام
زندگی میں سادگی کو دیجئے اونچا مقام — یہ ہے باپو کی تمنا، یہ ہے باپو کا پیام

دیش کو آزاد اس سانچے میں ڈھلنا چاہئے
راستہ بہتر ہے یہ، اس پر ہی چلنا چاہئے

پیام تعلیم - کلینڈر سنہ ۱۹۷۲ء

از: عبدالمجید آئینل ضلع بنگلور					اکتوبر	مئی	فروری اگست	مارچ نومبر	جون	ستمبر دسمبر	جنوری اپریل
۲۹	۲۲	۱۵	۸	۱	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
۳۰	۲۳	۱۶	۹	۲	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار
۳۱	۲۴	۱۷	۱۰	۳	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر
★	۲۵	۱۸	۱۱	۴	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل
★	۲۶	۱۹	۱۲	۵	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ
★	۲۷	۲۰	۱۳	۶	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات
★	۲۸	۲۱	۱۴	۷	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ

[illegible] انصاری بی ایس سی

ذرے سے انسان تک

یہ دنیا دیکھنے میں جو بہت ہی خوب صورت ہے
اسی دنیا کے بننے میں ہزاروں سال گذرے ہیں

ہے کہنا عقل مندوں کا کہ آگ اور کہر سے مل کر
بنی ہے یہ زمیں اپنی بسے ہیں آج ہم جس پر

سطح جب آگ کی ٹھنڈی ہوئی آہستہ آہستہ
ظہور ذرہ و خلیہ ہوا پھر اس بیابان میں

انہیں ذروں سے مل کر جیلی فش نے زندگی پائی
ہزاروں سال تک اس جیلی فش نے روپ جب بدلے

تو ہم نے فش کے بدلے کچھ عیاں تک جانور پائے
بشکل جانور دنیا میں پھر انسان بھی آیا
اور اس کی زندگی میں دور ایک غاروں کا بھی آیا

خدا نے اپنی قدرت سے اسے احساس پھر بخشا
زمانے کے حوادث نے سنوارا عقل کو اس کی

تب اس نے ایک دن قانون فطرت کو بھی پہچانا
ہوا معلوم اس کو حسن بھی اک شے ہے دنیا میں

ہزاروں منزلیں طے کر کے یوں ذرے سے بنے انساں
اس انسانی ترقی کو دیئے کچھ نام لوگوں نے

بہت سے لوگ اس کو ارتقا کا نام دیتے ہیں
مگر کچھ وہ ہیں جو اس کو خدا کا نام دیتے ہیں

ڈاکٹر ہوچی منہ

پیروں میں پرانے ٹائر کے چپل، جسم پر موٹے کپڑے کا کرتا، سفید لمبی داڑھی، پیار سے مسکراتی آنکھیں خلوص، شرافت اور سادگی کا مجسمہ۔ یہ بہتر سالہ ویتنامی جمہوریہ ویت نام کے صدر ہوچی منہ کی شخصیت تھی۔ گاندھی جی کی طرح ہوچی منہ بھی اپنی سادگی اور ہر دل عزیزی میں اپنی مثال آپ تھے۔

انگ این سنہ ۱۸۹۰ء میں ایک انقلابی کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابھی بارہ سال کے تھے کہ فرانسیسی حکومت سے اپنے دیش کو آزاد کرانے کے لئے خفیہ تحریک میں شریک ہو گئے۔

انیس سال کی عمر میں ان کے خاندان کے افراد کو فرانسیسی حاکموں نے قید خانے میں بند کر دیا۔ یہ دیش بھگتی کی سزا تھی۔ ہوچی منہ قید سے نکل بھاگے اور بھیس بدل کر ایک جہاز پر باورچی کی ملازمت اختیار کر لی۔ اپنا نام "با" رکھا۔ اور چھپتا چھپاتے "سمو کنے" لندن پہنچ گئے۔

جہاز سے فرار ہو کر انھوں نے ایک برف کی فیکٹری میں کام کرنا شروع کیا۔ یہ کام چھوٹ گیا تو ہوٹل میں کام کرنے لگے اور اپنا انگریزی تعلیم بھی جاری رکھی۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر پیرس گئے۔ وہاں فوٹو گرافی اور پینٹنگ کا کام شروع کیا۔ پیرس ہی سے سوشلزم سے آپ کا تعلق ہوا۔ اور ایشیا کی جنگ آزادی کے لئے خفیہ انقلابی تحریک شروع ہوئی اور یہ تحریک زور پکڑتی گئی۔ اور "با" کو احساس ہوا کہ انقلاب کے لئے قلم مؤثر ہتھیار ہے۔ رنگ کا برش پھینک کر انھوں نے قلم اٹھا لیا۔ اب وہ صحافی، ایڈیٹر، مضمون نویس، ڈرامہ نگار، شاعر اور ادیب بن گئے۔

پھر وہ پیرس سے غائب ہوئے تو ماسکو میں ظاہر ہوئے۔ ماسکو میں وہ لینن سے ملاقات کی غرض سے گئے تھے۔ لیکن ان کے پہنچنے سے دو روز پہلے لینن کا انتقال ہو چکا تھا۔

اس کے بعد چین میں سگریٹ فروشی کا کاروبار کرتے ہوئے نظر آئے۔ دن بھر سگریٹ بیچتے، رات کو ویت نامی عوام کو متحد کرنے میں لگے رہتے۔

اسی اثنا میں ہانگ کانگ کی پولیس نے انھیں گرفتار کر لیا۔ اور روس کا جاسوس قرار دے کر پھانسی کی سزا کا فیصلہ سنایا ـــــــ خوش قسمتی سے ایک انگریز وکیل نے ان کی جان بچائی۔ اس نے انھیں جیل سے فرار ہونے میں مدد دی۔ اور سفر خرچ بھی دیا۔

دوسری جنگ عظیم میں چیانگ کائی شک کے افسروں نے انھیں گرفتار کر کے دو سال سخت قید

(بقیہ صـــ ۲۳ پر پڑھیئے)

[illegible] راہی

رہبرِ ہندوستان

اک ایسا وقت تھا جب ہم پہ غیروں کی حکومت تھی
مقدر میں ہمارے صرف محکومی کی ذلت تھی
زمانے میں ہماری کوئی عزت تھی نہ وقعت تھی

اٹھا ایک شخص نظمِ گردشِ دوراں بدلنے کو
بڑھا پھر جبر و استبداد کی قوت کچلنے کو

مقابل اس کے خونی بھیڑیوں کا ایک جتھا تھا
مسلح تھے وہ ظالم اور یہ بالکل نہتا تھا
تشدد ان کا شیوہ اس کا ایک مسلک اہنسا تھا

اگر تھا ناز ان کو اپنی شیطانی حکومت پر
بھروسا تھا اسے بھی جذبۂ حق و صداقت پر

جواں ہمت تھا وہ ایک پیکرِ مردانگی تھا وہ
حریفِ تیرگی تھا وہ نقیبِ زندگی تھا۔ وہ
بظاہر ایک لاغر منحنی سا آدمی تھا وہ

مگر اس میں پہاڑوں سے بھی ٹکرانے کی طاقت تھی
بلا کا جوش تھا اس میں غضب کی اس میں جرأت تھی

ہزاروں ظلم اور لاکھوں ستم ڈھائے گئے اس پر
ستم کے جان لیوا تیر برسائے گئے اس پر
بعنوانِ دگر الزام لگوائے گئے اس پر

مگر سچائی کی قوت پہ وہ ایمان رکھتا تھا
مٹا دینے کا خود کو دیس پر ارمان رکھتا تھا

بالآخر رنگ لائیں اس کی وہ قربانیاں ایک دن
ہوا اپنے مقاصد میں وہ راہی کامراں ایک دن
غلامی سے ہوا آزاد پھر ہندوستاں ایک دن

ترانے گونج اٹھے خوشیوں کے بھارت کی فضاؤں میں
سکوں کی سانس لی پھر ہم نے آزادی کی چھاؤں میں

ابھی لیکن ابھی ایک اور گہرا گھاؤ اٹھانا تھا
مقدر میں ہمارے خون کے آنسو بہانا تھا
یہیں ہم میں ایک پاپی تھا جو رسوائے زمانہ تھا
کہ جس نے رہبرِ ہندوستاں کو قتل کر ڈالا
کہ جس نے انسانیت کے مہرباں کو قتل کر ڈالا

[illegible]
[illegible]

ہوبہو نقل

کردار: خان صاحب: فوجی سپاہی
سعید: چنے والا
اور دوسرے

(پردہ اٹھتا ہے)

(آفتاب محلّے میں دائیں طرف خان صاحب کا مکان ہے۔ مکان کے سامنے آم کا درخت ہے۔ بائیں طرف ہوٹل اور دکانیں ہیں۔ لوگ اپنے اپنے کاموں سے اِدھر اُدھر چل پھر رہے ہیں۔ خان صاحب درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھے بندوق کی نالی صاف کر رہے ہیں۔ مکان کے پیچھے سے چنے والا آواز لگاتا ہوا آتا ہے)

چنے والا: ۔ چنا کھا جا نہ ہوگا گھاٹا
جو کھائے گا، ہوگا پاٹھا
میرے چنے کی ہے یہ حکمت
کھانے سے آتی ہے طاقت
چنا زور گرم بالو میں لایا خریدار

صاحب: ۔ ابے او چنے والے
اِدھر آ سُن

والا: ۔ ابھی آیا بابو جی
تا ہے

صاحب: ۔ ابے بابو جی کہتا ہے

فوجی ہوں فوجی، محلّے میں خان صاحب کے نام سے مشہور ہوں۔

چنے والا: ۔ معاف کرنا خان صاحب مجھ سے چوک ہوگئی۔ کہیے کتنے کے چنے دوں؟

خان صاحب: ۔ ایک آنے کے دے دے

چنے والا: ۔ (چنے دیتا ہے) یہ لو خان صاحب اچھا اب جلدی سے پیسے دلواؤ دور تک پھیری لگانا ہے۔

خان صاحب: ۔ (چنے کھاتے ہوئے) میں نے تجھ سے نقد کب لئے تھے۔ اُدھار کی بات کر اُدھار کی۔

چنے والا: ۔ (عاجزی سے) نہیں خان صاحب۔ ان چنوں میں مجھے کچھ بچتا نہیں دن بھر مارا پھرتا ہوں تو روپیہ بارہ آنے ملتے ہیں۔ بشکل گزر ہوتی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ، اس مہنگائی کے زمانے میں اُدھار دے کر میں اپنے گھر کیا لے جاؤں۔ بیوی ہے۔ بوڑھی ماں ہے۔ میں ہوں۔ ان سب کی گزر کیسے ہوگی۔

خان صاحب: ۔ ارے تو پھر تو دوسرا دھندا کیوں نہیں کر لیتا کہیں نوکری ہی کر لی ہوتی۔

چنے والا: ۔ کیا کروں خان صاحب بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ مجھے کوئی پڑھانے والا نہیں تھا۔ ان پڑھ اور گنوار رہ گیا بہت کوشش کرتا ہوں کہ کہیں نوکری مل جائے مگر کھاتے پیتے مال دار لوگ مجھے کتّے کی طرح دھتکار دیتے ہیں۔

خان صاحب: ۔ وہ نالائق ہیں۔ گدھے ہیں جو تجھے اس طرح دھتکار دیتے ہیں۔ اس دنیا میں تیری سننے والا کیوں نہیں۔ دیکھ میں ہوں۔

چنے والا: ۔ (مسکراتے ہوئے) کیا آپ مجھے نوکری پر لگا دیں گے؟

خان صاحب: ۔ (سوچتے ہوئے) نوکری کرے گا؟

چنے والا: ۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ اگر آپ نوکری پر لگا دیں تو میں زندگی بھر احسان نہ بھولوں گا۔

خان صاحب: ۔ مگر تو نوکری نہیں

ہے گا۔

چنے والا:۔ (پریشان ہوکر) کیوں؟

خان صاحب:۔ بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔

چنے والا:۔ بھلا محنت کرنے سے کون جی چراتا ہے۔ خان صاحب، ندی جس طرح بہتی ہے نا اسی طرح پسینہ بہاؤں گا۔

خان صاحب:۔ شاباش! مجھے ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔

چنے والا:۔ مگر کام کیا کرنا ہوگا؟

خان صاحب:۔ ذرا غور سے سن، ہمارے گاؤں میں ملٹری والے آئے ہیں۔ وہ سب کو فوجی بنانا چاہتے ہیں۔ صرف ایک گھنٹے کا کام ہے۔

چنے والا:۔ یہ تو بہت اچھا کام ہے۔

خان صاحب:۔ شاباش

چنے والا:۔ تنخواہ کیا ملے گی؟

خان صاحب:۔ ساٹھ روپیہ۔ صبح سات بجے سے آٹھ بجے تک تیری ڈیوٹی ہوگی۔ اس کے بعد چنے بھی بیچ سکتا ہے۔

چنے والا:۔ مگر مجھے تو کچھ آتا ہی نہیں۔

خان صاحب:۔ تو اس کی فکر نہ کر، کل صبح میرے گھر آجانا پھر سب سکھا دوں گا اور سپاہی بنا دوں گا۔

چنے والا:۔ بہت اچھا کل میں سات بجے سے پہلے ہی آجاؤں گا۔

خان صاحب:۔ دیکھ کل میں گاؤں سے باہر پرانی حویلی کے پاس تیرا انتظار کروں گا۔ اور ہاں تو نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔

چنے والا:۔ میرا نام سعید ہے۔

خان صاحب:۔ اچھا سعید اب تو جا اپنا دھندا کر لے۔

چنے والا:۔ کل ضرور ملوں گا۔ خدا حافظ (جاتا ہے)

وقفہ

(پرانی حویلی سے قریب عام سڑک۔ سڑک کے ادھر ادھر دور دور تک اونچے درخت لگے ہیں۔ سورج کی کرنیں درختوں پر پڑ رہی ہیں اور خان صاحب حویلی کے سامنے بیٹھے چنے والے کا انتظار کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد حویلی کے پیچھے سے سعید نکلتا ہے)

سعید:۔ خان صاحب آپ کہاں ہیں؟

خان صاحب:۔ (چونک کر) میں یہاں ہوں سعید۔

سعید:۔ زیادہ انتظار تو نہیں

خان صاحب:۔ نہیں نہیں میں ابھی آیا ہوں۔

سعید:۔ تو لیجئے، اب مجھے تو سپاہی بنا دیجئے۔

خان صاحب:۔ فوجی تو بناؤں پہلے میری باتیں دماغ میں بٹھا لے، وہ یہ کہ میں کہوں تو بھی ویسا ہی اور میں جیسی حرکت کروں تو بھی ویسی ہی کرنا۔ مطلب کہ تو میری نقل کرنا۔

سعید:۔ (مسکراتے ہوئے) تم کہوگے میں بھی ویسا ہی کہوں اور تم جیسی حرکت کرو میں بھی ہو بہو نقل کروں۔

خان صاحب:۔ شاباش،

سڑک پر

(دونوں سڑک پر چلتے ہیں)

خان صاحب:۔ مجھ سے دس قدم (سعید دس قدم پیچھے ہٹتا ہے)

خان صاحب:۔ (بندوق ہاتھ میں) لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ

سعید:۔ (ڈنڈا ہاتھ میں لئے) رائٹ، لفٹ رائٹ

خان صاحب:۔ [illegible]

سعید:۔ دائیں مڑ
خان صاحب:۔ بائیں مڑ
سعید:۔ بائیں مڑ
خان صاحب:۔ پیچھے مڑ
(دوڑتے ہوئے) دوڑ لگا۔
سعید:۔ (خان صاحب کے پیچھے دوڑتے ہوئے) دوڑ لگا۔
[دونوں دوڑ کے دوڑتے گاؤں سے بہت دور نکل جاتے ہیں اور پسینے سے کپڑے بھیگ جاتے ہیں۔ راستے میں ایک سانپ پڑا ہے۔ بس ایک قدم کے فاصلے پر خان صاحب کی نظر سانپ پر پڑ جاتی ہے۔ خان صاحب فوراً رک جاتے ہیں]
سعید (ہانپتا ہوا رک جاتا ہے)
(خان صاحب کے ہاتھ میں بندوق ہے مگر سانپ کو دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔ ڈرتے اور پیچھے مڑتے تو بھی کاٹنے کا ڈر۔ اتنی ہیبت طاری ہوئی کہ منہ سے سانپ کا نام نہیں نکلا۔ سعید کے پاس ڈنڈا دیکھ لیتے ہیں اور سانپ کی طرف اشارہ کرتے ہیں)
خان صاحب:۔ ابے یہ
(سعید خان صاحب سے دس قدم دور ہے۔ یہی لے سعید کو سانپ نظر نہیں آتا ہے اور سمجھ نہیں پاتا)

نقل کی ہدایت تھی۔ (خان صاحب ہکلاتے وہی کہتا ہے)
سعید:۔ ابے یہ
خان صاحب:۔ (غصے سے) ابے دیکھ
سعید:۔ ابے دیکھ
خان صاحب:۔ (چیختے ہوئے) اسے ادھر دیکھ
سعید:۔ ارے ادھر دیکھ۔
خان صاحب:۔ (چہرہ سرخ ہو جاتا ہے) بے وقوف ادھر دیکھ۔
سعید:۔ بے وقوف ادھر دیکھ۔
خان صاحب:۔ بے وقوف سا...
(آواز حلق میں)
سعید:۔ بے وقوف سا...
خان صاحب:۔ (چلاتے ہوئے) سانپ سامنے۔
سعید:۔ سانپ سامنے

خان صاحب:۔ میرے سامنے
سعید:۔ میرے سامنے
خان صاحب:۔ (غصے سے) میرے سامنے سا...
(آواز حلق میں)
سعید:۔ میرے سامنے سا...
خان صاحب:۔ (بہت غصے سے) میرے سامنے سانپ
سعید:۔ (جلدی سے) میرے سامنے سانپ
[سعید سانپ کا نام سنتے ہی سانپ کو دیکھ لیتا ہے۔ گھبراہٹ میں ڈنڈا زمین پر گر جاتا ہے اور زور زور سے چلاتا ہے]
سعید:۔ بھاگو خان صاحب بھاگو۔
[خان صاحب اور سعید بھاگ پڑتے ہیں۔ جیسے سانپ ان کا پیچھا کر رہا ہو۔ پر وہ تو مرا ہوا سانپ تھا]

(پردہ گرتا ہے)

ڈاکٹر ہوچی منہ بقیہ صفحہ ۱۹ کا

کی سزا دی۔ یہاں ان کے دل میں انقلابی جذبے نے شعلہ کی صورت اختیار کی ——— دوسری بڑی لڑائی کے ختم ہونے سے پہلے شمالی ویتنام کے لوگ ہوچی منہ سے متعارف ہونے لگے۔

ڈاکٹر ہوچی منہ ۱۹۵۴ء میں بڑی جدوجہد کے بعد ملک کی آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن اس جنگ آزادی میں ویتنامیوں کو اپنا خون بہانا پڑا۔

ڈاکٹر ہوچی منہ ویتنام کے گاندھی جی ہیں۔ ان کے مخالفین انہیں ریڈ ڈکٹیٹر کہتے لیکن اتنا سیدھا سادہ اور باوقار شخص ایشیا کی سیاست میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔

(زینت مراکی ڈائجسٹ بابت اکتوبر ۱۹۶۸ء)

ہم بھارتی بچے ہیں

ہم امن کا نغمہ ہیں
ہم پیار کے شیدا ہیں
الفت سے ہمیں الفت
نفرت سے ہمیں نفرت

ہم قول کے سچے ہیں
ہم بھارتی بچے ہیں

اک پھول کی خوشبو ہیں
مسلم ہیں نہ ہندو ہیں
ہم سکھ ہیں نہ عیسائی
انسان ہیں ہم بھائی

ہم قول کے سچے ہیں
ہم بھارتی بچے ہیں

ہم پیار کی دھڑکن ہیں
ہم جنگ کے دشمن ہیں
دنیا کی ہیں رعنائی
کرتے ہیں مسیحائی

ہم قول کے سچے ہیں
ہم بھارتی بچے ہیں

دنیا ہے وطن اپنا
ہے سارا چمن اپنا
سب پھول ہمارے ہیں
ہم کو سبھی پیارے ہیں

ہم قول کے سچے ہیں
ہم بھارتی بچے ہیں

ہم لوگ بڑے ہو کر
ہر شیشۂ دل دھو کر
نفرت کو مٹا دیں گے
انساں کو جگا دیں گے

ہم قول کے سچے ہیں
ہم بھارتی بچے ہیں

سلیم احمد ایم اے

موت کے سائے میں

بوڑھی ماں بسترِ مرگ پر پڑی دَم توڑ رہی تھی۔ اُس کا کسان بیٹا آمر اور ڈاکٹر پلنگ کے قریب کھڑے تھے۔ بوڑھی عورت کی عمر ۹۲ برس کی ہو گی یا شاید اِس سے کچھ زیادہ۔ اب اُس کو زیادہ جینے کی ہوس نہیں رہی تھی۔ اُس کی زندگی چراغِ سحری کی طرح ٹمٹما رہی تھی۔ یہ کڑوی حقیقت اُسے اچھی طرح معلوم ہو چکی تھی۔ کہ اب وہ اس دُنیا میں چند دن کی مہمان ہے۔ اِسی لئے ڈاکٹر اور اپنے بیٹے کی بات چیت سے بے نیاز ہو کر اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں کا انتظار کر رہی تھی۔ ویسے وہ اُن کی باتیں سُن رہی تھی اور ایک ایک لفظ اُس کی سمجھ میں آ بھی رہا تھا۔ مگر اس کے لیئے نہ احتجاج کا وقت تھا۔ نہ غم و غصّے کا۔ اب تو وہ مر ہی رہی تھی۔ ۹۲ برس کی زندگی کے گرم و سرد۔ اور نشیب و فراز نے جیسے اس کے احساس کو ختم کر دیا تھا۔

دوپہر کی گرم دُھوپ کھڑکی سے چھن چھن کر کمرے میں آ رہی تھی۔ پُرانا فرش جگہ جگہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ اور اُس پر ناچتی ہوئی سورج کی کرنیں کمرہ کی ویرانی اور اُداسی کو بڑھا رہی تھیں۔ باہر دُور تک گیہوں کے پکے ہوئے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کے جھونکے کے ساتھ کھیتوں کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی کمرے میں پھیل جاتی۔ گرمیوں کی اس دوپہر میں پُورا گاؤں خاموشی کی چادر اوڑھے تھا۔ صرف ٹڈیوں اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ سُنائی دے رہی تھی۔

ڈاکٹر نے ذرا بلند آواز سے کہا: "دوست! تم اپنی ماں کو اِس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ وہ کسی وقت بھی دم توڑ سکتی ہیں۔"

آمر نے بڑی بے چینی سے جواب دیا:۔ "مگر ڈاکٹر! مجھے اپنے کھیتوں سے گیہوں اُٹھانا ہے۔ بہت دنوں سے وہاں پڑا ہے۔ موسم اچھا ہے۔ نہ جانے پھر کیا ہو۔" پھر اُس نے ماں سے مخاطب ہو کر پوچھا:۔ "ماں! تمہارا کیا خیال ہے؟"

بوڑھی عورت نے مری مری آواز میں "ہاں" کہا۔ اُس کی خواہش تھی کہ اُس کا بیٹا کھیتوں سے گیہوں اُٹھا لائے۔ وہ تو اکیلے بھی مر سکتی تھی۔ مگر اناج کون اُٹھائے گا! اُس نے اپنے بیٹے کو اناج اُٹھانے کی اجازت دے دی۔

ڈاکٹر برہم ہو گیا۔ اُس نے پاؤں زمین پر پٹکتے ہوئے کہا: "تم انسان نہیں، جانور ہو نہیں نہیں، جانور تم سے کہیں بہتر ہیں۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ میں تمہیں اُس وقت تک قدم بھی

آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ تمھیں اپنی ماں کا اتنا بھی خیال نہیں ہے۔ لیکن اگر تمھارا جانا اس قدر ضروری ہے تو گاؤں کی بوڑھی آیا کو بُلا لاؤ۔ تاکہ وہ تمھاری ماں کی دیکھ بھال کر سکے۔ اگر تم نے میرا کہنا نہ مانا تو میں تمھیں کُتّے کی موت مرنے دوں گا۔ جب تمھاری باری آئے گی تو میں تمھارے قریب بھی نہ آؤں گا۔

ڈاکٹر کی یہ تنبیہ سُن کر کسان ڈر گیا۔ مگر وہ جلدی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔ اُس نے دل ہی دل میں حساب لگانا شروع کیا۔ اِس گاؤں میں بوڑھی آیا ہی ایک ایسی عورت تھی جو مرتے ہوئے لوگوں کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اُس کا نام کچھ بھی رہا ہو۔ وہ پورے گاؤں میں آیا کے نام سے مشہور تھی۔ وہ مریضوں کی تیمارداری کرتی۔ مرنے والوں کے سرھانے بیٹھتی۔ اور جب وہ مر جاتے تو اُن کے کفن دفن کی تیاری کرتی۔ اُن کو نہلانے اور کفنانے میں مدد دیتی۔

لیکن اِن کاموں کے لئے اُس کی فیس مقرر تھی۔ کسان سوچ رہا تھا کہ کس طرح اُس کو زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔ اُس نے ڈاکٹر سے پوچھا:

"آیا کتنے پیسے لے گی؟"

ڈاکٹر نے ذرا غصّہ سے جواب دیا:۔ "مجھے کیا معلوم۔ یہ تو تمھاری ماں کی زندگی پر منحصر ہے۔ بہرحال تم خود جا کر اُس سے معاملہ طے کر لو۔ وہ ایک گھنٹے کے اندر یہاں آجانی چاہیئے۔"

ڈاکٹر کسان کو ڈانٹتا، اُس کو پھٹکارتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ کسان نے ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

"ماں! میں ابھی جا کر آیا کو لاتا ہوں۔ تم گھبرانا نہیں۔"

آیا گاؤں کی شاید سب سے زیادہ بوڑھی عورت تھی۔ چہرے پر جُھرّیاں ہی جُھرّیاں۔ موسم کے آخری سیب کی طرح مُرجھائی ہوئی۔ اُس کے پیشے کے تقاضوں نے اُس کی شکل و صورت کو اور بھی بھیانک بنا دیا تھا۔ خود غرضی، نفرت، حسد اور مکّاری نے مِل کر اُس کے چہرے پر بڑے خوفناک اثرات چھوڑے تھے۔ اور وہ انسان سے زیادہ کسی مُردے کی رُوح معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے لئے چُڑیل کا لفظ نہایت موزوں و مناسب تھا۔ مُردوں کو نہلاتے نہلاتے اُس میں ملکُ الموت کی سی بے رحمی پیدا ہو گئی تھی۔ جب وہ کمر کو جھکا کر راستوں سے نکلتی تھی تو بچے اُسے دیکھ کر چیخنے لگتے تھے۔ اُس کو موت کے ساتھوں کے علاوہ کوئی بات یاد نہیں رہ گئی تھی۔ وہ مختلف قسم کی موتوں کی نہ ختم ہونے والی داستانیں سُنایا کرتی۔

نوجوان کسان اُس کی جھونپڑی میں داخل ہوا تو وہ کفن کے دو ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ رہی تھی۔ کسان بڑھیا سے مخاطب ہوا:۔ "ماں! اسلام۔ تم اچھی طرح تو ہو!" بڑھیا نے گردن گھما کر کسان کی طرف دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ جیسے گالوں میں دھنسی یہ بے رونق اور ویران آنکھیں ایک ہی نظر میں سب کچھ جان گئی ہوں۔

"بس، جی رہی ہوں بیٹا! میرا حال ہی کیا! تم کیسے ہو؟"

"ہاں! میں تو ٹھیک ہوں، مگر میری ماں کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیوں اُس کو کیا ہوگیا؟" اُس نے یوں ہی پُوچھا۔ ورنہ وہ سب کچھ جانتی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ لوگ کب اور کیوں اُس کے پاس آتے ہیں۔

"وہ مرنے والی ہے۔" کسان نے جواب دیا۔

آپا نے کفن ایک طرف اُٹھا کر رکھ دیا۔ وہ جانتی تھی۔ ایسے موقعوں پر اُسے کیا کرنا ہے۔ اُس نے ہونے والی اپنی آمدنی کا پیشگی ہی اندازہ لگا لیا تھا۔

کسان بولا: "تمہیں میری ماں کے مرنے تک اُس کے پاس رہنا ہے۔ تم اِس خدمت کے لیئے کیا معاوضہ لوگی؟ یہ تو تمھیں معلوم ہے کہ میں کوئی امیر آدمی نہیں اسی لیئے کوئی ملازم بھی نہیں رکھ سکتا۔ میری ماں کو گھر کا تمام کام خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ غم والم اور پریشانیوں نے اُسے اِس حالت میں پہنچا دیا ہے۔ وہ اکیلی چار آدمیوں کے برابر کام کرتی۔ اب ایسے انسان اس دُنیا میں کہاں؟"

آپا نے ایک ماہر تاجر کی طرح جواب دیا۔

"میری دو فیسیں ہیں۔ دن کی فیس دو رُوپیہ ہے۔ اور رات کے چار روپیئے۔ یہ فیس امیروں کے لیئے ہے۔ غریبوں سے میں ایک رُوپیہ دن کا رات کے دو رُوپے۔ تم مجھے غریبوں والی فیس دے دینا۔"

کسان ایک لمحہ کے لیئے سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اپنی ماں کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ وہ کتنی سخت جان ہے۔ کتنی بے پناہ قوّتِ ارادی کی مالک ہے۔ آسانی سے مَوت کے آگے ہتھیار ڈالنے والی نہیں ہو سکتا ہے وہ ایک مہینہ سے بھی زیادہ اسی طرح موت کے ساتھ زور آزمائی کرتی رہے۔ اتنی مُدّت کے لیئے آپا کو کتنی بڑی رقم ادا کرنی پڑے گی۔ اِس سے بہتر ہے کہ وہ خود ہی اُس کے سِرہانے بیٹھا رہے۔

"نہیں، مجھے یہ فیس منظور نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اُس کی موت تک سودا کر لو۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ صبح تک مر جائے گی۔ اگر ایسا ہوا تو تمھارے لیئے فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اگر وہ کل تک زندہ رہے تو بھی تمھیں گھاٹا نہیں رہے گا۔"

بُڑھیا نے حیرت سے نوجوان کی طرف دیکھا۔ اُس نے کبھی اِس طرح موت کا سودا نہیں کیا تھا۔ اگرچہ اُس کو اِس میں کوئی بُرائی بھی نظر نہیں آئی۔ ایک لمحہ کے لیئے لالچ نے اُس کے دل کو گدگُدایا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اُس کو خیال آیا۔ کہیں یہ نوجوان اُس کو دھوکا تو نہیں دے رہا ہے۔ اِس لیئے وہ بولی:۔

"جب تک میں تمھاری ماں کو دیکھ نہ لوں اُس وقت تک یہ سَودا نہیں کر سکتی۔"

"ٹھیک ہے، تم میرے ساتھ چلو!" کسان نے جواب دیا۔

دونوں سوکھے کھیتوں کو پار کرتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ جوں ہی انھوں نے گھر کے اندر قدم رکھا۔ کسان بول اُٹھا: "ممکن ہے وہ مر بھی گئی ہو۔" اُس کے تحت الشعور سے یہ آواز نکلی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اگر وہ مر گئی ہے تو اس خرچ سے بچ جائے گا۔

مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے گندے بستر پر زندہ لیٹی تھی۔ اُس کی رُوح جیسے اُس کی ہڈیوں میں اُلجھی ہوئی ہو۔ آیا اُس کے بستر کے قریب آگئی۔ کسان کی ماں کو ایک نظر غور سے دیکھا۔ اُس کی نبض پکڑ کر محسوس کی۔ سینے کو ٹھونکا۔ اُس کی سانسوں کو محسوس کیا۔ کان لگا کر اُس کے دل کی دھڑکنوں کو سُنا۔ اُس سے کچھ سوالات بھی کیئے تاکہ اُسے یہ معلوم ہوسکے کہ بُڑھیا اپنے ہوش و حواس میں بھی ہے۔ اور اِس طرح وہ اُس کی آواز بھی سُن لے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد پھر ایک نگاہ اُس کے وجود پر ڈالی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سَودا کرتے وقت اُس سے بھُول چوک ہو جائے۔ سب کچھ دیکھنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ مریض ایک رات سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ اُس کا بہت جچا تُلا، سوچا سمجھا خیال تھا۔ مگر سودے بازی کی خاطر وہ یہ بات نہیں کہہ سکتی تھی۔ اُس نے کسان سے کہا:۔ "تمہاری ماں کم از کم دو دن تو زندہ رہے گی۔ ہو سکتا ہے تین دن لگ جائیں۔ تم مجھے چھ روپیئے دے دینا۔ اِس میں نہلانا، کفنانا بھی شامل ہے۔"

"چھ روپیئے؟ کیا چھ روپیہ؟" کسان ذرا چیخ کر بولا۔ "کیا تم اپنے ہوش و حواس میں ہو، ماں دو چار گھنٹہ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی۔"

دونوں بُڑھیا کی موت کا سَودا کر رہے تھے۔ وہ بہت دیر تک لڑتے جھگڑتے رہے۔ کوئی بات پکّی نہ ہو سکی۔ آخر آیا اپنے گھر جانے لگی۔ کسان کو فکر ہوئی۔ اُس کا اناج کھیت میں پڑا تھا۔ اگر بادل گھر آئے تو سبھی کچھ چوپٹ ہو جائے گا۔ اُس نے سوچا۔ چھ مہینے کی محنت اکارت چلی جائے گی۔ آخر کار اُس کو آیا کی شرط ماننی پڑی۔ سَودا طے ہوگیا۔

"صرف چھ روپیئے اور بس۔ اِس میں سب کچھ شامل ہے۔ یاد رکھنا، نہلانا اور کفنانا بھی۔"

کسان بات پکّی کر کے باہر چلا گیا اور آیا اُس کی ماں کے کمرے میں ——

وہ ہمیشہ مرنے والوں یا مُردہ لاشوں کے سرھانے بیٹھ کر سینے پرونے کا کام کیا کرتی تھی۔ اگر مریض بات کرنے کے قابل ہوتا تو اُس سے بات چیت بھی کرتی جاتی۔ وہ بُڑھیا کے سرھانے بیٹھی سینے پروتی رہی اور اُس سے باتیں بھی کرتی رہی۔

سُورج غروب ہو رہا تھا۔ شام کی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ باہر پیپل کے پتے ہوا میں سیٹی بجا رہے تھے۔ شام کے دُھندلکے اور زیادہ گہرے ہونے لگے۔ فضا پر ایک سنّاٹا چھانے لگا۔ اور اندر ایک بوڑھی عورت دُنیا سے بے نیاز زندگی کی آخری گھڑی انتظار کر رہی تھی۔ معلوم نہیں کب آئے گی یہ موت۔ اُس کی سانس دُھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ سانس باہر نکلتے وقت خر خر کی آواز پیدا ہوتی۔ ہر سانس پر یہ گمان ہوتا جیسے یہی آخری سانس ہے اور دُنیا سے ایک عورت ختم ہو گئی۔ ایک عورت جس کو نہ کوئی رونے والا نہ یاد کرنے والا۔ وہ زمین پر ایک بوجھ تھی۔ جس کے مرنے پر اُس کا بیٹا اطمینان کی سانس لے گا۔

رات کو کسان گھر آیا۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کی ماں ابھی زندہ ہے۔ اُس نے آیا سے کچھ سوالات۔

اور سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اگلی صبح ماں پھر زندہ تھی۔ کسان نے اپنا ناشتہ خود تیار کیا۔ اور اطمینان سے آپا کے سامنے ہی بیٹھ کر کھانے لگا۔ آپا کو بڑی اُلجھن ہو رہی تھی۔ یہ رات بھی یوں ہی گزر گئی۔ اُس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس کے ذہن نے سوچنا شروع کیا۔ اِس کسان نے اسے دھوکا دیا تھا۔ اُس سے زندگی میں اتنی بڑی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ بڑھیا کی حالت رات سے بہتر ہو گئی تھی۔ معلوم نہیں وہ کب تک زندہ رہے گی۔ دو دن، چار دن۔ ممکن ہے ہفتہ دو ہفتہ .... یہ خیال کرتے ہی آپا جھنجھلا اُٹھی۔ اُس کی زبان پر ایک موٹی سی گالی آتے آتے رہ گئی۔

نوجوان کسان اُس کی پریشانی کو بھانپ رہا تھا۔ وہ موڈ میں تھا اور بڑھیا کی پریشانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، کیسا پھنسایا ہے آپا کو! اُس نے بڑھیا سے ایک دو مذاق کی باتیں بھی کیں۔

دوسری طرف بڑھیا واقعی پریشان ہو گئی۔ اُس کا تو ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ وہ دوسری جگہوں سے کتنا کماتی ہے۔ مگر اُس کا یہ دن بھی بے کار ہو جائے گا۔ کبھی اُس کے دل میں ایک خوفناک سی خواہش انگڑائی لیتی۔ کیوں نہ اِس خبیث بڑھیا کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ اِس کو مرنا تو ہے ہی۔ کیوں نہ اِس کو جلد ہی موت کی آغوش میں پہنچا دیا جائے۔ غصہ اور نفرت سے اُس کے بازو تن گئے۔ دونوں ہاتھ بیمار بڑھیا کی گردن کی طرف بڑھے اور بڑھتے گئے۔ اب وہ اُس کا گلا دبانے ہی والی تھی کہ ایک نامعلوم طاقت نے اُس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو روک دیا۔ اِس حرکت کے خطرناک نتائج کا خیال کر کے وہ کانپ اُٹھی۔

اچانک اُس کو ایک اچھوتی ترکیب سوجھی۔ ایسی ترکیب جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ بڑھیا کا کسان بیٹا کھیتوں پر جا چکا تھا۔ بڑھیا نے اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی طرف پہلا عملی قدم اٹھایا۔ وہ مریض بڑھیا کے قریب آئی اور بولی۔

"اماں! کیا تم نے کبھی بھوت دیکھا ہے؟" بڑھیا نے نفی میں سر ہلایا۔

اُس کے بعد آپا نے بھوتوں کے بھیانک قصے سنانا شروع کر دیے۔ کہنے لگی: "مرنے سے کچھ دیر پہلے بھوت دکھائی دینے لگتا ہے۔ اُس بھوت کے ایک ہاتھ میں جھاڑو ہوتی ہے۔ سر پر لوہے کی کڑاھائی اور وہ بھیانک چیخیں نکالتا ہے اور جب مریض اُسے دیکھ لیتا ہے تو فوراً ہی دم توڑ دیتا ہے۔" اس تمہید کے بعد اُس نے تمام نام گِنانا شروع کئے کہ کن کن کے سامنے مرنے سے پہلے بھوت نمودار ہوئے تھے۔

بڑھیا کا بیمار اور کمزور ذہن بھوتوں کی بھیانک داستانیں سن کر خوف زدہ ہو گیا۔ اُس نے خوف اور پریشانی کے عالم میں اپنے ہاتھوں کو ملنا شروع کیا۔ بے چینی اور تکلیف اُس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ وہ گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھتی کہ شاید بھوت نمودار ہو رہا ہو۔ آپا نے محسوس کیا کہ اُس کا حربہ اپنا کام کر رہا تھا۔ وہ چپکے سے بڑھیا کے سرہانے سے سرک گئی۔ باہر آ ایک سفید چادر کپڑوں کی الماری سے

نکالی اور اس کو اپنے چاروں طرف اس طرح لپیٹ لیا کہ صرف آنکھیں نظر آسکیں۔ باورچی خانے سے ایک کڑھائی لے کر اپنے سر پر اس طرح رکھی کہ اس کے دونوں ہینڈل سینگوں کی طرح معلوم ہونے لگے۔ ایک ہاتھ میں جھاڑو لی اور دوسرے میں ٹین کا ایک کنستر، بیمار بڑھیا کے قریب پہنچ کر کنستر کو زمین پر دے مارا۔ ایک خوف ناک جھنکار سے پوری فضا گونج اٹھی۔ تب وہ کھڑکی کے پاس آئی۔ ایک اسٹول پر کھڑے ہو کر کمرے کی طرف جھانکا۔ بڑھیا کا منھ کھڑکی کی طرف ہی تھا۔ اس نے خوف ناک چیخیں نکالنی شروع کیں۔ اور جھاڑو سے کھڑکی کا دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ اس قدر شور و غل برپا ہوا گویا قیامت آگئی ہو۔

خوف زدہ بیمار بڑھیا نے پلنگ سے اٹھ کر بھاگنے کی ناکام کوشش کی۔ قیمتی زندگی کو بچانے کی آخری اور ناکام کوشش میں اس نے اپنی پوری قوت اور توانائی سے بستر سے اٹھنا چاہا۔ وہ جسم کا صرف نصف حصہ ہی پلنگ سے اٹھا سکی۔ اور پھر بستر پر گر گئی۔

چراغ گل ہو چکا تھا۔

آپا نے ہر چیز کو اپنی اپنی جگہ رکھا۔ چادر الماری میں کڑھائی باورچی خانے میں۔ اسٹول کو دیوار کے سہارے اور جھاڑو کو اپنی جگہ پر رکھ کر وہ اطمینان سے کمرے کے اندر آئی۔ بڑھیا کی آنکھیں اب بھی کھلی ہوئی تھیں۔ مگر ان میں جان نہیں تھی۔

پیشہ ورانہ چابک دستی کے ساتھ آپا نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔ اس کے منھ پر چادر ڈھانپ دی اور اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کی روح کی نجات کے لئے دعا کرنے لگی۔ دعا جو اس کے کاروبار کا ایک حصہ تھی۔

کسان جب گھر آیا تو اسے معلوم ہوا کہ ماں مرچکی ہے۔ اس کو شدید رنج ہوا۔ ماں کے مرنے کا ہفتہ آپا کے ساتھ سودے میں اسے گھاٹا ہوا تھا۔ ماں ایک دن پہلے ہی مرچکی تھی۔ اور حساب سے اسے آپا کے ساتھ سودے بازی میں دو روپے کا نقصان ہوا تھا۔

(مرکزی خیال موپاساں کی ایک کہانی سے)

غالب کا ایک شعر کا بقیہ صـ۱۵

وہ اس سلسلے میں کسی سے دبتے بھی نہیں تھے۔ سہ

دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے

لیکن وہ خوب جانتے تھے کہ برائی کا بدلہ برائی ہے۔ بھلائی کا بدلہ بھلائی۔ مجنوں کو مارنے کا مطلب یہ تھا کہ اس کے گنجے والے عزیز و رشتہ دار سب اس کی مرمت کر دیتے۔ آخر پتھر اٹھاتے ہی انھیں اپنے سر کی خیر کا بھی خیال آگیا۔ اور وہ اس ارادے سے باز رہے۔

[غالب کے شعر کی ان تشریحوں کو سن کر استاد اپنی کرسی پر تقریباً بے ہوش سے ہو جاتے ہیں۔ اور پردہ گر جاتا ہے]

سفرنامہ

ابن بطوطہ

(مسلسل)

ہوا موافق تھی اِس لئے طواسی سے چل کر ستر دن میں چین پہنچ گئے۔ چین کا پھیلاؤ، زرخیزی، کھیتی باڑی، سونا چاندی اور پھلوں کی پیداوار کا مقابلہ دوسرا کوئی ملک نہیں کر سکتا۔ چین کی شکر مصر کی شکر سے بڑھ کر ہے۔ انگور، خوبانی کی افراط ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ دمشق کی خوبانی سے بڑھ کر کہیں کی خوبانی نہ ہوگی۔ مگر چین کی خوبانی اس سے بڑھ کر ہے۔ خربوزہ خوارزم اور اصفہان کے خربوزے سے مقابلہ کرتا ہے۔ جتنے میوے ہمارے ملک میں ہیں، وہ یہاں سب اعلیٰ قسم کے پیدا ہوتے ہیں۔ گیہوں نہایت عمدہ اور اتنا بڑا کہ دوسرے کسی ملک میں ایسا گیہوں پیدا نہیں ہوتا۔ مسور اور چنا بھی بہت عمدہ۔

چین کے برتن

پہاڑ کی مٹی جو کوئلوں کے مانند جلتی ہے اُس میں پتھر ملاتے ہیں اور تین دن تک آگ میں جلاتے ہیں، پھر پانی چھڑک دیتے ہیں۔ یہ سب مٹی بن جاتی ہے۔ پھر اس کا خمیر اُٹھاتے ہیں۔ سب سے اچھا خمیر ایک مہینے میں تیار ہوتا ہے۔ معمولی دس دن میں۔ برتن بے حد سستے ہوتے ہیں اور جس طرح ہمارے ملک میں مٹی کے برتنوں کی کثرت ہے یہاں چینی کے برتنوں کی کثرت ہے۔ چین کے برتن ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں بھی جاتے ہیں۔

چین کی مرغیاں

چین کی مرغیاں اور مرغ بطخوں سے بڑے ہوتے ہیں اور اُن کے انڈے بھی بطخوں سے بڑے ہوتے ہیں۔ مرغا شتر مرغ کے برابر خوب بڑا ہوتا ہے اُس پر پَر زیادہ ہوتا ہے۔ سُرخ گوشت کا لوتھڑا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ کولم میں چین کا مرغ دیکھا تو یہ سمجھا کہ یہ شتر مرغ کا بچہ ہے۔ وہ زیادہ بڑا نہ تھا، یہاں آکر بڑے بڑے مرغ دیکھے۔

چین کے لوگ مورتی پوجا کرتے ہیں اور اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں۔ چین کا حکمران چنگیز خان تاتاری کی اولاد ہے۔

چین میں مسلمانوں کی بستیاں الگ ہیں جن میں جامع مسجد اور چھوٹی چھوٹی مسجدیں ہیں۔ مسلمانوں کی عزّت کی جاتی ہے۔ چینی لوگ سُؤر اور کُتّے کا گوشت کھاتے ہیں اور عام طور سے بازاروں میں بِکتے ہیں۔ یہ لوگ دولت مند ہیں مگر بے حد کنجوس ہیں۔ بڑے سے بڑا تاجر اور سیٹھ جس کی دولت کی انتہا نہیں ہوتی، ایسی کی مرزئی اور لبادہ پہنے پھرتا ہے۔

ان کا تعلق سونے چاندی کے برتن ہیں جنہیں اپنے پاس جمع رکھتے ہیں۔ ہر ایک چینی کے ہاتھ میں ایک لمبی لکڑی ہوتی ہے جسے وہ ٹیک کر چلتا ہے۔ ان کا قول ہے کہ لکڑی ہماری تیسری ٹانگ ہے۔

ریشم

ریشم کی پیداوار بہ کثرت ہے۔ فقیر اور مسکین بھی ریشمی کپڑے پہنتے ہیں۔

نوٹ

چین میں نوٹوں کا رواج ہے۔ یہ نوٹ ہتھیلی کے برابر ہوتا ہے اور سرکاری چھاپہ خانے میں چھاپا جاتا ہے۔ زیادہ استعمال سے پھٹ جاتا ہے یا شکستہ ہو جاتا ہے تو سرکار دوسرا بدل دیتی ہے۔ چین والے مٹی کا کوئلہ جلاتے ہیں۔ یہ مٹی کھریا جیسی مگر کالی ہوتی ہے جس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیتے ہیں اور پھر لکڑی کی طرح جلاتے ہیں۔ ایک دفعہ جلانے کے بعد راکھ گوندھ لیتے ہیں اور سکھا کر پھر جلاتے ہیں یہاں تک کہ خاک ہو جاتا ہے۔ پھر اس خاک میں پتھر ملا کر برتن بنا لیتے ہیں۔

تصویر کشی

چین کی دست کاری تمام دُنیا میں مشہور ہے اور تصویر کشی میں تو ایسا کمال ہے کہ فرنگی اور دوسری قومیں بھی اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ جہاں کہیں میں جاتا تھا واپس آتے وقت اپنی اور اپنے ساتھیوں کی تصویریں بازار میں لٹکی دیکھتا تھا اور اُن میں ذرہ برابر فرق نہ ہوتا تھا۔ شاہ چین نے مصوروں کو پہلے سے ہماری تصویریں بنانے کا حکم دے دیا تھا۔ مصور محل میں آ گئے اور وہیں دیکھ دیکھ کر اس طرح تصویریں بنا لیں کہ ہمیں خبر بھی نہ ہوئی۔ چین کے بازار میں جو کوئی بھی گزرتا ہے اُس کی تصویر تیار کر لی جاتی ہے۔ اگر کوئی مسافر ان کے ملک سے بھاگ کر چلا جاتا ہے تو اُس کی تصویریں ہر ملک میں بھیج دیتے ہیں تاکہ جہاں کہیں جائے گرفتار کر لیا جائے۔

سرائے

یہاں سرائے کو فندق کہتے ہیں۔ جب کبھی مسلمان سوداگر چین جاتے ہیں، فندق میں ٹھہر جاتے ہیں۔ چاہے تو کسی چینی مسلمان کے گھر ٹھہر جائیں۔ فندق میں ٹھہریں یا کسی مسلمان کے گھر ٹھہریں، مال کی فہرست لکھ لی جاتی ہے اور سامان کم ہو جانے کی صورت میں مالک مکان یا فندق کا مہتمم ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔

چین کے لوگ اپنا بیٹا اور بیٹی فروخت کر دیتے ہیں اور اسے عیب نہیں سمجھتے۔ مگر وہ لڑکا یا لڑکی چین سے باہر نہ جانا چاہے تو جس نے اُسے خریدا ہے، مجبور نہیں کر سکتا۔

پردیسیوں کے لئے جتنا امن چین میں ہے کسی ملک میں نہیں۔ لاکھوں کا مال لے کر پھرتے رہیے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ ہر شہر میں فندق بنی ہوئی ہے۔ حاکم ایک منشی کے ساتھ سرائے میں آتا ہے اور تمام مسافروں کے نام اور سامان کی فہرست لکھ کر سرائے کا دروازہ بند کرا دیتا ہے۔ صبح کو پھر آتا ہے اور ہر ایک آدمی کا سامان جانچ کر دوسری فندق تک پہنچا دیتا ہے اور

[illegible] حاصل کر لیتا ہے۔ سراؤں میں تمام ضروریات کا سامان مل جاتا ہے۔

زیتون

سمندری سفر ختم ہونے پر ہم زیتون پہنچے۔ جہاں کمخواب اور اطلس تیار کیا جاتا ہے۔ ان کپڑوں کو زیتونیہ کہتے ہیں۔ زیتون کا بندرگاہ دُنیا کے بڑے بندرگاہوں میں ہے۔ ایک سَو بڑے بڑے جہاز اور ان گنت چھوٹے جہاز ہر وقت تیار کھڑے رہتے ہیں۔ یہاں میری ملاقات چین کے سفیر سے ہوئی۔ جو سلطانِ ہند کے حضور میں تحفے لے کر گیا تھا۔ قاضی احمد جیلی جو بڑے فاضل ہیں اور شیخ کمال الدین اصفہانی جو یہاں کے بڑے بزرگوں میں ہیں، مجھ سے ملنے آئے۔ اور بڑے بڑے سوداگر بھی آئے۔ یہ لوگ کسی مسلمان کو دیکھتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ یہاں کے بزرگوں میں شیخ برہان الدین گازرونی ہیں۔ جن کی خانقاہ شہر کے باہر ہے۔

پھر ہم چین کلاں گئے جسے چین ما چین کہتے ہیں اور جہاں کے چینی برتن، ہندوستان، یمن اور چین کے تمام علاقوں میں جاتے ہیں۔

شہر کے بیچ میں ایک بڑا مندر ہے۔ جس کے نو دروازے ہیں اور ہر دروازے کے اندر چبوترے اور بلیں ہیں۔ دوسرے، تیسرے دروازے میں اندھوں اور اپاہجوں کے گھر ہیں جنھیں مندر سے کھانا اور کپڑا ملتا ہے۔ بیماروں کے واسطے شفا خانہ ہے۔ جہاں طبیب اور خدمتی ملازم ہیں۔ بوڑھوں، یتیموں اور لاوارث [illegible] ہیں جن کی آمدنی مندر میں خرچ ہوتی ہے جس راجہ نے مندر بنوایا ہے اُس کی تصویر مندر میں لگی ہوئی ہے اور چینی اُسے پوجتے ہیں۔ شہر کے ایک حصّے میں مسلمان رہتے ہیں۔ ان کی مسجدیں، خانقاہیں اور بازار الگ ہیں، قاضی ہے، شیخ الاسلام ہے۔ چین ماچین کے آگے کوئی شہر اور آباد نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ دو مہینے چلنے کے بعد یاجوج ماجوج کی دیوار ہے۔ وہاں کے خانہ بدوش کسی آدمی کو پکڑ لیتے ہیں تو کھا جاتے ہیں۔ ایسا کوئی نہیں جس نے یہ دیوار دیکھی ہو اور میں اس سے حال پوچھتا۔

چین کلاں میں مجھے معلوم ہوا کہ شہر سے باہر ایک بوڑھا ہے جس کی عمر دو سو برس کی ہے۔ نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے نہ پاخانہ اور پیشاب کرتا ہے۔ دن رات ایک غار میں عبادت کرتا رہتا ہے۔ یہ شہرت سُن کر میں بھی گیا۔ بوڑھا غار کے دروازے پر بیٹھا تھا دُبلا، پتلا سُرخ رنگ: عبادت کے نشان اُس کے چہرے پر نمایاں تھے۔ داڑھی بالکل نہ تھی۔ میں نے سلام کیا تو اُس نے ہاتھ پکڑ کر سونگھا پھر بولا: یہ آدمی دُنیا کے دوسرے کنارے کا ہے۔ پھر کہا: تجھے یاد ہے جزیرۂ سندر پور کے ایک مندر میں دو ستونوں کے بیچ میں ایک آدمی بیٹھا تھا جس نے تجھے دس اشرفیاں دی تھیں۔ دیکھو: میں وہی آدمی ہوں یہ کہہ کر غار میں چلا گیا اور پھر باہر نہ آیا۔ میں اس غار میں گیا، مگر ملاقات نہ ہوئی۔ غار کے آدمی نے کہا: اب تمہاری ملاقات نہ ہوگی۔ خواہ تم بیس برس تک بھی انتظار کیوں نہ کرو۔

(باقی آئندہ)

حافظ باقوی

بیل

سر سے پاؤں تک میں ہری ہوں — اک نازک سی سبز پری ہوں
بوڑھے برگد کی پوتی ہوں — سیج پہ بانسوں کے سوتی ہوں
جب کرتی ہوں جگ کا نظارا — ڈھونڈتی ہوں مضبوط سہارا
پریتم بانس کو جب پاتی ہوں — اُس سے خوب لپٹ جاتی ہوں
پیار سے اُس کا ہاتھ پکڑ کے — اپنے پریم میں اُس کو جکڑ کے
اُس کے سہارے چڑھتی ہوں میں — چڑھتی ہوں میں بڑھتی ہوں میں
چڑھتے رہنا کام ہے میرا — بڑھتے رہنا کام ہے میرا
خوب منڈھے پر پھیلتی ہوں میں — پَل کر پھولتی پھلتی ہوں میں
میرے پھولوں کی چھب نیاری — اِن سے لگتی ہوں میں پیاری
راہ میں جس کو بھی پاتی ہوں — اس سے بس گھل مِل جاتی ہوں

بچّو! مجھ سے بڑھنا سیکھو
علم کی سیڑھی چڑھنا سیکھو

برائی کا پھل

خالد نے عارف سے کہا کہ چوری کرنا بری بات ہے
عارف نے پوچھا:- چوری کیا چیز ہے؟ وہ نہیں جانتا تھا کہ چوری کس چیز کو کہتے ہیں؟

خالد نے کہا "جب تک دادی اماں زندہ تھیں وہ مجھے اچھی اچھی کہانیاں سناتی تھیں۔ اور کہتی تھیں دیکھو بیٹا چوری کبھی نہیں کرنی چاہیے۔"

عارف نے کہا کہ بھیا آج بہت دیر ہو گئی ہے میں آپ سے کل ضرور ایک کہانی سنوں گا

خالد نے کہا ٹھیک ہے کل تو اتوار ہے میں کہانی ضرور سناؤں گا۔

دوسرے دن رات کو خالد نے کہانی شروع کی۔

ملک عرب میں ایک چرواہا تھا وہ روزانہ اپنے اونٹ چرایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ ایک چور اس کے اونٹوں کے گلے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کسی طرح ان اونٹوں کو چرایا جائے۔ دوسرے دن وہ چرواہا اپنے اونٹوں کو روز کی طرح لے کر چرانے جا رہا تھا۔ موقع پا کر چور ایک اونٹ اس گلے سے نکال کر لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ راستے میں اس کو ایک اور چور ملا کہنے لگا۔ "ارے بھائی یہ اونٹ تم کہاں لیے جا رہے ہو؟"

پہلے چور نے کہا۔ "میں اس کو بازار میں بیچنے کے لیے لے جا رہا ہوں۔"

دوسرے چور نے کہا۔ "کتنے میں بیچو گے۔"

پہلے چور نے کہا "تم پہلے اونٹ کو دیکھ تو لو پھر دام بتائے جائیں گے"۔

دوسرے چور نے اپنے جوتے اتار کر وہاں رکھے اور اونٹ پر بیٹھ کر دیکھتے دیکھتے غائب ہو گیا

پہلا چور وہیں اس کے جوتوں کے پاس بیٹھا رہا شام ہونے کو آئی اونٹ کا پتہ تھا نہ آدمی کا وہ تھک کر اور مایوس ہو کر وہاں سے چلنے لگا کچھ دور جانے پر وہ دیکھتا ہے کہ وہی چرواہا واپس آ رہا ہے۔ چرواہے نے کہا کیوں بھائی اتنے مایوس کیوں ہو کیا میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں"؟

پہلے چور نے کہا "کیا بتاؤں بھائی میں نے آج صبح ایک آدمی سے ایک چیز خریدی تھی۔ وہ چیز لے کر میں گھر جا رہا تھا کہ راستے میں ایک آدمی ملا اور کہنے لگا بھائی کیا تم اس چیز کو بیچنے لے جا رہے ہو۔ میں نے لالچ میں آ کر اس سے کہا ہاں بھائی چیز تو بیچنی ہے میں نے اس کو دام

بتا دیے وہ اس چیز کو اس دام پہ لینے کو تیار ہو گیا اور
بتایا میں پہلے اس چیز کو اچھی طرح دیکھ تو لوں کہ یہ ہمارے
آئے گی یا نہیں میں نے اس سے کہا ہاں بھائی تو تم اس
چیز کو اچھی طرح دیکھ لو۔ اس نے وہ چیز لی اور میں نے
جتنے پیسوں میں لی تھی اتنے ہی پیسے دے دیے اور ایک
پھٹا ہوا جوتا یہاں چھوڑ کر چلتا بنا۔

سید اسماعیل حیدر آباد
پبلک اسکول

یہ ہے الف بے، یہ ہے جیم

آؤ احمد، آؤ احسن، آؤ محمد اسماعیل
آؤ شوکت، آؤ یاقت، آؤ عشرت، آؤ جمیل
سب سے الگ کیوں بیٹھے ہو تم آؤ محمد ابراہیم
یاد کریں مل جل کے سبق سب، یہ ہے الف بے، یہ ہے جیم

دیکھو! دوستو، غور سے دیکھو یہ لکھا ہے کیسا صاف
یہ ہے عین، اور یہ ہے غین اور یہ ہے فے اور یہ ہے قاف
کیسے پیارے حرف بنے ہیں دیکھو لے ہو بھائی تسیم!
یاد کریں مل جل کے سبق سب، یہ ہے الف بے، یہ ہے جیم

آؤ آؤ تم کو دکھا دوں میرے پیارے بھائی جمال
تم بھی تو ساتھی ہو ہمارے تم بھی دیکھو بھائی جلال
سب سے پہلے میں نے دیکھا یہ ہے لام اور یہ ہے میم
یاد کریں مل جل کے سب، یہ ہے الف بے، یہ ہے جیم

کیوں بیٹھے ہو بے فکری سے ابھی ہے باقی کام بہت
کام کرو اب میرے عزیزو! کر چکے ہو آرام بہت
آؤ ساجد، آؤ ماجد، آؤ شرافت، آؤ نسیم
یاد کریں مل جل کے سبق سب، یہ ہے الف بے، یہ ہے جیم

عبدالسمیع حافظ
دھام پور

اِدھر اُدھر سے

دلی کی گھاس گھڑی؟ یا ایشیا کا سب سے بڑا فرشی کلاک

نئے عظیم دلی کے بناؤ سنگھار میں اضافے کے طور پر کشمیری گیٹ بس اسٹینڈ کے قریب قدسیہ باغ کی مسجد کے شمال میں رنگ روڈ کے نیچے جمنا کا نشیبی علاقہ بھی طرح طرح سے سجایا گیا ہے۔ لوہے کے جنگلے سے گھرے ہوئے ایک وسیع پارک میں آپ کو ایک ٹیلا نظر آئے گا جس کے نیچے خوبصورتی سے حوض میں ایک مجسمہ نصب ہے۔ اسی حوض کے اوپر کی جانب ٹیلے کے ڈھلان پر دیکھیے تو آپ کو ساٹھ فٹ گولائی کی ایک گھاس گھڑی کا ڈائل نظر آئے گا، اس کے بڑے بڑے ہندسے پتھر میں گہرائی دے کر گملے کی نوعیت سے ترتیب دیے گئے ہیں، جن میں پھول پتیاں اگائی گئی ہیں اور ان پر تقریباً ساتھ اور دس فٹ لمبی گھنٹہ اور منٹ بتانے والی دو من وزنی سوئیاں ہیں۔ دونوں کے اوپر سرخ رنگ کی سکنڈ کی سوئی ہے یہ سب اپنا اپنا فرض انجام دے رہی ہیں۔ اس فرشی گھاس کا قطر (یعنی گولائی) ساٹھ فٹ ہے جس کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ایشیا میں اتنے بڑے ڈائل کا یہ واحد گھنٹہ ہے جو بجلی سے چلتا ہے اور اس کی تمام مشینری ٹیلے کی مٹی کے نیچے چھپی ہوئی کام کر رہی ہے یہ فرشی گھڑی یا گھنٹہ تمام دن سورج کی روشنی میں اور رات کو دس بجے تک سرچ لائٹ میں رنگ روڈ سے گزرنے والوں کو صحیح وقت بتاتا اور بزبانِ حال کہتا رہتا ہے،

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

کاریگروں نے اس کے اندر ایسا خودکار سسٹم بھی رکھا ہے جو اسے رات کو دس بجے بند کر دیتا ہے اور صبح چھ بجے پھر چلا دیتا ہے تاکہ اس دوران پرزوں کو آرام مل جائے اور بلا ضرورت رات میں بجلی کا خرچ بھی نہ ہو۔ یہ گھاس گھڑی تقریباً پچاس ہزار روپے کی لاگت سے مکمل ہوئی ہے، اور قابل دید ہے۔

حکیم خورشید عالم شمسی (الجمعیۃ)

روسی سائنس دانوں نے مصنوعی دل تیار کر لیا

آپ نے دل اور گردے کی جگہ نئے دل اور گردے لگانے کی بات تو سنی ہوگی، لیکن اب روسی سائنس دانوں نے یہ معجزہ بھی کر دکھایا ہے۔ ربڑ کی پتلی جھلی سے مصنوعی دل تیار کیا ہے یہ دل کئی گھنٹوں تک اصلی دل کی جگہ کام کرتا رہا اس کے چار خانے ہوتے ہیں اور اس میں پھول کی پنکھڑیوں کی مانند نازک قسم کے والو ہوتے ہیں جو دل کو حرکت کرنے کی طاقت فراہم کرتے ہیں۔ اس مصنوعی دل کو مستقل دھڑکتے رہنے کے لیے آٹومیٹک

سسٹم کام میں لایا جاتا ہے۔

یہ مصنوعی دل ماسکو کی ریسرچ لیبارٹری میں تیار کیا گیا ہے۔ روسی سائنس دانوں کی کوشش ہے کہ کچھ ہی دنوں میں دل کا ایسا ڈھانچہ تیار کیا جائے جو دل کے مریضوں کے لیے کارگر ثابت ہو سکے تاکہ مصنوعی دل کے ذریعے وہ انسان لمبے عرصے تک زندہ رہ سکے جس کا دل کمزور ہو چکا ہو۔

(الجمعیۃ دہلی)

نئے اُڑن کھٹولے

اگلے دس سال کے دوران لندن کے رہنے والے بالکل انوکھی قسم کی گاڑیوں کا لطف اُٹھائیں گے جو زمین پر نہیں چلیں گی زمین سے تین گز اوپر ایک خاص قسم کا ٹریفک ہوگا جن کے اوپر چھوٹی چھوٹی ٹبیں، جن میں سے چھ سے دس تک مسافر سفر کر سکیں گے نہایت پھرتی سے اِدھر اُدھر دوڑیں بھاگیں گی، سیاحوں، دوکانداروں اور عام شہریوں کو اب چند لمحوں سے زیادہ کسی اسٹیشن پر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ جلدی جلدی بسیں آئیں گی اور تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر اسٹیشن ہوں گے۔ یہ نظام البتہ موجودہ شہروں میں رائج نہیں کیا جا سکے گا بلکہ جہاں کہیں بھی شہروں میں جدید منصوبہ بندی کے تحت عمارتیں بن رہی ہیں اور علاقوں کے علاقے دوبارہ تعمیر ہو رہے ہیں وہاں یہ نظام رائج کرنا چنداں مشکل نہ ہوگا۔ لندن کے علاقے آکسفورڈ اسٹریٹ، پکاڈلی سرکس اور کرومنٹ گارڈن کے نواح میں مکان چونکہ نئے نقشوں کے مطابق بن رہے ہیں اس لیے ان علاقوں میں مندرجہ بالا تجربات کیے جا رہے ہیں۔

ٹریفک کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اگرچہ لندن کی سڑکوں پر پرائیوٹ کاروں کی آمد و رفت کو زیادہ سے زیادہ محدود کیا جا رہا ہے، پھر بھی ٹریفک کچھ اس قدر زیادہ ہے کہ بسوں اور لاریوں کے لیے راستہ بنانا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں سیاست داں سر جوڑ کر بیٹھے اور انھوں نے یہی فیصلہ کیا کہ زمین پر اب مزید گنجائش نہیں ہے اس لیے چھوٹے چھوٹے ڈبے زمین سے دس فٹ اوپر لٹکے ہوئے چلائے جائیں اور ان کی آمد و رفت اور رفتار کو کمپیوٹر کے ذریعے کنٹرول کیا جائے چوں کہ زیادہ بڑے سائز کی گاڑی کو اس ٹریک پر چلانا مناسب نہ ہوگا اس لیے فیصلہ کیا گیا ہے کہ ایک ڈبے کی لمبائی چار گز ہو اور دو ڈبے جوڑ کر چلائے جائیں مسافروں کو ان ڈبوں میں کھڑے ہو کر سفر کرنے کی اجازت صرف ان چند گھنٹوں میں ہوگی جن میں ٹریفک کا رش زیادہ ہوتا ہے۔ یہ گاڑیاں بجلی سے چلیں گی اور بالکل آواز نہیں دیں گی ورنہ نیچے پیدل چلتے ہوئے راہ گیروں کا سکون برباد کریں گی۔

الجمعیۃ دہلی

انوکھی شرطیں

اس کتاب میں عرب کے ملک کی دو بہت ہی دلچسپ اور مزیدار کہانیاں ہیں۔ پہلی کہانی میں ایک عرب تاجر نے اپنی شادی کے لیے تین شرطیں رکھی تھیں۔ ایک عورت نے ان شرطوں کو کیسے پورا کیا۔ بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ دوسری کہانی میں ایک خیاط کے مقدمے میں بچوں نے قاضی کے فیصلے کے خلاف کیسا اچھا فیصلہ کیا اور کس طرح اس وقت کے بادشاہ ہارون رشید نے انھی کے فیصلے کو بحال رکھا بہت دلچسپ کہانی۔ قیمت ۵۰/- مکتبہ جامعہ دہلی

710=10

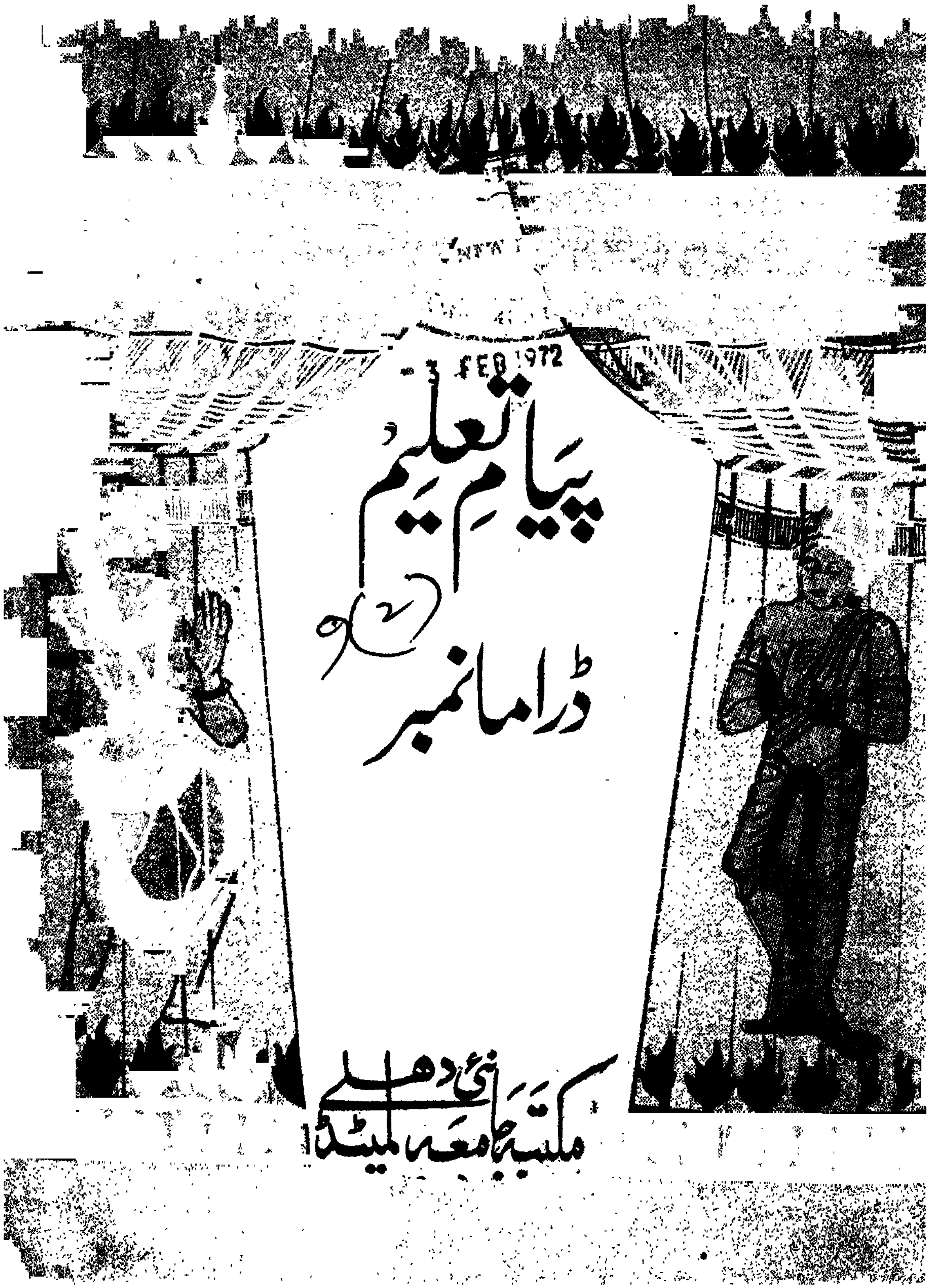
قومی بچت
آرگنائزیشن

No. D. ... JANUARY ...

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-25.

برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)
۱۵۲۸۔ پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دہلی ۶



پیامِ تعلیم

ڈراما نمبر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، نئی دہلی

ریاست ہائے [illegible]

ماہنامہ

فروری

سنہ ۱۹۷۷ء

پیامِ تعلیم

جلد ۹

شمارہ ۲

نئی دہلی ۲۵

محمد حسین حسّان ندوی

صدر دفتر — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
شاخ — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار جامع مسجد۔ دہلی ۶
شاخ — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
شاخ — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ شمشاد مارکیٹ۔ علی گڑھ

قیمت:۔ ۶۰ پیسے
سالانہ چندہ:۔ چھ ۶ روپے
اس شمارے کی قیمت:۔ ایک روپیہ ۵۰ پیسے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپواکر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

فہرست مضامین

ہماری ایک نئی اسکیم

مکتبہ پیامِ تعلیم

اس سال (۱۹۷۰ء) سے ہم نے ایک نئی اسکیم شروع کی ہے آپ کے لیے چھوٹی چھوٹی خوب صورت کتابیں تیار کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اس وقت اس سلسلے کی آٹھ کتابیں تیار ہو چکی ہیں۔

۱۔	بھیڑیے کے بچے	ترجمہ از قرۃ العین حیدر صاحبہ	۵۰/-
۲۔	ہرن کے بچے	" " " "	۵۰/-
۳۔	بیابان ڈھینچو کے بچے	" " " "	۵۰/-
۴۔	شیرخان	" " " "	۵۰/-
۵۔	لومڑی کے بچے	" " " "	۵۰/-
۶۔	بہادر	" " " "	۷۵/-
۷۔	سونے کا پنجرہ اور دوسری کہانیاں	احسان الحق صاحب	۶۵/-
۸۔	[illegible]	مرتبہ محمد حسین حسان ندوی	۱/۷۵

دوسری کتابوں کی تیاری کا کام بہت زوروں سے جاری ہے۔

پیامِ تعلیم کے تمام خریداروں کو مکتبہ پیامِ تعلیم اور مکتبہ جامعہ کی کتابوں پر دس فی صدی کمیشن دیا جائے گا ——— منیجر

بچوں سے باتیں

پیامیوں کی خدمت میں ڈراما نمبر حاضر ہے۔ لگ بھگ
یل برس (یا اس سے اوپر) ہونے کو آیا ہم نے یہ سلسلہ شروع کیا
ا۔ ڈراما نمبر اس سلسلے کی چوتھی پیش کش ہے۔ یقین ہے پچھلے
ن نمبروں کی طرح یہ بھی آپ کو پسند آئے گا۔ اِن شاء اللہ بہت
سند آئے گا۔

بچوں کے ادب کے سلسلے میں۔ بچوں کے لیے ڈراما لکھنے
، طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ کچھ لکھنے والوں نے اپنے شوق اوٗ
ل چسپی کی خاطر چند ڈرامے لکھے ہیں۔ مگر ڈراما لکھنے کی بھی ایک
ص تکنیک ہے۔ کچھ اصول ہیں۔ قاعدے ہیں۔ ہمارے ان شوقیہ
ھنے والوں میں گنتی کے کچھ لوگ ہوں گے جنھوں نے لکھتے وقت ان
عدوں کا خیال رکھا ہو۔

جو سچ پوچھیے تو سنجیدگی سے اس طرف قدم دارالاشاعت
ہور (شمس العلماء مولانا ممتاز علی مرحوم کی سرپرستی میں) نے اور
معہ نے اُٹھایا ہے۔ محترم پروفیسر محمد مجیب صاحب قبلہ (موجودہ
ئس چانسلر) نے "آؤ ڈراما کریں" کے نام سے بچوں کو ڈرامے سکھانے
لیے ایک پوری کتاب لکھ ڈالی۔ یہ مکتبے سے چھپی تھی۔ بڑی قیمتی کتاب
مگر اب نایاب ہے۔ ابھی ابھی نیشنل بک ٹرسٹ (دہلی) کی طرف سے
،ں کے ڈرامے کی تکنیک پر ایک اچھی سی کتاب چھپی ہے۔ یہ بھی کہانی
انداز میں ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ باتصویر ہے۔ تصویریں بھی
کئی رنگوں کی ہیں۔ یہ ایک طرح سے مجیب صاحب کی کتاب کا تتمہ
ہے۔ محترم مجیب صاحب کی کتاب آج سے ۲۶۔۲۷ برس پہلے لکھی گئی تھی۔

محترم مجیب صاحب کے علاوہ محترم سید عابد حسین صاحب قبلہ
نے ایک ڈراما شر پہ لڑکا اور مرحوم ذاکر صاحب قبلہ نے ایک چھوٹا سا
ڈراما بچوں ہی کے لیے لکھا۔ اس کا نام دیانت ہے۔ غفار مدہولی صاحب
نے بھی تین چار ڈرامے لکھے ہیں۔ یہ سب مکتبہ جامعہ نے شائع کیے ہیں
اور جامعہ میں اور جامعہ سے باہر کھیلے جا چکے ہیں۔ جامعہ میں ڈراموں
کی یہ مقبولیت بہت کچھ غفار مدہولی صاحب کے شوق اور لگن کا نتیجہ
ہے۔ جامعہ میں ڈراما کرنے کی اور ڈراما لکھنے کی پہل انھی نے کی۔ اس
پرچے میں اُن کا مضمون ضرور پڑھیے گا۔

کسی خاص نمبر کے لیے ایک ہی عنوان پر مضامین فراہم کرنا کوئی
ایسا آسان کام نہیں ہے۔ شروع شروع میں ہمیں بھی خاصی پریشانی
تھی۔ مگر ہمیشہ کی طرح اب کے بھی ہمارے بزرگوں دوستوں اور ساتھیوں
نے سہارا دیا۔ جتنے بھی بن پڑا ہماری مدد کی۔ ڈراما نمبر میں کوئی
خوبی پیدا ہو گئی ہے تو انھی سرپرستوں اور دوستوں کی بدولت۔

محترمہ صالحہ عابد حسین صاحبہ عزیزی خلیق انجم اشرفی صاحب،
مجتبیٰ یوسف ناظم صاحب، حکیم جنید عثمانی صاحب، غلام حیدر صاحب،
فرحت قمر صاحب، ناظر عاشق صاحب اور دوسرے ساتھیوں کے
ہم خاص طور پر ممنون ہیں، خلیق انجم صاحب اور حکیم عثمانی صاحب
نے تو ایک چھوڑ دو دو چیزیں مرحمت فرمائیں۔ گنجائش کم ہے اس لیے
ایک ہی مضمون شائع ہو سکے گا۔ چند بزرگوں کے ڈرامے دیر میں ملے۔

گے پرچے میں چھپیں گے۔ اگلا پرچہ ایک طرح سے دلّی نمبر کا ضمیمہ ہوگا۔

اب ہمیں اگلے خاص نمبر کی فکر ہے۔ بہت سے پیامیوں کا تقاضا ہے کہ کہانی نمبر شائع کیا جائے تو بھی اچھی بات ہے۔ پہلے تیاری ہم دلّی نمبر کی کر رہے ہیں۔ کہانی نمبر کے بعد کا خاص نمبر اللہ نے کیا تو دلّی نمبر ہی ہوگا۔

اچھا اب ایک اور خوش خبری سُنیے۔ پیامِ تعلیم نے آپ کے لیے ایک اور دل چسپ اور مفید اسکیم تیار کی ہے۔ مختلف عنوانوں پر آپ کے لیے چھوٹی چھوٹی خوبصورت کتابیں تیار کرنے کا پروگرام بنا لیا ہے۔ مثلاً منتخب اور چھوٹی چھوٹی کہانیاں، سیر و سفر، عام معلومات، جنرل سائنس۔ بڑے لوگوں کی سوانح عمریاں۔ مزاحیہ یا ہنسنے ہنسانے والے مضمون اور کیا اور کیا۔

اور یہ سُن کر آپ خوش ہوں گے کہ اس اسکیم پر عمل بھی شروع ہوگیا ہے۔ محترمہ قرۃ العین حیدر کی کتابوں سے اس اسکیم کی ابتدا کی گئی ہے۔ اور یہ اس اسکیم کے لیے بہت ہی نیک شگون ہے۔ اُن کی یہ کتابیں جانوروں کے بچوں پر ہیں۔ پہلی کتاب کا نام ہے "بھیڑیے کے بچے" دوسری کا "ہرن کے بچے" تیسری کا "میاں ڈھینچوں کے بچے" چوتھی کا "شیر خاں"۔ پانچویں کا "لومڑی کے بچے" اور چھٹی کا "بہادر"۔

یہ چھ کتابیں بڑے ہی دل چسپ انداز میں لکھی گئی ہیں۔ کہانیاں پڑھنے میں آپ کو اتنا مزہ نہ آئے گا جتنا مزہ انھیں پڑھنے میں آئے گا۔ ان میں چھٹی اور آخری کتاب کی قیمت ۲۵ پیسے ہے باقی پانچ کتابوں کی ۵۰-۵ پیسے

ان کے علاوہ ایک کتاب کہانیوں کی ہے۔ لکھنے والے ہمارے پرانے ساتھی پیامِ تعلیم کے پرانے لکھنے والے جناب احسان الحق صاحب ہیں۔ احسان صاحب بہت صاف ستھری سادہ زبان لکھتے ہیں۔ لکھنے کے انداز میں بڑی تازگی بہت زندگی ہے۔ اُن کی کتاب کا نام ہے "سونے کا پنجرہ اور دوسری کہانیاں" قیمت ۷۵ پیسے ہے۔

اور یہ آٹھویں کتاب ہے چچا غالب۔ غالب نمبر آپ لوگوں اور دوسرے پیامیوں کو بہت پسند آیا۔ ہمارے منیجر صاحب آپ کی فرمائشوں سے پریشان ہو گئے۔ موجودہ حالات میں غالب نمبر کو دوبارہ شائع کرنا ممکن نہ تھا اس لیے ایسے مضامین چُن لیے گئے جن سے چچا غالب کی زندگی کا کوئی پہلو اُبھرتا ہو اور انھیں کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا۔ قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے ہے۔

اِس اسکیم میں اپنے چھوٹے اور کم استعداد پیامیوں کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ کئی کتابیں اُن کے لیے تیار کی جارہی ہیں۔ ان کتابوں میں مزے مزے کی مُنی مُنی کہانیاں ہوں گی بہت ہی دلچسپ اوپر کی آٹھ کتابیں تو پریس بھیج دی گئی ہیں۔ کوئی عجب نہیں جو دلّی نمبر سے پہلے ہی شائع ہو جائیں۔ دوسری کتابوں کا کام بھی بہت تیزی سے ہو رہا ہے۔

اس اسکیم کی سب کتابیں پیامِ تعلیم کے خریداروں کو، دس فی صدی کی رعایت سے دی جائیں گی۔

کیف احمد صدیقی

سوال و جواب

شسو بی :-

پاپا ہم کو نئے سال کی آمد پر کیا تحفہ دیں گے؟
ٹافی کا پیکٹ دیں گے یا چاکلیٹ کا ڈبّہ دیں گے؟
پاپا ہم کو نئے سال کی آمد پر کیا تحفہ دیں گے؟

شبینہ :-

ممّی ہم کو نئے سال کی آمد پر کیا تحفہ دیں گی؟
بالائی کے لڈّو دیں گی یا گاجر کا حلوہ دیں گی؟
ممّی ہم کو نئے سال کی آمد پر کیا تحفہ دیں گی؟

پاپا اور ممّی :-

بچّو! آج دُعا کے علاوہ ہم تم کو کچھ دے نہ سکیں گے
آج تمہارے سارے تحفے ہم اُن بچّوں کو بھیجیں گے
جن کے پاپا نے سرحد پر اپنی جان نچھاور کر دی
ہم لوگوں کی جان بچا کر اپنی جان نچھاور کر دی
بھارت ماں کی شان بڑھانے والوں کی امداد کریں گے
بچّو آج دُعا کے علاوہ ہم تم کو کچھ دے نہ سکیں گے

شو بی اور شبینہ :-

ہاں پاپا ہاں ممّی، اب ہم نئے سال میں کچھ بھی نہ لیں گے
آج شہیدوں کے بچّوں کو اپنا ہر تحفہ بھیجیں گے

(غیر مطبوعہ)

جناب عبدالغفار صاحب مدھولی

جامعہ میں ڈراموں کی کہانی

میں نے جناب عبدالغفار صاحب سے "پیامِ تعلیم" کے ڈراما نمبر میں مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ عنوان دیا تھا "جامعہ میں ڈراموں کی کہانی" یعنی جامعہ میں ڈراموں کا رواج کب سے ہوا۔ جامعہ میں ڈرامے کو مقبول بنانے میں غفار صاحب کی دل چسپی اور کوشش کو بہت دخل تھا۔ اسی لئے اس مضمون کے لئے نگاہ اُنہی پر پڑی۔ غفار صاحب نے میری درخواست قبول فرمائی۔ اور یہ دل چسپ مضمون لکھ دیا۔ دل چسپ بھی، معلوماتی بھی

ایڈیٹر پیامِ تعلیم

جامعہ میں ڈرامے کی ابتدا بہت دل چسپ، بہت انوکھے انداز میں ہوئی۔ اور وہ اس طرح کہ ایک دن اچانک شیخ الجامعہ قبلہ "ذاکر صاحب مرحوم" کا اعلان آیا ہے کہ تیسری جماعت کے بچے مدرسے کے آخری گھنٹے میں ایک نقل دکھائیں گے۔

اس آخری گھنٹے میں پوری جامعہ ایک جگہ جمع ہوتی ہے۔ سرے پر ایک میز ہے۔ اس میز پر اسٹوو، پتیلی، گلاس اور کچھ برف رکھی ہے۔ اور موضوع ہے: "بادل کیسے بنتے ہیں اور بارش کیسے ہوتی ہے۔" بچوں نے یہ سب باتیں اس طرح سمجھائیں جیسے کوئی سائنس کا ماسٹر چیزیں دکھا دکھا کر سمجھاتا ہو۔ بیچ بیچ میں ہنسنے ہنسانے کی باتیں بھی ہو جاتی تھیں۔ یہ نقل بہت کامیاب رہی سبھی نے اسے پسند کیا۔

اس کامیاب نقل کے بعد بچوں کے حوصلے بڑھے۔ میرے سر ہو گئے کہ ایسی ہی نئی نئی باتیں کروا لیجیے۔ میں چاہتا بھی یہی تھا۔ بچوں کی دل چسپی اور شوق کو دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

یہ بات ۱۹۲۷ء کی ہے۔ اُس وقت تک ہمارے ملک میں دو ہی ایک ڈرامے بچوں کے لئے لکھے گئے تھے۔ میں نے پہلی دفعہ "قوم پرست طالب علم" کے نام سے ایک ڈراما لکھا۔

گاندھی جی نے فرمایا تھا: "لڑکوں کو تعلیمی کاموں میں لگا رہنا چاہیے۔ لیکن ضرورت پڑے تو بڑے لڑکوں کو اپنے بڑوں کا ساتھ دینے کے لئے سیاست کے میدان میں کود پڑنا چاہیے۔" اُن کی اِسی بات کو سامنے رکھ کر میں نے یہ ڈراما لکھا۔ دیکھنے والے بہت تھے ہال ناکافی تھا۔ میدان میں کرنے کے لئے پردوں کی ضرورت تھی۔ لڑکوں نے خوشی خوشی چندہ اکٹھا کیا۔ تھوڑی بہت مدد جامعہ نے بھی دی۔

عید کا زمانہ تھا۔ کھلے میدان میں جامعہ کے تمام لوگ اور مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کے بیچوں بیچ مولانا محمد علی مرحوم بھی آ کر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے لڑکوں نے قومی ترانہ گایا۔ پھر ایک بڑے طالب علم کے واقعات دکھائے گئے کہ اُس نے قومی جلسے میں حصّہ لیا۔ گرفتار ہوا۔ مولانا حسرت موہانی کی طرح جیل میں چکّی پیسی۔ رہائی ہوئی تو مدرسے کے لڑکوں نے دعوت دی۔ پھر اُسی لڑکے نے

بڑے ہوکر ایک ہندو کی دولت کی حفاظت کی۔ مولانا محمد علی یہ سب دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ بیچ بیچ میں بلند آواز سے کچھ تبصرہ بھی کرتے جاتے تھے۔ کیوں کہ یہ سب باتیں اُن پر بیت چکی تھیں۔ کہتے تھے کہ یہ لڑکے تو میری نقل کر رہے ہیں۔ اِس سے لوگوں میں اور بھی دل چسپی بڑھ گئی۔

اس ڈرامے میں لکھنو کے عرفان نے قوم پرست طالب علم کا۔ اور سی۔ پی کے رفیق نے ڈاکو کا کام اچھا کیا تھا۔ بنی احمدؔ نے مولانا شوکت علی کی نقل کی تھی۔ اُن کا جسم بھی بھاری بھرکم تھا۔ اِس لئے ان کے بولنے سے پہلے ہی لوگ محض اُن کی ہیئت دیکھ کر ہنستے تھے۔

اُسی زمانے میں ایک دن کی بات ہے، کسی لڑکے نے مجھ سے پوچھا: ماسٹر صاحب یہ سب کچھ تو ہو رہا ہے۔ لیکن جس طرح بڑوں کے ڈراموں میں عورتوں کا "پارٹ" ہوتا ہے اُسی طرح ہمارے ڈراموں میں لڑکیوں کا کام نہیں ہوتا، یہ کیا بات ہے؟

میں نے جواب دیا۔

ہمارے مدرسے میں لڑکیاں نہیں پڑھتی ہیں۔ اِس لئے اِن کا کام نہیں رکھا گیا۔

" تو کیا ہوا ہمارے یہاں کئی لڑکے ایسے ہیں جو لڑکیوں کی نقل کر سکتے ہیں۔" ایک لڑکے نے جواب دیا۔

" یہ ٹھیک ہے لیکن مردوں کی نقل مرد اور عورتوں کی نقل عورتیں کریں تو اچھا ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں جب لڑکیاں پڑھنے لگیں گی تو ان کا بھی خیال رکھا جائے گا۔ اور دیکھو ہم نے اب تک جتنے ڈرامے کئے ہیں عورتوں کے کام کے بغیر سب ٹھیک معلوم ہوتے تھے۔ ہر ایک ڈرامے میں عورتوں کا کام لازمی نہیں ہے۔

لڑکوں کی سمجھ میں بات آگئی اور بات آئی گئی ہوئی

ڈراموں کے پچھلے سال کے ہنگامی آغاز نے مستقل صورت اختیار کرلی۔ اِن ڈراموں سے جو جامعہ کی اہم تقریبوں کے موقع پر کھیلے گئے۔ قطع نظر کرکے دیکھیں تو جتنے ڈرامے اِس سال ہوئے۔ کسی اور سال نہ ہوئے ہوں گے۔

یہ کام مدرسے تک محدود نہ رہا۔ کالج کے طلبہ کو بھی شوق ہوا۔ اور تو اور اُستادوں نے بھی ایک ڈراما کھیلا میں اُس وقت کالج کے لڑکوں کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ ساتھی بھی ایسے تھے جنھیں جامعہ سے خاص لگاؤ تھا

ایک دن کی بات ہے کہ سارے لڑکے ایک کمرے میں جمع تھے۔ امتیازؔ صاحب نے کہا:

" ماسٹر جی ہو جائے "ایک ڈراما" مطلب یہ کہ کالج کے لڑکوں سے بھی ڈراما کروائیے۔

میں نے کہا " بڑے لڑکوں کے لئے ایسا ڈراما نہیں ہے جس میں عورتوں کا پارٹ نہ ہو۔"

تو کیا ہوا موجودہ ڈراموں میں سے کسی میں ایسا ردّوبدل کیجئے جس سے ہمارا کام بن جائے۔" عبدالکریمؔ پشاوری نے کہا:۔

---

[1] حافظ بنی احمد مرحوم لائبریرین جامعہ ملیہ۔ یہ اُس زمانہ میں غالباً ابتدائی میں پڑھتے تھے۔

[2] امتیاز حسین خاں مرحوم بی کام لندن پروفیسر معاشیات جامعہ عثمانیہ مرحوم ذاکر صاحب قبلہ کے بھتیجے۔ اُن دنوں یہ بھی جامعہ کالج کے طالب علم تھے۔

[3] یہ بھی مرحوم ہوگئے۔ جامعہ سے بی اے کرکے خان عبدالغفار خاں کی جماعت خدائی خدمت گار میں شامل ہوگئے اور اہم حیثیت حاصل کرلی۔ جوانی میں انتقال ہوگیا۔ ۱۲

اِس وقت تک بڑے لڑکوں کے لئے خاص طور سے
ڈرامے نہیں لکھے گئے تھے۔ بعد میں حیدرآباد (دکن) کے
اُستادوں اور پروفیسر محمد مجیب (موجودہ وائس چانسلر)
نے کئی ڈرامے اِس مطلب کے لکھے ہیں۔ اِن میں عورتوں
کا پارٹ نہیں ہے۔

میں اُس وقت اور کیا کرتا۔ آغا حشر کے ایک ڈرامے میں تبدیلی کرکے لڑکوں کے سامنے رکھ دیا۔ پارٹ تقسیم ہوئے۔ اِن بڑے لڑکوں کو سکھانے میں چھوٹوں کے مقابلے میں زیادہ دُشواری پیش آئی۔ کوئی تو شرماتا۔ کوئی کہتا آپ بتلاتے جائیے۔ اِس وقت تو سُنائے دیتا ہوں اصل کام اسٹیج پر دکھاؤں گا۔ ایک صاحب فرماتے میرا کام ہی کتنا ہے اوروں سے مشق کروائیے۔ کوئی تھیٹر کی نقل میں زور زور سے بولتا تو کوئی ایسے، جیسے مُنھ میں زبان ہی نہیں ہے۔ بڑی مشکلوں سے یہ لوگ قابو میں آئے۔ ڈراما تو جیسا کچھ ہوا اُس وقت بڑا مزا آیا جب حسین حسّان صاحب آپ کے "پیامِ تعلیم" کے مدیر معمولی عینک لگائے، بغل میں اخباروں کا پلندہ لیے، عینک میں سے گھورتے ہوئے عدالت میں داخل ہوئے۔ یہ فرض کیا گیا تھا کہ یہ "پیسہ اخبار" کے مدیر ہیں، اور ایک مقدمے میں اُنھیں گواہی دینی ہے۔ اُنھیں سکھانے کی ضرورت اِس لیے نہیں پڑی کہ یہ حضرت بیچ پیچ جیسے تھے ویسا ہی کام دیا گیا تھا۔

لوگوں نے کہا کہ اب تو اُستادوں کو بھی خاموش نہیں رہنا چاہیئے۔ ایک سال ہوا پروفیسر وہاج الدین صاحب (حیدرآباد) نے اُستادوں کے لیے ایک اچھا سا ڈراما لکھا تھا "نکاح یا تجربہ" پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اُستادوں کو راضی کرلیا۔ خود بھی اِس ڈرامے میں کام کیا۔ اوروں کو بھی سکھلایا۔ خود تو "جوتشی" بنے تھے۔ مجھے "مرزا فرشتہ" بنایا۔ نیازی صاحب[1] [illegible] بنے تھے۔ اور کریم اللہ صاحب[2] برادر نسبتی۔ علیم صاحب[3] ارسطو کے شاگرد علامہ مجذوبی بنے تھے۔ کالج سے بھی دو لڑکے لیے گئے تھے۔ انور خان صاحب کو حکیم جیپلی اور نصیر صاحب کو جعفر کا کام دیا گیا تھا۔ بیوی شروع سے آخر تک پردے میں رہی۔ اِس لئے عورت کی نقل کا جھگڑا نہ رہا۔

مجیب صاحب اداکاروں کے سجانے (میک اپ) میں کمال رکھتے ہیں۔ اداکاروں کا انتخاب بھی اچھا تھا۔

علیم صاحب نے عربی میں بی۔ اے کیا تھا۔ عربی قاعدے کے مطابق لفظوں کو ٹھیک ٹھیک بولنے کا ملکہ تھا۔ پارٹ خاصا لمبا تھا۔ خوب یاد کیا تھا۔ نقل اِس بات کی تھی کہ کوئی شخص بحث میں اِن کے سامنے غلط لفظ بولتا تو یہ اُس کی خبر لیتے۔

بہت چھوٹے بچّوں یعنی تیسری اور چوتھی جماعت والوں نے کہا کہ ایک ڈراما ایسا بھی کروائیے جس میں ہم ہی ہم ہوں۔ اِس مطلب کے لئے غلام عباس صاحب کا لکھا ہوا ڈراما "ثریا کی گڑیا" بہت موزوں تھا۔

اِس میں کام کرنے والے "دو بچیاں اور ایک بچہ" ہے۔ ایک بچی جس کی عمر سات سال کی ہوگی۔ اپنی سہیلیوں کو گڑیوں کا گھر دکھانے کے لئے چائے پر بلاتی ہے۔ اُس کا

---

[1] پروفیسر نذیر نیازی کالج سے جامعہ اُس وقت ثانوی میں پڑھاتے تھے۔ آجکل پاکستان میں کسی اچھے عہدے پر ہیں۔

[2] کریم اللہ صاحب بی۔ اے جامعہ سائنس کے استاد تھے۔ بعد میں جرمنی جاکر۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ اس وقت پاکستان میں غالباً کسی بڑے عہدے پر ہیں۔

[3] علیم صاحب اُس وقت جامعہ میں طالب علم اور استاد تھے۔ بعد میں جرمنی جاکر عربی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں چلے آئے۔ آجکل مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔

چھوٹا بھائی (عمر [illegible] سال) دعوت کی چیزیں ہضم کرنے کے لئے طرح طرح سے پریشان کرتا ہے۔ اس کی دونوں بہنیں ایک ترکیب سوچتی ہیں۔ وہ بھائی کو کل پرزوں کے ذریعے چلنے والی گڑیا بنا لیتی ہیں۔ سہیلی کے آنے پر یہ گڑیا طرح طرح کے کھیل تماشے دکھاتی ہے۔ چائے کا سامان، گڑیوں کا پیارہ، ایک پردہ اور صرف تین بچوں کے ذریعے یہ تمثیل نہ صرف مدرسے بلکہ گھروں میں آسانی سے کھیلی جا سکتی ہے۔ زبان میں مٹھاس ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے ہیں۔ اس عمر میں بچے جس طرح بولتے ہیں اور اپنی ادائیں دکھاتے ہیں۔ اسی انداز میں لکھا ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ نری گفتگو ہی نہیں ہے۔ اداکار کچھ نہ کچھ کرتے ہوئے بولتے ہیں۔ اس لئے اور بھی لطف آتا ہے۔

جامعہ میں اس وقت چھوٹی بچیاں نہیں پڑھتی تھیں۔ اس لئے میں نے اس ڈرامے میں "سہیلیوں" کو بدل کر "دوستا" کر دیا۔ گڑیوں کا کھیل چھوٹے بچے اور بچیاں سبھی کھیلتے ہیں۔ اس لئے اس تبدیلی کا کوئی پتہ نہ چلا۔

میاں مسعود (جواب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہیں) زندہ گڑیا بنے تھے۔ نگینہ کے شاہد، مسعود کے بڑے بھائی اور قائم گنج کے شفیق شاہد کے دوست بنے تھے۔

دوسرا ڈراما "اسکول کی زندگی" عید کے موقع پر کھیلا گیا تھا۔ میں جس وقت میٹرک میں پڑھ رہا تھا۔ Nag natten at School (ناگ ناٹن ایٹ اسکول) نامی کتاب نصاب میں تھی۔ اسی کے پلاٹ سے یہ ڈراما تیار کیا تھا۔ بھولے ناٹن کا کام عرفان نے، دو شریر لڑکوں کا کام قائم گنج کے سراج اور سعد انصاری صاحب کے بھائی شعیب نے کیا تھا۔ طیب صاحب نے کیلانی صاحب

کی۔ نبی احمد صاحب نے [illegible] تاریخی [illegible] میں [illegible] کا ڈراما "[illegible] انصاف" اسٹیج کیا۔ اس کی تیاری پر کافی رقم خرچ ہوئی تھی۔ ڈراموں کا کام اب اس حد تک ترقی کر چکا تھا۔ کہ لوگوں کو ٹکٹ خرید کر ڈراما دیکھنے میں کوئی عذر نہیں ہوتا تھا۔ ہارون رشید، حسن خواجہ، علی خواجہ، حسن خواجہ کا نوکر بالترتیب، نبی احمد، میر اصغر علی، محمد ہارون اور عبداللطیف بنے تھے۔ جن لڑکوں نے ان کے مجلس میں مقدمہ کا فیصلہ کیا تھا وہ مسعود حسن خان، محمد نور خان، آفتاب احمد، ابوالکلام تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی لڑکے تھے۔ یوں تو سب کا کام اچھا رہا۔ لیکن عبداللطیف جو ملازم کا کام کر رہے تھے۔ چونکہ رہ کر اپنا کام بر وقت اس انداز سے کرتے تھے کہ لوگ ان کے جواب کے منتظر رہتے تھے۔ کہ دیکھئے اب کیا کہتے ہیں۔ انھیں اور محمد ہارون کو انعام ملا۔ ایک منظر کا سامان ہٹانے اور دوسرے کو سجانے میں جو وقفہ نکل آتا اس وقفے میں نظم خوانی رکھی گئی۔ احمد بن سالم (چہارم) نے اس قطعے کو اتنی اچھی لے سے گایا کہ لوگوں نے دو دفعہ تالیاں بجائیں۔ پروفیسر محمد مجیب نے انعام کا اعلان کیا۔ انعام کیوں نہ ملتا۔ احمد کی آواز اچھی تھی ہی۔ اس پر انھیں نئی نئی طرزیں معلوم کرنے کا شوق تھا۔ آواز کو جس طرح چاہتے اونچی نیچی کر لیتے تھے۔

قطعہ یہ ہے ؎

بادو باراں کی بھی سہہ لوں گا میں ساری سختیاں
ہاں مشقت کو بھی خاطر میں نہ لاؤں گا کبھی

؎ آجکل لکھنؤ میں سرکاری ملازم ہیں۔ ؎ محمد طیب حسنانی [illegible] آج کل جامعہ میں چیف اکاؤنٹنٹ ہیں۔

؎ حیدرآباد سے چند بچے آئے تھے۔ احمد بھی انھیں میں تھے۔

محروی میں [illegible] کے فیض سے
ایک چھوٹا سا پن ہونے بچے پر دال پڑے

محترم ڈاکٹر انصاری صاحب اِس ڈرامے کو دیکھنے کے لئے خاص طور سے تشریف لائے تھے۔ محمد مجیب صاحب، ڈاکٹر سلیم الزّماں صاحب کے مشوروں سے انتظام میں خوبی پیدا ہو گئی تھی۔ قرول باغ والوں کو دِکھانے کے لئے یہ ڈراما دُوسرے دن بھی کیا گیا۔ یہ ڈراما مَیں نے لکھا اور مکتبہ جامعہ نے "بچّوں کا انصاف" کے نام سے شائع کیا۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں یہ روایت قائم ہو گئی کہ ابتدائی والے عید پر اور ثانوی اور کالج والے تاسیس پر ڈراما کھیلیں۔ چنانچہ تاسیس کے دُوسرے دن بڑے لڑکوں نے پروفیسر مجیب صاحب کی رہنمائی میں ڈراما "کھیتی" اسٹیج کیا۔ جو خود مجیب صاحب کا لکھا ہوا تھا۔ بشیر صاحب[1] نے لمبی لمبی تقریروں کو یاد کر کے "باتونی مولوی" کی نقل اُتاری وہ آپ ہی کا حصّہ تھا۔ اِن ہی دِنوں دہلی میں کانگریس کی مجلسِ عاملہ کا جلسہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب اِس ڈرامے کو دِکھانے کے لئے مجلس کے سب لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر گئے تھے۔

عید کے دن ڈراما کرنے کی روایت کو قائم رکھنے کیلیے سیّد نوُر شاہ صاحب نے ڈراما "اسکول کی زندگی" کروایا۔

تاسیس کے جشن کے لئے ذاکر صاحب نے ایک چھوٹا سا ڈراما "دیانت" لکھ دیا تھا۔ ذاکر صاحب کے مزاج میں نرمی، گرمی (غصّہ)، مذاق، سنجیدگی سب ہی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اِس لیے کہانی ایسی سوچی کہ اِس میں یہ سب باتیں آجائیں۔

ایک اور موقع پر مدرسہ ابتدائی والوں کی خواہش پر ڈاکٹر سیّد عابد حسین صاحب نے ڈراما "شریر لڑکا" لکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نفسیات کے ماہر ہیں۔ آپ نے اِس ڈرامے میں یہ بُنیادی خیال پیش کیا کہ شریر بچّے دلیر عموماً ہوتے ہیں۔ وقت پڑے تو اپنے کو جوکھم میں ڈال دیتے ہیں۔ بے جھجک خطروں میں کوُد پڑتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے شاگردوں اور سوال کرنے والوں کو دلیلوں سے مطمئن کرتے ہیں۔ اِس ڈرامے میں یہی رنگ نُمایاں نظر آتا ہے۔

ایک موقع پر پروفیسر محمد مجیب صاحب کا لکھا ہوا ڈراما "انجام" کھیلا گیا۔ ڈرامے کے ہدایت کار وہ خود ہی تھے۔ یعنی موصوف نے خود ہی اُسے اپنی نگرانی میں اسٹیج کے لئے تیار کرایا۔

وقت گزرتے دن نہیں لگتے۔ ہوتے ہوتے جامعہ کی عمر پچیس سال ہو گئی۔ اِس کا جشنِ زرّیں (سلور جوبلی) منایا گیا۔ اِس موقع پر آپ کا مشہور ڈراما "خانہ جنگی" کھیلا گیا۔ یہ بھی آپ ہی کی رہ نمائی میں تیار ہوا تھا۔ جوبلی کا خاص پنڈال حاضرین سے بھرا ہوا تھا۔ میک اپ، اداکاری، ڈرامے کے ماحول کے مطابق خوب تھی۔ اداکاروں میں شیخ سرمد کا پارٹ عُبید الحق صاحب نے، شاہ جہاں کا پارٹ احسان الحق صاحب نے، اورنگ زیب کا پارٹ محمد اکرام خاں صاحب نے۔ مُلّا ابوُالقاسم کا پارٹ سیّد حسن صاحب نے، ابراہیم بدخشانی کا پارٹ سیّد مجاہد حسین صاحب زیدی نے، اعتماد خاں عبد القوی کا پارٹ بشیر احمد صاحب انصاری مرحوم نے، عبد الرحمٰن کا پارٹ رشید نعمانی صاحب نے، دارا شکوہ کا پارٹ غیوُر صاحب

[1] محمد بشیر احمد صاحب [illegible] ۔ اے۔ جامعہ۔ جامعہ کے دفتر میں محاسب تھے۔ بعد میں پاکستان چلے گئے، وہیں انتقال ہو گیا۔

نے، شاگرد کا پارٹ حافظ رضی الدین صاحب نے، علی قوال کا پارٹ اشفاق محمد خان صاحب نے۔ علی قوال کے لڑکے کا پارٹ محسن شمسی صاحب نے ادا کیا تھا۔

محترم پروفیسر محمد مجیب صاحب کا چوتھا اور پانچواں ڈراما "دوسری شام" اور "آزمائش" جامعہ کے تعلیمی میلوں میں کھیلے گئے۔ مجیب صاحب کے یہ سب ڈرامے اردو ادب میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈراموں کی پرکھ کرنے والے لوگ انھیں شاہ کار کی حیثیت دیتے ہیں۔ بس ذرا مکالے کہیں کہیں لمبے ہو جاتے ہیں۔

ان سبھی ڈراموں میں صحیفانہ انداز ضرور جھلکتا ہے ۱۹۴۰ء سے جامعہ میں بچوں کے میلے کی ابتدا ہو گئی تھی۔ جو بعد میں تعلیمی میلے کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں تعلیمی اور دوسرے رنگا رنگ پروگراموں کے ساتھ ساتھ حسب معمول ڈرامے بھی اہتمام سے ہونے لگے۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ ڈرامے معیاری ہوں۔ ڈراموں کے نام اور ان پر تبصرہ "پیام تعلیم" میں چھپتا رہا۔

بقیہ ڈراما "بڑا مزہ اُس ملاپ میں ہے . . . . "

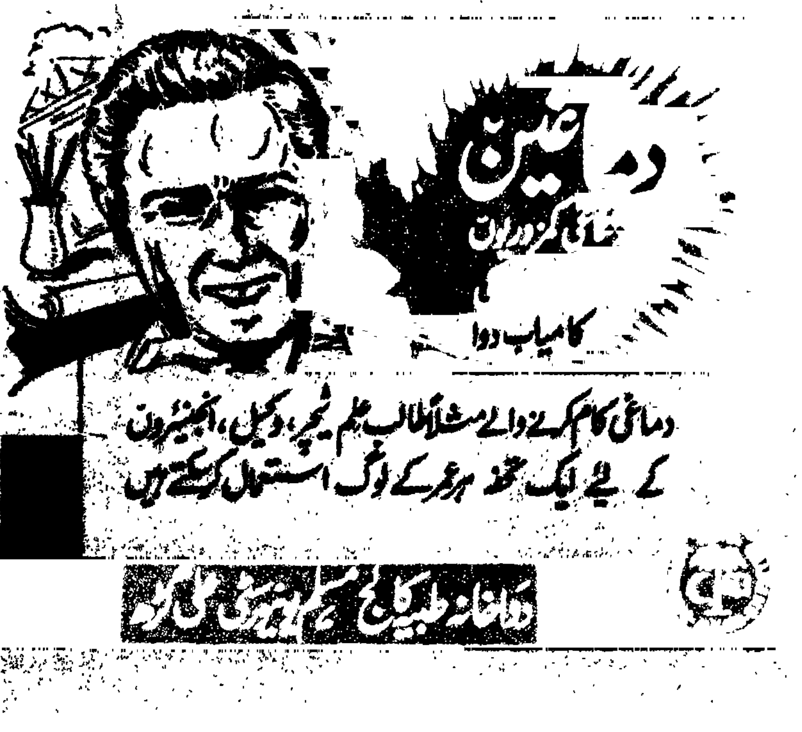
سرندر کور:۔ دیکھنا کل پھر لڑ پڑیں گے!

جمال:۔ ہاں، ہاں لڑیں گے تو کیا ہوا ۔۔۔ مَن بھی جائیں گے

عرشی:۔ اور کیا۔ بڑا مزہ اُس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

(سب ہنستے ہیں) (نرس اندر سر ڈالتی ہے "بس بس شور نہیں")

(پردہ گرتا ہے)



آزاد بارہ بنکوی

"خدا کرے کہ نیا سال اِس طرح آئے"

خدا کرے کہ نیا سال اِس طرح آئے   سبھی کے واسطے سچی مسرتیں لائے
ستم کوئی کسی مظلوم پر نہ کر پائے   زمیں کی لوح سے غم کا نشان مِٹ جائے

خدا کرے کہ نیا سال اِس طرح آئے

دلوں میں پیار محبت ہو نفرتوں کی جگہ   خلوص و مہر ہو پیدا عداوتوں کی جگہ
چراغِ عقل ہو روشن حماقتوں کی جگہ   اُجالا علم کا پھیلے جہالتوں کی جگہ

خدا کرے کہ نیا سال اِس طرح آئے

اُصول امن کے سارے جہاں میں چل جائیں   سدا کے واسطے جنگی بلائیں ٹل جائیں
فساد و شر و مصیبت کے دن بدل جائیں   ہر ایک راہ میں خوشیوں کے دیپ جل جائیں

خدا کرے کہ نیا سال اِس طرح آئے

یہ رنگ و نسل کے قصے تمام ہو جائیں   یہ ذات پات کے جھگڑے حرام ہو جائیں
اُصولِ عدل و مساوات عام ہو جائیں   فلاحِ عام کے جاری نظام ہو جائیں

خدا کرے کہ نیا سال اس طرح آئے

زبان کے اور علاقہ کے مسئلے نہ رہیں   امیری اور غریبی کے تذکرے نہ رہیں
خدا کے نام پہ جاری تنازعے نہ رہیں   زمیں پہ خون خرابہ کے سلسلے نہ رہیں

خدا کرے کہ نیا سال اِس طرح آئے

محترمہ صالحہ عابد حسین صاحبہ

(ڈراما)

بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے....

۱- نرندر } ساتویں کے طالب علم
۲- جمال } گہرے دوست۔ عمر ۱۴-۱۵ کے درمیان

۳- عرشی } آٹھویں جماعت کے
۴- نرمل کمار } طالب علم۔ عمر لگ بھگ ۱۵-۱۶ کے درمیان

۵- گڑیا - جمال کی بہن پانچویں میں پڑھتی ہے۔

۶- سرندر کور - گڑیا کی دوست اور پڑوسی۔

۷- ماں جی - نرندر کی ماں

۸- ابّا جان - جمال کے باپ

۹- موسی جی - سرندر کی خالہ

۱۰- ایک استاد۔

۱۱- ڈاکٹر

۱۲- نرس

۱۳- کچھ اور لڑکے لڑکیاں

پہلا سین

[پس منظر میں ایک اسکول کی عمارت کا کچھ حصّہ نظر آ رہا ہے۔ سامنے کھیل کے میدان میں نرندر، جمال، عرشی، نرمل کمار اور کچھ اور لڑکے ہاکی کھیل رہے ہیں۔ کھیل کے دوران کچھ جھگڑا ہو جاتا ہے اور سب آپس میں ہاتھ چلا چلا کر، چیخ چیخ کر لڑتے نظر آتے ہیں۔ کچھ لڑکے کھڑے ہنس رہے ہیں]

جمال:- کیا کہا، پھر تو کہو۔ منھ توڑ دوں گا۔

نرندر:- ہزار بار کہوں گا۔ تو کائر ہے۔ بُزدل ہے۔ میں کیا ڈرتا ہوں کسی سے ؟

جمال:- بدتمیز۔ تو تڑاق سے بات کرتا ہے۔ کائر تو تم لوگ ہو۔ گھاس پھوس کھانے والے۔

نرندر:- چل چل، بڑا آدم خور آیا کہیں کا !

جمال:- آدم خور تو تم ہو۔ انسانوں کا خون چوستے ہو۔ فساد کراتے ہو !

ایک لمبا لڑکا:- ان مسلّوں کو کیا دن لگے ہیں۔ بد تمیز۔ بدزبان !

ایک ٹھنگنا لڑکا:- چل چل، دھوتی پرشاد۔ ہزاروں برس سے تمیز سکھا رہے ہیں مگر آئی نہیں۔

عرشی:- ارے ارے۔ یہ کیا بکواس ہے۔ ہندو مسلمان کا جھگڑا تو نہ بناؤ اپنے جھگڑے کو۔

نرندر:- آخر آ گئے نا اپنے بھائی کی کمک پر !

عرشی:- نرندر بھائی، میرے تو تم بھی بھائی، دوست اور پڑوسی ہو اور جمال بھی !

لمبا شریر لڑکا:- بھگوان ایسے بھائیوں سے بچائے !

دوسرا ٹھنگنا شریر لڑکا:- خدا تم لوگوں سے محفوظ ہی رکھے۔ !

جمال:- سن رہے ہو نرندر اپنے دوستوں کی باتیں !

نرندر:- میں تو تمھارے دوست کی باتیں بھی سن رہا ہوں !

جمال:- وہ تو کچھ بھی نہیں کہہ رہا ہے۔ یہی زہریلی باتیں کرتا ہے۔

(لمبے لڑکے کی طرف اشارہ کرتا ہے)

لمبا لڑکا:- زرا ہوش میں رہنا ورنہ ہڈیوں کا سُرمہ بنا دوں گا۔ آستین کا سانپ !

ٹھنگنا لڑکا:- تم لوگوں کے دلوں میں زہر بھرا ہے ہمارے خلاف ہم جان بھی وار دیں تو بدگمان ہی رہوگے !

نرندر:- تم تم لوگ بھائی ہو...

اس ملک پہ۔ تم تو دوسرے ملکوں کے وفادار ہو!

نرمل :۔ نرندر سے۔ اس کی صحبت (دبلے لڑکے کی طرف اشارہ کرکے) تمہیں خراب کر رہی ہے۔ ایسی باتیں کہتے شرم نہیں آتی!

لمبا لڑکا :۔ شرم!! سچ کہنے میں کیا شرم۔

ٹھنگنا لڑکا :۔ اس بھروسے میں نہ رہنا کہ ہم دب جائیں گے۔

لمبا لڑکا :۔ تمہیں تو ایسا سبق دیا جائے گا کہ یاد کروگے!

نرمل :۔ تم لوگ فتنہ کی باتیں کر رہے ہو۔ یہ سب ان باتوں میں کیا دھرا ہے

(لمبا اور ٹھنگنا دونوں نرمل کمار کو لپٹ جاتے ہیں اور پھر سب گڈ مڈ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ نرندر اور جمال بھی ایک ایک لڑکے کو لپٹ جاتے ہیں۔ عرشی کبھی اس کو پکڑتا ہے کبھی اس کو۔ اندر سے ایک بڈھے استاد آتے نظر آتے ہیں۔ چند لمحے یہ سب دیکھتے ہیں۔ پھر لاٹھی کھٹکھٹا کر ڈانٹتے ہیں۔ لڑکے الگ ہو جاتے ہیں)

استاد :۔ عرشی کیا بات ہے؟

عرشی :۔ کچھ نہیں سر۔ ویسے ہی کچھ جھگڑا ہو گیا ان لوگوں میں!

استاد :۔ شرم کرو۔ اتنے بڑے بڑے لڑکے لڑتے ہیں۔ جاؤ اپنے اپنے گھر۔ جلد بہت جلد۔ (لڑکے جانے پر تیار ہوتے ہیں۔ استاد پھر اندر چلے جاتے ہیں۔ نرندر، نرمل، عرشی اور جمال ایک سمت روانہ ہوتے ہیں۔ جمال اور نرندر کا منھ پھولا ہے۔)

عرشی :۔ یار، اب ہاتھ ملا لو!

جمال :۔ مجھو نہ اس سے ہاتھ ملاؤں گا میں؟

نرندر :۔ مجھے، میں۔ میں تو کبھی زندگی بھر اس سے بات نہ کروں گا!

نرمل کمار :۔ (ہنس کر) جانے بھی دو۔ کل ہی دونوں گلے میں باہیں ڈالے نظر آئیں گے۔

عرشی :۔ اور کیا۔ سارے محلے میں ان کی دوستی اور محبت کی مثال دی جاتی ہے!

نرندر :۔ آج سے یہ ٹوٹ گئی!

جمال :۔ تو یہاں کون مرا جا رہا ہے۔

(سب نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں پردہ گر جاتا ہے)

دوسرا سین

[ایک چھوٹے سے باغیچہ میں پارٹی کا سامان لگا ہے۔ جیسے ابھی پارٹی ختم ہوئی ہے۔ اب گراموفون پر ریکارڈ لگا کر بجایا جا رہا ہے اور گڑیا، سرندر کور، دو تین اور لڑکیاں، اور عرشی، نرمل، جمال، نرندر اور دو اور لڑکے میوزک چیرز کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ سرسی جی گراموفون پر بیٹھی ہیں۔ جیسے ہی وہ ریکارڈ بند کرتی ہیں لڑکے، لڑکیاں کرسیوں پر بیٹھنے کو بھاگتے ہیں۔ ہر بار ایک لڑکا ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے.... یہاں تک کہ صرف ایک کرسی رہ جاتی ہے اور دو بیٹھنے والے اور یہ دونوں ہیں نرندر اور جمال! ان دونوں کے منھ پھولے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ نہیں رہے ہیں۔ ایک دم موسیقی ختم ہو جاتی ہے اور نرندر جمال کو دھکا دے کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ تالیاں بجتی ہیں۔ جمال غصے میں نرندر کو گھورتا ہے۔ اور پھر تیزی سے اسٹیج سے نکل جاتا ہے۔ سب حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں)

ن :- ارے یہ جمال کہاں گیا!
بالا:- (مسکراکر) خفا ہوگیا۔
ع :- خفا کیوں ہوگیا۔ ہار جانے
سے؟ بڑا احمق ہے!
جی :- نہیں، جمال ایسا نہیں!
جان :- ہار جیت تو کھیل میں ہوتی
ہی ہے۔ کیوں نرندر؟ کیا
بات ہے؟
ندر :- (سر جھکا ہوا) کوئی بات نہیں
چاچا جی!
سی جی :- یہ دونوں لڑ پڑے
ہیں شاید۔
رشی :- (دور سے ادھر آتا ہے) ہاں
ماں جی۔ نرندر اور جمال کی
لڑائی ہوگئی!
ں جی :- اتنی سی بات پر!
رشی :- نہیں ماں جی لڑائی تو پرسوں
سے ہے!
رمل :- ہاں خوب جنگ ہوئی دونوں
میں۔
جان :- (حیران ہوکر) نرندر اور
جمال میں لڑائی؟
ندر :- عرشی۔ بک بک نہ کرو۔
(چلا جاتا ہے)
مل :- ہونہہ! اُس وقت بڑے
سورما بنے تھے۔ خوب مار پٹائی
ہوئی چاچا جی!

ماں جی :- نرندر نے جمال کو مارا؟
کبھی نہیں!
عرشی :- اجی دونوں نے ایک دوسرے
کو مارا۔ بُرا بھلا کہا۔ ملیچھ
اور کافر کہا۔
اباجان :- اُف خدایا۔ یہ میں کیا
سُن رہا ہوں!
نرمل :- چاچا جی۔ دراصل وہ تین
"فسادی" لڑکے ہیں ہمارے
اسکول میں۔ وہ سب کو
لڑاتے رہتے ہیں۔
عرشی :- میں نے اُس لمبو اور ٹھنگنے
کو خوب ٹھونکا ماں جی!
ماں جی :- (دُکھ سے) ہا۔ کتنی بُری
بات۔ بچے یوں آپس میں
لڑیں اور پھر نرندر اور جمال!
ہے بھگوان! (پلّو سے آنکھیں
پونچھتی ہیں)
نرمل :- ارے موسی! آپ بے کار
پریشان ہو رہی ہیں۔ ایک
دو دن میں دونوں مَن جائیں گے
عرشی :- اور کیا۔ ان کی دوستی تو کبھی
ختم نہیں ہوسکتی۔
گڑیا :- بڑے آئے۔ سارا کھیل
ملیامیٹ کردیا!
سرندرکور :- منھ پھولا ہے
دونوں کا!

مینو :- نرندر ٹھیک کہتے ہیں۔ جمال
عرشی خواہ مخواہ اکڑتے ہیں!
سرندر :- دیکھو مینو۔ مجھے یہ باتیں
اچھی نہیں لگتیں!
ماسی جی :- مینو۔ جھگڑا کرانے میں
تمھارا ہاتھ ضرور ہوگا!
اباجان :- افسوس ہمارے بچے فسادی
قسم کے لوگوں کا اثر قبول کر رہے
ہیں!
ماں جی :- اسکول میں جانے کیا سیکھ کر
آتے ہیں!
نرمل :- ہمارے ہاں کئی جھگڑا کرنے
والے استاد ہیں ماں جی!
اباجان :- میں جمال کی آج اچھی
طرح خبر لوں گا۔
ماسی جی :- نہیں بھائی صاحب بچوں
کو آپس ہی میں نپٹنے دیجیے۔
عرشی :- نرندر اور جمال تو ایک دوسرے
کی جان ہیں!
گڑیا :- بڑے آئے جان بن کے۔ ساری
پارٹی خراب کردی۔
(دور سے بندر والے کی ڈگڈگی
سنائی دیتی ہے)
گڑیا :- بندر والا۔ بندر والا۔ نرمل
بھیا بلا لاؤ۔
سرندرکور :- آؤ گڑیا۔ دروازے پر
چلیں (ڈگڈگی کی آواز قریب

[illegible] اچھا

ما:- وہ تو چلا آرہا ہے یہیں!

ماں جی! بندر کا تماشا دیکھ لیں!

جان:- (مسکرا کر) تم سب تو خود بلا رہے ہو!

(بندر والا آکر بیچ میں بیٹھ جاتا ہے۔ بچے گھیرا ڈال لیتے ہیں۔ بڑے دور بیٹھے مسکرا رہے ہیں۔ ڈگڈگی کی آواز تیز ہو جاتی ہے۔ بندریا ناچ شروع کرتی ہے۔ اسٹیج کے ایک کونے کے دروازے سے نریندر جھانکتا ہے ... اسی وقت دوسری طرف سے جان جھانکتا ہے۔ نریندر تماشا دیکھتے ہیں، پھر نظریں اُٹھتی ہیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ جان منہ بنا کر غائب ہو جاتا ہے۔ نریندر بھی غصے میں پیر پٹختا چلا جاتا ہے ... ڈگڈگی کی آواز تیز ہو جاتی ہے) پردہ

تیسرا سین

(شام کا وقت ہے۔ اسپتال کا ایک چھوٹا سا کمرہ۔ ایک بیڈ، بستر خالی ہے۔ ایک پر کوئی بوڑھا مریض ہے جس کے پلنگ کا ایک حصہ پردے سے ڈھکا ہے۔ [illegible] ہے۔ نریندر لیٹا ہے۔ برابر ایک اسٹول پر ماں جی بیٹھی ہیں جن کے چہرے سے پریشانی برس رہی ہے۔ نوجوان نرس نریندر کی نبض دیکھ رہی ہے۔ ڈاکٹر جو ایک بڑی عمر اور مہربان چہرے والا ہے، اندر آتا ہے۔ ماں جی پر ایک نظر ڈالتا ہے۔ نریندر کے پاس جا کر اُس کا معائنہ کرتا ہے۔ نرس سے آہستہ سے کچھ کہتا ہے۔ نرس گردن ہلاتی ہے۔ پھر ماں جی کی طرف مڑتا ہے!)

ڈاکٹر:- بہن جی! گھبراؤ نہیں۔ لڑکا دو چار دن میں ٹھیک ہو جائے گا

ماں جی:- ڈاکٹر جی، میرے بچے کو اچھا کر دو۔ میں جیون (زندگی) بھر ابھاری (احسان مند) رہوں گی!

ڈاکٹر:- (انگلی اوپر اُٹھاتا ہے) بہن جی! اچھا تو وہ کرتا ہے۔ آپ دعا کیجئے۔ ہم دوا کر رہے ہیں۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں!

ماں جی:- ڈاکٹر صاحب ۔ ....

(آواز بھرا جاتی ہے)

ڈاکٹر:- رات کو بہن جی آپ نہیں [illegible] بھیجے گا۔

ماں جی:- ڈاکٹر صاحب۔ میرے گھر میں کوئی اور مرد نہیں ہے۔

نرس:- خیر ماں جی۔ ہم تو ہیں مریض کے پاس!

ماں جی:- نہیں ڈاکٹر مجھے رات کو اسی کے پاس رہنے کی اجازت دے دو۔

ڈاکٹر:- خیر۔ دیکھیں گے۔

(جاتا ہے)

نرس:- ماں جی۔ تم اسی خالی بیڈ پر لیٹ جاؤ۔ تھک گیا ہے تم!

ماں جی:- بیٹی۔ جیوا ہی پریشان ہے۔ نہ نیند آتی ہے نہ لیٹا جاتا ہے!

نرس:- مریض کو دودھ پلا دینا۔ ماں۔ اور یہ دوا بھی۔ (ایک گولی دیتی ہے) ہم پھر آئے گا!

نریندر:- (آنکھ کھولتا ہے۔ آواز بہت کمزور ہے) ماں!

ماں:- (پاس جا کر) ماں صدقے بیٹا۔ جی کیسا ہے؟

نریندر:- ماں، مجھے کیا ہوا ہے؟

ماں:- تو گر پڑا تھا بیٹا۔ بے ہوش ہو گیا۔ بخار بھی چڑھ آیا تھا۔ ڈاکٹر کہتا ہے کوئی فکر کی بات نہیں!

1

۔ ماں۔ مجھے دیکھنے کون
ئی آیا......
بھی آئے بیٹا۔ تیرے سب
ست۔ سب پڑوسی۔!
ر:۔ اور جمال۔
۔ جمال کا شاید جی اچھا نہیں
۔ نہیں وہ مجھ سے روٹھا
ہے ماں!
۔ اُس کے ابا جان آئے تھے۔
بہت دیر بیٹھے دعا پڑھتے
رہے تجھ پر!
ر:۔ ماں۔ جمال کو بُلا دو۔
۔ اچھا بیٹا بلا دوں گی۔ اب
تو یہ دوا دو چمچ پی لے (قطرہ اس
میں سے انڈیل کر اُس کے ہونٹوں
سے لگاتی ہیں)
ر:۔ اچھا ماں۔ مگر تم جمال کو
بُلاؤ گی نا۔
:۔ بیٹا۔ میں نے تو پہلے ہی عرشی
کو اُسے دیکھنے بھیجا ہے۔ وہ
ضرور آئے گا تجھے دیکھنے کے لئے!
رر:۔ (خوش ہو کر) سچ ماں!
:۔ ہاں ہاں۔ مجھے وشواش ہے
وہ ضرور آئے گا۔ وہ تجھ سے
پریم کرتا ہے (عرشی اکیلا اندر
آتا ہے)
نرندر:۔ عرشی۔ عرشی بھیا....

(آواز بھرا جاتی ہے) عرشی پاس
آ کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے
اور جھک کے پیار سے کہتا ہے)
"نرندر کیسے ہو؟
نرندر:۔ اچھا ہوں عرشی۔ تم اکیلے
کیوں آئے بھیا! (عرشی چپ
رہتا ہے)
ماں جی:۔ بیٹا جمال کیسا ہے؟ وہ
کیوں نہیں آیا؟
عرشی:۔ ماں جی۔ وہ۔ وہ۔
اچھا نہیں ہے (ہکلا جاتا ہے)
ماں جی:۔ کیا ہوا ہے اُسے؟
نرندر:۔ یہ غلط کہہ رہے ہیں ماں۔
جمال اچھا ہے مگر آیا نہیں۔
عرشی:۔ ہاں ماں جی۔ وہ نرندر
سے خفا ہے نا!
نرندر:۔ میں کب اُس کی صورت
دیکھنا چاہتا ہوں! نہ آئے۔
بالکل نہ آئے۔ کبھی نہ آئے۔
عرشی:۔ نرندر۔ تم اتنے غصے میں نہ
آؤ۔ لو سو جاؤ اب!
نرندر:۔ سو جاؤں گا۔ (اور کیا اُسے
یاد کر کے روؤں گا (منہ پھیر
لیتا ہے)
عرشی:۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں
بھیا۔ لو تم یہ دوا کھا لو۔
(زبردستی اُسے ایک دوا کھلاتا ہے

(تھوڑا بستر آہستہ آہستہ ...)
نرندر کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔
عرشی آہستہ سے اُٹھ کر ماں کے پاس
آتا ہے اور دھیرے سے کہتا ہے)
عرشی:۔ ماں۔ میں اب جا رہا ہوں۔
رات کو سونے کے لئے آ جاؤں گا۔
ماں:۔ نہیں بیٹا۔ ڈاکٹر نے مجھے
یہاں رہنے کی اجازت دے
دی ہے!
عرشی:۔ ماں جی۔ آپ دو رات سے
نہیں سوئیں!
ماں:۔ میں یہیں سو جاؤں گی بیٹا
عرشی:۔ نہیں ماں میں اپنا بستر لے کر
ابھی آتا ہوں۔ (چلا جاتا ہے
ماں مالا پھیرتی ہے۔ چند منٹ بعد
نرندر آنکھ کھولتا ہے) ماں۔
ماں:۔ (لپک کر پاس جاتی ہے) ہاں بیٹا
نرندر:۔ کون تھا ماں؟
ماں:۔ کوئی بھی تو نہیں میرے بچے!
نرندر:۔ ماں۔ اگر جمال آئے تو اُسے
اُسے کمرے میں گھسنے نہ دینا
ماں:۔ کیوں بیٹے۔ وہ تیرا دوست
ہے!
نرندر:۔ میرا کوئی دوست نہیں
کوئی یار نہیں۔ جمال میرا کو
نہیں ... ہے
نہیں ... میرا کوئی

(نرس اندر آتی ہے)

نرس :- ہا- ہا- تم کیوں چیختا ہے مسٹر!

ماں :- دیکھو بیٹی - اِس کا بخار تیز ہوگیا۔

نرس :- ماں- تم اِدھر آجاؤ- ہم ان کو انجکشن دے گا۔ پھر یہ آرام سے سو جائے گا۔ اوہ! کتنا اندھیرا ہے۔ (بتی جلاتی ہے)

نرندر :- میں انجکشن نہیں لوں گا۔ میں اچھا نہیں ہونا چاہتا۔

نرس :- dont be silly - لاؤ اپنا بازو۔ (نرندر غصے میں کروٹ لیتا ہے۔ نرس اُس کا بازو پکڑ کر انجکشن لگاتی ہے۔ تکیے ٹھیک کرتی ہے اور دوسرے مریض کی طرف پردے کی اوٹ میں چلی جاتی ہے)

نرندر :- اُدھر کون ہے ماں!

ماں :- ایک بے چارے بوڑھے آدمی ہیں۔ بہت بیمار ہیں مگر دیکھو کس قدر چپ رہتے ہیں اور ایک تم ہو- چیخ رہے ہو- بے کار بے کار....

نرندر :- اب کچھ نہ کہوں گا ماں-

(نرس چلی جاتی ہے۔ ماں چپکے چپکے کچھ پڑھتی ہے۔ نرندر سو جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ جمال اندر آتا ہے چہرہ پریشان، بال بکھرے- ماں کو ہاتھ سے سلام کرتا ہے- بیڈ کے پاس جاتا ہے- نرندر کو ذرا دیر دیکھتا رہتا ہے.... پھر اشارے سے ماں جی کو کھڑکی کے پاس بُلا کر لے جاتا ہے)

ماں جی :- (اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہیں) تو آ گیا میرے بچے- نرندر تجھے یاد کر کے رو رہا تھا!

جمال :- ہاں ماں جی - میں آ گیا۔

ماں :- اب تو وہ سو رہا ہے - اب تو سویرے آئیو بیٹا

جمال :- نہیں ماں - میں رات کو یہاں رہوں گا -

ماں :- رات کو میں تو رہوں گی بیٹا!

جمال :- نہیں ماں - آپ تھک گئی ہیں- عرشی باہر کھڑا ہے- آپ اُس کے ساتھ گھر چلی جایئے ماں -

ماں :- مگر.....

جمال :- ماں میں رات بھر پلک نہیں جھپکاؤں گا- کیا آپ کو مجھ پر وشواش نہیں!

ماں :- تو ابھی بچہ ہے- کیسے مریض کی دیکھ بھال کرے گا-

جمال :- (ایڑیوں کے بل کھڑا ہو کر) میں بچہ ہوں ماں - آپ سے کتنا بڑا ہوں ؟ پورا مرد ہوں میں تو -

ماں :- (مسکرا کر) - ہونھ- بڑا مرد - !

جمال :- ماں جی - اگلے سال تو میں فوج میں چلا جاؤں گا!

ماں جی :- ہائے یہ کیا کہہ رہا ہے بیٹے- تُو تو اپنے باپ کا سہارا ہے- اکلوتا بیٹا-

جمال :- ماں - اپنے دیش کی رکھشا (خدمت) کرنا ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے نا! ابا جان تو خود مجھے سپاہی بنانا چاہتے ہیں- دیش کا جان نثار سپاہی! اور نرندر بھی تو فوج میں جائے گا- ماں!

ماں جی :- ہائے بھگوان- (مسکرا کر) بھگوان اُسے اچھا تو کر دے!

جمال :- وہ تو اچھے ہیں ماں جی - اب آپ جایئے!

ماں جی :- تو تھک جائے گا!

جمال :- نہیں ماں جی - میں تگڑا جوان ہوں تھکوں گا نہیں- (مُسکراتا ہے)

ماں جی :- تو کتنا اچھا ہے میرے بچے!

جمال :- نرندر سے پوچھئے، میں کتنا بُرا ہوں!

ماں جی :- نہیں بیٹے وہ تو تجھے بہت چاہتا ہے!

۔ اب چلیے ماں جی ۔ (دونوں
باہر جاتے ہیں۔ منٹ بھر بعد جمال
واپس آتا ہے۔ نرندر کا تکیہ وغیرہ
درست کرتا ہے۔ روشنی دھیمی کرتا
ہے اور خود اسٹول پر بیٹھ جاتا ہے۔
(پردہ گر جاتا ہے)

چوتھا سین

(وہی کمرہ۔ صبح کی ہلکی ہلکی روشنی
کھڑکی میں سے نرندر کے چہرے پر
پڑ رہی ہے! جمال اسٹول پر بیٹھا
ہے اور اُس کا سر نرندر کے پاؤں
کے قریب بیڈ پر اوندھا ہے۔
اور بے خبر سو رہا ہے۔ نرندر کی
آنکھ کھلتی ہے۔ چاروں طرف
دیکھتا ہے]

[نرن]در :۔ ماں ۔ ماں جی ۔ (جمال
چونک پڑتا ہے)

[جما]ل :۔ تم جاگ گئے نرندر؟ (نرندر
اُسے دیکھتا ہے اور حیران رہ جاتا
ہے)

[نرس]ں :۔ نرندر... کیسے ہو؟

[نر]ندر :۔ تمھیں کیا ۔ ماں کہاں
ہیں؟

جمال :۔ ماں جی سو رہی ہیں ۔ لو
تم (تھرماس میں سے دودھ
پیالی میں اُنڈیلتا ہے) لو۔ دودھ
پی لو۔ نہیں پہلے گلی کرلو (فن
دگلاس اٹھاتا ہے) بیڈ کے
پیچھے سے چلمچی نکال کر نرندر کو
گلی کراتا ہے۔ پھر دودھ کی پیالی
مُنھ سے لگا دیتا ہے) بس نخرے
نہ کرو۔ دودھ پی لو۔

(نرندر چپ چاپ دودھ پی لیتا ہے
اور حیران حیران اُسے دیکھتا ہے۔
جمال چلمچی اور پاٹ باتھ روم میں لے
جاتا ہے۔ نرس اندر آتی ہے)

نرس :۔ وَل مسٹر اب آپ کیسا ہے؟

نرندر :۔ سسٹر۔ اب تو میں بہت بہتر
ہوں۔

(نرس نبض دیکھتی ہے، تھرما میٹر
لگاتی ہے۔ چارٹ میں بھرتی ہے
جمال پاٹ اور چلمچی صاف کرکے لاکر
رکھتا ہے اور نرس کو سلام کرتا ہے)

نرس :۔ گڈ مارننگ! وِل نرندر ۔
آپ کا Brother بڑا اچھا
ہے۔ رات بھر نہیں سویا۔

جمال :۔ (ہنس کر) میرا بھائی تو کہتا ہے
میں بہت بُرا ہوں۔

نرس :۔ نائیں، نائیں۔ یو آر ویری
گڈ بوائے اینڈ ویری گڈ
نرس (ہنستی ہے) (نرندر سے)
یہ تمہارا … برادر ہے؟

نرندر :۔ بالکل ریل۔ سگا بھائی!

نرس :۔ گڈ ۔ یو آر لکی
(نرندر ہاتھ بڑھاتا ہے۔ جمال
تھم لیتا ہے۔ نرندر دھاڑ کر
اپنے بازو اس کے گلے میں ڈال دیتا ہے
دونوں رونے لگتے ہیں)

نرس :۔ نائیں نائیں۔ رونا کا ہے کو
مانگتا۔ اب تم اچھا ہے۔

(ماں جی، موسی جی، بچی، نرندر کی ..
وشی اور ابا جان اندر آتے ہیں)

نرس :۔ اوہ! اتنا آدمی نہیں!

موسی جی :۔ بس دو منٹ سسٹر، پھر چلے
جائیں گے!

نرس :۔ آل رائٹ۔ دو منٹ سے زیادہ
نہیں (چلی جاتی ہے)

ماں جی :۔ کیسا ہے نرندر بیٹے جمال پھر
نرندر کو پیار کرتی ہے اکیسا جی ہے؟

نرندر :۔ بالکل اچھا ہوں ماں۔

عرشی :۔ ہاں اب دونوں بیٹے جو مل گئے!

نرندر :۔ ماں۔ میرا بھائی مجھ سے روٹھ گیا
تھا میں بیمار ہو گیا۔ اب اچھا
ہو جاؤں گا (سب بچے تالیاں
بجاتے ہیں)

ابا جان :۔ ہاں ہاں ۔ شور نہیں۔
(مسکراتے ہیں)

بچی :۔ یہ دونوں مجھ سے لڑا کا ہیں
ابا جان!

(دیکھیے صفحہ ...)

ثمر بارانوی

نیا سال

ہنسو مسکراؤ، نیا سال آیا
نئے گیت گاؤ، نیا سال آیا

گلوں پر جوانی کا عالم ہے طاری — ہر اک سمت رقصاں ہے بادِ بہاری
خزاں کی حکومت چمن سے سدھاری — ہوا اب بہاروں کا فرمان جاری

ہنسو مسکراؤ، نیا سال آیا
نئے گیت گاؤ، نیا سال آیا

بڑی پُر فضا اس وطن کی زمیں ہے — وطن یہ ہمارا بڑا دل نشیں ہے
کوئی دوسرا اس سے بڑھ کر نہیں ہے — بتاؤ تو ایسا ہمارے کہیں ہے

ہنسو مسکراؤ، نیا سال آیا
نئے گیت گاؤ، نیا سال آیا

اُٹھو اُٹھ کے اُلفت کا پیغام دے دو — سبھی کو اُخوّت کا پیغام دے دو
غریبوں کو راحت کا پیغام دے دو — مریضوں کو صحت کا پیغام دے دو

ہنسو مسکراؤ، نیا سال آیا
نئے گیت گاؤ، نیا سال آیا

وطن اب ہمارا ہے آزادِ کامل — ہمیں ہر طرح کی مسرّت ہے حاصل
خدا کا کرم ہے بہر حال شامل — نظر آ رہی ہے ہمیں اپنی منزل

ہنسو مسکراؤ، نیا سال آیا
نئے گیت گاؤ، نیا سال آیا

فلک پر سے لاؤ ستارے سجا دو — زمینِ وطن کو دلہن اب بنا دو
مسرت کے پھولوں سے گلشن سجا دو — نئے جشنِ بہاراں کو قریہ صلا دو

ہنسو مسکراؤ، نیا سال آیا
نئے گیت گاؤ، نیا سال آیا

جناب اظہر افسر

مچھلی کا شکار (ڈراما)

قدیر
نجمہ
لڑکی (جل پری)
بوڑھا

[ایک خوب صورت سے مکان کا پچھلا حصّہ، قدیر سیٹی بجاتا ہوا ڈور اور بنسی ٹھیک کر رہا ہے]

نجمہ :۔ (دائیں جانب سے آتی ہے) "یہ کیا کر رہے ہو قدیر، یہ ڈور یہ بنسی، اس کا کیا بنے گا؟

قدیر :۔ بنے گا یہ کہ آج مچھلی کا شکار ہوگا۔ ذرا ہٹو تو میں ڈور لپیٹ لوں۔۔۔ چلوگی؟

نجمہ :۔ نا بابا میں نہیں چلتی تمہارے ساتھ۔ کہیں پاؤں واؤں پھسل گیا تو غڑاپ سے اندر!

قدیر :۔ غڑاپ سے اندر ہو جاؤ گی! (ہنستا ہے) اور میں کس لیے ہوں؟

نجمہ :۔ تم کیا کرو گے؟

قدیر :۔ پہلے تو تم پھسلو گی نہیں۔ اور اگر ایسا ہو بھی جائے تو کیا مجھے تیرنا نہیں آتا؟ دو ہی ہاتھ میں تمہیں پانی سے باہر نکال لاؤں گا۔

نجمہ :۔ جی ہاں، بس رہنے دو۔ اپنے آپ کو بڑا بانکا تیرنے والا سمجھ رکھا ہے، ہونہہ!

قدیر :۔ یہی باتیں تو تمہاری بُری لگتی ہیں۔ ہٹو راستہ چھوڑ دو۔

نجمہ :۔ اچھا ان آٹے کی گولیوں کا کیا ہوگا؟

قدیر :۔ ہوگا کچھ! تم میرے ساتھ چلنے سے تو رہیں۔

نجمہ :۔ تم یہ بتا دو کہ ان آٹے کی گولیوں کا کیا ہوگا تو میں ضرور چلوں گی۔ ضرور چلوں گی، ضرور چلوں گی!۔۔۔

قدیر :۔ بس، بس، بس۔ دیکھو ان آٹے کی گولیوں کو لگائیں گے اس کانٹے پر، یہ، جس سے مچھلی پکڑتے ہیں۔ اسے کُل بھی کہتے ہیں۔ پھر اس کانٹے کو پھینکیں گے تالاب میں۔ ذرا سی دیر میں تو دا غڑاپ غڑاپ اندر ہونے لگے گا۔ جھٹکا دیا۔ بنسی کھینچی کہ یہ رہی مچھلی۔ چلو نجمہ بڑا مزا رہے گا۔

نجمہ :۔ اکیلے ہم تم؟

قدیر :۔ اور کیا۔

نجمہ :۔ اکیلے، ڈر لگتا ہے قدو!

قدیر :۔ ہونہہ، ڈر کاہے کا۔ میں کئی بار اکیلا تالاب پر جا چکا ہوں۔۔۔ پرسوں ہی میں اور کندن تالاب پر گھومنے گئے تھے، بڑا مزا رہا۔ مچھلیاں بھی تو پکڑیں ہم نے

نجمہ :۔ مگر تم گھر تو کچھ بھی نہیں لائے۔

قدیر :۔ کندن کی ہنسی ہنسی میں سب چھوٹ گئیں، نجمہ! بڑی موٹی موٹی مچھلیاں پھنسی تھیں، اچھا اب دیر کیوں کر رہی ہو، چلتی ہو تو چلو۔۔۔ چلتی ہو یا میں جاؤں؟

نجمہ :۔ چلتی ہوں، چلتی ہوں بابا! ذرا اپنے جوتے کا بٹن تو لگا لوں،

قدیر :۔ آؤ اِدھر سے نکل چلیں۔

اس طرف تالاب پیچھے ہیں۔ ذرا دبے دبے پاؤں رکھو، کبھی تمہارا جوتا تو بہت آواز کرتا ہے۔

نجمہ:۔ اچھا اچھا۔ یہ تو بتاؤ کس طرف سے چلوگے، سڑک سے تو تالاب میل بھر پڑ جائے گا۔

قدیر:۔ سڑک سے نہیں، اِدھر سے چلیں گے، جھاڑیوں کی طرف سے، پاس ہی نکل جائیں گے۔

نجمہ:۔ قدو!

قدیر:۔ ہاں،

نجمہ:۔ ماسٹر جی کا دیا ہوا کام کر لیا تم نے؟

قدیر:۔ بھئی اس وقت پڑھائی وڑھائی کی باتیں چھیڑ کر موڈ نہ بگاڑو، کچھ اور مزے کی باتیں کرو۔

نجمہ:۔ اچھا جانے دو، اس تھیلی میں کیا ہے؟

قدیر:۔ ذرا گھر سے دور ہو جائیں تب بتاؤں گا۔

نجمہ:۔ اوہو اب جیسے تمہاری باتیں گھر تک سنائی دیں گی، بولو نا کیا ہیں؟

قدیر:۔ پوڑیاں ہیں۔ میٹھی پوڑیاں،

نجمہ:۔ اچھا!

قدیر:۔ تالاب پر جب تھیلی خالی ہو جائے گی تو اس میں مچھلیاں بھر لیں گے۔ ارے نجمہ! بھول ہو گئی!

نجمہ:۔ کیسی بھول؟

قدیر:۔ تم نے بھی یاد نہ دلایا، تمہارے لیے بھی، ایک ٹہنی کا کانٹا لے لیتے،

نجمہ:۔ اونہہ، رہنے دو، تم مچھلیاں پکڑو یا میں ایک ہی بات ہے۔

قدیر:۔ لو ذرا تھیلی سنبھالو، کانٹا کپڑوں سے الجھ رہا ہے،

نجمہ:۔ ٹہنی سے کانٹا تم نے ڈور کے ساتھ کیوں باندھ لیا؟ تالاب پر چل کر باندھتے۔

قدیر:۔ اوہو، تو اب تالاب کتنی دور ہے۔ یہ رہا۔ دیکھا، کیسا پانی چمک رہا ہے۔

منظر ۲

(تالاب کا کنارہ، بائیں جانب ایک گھنا درخت ہے اور پانی تک اونچے نیچے پتھر پڑے ہیں)

نجمہ:۔ پانی سچ مچ کیسا چمک رہا ہے۔ مگر قدو،

قدیر:۔ ہاں،

نجمہ:۔ ہم دونوں تالاب پر تو چلے آئے ہیں۔ اگر ہمارے پیچھے ہماری ڈھونڈ ہوئی تو؟

قدیر:۔ تو کیا، کہہ دیں گے، یوں ہی گھومنے گئے تھے اِدھر اُدھر۔ دیکھا، کیسی سہانی جگہ ہے۔ لو بس یہیں بیٹھتے ہیں۔

نجمہ:۔ یہاں نہیں، آگے چلو آگے۔

قدیر:۔ کیوں؟

نجمہ:۔ دیکھتے نہیں، اتنا بڑا بورڈ لگا ہے (پڑھتی ہے) یہاں مچھلیاں پکڑنا منع ہے۔

قدیر:۔ (دُہراتا ہے) یہاں مچھلیاں پکڑنا منع ہے۔ بیٹھو جی بیٹھو، ایسے تو بیسیوں بورڈ لگے رہتے ہیں۔ ان کی کون سنتا ہے۔ بیٹھو، بیٹھو، لو میں نے تمہارے لیے پتھر بھی صاف کر دیا۔

نجمہ:۔ یہیں بیٹھیں گے؟

قدیر:۔ ہاں ہاں، یہیں بیٹھیں گے۔ لو ذرا تھیلی سنبھالو۔

نجمہ:۔ بڑی سونی سی جگہ ہے۔ کوئی آدمی نظر ہی نہیں آتا۔

قدیر:۔ کون آئے گا یہاں تالاب پر، سب اپنے اپنے گھروں میں گھسے پڑے ہیں۔

نجمہ:۔ کیا کر رہے ہو؟

قدیر:۔ ذرا ڈور پانی میں پھینکنے کی تیاری کر رہا ہوں۔ ہٹنا تو۔

۔ہاتھ دُور سے لے کر پھینکتا دُور۔
ہاں! ایسے،
(قدیر پانی میں ڈور پھینکتا ہے)
۔ لو بھئی ڈور تو پڑ گئی۔ اب
دیکھو مچھلی کب آتی ہے۔ نجمہ۔
۔ ہاں
۔ جانے مچھلی کب آئے گی، آؤ
تب تک کچھ کھائیں، ہونہہ تھیلی
میں سے پوڑیاں تو نکالو،
۔ (گنتی ہے) ایک، دو، تین،
ایک دو تین، پوری چھ ہیں۔
تین تمہاری، تین میری۔
۔ (کھاتے ہوئے)۔ آپا جان بھی
کیا بناتی ہیں پوڑیاں کہ پوچھو
نہیں، آہا۔ (چٹخارہ لیتا ہے)
۔ سچ مچ بہت مزیدار ہیں (چٹخارہ
لیتی ہے) ذرا پانی پی لوں!
۔ سنبھل کے، کہیں گھر والی بات
نہ ہو جائے کہ پاؤں پھسلا اور
غڑاپ سے اندر!
۔ (سر ٹکا کر ہنستی ہے)، اونہوں،
تم ہو نا۔ (لمبے لمبے گھونٹوں
سے پانی پیتی ہے) بس بابا!
میرا تو پیٹ بھر گیا۔ دیکھنا قدو،
کیسا دکھائی دے رہا ہے دُور
تک پانی ہی پانی، ادھر پہاڑی
اُس طرف ہرے ہرے درخت،

آہا ہا ہا
قدیر :۔ نجمہ! ابھی تک کچھ نہیں ہلا۔
نجمہ :۔ ہلے گا، کیا جلدی ہے؟ مجھے
تو نیند آ رہی ہے، میں لیٹتی
ہوں۔
قدیر :۔ نیند تو مجھے بھی آ رہی ہے۔
پاؤں اُدھر لمبے کرو نجمہ
اُدھر، اتنی جگہ پڑی ہے اُدھر،
نجمہ :۔ اچھا اچھا چھوؤ نہیں،
قدیر :۔ بورڈ سے ٹیک لگا کر میں نے
بھی اپنے پاؤں پھیلا دئے
ہیں۔ (انگڑائی لیتا ہے) آ ہا ہا ہا۔
نجمہ :۔ کہیں گر نہ پڑو قدو۔
قدیر :۔ میں کہتا ہوں کہیں تم ہی نہ
لڑھک جاؤ۔ میرے پاس
تو بہت جگہ ہے۔ خوب لوٹ
لگا سکتا ہوں۔
(بجلی کی سرخ بتیاں غروب
ہوتی ہیں۔ پل بھر کے لئے روشنی
بجھ کر پھر آ جاتی ہے۔ اب بھی نجمہ
اور قدیر پاس پاس لیٹے ہوئے
ہیں)
قدیر :۔ (کروٹ لیتا ہے) اہا ہا ہا، کیسی
ٹھنڈی ہوا ہے۔
نجمہ :۔ قدو قدو دیکھو ڈور، اندر
ہو رہا ہے۔
قدیر :۔ (اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے) کھینچ لوں؟

نجمہ :۔ ابھی نہیں نجمہ اور قدیر ہنستے ہ
قدیر :۔ کچھ تو پھنس گئی ہے نجمہ!
نجمہ :۔ تو کھینچو پھر۔ (اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے)
قدیر :۔ بہت بھاری ہے نجمہ، ذرا تم بھی
زور لگاؤ
نجمہ :۔ آہستہ آہستہ، یہ کیا ہے قدو۔
بال؟ (چیخ مارتی ہے)
قدیر :۔ یہ تو کسی لڑکی کا سر ہے، دیکھو
دیکھو، کتنی خوب صورت ہے۔
نجمہ :۔ تمہارا کانٹا اُس کے سنہری بالوں
میں بری طرح اُلجھ گیا ہے قدو!
اونہوں، کھینچو مت۔
قدیر :۔ واہ، کھینچوں نہیں تو وہ اوپر
کیسے آئے گی۔
نجمہ :۔ چھوڑ دو قدو، اِسے اُوپر لا کر
کیا کریں گے ہم۔
قدیر :۔ تم تو کچھ سمجھتی ہی نہیں ہو،
یہ جل پری ہے جل پری۔
نجمہ :۔ جل پری؟
قدیر :۔ ہاں کھینچو کھینچو، گھر لے
جائیں گے اِسے۔
نجمہ :۔ نہیں قدو، مجھ سے نہیں کھینچا
جاتا، اِس کا چہرہ دیکھو، کتنی
تکلیف ہو رہی ہے اُسے،
قدیر :۔ تکلیف تو مجھے کھینچنے میں ہوتی ہے،
مگر نجمہ! یہ تو ..... ا
ہوتی جا رہی ہے۔ وہ آ

جا رہی ہے [illegible]

قدیر:۔ اپنے ساتھ کشتی لیے جا رہی ہے
نجمہ! اب کیا ہوگا؟

نجمہ:۔ قدرو، کشتی چھوڑ دو ہاتھ سے۔ نہیں تو تم بھی تالاب میں گر جاؤ گے بھیا قدرو، قدرو!

قدیر:۔ نجمہ، نجمہ، نجو۔ میں گرا۔
(قدیر چیختا ہے)

نجمہ:۔ قدرو۔ قدرو۔ (رونے لگتی ہے)

(آہستہ آہستہ اندھیرا ہو جاتا ہے اور پھر روشنی ہوتی ہے تو پانی کے اندر بائیں جانب ایک پتھر کا گھر بنا ہوا ہے۔)

(دائیں جانب سے ایک خوب صورت لڑکی جو جل پریوں کی طرح چل رہی ہے۔ قدیر کا ہاتھ پکڑ کر داخل ہوتی ہے)

قدیر:۔ تم۔ تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو اچھی لڑکی مجھے چھوڑ دو، میں ڈوب جاؤں گا۔

جل پری (لڑکی) تم ڈوب چکے ہو اب اور کیا ڈوبو گے،

قدیر:۔ میں ڈوب چکا ہوں (چیخنے لگتا ہے) نجو۔ نجمہ۔ ابا جی۔ آپا!

لڑکی:۔ تمہاری آواز کوئی نہیں سن سکتا۔ تم تالاب کی تہہ میں ہو۔

قدیر:۔ مجھے چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔

(پتھر کے گھر میں سے ایک بوڑھا شخص نکلتا ہے)

بوڑھا:۔ یہ کیسی آوازیں ہیں؟ کون شور کر رہا ہے؟

قدیر:۔ چھوڑ دو مجھے، مجھے چھوڑ دو۔ مجھے کنارے پر پہنچا دو۔ مجھے تالاب سے باہر کر دو۔ خدا کے لیے چھوڑ دو۔

بوڑھا:۔ تم کون ہو لڑکے؟

قدیر:۔ میں تالاب پر مچھلی پکڑنے آیا تھا۔

بوڑھا:۔ مچھلی پکڑنے۔ ہوں تمہیں وہ بورڈ دکھائی نہیں دیا!

قدیر:۔ کون سا بورڈ؟

بوڑھا:۔ وہی جس پر خوب موٹے موٹے حرفوں میں لکھا ہے "یہاں مچھلیاں پکڑنا منع ہے"

قدیر:۔ ہاں میں نے۔ میں نے۔۔

بوڑھا:۔ میں جانتا ہوں، تم نے اس بورڈ کو پڑھ کر کیا کہا تھا "ہنہ ایسے بیسیوں بورڈ لگے رہتے ہیں۔ ان کی کون سنتا ہے۔"

قدیر:۔ ہاں ہاں میں نے کہا تھا مگر تم نے یہ کیسے سن لیا، تم کون ہو؟

بوڑھا:۔ میں اس لڑکی کا باپ ہوں جس کو تم اپنے کانٹے میں الجھا کر باہر نکال لینا چاہتے تھے۔ میں اس پانی کی دنیا کا راجہ ہوں۔ اور اب تم میرے پاس ہو۔ میں تمہاری باتیں جانتا ہوں۔

قدیر:۔ میں۔ مجھ سے بڑی بھول ہوئی ہے۔

بوڑھا:۔ تمہاری بہن کہاں ہے؟

قدیر:۔ وہ کنارے پر بیٹھی رو رہی ہے!

بوڑھا:۔ جاؤ بیٹی اسے لے آؤ۔

قدیر:۔ کیا تم اسے بھی ڈبو دو گے؟

بوڑھا:۔ مچھلیاں پکڑنے میں وہ بھی تمہاری ساتھی ہے، اسے بھی سزا ملنی چاہیے۔

قدیر:۔ نہیں نہیں، قصور میرا ہے۔ میں نے ہی اسے تالاب پر چلنے کو کہا تھا۔

بوڑھا:۔ تمہارے خلاف اور بہت سی باتیں ہیں۔ تم نے پرسوں تالاب پر آ کر مینڈکوں پر پتھر پھینکے، دو مینڈک ابھی تک گھائل ہیں، ان کے اچھے ہونے کی کوئی امید نہیں۔

(جل پری دائیں جانب سے نجمہ کو لے کر آتی ہے۔ نجمہ اوپر نیچے دیکھ رہی ہے)

جل پری:۔ یہی وہ لڑکی ہے پتا جی، جو اس لڑکے کے ساتھ تالاب پر

آئی ہے۔

نجمہ:۔ قدّو۔ قدیر۔ قدّو!

قدیر:۔ نجّو۔ نجمہ!

جل پری:۔ اے لڑکی، دور کھڑی رہ، اس سے نہ چمٹ۔

نجمہ:۔ تم کون ہو؟ چھوڑ دو قدیر کو، میرے قدّو نے کیا کیا ہے اُسے کیوں باندھ دیا ہے تم نے؟

جل پری:۔ تمھارے قدیر نے ایک دو باتیں نہیں کی ہیں کتنی سن سکو گی، تمھارا قدیر اکیلا تالاب پر مارا مارا پھرتا ہے، تمھارا قدیر مچھلیاں پکڑتا ہے اور پھر اسی جگہ جہاں مچھلیاں پکڑنا منع ہے۔ تمھارا قدیر ایک ضدّی لڑکا ہے۔

نجمہ:۔ قدیر میرا بھائی۔۔۔

جل پری:۔ تمھارا بھائی ظالم ہے، میرے بالوں میں جب کانٹا اُلجھا تو اس نے مجھے اُوپر کھینچنے کی کوشش کی۔ تم بھی دیکھ رہی تھیں۔ تمھیں میری حالت پر دُکھ ہوا، مگر اس ظالم لڑکے نے مجھے اوپر کھینچ لینے کو اور طاقت لگائی۔ ایک بار کانٹا میرے بالوں میں سے نکل گیا تو دوسری بار اُلجھایا۔

نجمہ:۔ قدیر کو پتہ نہیں تھا کہ تم پانی کے راجہ کی لڑکی ہو۔

جل پری:۔ اچھا! تو تمھارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ صرف پانی کے راجہ کی لڑکی ہی پر ترس کھانا چاہیے۔ اوروں پر نہیں۔ شاید اسی لیے تمھارا قدیر اپنے کمزور ساتھیوں کو ستاتا اور جانوروں کو پیٹتا رہتا ہے۔ پرسوں شام کو اس نے کتنے مینڈک پتھروں سے کچلے۔ اور اپنی ہنسی سے انھیں کچل کے دیے۔ کچھ پتہ ہے! اب چُپ کیوں ہو؟

بوڑھا:۔ لڑکے! تمھارے پاس ان ساری باتوں کا کوئی جواب ہے۔ تم نے ایسا ہی کیا ہے جیسا میری بیٹی کہہ رہی ہے؟

قدیر:۔ ہاں! میں نے پرسوں مینڈکوں پر پتھر پھینکے تھے۔ میں ساتھیوں کو بھی ستاتا رہتا ہوں۔

بوڑھا:۔ تم اپنے ساتھیوں کو بھی ستاتے رہتے ہو، اور جانوروں کو بھی پیٹا کرتے ہو۔ تم میں رحم نام کو نہیں، سارا سارا دن اکیلے تم تالاب پر گھومتے ہو اور جہاں مچھلیاں پکڑنا منع ہے

ضد سے وہیں بیٹھے ہو۔ تم ایک ضدّی لڑکے ہو۔

قدیر:۔ ہاں!

بوڑھا:۔ تمھیں دس دن تک یہیں قید رہنا ہوگا۔ تمھیں پورے دس دنوں تک ان زخمی مینڈکوں کی سیوا کرنی ہوگی اور لڑکی! تم۔ تمھارا قصور یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے ساتھ اُس کے کہنے پر اکیلی چلی آئیں۔ مگر تم ایک رحم دل لڑکی ہو۔ جاؤ، آیندہ سے ایسی بھول نہ ہو۔ چاہے کوئی کہے، کبھی تالاب پر نہ آنا۔ بیٹی جاؤ، اس لڑکی کو کنارے پر چھوڑ آؤ۔

نجمہ:۔ اور میرا بھائی؟

بوڑھا:۔ تمھارا بھائی دس دن تک یہیں رہے گا۔ یہ اپنے کرتوتوں کا پھل پالے، پھر اسے کنارے پر چھوڑ دیا جائے گا۔

نجمہ:۔ نہیں نہیں، ایسا نہ کیجیے۔ میں بغیر قدیر کے اپنے گھر کیسے جاؤں گی؟

بوڑھا:۔ (تالی بجاتا ہے) کوئی ہے لے جاؤ، اس لڑکے کو سیپیوں والے غار میں بند کر دو۔

قدیر:۔ نہیں نہیں، مجھے غار میں بند نہ کیجیے۔ میں اب کبھی جانوروں پر ظلم نہیں کروں گا۔ میں تالاب پر

بھی نہیں آؤں گا۔ میں اب ننھا
رہا نہیں ہوں، مجھ سے بھول
ہوئی ہے، اور اب ایسی بھول کبھی
نہ ہوگی۔

نجمہ :۔ چھوڑ دو میرے بھائی کو، میرے
قدیر کو چھوڑ دو، اچھی جل پری!
جل پری، تم اپنے پتا سے کہو
کہ وہ میرے بھائی کو چھوڑ دیں،
میرے قدیر کو چھوڑ دیں، کیا
تمہارا کوئی بھائی نہیں ہے،
کیا تم اپنے بھائی کو کسی دکھ
میں دیکھ سکتی ہو؟ میرا بھائی۔
میرا قدیر اب ایک اچھا لڑکا
بن گیا ہے۔ جل پری، میری
پیاری جل پری! اپنے پتا سے
کہو کہ وہ میرے بھائی کو چھوڑ
دیں۔

جل پری :۔ پتا جی!

بوڑھا :۔ ہوں،

جل پری :۔ اب یہ ایک اچھا لڑکا بن
گیا ہے پتا جی، آگے ایسی بھول
نہیں کرے گا۔ اکیلا تالاب پر
مارا مارا نہیں پھرے گا، اور نہ
جانوروں ہی کو ستائے گا۔ اسے
چھوڑ دیجئے پتا جی!

بوڑھا :۔ تمہاری مرضی ہے تو اچھی
بات ہے۔ جاؤ، پھر دونوں کو

کنارے پر چھوڑ آؤ۔

منظر ۳

(وہی تالاب کا کنارا)

[قدیر اور نجمہ سو رہے ہیں۔
اچانک قدیر اٹھتا ہے]

قدیر :۔ نجو۔ نجو! تم کہاں ہو؟

نجمہ :۔ یہ کیا بڑبڑا رہے ہو۔ میں
یہاں ہوں۔ کیسی اچھی ٹھنڈی
ہوا چل رہی ہے۔

قدیر :۔ اٹھو اٹھو، چلو جلدی کرو۔
ٹھنڈی ہوا کو مارو گولی۔
چلو گھر چلو۔

نجمہ :۔ یہ تمہیں اچانک ہو کیا گیا؟
یہ سوتے سوتے یکا یک گھر
کی دھن کیسے سما گئی۔

قدیر :۔ میں کہتا ہوں فوراً چلو۔

نجمہ :۔ ایک مچھلی نہیں پکڑی، منی
جیسی کی دیسی ہے، کوئی
خواب دیکھا ہے کیا؟

قدیر :۔ ہاں، خواب ہی سمجھو۔ چلو
اٹھتی ہو یا میں جاؤں۔

نجمہ :۔ یہ ڈور، یہ بنسی، تھیلی،

قدیر :۔ پھینکو ان سب چیزوں کو
یہیں، بھاگو یہاں سے۔

نجمہ :۔ ارے ارے قدیر! سنو تو،
میں بھی آ رہی ہوں۔

(دونوں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہیں، پردہ گرتا ہے)

نثار نور صپوری

آسرا چاہیے

صاف میدان ٹھنڈی ہوا چاہیے
ساتھ بچوں کا اک جمگھٹا چاہیے
روز سجتی رہے کھیل کی انجمن
اس سے زیادہ ہمیں اور کیا چاہیے
مدرسہ سے ہماری ہو جب واپسی
طاق پر دودھ روٹی دھرا چاہیے
روز ناشتے پر اٹھے اڑاتے رہیں
اور حلوہ بھی پوریوں کے سوا چاہیے
ہم نے گڈو سے کھانے کو پوچھا تو وہ
جھٹ سے بولا مجھے گلگلا چاہیے
مل ہی جائے گی خود اپنی منزل ہمیں
دل میں جذبہ مگر شوق کا چاہیے
گیت گاتے رہیں، غل مچاتے رہیں
فکرِ دنیا نہ ہو اور کیا چاہیے
پست ہمت نہیں ہیں ارادے جواں
پھر بھی اپنے بڑوں کی دعا چاہیے
زندگی اپنی پُر نور بن جائے گی
علم کا دل میں روشن دیا چاہیے
غیر کا کچھ نثار اب بھروسا نہیں
صرف اللہ کا آسرا چاہیے

ڈرامے کی کہانی

خلیق انجم شرقی

رِعنا اسکول سے ہانپتی کانپتی واپس آئی۔ بہت جوش میں تھی اور مارے خوشی کے چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"خیریت تو ہے؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ارے بھائی صاحب۔ مزا آ گیا۔ کل ہمارے اسکول میں ایک بہت عمدہ ڈراما ہو رہا ہے۔"

"اچھا! یہ تو واقعی مزے کی بات ہے۔ لیکن میری ننھی بہن، یہ تو بتاؤ کہ تمہیں ڈراما کی اسپیلنگ (ہجے) بھی معلوم ہے؟ اور یہ کہ ڈراما ہوتا کیا ہے؟"

"واہ کیوں نہیں" وہ جھٹ بولی۔ "ڈی آر اے ایم اے۔ ڈراما (DRAMA) یہ بس ایک مزے کا کھیل ہوتا ہے جسے بہت سے کردار اسٹیج پر آ کر کھیلتے ہیں"۔ میں یہ سن کر ہنس دیا اور بولا۔ "بھئی اپنی سمجھ کے مطابق تم نے جواب ٹھیک ہی دیا ہے پر یہ سو فیصد ٹھیک نہیں۔"

"تو پھر آپ کس لئے ہیں" وہ شوخی سے بولی۔ "بتائیے نا "ڈراما" کی صحیح تعریف کیا ہے؟"

"ہاں ہاں بھئی۔ ڈراما کی صحیح تعریف بھی بتاؤں گا اور ڈراما کی کہانی بھی سناؤں گا۔ لیکن ذرا تم کپڑے بدل کر کھانا وانا تو کھا لو۔ اور ہاں میرے کمرے میں یہ کہانی سننے کے لئے آؤ تو چائے بھی بنا کر لانا تاکہ تمہیں کہانی سننے اور مجھے کہانی سنانے کا مزا بھی آئے۔

ڈراما کی کہانی سننے کے شوق میں رعنا صاحبہ الٹا سیدھا کھانا کھا کر اور عمدہ سی چائے بنا کر جلد ہی میرے کمرے میں آ گئیں اور پیالی میز پر رکھ کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کہنا شروع کیا۔

"ڈراما" انگریزی کا لفظ ہے۔ انگریزی کے بہت سے دوسرے لفظوں کی طرح اسے بھی ہم نے اپنا لیا ہے۔ لیکن اصل میں یہ یونانی زبان کے لفظ "ڈرائو" سے لیا گیا ہے۔ اس کے معنی ہیں ایکشن یا عمل۔ ہر زبان اور ہر ملک میں ڈراما کی تعریف یہی ہے کہ ڈراما انسانی زندگی کی عملی تصویر ہے۔ کہانی، ناول یا شاعری میں تو صرف الفاظ ہی سے کام چل جاتا ہے۔ لیکن ڈراما ان سب سے الگ ہے۔ اس لئے الگ ہے کہ یہ پورا کا پورا عمل ہے۔ صرف الفاظ ہی اس کے لئے کافی نہیں۔ ارسطو نے کہا ہے کہ ڈراما الفاظ اور عمل دونوں کا مجموعہ ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈراما کے لئے عمل یا ایکشن ضروری ہے۔ اگر کوئی ایسا ڈراما لکھے جسے اسٹیج پر عمل کے ذریعے پیش نہ کیا جا سکے تو وہ صحیح معنوں میں ڈراما نہیں مانا جائے گا۔"

"مگر بھائی صاحب"۔ رعنا نے بیچ ہی میں میری بات کاٹ دی۔ "میں نے تو کئی ایسے ڈرامے پڑھے ہیں جنہیں اسٹیج نہیں کیا جا سکتا پھر وہ کیسے ڈرامے ہیں؟"

"تم ٹھیک ہی پوچھتا ہے۔ بازار کے عمل میں صرف اردو میں ڈراما نگاری کی ترقی کے لیے لکھے گئے ہیں۔ اسٹیج کرنے کے لیے نہیں۔ ان کے لیے "ادبی ڈراما" کا نام تجویز کیا گیا ہے۔ یہ محض الفاظ ہی الفاظ ہیں۔ ان میں عمل نہیں۔ اس لیے ان کو "نامکمل ڈراما" کہا جائے تو بہتر ہے۔ خیر تو اس ساری بحث کا مطلب یہ نکلا کہ ڈراما کے لیے کیے جانے یا اسٹیج کیے جانے کے قابل ہونا ضروری ہے۔ ڈراما لکھنے والا ڈراما لکھتے وقت اسٹیج کی تمام ضرورتوں کا خیال رکھے ..."

"یہ اسٹیج کی ضرورتیں کیا ہیں؟" رحمانے پھر بیچ ہی میں بات کاٹ دی۔ "بتاتا ہوں بھئی۔ سب سے پہلے تو تھیئیٹر یعنی وہ جگہ جہاں ڈراما دکھانا ہو کی عمارت اور سجاوٹ ہے۔ پرانے زمانے میں یونان میں تھیئیٹر کھلی جگہ میں ہوتا تھا۔ کوئی عمارت نہ ہوتی تھی۔ روسی تھیئیٹر آج بھی کھلے میدان میں پیش کیا جاتا ہے۔ خود ہمارے شاعر ٹیگور کی رائے یہ تھی: اسٹیج کے لیے سین سینری کی بالکل ضرورت نہیں اور شروع میں ڈراما اسی طرح کھلے تھیئیٹر میں شروع ہوا تھا۔

اردو کا سب سے پہلا ڈراما "اندر سبھا" کھلے میدان میں پردے لٹکا کر پیش کیا گیا تھا۔ لیکن کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس کے لیے تھیئیٹر کی عمارت اور اس کی سجاوٹ ضروری سمجھتے ہیں۔

ایک امریکن ماہر کا خیال ہے کہ تھیئیٹر کی عمارت ایسی ہو کہ اس میں اسٹیج الگ ہونے کے باوجود تماشائیوں کے بیٹھنے کی جگہ ایسی ہو کہ تماشائیوں اور اداکاروں کے ماحول میں زیادہ فرق نہ ہو۔ ان کے خیال میں اسٹیج کے تین طرف تماشائی بٹھائے جائیں۔ انہوں نے اسٹیج کی زیادہ سے زیادہ سجاوٹ پر بھی زور دیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ سجاوٹ کیسی ہو اور اس میں کیا کیا ضروری چیزیں ہوں۔ سب سے زیادہ ضروری چیز روشنی کا اچھا انتظام ہے۔ روشنی کے اچھے انتظام پر اسٹیج کی ساری سجاوٹ اور اداکاری کے پورے کام کا دار و مدار ہوتا ہے۔

پرانے زمانے میں اسٹیج پر روشنی کا استعمال صرف اس لیے ہوتا تھا کہ تماشائی اداکاروں کے چہرے کا اتار چڑھاؤ اور اسٹیج کی سجاوٹ صاف دیکھ سکیں لیکن اب نئے زمانے میں رنگ برنگی روشنیوں کے ذریعے ہر قسم کا ماحول پیدا کیا جاتا ہے۔ چاندنی رات کا منظر ہلکے نیلے رنگ کی روشنی سے دکھایا جاتا ہے۔ آج کل جو جدید انداز کی روشنیاں استعمال ہوتی ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) چھت کی روشنی جو انگریزی میں بیٹن (BATTEN) کہلاتی ہے۔

(۲) عکس انداز یا ریفلیکٹر (REFLECTOR) جو عکس ڈالنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

(۳) بہت تیز روشنی جو فلڈ لائٹ (FLOOD LIGT) کہلاتی ہے۔

اس کے علاوہ آرک لیمپ (ARC LAMP) جو زیادہ فاصلے سے روشنی ڈالنے کے کام آتے ہیں۔ ایرینا لیمپ (ARENA LAMP) جو بہت تیز روشنی کے لیے ہیں اور اسٹیج کے خاص حصے کو زیادہ روشن کرنے کے کام آتے ہیں۔

مختلف سین سینریاں دکھانے کے لیے ایسے پردوں کا استعمال ہوتا ہے جن پر منظر بنے ہوں۔ اس کے علاوہ کمرے کی سجاوٹ ماحول کے مطابق ہوتی ہے۔ ایک مثال لے لو، غریب کے سونے کی جگہ دکھانی ہو تو اس کی سجاوٹ ایسی ہوگی کہ ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر پرانی سی دری اور معمولی سا تکیہ پڑا ہوگا۔ وہاں عمدہ سامان دکھانا ماحول اور سجاوٹ کے اصولوں کے خلاف ہے۔

تیسرے نمبر پر میک اپ ہے۔ جسے میک اپ (MAKEUP) کہتے ہیں۔ اِس میں صورت بدلنا اور لباس دونوں شامل ہیں۔ میک اپ میں کئی باتوں کا دھیان رکھنا ضروری ہے۔ میک اپ کرنے والا جسے میک اپ مین (MAKEUPMAN) کہتے ہیں۔ اِن باتوں کو میک اپ کرتے وقت ذہن میں رکھے۔ مثال کے طور پر کسی اداکار پر بادشاہ کا میک اپ کرنا ہے؟ تو میک اپ کرنے والے کو یہ معلوم ہو کہ وہ بادشاہ کس ملک کا ہے۔ کس زمانے کا ہے؟۔ اس کے داڑھی تھی یا نہیں۔ داڑھی تھی تو کس انداز کی۔ وہ کیسا لباس پہنتا تھا۔ اُور اُس کے بعد ویسی ہی صورت بنانے کی کوشش کرے۔ اُور وہی لباس کردار کو پہنائے۔ تاکہ نقل میں اصل کا رنگ پیدا ہو جائے۔ اب رہی صورت کی بات تو اُس کے لئے آج کل ایسے لوشن، پاؤڈر اور کریم آ گئے ہیں۔ جن کی مدد سے حسین سے حسین اور بدصورت سے بدصورت بننا آسان ہو گیا ہے۔ اِس کے علاوہ چہروں کے خول (MASKS) بھی استعمال ہونے لگے ہیں۔

میک اپ کا کمرہ جو گرین رُوم (GREENROOM) کہلاتا ہے۔ میک اپ مین کی نگرانی میں ہوتا ہے اور عام طور پر اسٹیج کے ساتھ اِس طرح بنا ہوتا ہے کہ ڈراما کے کرداروں اور دوسرے کام کرنے والوں کو اسٹیج تک آنے جانے میں آسانی رہے۔

ایک خاص چیز موسیقی یا باجوں کا استعمال ہے۔ مختلف موقعوں پر گانے یا اداکار کی آواز کے ساتھ سازوں کا استعمال ہوتا ہے؟۔ ساز بجانے والے اگر تماشائیوں کی نظروں سے چھپے رہیں تو بہتر ہے؟۔ ساز بجانے والوں کے لئے اِس بات کا دھیان رکھنا ضروری ہے کہ اِن سازوں کی آواز اداکار کی آواز سے اونچی نہ ہو جائے۔ ان کا ایک خاص کام یہ بھی ہے کہ جب منظر بدلا جائے تو اِس چھوٹے سے وقفہ میں اپنی موسیقی کے ذریعے خالی پن کو بھر دیں۔

"بھائی صاحب؟" رعنا جو بہت دیر سے مجھے بولتے دیکھ کر اُکتا سی گئی جلدی سے بول پڑی۔

"یہ تو سب اسٹیج کے بارے میں ہوا۔ اور اسٹیج پر کام کرنے والوں کے بارے میں؟"

"ارے بھائی! دَم تو لینے دو" مَیں نے جھنجھلا کر کہا۔ سب باری باری سے ہی تو بتاؤں گا۔ سب سے پہلے اداکاروں کا نمبر ہے۔ یعنی ڈراما میں کام کرنے والوں کا۔

ڈراما کی کہانی کا انحصار ڈراما لکھنے والے سے زیادہ ڈراما کرنے والوں پر ہوتا ہے؟۔ چوُں کہ ڈراما عمل ہی کا نام ہے؟ الفاظ تو محض اُس عمل کو ظاہر کرتے ہیں۔ اگر ڈراما اچھا ہو اور کردار اسے اچھی طرح پیش نہ کر سکیں تو ڈراما ناکام ہو جائے گا اور ڈراما میں کچھ کمیاں بھی ہوں اور اُس کے اداکار اپنے فن کے ہر پہلو کو جانتے ہوں اور بہت اچھی اداکاری کریں تو ساری کمیاں چھپ جائیں گی اور ڈراما کامیاب کہلائے گا۔ اب یہ بات سمجھو کہ ایک اچھے ڈراما آرٹسٹ یا اداکار کو کیسا ہونا چاہیئے۔ اور اُسے کِن کِن باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔"

"عام طور پر لوگ اداکاری کا مطلب صرف نقل کرنا سمجھتے ہیں۔ لیکن کامیاب اداکاری نقل سے کچھ زیادہ ہے؟۔ ڈراما کے اداکار کو کٹھ پتلی کی طرح محض نچانے والوں کے اشاروں پر کام کرنا، چلنا، پھرنا اور ناچنا نہیں معلوم ہونا چاہیئے۔ وہ کچھ اِس طرح کام کرے کہ تماشائیوں کو ایسا لگے جیسے سچ مچ ایسا ہی ہو رہا ہے؟۔ یہ نہیں کہ نقل صاف نظر آئے۔

ایک اچھے اداکار کو اسٹیج پر آ کر یہ بھول جانا چاہیئے کہ وہ اصل میں کون ہے؟۔ بس اپنے کردار کے رنگ میں اپنے کو اچھی طرح ڈھال لے۔ مثلاً اگر وہ بادشاہ کا کردار ادا کر رہا ہے تو اُس کی صورت اور لباس تو بادشاہ جیسا ہو گا ہی اُسے اپنی

حرکتوں سے بھی خود کو بادشاہ ہی ظاہر کرنا چاہیئے۔ ویسا ہی رُعب و جلال دکھلائے۔ بولے تو آواز ویسی ہی بادشاہ ہو۔ ویسے ہی چلے پھرے۔ یہ نہیں کہ لباس اور میک اپ تو بادشاہ کا ہو اور آواز بھیک مانگ رہی ہو۔۔۔"

یہ سن کر رعنا ایک دم ہنس دی اور بولی ۔" ہاں بھائی صاحب۔ ایک ڈرامے میں میں نے دیکھا تھا کہ ایک لڑکا جسے بادشاہ بنایا گیا تھا، ایسی آواز میں بول رہا تھا۔ جیسے کئی وقت سے کھانا نہ ملا ہو۔"

"ہاں بھئی"۔ میں بولا۔" ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ ورنہ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ پیدا ہونا تو دور رہا۔ ڈراما بالکل ناکام ہو جائے گا۔ لیکن اِن سب باتوں کا مطلب یہ نہیں کہ اداکار کا کام بس آواز اور صورت تک ہی ہے۔ نہیں بلکہ ہر جملہ ادا کرتے وقت اس کی تمام حرکتیں بھی ویسی ہی ہوں۔ یہ نہیں کہ ظاہر تو غصّہ کرنا چاہے اور چہرے پر غصّے کا نام و نشان نہیں۔ خوشی، غم، غصّہ، پریشانی اور اداسی وغیرہ کے جذبات ظاہر کرنے کے لئے چہرے کے اُتار چڑھاؤ۔ آنکھ اور ہاتھ کے اشارے بھی ضروری ہیں۔

ہر اداکار کے لئے پورے ڈرامے کا پڑھنا بہت ضروری ہے تاکہ وہ ڈرامے کا پورا ماحول سمجھ سکے۔ اس کے علاوہ اپنے ہدایت کار کی ساری باتوں پر عمل کرے۔ اداکار کو یہ بھی چاہیئے کہ اپنے مکالمے یا ڈائیلاگ یاد کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے سے پہلے اور بعد کے اداکار کے ڈائیلاگ بھی یاد کرے۔ اِس سے فائدہ یہ ہے کہ اُسے مکالموں کی ترتیب یاد رہتی ہے کہ کس جملے کے بعد مجھے کون سا جملہ بولنا ہے۔ ڈرامے کے لئے اداکاروں کو چُنتے وقت اُن کی شخصیت دیکھنا بہت ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ بادشاہ کے کردار کے لئے ایسے آدمی کو چُنا جائے جو فقیر کے کردار کے لئے زیادہ موزوں ہو۔ عام طور پر ہیرو اور ہیروئن کے لئے خوب صورت اور ویلن اور ولن جیسے کے لئے بدصورت ہونا ضروری ہے۔ یہ سارے کام ہدایت کار کے ہیں۔"

"ہدایت کار کون!" رعنا نے پھر سوال کر دیا۔

"جس طرح کھیل کود کی ٹیم میں کپتان ہوتا ہے۔ بس ویسے ہی اداکاروں میں ہدایت کار ہوتا ہے۔" میں نے سمجھایا۔" ہدایت کار کا کام ہے ڈراما پڑھ کے اس کے کرداروں کے مطابق اداکاروں کا چناؤ کرنا۔ اسٹیج کا سارا ساز و سامان تیار کرانا۔ اداکاری کی مشق کرانا۔ ڈائیلاگ یا مکالمے یاد کرانا۔ سامان کو ترتیب دینا۔ گرین روم تیار کرنے والے میک اپ مین بھی اسی سے ہدایتیں لیتے ہیں۔

ہدایت کار چاہے خود ڈراما نگار نہ ہو۔ لیکن اُسے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اسٹیج کرنے کے لئے ڈراما کیسا ہونا چاہیئے۔ ہدایت کار کے ساتھ ساتھ ایک اور آدمی بھی ہوتا ہے۔ اُسے لقمہ دینے والا یا پروموٹر (PROMOTER) کہتے ہیں۔ یہ آدمی تماشائیوں کی نظروں سے بچ کر اداکاروں کے سامنے رہ کر یہ کام کرتا ہے۔ کہ اگر کوئی اداکار اپنا پارٹ یا کام یا مکالمہ (ڈائیلاگ) بھول جائے تو وہ اسے یاد دلا دے۔ لیکن اس طرح کہ صرف اداکار سُنیں اور دیکھیں۔ تماشائی نہ دیکھ سکیں۔ نہ سن سکیں۔ اِس لئے لقمہ دینے والے یہ کام اشاروں یا کانا پھوسی کے ذریعے کرتے ہیں۔

اسٹیج کی کامیابی میں اِن تمام لوگوں کے علاوہ تماشائیوں

کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ تماشائیوں کو ڈرامے میں پوری دلچسپی لینی چاہیئے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اداکاروں کی ہمت جواب دینے لگتی ہے۔ کسی خاص موقع پر تماشائیوں کا بگڑنا، بے جا شور و غل یا آوازیں نکالنا نہ صرف اداکاروں میں گھبراہٹ پیدا کر دیتا ہے بلکہ پورے ڈرامے کے ماحول اور اثر کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ ہاں اچھی اداکاری پر دبی زبان سے تعریف کرتے رہنا اچھا ہے۔ اس سے اداکاروں کے حوصلے بڑھتے ہیں۔

اداکار اپنے کام انجام دیتے وقت عام طور پر تماشائیوں ہی کی طرف مخاطب رہتے ہیں۔ لیکن اداکار کو یہ کام اس خوبی سے کرنا چاہیئے کہ تماشائی اُسے اپنی طرف مخاطب نہ سمجھیں۔ مثلاً دو آدمی اسٹیج پر باتیں کر رہے ہوں تو یہ ضروری نہیں کہ دونوں ہی کے چہرے تماشائیوں ہی کی طرف ہوں۔ وہ باتیں اس طرح بھی کر سکتے ہیں کہ ان میں سے ایک کا چہرہ اور دوسرے کی پیٹھ تماشائیوں کی طرف ہو۔"

"بھائی صاحب! آپ نے یہ سب بعد کی باتیں تو بتا دیں لیکن ابھی شروع کی بات تو بتائی نہیں کہ ڈراما شروع کب اور کہاں ہوا۔ اور اس کی کتنی قسمیں ہیں" رعنا نے سوال کیا۔

"میں کیا کروں بھئی۔ پہلے تو تم نے بیچ ہی میں اسٹیج کی ضرورتیں پوچھ لیں سو میں نے سب بتا دیں۔ خیر اب ان سوالوں کے جواب سنو۔

"یہ بتانا تو بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے کہ ڈراما کیسے اور کب اور کہاں شروع ہوا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ایک کھیل کی شکل میں شروع ہوا۔ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ انہیں ڈراما کی ابتدائی شکل جنگلی ناچ تھی جو فتح کی خوشی میں ناچے جاتے تھے۔ لیکن یہ سب مانتے ہیں کہ شروع میں ڈرامے کا مذہب سے گہرا تعلق تھا۔ تمہیں یہ معلوم کر کے شاید حیرت ہو کہ انجیل کے دو باب "دی بک آف روتھ" اور "دی بک آف جوب" ڈرامے کی شکل میں ہیں۔

ایران میں بہت پُرانے زمانے میں ڈراما مذہبی تقریبات منانے کے لئے ہوتا تھا۔ قدیم مصر میں اوسیرس نامی دیوتا کی پوجا ڈرامے کی شکل میں ہوتی تھی۔ لیکن یہ سب مانتے ہیں کہ ڈرامے کا بابا آدم یونان ہے اور صحیح معنوں میں ڈراما وہیں شروع ہوا۔ شروع میں وہاں بھی ڈرامے مذہبی ہوتے تھے اور اُن میں ایک ہی کردار ہوتا تھا۔

"ایک ہی کردار بس، پھر وہ ڈراما کیسے ہوتا تھا؟" رعنا حیرت سے چونک پڑی۔

"ارے پگلی۔ تم نے "مونو ایکٹنگ" نہیں دیکھی۔ اس میں ایک ہی شخص منہ سے چار یا تین آوازیں نکالتا ہے۔ یہ بھی تو ایک طرح کا ڈراما ہی ہے۔ ایسے ہی پہلے ہوتا تھا۔" "بھئی، وہ تو ڈراما کی بالکل ابتدائی شکل تھی نا!" میں نے اُسے سمجھایا۔ "شروع میں ڈرامے کی دو قسمیں تھیں۔ ٹریجیڈی یا المیہ اور کامیڈی یا طربیہ۔

ٹریجیڈی یا المیہ ایسا ڈراما جس میں شروع سے آخر تک رنج و غم ہی ہو اور انجام بھی دردناک اور دُکھ بھرا ہو۔ کامیڈی یا طربیہ وہ ڈراما جس میں شروع سے آخر تک خوشی ہی خوشی ہو یا انجام خوش کرنے والا۔ اعلیٰ قسم کے ڈرامے کی اب بھی یہی دو خاص قسمیں ہیں۔ لیکن عام ڈرامے کو پانچ طرح کے ڈراموں میں بانٹا گیا ہے۔

(۱) ٹریجی کومیڈی:- یہ ڈراما ملا جلا ہوتا ہے یعنی شروع میں رنج و غم اور آخر میں سب دُکھ دور ہو کر خوشی آجاتی ہے۔

(۲) فارس:۔ اس طرح کے ڈرامے میں عام طور پر گھٹیا قسم کے واقعات ہوتے ہیں۔

(۳) میلوڈراما:۔ اس طرح کے ڈرامے میں ایسے واقعات ہوتے ہیں جن کی ایک کڑی کو دوسری کڑی سے ملانے کے لئے کھینچ تان کی جائے اور اس کے لئے بہت سارے حالات اور حادثات دکھائے جائیں۔

(۴) براسک:۔ بس یہ سمجھ لو کہ اپنے یہاں جیسے بھانڈ اور نقال بڑے لوگوں کی نقلیں اتارتے ہیں اسی طرح براسک میں تماشائیوں کو ہنسانے کے لئے اداکار شریف اور اعلیٰ شخصیتوں کی نقل اتارتے ہیں۔

(۵) اوپیرا:۔ یہ ڈراما نظم کی شکل میں ہوتا ہے اور موسیقی اس کا خاص جزو ہوتی ہے۔

"یہ تو ہوئیں ڈرامے کی قسمیں۔ اب یہ سمجھو کہ ایک اچھا ڈراما ہونا کیسا چاہیے۔ ڈرامے میں سب سے پہلی چیز اس کا مرکزی خیال ہے۔ مرکزی خیال کا اچھا ہونا ضروری ہے جیسے ایمان داری سب سے عمدہ چیز ہے۔ اس کے بعد پلاٹ کا نمبر ہے۔ پلاٹ نام ہے مرکزی خیال کے پھیلاؤ کا یعنی یہ کیسے دکھانا ہے کہ ایمان داری اور عمدہ چیز ہے یہ پھیلاؤ ایسا ہو کہ ڈرامے کی کڑی سے کڑی مل جائے عجیب و غریب واقعات نہ ہوں اور واقعات میں ترتیب ہو۔ پھر ڈراما شروع کرنے کی بات ہے۔ ڈرامے کا آغاز اگر دلچسپ نہ ہوگا تو تماشائی ایسے ڈرامے میں کوئی دلچسپی نہ لیں گے۔

اس کے بعد کردار اور سیرت نگاری کا نمبر ہے۔ یہ بہت ضروری چیز ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ڈرامے میں کردار اپنے مرتبے اور ماحول کے مطابق گفتگو کریں یعنی بادشاہ کی سیرت یہ ہے کہ اس کا انداز بیان پُروقار ہو۔ اگر بادشاہ اور وزیر آپس میں باتیں کر رہے ہوں تو ان دونوں کا فرق کردار نگاری کے ذریعے ہوگا۔

ڈراما جیسا کہ میں نے شروع میں تمہیں بتایا زندگی کا عمل ہے اور اس عمل کا اظہار گفتگو کے ذریعے ہوتا ہے یہی گفتگو مکالمہ یا ڈائیلاگ کہلاتا ہے۔ اور پورے ڈرامے کی جان ہے اور کردار نگاری کا خاص حصہ ہے۔ مکالمے لکھتے وقت ڈراما نگار کو کچھ باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ مثلاً یہ کہ زبان آسان ہو تاکہ کرداروں اور تماشائیوں کی سمجھ میں آجائے۔ فقرے الجھے ہوئے نہ ہوں۔ بے موقع نہ ہوں۔ ماحول اور کردار کے مطابق ہوں۔ مثلاً بادشاہ اپنے لیے "میں" کے بجائے "ما بدولت" کے الفاظ استعمال کرے۔ خوشی کے ماحول میں کردار خوشی کی باتیں کرے نہ کہ سنجیدہ گفتگو یا دکھوں کا تذکرہ کرے۔ مکالمے اتنے لمبے نہ ہوں کہ کردار بولتے بولتے اور تماشائی سنتے سنتے اکتا جائیں۔ جملے چھوٹے چھوٹے اور چست ہوں تاکہ کرداروں کو آسانی ہو اور تماشائیوں کو لطف آئے۔

اس کے بعد ڈراما میں تسلسل (CONTINUITY) اور تذبذب (SUSPENSE) کا نمبر ہے۔ تسلسل یعنی واقعات کا سلسلہ وار ہونا۔ ڈراما میں صرف بول چال کے ذریعے پوری کہانی تماشائی کو سمجھانی ہوتی ہے۔ اس لئے اگر ترتیب نہ ہوگی تو تماشائی کو ڈراما سمجھنے میں مشکل ہوگی۔

تذبذب یا سسپنس بھی بہت ضروری ہے۔ بہت سی باتیں ایسی ہوں جن کے بارے میں آخر تک تماشائی کچھ نہ جان سکے اور صرف انجام میں ان کا پتہ چل سکے۔ سسپنس کی وجہ سے ڈرامے سے تماشائی کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

تصادم یا ٹکراؤ۔ ڈرامے میں دو مخالف قوتوں جیسے اچھائی اور برائی کا ٹکراؤ دکھانا بھی ضروری ہے

اس کی مثالیں انگریزی کے مشہور ڈرامہ نگار شیکسپیئر کے ڈراموں میں بہت ملتی ہیں۔ تم نے پڑھا ہے نا شیکسپیئر کے ایک ڈرامے کا ترجمہ؟"

"جی بھائی صاحب۔ جیسے میک بیتھ (MAC BETH) میں نیکی اور بدی کا ٹکراؤ دکھا کر آخر میں نیکی کی فتح دکھائی ہے۔" رعنا بولی۔

"شاباش بالکل ٹھیک کہیں تم۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد نقطۂ عروج یا کلائمکس (CLIMAX) کا نمبر ہے۔ یہ انجام سے پہلے کی چیز ہے۔ یہاں تمام واقعات کی گتھی بنا کر تماشائی کو اس حالت میں چھوڑ دیا جائے کہ وہ انجام کے لئے بے چین ہو جائے۔ یہاں ڈرامے کو انتہائی دلچسپ ہو جانا چاہیے۔

انجام :- نقطۂ عروج کے بعد ڈرامے کی آخری منزل انجام ہے۔ انجام کو بہت عمدہ اور مرکزی خیال کے مطابق ہونا چاہیے۔ مثلاً نیکی کی بدی پر فتح ڈرامے کا مرکزی خیال ہے تو انجام سے یہ بات تماشائی پر ظاہر ہو جانی چاہیے۔"

"اچھا بھائی صاحب! اب تو یہ بتائیے کہ ہندوستان میں ڈرامے کا رواج کب سے شروع ہوا؟" رعنا نے سوال کیا۔

"یہ بہت عمدہ سوال کیا تم نے رعنا بی۔" میں نے کہا۔ "قدیم ہندوستان میں بھی یونان کی طرح دیوی دیوتاؤں کی کہانیوں پر ڈرامے شروع ہوئے۔ سب سے پہلے سنسکرت میں ڈرامے لکھے گئے۔ ان ڈرامہ نگاروں میں کالی داس بہت مشہور ہیں۔ انھیں ہندوستان کا شیکسپیئر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے تقریباً سو سال پہلے راجہ بکرماجیت کے درباری شاعر تھے۔ ان کا ناٹک "شکنتلا" پوری دنیا میں مشہور ہے۔ یہ ڈرامہ مہاراجہ کے محل میں اسٹیج بھی کیا گیا تھا اور اتنا کامیاب ہوا تھا کہ بڑے بڑے لوگ ڈرامہ نگاری

کرنا اور ڈرامے میں حصہ لینا عزت کی بات سمجھے جانے لگے تھے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کا زوال ہوا اور ڈرامے اپنی اصلی شکل کھو کر بھانڈوں کی نقلوں تک رہ گیا۔ بھانڈوں کی نقلیں، رام لیلا اور کرشن لیلا کے سوانگ۔ کٹھ پتلیوں کے کھیل، نوٹنکی، یہ سب ہندی ڈرامے کی مختلف شکلیں ہیں جو اب تک جاری ہیں۔

"اندر سبھا" اردو کا پہلا ناٹک کہلاتا ہے۔ لیکن نظم کی شکل میں تھا۔ اسے اردو کا پہلا منظوم ڈرامہ کہنا ٹھیک ہے۔ نثر میں پہلا ڈرامہ ماسٹر احمد حسن وافر نے لکھا تھا اور اس کا نام تھا "بلبلِ بیمار" لیکن اندر سبھا اسٹیج ہو کر اتنا مقبول اور مشہور ہوا تھا کہ اس کے آگے لوگ نثری ڈرامے کو اہمیت نہ دے سکے۔ "اندر سبھا" کو امانت لکھنوی نے لکھا تھا۔ اور یہ واجد علی شاہ کا زمانہ تھا یعنی آج سے کوئی سوا سو سال پہلے کی بات ہے۔

بنگال میں بنگالی ڈرامے تو ۱۸۵۷ء سے ہی پیش کیے جانے لگے تھے۔ بعد میں اردو ڈرامہ بھی شروع ہوا۔ "اندر سبھا" اسٹیج کیا گیا۔ اس کے بعد شیخ پیر بخش کا لکھا ہوا ڈرامہ "ناگر سبھا" بہت مقبول ہوا۔

بمبئی میں اٹھارہویں صدی میں انگریزی تھیٹر تھا۔ چند لوگوں نے ایک ہندوستانی ڈرامیٹک کلب بنا کر بمبئی کے ڈرامے اسٹیج کرنا شروع کئے اور پھر اردو والوں کو شوق ہوا کہ ۱۸۵۳ء میں "پیدائش سیاوش" نام کا ڈرامہ اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ رفتہ رفتہ بمبئی میں ڈرامے کا فن اتنا مقبول ہوا کہ بیسیوں تھیٹر کمپنیاں بن گئیں۔ کتنے ہی نئے ڈرامہ نگار پیدا ہو گئے اور ہزاروں نوجوان مرد عورتیں اداکاری کے میدان میں آ گئے۔ ان تھیٹر کمپنیوں کے مالک زیادہ تر پارسی سیٹھ تھے۔ اس زمانے میں ڈرامہ "رستم و سہراب" بہت مقبول ہوا۔ اس دور کے سب سے مشہور ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری ہوئے۔ انھوں نے اردو ڈرامہ نگاری اور تھیٹر کو نئی زندگی بخشی۔ ان کے بہت زیادہ مشہور ڈرامے "یہودی کی لڑکی"، "سفید خون"، "خوبصورت بلا" اور "مارِ آستین" وغیرہ ہیں۔

[illegible]
اُن کے دو ڈرامے "باپ کا گناہ" اَوْر "[illegible]" اولڈ پارسی شیکسپیرین کمپنی نے اسٹیج کیے اَوْر بہت پسند کیے گئے۔

[illegible]ء سے اَدبی ڈرامے بھی لکھے جانے لگے۔ اَدبی ڈراموں کے بارے میں تمھیں مَیں شروع میں بتا چکا ہوں۔ لیکن اسی زمانے میں یعنی ۱۹۲۲ء میں امتیاز علی تاج نے اپنا مشہور ڈراما "انار کلی" لکھا۔ یہ ڈراما اسٹیج نہ ہو سکا تھا۔ پھر بھی صحیح معنوں میں ڈراما تھا۔ اِس لیے کہ اسٹیج کی تمام ضرورتوں کو سامنے رکھ کر لکھا گیا تھا۔ تاج نے "انار کلی" کے علاوہ کوئی اسٹیج ڈراما نہ لکھا۔ لیکن ایک ایکٹ کے ڈرامے اور ریڈیو ڈرامے بہت لکھے۔..؟

"اتوہ!..." رعنا بول اُٹھی۔ "آپ تو اُلٹا بولتے چلے جا رہے ہیں جیسے مجھے تو سب معلوم ہے کہ ایک ایکٹ کے ڈرامے اور ریڈیو ڈرامے کیا ہوتے ہیں۔"

"اوہ معاف کرنا منّی بہن!" مَیں نے کہا۔ "بھئی شروع میں سب اسٹیج ڈرامے ہی لکھے گئے۔ جیسے مَیں نے ابھی بتایا۔ تاج کا ڈراما "انار کلی"۔ لیکن جب بعد میں انگریزی یا یوں کہو مغربی ادب کا اثر اُردو ادب پر پڑا تو ڈراما بھی نہ بچ سکا۔ اَوْر اُردو ڈرامے میں ایک نئے انداز کے ڈرامے کا جسے ایک ایکٹ کا ڈراما یا "ایکانکی کھیل" کہتے تھے۔ اضافہ ہوا۔ ایک ایکٹ کا ڈراما مشینی دور کی پیداوار ہے۔ دراصل جب لوگوں کو طویل اسٹیج ڈرامے دیکھنے سے اُکتاہٹ ہونے لگی تو یہ چھوٹے چھوٹے ڈرامے لکھے جانے لگے۔ جیسے پُرانے زمانے میں لوگوں کو فُرصت تھی تو وہ طلسم ہوش رُبا اور الف لیلہ جیسی لمبی لمبی داستانیں پڑھتے تھے۔ اور اب لوگ مختصر افسانے پسند کرتے ہیں جنھیں چند منٹ میں پڑھا جا سکے۔

اَوْر بھئی ریڈیو ڈرامے وہ ڈرامے ہوتے ہیں جو ریڈیو سے نشر کرنے کے لیے لکھے جاتے ہیں۔ اِن کی ابتدا آل انڈیا ریڈیو

[illegible]
"ہاں بالکل آ گیا۔ آگے چلیے۔" رعنا بولی۔

"امتیاز علی تاج کے علاوہ نور الٰہی محمد عمر صاحبان نے اسٹیج ڈرامے یورپی ڈراموں کے ترجمے بھی کیے اور خود بھی لکھے۔ اُن کے مشہور ڈراموں میں "بگڑے دل"، "تین ٹوپیاں"، "ظفر کی موت" وغیرہ ہیں۔

"ایکانکی ڈرامے" لکھنے والوں میں مرزا عظیم بیگ چغتائی (مشہور ڈراما "مرزا جنگی") پروفیسر سید عابد حسین (مشہور ڈراما "پردۂ غفلت") پروفیسر محمد مجیب (مشہور ڈرامے، انجام۔ خانہ جنگی۔ حبّہ خانم) پروفیسر اشتیاق قریشی (مشہور ڈرامے، ہمزاد، گناہ کی دیوار) شاہد احمد دہلوی (مشہور ڈرامے، کھڑکی، چمپئی کی انگوٹھی) صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔ سید انصار علی ناصری (مشہور ڈرامے طبیب، بیمہ ایجنٹ) پروفیسر فضل الرحمٰن (مشہور ڈرامے پردہ۔ نئی روشنی)۔ فضل حق قریشی (مشہور ڈرامے پنیر کے سوراخ، قربانی کا دُنبہ) مرزا ادیب (مشہور ڈرامے آنسو اَوْر ستارے، لہو اَوْر قالین) نازلی (ڈراموں کا مجموعہ دو شالہ) وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

ریڈیو ڈراما جیسا کہ مَیں نے تمھیں ابھی بتایا ریڈیو سے نشر ہونے والے ڈراما کو کہتے ہیں۔ اِس کے لکھنے میں ڈراما نگار کو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اِس کا ہر حصّہ الفاظ کے ذریعہ پیش کیا جا سکے اور پھر عمل آوازوں کے ذریعہ۔

ریڈیو ڈراما لکھنے والوں میں رفیع پیرزادہ (تتلی، مارِ آستین) شوکت تھانوی (نہیں مگر ہاں۔ لاٹری ٹکٹ، میر حسینا کی عید) کرشن چندر (سرائے کے باہر۔ دروازہ) سعادت حسن منٹو (اتوار، خودکشی۔ کروٹ) احمد ندیم قاسمی (دارا شکوہ۔ ساحل اُس پر) عصمت چغتائی (ایک بات۔ نیلی رگیں) راجندر سنگھ بیدی (خواجہ سرا۔ رخشندہ) محمود نظامی (نیلو فر۔ شگوفہ) سلطان

فیاض حسین (دو پیک۔ نقشے) میاں لطیف الرحمن (شادی کا پیغام ۔ غرناطہ کا مجاہد ۔ عمر خیام) انتصار حسین (قینڈی ۔ لال دھاگا) سید عابد علی عابد (دلی کا قتل عام ۔ چنگیز خان) ممتاز مفتی (میاں کی مرضی ۔ آپا) بہت مشہور ہیں۔

"بھائی صاحب! یہ تو آپ نے بس بڑوں کے ڈراما نگاروں کے نام گنا دیئے، کچھ بچوں کے ڈرامہ نگاروں کے نام اور ڈرامے کی تاریخ بھی بتائیے۔"

رعنا کی اس بات میں سنجیدہ ہو گیا اور بولا۔ بھئی بدقسمتی سے ہمارے اردو ادب میں بچوں کے ادب پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ اور ڈرامے پر تو نہیں کے برابر۔ بس جیسے بہت سے بڑوں کے ادیبوں نے منہ کا مزہ بدلنے کے لیے بچوں کے لیے بغیر سوچے سمجھے کہانیاں لکھ دی ہیں ویسے ہی کچھ ڈرامے بھی لکھے گئے ہیں۔ اب اس کی تاریخ کیا بتاؤں۔"

"میری معلومات کا جہاں تک تعلق ہے۔ جامعہ کے پروفیسر عابد حسین صاحب نے بچوں کے لئے ایک ڈراما "شریر لڑکا" لکھا تھا جو بہت سے اسکولوں میں اسٹیج ہوا۔ جامعہ ہی کے استادوں کے مدرسے کے استاد عبدالغفار مدھولی صاحب نے البتہ اس سلسلے میں مسلسل اور کامیاب کوششیں کیں اور بچوں کے لئے بہت سے ڈرامے لکھے۔ ان کے مشہور ڈراموں کے نام اور ان کا مختصر ذکر سن لو۔

۱۔ بچوں کا انصاف۔ اس کی کہانی الف لیلہ سے لی گئی ہے۔ خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں بچوں کی ایک نقلی عدالت کے ذریعے ایک سچے جج کے مقدمہ کا صحیح فیصلہ دکھایا ہے۔

۲۔ اسکول کی زندگی:۔ اس میں اسکول کے بچوں کو نیک بننے کی تعلیم دی گئی ہے۔

۳۔ قوم پرست طالب علم:۔ اس میں طالب علموں کو قوم پرستی کی تعلیم دی گئی ہے۔

۴۔ محبت:۔ اس ڈرامے کا مرکزی خیال بچوں میں سچی ہمدردی اور پیار محبت ہے۔

مدھولی صاحب کے ڈراموں کی زبان بہت آسان اور بچوں کی سمجھ میں آنے والی ہے۔ اور اسکولوں میں اسٹیج کرنے کے لئے بہت عمدہ ہیں۔

اردو میں اوّل تو ڈراموں پر توجہ ہی کم ہے۔ زیادہ تر ڈرامے ادبی ہوتے ہیں۔ فلم کی مقبولیت نے تھیئٹر کمپنیوں کا بالکل ہی خاتمہ کر دیا ہے۔ ڈراموں سے لوگ فلم کی وجہ سے زیادہ دل چسپی بھی نہیں لیتے۔ اس لئے صحیح معنوں میں اسٹیج کرنے کے لائق ڈرامے اب بھی بہت کم لکھے جا رہے ہیں اور خاص کر بچوں کے ڈرامے اور وہ بھی اسٹیج کئے جانے کے قابل تو بہت ہی کم ہیں۔ اردو میں بچوں کے دو مشہور رسالوں "کھلونا" اور "پیام تعلیم" میں بھی سال میں ایک آدھ بار ہی ڈراما نظر آتا ہے۔ "پیام تعلیم" تو ڈراما نمبر نکال کر یہ کمی پوری کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں مشہور ڈراما نگار اظہر افسر صاحب بہت کوشش کر رہے ہیں اور بچوں کے لئے مسلسل ڈرامے لکھ کر شائع کرا رہے ہیں۔ ادھر بچوں کے "کھلونا" میں پچھلے دو سال میں احمد مشکور اور جاوید احمد کے بھی چار پانچ بہت دل چسپ اور اسٹیج کئے جانے کے قابل ڈرامے شائع ہوئے ہیں۔

ہاں! ایک بات تو بھول ہی گیا۔ ہمارے پروفیسر مجیب صاحب نے بچوں کے لئے ایک کتاب "آؤ ڈراما کریں" بھی لکھی ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ ڈراما کیسے کرنا چاہئے۔ اس طرح کی اور کتابوں کی بھی ضرورت ہے۔ اور اب تو مختلف مضامین کی تعلیم کے لئے ڈرامے کو ذریعہ بنایا جا رہا ہے۔ اس طرح کے ڈرامے کو "تعلیمی ڈرامے" کا نام دیا گیا ہے۔ محترمہ ہلینا سوامی ناتھن نے اس پر ایک بہت عمدہ کتاب بھی لکھی

ہیتے۔ مگر ہے انگریزی میں، نام ہے "ڈراما ان اسکولس"
(اسکولوں میں ڈراما) تم ضرور پڑھو۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کلاس کے بچے کس طرح اپنے سبق کی کہانیاں ڈرامے کی شکل میں کر کے یاد کر سکتے ہیں۔ ہر مضمون کے لئے الگ الگ طریقے ہیں۔ لیکن اب ان کے بیان کرنے کا موقع نہیں پھر کبھی سہی۔

ہمارے یہاں دوسرے یورپین ملکوں کی طرح "قومی تھیٹر" اور "قومی اوپیرا" قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ڈرامے کا فن بھی ترقی کر سکے۔ فلم تو محض تصویروں کی زبانی ایک کہانی ہے لیکن ڈراما تو چلتی پھرتی زندگی ہے۔ اور ہاں .... اور ہاں .... بچوں کے لئے بھی ایک تھیٹر کی ضرورت ہے جہاں بچوں کے ڈرامے اسٹیج کئے جائیں۔ کیونکہ ہم بچے ہی تو کل کے بڑے بنیں گے۔" رعنا بیچ میں بول پڑی۔

"ارے پگلی! تو نے میرے منھ کی بات چھین لی۔ خدا کرے وہ دن جلد آئے۔" یش بولا۔ "آمین" رعنا نے بڑے خلوص سے کہا۔ اور خالی پیالیاں اٹھا کر باہر نکل گئی۔

ؔ ہندوستان کے بہت سے حصّوں میں خصوصاً دلّی میں ڈرامیٹک کلب قائم ہیں۔ یہ زیادہ تر آزادی کے بعد قائم کئے گئے ہیں اور ترقی پسند نوجوان اور ڈراما سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ چند سالوں سے دلّی میں اداکاری سکھانے کا ادارہ یا اسکول بھی قائم ہے۔ جناب القاضی اس کے پرنسپل یا کرتا دھرتا ہیں۔ یہ اسکول خوب ترقی کر رہا ہے۔

راغب نعیم
ہزاری باغ

"انھیں پیارے بچّو! بنایا ہے کس نے"

(بڑے لڑکوں کے لئے)

خزانا یہ اپنا لٹایا ہے کس نے؟
انھیں پیارے بچّو! بنایا ہے کس نے؟

یہ لعل و گہر یہ حسیں ماہ پارے
یہ شاداب وادی، یہ دل کش نظارے
یہ شمس و قمر، جھلملاتے ستارے
یہ ذرّے جو ہیں موتیوں سے بھی پیارے

یہ کلیوں کی شوخی، گلوں کا تبسّم
گلستاں میں پھیلا ہوا یہ ترنّم
یہ دریا، یہ دریا میں موجِ تلاطم
یہ جھرنوں کا مسحور کن سا تکلّم

بتاؤ! ہمیں کس نے انساں بنایا؟
سلیقے سے جینا بھی ہم کو سکھایا
محبت کا ہر دل میں پودا اگایا
بھلائی کا رستہ بھی سب کو دکھایا

زمانے میں کس نے یہ قرآن بھیجا؟
بنا کے محمدؐ کو سلطان بھیجا؟
یہ دنیا بنائی یہ انسان بھیجا؟
ہمارے لئے دین و ایمان بھیجا؟

یہ کونین تخلیق کی ہے خدا نے
ہمارے لئے ہیں یہ سارے خزانے

ب غلام یزدانی

[illegible]

(ایک ریڈیائی ڈراما)

افراد:-
شنکر، رمیش اور حامد ——— تین طالب علم
استاد-
شنکر کے ماں اور باپ-

[مختلف قسم کے سازوں کی ملی جلی آوازیں جن میں سے آہستہ آہستہ حامد کی آواز ابھرتی ہے]

حامد:- (تیز تیز رٹ رہا ہے) $(a+b)^2 = a^2 + b^2 + 2ab$

$a^2 - b^2 = (a+b)(a-b)$

(فارمولے دہرائے جائیں اور دہرانے میں غلطیاں بھی کی جائیں)

شنکر:- ارے بھیا حامد! یہ فارمولے اب یاد ہو رہے ہیں جب پرچہ شروع ہونے والا ہے۔

حامد:- کیا بتاؤں شنکر۔ یاد ہی نہیں ہوتے یہ فارمولے۔

شنکر:- تو بھیا اس آخری وقت میں رٹنے سے کیا فائدہ؟ انھیں سمجھ لیا ہوتے؟

حامد:- خوب۔ بھلا Mathematics بھی کوئی سمجھنے کی چیز ہے۔ اور وہ بھی الجبرا۔

شنکر:- بھئی واہ Mathematics ہی تو سمجھنے کی چیز ہے۔ یہ تم سے کس نے کہا اسے رٹنا چاہئے۔

حامد:- شنکر آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ ارے کبھی آیا ہے ہماری سمجھ میں الجبرا جواب آئے گا۔

شنکر:- کیوں۔ کیوں نہیں آئے گا سمجھ میں۔

حامد:- ابھی تو اپنی بھی سمجھ میں نہیں آیا آج تک۔ نہ جانے دوسرے کیسے سو میں سے سو نمبر لے آتے ہیں۔ اور اس سال تو اور بھی مصیبت ہو گئی یار!

شنکر:- وہ کیسے؟

حامد:- مجھے امتحان ہال میں سب سے اگلی سیٹ ملی ہے۔ گارڈ کے سامنے۔ وہاں سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

شنکر:- دیکھو حامد۔ یہ بڑی بری بات ہے۔ کاپی (نقل) کرنے سے کب تک کام چلے گا۔

حامد:- جب تک چلے۔ خیر اب ہٹاؤ ان باتوں کو۔ تم سناؤ اپنا حال۔

شنکر:- کیا مطلب؟

حامد:- او ہو تو اب مطلب اور معنی بھی مجھے سمجھانے پڑیں گے۔ ذرا اپنی آستین تو دکھاؤ الٹ کے۔

شنکر:- اے یہ لو۔

حامد:- ارے .... بالکل صاف۔ کچھ نہیں لائے!

شنکر:- نہیں۔

حامد:- بھئی واہ۔ یہ کیا کیا۔ ادھر دیکھو پورے فارمولے اس آستین میں اِدھر اور یہ آٹھ سوال guess Paper کے حل کئے ہوئے دوسری طرف تیار ہیں اور ہاں رات کو دو بجے پر کاش بھی آیا تھا میرے پاس سوامی صاحب کا guess کے۔ تم نے

دیکھا ہوگا نا اُن کا guess paper

شنکر: نہیں۔ میں نے نہیں دیکھا۔

حامد: ہائیں کیا غضب کیا۔ وہ تو بڑا expected (متوقع) ہے۔ چار سوال تو sure (یقینی) ہیں۔ کیا بات ہے استاد تمہاری آستینیں بھی آج صاف ہیں۔ اور اس سے تم آری نہیں کی۔ ایں! اب تک اندر سے معلوم نہیں۔ میں بھی ملتی ہیں۔ ہر کیا کاپی کرنا چھوڑ دیا ہے۔ پریشان ہو گئے۔ کیا کہا۔ ذرا پھر کہنا۔

شنکر: میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے کاپی کرنا چھوڑ دیا ہے۔

حامد: بھئی کیا خوب۔ کاپی کرنا چھوڑ دیا ہے.... اور وہ بھی شنکر نے.... ہاہا.... ہاہا....

رمیش: (آتے ہوئے) کیا بات ہے حامد بھائی۔ آج تو رونے کا دن ہے، یہ ہنسی کیسی؟

حامد: کیا بتاؤں رمیش، تمہیں یقین نہیں آئے گا۔

رمیش: کیوں، آخر کیا بات ہے؟

حامد: استاد کہہ رہے ہیں کہ انھوں نے نقل کرنا چھوڑ دیا ہے۔

رمیش: اچھا جی، گرو نے کاپی کرنا چھوڑ دیا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

شنکر: ٹھیک کہہ رہا ہوں رمیش اب میں نقل نہیں کروں گا۔

رمیش: کیوں بنا رہے ہو۔ کیا کوئی اور نئی ترکیب ہاتھ آئی ہے؟

شنکر: اب تم نہ مانو تو میں کیا کروں۔

رمیش: اچھا.... تو دیکھوں تمہاری جیبیں.... ٹوپی اُتارو.... کوٹ کا کالر پلٹو.... قمیص کی آستین اُلٹو.... گلے کے بٹن کھولنا.... کمپاس بکس اندر سے دکھاؤ.... کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

شنکر: سچ مانو رمیش، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔

حامد: مگر شنکر، یہ تمہیں سوجھی کیا۔ اب امتحان کیسے دوگے۔

شنکر: کوئی بات نہیں۔ چاہے فیل ہو جاؤں مگر نقل نہیں کروں گا۔

رمیش: کیوں آخر؟

شنکر: پہلی بات تو یہ کہ کاپی کرنا اخلاقی جرم ہے۔ دوسرے نقل کر کے پاس ہونا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔

حامد: بھئی کیا کہنے ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی۔ میں پوچھتا ہوں بھیّا، یہ جو لوٹ پیٹ کر تم میٹرک تک پہنچے ہو، تو بھلا کون سا امتحان ایسا گزرا ہے جس میں تم نے کوئی داؤں روا نہیں کیا۔

شنکر: یہ سب ٹھیک ہے مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔

رمیش: تو پھر پاس بھی نہیں ہوگے۔

شنکر: کیوں کیا بغیر کاپی کیے لڑکے پاس نہیں ہوتے؟

رمیش: وہ پاس ہونے والی مخلوق اور ہوتی ہے بھیّا۔ انھیں بھگوان اپنے ہاتھ سے بناتا ہے۔

شنکر: نہیں، وہ بھی ہم جیسے معمولی انسان ہوتے ہیں۔ بس محنت ذرا زیادہ کرتے ہیں۔

حامد: ارے بھائی، کیا ہم کچھ کم محنت کرتے ہیں۔ پرسوں رات بھر تاریخ، جغرافیہ رٹا۔ ایک ایک سنہ دس دس دفعہ یاد کیا۔ پانی پت کی تینوں لڑائیاں اکبر کے reforms علاؤالدین کی فتوحات غدر کے اسباب زمین کی گردشیں۔ موسموں کی تبدیلی، مشہور شہروں کے نام اب تک ازبر ہیں۔ مگر خدا سمجھے اگزامنر کو، پرچہ دیکھتے ہی ہوش اڑ گئے۔ سارے سوال....

۔ مگر پھر بھی نوٹس تو تمہاری قمیص کی آستین کے اندر لکھے ہوئے ہوں گے نا۔

:۔ یہی تو غضب ہو گیا بھیّا۔ میں کل غلطی سے بجائے تاریخ جغرافیہ کے سائنس کی قمیص پہن کر چلا آیا۔

(مختلف سازوں کی وہی ملی جلی آوازیں جو آہستہ آہستہ کم ہوں۔ .... امتحان ہال کی خاموشی جس میں invigilator سے جوتوں کے چرچرانے کی آواز آتی رہتی ہے۔ جوتوں کی آواز دور ہوتی جاتی ہے تو کانا پھوسی کی آواز تیز ہو جاتی ہے۔ جب جوتوں کی آواز تیز ہونے لگتی ہے تو کانا پھوسی بند ہو جاتی ہے)

آواز ۱:۔ (کانا پھوسی) دوسرے سوال کا کیا جواب آیا .... دوسرے کا۔ دوسرے کا۔

آواز ۲:۔ (کانا پھوسی) ابھی نہیں کیا ہے میں نے۔ پہلے کا کیا جواب ہے۔

آواز ۱:۔ بیس دن

آواز ۲:۔ بیس دن؟ میرے پاس تو دس آدمی آتا ہے۔

آواز ۱:۔ ذرا کاپی کو اِدھر ہٹا کے رکھو یار۔ مجھے صاف دکھائی نہیں دے رہا ہے ... اور .... اور ... بس۔

آواز ۳:۔ تیسرا سوال کیا ہے تم نے رشید۔ (جوتوں کی آواز تیز ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے کانا پھوسی بند ہو جاتی ہے)

گارڈ:۔ کیوں کیا بات ہے۔

شنکر:۔ جی .... میں جا سکتا ہوں؟

گارڈ:۔ کہاں؟

شنکر:۔ جی گھر

گارڈ:۔ اتنی جلدی۔ ابھی تو پرچہ بٹے ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔

شنکر:۔ جی ہاں ....

گارڈ:۔ بیٹھ جاؤ۔ اطمینان سے سوال دیکھو۔ گھبراؤ مت۔ تمہارا نام؟

شنکر:۔ جی شنکر لال۔

گارڈ:۔ اچھا اچھا۔ پریشان مت ہو۔ کوشش کرو۔

شنکر:۔ جی میں .... میں پرچہ ....

گارڈ:۔ دیکھو ابھی بہت وقت باقی ہے۔ گھبراؤ مت۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔؟

شنکر:۔ جی ہاں بالکل ٹھیک ہے۔

گارڈ:۔ پھر کیا بات ہے۔

شنکر:۔ جی میں پرچہ کر چکا ہوں۔

گارڈ:۔ پورا پرچہ کر چکے ہو۔ سارے سوالات؟

شنکر:۔ جی ہاں، پورے سوال کر چکا ہوں۔

گارڈ:۔ [illegible]
اتنی جلدی جانا ٹھیک نہیں — ایک دفعہ revise کر ڈالو۔ کوئی غلطی نہ رہ گئی ہو۔

شنکر:۔ جی جناب میں revise بھی کر چکا ہوں۔

گارڈ:۔ مجھ میں نہیں آتا تم نے ایک گھنٹہ میں پورا پرچہ کیسے حل کر لیا۔ کہیں ... کہیں کاپی تو ....

شنکر:۔ جناب، آپ میری تلاشی لے سکتے ہیں۔ میں نے نقل نہیں کی ہے۔ آپ کو پھر بھی یقین نہ ہو تو میں ابھی دوبارہ آپ کے سامنے پرچے حل کئے دیتا ہوں۔

گارڈ:۔ نہیں نہیں .... مجھے پورا یقین ہے۔ تم بڑے ذہین لڑکے ہو۔ تم جا سکتے ہو۔

(وہی مختلف ساز۔ شور و غل)

حامد:۔ رمیش! کیسا رہا پرچہ۔

رمیش:۔ ارے ملاؤ ہاتھ۔ پانچوں کرنی ہیں ہیں۔

حامد:۔ اچھا!

رمیش:۔ چھ میں سے ساڑھے پانچ تو بالکل صحیح ہیں۔ آدھے سوال کا صرف جواب لکھ آیا ہوں۔ دو ایک نمبر اس کے بھی مل ہی جائیں گے۔

حامد :۔ یار کیا آسان پرچہ آیا ہے آج ۔
بالکل ہی unexpected

رمیش :۔ تمہارے کتنے صحیح ہیں ؟

حامد :۔ یوں سمجھو کہ چار تو بالکل صحیح ہیں ۔ چھٹے سوال میں ایک ذرا سی غلطی رہ گئی ۔

رمیش :۔ وہ کیا ؟

حامد :۔ جواب اسکوائر میٹر کی بجائے روپے پیسے میں نکال کر آگیا ہوں ۔

رمیش :۔ مگر جواب کیا آیا ۔

حامد :۔ دس روپے پچاس پیسے ۔

رمیش :۔ بالکل ٹھیک ۔ یہی تو میرا بھی answer ہے ۔ منوہر سے بھی ملالیا ہے میں نے ۔

حامد :۔ آئیں ! وہ کیسے ۔

رمیش :۔ ارے بھائی یہی تو پوچھا ہے سوال میں ۔ اے .... ارے شنکر .... یار تمہیں کب سے ڈھونڈ رہا ہوں ۔

شنکر :۔ کیوں ، خیر تو ہے ؟

رمیش :۔ تم نے آج کمال ہی کر دیا ۔ ایک گھنٹہ میں پورا پرچہ ختم ۔

شنکر :۔ پرچہ ہی ایسا آسان تھا ۔

رمیش :۔ یہاں تو بھیا آخری منٹ تک بیٹھے رہے پھر بھی پورے سوال نہ ہو سکے ۔

حامد :۔ خیر پانچ تو اب بھی پورے صحیح ہیں ۔ ہاں شنکر ۔ پہلے سوال کا کیا جواب آیا ؟

شنکر :۔ چوبیس دن ۔

حامد :۔ (اکدم) چوبیس دن !

رمیش :۔ میرے پاس تو ساٹھ آدمی آتا ہے

حامد :۔ اور میرے پاس تیس بچے ۔

شنکر :۔ نہیں ۔ سوال میں پوچھا ہے ۔ باقی کام کو مرد ، عورتیں اور بچے مل کر کتنے دن میں کریں گے ۔ اس لئے جواب دنوں میں آئے گا ۔

رمیش :۔ ٹھیک کہتے ہو یار ۔ یہ تو سوچا ہی نہیں ۔ ایک اور گیا ۔ اور تیسرے سوال کا جواب ؟

شنکر :۔ باپ کی عمر ساٹھ سال اور بیٹے کی عمر تیس سال ۔

رمیش :۔ میرے پاس تو باپ کی عمر تیس سال اور بیٹے کی عمر پچاس سال آرہی ہے ۔

حامد :۔ نہیں نہیں ۔ میرے پاس باپ کی عمر تیس سال اور بیٹے کی عمر پینتیس ۳۵ سال آتی ہے ۔

شنکر :۔ نہیں ۔ پہلی ہی شرط سوال میں یہ دی ہوئی ہے کہ باپ کی عمر بیٹے کی عمر کی دگنی ہے ۔ اور پھر باپ کی عمر بیٹے کی عمر سے کم کیسے ہو سکتی ہے ۔

رمیش :۔ مارے گئے ۔ اب تو ناؤ بیچ ڈوبتی دکھائی دے رہی ہے ۔

حامد :۔ کیا بتاؤں رمیش ! میں نے ساٹھ کاٹ کے تیس بنالئے ہیں ۔ سامنے سے اس بے وقوف رشید نے کہا " باپ کی عمر تیس سال ۔ بیٹے کی عمر پینتیس ۳۵ سال "

شنکر :۔ اور چوتھا سوال ؟

رمیش :۔ کیا پوچھتے ہو بھیا اب تو اس کی بھی کچھ امید نہیں ۔ ہم دونوں کا ایک ہی جواب ہے ۔ آٹھ سو روپے ۔

شنکر :۔ آٹھ سو کیسے ۔ سوال میں سود کی شرح پوچھی ہے ۔ جواب چھ فی صدی آتا ہے ۔

رمیش :۔ مر گئے بھیا حامد ، میں نے کہا تھا نا جواب غلط معلوم ہوتا ہے ۔ ate of interest اتنا زیادہ نہیں ہوتا مگر تم ۔ کہا اگزامینر ایسے ہی چکر دیا کرتے ہیں ۔ لو تین سوال گئے ۔ باقی کے دو بھی .....

شنکر :۔ پانچویں سوال کا جواب ہے اور چھٹے کا دس روپے پچاس پیسے ۔

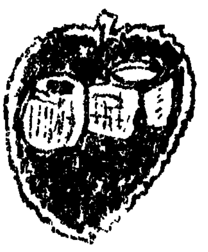
حامد :۔ چلو چھٹی ہوئی ۔ ایک آخر

سوال صحیح ہے اپنا تو۔ باقی سب
گئے۔ بھیا رمیش۔
رمیش :۔ کیوں۔ کیا ہے۔
حامد :۔ کل سے چھٹی۔ پھر ایک سال
کی۔
(مختلف سازوں کا دھیما ملا جلا تاثر)
[پسِ منظر میں لڑکوں کی ہلکی ہلکی
آوازیں]
حامد :۔ اور رشید کا کیا رہا۔ ذرا اُس کا
نام بھی تو دیکھو رمیش۔
رمیش :۔ ارے میاں وہ فیل ہے کہیں
بھی نہیں ہے اُس کا نام لسٹ
میں۔
حامد :۔ یہ تو ہم پہلے ہی سے جانتے
تھے۔ بڑے چلے تھے بچو پاس
ہونے۔ اچھا پتواری، منوہر
اور احمد۔
رمیش :۔ سب فیل۔
حامد :۔ کیا کہہ رہے ہو؟
رمیش :۔ حامد بھائی جو دوسروں کی
مدد نہیں کرتے، بھگوان بھی
اُن کی مدد نہیں کرتا۔ ایک
سوال نہیں بتایا اِس پتواری
نے مجھے پورے امتحان میں۔
حامد :۔ آدمی تو بس شنکر ہے۔ کیا کہنے
ہیں۔ اسکول کی لاج رکھ لی۔
پوری یونی ورسٹی میں فرسٹ۔

کاش اُس کے برابر جگہ ملتی امتحان
میں۔
رمیش :۔ ارے پھر کیا رکھا تھا۔ آج ہم
بھی اِن پاس ہونے والوں کی
اکڑ نکال کر رکھ دیتے۔ مگر بھیا
اپنی تو تقدیر ہی کھوٹی ہے۔
ورنہ خود شنکر کا کیا حال تھا۔
حامد :۔ سچ کہتے ہو یار۔ اپنی تو عقل
حیران ہے۔ یہ شنکر کیا سے
کیا ہو گیا۔ تمہیں یاد ہے پچھلے
سائنس اور تاریخ و جغرافیہ
کے پرچے ہم نے اُسے کاپی
کرائے تھے۔ اور maths تو
اُسے آتا ہی نہیں تھا۔
رمیش :۔ کچھ بھی ہو جناب ہم تو قائل
ہو گئے اُس کے۔ پوری اسٹیٹ
میں فرسٹ۔ واہ میرے شنکر
تیری جے ہو۔ شنکر کی .....
(سب) جے ..... شنکر زندہ
باد ..... شنکر ..... زندہ باد۔
(چند سکنڈ سازوں کی دھیمی ملی جلی
آوازیں)
باپ :۔ ارے شنکر ..... شنکر
شنکر :۔ (نیند میں) .... زندہ باد
باپ :۔ زندہ باد!
شنکر :۔ شنکر کی .... جے ... (تیز تیز)
$a^2 + b^2 = a^2 b + 2^2$ ....

باپ :۔ نہ جانے کیا بک رہا ہے نیند
میں۔ ارے شنکر اُٹھتا ہے کہ
نہیں۔ صبح ہو گئی آٹھ بج چکے۔
شنکر :۔ (چونک کر) ہوں .... کون۔
پتاجی۔
باپ :۔ پتاجی کا بچہ کیا بڑبڑا رہا تھا
نیند میں۔ اتنا کہا راتوں کو
مت جاگا کر۔ مگر سال بھر تو
کھیلتے پھریں گے سپوت اور
امتحان کے وقت رات رات
بھر رٹائی ہوتی ہے۔ یہ لچھن
ہیں پاس ہونے کے؟
ماں :۔ اے ہے کیوں سویرے ہی
سویرے بچے کے پیچھے پڑ گئے۔
ابھی پلنگ سے اُٹھا نہیں اور
تم نے ڈانٹنا شروع کر دیا۔
باپ :۔ یہ سب تمہارے لاڈ پیار کا
نتیجہ ہے۔ میری اِس گھر میں
چلتی کہاں ہے۔
ماں :۔ تمہاری اِس پڑھائی کے پیچھے
تو میرے بچے کا سوکھ کر یہ
حال ہو گیا۔ اب کیا اِسے جان
سے مار ڈالنا چاہتے ہو؟
باپ :۔ ایسے جینے سے تو مر جانا ہی
اچھا۔ خیر ہے اِس کے ساتھی
گریجویٹ ہو گئے اور یہ چار
سال سے میٹرک میں جھول
(ملاحظہ ہو صفحہ ۵ کالم ۳)


…ی کا سرکاری معیار
شاہی



ناب یوسف ناظم

دعوت

(سبحان خاں، اُن کی بیگم اُن کے دو لڑکے، ایک حکیم،)

مقام: سبحان خاں کا مکان
اتوار کا دن۔
وقت: دن کے گیارہ بجے۔
(سبحان خاں کے کراہنے کی آواز)
ہائے رے اللہ، ارے
اللہ، ہائے۔ اوہو ہو۔

بیگم: (دور سے) ارے یہ تو ابھی
اچھے بھلے تھے، کیا ہوا انھیں
سبحان خاں: اوہو ہو ہو۔ ارے
رے ارے رے ۔۔ ذرا ادھر
آنا۔ ارے بھئی، ذرا جلدی
آؤ نا۔

بیگم: (قریب آکر) ہائے اللہ کیا
ہو گیا آپ کو۔ آپ تو تڑپ
رہے ہیں، یہ پیٹ کیوں
پکڑے ہوئے ہیں آپ۔
سبحان خاں: اوہو ہو تڑپوں
نہ تو کیا کروں ۔ کتنی دیر سے
تو چیخ رہا ہوں۔ یہاں ہے
کون جو میری فکر کرے، اوہو ہو
ہائے اللہ۔

بیگم: ارے ذرا بتایئے تو کیا ہوا
آپ کو، بولیے نا بھئی؟
سبحان خاں: کیسے بتاؤں ۔۔!
بولا بھی تو نہیں جاتا (پلنگ
پر لوٹ جاتا ہے) اوہو ہو۔
بیگم: کیا پیٹ میں تکلیف ہے
آپ کے؟
سبحان خاں: اور نہیں تو کیا
ٹانگ ٹوٹ گئی میری؟ کیا
دکھائی بھی نہیں دے رہا ہے
تمھیں؟
بیگم: ارے ابھی تو آپ شادی
کی دعوت سے لوٹے ہیں کیا
کھانا بھی تھا وہاں؟
سبحان خاں: جی ہاں کھانا بھی
تھا وہاں۔ کھانے کی دعوت
نہ ہوتی تو میں جاتا کیوں؟
بیگم: آپ نے مجھے نہیں بتایا۔
سبحان خاں: کیوں کیا آپ
بھی چلتیں۔ یہی حشر ہوتا۔
ہو ہو۔ ارے اللہ۔

بیگم: میں کیوں جاتی وہاں۔
کیا آپ کو معلوم نہیں، ایسی
دعوتوں میں دو چار دن
کا باسی کھانا بھی کھانا پڑتا ہے
سبحان خاں: جی نہیں میری
معلومات اتنی زیادہ نہیں، اوہو ہو،
خیر اب یہ بتایئے اس پیٹ
کے درد کو کیا کروں؟
بیگم: ٹھہریئے، میں اینٹ گرم
کرکے لاتی ہوں۔
سبحان خاں: اینٹ گرم ہوتے
تک تو میرا دم نکل جائے گا
پہلے تو آپ اینٹ ڈھونڈنے
ہی میں دو گھنٹے لگا دیں گی
۔۔۔ اوہو۔
بیگم: نہیں، نہیں ابھی لاتی ہوں
ٹھہریئے ۔۔۔ اور رشو،
رشو بیٹے۔ ذرا سامنے کے
صحن سے ۔۔۔ ارے سن
رہے ہو رشو۔

رشو: (قریب آکر) جی آیا۔
بیگم: دیکھ ذرا پڑوس سے
ایک اینٹ تو لے آؤ۔
ان کے کمپاؤنڈ میں کتنی
اینٹیں پڑی ہیں۔
سبحان خاں: اوہو، اوہو
اب یہ اینٹ کب آئے گی
اور کب گرم ہوگی۔
رشو: اباجی کیا ہوا آپ کو۔
سبحان خاں: اباجی کے بچے
پہلے اینٹ لے کر آ۔ پھر
میری خیریت پوچھیو۔
رشو: امی ان کے گھر سے اینٹ
لانا مشکل ہے۔ یہ اباجی
کے پلنگ کے پاؤں کے نیچے
جو اینٹیں رکھی ہوئی ہیں
اُن میں سے نکال دوں؟
سبحان خاں: ہاں ہاں ذرا
نکال دو۔ بلکہ اباجی کو
بھی نکال دو۔ چلو بھاگو
یہاں سے۔ اوہو دیکھو
میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ
یہ اینٹ کا حکمت چلاؤ
ارے کچھ کرو جلدی سے
ارے رے رے۔
بیگم: ٹھہریے میرے پاس
زندہ طلسمات ہوگا لے
آتی ہوں ..... لیجیے
یہ تو ذرا پی لیجیے۔
سبحان خاں: میرے پیٹ
کا درد اس زندہ طلسمات
سے ٹھیک نہ ہوگا۔ او
ہوہو۔ اُف۔ ایسی مروڑ
ہو رہی ہے جیسے پیٹ
کے اندر کوئی چیز پھنس
گئی ہے۔ ارے
بیگم میں کیا کروں۔
بیگم: ڈاکٹر کو بلوا لوں۔
سبحان خاں: ڈاکٹر؟ ارے
وہ دس روپے تو فیس
لے مرے گا اور کھانا
میں نے مشکل سے دو روپے
کا کھایا ہوگا۔
بیگم: اچھا میں حکیم جی کو بلوا
لیتی ہوں وہ تو دو ہی
روپے فیس کے لیں گے۔
سبحان خاں: دو روپے۔
خیر بلوا لو۔ لیکن اس طرح
نہ بلواؤ جیسے اینٹ منگوائی
تھی۔ اوہوہو۔
اور اس رشو کو نہ بھیجو
انور کو بھیجو۔
بیگم: میں انور ہی کو بھیجتی ہوں
لیکن اب آپ ذرا چپکے
لیٹے رہیے۔
سبحان خاں: اب بھیج بھی چکو
او انور۔ انور۔
انور: جی اباجی آرہا ہوں۔
ذرا جوتے پہ پالش کر رہا
ہوں۔
سبحان خاں: (چیخ کر) ذرا
جلدی آؤ، جوتے پر پالش
پھر کرلینا۔ ورنہ میں تمہارے
سر پہ پالش کردوں گا۔
بیگم: دیکھو انور، یہ کونے پر
جو حکیم صاحب رہتے ہیں نا
ہاں ہاں وہی جو عینک
لگاتے ہیں ذرا انھیں
جاکر جلدی سے ساتھ لے
آؤ۔ کہنا اباجی کی طبیعت
خراب ہے۔
انور: جی اچھا۔ لائیے ذرا
اپنی چپل تو دیجیے یہی پہن
کر چلا جاتا ہوں۔ کیا
کہوں اُن سے؟
سبحان خاں: کہو جاکر اباجی کا
انتقال ہوگیا ہے
اور آپ کو فاتحہ پڑھنے
کے لیے بلانے آیا ہوں۔
بیگم: آپ بھی کیا باتیں کرتے
ہیں۔ جاؤ انور جلدی کا

جاؤ کہنا اُن کے پیٹ میں
درد ہے۔
(وقفہ)..... حکیم جی آتے ہیں۔)
نوری: امی حکیم جی آگئے ہیں۔
جی: ہاں ہاں انہیں اندر لے
چلو ـــ دیکھیے حکیم جی
ان کے پیٹ میں بے حد
درد ہے۔
حکیم جی: خان صاحب آداب
عرض کرتا ہوں۔ مزاج
کیسے ہیں۔
سبحان خاں: مزاج اچھے
ہوتے تو آپ کو کیوں بلواتا
پیٹ میں بڑا درد ہو رہا
ہے۔ اوہو اوہو۔ بس
ایک گھنٹے سے یہی تکلیف
ہے۔
حکیم جی: ارے آپ کا چہرہ تو
پیلا پڑ گیا ہے۔ کیا کھایا
تھا آپ نے۔
سبحان خاں: جی میں آج ایک
دعوت میں چلا گیا تھا۔
حکیم: دعوت۔ خوب خوب
کیا کیا کھایا آپ نے
وہاں۔
سبحان خاں: کچھ نہیں۔ بس
شامی کباب تھے ٹکیاں تھیں
شیرمال تھے مُرغ کا سالن
تھا۔
حکیم جی: ماشاءاللہ ماشاءاللہ
(منہ میں پانی بھر آتا ہے)
کتنے کباب کھائے آپ
نے۔
سبحان خاں: میں نے گنے
تو نہیں لیکن چار ٹکیاں
اور چار کباب تو کھائے
ہی ہوں گے۔
حکیم جی: اور شیرمال۔
سبحان خاں: مرغ کے سالن
اور دم کے قیمے کے ساتھ
میں نے تین شیرمال کھائے
اور شاید کلیجی کے سالن
اور کوفتوں کے ساتھ
بھی دو شیرمال اور
کھائے ہوں گے۔
حکیم جی: ماشاءاللہ ماشاءاللہ
چاول بھی کھائے آپ
نے...
سبحان خاں: دعوت میں
جاکر بریانی نہ کھانا کون
سی شرافت ہے۔ بریانی
میں مسالہ اور گوشت
ذرا زیادہ تھا۔
حکیم جی: تو بریانی بھی کھائی
آپ نے (ٹھنڈی سانس
بھرتے ہیں۔)
سبحان خاں: ہاں بس یہی
کوئی دو پلیٹ۔
حکیم جی: اور میٹھا تو ہوگا ہی۔
سبحان خاں: میٹھا تو تھا ہی
شادی کی دعوت میں میٹھا
نہیں ہوگا تو کیا کھٹا ہوگا۔
میں نے ڈبل روٹی کے میٹھے
کے بعد تھوڑی سی فیرینی
بھی کھائی تھی۔
حکیم جی: (منہ میں پانی بھر آتا
ہے) خان صاحب یہ
دعوت کہاں تھی۔
سبحان خاں: ارے یہ مولوی
شفیع اللہ صاحب کی لڑکی
کی شادی کی دعوت تھی۔
حکیم جی: ہائیں مولوی شفیع اللہ
اور انہوں نے مجھے نہیں
بلوایا۔ حالانکہ میں برسوں
سے ان کی کھانسی کا علاج
کرتا ہوں۔
سبحان خاں: ارے اللہ
ہاں ہاں وہ تو کیا ہوگا
آپ نے۔ جبھی تو آج بھی
کھانس رہے تھے۔ اب
میرے پیٹ کے درد کے

بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔

حکیم جی: خان صاحب۔ کیا یہ دعوت صبح کی تھی۔

سبحان خاں: ارے بیگم سنتی ہو۔ یہ حکیم جی میرا علاج کرنے آئے ہیں یا ——

حکیم جی: تو آپ کا اس میں بگڑتا کیا ہے بتا دیجیے نا۔

سبحان خاں: ارے حکیم صاحب دعوت تو ابھی وہاں ہو رہی ہے اور اگر میں اس پیٹ کے درد میں مبتلا نہ ہو جاتا تو دوبارہ جاتا۔

حکیم جی: دعوت ابھی ہو رہی ہے۔ تو ابھی وقت ہے خاں صاحب میں تھوڑی دیر میں آؤں گا۔ اچھا خدا حافظ۔

سبحان خاں: ارے ارے مجھے ایک آدھ گولی تو دیتے جاؤ۔

حکیم جی: نہیں نہیں اب مجھے جانے دیجیے۔ مجھے فیس بھی نہیں چاہیے۔ اچھا کیا آپ نے جو مجھے اطلاع دے دی۔

سبحان خاں: ارے انور رشو۔ جانے مت دینا اس حکیم کو جانے مت دینا۔ بیگم روکو روکو۔

حکیم جی: اب میں بالکل نہیں رکوں گا۔ کیا کہا آپ نے وہاں ڈبل روٹی کا میٹھا اور فیرنی بھی ہے ہے نا خاں صاحب ارے خان صاحب، اچھا خدا حافظ۔

سبحان خاں: ہائے اللہ ارے اللہ بیگم اس سے تو اچھا تھا کہ تم ڈاکٹر کو بلواتیں۔

بیگم: اچھا ہوا جو میں نے اس دبلے پتلے ڈاکٹر کو نہیں بلوایا۔ یہ حکیم جی تو دم خم کے آدمی تھے جو کھانے کی اتنی لمبی فہرست سن کر بے ہوش نہ ہوئے۔ وہ ڈاکٹر تو تمہارے کھانے کی تفصیل سن کر ہی یہیں دم توڑ دیتا۔

سبحان خاں: لیکن اب میں کروں کیا۔ اپنا وہ زندہ طلسمات ہی ذرا لے آؤ۔ ایک خوراک اور پی لوں۔

بیگم: ابھی ایک خوراک کی گنجائش ہے آپ کے پیٹ میں؟

(پردہ گرتا ہے)

اپچ۔ سی۔ سٹیونس (H.C.G. Stevens)　　　مترجم:۔ غلام حیدر

کرکٹ کا کپتان

مترجم کا نوٹ:۔ یہ چھوٹا سا ڈراما ایک بہت اچھے کرکٹ کے کھلاڑی پر ہے۔ کھلاڑی بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ اِس میں ایک نوعمر کھلاڑی بھی ہے۔ مگر مُصنّف نے اُسے لڑکی لکھانا ہی پسند کیا ہے۔ ہمارے مُلک میں ابھی لڑکیاں کرکٹ اِتنی باقاعدگی سے نہیں کھیلتیں لیکن یورپ کے مُلکوں میں کافی پہلے سے لڑکیاں باقاعدہ کرکٹ کھیلتی ہیں اور اچھی کھلاڑی بھی ہو جاتی ہیں ڈرامے کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اِس لئے کردار اور ناموں کو بدلا نہیں گیا

کردار:۔ ۱۔ گرینڈس ۔ عُمر تقریباً اسّی سال
۲۔ ڈوبسن۔ گرینڈس کا بوڑھا بٹلر (مُلازم)
۳۔ میرجری۔ گرینڈس کی پوتی کرکٹ کی اچھی کھلاڑی
۴۔ کیپٹن۔
[کیپٹن کا کردار خیالی کردار ہے۔ اچھا یہی ہے کہ اِس کے مکالمے اسٹیج پر صرف آواز سے ادا کیے جائیں اور کوئی کردار سامنے نہ آئے]

[گرینڈس کا چھوٹا سا مکان، کمرے کی کھڑکیاں باغ میں کھلتی ہیں۔ بائیں طرف کا دروازہ بڑے ہال کی طرف کھلتا ہے کمرے میں جو کچھ سامان نظر آتا ہے اس سے مالک کے کرکٹ کے شوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ پُرانے کھلاڑیوں کے بوسیدہ اور نئے کھلاڑیوں کے اچھے فوٹو، دیوار پر ایک کرکٹ کیپ لٹکی ہوئی، ۔ اچھا سا کرکٹ کے سامان کا تھیلا، دائیں طرف آتش دان (یا کسی ریک) پر ایک بہت پُرانا کرکٹ کا بلّا احتیاط سے رکھا ہوا۔

درمیان میں ایک آرام کرسی۔ جس کا منہ ڈراما دیکھنے والوں کی طرف ہے۔ آرام کرسی کے دائیں طرف ایک میز پر مختلف دواؤں کی بہت سی شیشیاں، گلاس۔ کرسی میں گرینڈس اونگھ رہا ہے۔ گلے میں کلب کی ٹائی بندھی ہوئی ہے۔ پردہ کھلنے کے تھوڑی دیر بعد جس میں گرینڈس کوئی حرکت نہیں کرتا، ایک کار کے ہارن کی آواز آتی ہے۔ گرینڈس چونک کر دروازے کی طرف دیکھتا ہے۔ اور تھوڑی دیر بعد ڈوبسن (بٹلر) داخل ہوتا ہے۔ (ڈوبسن کا لباس بہتر ہے انگریزی ہی ہوگا

ڈوبسن:۔ جی۔ جی۔ معاف فرمایئے گا۔ وہ..... جناب، وہ کیا آپ خیال ہے کہ......

گرینڈس:۔ (آنکھیں اب بھی بند ہیں

کیوں کہتے ہو۔ ہاں کیا ضرورت ہے کہنے کی.... میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو.... یہی نا کہ....،

ڈولسن :۔ نہیں نہیں حضور.... بس مجھے ایسا لگتا ہے کہ.....

گرینڈس :۔ ہاں، ہاں۔ یہی نا، تم یہی تو کہنا چاہتے ہو (آواز میں کسی قدر تمسخر پیدا ہو جاتا ہے) کل کے جوش و خروش میں، سرکار۔ وہ کل کا کرکٹ میچ دیکھنے کے بعد اور.... حضور اتنا شور و غل اور اچھل کود مچانے سے آپ نے اپنے دل کی تکلیف بڑھالی۔ اور حضور آپ کو ایسا۔ ہاں ایسا نہیں کرنا.....

ڈولسن :۔ ل۔ لیکن۔ سرکار.....

گرینڈس :۔ اور سرکار، میں یہ سب کچھ بس میرجوری کو نہ بتلا دوں۔؟ (آنکھیں کھول کر بغور ڈولسن کو دیکھتا ہے) نہیں ڈولسن، بالکل نہیں۔ بس میرجوری اسکول سے چھٹی کے چند گھنٹوں کا جڑی بے چینی سے انتظار کرتی ہے۔ کار کی سواری بھی ملتی ہے.... اور پھر اس کے علاوہ، خیر چھوڑو اسے! — وہ اپنے دادا سے ملنا چاہتی ہے۔ نہیں اُسے نا اُمید نہیں کرنا چاہیے۔

ڈولسن :۔ (ہارمانتے ہوئے) بہت اچھا سرکار۔ جیسی آپ کی خواہش۔

[ڈولسن چلا جاتا ہے، اور گرینڈس ذرا دقت کے ساتھ اُٹھ کر سامنے رکھے ہوئے آئینے تک جاتا ہے اور اپنے لباس اور صورت شکل کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ میرجوری داخل ہوتی ہے، لیکن اس کا داخلہ گرینڈس کے کام ختم کرنے سے پہلے ہی ہو جاتا ہے۔ میرجوری صورت سے اسکول کی طالب علم لگتی ہے۔ جسم پر اور لباس کے علاوہ خاص چیز بلیزر دکھلائی دیتی ہے جو ٹیم کی طرف سے ملا ہوا کوٹ ہے]

میرجوری :۔ (دروازے سے ہی) کیا میں آپ کی کچھ مدد نہیں کر سکتی۔

گرینڈس :۔ تم۔ شیطان۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ اپنے آپ کو کچھ تھوڑا سا ٹھیک ٹھاک کر دوں، اور تم میرے تیار ہونے سے پہلے ہی چلی آئیں!..... میں نہیں چاہتا کہ تم سوچو کہ تمہارا دادا ایک بار پھر اپنی صورت شکل پر ناز کرنے لگا ہے۔ مجھے پہلے اپنی صورت شکل اور جسم پر ناز تھا۔ بالکل۔ میں بھی کسی زمانے میں بہت خوبصورت تھا!

میرجوری :۔ (مسکراتے ہوئے) لیکن میرا خیال ہے آپ پھر خود پسند ہو گئے ہیں، اور آپ کو ہونا بھی چاہیے دادا۔ چونکہ میں جب بھی آتی ہوں آپ کو پہلے سے بہتر دیکھتی ہوں..... مگر ہاں۔ د آپ کو بیٹھ جانا چاہیے ڈولسن کہہ رہا تھا کہ آپ کو....

گرینڈس :۔ ڈولسن خود بڈھا ہے اور بے وقوف بھی ہے۔

میرجوری :۔ مگر اتنا میں بھی کہوں گی.... کہ آپ کو بھی ذرا احتیاط کرنی چاہیے۔ (بہت آہستہ گرینڈس کی کرسی کی طرف جاتی ہے، اور پھر اس کے پاس گھٹنے کے بل بیٹھ جاتی ہے) اچھا اب آپ کو ٹھیک طرح سے دیکھوں!

گرینڈس :۔ اچھی طرح سے دیکھو لوگ کہتے ہیں کہ میں پہلے بھی بھونڈا لگنے لگا ہوں ٹھیک ہے نا؟

میر جوری :- بالکل نہیں ، بالکل نہیں (ایک بار پھر غور سے دیکھتی ہے) دادا ! آپ بالکل انکل چارلس لگ رہے ہیں - بالکل اتنے ہی جوان !

گرینڈ پس :- انکل چارلس ! بس بس تم مجھے اپنے انکل چارلس جیسا مت کہو۔ اور جو کچھ چاہو کہہ لو۔ وہ پچھلے ہی اتوار یہاں دن بھر پڑا رہا - ماجی، اس دن اس نے یہ بھی مان لیا کہ بچپن سے آج تک اس نے ایک بار بھی کرکٹ نہیں کھیلی۔ کیا کہو گی ایسے آدمی کو، جس نے اس وقت سے بلّے کو ہاتھ نہ لگایا ہو جب سے .....

میر جوری :- مگر دادا، وہ بڑی طرح اپنے کاموں میں پھنسے رہتے ہیں۔ ہر وقت شہر میں - اس لیے انھیں وقت ہی نہیں مل پاتا۔

گرینڈ پس :- (عدالت میں بیٹھے ہوئے جج کی طرح فیصلہ سناتے ہوئے) بیٹی ! ایسا آدمی میری سمجھ میں نہیں آسکتا جسے کرکٹ کھیلنے کا بھی وقت نہ ملتا ہو۔ کبھی بھی موقع نہ نکال سکے.....

(چھوٹا سا وقفہ)

.... مجھے یاد ہے، جب ....

(ایک دم میر جوری کے کوٹ پر ٹیم کا نشان دیکھ کر چونک پڑتا ہے) ایں - پچھلی بار تو یہ تمہارے کوٹ پر نہیں تھا !

میر جوری :- (غرور کے ساتھ کھڑی ہو کر) یہی خبر دینے تو میں آپ کے پاس آئی تھی دادا - مجھے اپنے اسکول کا کلر مل گیا ہے - اب میں اپنے اسکول کی فرسٹ الیون میں آگئی ہوں !

(گرینڈ پس اٹھنے کی کوشش کرتا ہے مگر میر جوری اسے بڑی نرمی کے ساتھ پھر کرسی پر بٹھا دیتی ہے)

"تم الیون میں ....؟ ..... مگر یہ تو بہت اچھا ہوا .... بہت ہی اچھا ہوا بیٹی - مجھے تم پر ناز ہے .... بس ایسا ایک آدمی ضرور چاہتا ہوں میں خاندان ..... اب حالانکہ تم لڑکی ہو مگر خیر -

میر جوری :- (احتجاج کرتے ہوئے) لیکن دادا .....

گرینڈ پس :- مجھے پتا ہے تمہارا کیا مطلب ہے - مگر دیکھو نا میرے زمانے میں اگر کوئی لڑکی کرکٹ کھیلتی - تو اسے سیدھا پاگل خانے بھیج دیا جاتا - تم بتاؤ نہیں تھی ایسی بات - ! لڑکی، اچھا ساری زندگی کسی پیڈ کی شکل نہیں دیکھتی تھی -

میر جوری :- (ہنستی ہے) کیسی عجیب بات تھی - (تھوڑا سا گرینڈ پس کی طرف جھکتی ہے) ہاں دادا - میں نے ۲۴ رن بنائے، اور وہ بھی سینٹ مائیکل اسکول کے خلاف - اور ہاں ! صرف ۲۰ رن پر تین وکٹ بھی لیے - مجھے ٹیم میں بالکل آخری منٹ پر شامل کیا گیا، بس وہ میری ایلیسن کو فلیو ہو گیا، اس لیے مجھے رکھ لیا گیا -

گرینڈ پس :- کیا قسمت ہے سچ - واہ، واہ - کیا خوش قسمتی کی بات ہے .... (جیسے خود سے بات کر رہا ہو) کھیل میں ہر چیز مدد کرتی ہے، ہر چیز حد ہے کہ فلیو کی بیماری بھی مددگار ہو جاتی ہے - ہر شخص .. ... ہر چیز ..... کچھ نہ کچھ کرکٹ کے سلسلے میں ضرور مدد کر دیتی ہے ..... ہاں سوائے تمہارے انکل چارلس کے .... وہی تمہارا کاہل پیشو انکل چارلس .... شاید اپنی زندگی کے ہر دن میں

شہر کی آدھی درجن دعوتوں میں جا سکتا ہے ..... توبہ

میر جوری :۔ (ہنستے ہوئے) بے چارے انکل چارلس۔

گرینڈ پس :۔ (ایک بار پھر پرانے موضوع پر لوٹتے ہوئے) تمہیں کس نمبر پر بھیجا تھا بیٹی ..... ہاں کس نمبر پر گئی تھیں تم ؟

میر جوری :۔ اِس میں سب سے زوردار بات تو یہی تھی۔ میں پہلے نمبر پر گئی تھی۔

گرینڈ پس :۔ پہلے نمبر پر — ! سچ !!

میر جوری :۔ میں ہمیشہ پہلے نمبر پر جاتی ہوں۔ جونیئر ٹیم میں بھی میرا پہلا ہی نمبر ہے۔ اور میری ایلینس کا نمبر بھی اتفاق سے اپنی ٹیم میں یہی ہے۔ بس سینیئر ٹیم میں بھی میں پہلے نمبر پر گئی۔ کیپٹن کے ساتھ ساتھ۔ مارگریٹ — مارگریٹ ہاورڈ کے ساتھ۔ اس کا بھائی بھی تو بہت اچھا کھلاڑی ہے۔

گرینڈ پس :۔ میں جانتا ہوں — وہ لیفٹ ہینڈر ہے نا ! (پھر جیسے خود سے بات کرنے لگتا ہے) ..... پہلے نمبر پر ..... کیپٹن کے ساتھ۔ (میر جوری سے مخاطب ہوتے ہوئے) کتنے مزے کی بات ہے میری جی۔ بڑے مزے کی بات ہے ..... تمہیں پتہ ہے ؟ ایک بار میں بھی کیپٹن کے ساتھ پہلے نمبر پر ہی گیا تھا ..... ساٹھ سال ہاں ساٹھ سال پہلے۔

(چھوٹا سا وقفہ)

میر جوری :۔ سچ !! دادا !

گرینڈ پس :۔ ساٹھ سال پہلے۔ جولائی سنہ — سنہ — ہاں، بالکل یہی زمانہ تھا۔ ساٹھ سال پہلے۔

میر جوری :۔ کتنے رن بنائے تھے آپ نے ؟ دادا مجھے سب کچھ بتائیے اُس کھیل کے بارے میں .....

گرینڈ پس :۔ میں نے کتنے رن بنائے تھے !! ..... یہی بات تو جاننا چاہتی ہو تم ..... ؟ کیوں ٹھیک ہے نا ! (رازداری کے انداز میں، بالکل جیسے کان میں کہنا چاہتا ہو۔) یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں گراس شائر کی ٹیم کی طرف سے کھیل رہا تھا۔ ..... دوسری اننگ شروع ہو رہی تھی ..... ہمیں کل ایک سو اسّی رن کی ضرورت تھی اُنہیں ہرانے کے لیے .....

میر جوری :۔ اور آپ نے ..... میرا مطلب ہے آپ نے .... ؟

گرینڈ پس :۔ اُنہیں ہرانے کے لئے صرف ایک سو اسّی رن ! ..... میں ویسے عام طور پر تقریباً بیچ میں جایا کرتا تھا۔ لیکن اِس مشکل وقت میں ٹیم میں میری جگہ بدل دی گئی ..... ہاں۔ پہلی جگہ — آزمائش کے طور پر ..... تاکہ ہم تیزی سے اسکور بنا ڈالیں۔ کیپٹن کے ساتھ ..... (کسی قدر اُداسی کے ساتھ) کافی دیر ہو گئی تھی .... اور اگر ہم بہت جلدی کھیل کو اپنے قابو میں نہ کر لیتے تو ہم صرف میچ ڈرا کرانے میں کامیاب ہو پاتے۔ اور تم خود سمجھ سکتی ہو کہ میچ ڈرا ہونا کتنی بودی بات ہوتی۔ ہارنے سے بھی زیادہ گھٹیا .....

میر جوری :۔ کتنا جوش ہوگا آپ لوگوں میں اُس وقت ..... دادا ..... اور ہاں ......

گرینڈ پس :۔ ہرانے کے لئے ایک سو اسّی رن ..... اور بس اِسی جوش اور ہلچل میں ایک نئی پریشانی کھڑی ہو گئی۔

میر جوری :۔ (انداز میں ایک دم ناامیدی جھلک اُٹھتی ہے) تو پھر دادا ؟

آپ لوگ نہیں بنا سکے ؟

گرینیڈس :- صرف ایک سو اسّی رن اور میچ کی جیت — ایک ایک منٹ قیمتی تھا.... مَیں نے اپنے پیڈس باندھ لیے تھے. سب کچھ ٹھیک تھا.... مَیں نے چائے کے خیمے کے پیچھے اَپنے پیڈس باندھے، دھوپ سے ذرا بچ کر.... مگر مجھے اپنا بیٹ نہیں مل رہا تھا۔

میرجوری :- واہ، یہ تو بڑی عجیب بات تھی۔

گرینیڈس :- ہاں بس میرا بیٹ غائب تھا۔ میں نے خود ہی اُسے کسی غلط جگہ پر رکھ دیا تھا... اور بھول گیا تھا — یہ احمق بڈھا — اَیسے ہی جیسے یہ ڈوبسن کبھی کبھی حماقت کر دیتا ہے — کیپٹن بڑی تیزی سے خیمے کے پاس آیا۔ اُسے کھیل شروع کرنے کی بہت جلدی تھی — اَور مَیں اپنی حماقت کو کوس رہا تھا — اور بیٹ تھا کہ مل ہی نہیں رہا تھا۔

میرجوری :- پھر آخر وہ ملا کہاں سے آخر میں ؟

گرینیڈس :- اوہ — وہ، وہ کسی کے کوٹ کے نیچے دبا ہوا تھا — وہ بالکل دوسرے کونے میں۔ بس ایسے ہی کسی کے کوٹ کے نیچے پڑا تھا...... مگر اس کو ڈھونڈنے میں مجھے پورے پانچ منٹ لگ گئے — کیپٹن تھا کہ کھڑا ہوا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ بار بار زمین پر پیر پٹختا، اُس نے بہت کوشش کی کہ مجھے کسی اَور کے بیٹ سے کھیلنے پر تیار کرے (چڑھانے کے انداز میں) جیسے مَیں کسی اَور کے بیٹ سے کھیل ہی لیتا۔

میرجوری :- اچّھا پھر جب آپ مَیدان میں اُترے.... دادا.... ؟

گرینیڈس :- ہاں — جب ہم اُترے مَیدان میں... (پُر رازدارانہ انداز میں) شش.... ہم دونوں ہی نے سارے رن کھینچ دیئے — ایک وکٹ بھی گنوائے بغیر — اَور پاؤ گھنٹہ وقت ابھی باقی تھا کہ ہم نے میچ جیت لیا تھا۔ ہاں — ! کیپٹن نے ساٹھ رن بنائے، ہاں، ٹھہرو مَیں بتاتا ہوں، ایک نو بال تھی اَور دو بائی رن — اَور — ہاں....

میرجوری :- (گرینیڈس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اِس کا مطلب ہے دادا آپ نے سنچری بنائی تھی اُس میچ میں — باپ رے کتنی بڑی بات ہے (وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر گرینیڈس کے بالکل قریب آ گئی۔ گرینیڈس کے چہرے سے ایک اندرونی جوش اور بےکلی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اُسے کچھ کم کرنے کے لئے میرجوری نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا — پھر ریک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)...... یہی وہ شاندار بیٹ ہے دادا ؟ وہ جو اُوپر رکھا ہے۔

گرینیڈس :- (اب پھر پُرسکون ہو گیا) ہاں، یہی ہے..... اور یہی میری زندگی کی سب سے قیمتی اور عزیز چیز ہے۔

میرجوری :- بالکل، دادا۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔

(چھوٹا سا وقفہ)

گرینیڈس :- (اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے) اب مَیں اِسے نیچے اُتارنا چاہتا ہوں — تمھیں دِکھانا چاہتا ہوں۔

میرجوری :- نہیں نہیں دادا۔ مَیں خود.... دیکھیے آپ کو تھکنا نہیں چاہیے — آپ کو پتہ ہی —

کہ ڈوبسن کہہ رہے تھے ......

گرینڈس:۔ ڈوبسن بُڈھو ہے۔ اُسے پتہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہَے۔ لیکن وہ نیک نیّت آدمی ہَے۔ اَوْر اُس کی نیک نیّتی کے بدلے میں مَیں نے اپنے وصیّت نامہ میں دو ہزار رُوپے اُس کے نام لکھ دیئے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ بُڈھا احمق ہوگیا ہَے.... (دوائوں کی بوتلوں کی طرف اشارہ کرتا ہَے) مجھے یہ سب خرافات پینے پر مجبور کرتا ہَے۔ ہر تیسرے گھنٹے بعد۔ اب بتاؤ میری عمر میں ——

میرجوری:۔ مگر دادا، اِس سے آپ کو بڑا فائدہ ہوگا۔

گرینڈس:۔ (بڑی خوش مذاقی کے انداز میں) میرا خیال ہَے تم بھی بُڈھے ڈوبسن کے ساتھ سازش میں شامل ہوگئی ہو.... (اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے) بس مَیں اپنا بیٹ ضرور اُتاروں گا... تاکہ تم دونوں خوب ناراض ہو۔

(گرینڈس اُٹھ کر ریک تک جاتا ہَے مگر وہاں پہنچ کر احساس ہوتا ہے کہ پچھلے چند منٹ کے جوش نے اُسے بہت تھکا دیا ہے۔ اور بیٹ اپنی جگہ سے اُتارنا آسان نہیں ہَے۔ پھر بھی وہ ہمت نہیں ہارتا اَوْر میرجوری جو بیٹ اُتارنے میں اُس کی مدد کرنا چاہتی ہے اُسے قبوُل نہیں کرتا۔ آخر میں میرجوری صرف کھڑے کھڑے اُسے دیکھتی رہتی ہَے۔ بہت آہستہ آہستہ وہ بیٹ کو ہاتھ میں لے کر اسٹوُل یا کُرسی سے نیچے اُترتا ہَے اَوْر پھر تنے بھی آہستہ آہستہ کمرے کے درمیان تک آتا ہَے۔ اَوْر وہاں بالکل اُسی انداز میں کھڑا ہوتا ہے جیسے ایک بار پھر اُسے بال کھیلنی ہے)

ایک نشوُانسی رَن —— اُن کو ہرانے کے لئے.... (بالکل ٹھیک طرح سے کریز وغیرہ لے کر اپنے خیال میں بال کا انتظار کرتا ہے۔ میرجوری شوق بھری نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے۔ مگر ذہن میں فیصلہ نہیں کر پاتی کہ اُسے گرینڈس کو یہ سب کچھ کرنے دینا چاہیئے یا ڈوبسن کو آواز دینی چاہیئے]

ہاں ٹھیک ہَے۔ مَیں بالکل تیار ہوں (جیسے بال آئی۔ اَوْر گرینڈس اپنا بیٹ نہ لگا سکا۔) (میرجوری سے مخاطب ہوتے ہوئے) ارے رے —— یہ بڑی خطرناک بال تھی۔ میری! بہت بڑی ہی خراب بال تھی یہ۔ (رازدارانہ انداز میں) جانتی ہو میں بہت جلدبازی سے کام نہیں لینا چاہتا۔ اِسی لئے مَیں نے پہلی ہی بال پر چھّا مارنے کی کوشش نہیں کی —— مگر تم اب دیکھنا۔

(ایک بار پھر بال کا انتظار —— بال آتی ہے اَوْر اُس پر وہ چھّا لگاتا ہَے اور دوسری طرف وہ اپنے خیالی ساتھی سے ہاتھ کے اشارے سے اپنی جگہ پر کھڑے رہنے کو کہتا ہے)

رُکے رہو —— اُدھر ہی ٹھہرو.... (پھر میرجوری سے مخاطب ہوتا ہے) بالکل ایسا ہی ہُوا تھا۔ بالکل ایسا ہی —— بات یہ تھی ناکہ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا —— اَوْر ہمیں بہت جلدی رَن بنانے تھے.... دیکھو ٹھہرو، میں اَوْر دکھاتا ہوُں۔

میرجوری:۔ (پریشان ہوکر آگے بڑھتے ہوئے) مگر دادا.... آپ پوُری اننگ تو اِس وقت نہیں کھیل سکتے۔ اِس میں تو گھنٹے لگ جائیں گے۔

ہینڈرس :- نہیں — (خیال میں کھویا ہوا) ہاں - ہاں ٹھیک ہے - شاید ٹھیک ہی ہے - مَیں پورا کھیل نہیں کھیل سکتا - پھر اِن کے علاوہ .... (اُسے اپنے دل پر تھکن کا احساس ہونے لگتا ہے) اب تھوڑا سا تھک بھی گیا ہوں - مجھے یہ بات اب مان لینی چاہیئے - ہاں — ! بس یونہی تھوڑی سی تھکن .... مگر ٹھہرو ! بس ایک منٹ .... ایک منٹ — بس میں تمھیں ایک شاٹ اور دکھادوں .... اب مجھے یاد آگیا ہے وہ ہاتھ .... ایک ہِٹ - .... ایک سِکسر .... بالکل ٹھیک ٹھیک میں .... بس میں وہی ہاتھ تمھیں دکھاؤں گا - — تمھیں خود اِس سے بڑا فائدہ ہوگا - کیسے سِکسر مارتے ہیں ؛ — اب تو تم خود بھی فرسٹ الیون میں ہونا — !

[وہ بَیٹنگ کے لئے پھر تیار ہوکر کھڑا ہوتا ہے - میرجوری اب خطرے کے احساس سے خود بھی پریشان ہوگئی ہے - چنانچہ بڑی خاموشی سے بائیں دروازے سے ڈوبسن کو بُلانے کے لئے کھِسک جاتی ہے - اُس کی غیر موجودگی ہی میں ایک بہت زوردار ہِٹ سے سِکسر لگتا ہے - سب کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ گرینڈس تھکن سے بالکل چُور ہوکر لڑکھڑاتا ہوا کُرسی پر آکر بیٹھ جاتا ہے - بالکل جیسے کھیل چکا ہو - مگر پورے جذبے کے ساتھ بَیٹ اَب بھی اُس کے ہاتھوں میں ہے - جلد ہی خاموشی سے میرجوری داخل ہوتی ہے - ڈوبسن بھی ساتھ ہے - وہ دونوں تیزی سے کُرسی تک جاتے ہیں - ڈوبسن بڑے مودّبانہ اور احتیاط کے انداز میں کُرسی کے پیچھے چلا جاتا ہے]

گرینڈس :- (بہت کمزور آواز میں) میرجی ! تم نے دیکھا ؟

میرجوری :- جی ... ہاں مَیں نے دیکھا - کتنا زبردست ہِٹ تھا ... ! (اُسے کُرسی میں ٹھیک سے بٹھاتی ہے) اب آپ تھوڑا سا آرام کیجئے دادا ! .... آپ کو بڑا سکون ملے گا آرام سے ....

گرینڈس :- مگر ... ہاں ، مگر تم مجھے چھوڑ کر مت جانا ... تم ابھی تو اپنے اسکول واپس نہیں جا رہیں نا .... ؟

میرجوری :- نہیں نہیں — ابھی نہیں جا رہی — ساڑھے پانچ بجے تک میری چھُٹی ہے - مَیں آپ ہی کے پاس ہوں گی دادا — ہم ایک بار پھر بات کریں گے اِس کے بارے میں .... ہاں اُنکا کے بارے میں ... (غور سے گرینڈس کو دیکھتی ہے - پھر ڈوبسن سے بہت آہستہ سے کہتی ہے) - یہ تو سو گئے -

(ڈوبسن بہت آہستہ سے پنجوں کے بَل چل کر سامنے آتا ہے)

ڈوبسن :- (کانا پھوسی کے انداز میں) — کیا سچ مچ — مِس میرجوری - ؟ (ایک بار گرینڈس کی طرف دیکھ کر) .... مجھے اِس وقت اِن کی حالت اچھّی نہیں لگ رہی .... میرا خیال ہے مَیں بھی ابھی یہیں ٹھہروں -

[ڈوبسن گرینڈس کے ہاتھوں سے بہت آہستگی سے بَیٹ لے لیتا ہے اور میرجوری کو دے دیتا ہے - وہ اِسے لئے ہوئے ریک تک چلی جاتی ہے اُس کے پیچھے پیچھے ڈوبسن بھی چلا جاتا ہے اور دونوں خاموش کھڑے ہو جاتے ہیں - مگر اُسے دیکھتے رہتے ہیں .... روشنی ہلکی ہو جاتی ہے موسیقی کی آواز تیز ہوتی ہے - روشنی صرف کھلی ہوئی کھڑکیوں سے آرہی ہے - ہلکی سی روشنی میں تیس پینتیس سال کا ایک شخص نظر آتا ہے - کھیل کے لئے تیار ، بَیٹ ہاتھ میں ہے - پَیڈ بندھے ہوئے ہیں - وہ اسٹیج کے درمیان آکر ایک جگہ رُک جاتا ہے - میرجوری اَور

ڈوبسن جیسے نہ اُسے دیکھ رہے ہیں۔ نہ اُس کی آواز سُن رہے ہوں۔ (بہتر ہے اندھیرے میں صرف دھندلے دھندلے خاکے نظر آئیں)

کیپٹن :۔ (بہت پُرسکون اور پُراسرار آواز میں) کیا تم ابھی تیار نہیں ہوئے۔ ہمیں ایک سو اسّی رَن بنانے ہیں۔ وقت بہت کم ہے۔ بس آجاؤ جلدی سے۔ فوراً آجاؤ!

گرینڈس :۔ (سوتے ہوئے) بالکل ٹھیک ہے.... بالکل ٹھیک ہے۔ ہمیں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ نہیں، بالکل نہیں۔ دیکھو کیپٹن۔ میں نے پَیڈ س باندھ لئے ہیں۔

(موسیقی رُکتی ہے اور روشنی پھر میرجوری اور ڈوبسن کی طرف جاتی ہے)

میرجوری :۔ اوہ ڈوبسن!۔ دادا اب بھی وہی میچ کھیل رہے ہیں۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ مجھے انھیں اتنا جوش نہیں دلانا چاہئے تھا۔

ڈوبسن :۔ مجھے انھیں کل باہر نہیں جانے دینا چاہئے تھا۔ مگر یہ مانتے کس کی ہیں۔ اپنے علاوہ۔

(روشنی پھر ڈوبسن اور کیپٹن کی طرف منتقل ہوتی ہے)

کیپٹن :۔ (بے صبری کا اظہار کرتے ہوئے) مگر تمہارا بَیٹ کہاں ہے؟

گرینڈس :۔ (سوتے ہی میں کُرسی کے چاروں طرف ٹٹولتے ہوئے) ہاں! میرا بَیٹ کہاں ہے؟ یہ کیا حماقت ہے۔ مجھے میرا بَیٹ نہیں مل رہا.... مَیں اسے کہیں رکھ کر بھول گیا ہوں شاید....

کیپٹن :۔ نہیں مل رہا....! مگر اُسے تو اِس وقت ملنا چاہیئے...... جلدی کرو۔

گرینڈس :۔ ہاں بس چلتا ہوں...... وہ میرا بَیٹ.....!

میرجوری :۔ اوہ۔ گرینڈس دادا!!

گرینڈس :۔ ارے ابھی ذرا دیر پہلے وہیں تو تھا.... (کھڑے ہونے کی کوشش کرتا ہے) مَیں... مَیں......

کیپٹن :۔ ایسے تو ہم کبھی بھی رَن نہیں بنا سکیں گے.... اچھا کوئی دوسرا بَیٹ لے لو.... (وہ ہاتھ کے اشارے سے کسی اور خیالی بَیٹ کی طرف اشارہ کرتا ہے) تم اُس کا پارکنسن کا بَیٹ کیوں نہیں لے لیتے.... وہ اُدھر.... وہ رکھا ہوا ہے۔

(موسیقی پھر شروع ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ بالکل آخر تک چلتی رہتی ہے)

گرینڈس :۔ (اب کھڑا ہو چکا ہے مگر سو اب بھی رہا ہے) پارکنسن کا بَیٹ....!

(ڈوبسن آگے بڑھنا چاہتا ہے جُنبش کرتا ہے مگر اِس خیال سے پھر رُک جاتا ہے کہ اُس کی یہ حرکت گرینڈس کو اَور زیادہ گڑبڑا دے گی)

مَیں کسی دوسرے کے بَیٹ سے نہیں کھیلوں گا۔ ہرگز نہیں۔ مَیں ابھی دیکھتا ہوں....

(بڑی مشکل سے ریک تک جاتا ہے اور بَیٹ ٹٹولتا ہے۔ مگر ظاہر ہے بَیٹ وہاں موجود نہیں ہے۔ آخر وہ آہستہ آہستہ بالکل غیر ارادی طور پر آگے بڑھ کر میرجوری کے ہاتھ سے بَیٹ لے لیتا ہے۔ وہ بالکل ساکت کھڑی دیکھ رہی ہے)

گرینڈس :۔ (ذرا جوش میں بولتا ہے) یہ ہے یہ ہے، مل گیا ہے مجھے۔ (وہ بَیٹ ہاتھ میں لے کر مُڑتا ہے اور پہلی بار کیپٹن کے مقابل کھڑا ہوتا ہے اور جیسے ہی وہ کیپٹن کے سامنے آتا ہے کیپٹن کے چہرے کی تمام سختی اور کڑواہٹ ایک مسکراہٹ میں بدل جاتی ہے اور وہ آہستہ اُسے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہے۔ کیپٹن بہت آہستہ آہستہ پُر اسرار انداز میں کھڑکی کی روشنی کی طرف

بڑھتا جاتا ہے۔ گرینڈس اب اِس
پُرانے رُوپ کا اصلی رُوپ پہچان
گیا ہے کہ کیپٹن کے رُوپ میں موت
کا فرشتہ اُسے لینے آیا ہے۔ وہ آخری
بار اپنی پُوری طاقت جمع کر کے
آگے بڑھتا ہے اور صرف کُرسی تک
پہنچ پاتا ہے)

گرینڈس :۔ (کم وبیش اُس آواز میں جو کبھی
اُس کی جوانی میں رہی ہوگی) ہاں!
۔ میں تمہارے ساتھ چلنے کے
لئے تیار رہوں۔ بالکل تیار۔
۔ چلنے کے لئے......

میرجوری :۔ (خوف سے کانپ رہی ہے)۔
ڈولسن !! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

ڈولسن :۔ (سکون کے ساتھ) ہاں مِس میرجوری۔
یہ بڑی حیرت ناک بات ہے!
(کیپٹن کے پیچھے پیچھے جانے کے لئے اپنی
پُوری طاقت صرف کرتے ہوئے گرینڈس
کُرسی میں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ اُس کا
ہیٹ اُس کے پیروں میں لُڑھک جاتا
ہے۔ وہ ختم ہو چکا ہے۔ کیپٹن آہستہ
آہستہ روشنی سے اندھیرے میں غائب
ہو رہا ہے۔ مُسکراتا ہوا... دایاں بازو
خوش آمدید کہنے کے لئے پھیلا ہوا ہے
۔ ڈولسن آگے بڑھتا ہے اور اپنے
مالک کے لٹکے ہوئے ہاتھوں کو آہستہ
سے گھٹنوں پر رکھ دیتا ہے۔ پھر میرجوری

کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر آہستہ
آہستہ اُس کی آنکھیں چاروں
طرف گھومتی ہوئی ہیٹ پر آ کر
اٹک جاتی ہیں۔ وہ اُسے اُٹھاتا
ہے۔ اور بہت آہستگی اور محبت
کے ساتھ گرینڈس کے دائیں ہاتھ
پر رکھ دیتا ہے۔]

میرجوری :۔ (ایک طویل وقفے کے بعد لڑکھڑائی
زبان سے ایسے انداز میں بولتی ہے
کہ الفاظ صاف طور پر نہیں نکل پاتے)
خوب ... خوب کھیلے گرینڈس
دادا۔ خوب کھیلے۔
(وہ اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں
چھپا لیتی ہے اور پردہ گر جاتا ہے)

"کایا پلٹ"

(بقیہ صفحہ ۴۳ کا)

رہا ہے۔ مجھے تو اب باہر نکلتے
ہوئے بھی شرم آتی ہے۔"

ماں :۔ تو چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھو۔
رات بھر بچہ امتحان کی تیاری
کرتا رہا اور صبح اُٹھتے ہی
انھوں نے اُس کی جان کھانی
شروع کر دی۔ بھاڑ میں جائے
ایسی پڑھائی، اور چوڑ لے
میں جائے ایسا امتحان۔ چلا
بیٹا! مُنہ ہاتھ دھو کے کچھ کھا
لے۔ انھیں بکنے دے۔

شنکر :۔ "نہیں ماں .... پتا جی ٹھیک
کہتے ہیں...... بالکل ٹھیک
کہتے ہیں..... اور میں ....
میں بھی .....

ماں :۔ "کیا بات ہے بیٹا!"

شنکر :۔ "کچھ نہیں ماں۔ میں بھی .... میں
بھی آج وعدہ کرتا ہوں اِس
دفعہ پاس ہو کے رہوں گا

باپ :۔ "یہ تو تو ہر امتحان سے
کہا کرتا ہے۔"

شنکر :۔ جی نہیں پتا جی! ۔ اب
ایسا نہیں ہوگا۔ (یقین کے
کے ساتھ) ..... اب
مجھے پاس ہونا ہے ..
(خیالوں میں کھوتے ہوئے)
مجھے پاس ہونا ہے اور
آنا ہے ..... اوّل
آنا ہے ....

(ساز)

کسان کا شکاری دوست

مصنف:- ر۔ سوتی
ترجمہ:- حمید عثمانی

ڈراما

پہلا ایکٹ

[شکاری کے بھیس میں راجہ اپنے تین سرداروں کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ سب کے کندھوں پر تیر کمان ہے]

راجا:- میرے بہادر سردارو، تم یہیں کھڑے رہو۔ مَیں تنہا جنگل میں شکار کھیلنے جا رہا ہوں۔ مجھے زیادہ دیر ہو جائے تو تم لوگ میری تلاش میں نکلنا۔

تینوں سردار:- بہت اچھا۔ سرکار کا جو حکم!

دوسرا ایکٹ

[ایک کسان کنگالوں جیسے کپڑے پہنے اپنے کھیت میں کھڑا رو رہا ہے۔ شکاری کے بھیس میں راجا وہاں آتا ہے]

راجا:- ارے بھائی، تم یہاں کھڑے رو کیوں رہے ہو؟

کسان:- میرے نصیب میں رونا لکھا ہے اس لیئے رو رہا ہوں۔

راجا:- مگر تمہارے نصیب میں رونا کیوں لکھا ہے، یہ تو بتاؤ؟

کسان:- میرے کھیت میں روز ایک بھیڑیا گھس آتا ہے اور فصل کو بہت نقصان پہنچاتا ہے۔ مَیں بہت شور مچاتا ہوں، تھالی بجاتا ہوں مگر وہ ڈرتا ہی نہیں۔

راجا:- بس اتنی سی بات! یہ کام تو کسی بھی شکاری سے کہتے تو وہ کر ڈالتا۔

کسان:- کر ڈالتا؟ کون کر ڈالتا۔ لو، مَیں تم سے ہی کہتا ہوں تم کر دو گے؟ - بولو!

راجا:- اچھا، مَیں یہ کام کر دوں گا۔ کہاں ہے بھیڑیا؟

کسان:- اس کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ مگر بہت خطرناک بھیڑیا ہے۔ بھیا ذرا ہوشیار رہنا۔

راجا:- کوئی بات نہیں، مَیں اس سے نپٹ لوں گا۔

کسان:- بھگوان تمہارا بھلا کرے۔

تیسرا ایکٹ

مقام:- کسان کی جھونپڑی [ایک طرف بھیڑیا مرا پڑا ہے۔ شکاری چارپائی پر بیٹھا ہے۔ کسان اس کے لیے تھالی میں روٹی اور گھی لاتا ہے]

کسان:- مجھ غریب کے گھر میں باسی روٹی اور گھی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

راجا:- واہ واہ! ایسی روٹی اور ایسا گھی مجھے کھانے کے لیئے اور کہیں کہاں ملتا؟ لاؤ، مجھے یہ بہت پسند ہے۔

(راجا کھانے کے لیے بیٹھ جاتا ہے)

کسان:- (ہاتھ جوڑ کر) تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ اسے مَیں کبھی نہیں بھول سکتا۔

راجا:- اس میں احسان کی کیا بات ہے۔ مَیں شکاری ہوں۔ شکار ہی کھیلنے نکلا تھا۔ مَیں نے بھیڑیا شکار کر لیا۔ اب

میں احسان کی کیا بات ہے؟
کسان:- تم نے میرا اتنا بڑا کام کیا ہے۔
مجھے بھی تم کو کچھ دینا ہی چاہیے
ورنہ سب کیا کہیں گے۔ (کسان
گھر میں جاتا ہے اور ایک ڈلیا جوار
لاکر شکاری کے سامنے رکھتا ہے)
تمہاری محنت کے صلے میں دے
رہا ہوں۔ تم کو لینا ہی پڑے گا۔
راجا:- (ہنستا ہے) اور میں نہ لوں تو؟
کسان:- نہ لوگے تو میں برا مانوں گا۔
تم نے میرا کام کیا۔ مجھے اپنی حیثیت
کے مطابق کچھ تو دینا ہی چاہیے۔
گھر میں اور کچھ نہیں ہے۔ ورنہ
زیادہ دیتا۔ پچھلے سال برسات
میں بہت سی فصل بہہ گئی۔ اس
لیے کچھ ہوا ہی نہیں۔
راجا:- (ہنستے ہوئے) مگر مجھے اس کی
ضرورت ہی نہیں ہے۔
کسان:- ضرورت ہی نہیں! کیا بات
کرتے ہو۔ کیا تمہیں کھانے پینے
کی ضرورت نہیں؟ ارے بھائی!
ابھی اتنا ہی لے جاؤ۔ جاڑوں
میں فصل اچھی ہوئی تو بہت
سا دیے بغیر نہ مانوں گا۔
راجا:- اچھا تو میں لیے جاؤں گا۔
کسان:- ہاں، یہ بات کہی تم نے۔
(اتنے میں باہر سے شور سنائی دیتا ہے

مہاراجا کی جے ہو، مہاراجا کی
جے ہو)
کسان:- (چونک کر) یہ شور کیسا ہے؟
(باہر جھانکتا ہے) میرے گھر کے
سامنے اتنے سپاہی کہاں سے
آگئے؟ یہ ماجرا کیا ہے؟
(شور پھر سنائی دیتا ہے) مہاراج
کی جے۔ مہاراجا کی جے۔
ہائیں مہاراج آرہے ہیں۔
اب کیا ہوگا (ایک سردار اندر
داخل ہوتا ہے اور راجا کے پیروں
پڑتا ہے۔ یہ دیکھ کر کسان جھپٹ
کر اس کے پاس پہنچ کر) ارے ارے
یہ کیا کر رہے ہو۔ تم کس کے
پیروں پڑ رہے ہو۔ یہ تو میرا
بھائی بند ہے۔
سردار:- (کسان کو دیکھے بغیر) مہاراجا
کی جے ہو۔
کسان:- بھلے آدمی! تم کس کو مہاراجہ
کہہ رہے ہو۔ کس کے پیروں پڑ
رہے ہو۔ ذرا سوچو تو۔ یہ تو
میرا دوست ہے۔ ابھی میرے
کھیت میں اس نے ایک بھیڑیا
مارا ہے۔ وہ دیکھو سامنے
مرا پڑا ہے۔
سردار:- یہ کیا کہتے ہو۔ مہاراجا نے
تنہا ہی اس قدر دلیری کا

کام کیا ہے۔
(اتنے میں باقی دو سردار اندر داخل
ہو کر مہاراجا کے پیروں پر پڑتے ہیں)
کسان:- تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو؟ میری
سمجھ میں نہیں آتا (راجا سے)
میرے شکاری دوست! یہ لوگ
تمہارے پیر کیوں پڑ رہے ہیں؟
تینوں سردار:- اس لیے کہ یہ مہاراجا
ہیں۔ وکرم پور کے مہاراجا دھیر
سنگھ۔
(کسان ایک دم گھبرا کر اٹھتا ہے۔ اس
کی زبان حیرت سے بند ہے)
کسان:- یہ تو مہاراجا دھیر سنگھ کی جے۔
دوسرا سردار:- مہاراجا آج اکیلے ہی
شکار کھیلنے نکلے تھے۔ انھیں بہت
دیر ہوگئی تو ہم ان کو تلاش کرتے
کرتے ادھر آ نکلے۔
کسان:- ہائیں!
راجا:- میرے کسان دوست گھبراؤ نہیں
کسان:- (جھٹ سے راجا کے قدموں پر
گر پڑتا ہے) مہاراج مجھے معاف
کر دیجیے۔ میں آپ سے تم کر کے
بات کرتا رہا۔ میں نے آپ کی
بے عزتی کی ہے۔
راجا:- (ہنستا ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر
بٹھا دیتا ہے) یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تم نے
میری بے عزتی نہیں عزت کی ہے

کسان :- میں نے آپ کو باسی روٹی کھلائی ہے۔

راجا :- مگر خلوص کی ایسی باسی روٹی مجھے نصیب کہاں ہوتی ہے۔

کسان :- میں نے آپ کو ایک انجلی جوار دی۔

راجا :- یہ اتنی سی جوار میرے لیے کسی خزانے سے کم نہیں۔ میں اسے اپنے محل میں لے جاؤں گا اور اس کی روٹیاں پکوا کر کھاؤں گا۔

کسان :- میں یہ جوار آپ کو نہیں لے جانے دوں گا۔

راجا :- یہ جوار تو میں لے ہی جاؤں گا۔ میری محنت کی کمائی ہے۔ زندگی میں پہلی بار میں نے اتنا کمایا ہے۔ میں اسے کیوں جانے دوں (سرداروں کی طرف دیکھتے ہوئے) اٹھاؤ یہ جوار کی ڈلیا۔ میرے محل میں لے جاؤ۔

کسان :- (پیروں پڑتا ہوا) مہاراج مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔

راجا :- تم سے غلطی ہوئی ہی نہیں۔ میں نے تمہارا کام کیا۔ تم نے محنت کے بدلے میں جوار دی۔ اس میں غلطی کس بات کی۔ کوئی کام کرے تو اس کی مزدوری تو تم کو دینا ہی چاہیے۔ تم نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اب مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے۔

کسان :- آپ کا فرض! آپ تو دیس کے مالک ہیں۔

راجا :- ہاں دیس کے مالک کی حیثیت سے مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ (گلے سے موتیوں کا ہار اتارتے ہوئے) تم نے اپنا فرض اچھی طرح پورا کیا۔ انعام کے طور پر میں تم کو یہ دے رہا ہوں (کسان گھبرایا ہوا راجہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ بڑھ نہیں رہا تھا) لو، میں تمہارا راجہ ہوں تمھیں یہ تحفہ دے رہا ہوں، لو، اور خوش رہو۔

کسان :- (تحفہ لیتے ہوئے) میرے ان داتا کی عمر دراز۔

تینوں سردار :- مہاراجا کی جے ہو۔ مہاراجا کی جے ہو۔

(پردہ گرتا ہے)

شفیع تمنا کلکتوی

آیا ہے نیا سال

آیا ہے نیا سال مجھے امّی دعا دو
ہر کام مری زیست کا اچھا ہو، بھلا ہو

دیکھوں نہ کسی کو کبھی میں نفرت کی نظر سے
دل میرا محبت کے ارادوں سے بھرا ہو

چھٹ جائے جو کبھی غم کا خطرناک اندھیرا
ہمت کا اجالا مری راہوں کا دیا ہو

دنیا میں ہر انسان کو میں ایک سا جانوں
کوئی مری نظروں میں نہ چھوٹا نہ بڑا ہو

لکھ پڑھ کے میں کردار کا بن جاؤں سپاہی
حق علم و ادب کا جو ہے وہ مجھ سے ادا ہو

دنیا میں کسی کو میں کبھی غیر نہ سمجھوں
مل جل کے رہوں سب سے، یہی کام مرا ہو

دکھلاؤں زمانے کو میں اخلاق کا جوہر
کام آؤں میں اس کے جو مصیبت میں پھنسا ہو

امّی یہ دعا دو کہ برائی سے بچوں میں
وہ کام نہ ہو مجھ سے کہ ناراض خدا ہو

جناب فرحت قمر

بلاک نمبر

[رئیس گھر پر اکیلا ہے۔ اُس کے ماں باپ باہر کام سے گئے ہیں۔ اکیلے پن سے اُکتایا ہوا ہے۔ پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ پر جی نہیں لگتا]

رئیس :۔ (خود بخود) اگر اِس دُنیا میں انسان کو پیدا ہی ہونا تھا تو وہ ایک دم بڑا ہی پیدا ہوتا۔ یہ لڑکپن کی عمر بڑی خطرناک ہے۔ پڑھنا، لکھنا، اسکول جانا، بڑوں کے ہر حکم کی تعمیل کرنا"۔......

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے۔ رئیس اُٹھ کر دروازہ کھولتا ہے۔ ایک اجنبی مرد اور ایک۔ اَن جانی عورت دروازے پر کھڑے ہیں)

رئیس :۔ السّلام علیکم

مرد :۔ وعلیکم السّلام

عورت :۔ جیتے رہو بیٹا۔

مرد :۔ نقوی صاحب گھر پر ہیں ؟

رئیس :۔ جی، وہ تو باہر تشریف لے گئے ہیں۔

عورت :۔ تمھاری اُمی ہوں گی۔

رئیس :۔ وہ بھی اُن کے ساتھ گئی ہیں۔ شام تک لوٹیں گے وہ تو۔

مرد :۔ ہم لوگ آگرے سے آئے ہیں۔ نقوی صاحب سے ملنا تھا۔ کیا آپ لوگوں کو ہمارا خط نہیں ملا۔؟

رئیس :۔ جی مجھے معلوم نہیں ــــ (ذرا رُک کر) بہر حال آپ اندر تشریف لائیے ۔ لائیے میں آپ کا بکس اُٹھاؤں۔

مرد :۔ نہیں نہیں۔ تمھیں تکلیف ہوگی۔ ہم خود اُٹھا لیں گے۔

رئیس :۔ نہیں جناب۔ تکلیف کیسی ؟ (بکس اُٹھا لیتا ہے)

(سب اندر کمرے میں آ بیٹھتے ہیں۔ رئیس بکس ایک کونے میں اور دوسرا سامان میز پر رکھ دیتا ہے ۔ مہمان کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں لیکن خاموشی چھائی رہتی ہے۔ رئیس کچھ سمجھ نہیں پاتا کہ کیا بات کرے۔ مرد مہمان خاموشی کی مُہر توڑتا ہے)

مرد :۔ تو رئیس میاں آپ اِس سال بی۔اے فائنل کی تیاریاں کر رہے ہیں ؟

رئیس :۔ جی !

مرد :۔ بس جلدی سے پاس کر ڈالو۔ رضیہ بھی اِس سال انٹر میں بیٹھ رہی ہے۔

رئیس :۔ (دماغ پر زور ڈالتے ہوئے) رضیہ ـــ کون رضیہ ؟

مرد :۔ نقوی صاحب نے شاید تم کو کچھ نہیں بتایا۔ پُرانی وضع کے آدمی ہیں۔ شاید اُنھوں نے شادی کے بارے میں تم کو بتانا کچھ مناسب نہیں سمجھا۔

عورت :۔ ٹھیک بھی تو ہے۔ بچوّں میں اتنی سمجھ کہاں ہوتی ہے کہ بھلے بُرے کو سمجھیں۔

رئیس :۔ جی میں کچھ سمجھا نہیں۔

مرد :۔ سمجھ جاؤ گے بیٹا ـــ اور پھر اصلی سمجھ تو شادی کے بعد ہی

آتی ہے۔ کیوں رضیہ کی امّی؟

عورت :۔ بے چارہ پریشان ہو رہا ہے۔ بتا دیجئے نا!

مرد :۔ بھئی بات یہ ہے کہ ۔۔ کہ ۔۔ نقوی صاحب سے میری پرانی جان پہچان ہے۔ بس اسی جان پہچان کو گہرے رشتے میں بدلنے کا ارادہ ہے ۔۔ وہ ہماری بیٹی رضیہ ہے نا۔ نقوی صاحب اُسے اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں۔

رئیس :۔ آپ ہاتھ منھ دھو لیجئے۔ میں کچھ چائے کا انتظام کرتا ہوں۔

مرد :۔ ہاں بھئی ۔۔ ہاتھ منھ ہی کیا۔ ہو سکے تو نہا لیا جائے۔ راستے کی دھول نے حلیہ خراب کر دیا۔

رئیس :۔ آئیے! میں آپ کو باتھ روم دکھا دوں (واپس آکر) خالہ جان آپ آرام سے بیٹھئے۔ میں پڑوس سے بوا کو بلا لاؤں۔ وہ اتنے آپ سے باتیں ہی کریں۔ (رئیس بوا کو بلا لاتا ہے)

بوا :۔ سلام بہن ٹھیک تو ہیں آپ؟

عورت :۔ جی ہاں! سب خدا کا شکر ہے۔ آپ تو ٹھیک ہیں؟

بوا :۔ ٹھیک بے ٹھیک کیا بہن، سب ٹھیک ہی ہے۔ دہلی جیسے شہر کی مشینی زندگی میں آدمی ٹھیک نہ رہے تو بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں دو دن کے لئے پڑ گئی تھی سارا گھر الٹ پلٹ ہو گیا۔

عورت :۔ (ہنستے ہوئے) دِلّی ہی کیا عورت تو جہاں بھی رہے یہی معاملہ ہے۔

بوا :۔ جی ہاں! ۔ (رئیس سے) بیٹا! کچھ چائے وائے کا انتظام کرو۔ جاؤ تم بازار سے کچھ لے آؤ۔ چائے میں بناتی ہوں۔

عورت :۔ بوا تکلیف کی ضرورت نہیں بس آپ تو پاس میٹھی باتیں ہی کرتی رہئے۔ آپ جیسی ہنس مکھ عورت کی باتوں سے زیادہ اچھی چائے تھوڑی ہوتی ہے چائے۔

بوا :۔ مگر میری باتوں سے آپ کی بھوک تو مٹنے سے رہی۔ (چلی جاتی ہے)

(مرد نہا کر واپس ہوتا ہے)

عورت :۔ کیوں جی، یہاں آکر بڑا سکون سا محسوس ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ رشتہ جم جائے گا۔

مرد :۔ مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ لڑکا بھی شریف معلوم ہوتا ہے۔

عورت :۔ بالکل سیدھا۔ آج کل کے چھوکروں کے سے ہاؤ بھاؤ بھی نہیں

مرد :۔ اب صاحبزادے کے ماں باپ کو آؤ دیکھنا ہے۔ خدا وہ اخبار نکالنا۔

عورت :۔ بس یہاں بھی اخبار۔ کبھی تو خالی وقت میں کچھ اور کر لیا کرو۔

مرد :۔ (ہنستے ہوئے) بھئی اس وقت تو تم سے باتیں کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا اور فالتو باتیں کرنے سے اچھا ہے اخبار پڑھ لیا جائے۔

عورت :۔ جی ہاں ۔۔۔۔۔

(بوا اور رئیس چائے لے کر آتے ہیں)

بوا :۔ لیجئے، چائے پیجئے۔

عورت :۔ بڑی تکلیف کی آپ نے۔

بوا :۔ یہ کیا تکلیف ہوئی۔ تکلیف تو جب ہی نہیں ہوگی جب رئیس کی شادی میں راتوں رات جاگ کے کام کرنا پڑے گا۔

عورت :۔ خدا وہ دن جلد لائے۔

مرد :۔ بھئی آپ لوگوں نے بڑی فضول خرچی کر ڈالی۔ مٹھائی، پھل، بسکٹ، نمکین ۔ آج کل کے زمانے میں مہمانوں کی خاطر بھی دیکھ بھال کر کرنی چاہیے۔

عورت :۔ ایسا لگتا ہے کہ شام کا کھانا کھلانے کا ارادہ نہیں ۔ بھئی ہم

لوگ تو خالی چائے پینے کے عادی ہیں۔

بوا:۔ کیا بات کرتی ہیں بہن۔ آپ کے جی روز آتی ہیں۔

عورت:۔ ارے بہن۔ جب روز روز آئیں گے تو کیا خالی چائے پلاؤں گی۔

بوا:۔ (مسکراتے ہوئے) خدا نہ کرے۔ ہمارا بیٹا بڑا ہونہار ہے۔ بی۔ اے کے بعد، بزنس (کاروبار) کرکے خوب کمائے گا اور آپ کو اسی طرح مٹھائی، پھل، نمکین کھلائے گا۔

مرد:۔ (رئیس سے) تو تمھارا ارادہ بزنس کرنے کا ہے۔

رئیس:۔ جی

مرد:۔ ٹھیک ہے۔ آج کل سرکاری نوکری میں رکھا ہی کیا ہے۔ اور تمہارے چھوٹے بھائی کیا کر رہے ہیں؟

رئیس:۔ جی، وہ تو دن بھر کھیلتے ہیں۔

مرد:۔ پڑھنے میں دلچسپی کم ہے۔ تمہارا یہی مطلب ہے نا؟

رئیس:۔ نہیں جناب، ابھی پڑھنے کی عمر ہی کہاں ہے؟

مرد:۔ کیوں بھئی۔ نقوی صاحب نے تو لکھا تھا کہ وہ ہائی اسکول کر رہا ہے۔

رئیس:۔ ہائی اسکول تو میری بہن کر رہی ہے۔

مرد:۔ ہو سکتا ہے غلطی سے لکھا گیا ہو۔ اس خط میں تو انھوں نے اپنی فیملی کی پوری تفصیل لکھی تھی۔ یہ بھی لکھا تھا کہ ان کے بھائی بھی اکتوبر میں افریقہ سے آنے والے ہیں۔ وہی وقت شادی کے لئے اچھا رہے گا۔

رئیس:۔ بھائی۔ افریقہ؟۔ میرے کوئی تائے یا چچا افریقہ میں نہیں!

مرد:۔ کیا تمھارے والد صاحب کا نام ابوالکاظم نقوی ہی ہے نا؟

رئیس:۔ جی۔ جب سے میں ان کو جانتا ہوں وہ علی مرتضیٰ نقوی کہلاتے ہیں۔

عورت:۔ رضیہ کے ابا! یہ کیا معاملہ ہے؟

مرد:۔ (جیب سے ڈائری نکالتے ہوئے) یہ دیکھو پتہ۔ (رئیس پڑھتا ہے) ابوالکاظم نقوی۔ آئی ۴۷۰۔ سروجنی نگر۔ نئی دہلی۔

مرد:۔ آئی کہ ایل؟

رئیس:۔ اس میں تو آئی لکھا ہے۔ صاف صاف آئی (I) ہے۔ آپ ایل کس طرح کہتے ہیں؟

مرد:۔ اس طرح۔ بالکل سیدھا۔ ٹائپ کے ایل کی طرح۔

رئیس:۔ (مسکراتے ہوئے) مگر یہ تو بڑی آسانی سے پڑھا جا سکتا ہے۔

مرد:۔ (مسکراتے ہوئے) اور میں اس کو اب تک ایل ہی سمجھتا رہا، ایل ہی پڑھتا رہا اور ایل ۴۷۰ میں ہی آ دھمکا۔

بوا:۔ یہ موئے سرکاری کوارٹر ہی اس طرح بنے ہوئے ہیں کہ ان میں کچھ پتہ ہی نہیں لگتا کس نمبر پہ نمبر ہے۔ آدمی کو تو کوئی جانتا ہی نہیں۔ اور بے چارہ نیا آدمی کیا کرے۔ سارے کے سارے ایک جیسے بنے ہیں۔

مرد:۔ یہ بھی خوب رہی۔ تعجب تو مجھے بھی تھا کہ میرے تار دینے کے باوجود نقوی صاحب گھر سے چلے گئے۔ معاف کرنا بھائی، آپ لوگوں کو بڑی زحمت ہوئی۔

رئیس:۔ زحمت تو آپ کو ہوئی۔ چلیے! میں آپ کو چھوڑ آؤں۔

مرد:۔ نہیں نہیں بیٹا! تم تو یہیں رہو۔ گھر اکیلا ہے۔ ہم چلے جائیں گے۔ خدا حافظ!

ناوک حمزہ پوری

ہمارا آدرش!

اربوں آنکھوں کا ہے تارا — پیارا بھارت دیش ہمارا
جن گن منگل نغمہ اپنا — آزادی آدرش ہمارا

ہم آزادی کے متوالے — آزادی کے ہیں رکھوالے
ہندو مسلم، سکھ عیسائی — ایک ہیں ہم سب گورے کالے

جن منگل ہے اپنا نعرہ — سب کی جے اعلان ہمارا
دیس کی قرباں گاہ پہ یارو — تن من دھن قربان ہمارا

ہم سب ایک ہیں ایک رہیں گے — ذات پات کا نام نہ لیں گے
دیس پہ مشکل آن پڑی ہے — چھن بھر بھی آرام نہ لیں گے

مت چھیڑو فولاد ہیں ہم سب — ارجن کی اولاد ہیں ہم سب
گاندھی جی کے شیدائی ہیں — ذاکر ہیں، آزاد ہیں ہم سب

جو بھی ہم سے جنگ کرے گا — وہ آپ اپنی موت مرے گا
وہ خود ہی رسوا ہو جائے گا — جو ہم پہ الزام دھرے گا

اپنا فرض نبھائیں گے ہم — دیش کی لاج بچائیں گے ہم
حملہ آور فوج ہے بزدل — اس کو مار بھگائیں گے ہم

ہم ہیں گاندھی ہم ہیں نانک — ستیہ اہنسا کے ہم پوشک[1]
جنگ نہیں بھاتی ہے ہم کو — ہم ہیں امن کے رکشک[2] ناوک

[1] پالنے والے
[2] حفاظت کرنے والے

• سلیم تمنائی

جنگل کا نپٹ گیا

سماں تھا چودھویں رات کا۔ چاند سارے جنگل کو اپنی روشنی سے نہلا رہا تھا۔ جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ اچانک سائیں سائیں کرتے جنگل کی سانس رُک گئی۔ پرندوں کی میٹھی بولیاں اُن کی خوبصورت چونچوں میں جیسے اٹک گئیں۔ شیر کی دھاڑ، اس کے کچھار میں بند تھی اور ہرن چاندنی میں چوکڑیاں نہیں بھر رہا تھا۔ سہمے سہمے جنگل میں شہری اور جنگلی کبوتر ایک شاخ پر کہیں سے آ کر بیٹھ گئے۔

شہری کبوتر:۔ بھائی برادر! یہ تو بتاؤ یہ خاموشی، یہ سناٹا کیسا ہے بھلا؟

جنگلی کبوتر:۔ آندھی طوفان آنے والا ہے۔

شہری کبوتر:۔ طوفان!

جنگلی کبوتر:۔ ہاں!

شہری کبوتر:۔ کس صورت میں آ رہا ہے؟

جنگلی کبوتر:۔ وہ دیکھو، میری چونچ کی سیدھ میں کچھ نظر آ رہا ہے۔

شہری کبوتر:۔ یہ سارے ہاتھی ہتھنیاں اور اُن کے ننھے منّے بچے کیوں جمع ہو رہے ہیں۔ کیا سوئمبر رچے گا؟

جنگلی کبوتر:۔ کیا شہروں کی سی بات کرنے لگے۔ سوئمبر کا زمانہ تھوڑا ہے!

شہری کبوتر:۔ کیا ہاتھی ہتھنی کی شادی ہے؟

جنگلی کبوتر:۔ شادی ہوتی تو ہر طرف چیخ پکار ہوتی۔ ہنگامہ ہوتا۔ تم نے جنگل کی شادیاں نہیں دیکھیں۔ اب آئے ہو تو کچھ دن یہاں آرام کرو۔ سب کچھ دیکھو اور کچھ سیکھ کر جاؤ۔

شہری کبوتر:۔ سیکھ لوں گا لیکن اب جلد سے جلد یہ بتاؤ کہ یہ مجمع کیوں ہو رہا ہے؟

جنگلی کبوتر:۔ آج یہاں اِس بات کا فیصلہ ہوگا کہ ہاتھیوں میں کون لیڈر ہوگا۔

شہری کبوتر:۔ اچھا، اچھا! لیڈر کا چناؤ تو کیا فیصلہ ووٹ سے ہوگا؟

جنگلی کبوتر:۔ نہیں میاں! ووٹ کی با[ت] شہروں میں چلتی ہے، میں الیکش[ن] کا تماشا دیکھ چکا ہوں۔ شہر[وں میں] بوگس ووٹ سے ڈبے بھر جا[تے] ہیں۔ اور گیدڑ لیڈر بن جاتا۔

شہری کبوتر:۔ ٹھیک ہے۔ مگر یہ بتاؤ لیڈر کیسے چُنا جائے گا۔

جنگلی کبوتر:۔ کشتی کے بعد،

شہری کبوتر:۔ فری اسٹائل ہندوست[انی] یا جوڈو (جاپانی کشتی)؟

جنگلی کبوتر:۔ یہ شہروں کی کشتی نہ[یں] ٹکر ہے میرے یار ٹکر معصوم[وں] کی ٹکر۔

شہری کبوتر:۔ جو طاقتور ہوگا لیڈر بن جائے گا۔ شہری تہ[ذیب] بالکل جنگل میں کیسے پہنچ گ[ئی] یار میرے آب و ہوا کی تبدی[لی] کی خاطر یہاں آیا تھا۔ لیک[ن] یہاں بھی شہری آب و [ہوا] داخل ہو گئی ہے۔

جنگلی کبوتر :۔ (مسکرا کر) یہاں شہری آب و ہوا کیسے پہنچ گئی! آ لیتے جیسے آپ پہنچ گئے یہاں (ہنستا ہے) دیکھو پہلوان اکھاڑے میں آ رہے ہیں۔ چلو ذرا قریب کے پیڑ پر بیٹھ کر تماشا دیکھیں۔

(دونوں اُڑ کر قریب کے پیڑ پر جا بیٹھتے ہیں)

جنگلی کبوتر :۔ یار ذرا مضبوطی سے ڈال کو پنجوں میں پکڑے رہنا۔ اِدھر بھاری بھرکم چنگھاڑا اور آپ زمین پر آ رہے جیسے گولی لگ گئی ہو۔

(ایک بوڑھا اور ایک نوجوان ہاتھی اکھاڑے میں آتے ہیں)

شہری کبوتر :۔ ہمارے شہر میں پہلوانوں کے لنگوٹ باندھا جاتا ہے)

جنگلی کبوتر :۔ کیا شہر کی بات کر رہے ہو۔ انھیں کتنے گز کپڑا چاہئے۔ لنگوٹ کے لئے ماموں جان دُبلے پتلے تھوڑی ہیں! اور دوست خود شہر میں لنگوٹ تو کیا لباس ہی کم سے کم پہنا جا رہا ہے ہماری تہذیب اپنانے کی ناکام کوشش ہے۔ یوں سمجھو کوا چلا ہنس کی چال

شہری کبوتر :۔ اصل میں قدرتی لباس تو صرف پرندوں کو ملا ہے۔ جانوروں کی جلد تو رنگ دی گئی ہے۔

تمہیں راز کی بات بتاؤں آج کل انسان بھی اپنی جلد رنگ رہا ہے۔

جنگلی کبوتر :۔ جی ہاں یہ انسان پرندوں کے نہ سہی، کم سے کم چوپایوں مثلاً گدھے اور بیل کے قریب آ رہے ہیں۔ چلو نیک فال ہے۔ دشمن ہی سہی، دعا کریں گے ان کے لئے (چنگھاڑ کی آواز آتی ہے) لو سنو، وہ کچھ کہہ رہے ہیں۔

بوڑھا ہاتھی :۔ دوستو، بچو اور بچیو! میں برسوں سے آپ کی خدمت کرتا آیا ہوں۔ عمر میں بڑا ہوں۔ کئی معرکے جیتے ہیں۔ جب بھی ضرورت پڑی ہے میں نے اپنی بھاری بھرکم قوم کو ظالم انسانوں کے فریب اور ان کی بندوق کی گولیوں سے بچایا ہے۔ ایک جنگل سے دوسرے جنگل صحیح و سلامت پہنچایا ہے بڑے بڑے پیڑ گرائے ہیں۔ گنے کے کھیت کے کھیت ان کے منہ میں ٹھا دئے ہیں اور کسی انسان کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ تمہارے منہ سے گنا چھین لے۔ ہم نے اپنی چنگھاڑ سے جنگل کے دل ہلا دئے ہیں۔ اپنی قوم کی آن بان شان اونچی رکھی اور تب کہیں سکھ کی سانس لی۔ راحت کی بانسری بجائی اور خوشی کی تان اُڑائی۔ پہلے طاقت زیادہ تھی۔ پہاڑ بھی آنکھ چُراتے، شیر، چیتے اور ریچھ راستا کاٹ کر نکلتے۔ دریا کا پانی اپنی گود میں نہلا، دائیں بائیں سے سلام کر نکل جاتا۔ غرض پہلے بَل بوتا زیادہ تھا۔ اور اب تجربہ، ذہانت اور سوجھ بوجھ زیادہ ہے۔ یہ بچّہ جمعہ جمعہ آٹھ دن کا۔ نئے پیپل کے پیڑ کی عمر کا ہے، بھلا میرے مقابلے میں آیا ہے۔ چند گیدڑوں کی مدد سے لیڈر بن جانا چاہتا ہے۔

ہاتھی اور ہتھنیاں :۔ شرم شرم!

نوجوان ہاتھی :۔ دوستو، بزرگو، ماں بہنو! زمانہ چال غضب کی چل گیا۔ مولانا مغل! پُرانے ہتھکنڈے اب نہیں چلتے۔ اب طاقت کے ساتھ دماغ بھی چاہئے۔ رہی بزرگوار کے کارناموں کی بات، اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی نرالی مثال ہے۔ قوم پر احسان کم، آفتیں زیادہ ڈھائی ہیں۔ پچھلے سال کھیڑے میں کئی نوجوان ہاتھی، ہتھنیاں اور بچے انسانی ہاتھوں میں پکڑے گئے۔ یہ سب کے سب زخمی ہوئے اور غلام بنائے گئے۔ اگر ذرا بھی ان کا خیال ہوتا تو بجائے چین

بچھنے کے انسانوں سے لڑ کر جان دے دیتے، قوم کو بلا کر اونچ نیچ سمجھا دیتے۔ کھڈے کو اکھاڑ پھینکتے یا دشمن طاقت ور تھا، ہتھیار سے لیس تھا تو کسی دوسرے جنگل کو ہجرت کرنے کی صلاح اور گوریلا لڑائی کی تعلیم دیتے۔

بوڑھا ہاتھی:۔ ہم..... خیر تمہیں پسند نہیں۔ میں صلاح دینے کی سوچ ہی رہا تھا کہ یکایک دشمن چال غضب کی چل گیا۔ میں معصوم ہوں۔

نوجوان ہاتھی:۔ آپ کی معصومیت کے صدقے جاؤں۔ آپ تو انسانوں کی طرح دودھ پیتے بچے ہیں۔ یہ سارے دکھانے اور چبانے کے دانت یوں ہی اُگ آئے ہیں۔ شاید عقل داڑھ کی کمی ہے۔ اب بہانے نہیں چلیں گے۔ دوستو، میں عمر کے سوا ہر اعتبار سے بوڑھے میاں سے افضل ہوں، ذرا انصاف کی کہئے، خدا لگتی کہئے۔ کیا ہم آپ کی پیاری موت کے بعد لیڈر بنیں۔ بزرگ وہ ہیں جو اپنی زندگی میں چھوٹوں کا بھلا کرتے ہیں۔ بھائیو! اب بوڑھے میاں کب تک جئیں گے۔ جلد ہی اللہ کو پیارے ہوں گے۔ اللہ اللہ کریں کسی گوشے کو اپنائیں اور اپنی صحت و تندرستی سدھاریں۔ ورنہ دونوں چیزیں خطرے میں ہوں گی۔ میں ناخلف نہیں ہوں۔ اپنے ماں باپ کی ہونہار اولاد ہوں۔ میں لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مجبوراً قوم کی بھلائی کی خاطر لڑنا پڑ رہا ہے جس کا مجھے افسوس ہے۔

ہاتھی ہتھنیاں:۔ شرم شرم!

بوڑھا ہاتھی:۔ ہائے! شرم تم کو مگر نہیں آتی۔

نوجوان ہاتھی:۔ پہلے آتی تھی تم کو حال دل پہ ہنسی، لیکن افسوس ہزار افسوس اب کسی بات پر نہیں آتی۔

بوڑھا ہاتھی:۔ کام کی بات کرو کام کی۔

نوجوان ہاتھی:۔ بے کار آدمی کام کی بات کرے، تعجب ہے۔

بوڑھا ہاتھی:۔ سنا دوستو گویا ہم انسان ہیں جو کار، بس، لاری، جیپ وغیرہ کی بات کریں۔

نوجوان ہاتھی:۔ آپ باتوں کے دھنی ہیں۔ انسانوں کے ملا، پنڈت وغیرہ ہیں جناب عالی! آپ کی زبان ایسی قینچی ہے جسے زنگ نہیں لگتا۔ نہیں نہیں حجام کی قینچی ہیں جو بال کٹنے پر بھی آواز دے اور نہیں کٹنے پر بھی۔ غرض آپ کام کے آدمی ہرگز نہیں ہیں۔ ایک چھوٹا سا خرگوش ایک دن بڑی آسانی سے اپنے آپ کو چاند کا سفیر بنا کر آپ کو اُلو بنا گیا۔

بوڑھا ہاتھی:۔ اُس کے لئے ہمیں نادان ہونے کی گالی نہ دو۔ ہم معصوم تھے۔ شریف آدمی کو دغا و فریب کی باتیں نہیں آتیں۔

نوجوان ہاتھی:۔ حضور! اب آپ کا جادو چلنے والا نہیں۔ آپ نے باتوں کا اسٹاک بھی ختم کر لیا ہے۔ جب بڑھاپا آجاتا ہے تو جنگل کے کسی کونے میں دادی اماں کے ساتھ بیٹھ کر جگالی کرنی چاہئے۔ آپ کی عقل پہ ترس آتا ہے۔ شریف جانوروں کی طرح نوجوانوں کو جنگل کی حکومت سونپ کر موج کر سکتے ہیں۔ اب جنگل سے بھی گئے۔ عزت سے بھی گئے۔

بوڑھا ہاتھی:۔ نہیں! ربِّ رحیم کے مطابق ذرا مقابلہ ہو جائے تو پتہ چلے کہ کس کا پتّا پانی ہوتا ہے۔ ہم سے ٹکر لینا موت کو دعوت دینا ہے۔ ایک ہی ٹکر میں گردے بل جائیں۔ دل دہل جائیں، سہم جائیں۔ پتّا

کمبل کا پانی ہوگیا ہوگا۔

نوجوان ہاتھی:۔ دادا! تم دھوکے سے بہادر تو ہرا دو، ورنہ جیت تو سولہ آنے میری ہے۔

بوڑھا ہاتھی:۔ بڑے بول کا سر نیچا کچھ کر گزرو پھر سر اونچا کرو۔ بڑے بول بولو۔

[دو بھورے رنگ کے ہاتھی داخل ہوتے ہیں۔ دونوں سلام کرتے اور سلام لیتے ہیں]

دونوں ہاتھی:۔ ہم امپائر تشریف لاتے ہیں۔ ہم انصاف ہیں۔ انسان کا انصاف اندھا اور ہمارا روشن اور آنکھ والا۔ کیونکہ اُن کا دیوتا آنکھ پر سیاہ پٹی باندھ کر ترازو پکڑتا ہے۔ ڈنڈی مار کر کہتا ہے کہ میری آنکھوں پر پٹی کس کر باندھ دی گئی ہے۔ ہمارا دیوتا کھلی آنکھ دیکھتا ہے۔ اور ترازو کے بغیر انصاف کرتا ہے۔ اس لئے ڈنڈی مارنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

سارے ہاتھی:۔ (خوش ہوکر) جنگلی تہذیب اور ہماری بھرکم قوم کی جے ہو، جے اسے، جے اسے، جے اسے ہے۔

امپائر ہاتھی:۔ کشتی، ٹکر اور مقابلے سے پہلے جنگلی تہذیب اور ہماری بھرکم جنگلی قوم کی ریت اور رسم کے مطابق ہم ایک بار منع فرماتے ہیں۔ ہم آپس میں لڑیں گے تو ہماری معزز جنگلی قوم کے نیک اور اچھے لوگوں پر کیا بیتے گی۔

نوجوان ہاتھی:۔ بزرگو اور محترم سابق لیڈر صاحب.....

بوڑھا ہاتھی:۔ (بات کاٹ کر) سابق کیوں؟ ابھی تو میں اپنے عہدے پر ہوں۔

نوجوان ہاتھی:۔ جنگل کی ساری نوجوان ہتھنیاں اور ہاتھی یہ چاہتے ہیں کہ اُن کا لیڈر کوئی بڈھا کھوسٹ نہ ہو۔ نوجوان ہو۔ جس کا دماغ تازہ، دل تازہ، خیالات تر و تازہ، غرض ہر چیز تازہ ہو۔ یہ خوبیاں جنگل کی قسم خدا مجھ سے جھوٹ نہ بلوائے۔ مجھ میں سو فی صدی ہیں۔ دوستو! دُنیا سے آہستہ آہستہ جنگلی تہذیب مٹتی جا رہی ہے۔ انسان ہمارا بڑا بھاری دشمن ہے۔ وہ جنگلات ہی کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ آدھے سے زیادہ جنگل کو کاٹ چکا اور جلا چکا ہے۔

بوڑھا ہاتھی:۔ سنا دوستو! کالا جھوٹ۔ جھوٹ بول رہے تمام ہاتھی برابر ہیں۔ کیا زمانہ آیا، ہم بوڑھوں کے دُنیا بھر کے احسانات ہیں۔ ان نوجوانوں پر مگر یہ احسان فراموش، پتہ نہیں خدا کو کیا منہ دکھائیں گے

نوجوان ہاتھی:۔ پہلے آپ جنگل کو منہ دکھائیں رہی خدا کو منہ دکھانے کی بات! عمر ہی کتنی رہ گئی ہے؟ بوڑھاپا دستک دئے بغیر آپ کی عمر شریف میں جو گھس آیا ہے۔

[سب ہنستے ہیں]

امپائر:۔ خاموش خاموش۔

بوڑھا ہاتھی:۔ امپائر صاحبان! آپ جانتے ہیں کہ یہ نوجوان کس طرح اپنے پیارے اور مہذب جنگل کے قواعد اور ضوابط کو توڑنا چاہتا ہے۔

دوستو، قواعد جمع ہے قاعدے کی اور ضابطہ کی جمع ٹھہری ضوابط۔ اب آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ معاملہ واحد کا نہیں جمع کا ہے۔

ہاتھی ہتھنیاں:۔ ہاں سمجھ میں آرہا ہے ہمارے پاٹھوں کو مُلا پنڈت سے قاف سے قواعد پڑھتے اور ضاد سے ضوابط رٹتے سُنا ہے۔

بوڑھا ہاتھی:۔ یہ آتو کی دُم فاختہ نوجوان

انسانوں کی بستی کے رسم و رواج قائم کرنا چاہتا ہے۔

امپائر:۔ یعنی؟

بوڑھا ہاتھی:۔ ووٹ کا طریقہ ایجاد کرنا چاہتا ہے۔

امپائر:۔ بُرا کیا ہے؟

بوڑھا ہاتھی:۔ آپ تو جانتے ہیں اَور ہم نے ہیرامن طوطے سے سُنا تھا کہ انسان نے اپنے مطلب کے لئے یہ طریقہ ایجاد کیا تھا۔ چمک دمک میں سونا تھا لیکن اصل میں یہ جال تھا۔ ووٹ میں پانچ چھے، پان سات نہیں پورے پان سو، خرچتا ہے اور جب تک اصل سُود سمیت وصول نہیں ہوجاتا، اُس وقت تک خدمت مفت نہیں بلکہ ہدیہ لے کر کی جاتی ہے۔

امپائر:۔ خوب خوب!

جوان ہاتھی:۔ مائی باپ! ادب بے اَدبوں سے سیکھا جاتا ہے۔ صرف عقل چاہئے۔ اچھی چیز روس امریکا، برطانیہ اَور چین میں بھی ہو تو سیکھنی چاہئے۔

امپائر:۔ دیکھو، شہر سے جنگل میں اخباری نمائندے بھی آچکے ہیں۔ جنگلی تہذیب کے ہلاکو اور چنگیز ریچھ اَور بھیڑیے بھی چھپے بیٹھے ہیں۔ اِن کی نیت بُری ہے۔ گھنے درختوں اور گھنی جھاڑیوں پر بھی ذرا نظر ہے۔ آج جب کہ ہر پیڑ پتے کے بھی کان ہیں جنگل کی بدنامی کا ڈر ہے۔ ظلم تو پہلے ہی سے انسان کے پاس ہے، بہتر ہے۔ آپس میں تصفیہ ہوجائے۔

نوجوان ہاتھی:۔ مجھے منظور ہے۔ ووٹ سے معاملہ طے ہوجائے تو خون خرابے سے بھی ہم بچ جائیں۔

بوڑھا ہاتھی:۔ مجھے منظور ہے۔ مگر فیصلہ ووٹ کے بغیر ہو اَور میرے جینے تک مجھے لیڈر تسلیم کرلیں اور تنظیم میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں۔

(ہر طرف سے "تا" "تا" کی آوازیں گونجتی ہیں)

امپائر:۔ بوڑھے میاں! ہماری مانو عقل کے ناخن لو۔ رضاکارانہ طور پر لیڈرشپ نوجوان کو سونپ دو۔ اس طرح پانچوں گھی میں رہیں گی۔

بوڑھا ہاتھی:۔ اَور میرا سر کڑھائی میں۔

امپائر:۔ نہیں بلکہ تمہارا سر سلامت رہے گا۔ وہ طاقت ور ہے اَور پبلک بھی اُس کے ساتھ ہے۔

بوڑھا ہاتھی:۔ میری عزت کا سوال۔؟

امپائر:۔ جھوٹی عزت کا خیال بُرا ہے۔ تم نے ہیرامن طوطے سے جو انسانی قید سے نکل کر جنگل میں آیا تھا انسانی تہذیب کے ختم ہونے کی کہانی سُنی ہوگی۔ کاش! تم نے اچھے کام کئے ہوتے، تو نوجوان ہاتھی کی یوں تمہیں للکارنے کی ہمت نہ ہوتی۔

بوڑھا ہاتھی:۔ نہیں میں لڑوں گا۔

امپائر:۔ انسانی دُنیا میں بال ہٹ تریا ہٹ، اَور راج ہٹ کی بات کہی گئی تھی اَور یہ بوڑھی ہٹ جنگل میں سُن لی۔ جنگل اَور اُس کی تہذیب کا اللہ ہی حافظ ہے ..... ٹھیک ہے (چیخ کر) دوستو! لیڈرشپ کے لئے لڑائی ہوگی۔ لیکن ایک بات رہے۔ بوڑھا ہارے یا جوان۔ ندی نالے میں ڈوب مرے یا کہیں چھپ کر بیٹھ رہے۔ دیکھا گیا ہے ہارنے والے اکثر کمزوروں پر ظلم کرتے ہیں۔ انسان بُرا سہی لیکن پھر بھی ظلم ہماری تہذیب کے شایانِ شان نہیں

(اب دونوں ہاتھی اپنی اپنی سونڈ گھوم کر تماشائیوں کو سلام کرتے پھر چنگھاڑتے ہیں۔ سلامی

جاتا ہے۔ ہتھنیاں اور بچے ڈر کر ایک طرف سرک جاتے ہیں۔ دونوں ہاتھی پیچھے ہٹ کر آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے سر ٹکراتے ہیں۔ پھر اپنی اپنی سونڈ سے ایک دوسرے کے بھاری بھرکم لوہے کے ستون جیسے پاؤں پکڑ کر گرانے کی کوشش ہوتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کے سر زخمی ہو جاتے ہیں تو ان کے جسم بھر جاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد بوڑھا ہاتھی تھکا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ہاتھی :۔ (امپائر کی طرف دیکھ کر) دس منٹ آرام کی خواہش ہے۔ انٹرول تو ہونا ہی چاہیے۔

:۔ وقفہ کے لئے ابھی آدھا گھنٹہ باقی ہے۔ یہ ٹکر دو گھنٹوں کی ہوگی۔

ہاتھی :۔ ابھی آدھا گھنٹہ باقی ہے؟ امپائر صاحب، آخر یہ ابھی بچہ ہے۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا۔ رحم آتا ہے۔ آپ کہیں تو میں اسے چھوڑ دوں۔

ن ہاتھی :۔ مجھے کسی کا رحم نہیں چاہیے۔

نوجوان ہاتھی نے بھرپور قوت سے بوڑھے ہاتھی کے ٹکر ماری۔ بوڑھا گرتے گرتے بچا اور سارے تماشائیوں نے خوشی سے چنگھاڑ کر جنگل کو سر پر اٹھا لیا۔ نوجوان ہاتھی میں اب دوگنی ہمت آ گئی، وہ آگے بڑھا اور "یا جنگل مدد" کہہ کر وہ بھرپور ٹکر ماری کہ بوڑھا پتھر کی طرح لڑھک گیا۔ امپائروں نے ایک دو تین گننا شروع کر دیا۔

بوڑھا ہاتھی :۔ ذرا آہستہ آہستہ گنئے۔ بھاری بھرکم جسم ہے۔ جوانی میں آگ تھے ہم۔

نوجوان ہاتھی :۔ اب بوڑھاپے میں خاک ہو تم۔

بوڑھا ہاتھی :۔ خاکسار ہیں۔ مغرور نہیں تم نوجوانوں کی طرح۔

بوڑھی ہتھنی : (آگے بڑھ کر) کیا تم دونوں اپنی قوم کا مذاق اڑاؤ گے۔ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا مگر دیکھ رہی ہوں کہ پیڑ پر بندر ٹہنیوں سے لٹکے ہنس رہے ہیں۔ دن کے اندھے الو بھی خوشی میں ہوک رہے ہیں۔ کیا یہ اندھے کنویں میں ڈوب مرنے کی بات نہیں ہے؟ (نوجوان ہاتھی سے) میرے بچے جب تمہاری ماں کا دودھ سوکھ گیا تھا تو میں نے تمہیں پلایا تھا۔ میرے بچے میری مانو، بڑوں کی عزت کرنا سیکھو۔ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو (بوڑھے ہاتھی سے) میاں بوڑھے، تمہاری ماں میری سہیلی تھی اور تمہاری بیوی میری شاگرد، آج دونوں اس جنگل میں نہ رہیں۔ میری مانو میری سنو! تم نے اچھے دن دیکھے ہیں۔ اب ان نوجوانوں کو دیکھنے دو۔ تم بزرگ بن کر انھیں راستہ دکھاؤ۔ ورنہ کل کلاں کو تاریخ لکھی جائے گی تو سارے برِ اعظموں کے جنگلوں میں ہمارے نام پر، جنم پہ تھوکا جائے گا اور انسان تو بس ہمارا مذاق ہی اڑائے گا۔

بوڑھا ہاتھی :۔ اچھا تو آپا جان! تم جنگل کی سب سے بوڑھی خاتون ہو، تم کہتی ہو تو میں اس کو بخش دیتا ہوں، (نوجوان ہاتھی سے) جا نوجوان! تو بھی کیا یاد کرے گا کہ ہم جیسا کوئی شریف ہاتھی بھی تھا۔

نوجوان ہاتھی :۔ لیکن ....

امپائر :۔ (سونڈ سے اس کا منہ بند کرتے ہوئے) اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو، بات میں بات بڑھتی ہے، بات کا بتنگڑ بنتا ہے۔

(باقی صہ ۹۲ پر)

مناظر عاشق ہرگانوی

"کھوٹا سکّہ"

تامل ڈراما

پہلا منظر

[اُنبی بے حد اُداس سا داخل ہوتا ہے]

راجا:۔ کیا ہوا اُنبی؟ آج تم اتنے اُداس کیوں ہو؟ کسی نے کچھ کہا ہے یا کسی سے جھگڑا ہوا ہے؟

اُنبی:۔ کچھ نہیں راجا! آج ماں نے ایک نئی پنسل خرید کر دی تھی، وہ کہیں گم ہوگئی ہے۔ شاید کسی نے میری جیب سے نکال لی۔

راجا:۔ تمہیں کسی پر شک ہے؟

اُنبی:۔ میری بغل میں وہ کِٹّو بیٹھا کرتا ہے نا....

راجا:۔ شاید اُسی نے لی ہو....

اُنبی:۔ ہاں، اُسی پر میرا شک ہے۔

راجا:۔ اچھا، تو اب سمجھا....

اُنبی:۔ کیا؟

راجا:۔ اُس دن ماسٹر صاحب کی نظر بچا کر کِٹّو نے کھڑی (چاک) کے چھوٹے ٹکڑے اپنی جیب میں ڈال لئے تھے۔ مَیں نے دیکھ لیا تو گڑگڑانے لگا کہ ماسٹر صاحب سے شکایت نہ کرنا...." ہاں بھیّا تو تمہاری پنسل کس رنگ کی تھی؟

اُنبی:۔ میری پنسل کا رنگ نیلا تھا۔ پیچھے ربر لگی ہے۔

راجا:۔ اچھا، میں پتہ لگاؤں گا۔

اُنبی:۔ راجا، وہ دیکھو، کِٹّو آرہا ہے، اُس سے پوچھو نا!

راجا:۔ پوچھنے سے کیا ہوگا، کیا وہ کہہ دے گا کہ مَیں نے پنسل چُرائی ہے؟ تم چُپ رہو۔ مَیں دیکھ لوں گا۔

[کِٹّو آتا ہے]

کِٹّو:۔ کیوں راجا، اُنبی اتنا اُداس کیوں ہے؟

راجا:۔ کچھ نہیں، اُنبی۔ تم گھر جاؤ۔ مَیں بعد میں آؤں گا۔

اُنبی:۔ اچھا۔ (جاتا ہے)

راجا:۔ کل حساب کا پرچہ ہے۔

کِٹّو:۔ حساب کے امتحان کی یاد آتی ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے مَیں ریچھ، شیر، چیتے، ہاتھی وغیرہ سے اُلجھ رہا ہوں۔

راجا:۔ حساب تو بڑا آسان سبجکٹ (مضمون) ہے۔

کِٹّو:۔ میرے لیے صفر کا ہندسہ پانا اُس سے زیادہ آسان ہے۔

راجا:۔ مجھے تو معلوم ہے کہ کل امتحان میں کون کون سے سوال آئیں گے۔

کِٹّو:۔ ارے تمہیں کیسے معلوم ہوا؟

راجا:۔ بس، معلوم ہوگیا۔

کِٹّو:۔ بھائی! مجھے بھی کچھ بتاؤ۔ تمہاری مہربانی سے میرے بھی دس فی صدی نمبر آجائیں گے۔

راجا:۔ دس فی صد نمبر پانے سے کیا ہوگا؟

کِٹّو:۔ ماں باپ کو تعجب میں ڈال دوں گا۔

راجا:۔ اچھا، پھر کاغذ پنسل سنبھالو۔

کِٹّو:۔ ذرا ٹھہرو۔ بستے سے نکال لوں۔

(بستے سے کاغذ اور نیلی پنسل نکالتا

ہے)

راجا:۔ لکھو! ایک بار ایک آدمی ایک پنسل چُراتا ہے۔

بِٹّو:۔ یہ کیا بکتے ہو؟

راجا:۔ پہلے لکھو، پھر بتاؤں گا۔ ایک لڑکا ایک گھنٹے میں دس پنسلیں چُراتا ہے۔ وہ ایک دن میں کتنی پنسلیں چُرائے گا؟ لکھو، چُپ کیوں کھڑے ہو؟

بِٹّو:۔ یہ کوئی حساب ہے کہ چوری ہے؟

راجا:۔ حساب کو چوری کیوں کہو، اپنے ہاتھ کی پنسل کو کہو۔

بِٹّو:۔ کیا کہا؟ یہ چوری کی پنسل ہے؟ کس نے کہا تم سے؟

راجا:۔ اَنّبی ابھی گیا ہے، اُسی نے کہا ہے۔ سچ سچ بتاؤ کِٹّو، یہ نیلی پنسل تمہیں کہاں سے ملی؟

کِٹّو:۔ لال پنسل کے ساتھ یہ بھی خریدی ہے۔

راجا:۔ جھوٹ مت بولو۔ جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ یہ پنسل اَنّبی کی ہے۔ اُس نے یہ کہنے کے بدلے کہ تم نے چُرالی، یہ کہا کہ تم نے لے لی۔

کِٹّو:۔ یہ اُس کی پنسل ہے تو لے لو۔ مجھے کوئی عذر نہیں۔ لو، تم ہی اسے اَنّبی کے پاس پہنچا دینا۔

ہاں! اپنے پاس نہ رکھ لینا، مجھے

(کِٹّو جاتا ہے)

دوسرا منظر

اَنّبی:۔ کیوں ماں، تمہارا چہرہ کچھ اُترا اُترا سا ہے؟

ماں:۔ کچھ نہیں بیٹا! تمہاری کتابوں کے واسطے ایک ہی روپیہ میرے پاس تھا، مگر سامنے والے گھر کی بڑھیا کے پوتے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ دوا خریدنے کے لیے پیسہ نہیں تھا، اِس لیے .....

اَنّبی:۔ وہ روپیہ دے آئیں ماں؟

ماں:۔ ہاں بیٹا! تمہاری کتابیں خریدنے کے لئے .....

اَنّبی:۔ پیسہ نہیں ہے تو فکر کی بات نہیں۔ میں بغل والے لڑکے کی کتاب دیکھ لوں گا۔ بعد میں خرید دینا۔

ماں:۔ ہاں، ہاں، ضرور خرید دوں گی۔ تمہیں اِس سے کوئی رنج تو نہیں ہوا نا؟

اَنّبی:۔ رنج کیسا؟ بڑھیا کے پوتے کے علاج کے لیے اگر تم وہ روپیہ نہ دے آتیں، تب مجھے رنج ہوتا۔ اب تو میں خوشی محسوس کر رہا ہوں۔

تیسرا منظر

(گلی میں)

راجا:۔ اَنّبی! اتنی تیزی سے کہاں جا رہے ہو؟ ذرا ٹھہرو، میں بھی آتا ہوں۔ لیکن تم تو آج بھی اُداس ہو، کیوں؟

اَنّبی:۔ کوئی بات نہیں ہے۔ بغیر کتاب کے جماعت میں جانے سے عجیب سا لگتا ہے۔

راجا:۔ فکر نہ کرو۔ میرے گھر آؤ۔ میں اپنے ڈیڈی سے کہہ کر تمہیں ایک روپیہ دلا دوں گا۔

اَنّبی:۔ نہیں راجا! میری ماں ناراض ہوں گی۔

راجا:۔ ناراض کیوں ہوں گی؟

اَنّبی:۔ اُن کا کہنا ہے کہ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا بُری بات ہے۔

راجا:۔ ماں کہتی ہیں تو کہنے دو۔ چھوڑو اُن کی بات۔

اَنّبی:۔ ماں کی بات ماننا سب کا پہلا فرض ہے۔ ماں کی باتیں امرت کی طرح ہوتی ہیں۔

راجا:۔ اچھا، تم اسکول جاؤ، میں پیچھے سے آتا ہوں۔

اَنّبی:۔ جلدی آجانا۔

[راجا جاتا ہے۔ کِٹّو سامنے سے آتا ہے اور اَنّبی سے ٹکرا جاتا ہے]

کِٹّو:۔ کیوں بھئی، راستہ دیکھ کر کیوں نہیں چلتے؟ اس طرح آکر ٹکراتے ہو۔ ارے اَنّبی! تم اداس کیوں ہو؟

اَنّبی:۔ اُداس وداس کچھ نہیں ہوں۔

کِٹّو:۔ تو خوش رہو یار! منھ کیوں لٹکائے رہتے ہو؟

اَنّبی:۔ کیا بتاؤں۔ تامل کی کتاب نہیں ہے۔ جماعت میں کیسے جاؤں؟ ایک روپیہ چاہئے۔ جیب میں ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔ اِس لئے سوچ میں ہوں۔

کِٹّو:۔ تمہاری حالت پر مجھے ترس آ رہا ہے۔ مگر کیا کیا جائے؟ وہ دیکھو بسنتا، جیٹّو، گوپو وغیرہ آ رہے ہیں۔ آؤ، ہم سب چل کر کھیلیں۔

اَنّبی:۔ تم جاؤ، میں نہیں جاؤں گا۔

کِٹّو:۔ مجھے اجازت دینے والے تم کون ہوتے ہو؟ میں تو جا کر کھیلوں گا ہی۔

(کِٹّو جاتا ہے)

اَنّبی:۔ (خود سے) اب گھر چلنا چاہئے۔ شاید ماں پیسہ .... (پیروں نیچے سکّے کے جھنجنانے کی آواز)

ارے، یہ کیا؟ سکّہ! یہ تو چاندی کا روپیہ ہے! نہ جانے کس کا گر پڑا ہے، پتہ لگا کر اُسے سونپ دینا چاہئے۔

چوتھا منظر

(مدرسے کا صدر دروازہ)

گوپو:۔ کِٹّو، کل چھٹّی ہے۔

کِٹّو:۔ ایں، چھٹّی! تب تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ (گا نے لگتا ہے)

ہم کھیلیں گے، دن بھر ہم کھیلیں گے
گلّی، ڈنڈا، کبڈّی سب کھیلیں گے

[بسنتا، جیٹّو وغیرہ آتے ہیں]

بسنتا:۔ یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔

کِٹّو:۔ تب تم ہی بتاؤ، ٹھیک کیا ہے؟

بسنتا:۔ گھر جا کر حساب کے سوال حل کرنا ہیں۔

کِٹّو:۔ ہوم ورک!

بسنتا:۔ ڈیڈی کو دکھلانا ہیں، دکھلا کر غلطیاں ٹھیک کرانا ہیں۔ سمجھے؟

کِٹّو:۔ سمجھا۔

بسنتا:۔ کیا سمجھے؟

کِٹّو:۔ یہی کہ تمہارے ڈیڈی تمہارے لے حساب کے سوال حل کرتے ہیں۔

بسنتا:۔ اور کچھ نہیں؟

کِٹّو:۔ کیوں نہیں، کل چھٹّی ہے۔ چھٹّی میں ہم سب کھیلیں گے۔

گوپو:۔ ابھی گھنٹی بجنے میں دیر ہے۔ کیا کریں؟

کِٹّو:۔ چاہو تو تم جا کر گھنٹی بجا دو۔ اسکول شروع ہو جائے گا۔

گوپو:۔ تب تک کچھ کھیلیں تو کیسا رہے۔

بسنتا:۔ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ کھیلوں گی۔

گوپو:۔ ہم تو کرکٹ کھیلنے والے ہیں۔

بسنتا:۔ میں بھی کھیلوں گی۔

کِٹّو:۔ ہم ہاکی کھیلیں گے۔

بسنتا:۔ میں بھی ہاکی کھیلوں گی۔

کِٹّو:۔ نہیں، ہم نٹ بال کھیلیں گے۔

بسنتا:۔ اچھا آؤ، کھیلیں۔

کِٹّو:۔ ہائی جمپ، لانگ جمپ۔

بسنتا:۔ میں بھی تیار ہوں۔

کِٹّو:۔ تب تو ہم لڑکوں کو چاہئے کہ بھنوری اور سلیپنگ وغیرہ کھیلیں۔

بسنتا:۔ کیا کہا؟ سلیپنگ؟ یہ کون سا کھیل ہے؟

کِٹّو:۔ وہی جس میں ایک رسّی ہوتی ہے۔ لڑکیاں اس کے دونوں سروں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتی ہیں۔ پھر رسّی کو پیٹھ کے آگے لے جا کر، پیروں کے پیچھے سے لا کر سر پر گھماتی ہو

کو دیتی ہیں۔
دکھیل کی نقل کرکے دکھاتا ہے اور دھڑام سے گر جاتا ہے۔ سب ہنس پڑتے ہیں)

بسنتا:۔ ارے بے وقوف، سلیپنگ نہیں اسکیٹنگ کہو۔

کنّو:۔ ابھی تو سلیپ ہوگیا، کھسک گیا۔ اچھا کہو، کون سا کھیل کھیلیں؟

بسنتا:۔ پھول یا سر!

کنّو:۔ اس کے لیئے تو سکّہ چاہیئے۔ یہاں سکّہ کس کے پاس ہے؟

بسنتا:۔ میرے پاس ہے، لو، ایک رُوپیہ، چاندی کا سکّہ ہے۔

کنّو:۔ اچھا، تو پھر کھیل شروع ہو جائے۔

(بسنتا ٹین کا ڈبا کھول کر رُوپیہ نکالتی ہے۔ اور اوپر اچھالتی ہے۔ رُوپیہ کی جھنجھناہٹ کے ساتھ اسکول کی گھنٹی بج اٹھتی ہے)

بسنتا:۔ لاؤ، میرا رُوپیہ۔ گھنٹی بج گئی، جاتا ہے۔ (سب لڑکے چل پڑتے ہیں)

کنّو:۔ (تھوڑی دیر سوچنے کے بعد خود سے) اچھا، دیکھ لوں گا۔

پانچواں منظر
(کلاس روم)

بسنتا:۔ سچ کہتی ہوں سداشیوم،

ڈبّے سے رُوپیہ غائب ہے۔

سداشیوم:۔ تعجّب ہے! کیسے گم ہوا؟

بسنتا:۔ میں گھر سے لائی ضرور تھی۔

کنّو:۔ ہاں، میں نے بھی تو دیکھا تھا، ہم نے اس سے پھول یا سر کھیلنا بھی شروع کیا تھا

سداشیوم:۔ ڈبّے سے رُوپیہ کیسے غائب ہوا ہوگا؟ اس کا پتہ لگانا ضروری ہے کہ کس نے لیا ہے۔

کنّو:۔ کیسے پتہ لگاؤ گے، جب تمہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ کس نے لیا ہے تو کیسے پتہ لگاؤ گے؟

بسنتا:۔ سب کی جیبوں کی تلاشی لی جاسکتی ہے۔

سداشیوم:۔ ہاں، ہاں سب قطار میں کھڑے ہوجاؤ۔ کنّو، نکو، پنچو، رامو سب کھڑے ہوجائیں۔

کنّو:۔ کیوں سداشیوم، مجھے بھی کھڑا ہونا ہے کیا؟ ہم تم دونوں دوست ہیں نا؟ اس دن تم نے بیچ بازار

میں کتّے کی طرح میرے ہاتھ سے دہی بڑا چھین لیا تھا۔ میں نے تمہیں کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ اتنی جلدی ساری باتیں بھول گئے؟

سداشیوم:۔ گھر، دوکان کی دوستی اور چیز ہے، یہاں کی بات اور ہے۔ جاؤ جلدی قطار میں کھڑے ہوجاؤ۔

انبی:۔ (اندر داخل ہوتا ہے اور پکارتا ہے) سداشیوم! سداشیوم!

سداشیوم:۔ کیا بات ہے انبی؟ تم بھی قطار میں کھڑے ہوجاؤ۔

انبی:۔ کس لیے!

سداشیوم:۔ کھڑے ہوجاؤ، خود ہی معلوم ہوجائے گا۔

کنّو:۔ ہاں، ہاں کھڑے ہوجاؤ۔ میں بھی تمہارے پیچھے کھڑا ہوجاؤں گا۔ تم آگے جاؤ انبی۔

سداشیوم:۔ سب کی جیبیں میں دیکھوں گا دکھاؤ اپنی اپنی جیب۔ کھولو اپنی مٹھی۔ جنّو تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ کاغذ؟

کنّو:۔ پوچھو کس لیئے ہے؟

سداشیوم:۔ تمہارے کھانے کے لیئے ہے۔ چپ بھی رہوگے یا نہیں۔ انبی! تمہاری مٹھی میں کیا ہے

نبی :۔ رُوپیہ ہے۔

سداشیوم :۔ کیا؟ روپیہ ہے؟

توُ :۔ ایک روپیہ نا؟

انبی :۔ ہاں، کیوں میں ایک رُوپیہ نہیں رکھ سکتا کیا؟

سداشیوم :۔ انبی! تمھیں یہ ایک رُوپیہ کہاں سے ملا؟

انبی :۔ راستے میں ملا ہے۔

کنٹو :۔ راستے میں ملا؟ جھوٹ کیوں بولتے ہو؟

سداشیوم :۔ سچ سچ کہو انبی! تمھیں روپیہ کہاں سے اور کیسے ملا؟

کنٹو :۔ وہ سچ کیسے کہے گا سداشیوم! مجھ سے معصوم بن کر کہہ رہا تھا کہ کتاب خریدنے کے لیے میرے پاس ایک رُوپیہ نہیں ہے۔ پھر اچانک ان کے ہاتھ میں ایک رُوپیہ کہاں سے آ ٹپکا! کہتا ہے کہ نیچے پڑا ملا ہے۔ تعجب کی بات ہے۔

انبی :۔ زیادہ زبان نہ چلا کنٹو۔

سداشیوم :۔ بسنتا کا ایک رُوپیہ چوری ہو گیا ہے۔ اسی لیے آتی پوچھ تاچھ کر رہے ہیں۔ یہ رُوپیہ تمھیں کیسے ملا؟

کنٹو :۔ سداشیوم! بے شک یہی بسنتا کا رُوپیہ ہے۔ بسنتا کو رُوپیہ دکھاؤ۔ وہی بتائے گی کہ اس کا ہے یا نہیں؟

سداشیوم :۔ انبی، ذرا دکھاؤ تو دیکھیں۔

کنٹو :۔ میٹھی میٹھی باتوں سے تھوڑے ہی مانے گا۔ چھین لو زبردستی۔

سداشیوم :۔ لاؤ روپیہ! بسنتا، دیکھو! یہ رُوپیہ تمھارا ہے کہ نہیں؟

بسنتا :۔ یہ میرا ہی رُوپیہ ہے۔

سداشیوم :۔ اچھی طرح دیکھو۔

کنٹو :۔ یہ شیر والا سکہ بسنتا کا ہی ہے۔ میں نے پہلے ہی اسے بسنتا کے ہاتھ میں دیکھا ہے۔

سداشیوم :۔ انبی، یہ کام کتنے دنوں سے ہو رہا ہے؟ چلو ماسٹر صاحب کے پاس۔

کنٹو :۔ انبی، یہ کیا کر دیا تم نے؟ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ تم بڑے نیک ہو۔

(راجا آتا ہے)

راجا :۔ یہ کیا؟ بسنتا کیا ہوا؟ کنٹو تم بولو۔ کیا ہوا؟

کنٹو :۔ کچھ مت پوچھو راجا۔ اس نے بسنتا کے ڈبّے سے ایک رُوپیہ لے لیا ہے۔ ہاتھ میں دیکھو وہی رُوپیہ ہے۔ پوچھنے پر کہتا ہے کہ راستے میں پڑا ملا ہے مگر رُوپیہ چوری کا ہے۔

راجا :۔ چوری کا رُوپیہ؟ بکو مت، انبی نیک لڑکا ہے۔ میرے خیال میں اس نے رُوپیہ چرایا نہیں ہوگا مجھے پورا یقین ہے۔

بسنتا :۔ تمھیں یقین ہو تو ہو۔ مجھے اس سے کیا؟ اس نے رُوپیہ چرایا نہیں تو اس طرح مُنہ لٹکائے کیوں کھڑا ہے!

راجا :۔ اس لیے کہ ظلم کا سامنا کرنے کی ہمت اس میں نہیں ہے۔

بسنتا :۔ مگر چوری کرنے کی دلیری کیسے آگئی؟ راجا، یہ میرا ہی رُوپیہ ہے۔

سداشیوم :۔ فضول کی باتیں چھوڑ دو۔ آؤ، ماسٹر صاحب کے پاس چلیں۔

چھٹا منظر

(بسنتا کا گھر)

چندر :۔ ہاں، میری الماری میں ایک کھوٹا سکہ پڑا تھا۔ وہ کیا ہوا؟

بسنتا :۔ (اندر داخل ہوتی ہوئی) بھیا یہ دیکھو رنگوں کا ایک ڈبّہ لائی ہوں۔

چندر :۔ اسے خریدنے کے لیے تم نے پیسے کہاں سے لیے؟

بسنتا :۔ تمھاری الماری میں سے لے گئی تھی۔ بہت دنوں سے ایک رُوپیہ پڑا ہوا تھا۔

چندر :۔ مگر وہ تو کھوٹا سکہ تھا۔ تم نے اُسے کیسے چلا لیا؟

بسنتا :۔ کیا کہا؟ کھوٹا سکہ! مجھے تو معلوم

نہیں تھا۔ مگر بھیّا، مَیں نے دُکان والے کو دھوکا نہیں دیا ہے۔ اسکول میں میرے ڈبّے سے کسی نے یہ رُوپیہ لے لیا تھا تلاشی لینے پر اَنبی نام کے ایک لڑکے کے ہاتھ میں وہ رُوپیہ مِلا پُوچھنے پر اُس نے کہا کہ زمین پر پڑا مِلا ہے۔

چندر:۔ اُس لڑکے کی بات سچ ہے۔ تمہارا رُوپیہ کھوٹا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تو رنگوں کا ڈبّہ خرید لائی۔

بَسنتا:۔ ہاں بھیّا، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ بے چارے کو ماسٹر صاحب سے شکایت کرکے خوب پِٹوایا گیا، اَور اُس کے گھر بھی خبر بھیجی گئی ہے۔ چلو بھیّا، ہم اُس کے گھر چل کر ساری بات بتا دیں۔ بے چارے پر ناحق چوری کا الزام لگ گیا۔ مجھے بے حد افسوس ہو رہا ہے۔

ساتواں منظر

(گلی میں غبارے والا کِٹّو کو پکڑے ہوئے ہے)

غبارے والا:۔ کیوں چھوکرے اکھوٹا سکّہ دے کر مجھے دھوکا دینا چاہتے ہو؟

(کِٹّو ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس میں کئی غبارے پھٹ جاتے ہیں)

کِٹّو:۔ رُوپیہ کے کھوٹا ہونے کا مجھے پتہ نہیں تھا۔ مجھے چھوڑ دو بھائی۔ مَیں آیندہ سے کسی کو کھوٹا پَیسہ دے کر دھوکا دینے کی کوشش نہیں کروں گا۔

غبارے والا:۔ تم نے مجھے دھوکا دے کر تیئیس پَیسے کے غبارے لے لیے ہیں۔

کِٹّو:۔ وہ سب تو پھُوٹ گئے ہیں۔ اب کیا کروں؟ میرے پاس پَیسے نہیں ہیں۔

غبارے والا:۔ تو قمیص اُتار دو۔

(راجا آتا ہے)

راجا:۔ کیوں غبارے والے، تمہیں کِٹّو سے کتنے پیسے لینے ہیں؟

غبارے والا:۔ تیئیس پَیسے ہیں، بیٹا! کھوٹا رُوپیہ دے کر اُس نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی۔

راجا:۔ یہ لو تیئیس پیسے، اور اسے چھوڑ دو۔

کِٹّو:۔ راجا، تم کیوں دو؟ مَیں اپنے گھر سے دِلا دوں گا۔

راجا:۔ کوئی بات نہیں (پیسے دیتا ہے اور غبارے والا جاتا ہے)

کِٹّو:۔ راجا! تم نے ٹھیک موقع پر آکر مجھے بچایا اور میری مدد کی... مگر....

راجا:۔ مگر کیا؟

کِٹّو:۔ مَیں نے بُری حرکت کی تھی۔ بَسنتا کے ڈبّے سے روپیہ چُرا کر الزام اَنبی پر لگا دیا تھا۔ مگر میرا ہی بُرا ہوا۔ بیچ سڑک پر ذلیل ہونا پڑا۔

راجا:۔ فکر نہ کرو۔ مجھے ساری بات معلوم ہے۔ مجھے ہی نہیں بَسنتا، اَنبی سب کو معلوم ہے۔ مَیں تمھی کو ڈھونڈتا ہوا اَنبی کے گھر سے آ رہا ہوں۔ وہاں بَسنتا اور اُس کا بھائی چندر بھی ہیں۔ جو رُوپیہ تمہیں زمین پر پڑا مِلا تھا اُسے تم نے بَسنتا کا رُوپیہ بتایا اور بَسنتا کا کھوٹا رُوپیہ تم نے ہڑپ لیا۔ بَسنتا نے اس رُوپئے سے رنگوں کا ایک ڈبّہ خریدا لیکن گھر جانے پر اُسے اپنے بھائی سے جب معلوم ہُوا کہ وہ رُوپیہ کھوٹا تھا تو وہ فوراً اپنے بھائی کو ساتھ لے کر معافی مانگنے کے لیے اَنبی کے گھر پہنچ گئی۔ کِٹّو، تم جو بھی کہو، اَنبی نیک لڑکا ہے۔

کِٹّو:۔ میں بھی جاتا ہُوں۔

راجا:۔ کہاں؟

کِٹّو:۔ اَنبی کے گھر۔ وہاں سب سے معافی مانگوں گا۔ اور کہوں گا کہ مَیں اب سے نیک لڑکا بنوں گا۔ اَور کبھی بھی بُری راہ پر نہ چلوں گا۔ اِس کھوٹے سکّے نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔

بچوں کی کتابیں

مذہب:-

ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۰/۵۰
آں حضرت	الیاس احمد مجیبی اردو ہندی	۶۵/۰
پاک کہانیاں دو حصوں میں	مقبول احمد سیوہاروی	۲/۳۵
چار یار	الیاس احمد مجیبی	۱/۳۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۲/۲۵
رسول پاکؐ	عبدالواحد سندھی	۱/۸۰
عقائد اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۵۰
مسلمان بیبیاں	مولانا اعجاز الحق قدوسی	۰/۷۵
نبیوں کے قصے	خواجہ عبدالحی فاروقی	۱/۲۵
ہمارے رسولؐ	〃 〃 〃	۱/۶۵
ہمارے نبیؐ	سید نواب علی رضوی اردو ۷۵/۰ ہندی	۰/۴۰

معلومات:-

آدمی کی کہانی	مشتاق احمد	۱/۲۵
انوکھا عجائب خانہ	محمد حسین حسان (چار حصے)	۱/۸۰
بجلی کی کہانی	علی احمد خان	۰/۵۰
بڑے دادا کی کہانی	محمد عبدالغفور	۰/۶۵
تاریخ ہند کی کہانیاں اوّل	نجمہ سلطان	۰/۸۰
〃 〃 〃 دوم	ضیاء الرحمٰن	۱/۰
〃 〃 〃 سوم	مشتاق احمد عظمی	۱/۸۰
〃 〃 〃 چہارم	〃 〃 〃	۰/۹۵
چٹانوں کی کہانی	محمد امین	۰/۷۵
خبر رسانی کے طریقے	رقیہ منظور الامین	۰/۸۵
دنیا کے بچے	محمد حسین حسان	۰/۸۰
دنیا کے بسنے والے	بشیر حسین زیدی	۰/۷۵

دہلی	ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی	۱/۸۰
رابندر ناتھ ٹیگور	فدا حسین	۱/۲۵
سماجی زندگی اوّل	احمد شکیل و غلام ابرار	۰/۶۵
〃 〃 دوم	〃 〃 〃	۰/۸۰
〃 〃 سوم	〃 〃 〃	۰/۸۱
〃 〃 چہارم	〃 〃 〃	۰/۸۱
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	۱/۳۰
سمندر کے نیچے	〃 〃	۲/۰
قدرت کے کرشمے	ادارہ	۰/۶۲
میرا نیس	محمد حسین حسان	۱/۲۵
ہماری پارلیمنٹ	کیلاش چندر	۱/۵۰

کہانیاں، ڈرامے اور ناول

اس نے کیا کرنہ جانا (کہانیاں)	آصف مجیب	۰/۳۷
پریم کی جیت (ڈراما)	اسد اللہ کاظمی	۰/۳۷
تابیل خاں (کہانی)	محمد حسین حسان	۰/۳۰
ترکوں کی کہانیاں (کہانیاں)	مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۰/۵۵
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول)	م ندیم	۱/۵۵
تین اناڑی (ناول)	عصمت چغتائی	۱/۴۰
چیتاق کا ڈبہ (کہانی)	برکت علی فراق	۰/۴۰
چمپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی)	محمد معین	۰/۳۵
ستاروں کی سیر (ناول)	کرشن چندر	۰/۷۵
کوے دادا (سچا ناول)	مجیب احمد خان	۱/۷۵
لال مرغی (کہانی)	عبدالواحد سندھی	۰/۵۰
مزہ چکھائیں گے (کہانی)	مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۰/۳۵
مزے دار پہیلیاں (پہیلیاں)	محمود علی خان	۰/۶۵
ننھا لٹو (کہانی)	خورشیدہ سلطان	۰/۳۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ——— جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

جناب خاور جبل پوری

تلوار اور کوڑا

افراد:۔

سلطان غیاث الدین:۔ ہندوستان کا مشہور بادشاہ
ناظر:۔ ایک دیہاتی بڑھیا کا کم سن بچہ
بانو بیگم:۔ ناظر کی بوڑھی ماں
شہر قاضی:۔ منصف مزاج قاضی
پیش کار:۔ قاضی کی عدالت کا پیش کار
ننھے خاں:۔ عدالت کا جمعدار
بیگم:۔ بادشاہ کی بیوی
خدمت گار۔ اور کنیزیں وغیرہ
وقت صبح
مقام محل سرا

سلطان غیاث الدین نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر اپنی بیگم کے ساتھ ناشتہ کر رہا ہے کئی کنیزیں مورچھل کے پنکھے جھل رہی ہیں۔ لطیفوں چٹکلوں اور گدگدیوں کا دور چل رہا ہے۔ ایک کنیز چاندی کی طشتری میں خوبصورت لفافہ پیش کرتی ہے بادشاہ اسے چاک کر کے دیکھتا ہے۔

بادشاہ:۔ اوہو آج ہمارا جگری دوست آ رہا ہے بیگم تم شام کو پرتکلف دعوت کا انتظام کر دینا۔

بیگم:۔ مناسب ہے عالی جاہ۔

بادشاہ:۔ اُسے ہرن کے کباب بہت پسند ہیں۔ ہم جائیں گے اور انشاء اللہ دوپہر تک شکار لائیں گے

ارے کوئی ہے؟

خادم:۔ جی حضور! کیا حکم ہوتا ہے سرکار

بادشاہ:۔ ہمارا شکاری گھوڑا اور سامان جلد تیار

خادم:۔ بہت اچھا حضور

(سلام کر کے رخصت [illegible] ہے)

ک کنیز:۔ اگر ہرن آجائے تو اعلیٰ درجے کے تکے تیار ہوجائیں۔
سری:۔ اور سیخ کے کباب بھی
یسری:۔ کباب سیخ ہوں میں کروٹیں ہر سو بدلتی ہوں
جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتی ہوں

ادشاہ:۔ بہت خوب
نیز:۔ ظلِ سبحانی کا فیض ہے ورنہ ہم کہاں اور شعر و شاعری کہاں۔
یگم:۔ لیکن آپ کہاں جائیں گے شکار کو۔ موسم بڑا سخت ہے گرمی اور لو سے گھر میں بیٹھے دماغ کھولا جاتا ہے۔
بادشاہ:۔ پھر ہرن کس طرح آئے گا؟
بیگم:۔ کیوں نہیں آئے گا آخر یہ حرام خور شکاری جو مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں کس دن کام آئیں گے۔
ب کنیز:۔ بات یہ ہے کہ از ہیبتِ شاہ جہاں ....
سری:۔ (بات کاٹ کر) گھریلو زبان میں بات کیجیے۔ فارسی وارسی ہم نہیں سمجھتے۔
ی کنیز:۔ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ بادشاہ سلامت کے خوف سے جنگلی جانور روپوش ہوجاتے ہیں اس لیے کسی اور کو ہی جانا چاہیے۔
ب کنیزیں:۔ بے شک بے شک۔
دشاہ:۔ نہیں جی ہم خود ہی شکار کرکے لائیں گے اپنے دوست کے لیے۔

---

(۲)

(دوپہر کا وقت گھنا جنگل۔ چلچلاتی دھوپ میں بادشاہ گھوڑے پر سوار پریشان اور سرگرداں پسینے میں شرابور ادھر اُدھر نگاہیں دوڑا رہا ہے۔ آسمان پر کچھ پرند منڈلا رہے ہیں۔ بادشاہ اسی طرف اپنا گھوڑا ڈال دیتا ہے۔)
آگے ایک چھوٹے چشمے پر ہرن پانی پیتے ہوئے نظر آتے ہیں، بادشاہ اُن پر تیر چلاتا ہے اور وہ سب چوکڑی بھر کر بھاگ جاتے ہیں۔
بادشاہ دوسرا تیر چھوڑتا ہے تو ایک چیخ کی آواز سنائی دیتی ہے
بادشاہ (حیران ہوکر) یا خدا یہ کیا غضب ہوگیا
آگے بڑھ کر۔ کون زخمی ہوا ہے ہمارے تیر سے
ارے یہ یہ بچہ تو مرچکا ہے۔ اس بے گناہ کا خون میرے اعمال نامے میں لکھا جائے گا۔
(دور تک آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے) لیکن آبادی کا نشان بھی نظر نہیں آرہا ہے۔ خیر میں اپنا تیر جس پر شاہی نشان بنا ہے اِس بچے کی لاش کے پاس چھوڑے جاتا ہوں جس سے تلاش کرنے والوں کو صحیح پتہ لگ جائے گا۔
بادشاہ واپس آتے ہی کچھ ملازموں کو پتہ لگانے بھیجتا ہے لیکن کہیں اس مقتول بچے کے وارثوں کا پتہ نہیں چلتا۔

---

(۳)

(قاضی صاحب اپنی نشست گاہ پر گاؤ لگا کر بیٹھے ہیں اہل کار اور ہرکارے وغیرہ قریب کھڑے ہیں)
(قاضی صاحب کے حکم سے ایک نقیب دکچہری میں آواز لگانے والا) تین مرتبہ پکارتا ہے)
"عرضی درخواست دینے والے حاضر ہوں"
(تیسری آواز پر ایک دیہاتی بڑھیا ہانپتی کراہتی ہوئی قاضی کے سامنے آتی ہے اور سلام کرکے کہتی ہے۔)

قاضی صاحب میرا انصاف کیا جائے میں لٹ گئی برباد ہو گئی سرکار

قاضی:۔ کیا ہوا آخر صاف صاف کیوں نہیں کہتی؟

بڑھیا:۔ میرا ایک ہی بچہ تھا سرکار۔

قاضی:۔ پھر کیا ہوا؟

بڑھیا:۔ وہ تیر سے شکار کر دیا گیا

قاضی:۔ کس نے شکار کیا اسے؟

بڑھیا:۔ (تیر پیش کر کے) یہ دیکھ لیجیے قاضی صاحب اس پر نشان موجود ہے۔

(تیر پر نشان دیکھ کر قاضی دم بخود ہو جاتا ہے۔ سوچنے لگتا ہے اور خود سے کہتا ہے)

(اگر میں اس معاملے کو ہاتھ میں لیتا ہوں تو شاہی عتاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر ٹال دیتا ہوں تو خدا کی عدالت میں مجھے مجرم کی حیثیت سے جوابدہی کرنی پڑے گی۔ لیکن کچھ بھی ہو سچائی اور انصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔) اچھا بڑی بی۔ تمھارا نام کیا ہے؟

بڑھیا:۔ بانو بیگم

قاضی:۔ بانو اب تم جاؤ ایک ہفتہ بعد آج ہی کے دن پھر آجانا۔ میں مجرم کو حاضری کے لیے سمن جاری کر رہا ہوں۔

(۴)

قاضی:۔ (پیش کار سے) آج ہی غیاث الدین بادشاہ کے نام مقرر کی ہوئی تاریخ پر حاضر ہونے کے لیے ہماری مہر سے سمن نکال دو۔

پیش کار:۔ مگر اس سمن کی تعمیل کون کرائے گا

قاضی:۔ اس کا انتظام ہم کر دیں گے تم فکر نہ کرو۔

(پیش کار بہت اچھا کہہ کر سمن لکھنے لگتا ہے اور لکھنے کے بعد قاضی کی خدمت میں پیش کرتا ہے قاضی اسے دستخط کر کے جمعدار کو آواز دیتا ہے)

ننھے خاں ادھر آؤ

ننھے خاں: جی حضور، کیا حکم ہے

قاضی:۔ تمھارے چپراسیوں میں سب سے زیادہ ہوشیار اور نڈر کون ہے۔؟

ننھے خاں:۔ جی سب سرکاری نمک خوار خاں ہیں جو حکم ہو تعمیل کریں گے۔

قاضی:۔ اچھا تو ہمارے سامنے سب کو حاضر کیا جائے۔

(سب چپراسی قاضی کو سلام کر کے ادب سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔)

قاضی:۔ شہنشاہ غیاث الدین کی عدالت میں حاضری کی اطلاع دینے کی ذمّے داری کون لیتا ہے؟

(چپراسی خاموش کھڑے ہیں کوئی جواب نہیں دیتے۔)

قاضی:۔ (غصّے سے) بولتے کیوں نہیں، کم بختو میں تم سب کو ابھی ملازمت سے برطرف کر دوں گا۔

(چپراسی کانپ جاتے ہیں مگر منہ سے بات نہیں نکلتی۔)

قاضی:۔ سب کے سب نمک حرام ہو جاؤ ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔

(چپراسی ایک ایک کر کے عدالت کے کمرے سے باہر چلے جاتے ہیں۔)

قاضی:۔ (ننھے خاں سے) بڑی دقّت ہے۔ اب کیا کیا جائے!

ننھے خاں:۔ کوئی فکر کی بات نہیں ہے جناب! مجھے دیجیے سمن میں اس کی تعمیل کراؤں گا۔

قاضی:۔ شاباش، ہر شخص کو ایسی ہی ہمت اور جرأت سے کام لینا چاہیے۔ لو یہ سمن اور خدا کا نام لے کر جاؤ اپنا فرض پورا کرنے۔

(ننھے خاں سمن لے کر جاتا ہے۔ شاہی محل کا صدر دروازہ بند ہے اندر اور باہر سپاہی پہرا دے رہے ہیں۔ دوپہر کا وقت ہے۔ بادشاہ کھانا کھا کر بستر پر لیٹنے جا رہا ہے۔ ننھے خاں سوچتا ہے کہ بڑی مشکل آ پڑی اگر بغیر تعمیل واپس جاتا ہوں تو قاضی سزا دے گا اور بادشاہ سے کچھ کہتا ہوں تو سر سلامت نہیں رہ سکتا۔)

(دیر تک سوچنے کے بعد وہ بلند آواز سے اذان دیتا ہے اللہ اکبر اللہ اکبر۔ اللہ اکبر اللہ اکبر)

(بادشاہ حیران ہو کر جھروکے سے دیکھتا ہے)

بادشاہ:۔ کون ہے یہ پاگل آدمی۔ اس کو ہمارے سامنے حاضر کیا جائے (ننھے خاں بادشاہ کو جھک کر سلام کرتا ہے۔)

بادشاہ:۔ کون ہو جی تم؟

ننھے خاں:۔ (ڈرتے کانپتے ہوئے) میں۔ میں۔ حضور حضور

بادشاہ:۔ میں میں حضور حضور کیا۔ صاف صاف بات کرو ورنہ سر اڑا دیا جائے گا تمہارا

ننھے خاں:۔ (سہم کر) جہاں پناہ میں جمعدار کی عدالت ہوں۔

بادشاہ:۔ (مسکرا کر) پاگل معلوم ہوتے ہو تم۔ جمعدار کی عدالت کیا بلا ہوتی ہے۔

ننھے خاں:۔ نہیں غریب پرور عدالت کا جمعدار ہوں۔

بادشاہ:۔ یہاں کیوں آئے تم اور بے وقت اذان کس لیے دی؟

ننھے:۔ حضور کی قدم بوسی حاصل کرنے کو۔

بادشاہ:۔ تمہیں معلوم نہیں کہ بے وقت اذان دینے والے مرغ کا سر کاٹ دیا جاتا ہے

ننھے:۔ مگر میں مرغ نہیں ہوں۔ آدمی ہوں سرکار!

بادشاہ:۔ آدمی تو ہو مگر پاگل آدمی۔ اچھا اپنا مقصد جلد بیان کرو ہمارے آرام میں خلل پڑ رہا ہے۔

ننھے خاں:۔ (سمن بادشاہ کو دے کر) عالی جاہ خود ہی ملاحظہ فرمالیں۔

بادشاہ: (سمن پڑھ کر) بہت خوب میں ضرور آؤں گا عدالت میں۔ اب تم جا سکتے ہو۔

ننھے خاں:۔ مگر حضور گستاخی معاف۔ اس پر اطلاع پانے کے دستخط تو کر دیجیے۔

(بادشاہ سمن پر دستخط کر کے واپس دیتا ہے اور ننھے خاں سلام کر کے واپس جانا چاہتا ہے۔)

بادشاہ:۔ ٹھہرو۔ ہم تمہاری بلند ہمتی اور فرض شناسی سے بہت خوش ہیں آج سے تم شاہی ڈیوڑھی کے افسر مقرر کیے جاتے ہو۔

(ننھے خاں:۔ بادشاہ کو جھک کر تین سلام کرتا ہے اور روانہ ہو کر خوش خوش قاضی صاحب کے یہاں پہنچتا ہے)

قاضی:۔ مسکرا کر۔ مبارک ہو ڈیوڑھی کی افسری۔ تمہارے آنے سے پہلے ہی شاہی فرمان مجھے مل گیا ہے۔

ننھے خاں:۔ یہ سب آپ کی دعاؤں کا صلہ ہے قاضی صاحب

قاضی:۔ نہیں یوں کہو خدا کی عنایت ہے وہ حق دار کو اس کا حق ضرور دیتا ہے۔

---

(۵)

(قاضی صاحب عدالت میں اپنی جگہ بیٹھے ہیں۔ پاس ہی پیش کار ایک طرف بیٹھا اپنے کام میں مشغول ہے۔)

(قاضی صاحب ایک چپراسی کو بلا کر کہتے ہیں)

مسماۃ بانو بیگم کو آواز لگاؤ۔

چپراسی:۔ پکارتا ہے

مسماۃ بانو بیگم حاضر ہے؟

(بوڑھی بانو بیگم قاضی صاحب کے سامنے آتی ہے اور

سر جھکا کر کھڑی ہو جاتی ہے)

قاضی:۔ (چپراسی سے) غیاث الدین صاحب کو آواز دو۔

چپراسی:۔ آواز دینے کے بجائے باہر آ کر بادشاہ کو سلام کر کے عرض کرتا ہے چلیے حضور قاضی صاحب یاد کر رہے ہیں۔

بادشاہ اندر داخل ہوتا ہے۔ پیش کار تعظیم کو کھڑا ہو جاتا ہے مگر قاضی بدستور اپنی جگہ بیٹھا ہے نہ بادشاہ کو سلام کرتا ہے نہ بیٹھنے کو کہتا ہے بادشاہ بانو بیگم کے مقابل کھڑا ہو جاتا ہے۔

قاضی:۔ (بانو بیگم سے) تم اپنا سچ سچ بیان لکھواؤ

بانو بیگم:۔ میں خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کر کہتی ہوں کہ پندرہ دن پہلے دوپہر کے وقت میرا اکلوتا بچہ ناظر ندی کے کنارے کپڑے دھو رہا تھا کہ بادشاہ سلامت کے تیر سے گھائل ہو کر ہلاک ہو گیا۔

قاضی:۔ کیا تم بھی وہاں موجود تھیں۔

بانو بیگم:۔ نہیں میں لکڑیاں کاٹنے جنگل چلی گئی تھی۔

قاضی:۔ پھر تم نے کیسے جانا کہ تیر بادشاہ کا تھا۔

بانو بیگم:۔ حضور اس پر شاہی نشان بنا ہوا ہے۔

قاضی:۔ اس تیر کو شاہی خاندان کا کوئی شخص یا ملازم بھی چلا سکتا ہے تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ بادشاہ کے ہاتھ سے ہی تیر چھوٹا۔

(بانو بیگم اس سوال کا جواب نہ دے پائی خاموش کھڑی ہوئی بادشاہ کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھ رہی ہے) بادشاہ اپنے گلے کی انگلی سینے سے لگا کر اشارہ کرتا ہے۔

قاضی:۔ چپ کیوں ہو گئیں کچھ کہو۔ تمہارا کوئی گواہ ہے؟

بانو بیگم۔ ہاں صاحب ہے گواہ

قاضی:۔ کون ہے وہ

بانو بیگم:۔ خود بادشاہ سلامت۔

قاضی:۔ (بادشاہ سے) آپ کو کیا کہنا ہے اس معاملہ میں

بادشاہ:۔ جی ہاں اس غریب کا بچہ میرے ہی تیر سے ہلاک ہوا ہے مجھے اپنے جرم کا اقرار ہے۔

قاضی:۔ چونکہ آپ اقبالی ملزم ہیں اور آپ کا تیر بھی اس بات کی شہادت ہے کہ شاہی نشان والے تیر کو آپ کے سوا دوسرا استعمال نہیں کر سکتا اس لیے آپ اس بڑھیا کو رضامند کر لیں ورنہ بچے کے قتل کے جرم میں آپ کو سخت سزا ملے گی۔

بادشاہ:۔ (بانو بیگم کا دامن پکڑ کر) آج سے تم میری ماں کی جگہ۔ اگر مناسب سمجھو تو مجھے معاف کر دو میں تمہیں اتنا زیادہ زر دوں گا کہ ساری عمر عیش و آرام سے زندگی بسر کر سکو گی

بانو بیگم:۔ میں نے معاف کیا میرے خدا نے معاف کیا۔ مجھے شکایت نہیں ہے آپ سے۔

قاضی:۔ اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر بادشاہ کو سلام کرتا ہے اپنی جگہ بیٹھنے کی درخواست کرتا ہے۔

بادشاہ:۔ نہیں۔ باہر کھڑے ہوئے مجمع کو اندر بلا لیا جائے۔ بہت بڑا مجمع اندر آتا ہے۔

بادشاہ:۔ (نیام سے تلوار کھینچ کر) قاضی صاحب آپ جانتے ہیں:

قاضی:۔ (نڈر ہو کر) تلوار ہے یہ

بادشاہ:۔ میں اسے کس لیے لایا تھا؟

قاضی:۔ غیب کا علم خدا کو ہے۔

بادشاہ:۔ اس لیے کہ اگر آپ میری رعایت کرتے تو اسی تلوار سے آپ کا سر اڑا دیتا۔

قاضی:۔ مسکرا کر۔ اور آپ جانتے ہیں یہ کیا چیز ہے؟

بادشاہ:۔ کوڑا

قاضی:۔ یہ میں نے اس لیے اپنے پاس چھپا رکھا تھا کہ اگر آپ حکم نہیں مانتے تو اسی کوڑے سے آپ کی کھال کھینچ لی جا

بادشاہ:۔ (قاضی کو گلے لگا کر) خدا کا شکر ہے کہ ہم دونوں فرض سے غافل نہیں رہے۔

(سارا مجمع ایک زبان ہو کر) شہنشاہ غیاث الدین زندہ باد قاضی صاحب زندہ باد۔ انصاف زندہ باد۔

انوکھا مقدّمہ

(دیہاتی ماحول میں)

عبدل (عبداللہ) دیہات کا ایک سادہ مزاج اور نیک دل کسان

رحمتل (رحمتُ اللہ) دیہات کا ایک دوسرا سادہ مزاج اور نیک دل کسان۔

قاضی جی :- عدالت کا جج

پہلا منظر

(دیہات کا ایک مکان)

[صبح کا وقت ہے۔ رحمتل کے مکان پر عبدل چادر لپیٹے ہوئے دروازے پر ہلکے ہلکے دستک دیتا ہے اور پکارتا ہے۔]

عبدل :- (دستک دیتے ہوئے) "ارے او بھائی رحمتل! میں نے کہا ذرا دروازہ تو کھولو۔"

رحمتل :- (دروازہ کھولتے ہوئے) "کون؟ ارے عبدل بھائی! "

عبدل :- "ہاں ہاں میں ہی تو ہوں۔ اَلسّلام علیکم!"

رحمتل :- وعلیکم السّلام، آؤ آؤ، کہو اتنے سویرے سویرے کیسے آنا ہوا؟"

عبدل :- "بھئی مبارک ہو، میں نے کہا....."

رحمتل :- (بات کاٹ کر) "ارے ارے یہ مبارک باد کیسی؟!"

عبدل :- "چلو اندر چلو، اطمینان سے بتاتا ہوں"۔

رحمتل (اندر لا کر عبدل کو ایک کھاٹ پر بٹھاتے ہوئے) "اب کہو کیا بات ہے؟ جو اتنے سویرے مبارک دینے دوڑے چلے آئے؟"

عبدل :- "بس کچھ نہ پوچھو، یوں سمجھو کہ تمہارے نصیب جاگ اُٹھے"

رحمتل :- "میں نہیں سمجھا، پہیلیاں نہ بُجھواؤ عبدل، جو کہنا ہے صاف صاف کہو نا۔ کیسی مبارک باد اور کہاں کے نصیب؟!"

عبدل :- (چادر کے اندر سے ایک مٹکی نکال کر سامنے رکھتے ہوئے) اچھا تو لو دیکھو، جانتے ہو اس مٹکی میں کیا ہے؟"

رحمتل :- "تو بتاؤ نا، مجھے کیا معلوم"۔

عبدل :- "اشرفیاں ہیں اشرفیاں اور وہ بھی مُنہ تک بھری ہوئی۔ اور یہ سب تمہاری ہیں"۔

رحمتل :- (آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے) "کیا کہا، میری ہیں؟!"

عبدل :- "ہاں بھائی! تمہاری اور صرف تمہاری"۔

رحمتل :- "وہ کیسے؟ اور یہ تمہیں کہاں سے ملیں؟"

عبدل :- "اچھا تو سنو! تمہیں اپنی ندی کنارے والی زمین تو یاد ہوگی"۔

رحمتل :- "ہاں ہاں اچھی طرح یاد ہے۔ وہی جو پار سال تم نے مجھ سے خریدی تھی؟"

عبدل :- "ہاں ہاں وہی"

رحمتل :- "پھر اس کا ان اشرفیوں سے کیا تعلق؟"

عبدل :- "بھائی! بات یہ ہے کہ آج

سویرے سویرے جب مَیں اُس پر ہَل چلانے گیا تو یکایک ہَل کسی سخت چیز سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ اب جو کھود کر دیکھتا ہُوں تو اشرفیوں سے بھری مٹکی ملی۔ بس ہَل بَیل تو چھوڑے مَیں نے کھیت میں اَور اسے لئے سیدھا تمہارے پاس بھاگا آ رہا ہُوں۔"

رحمتُل :۔ "تو پھر میرے پاس کیوں لئے بھاگے چلے آئے۔ مجھے اِس سے کیا سروکار؟ نصیب تو تمہارے جاگے کہ یہ تمہیں ملا اور تمہاری زمین سے نکلا۔"

عبدُل :۔ "جی نہیں، تم بھُول رہے ہو، مَیں نے تم سے صرف زمین خریدی تھی، زمین کے اندر کا دبا ہوا خزانا نہیں۔ یہ تو ہر حال میں تمہارا ہی ہے۔"

رحمتُل :۔ "بھائی عبدُل، میری نہیں تمہاری ہے۔ مَیں نے زمین جُملہ حقوق سمیت تمہارے ہاتھ بیچی تھی، اب مجھے کیا پتا کہ یہاں میں خزانہ دبا ہے یا کنکر پتھر۔ یہ تو تمہاری قسمت ہے اور خدا کی دین۔ مجھے کیوں گُنہ گار کرنے چلے ہو۔"

عبدُل :۔ "یہ بھی اچھی کہی۔ یہ پلیل ہارکا مجھ سے نہیں چلے گی۔ مَیں کہتا ہُوں کہ جب مَیں نے صرف زمین ہی خریدی تھی اَور اُسی کی قیمت چکائی تھی تو اب اُس میں سے نکلنے والے خزانے کا مَیں مالک کس طرح ہو سکتا ہُوں۔ اِس طرح تو تم اُلٹا مجھے ہی گنہگار بنا دو گے۔"

رحمتُل :۔ "نہیں نہیں ایسا نہیں، تم غلط سمجھے، ایک بار پھر ٹھنڈے دل سے میری بات پر غور کرو کہ جب مَیں نے زمین تمہارے ہاتھ بیچ دی اور وہ میری ملکیت سے نکل کر پوری طرح تمہاری ملکیت بن گئی تو اب اُس میں کی ہر چیز تمہاری ہے نہ کہ میری۔"

عبدُل :۔ "مَیں کچھ نہیں جانتا، میرا ضمیر تو اس بات پر مطمئن ہے کہ مَیں نے صرف زمین خریدی تھی۔ اِس لئے مجھے صرف زمین سے واسطہ ہے۔ اِس کے اندر سے نکلنے والا خزانا بہر حال تمہارا ہے۔ اِس لئے یہ مٹکی سنبھالو، مَیں تو چلا۔ آگے تم جانو تمہارا کام۔"

(جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے)

رحمتُل :۔ (دیکھتے ہوئے [illegible]) رکے ہوئے، ابھی نہیں، تم اسے یوں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ اسے تو تمہیں لے کر ہی جانا پڑے گا۔ بھلا پرائی چیز مَیں کیوں رکھنے لگا۔"

عبدُل :۔ (تیز لہجے میں) "عجب اُلجھن ہے۔ یہی تو میرا بھی کہنا ہے کہ مَیں کیوں پرائی چیز اپنے ساتھ لے جاؤں۔"

رحمتُل :۔ (نرمی سے) "دیکھو ایک بات تو طے ہے کہ یہ ہم دونوں میں سے ایک کا ضرور ہے۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ یہ کسی کا نہ ہو۔"

عبدُل :۔ "اِس سے کس کو انکار ہے مگر اِس کا فیصلہ کون کرے؟ تم میری تو سُنتے نہیں۔"

رحمتُل :۔ (مسکرا کر) "یہی بات تو مَیں بھی کہہ سکتا ہُوں کہ تم میری کہاں مانتے ہو، پھر فیصلہ ہو تو کیسے ہو؟"

عبدُل :۔ (جھنجھلاتے ہوئے) "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر کیا ہو؟"

رحمتُل :۔ "میری مانو تو ایک تدبیر بتاؤں۔"

عبدُل :۔ "تو پھر جلدی سے کہہ ڈالو کہ اِس اُلجھن سے نجات ملے۔"

رحمتُل: "آؤ تو پھر ایسا کریں کہ ہم تم دونوں اِسے ابھی قاضی کے پاس لے کر چلیں اور اُس کے سامنے اپنی اپنی بات رکھ دیں۔ پھر جو اُن کا جو فیصلہ ہو اُسے مان لیں۔"

عبدُل: "دیکھا ایک کھلاڑی ہاں! اب کہی ہے تم نے بات۔ چلو منظور ہے لاؤ ہاتھ دو۔"

(دونوں ہاتھ ملاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

(عدالت)

[دن کے دس بجے ہیں، عدالت لگ چکی ہے، اردلی، پیش کار سب اپنی اپنی جگہ پر مستعد ہیں۔ قاضی جی عدالت کی کرسی پر آکر بیٹھتے ہیں۔ سامنے سے عبدُل اور رحمتُل کمرۂ عدالت میں داخل ہوتے ہیں۔]

عبدُل: (کٹہرے میں پہنچ کر چادر کے اندر سے اشرفیوں کی مٹکی نکال کر سامنے رکھتے ہوئے) "حضور! ہمارے درمیان انصاف کیا جائے۔ اشرفیوں کے اس مٹکے نے ہمیں بڑی اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔"

قاضی: (حیرت سے) "اشرفیوں کے اس مٹکے نے اُلجھن میں ڈال دیا ہے؟ کیا مطلب؟! معاملے کو کھول کر پیش کرو۔"

عبدُل: "حضور! معاملہ یہ ہے کہ میں نے پارسال (رحمتُل کی طرف اشارہ کر کے) رحمتُل بھائی سے ایک بنجر زمین خریدی تھی۔ آج اس زمین پر ہل چلاتے ہوئے اتفاقاً اُس کے اندر سے اشرفیوں کی یہ مٹکی برآمد ہوئی۔ چونکہ میں نے اِن سے صرف زمین خریدی تھی اس لئے اُس میں سے نکلنے والے دفینے کو ان کی امانت سمجھ کر ان کو دینا چاہا تو وہ اِس کو لینے سے انکاری ہیں۔"

قاضی: (رحمتُل سے مخاطب ہو کر) کیا عبدُل کا بیان صحیح ہے؟ یا پھر تمہیں اِس پر کچھ اعتراض ہے۔"

رحمتُل: (آگے بڑھ کر) "جی حضور! واقعے کی حد تک عبدُل کا بیان بالکل درست ہے۔ لیکن اِن کے اِس خیال سے مجھے بالکل اتفاق نہیں کہ یہ اشرفیاں میری امانت ہیں۔"

قاضی: (عبدُل کی طرف رُخ کر کے) "تم اپنے دعوے کی وضاحت صاف لفظوں میں کرو۔"

عبدُل: "حضور! میرا کہنا ہے کہ میں نے رحمتُل سے صرف زمین خریدی تھی اور اُسی کی قیمت چکائی تھی۔ زمین میں اگر پہلے سے کوئی خزانہ دبا تھا تو وہ انھیں کا تھا۔ اِس لئے یہ دفینہ انہیں کا حق ہے اور انہی کو اِسے لینا بھی چاہئے۔ ظاہر ہے کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

قاضی: (رحمتُل سے) اِس بارے میں تمہارا جواب دعویٰ کیا ہے؟ اسے پیش کرو۔"

رحمتُل: "حضور! اور میرا کہنا ہے کہ میں نے زمین عبدُل کے ہاتھ اس کے جملہ حقوق کے ساتھ بیچ دی تھی۔ اب مجھے کیا پتا کہ اس کے اندر خزانہ دبا ہے، یا ناگو کا ڈھیر یہ تو عبدُل کی قسمت اور خدا کی دین ہے کہ اِس میں سے خزانہ برآمد ہوا ہے۔ اور جب زمین میری ملکیت سے نکل کر پوری طرح عبدُل کی ملکیت میں جا چکی تو پھر اِس میں سے نکلنے والا خزانہ بھی اُنھی کا ہوا نہ کہ میرا۔"

[رحمتُل کے اِس بیان پر عدالت میں گہری خاموشی چھا جاتی ہے۔ قاضی قلم میز پر رکھ کر سر جھکا لیتا ہے۔ چہرے پر غور و فکر کے آثار چھا جاتے

ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ دونوں کے بیانات سن کر شدید اُلجھن میں پڑ گیا ہے اور مقدمے کا کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا ہے۔ اِسی حالت میں چند لمحے گزرتے ہیں۔ یکایک قاضی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آتی ہے اور وہ سر اُٹھا کر مخاطب ہوتا ہے۔]

قاضی:۔ "عدالت نے مقدمے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

عبدل اور رحمتل:۔ (ایک ساتھ) "حضور! ہم اُسے سُننے کے لئے بے چینی سے منتظر ہیں۔"

قاضی:۔ "مگر وہ ابھی محفوظ ہے اور اُسے سُنانے سے پہلے عدالت تم سے کچھ بظاہر غیر متعلق سوالات کرنا ضروری سمجھتی ہے۔"

عبدل اور رحمتل:۔ (ایک ساتھ) ہم اُس کے لیے حاضر ہیں۔"

قاضی:۔ (عبدل کی طرف رُخ کر کے) "تمہاری مالی حالت کیسی ہے؟"

عبدل:۔ "حضور! کچھ بہت اچھی تو نہیں پھر بھی خدا کا شکر ہے کسی نہ کسی طرح گزارا ہو جاتا ہے۔"

قاضی:۔ "اور تمہارے خاندان میں کُل کتنے آدمی ہیں۔"

عبدل:۔ "کُل تین آدمی، دو ہم میاں بیوی اور ایک لڑکا۔"

قاضی:۔ "لڑکے کی عمر کیا ہوگی، اور کیا وہ شادی شدہ اور برسرِ کار ہے؟"

عبدل:۔ "اُس کی عمر بھی کوئی بائیس ۲۲ سال ہوگی۔ اور وہ کھیتی باڑی کے کام میں میرا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اِس کے علاوہ کوئی اور کام ابھی نہیں کرتا۔ شادی تو اب تک نہیں ہو سکی۔ کچھ اپنی غریبی اور کچھ مناسب رشتہ نہ ملنے کی وجہ سے۔"

قاضی:۔ (رحمتل سے) "اور اِن سوالات کے سلسلے میں تمہارا کیا جواب ہے؟"

رحمتل:۔ "حضور! میرا بھی تقریباً وہی جواب ہے جو عبدل بھائی نے دیا۔ میرا کنبہ بھی کُل تین ہی آدمیوں کا ہے۔ دو تو ہم میاں بیوی۔ اور ایک بچی جس کی عمر ۱۸ سال ہے۔ میں اپنے خاندان کا اکیلا کمانے والا ہوں، مالی حالت بھی بس واجبی ہی سی ہے۔ اسی وجہ سے اب تک بچی کی شادی بھی نہیں کر سکا۔"

قاضی:۔ (مسکرا کر) "تب تو اسے خدا کا فضل ہی کہنا چاہئے اور عدالت کا فیصلہ بھی اُسی کے حق میں ہے۔"

عبدل:۔ "اور وہ کیا؟"

قاضی:۔ "وہ یہ کہ تم دونوں اپنے بچے اور بچی کا رشتہ آپس میں کر لو۔ میرے خیال میں یہ رشتہ مناسب ترین رشتہ ہے۔ اور شاید اللہ تعالیٰ نے تمہاری اِسی مشکل کو حل کرنے کے لئے غیب سے یہ سامان کیا ہے۔ اِس لئے میرا فیصلہ ہے کہ یہ رقم اِن دونوں کی شادی اور اُن کا گھر بسانے پر صرف کر دو۔"

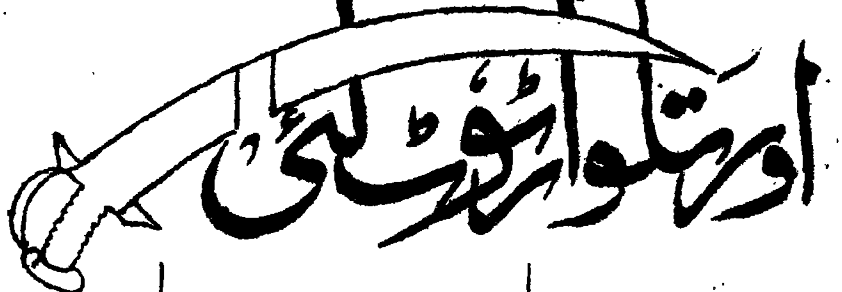
[عبدل اور رحمتل ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر مسکراتے ہیں اور خوشی خوشی عدالت سے باہر آتے ہیں۔]

(پردہ......)

مارچ ۷۲ء کے چند مضمون اور نظمیں

۱۔ ڈاک گھر (ڈرامہ) حمید عثمانی
۲۔ انصاف ایسے ہوتا ہے خلیق انجم اشرفی
۳۔ ایک پونڈ گوشت شاکر حسن چاندپوری
۴۔ جن کا نام ڈکشنری فخرالدین عارفی
۵۔ اندرا گاندھی کا نعرہ (نظم) ساحر بھوپالی
۶۔ چاند (نظم) حرمت الاکرام
۷۔ ڈکشنر جانسن مضمون
۸۔ سونے کا پنجرہ (کہانی) احسان الحق
وغیرہ وغیرہ

ابوالمکارم غازی الدّین کمال کریم نگری



اور تلوار ٹوٹ گئی

(ڈراما)

(پس پردہ دھیمی موسیقی بج رہی ہے، اناؤنسر کہتا ہے۔)

اناؤنسر:- ہندوستان میں بہت سی نامور شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں جنھوں نے اپنے نمایاں کارناموں سے ملک کو عظمت بخشی ہے۔ ان ہی شخصیتوں میں راجہ چندرگپت کے پوتے، یعنی موریا خاندان کے مشہور راجہ سمراٹ اشوک کا شمار ہوتا ہے۔ حضرت مسیح کی پیدائش سے ڈھائی سو سال پہلے کاٹھیاواڑ سے کلنگ اور گنجام تک، پنجاب سے افغانستان تک اور جنوب میں میسور تک اپنی کا راج تھا۔ راجہ اشوک نے بدھ مت کے پرچار کے لیے جو ستون اور لاٹ نصب کرائے تھے، زمانے کی تبدیلیوں اور بے احتیاطی کے باوجود ان میں سے بعض اب بھی برقرار ہیں۔[1] سانچی اور بودھ گیا وغیرہ کے ستون راجہ اشوک کی زندہ یادگاریں ہیں۔ ۲۶۱ سال قبلِ مسیح، خلیج بنگال کے ساحل پر، مہاندی اور دریائے گوداوری کے درمیان واقع ریاستِ کلنگ سے راجہ اشوک کی پہلی اور آخری جنگ ہوئی تھی۔ اس جنگ میں راجہ اشوک فتح یاب ضرور ہوئے تھے، مگر فاتح ہوتے ہوئے بھی وہ خون کے آنسو رو رہے تھے۔ ہزاروں انسانوں کے خون سے رنگی ہوئی کلنگ کی سرزمین اور سینکڑوں زخمیوں کی درد و کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ و پکار، اُن کے لیے پچھتاوا بن گئی تھی۔

ایسے میں متھرا کی ایک بڑی شخصیت، اُپاگپت کا ظہور ہوتا ہے۔ اُن کے پاس گیان ہے، علم کی روشنی ہے۔ اس روشنی سے راجہ اشوک فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور اس کے بعد ایسی تبدیلی رُونما ہوتی ہے کہ جنگجو، جدل اور قتل و غارت کے دلدادہ راجہ اشوک، امن کے پیامبر بن جاتے ہیں۔ راجہ اشوک کے ذہن کی تبدیلی کے واقعے کی ایک جھلک آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

(پردہ اُٹھتا ہے)

(اسٹیج پر خون میں لت پت لاشوں اور کراہتے ہوئے زخمیوں کے درمیان راجہ اشوک، عالمِ اضطراب میں ٹہل رہے

[1] ان میں سے ایک دہلی میں فیروز شاہ کوٹلہ میں ہے۔

ہیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور چہرے سے پریشانی اور پشیمانی کا اظہار ہو رہا ہے۔ پس منظر میں المیہ موسیقی بج رہی ہے۔ ایک بوڑھی عورت لاٹھی ٹیکتی، اسٹیج پر آتی ہے۔ راجہ اشوک اُس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:۔)

راجہ اشوک:۔ ماں! ہمیں معاف کر دو، ہم اپنے وعدے کو نہیں نبھا سکے۔ آپ کے اکلوتے فرزند کو واپس نہ لوٹا سکے۔ اس کلنگ کی سرزمین پر شہید ہو کر اپنے راجہ کے دل میں اُنھوں نے گھر بنا لیا ہے۔ ہم بہت نادم ہیں۔ اب اپنے کیے پر پچھتا رہے ہیں۔ ہمارے تمام ساتھی، دوست احباب اور فرماں بردار سپاہی سبھی اس جنگ میں کام آ گئے ہیں اور ہمیں داغِ مفارقت دے گئے ہیں۔ ہم نے یہ جنگ کر کے بہت بڑی بھول کی ہے۔ ہاں ۔۔۔! بہت بڑی بھول ۔۔۔!!

بوڑھی عورت:۔ جُگ جُگ جیو مہاراج۔ مجھے اپنے بیٹے کی موت کا کوئی غم نہیں، آپ کی جان سلامت ہے، یہ میرے لیے کیا کچھ کم ہے؟ مجھے تو اس بات پر فخر ہے کہ میرا بیٹا اپنے آقا کے لیے دل و جان سے قربان ہو گیا ہے۔ اُس نے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا ہے بلکہ اُس نے تو صرف اپنا فرض ادا کیا ہے ۔۔۔!

راجہ اشوک:۔ ہمیں شرمندہ نہ کیجیے ماں جی ۔۔۔! اِن لاشوں کے ڈھیر سے فتح ہمارا مذاق اُڑا رہی ہے۔ اِن زخمیوں کی درد و کرب میں ڈوبی ہوئی آوازیں تیر بن کر ہمارے جسم میں پیوست ہو رہی ہیں۔ کاش ۔۔۔! اِس مصیبت سے کوئی ہمیں نجات دلا سکتا۔ آہ ۔۔۔! کہیں سے ہمیں روشنی مل جاتی کہ ہم اپنی اگلی راہ کا انتخاب کر لیتے۔ کوئی آ رہا ہے۔ سُنو ماں ۔۔۔! قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی ہے۔

بوڑھی عورت:۔ ہاں مہاراج ۔۔۔! شاید کوئی بودھ بھکشو ہیں، جو یہاں تشریف لا رہے ہیں۔

(اُپاگپت جن کے سر پر مہاتما گوتم بدھ کی طرح بال بندھے ہوئے ہیں۔ سفید چادر اوڑھے، پیروں میں کھڑاویں پہنے، ہاتھ میں عصا لیے آتے ہیں۔ راجہ اشوک اپنی گردن جھکا کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے اُنھیں نمسکار کرتے ہیں۔ پھر مخاطب ہو کر کہتے ہیں:۔)

راجہ اشوک:۔ اے عظیم بودھ بھکشو، ہمیں کوئی ایسی ترکیب بتا دیجیے جس سے ہمارے غم کا مداوا (علاج) ہو سکے۔ کلنگ کی لڑائی جیتنے کے باوجود، ہمیں لڑائی سے سخت نفرت ہو گئی ہے۔ اب ہم امن چاہتے ہیں، لیکن کچھ سجھائی نہیں دیتا، اب آپ ہی اِس کی کوئی سبیل نکالیے۔

اُپاگپت (ہاتھ کے اشارے سے آشیرواد دیتے ہوئے) میں بودھ بھکشو اُپاگپت، متھرا کا ایک معمولی انسان ہوں۔ ہاں! میرے پاس مہاتما گوتم بدھ کا عظیم پیغام ہے۔ یہ پیغام زندگی کی صدائے حق و سچائی کی آواز ہے۔ اِن مقتولوں اور زخمی ہوئے مظلوموں کی آواز ہے۔ انھوں نے کہا ہے:۔

" ۔۔۔ اِس دنیا کی خوش حالی اور تہذیب کو بنانے میں انسان سے تعلق کا سرِ بلند ہونا ضروری ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی، گیان، دھیان اور

ریاضت اور عبادت میں گزارے تاکہ اِس پُر فریب دُنیا کے جال میں نہ پھنس سکے۔ غلطی کوئی خلافِ فطرت بات نہیں ہے مگر انسان وہی ہے جو اپنے کئے پر پچھتائے، نادم ہو اور آئندہ سے کبھی ایسی غلطی نہ کرنے کا عہد کرے۔ بالخصوص وہ لوگ، جن کے ہاتھوں میں اقتدار کی باگ ڈور ہے۔ قیامِ امن کے لئے جدوجہد کریں۔ کیونکہ امن زندگی ہے۔ امن ترقی کا زینہ ہے۔ امن جیو اور جینے دو کے فلسفہ کا نچوڑ ہے۔"

راجہ اشوک:- اے عظیم بودھ بھکشو۔! زندگی کے بارے میں مہاتما گوتم بدھ نے کیا کہا ہے۔؟

اُپاگپت:- راجے۔! زندگی کے بارے میں اُنھوں نے کہا ہے:-

"زندگی مایۂ غم (غم کا سرمایہ) ہے اور اُس کی مسرتوں کی تمنا اسبابِ غم۔ اِسی تمنا اور ہوس کو فنا کر دینے سے غم کا ازالہ ہو جاتا ہے اور زندگی ان آلائشوں سے پاک ہو جاتی ہے۔ دُنیا کی سبھی چیزیں فانی اور غم انگیز ہیں۔ ساری تکلیفوں کا باعث جہالت اور نادانی ہے۔ نفس پر قابو رکھ کر ہی رُوح کی نشو و نما ہو سکتی ہے۔ حرص و ہوس اور جملہ خواہشوں کو ترک کر دینے سے ہی تکلیفوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اور تبھی "نروان" ممکن ہے۔ اِس لئے اہنسا پرمو دھرم ہے۔ عدم تشدد ہی فرضِ اوّلین ہے۔"

راجہ اشوک:- "اے پیامبرِ امن۔! ہم آپ کے بے حد ممنون و مشکور ہیں۔ جنگ کی ہولناک تباہیوں نے ہماری آنکھوں پر پڑی ہوئی ہوسِ اقتدار کی نقاب اُلٹ دی ہے۔ اور آپ کے توسط سے، مہاتما گوتم بدھ کی باتوں سے ہمارے ذہن کو روشنی ملی ہے۔ ہم آج یہ عہد کرتے ہیں کہ کلنگ کی لڑائی ہماری پہلی اور آخری لڑائی کہلائے گی۔ اِس لئے کہ جنگِ کلنگ سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوا ہے کہ جنگ جیت کر اودھ مرے جسموں اور لاشوں پر تو حکومت کی جا سکتی ہے، مگر زندہ انسانوں کے دِلوں پر حکمرانی کے لئے علم اور سوجھ بوجھ کو عام کیے بنا کامیابی ممکن نہیں۔

اُپاگپت:- بے شک۔! راجے۔! بے شک۔! علم و فہم کو وسعت دیتے ہوئے قربانی اور ایثار کے جذبے سے عوام کی خدمت کی جائے تو دُنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے۔

راجہ اشوک:- ہم آپ کی باتوں سے بے حد متاثر ہوئے۔ اِس واقعہ کی یادگار کے طور پر ہم اپنی سب سے عزیز شئے "تلوار" کو توڑ دیتے ہیں، اور آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ مہاتما گوتم بدھ کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے ہم حتی المقدور زندگی کی آخری سانس تک کوشش کرتے رہیں گے۔

(راجہ اشوک نیام سے تلوار نکال کر توڑ دیتے ہیں۔ ایک بڑی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ اُن کے چہرے پر اضمحلال کی جگہ اطمینان اور مسرت کے نقش اُبھرتے ہیں۔ وہ اُپاگپت سے کچھ تپاک طریقے سے بغل گیر ہو جاتے ہیں۔ پس منظر میں موسیقی کے ساتھ

"بُودّھم شرنم گچھامی، سنگھم شرنم گچھامی، دھرمم شرنم گچھامی۔"

_____________ کا اشلوک

گایا جا رہا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

نسیم فرمانا بر

شفیع الدین نیرؔ بچوں کے محبوب ترین شاعر بھی، ادیب بھی ہیں۔ ان کی یہ کتابیں پڑھیے کیسی دلچسپ اور مزیدار کتابیں ہیں

کا پتلا	-/۳۰	وطنی نظمیں	-/۸۵	ٹلّو میاں	-/۳۵
گھر جاؤں تو کیسے	-/۲۵	ہماری نعت	-/۳۰	چنن منن	-/۲۰
. کا پرستان	-/۳۰	یادگار انگوٹھی	-/۳۵	چھنگو منگو	-/۵۰
ن کا ڈبا	-/۲۵	انار راجا	-/۲۵	ڈھول کا پول	-/۴۵
ور کا بیٹا	-/۵۰	انوکھی چھتری	-/۳۵	ریڈیو کا بھوت	-/۳۰
ل مٹھو	-/۳۵	بونے کا بٹوا	-/۲۵	شیرخاں کے معرکے	-/۷۵
کہانیاں	-/۵۰	بدھو کی بیوی	-/۲۵	طلسمی مینا	-/۳۰
شیار حسن	-/۲۵	بطخ شہزادی	-/۳۵	عید کے کھلونے	-/۳۵
سلامی نظمیں	-/۶۵	بونے کا انصاف	-/۳۰	کھلومیاں	-/۵۰
ن کا کھلونا	-/۷۵	پری کی چھڑی	-/۳۵	گھر کا آئینہ	-/۳۵
ن کا تحفہ اوّل	-/۵۰	پرستان کی سیر	-/۲۵	گلگلے کی دوڑ	-/۲۵
” ” دوم	-/۷۵	پپیسے کا صابن	-/۳۵	گھی شکر	-/۶۵
نی کا تحفہ	۱/-	باپ کی ناؤ	-/۳۵	غالب کی کہانی	-/۵۰
ن کے گیت	-/۶۵	تارا کا ڈھڈا	-/۲۵		

بچوں کے مقبول ادیب اطہر پرویز صاحب کی دلچسپ اور معلوماتی کتابیں

نمول رتن	۱/۵۰	مصنوعی چاند	۱/۵۰	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	۱/-
ہولی اور چراغ	۱/۶۲	گلیلی گلیلیو	۱/-	شہر اور گاؤں	۱/-
بدن کی کہانی	۱/۲۵	اکبر بیربل کے لطیفے	-/۶۰	ایٹم کیا ہے	-/۶۵
ہماری کھیتی باڑی	۱/۲۵	خلا کا سفر	۱/۲۵	سورج کا گھرانا	-/۷۵
نجومی آپا	-/۷۵	توانائی کا راز	۱/۲۵		

مصنف :- شری ہری کرشن پریمی
ترجمہ :- قمر ردولوی

راکھی

(دو سینی ڈراما)

(میواڑ پر گجرات کے سلطان بہادر شاہ نے حملہ کیا تھا۔ میواڑ کی ہار ہوتے دیکھ کر رانی کرناوتی نے دہلی کے شہنشاہ ہمایوں کو راکھی بھیجی اور بھائی کا رشتہ جوڑ کر مدد مانگی۔ رانی کو اپنی بہن مان کر ہمایوں اپنا کام چھوڑ کر میواڑ کی طرف روانہ ہوا۔ لیکن اس وقت تک بہادر شاہ نے میواڑ فتح کر لیا تھا۔ اور رانی کرناوتی بہت سی راجپوت عورتوں کے ساتھ جوہر کر چکی تھیں۔ ہمایوں نے بہادر شاہ کو شکست دے کر پھر سے چھوٹے وکرم سنگھ کو گدی (تخت) پر بٹھایا۔ لیکن بہن کی پکار پر وقت پر نہ پہنچنے کے سبب ہمایوں کو ہمیشہ قلق رہا)

مقام :- چتوڑ گڑھ کا وہ حصہ جہاں پر جوہر کی چتا رچائی گئی تھی۔

(بادشاہ ہمایوں، مہارا وکرما دتیہ اور دھن داس داخل ہوتے ہیں)

ہمایوں :- مہارانا صاحب! میواڑ پر سسودیا خاندان کے سوا دوسرا کوئی حکومت کر ہی نہیں سکتا۔ صدیوں کی قربانیاں بے کار نہیں جا سکتیں۔ بہادر شاہ نے میواڑ کی طرف جو لالچ بھری نظر اٹھائی تھی اس کی سزا اس کو مل گئی۔ اسے گجرات کی سلطنت سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔

دھن داس :- جو بے جی ہونے گئے تھے چھپتے اور رہ گئے دو بے!
دیکھو آگے بڑھ کر) پہچئے جہاں پناہ! ہم آگئے اسی مقام پر جہاں مہارانا سانگا کی ویر (بہادر) پتنی میواڑ کی امر مہارانی کرناوتی بارہ ہزار کشترانیوں کے ساتھ چتا پر چڑھی تھی ــ ان کی پوتر جسم کی راکھ یہی ہے۔

ہمایوں :- (درد بھرے لہجہ میں) یہ خاک وطن پر جان دینے والوں کو دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ یہ خاک انسانیت کی آنکھوں کا سُرمہ ہے۔ اسے جو سر آنکھوں پر لگائے اُس پر ہمیشہ خدا کی مہربانی کا سایا رہے۔ (خاک اٹھا کر آنکھوں سے لگاتا ہے) ارے یہ تو ابھی تک گرم ہے۔

وکرم :- میواڑ کا دل بھی ابھی تک اسی طرح اندر ہی اندر سُلگ رہا ہے۔

ہمایوں :- (کھڑے ہو کر) یہ آگ دشمن کے ظلم و ستم کے عذاب کو جلانے والی ہو ــ مہارانا! بہن کرناوتی کی چتا کی یہ آگ مذہبی تعصب کی جلن نہ پیدا کرنے پائے۔ ایک مسلم حکمران نے بھاری بھول کی تھی! مگر دوسرے مسلمان نے اُسے سزا بھی دے دی۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ مہارانا! مسلمانوں سے ناراض نہ ہونا۔ سارے ہی مسلمان ایک سے

ہوتے۔

وِکرم:۔ اِس کی مثال تو آپ ہی ہیں بادشاہ سلامت! آپ جیسی فراخ دِلی کس میں ہو سکتی ہے؟ آپ کا دِل پریم اور دَیا کا سمندر ہے۔ آپ کا احسان . . . . .

ہمایوں:۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مہارانا! میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ جن راکھی کے دھاگوں سے بہنیں بھائیوں کے سر خرید لیتی ہیں وہ ہم مسلمانوں کو کہاں نصیب ہیں۔؟ میں ایسی بہنوں کی قدر کرتا ہوں ـــ

تاتار خاں:۔ "بادشاہ سلامت! خبر ہے کہ شیر خاں نے . . . اور بہار پر قبضہ کر لیا ہے اور دہلی کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے۔۔"

وِکرم:۔ جہاں پناہ! میں دیکھتا ہوں کہ میواڑ کی حفاظت کرنے کی قیمت آپ کو بہت زیادہ دینی پڑ رہی ہے۔

ہمایوں:۔ "بہن کے پیار کی قیمت' راکھی کے اِن دھاگوں کی قیمت دُنیا کی بادشاہت اور بہشتی سلطنت سے بھی بڑھ کر ہے۔ مہارانا! مجھے افسوس اِس بات کا ہے کہ میں ٹھیک وقت پر آکر بہن کرناوتی کے قدموں کی خاک نہ چھو سکا۔ ایسی پاک بہن کے کام نہ آسکا۔ اِس کمی کو اُس کی چِتا کی دھوئیں سے پورا کرتا ہوں۔ میں نے میواڑ پہنچنے میں جو دیر کی اُس کی سزا مجھے اب بھگتنی ہے۔ پورا قرض تو اُسی روز اُترے گا جب ساری مسلم قوم کی بہنیں بے جھجک ہندو بھائیوں کے ہاتھوں میں راکھی باندھنے کی ہمت کریں گی اور ساری ہندو بہنیں مسلم بھائیوں کے ہاتھوں میں دِلی محبت کے ساتھ اپنی پاک راکھی باندھنے کی مہربانی کریں گی۔ بس جبھی ہماری آنکھوں سے نفرت کا میل دُھل جائے گا۔ چلئے مہارانا! آپ کو تخت پر بٹھا دینے کے بعد شیر خاں سے اپنی قسمت کا فیصلہ کروں گا۔ ہمایوں مصیبتوں سے ڈرتا نہیں ہے۔

(ہندی سے ترجمہ)

"جنگل کا ناپ گیا"

کا بقیہ صفحہ کا

کا پھل جنگل میں میٹھا ہوتا ہے۔ تم نوجوان ہو، عقل مند ہو، ابھی تمہارے سہرے کے پھول بھی کھلنے ہیں۔

نوجوان ہاتھی:۔ (خوش ہو کر) ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔

امپائر:۔ اب کچھ بات بنی۔ چلو دونوں آگے بڑھو۔

(دونوں آگے بڑھتے ہیں۔ ایک دوسرے کی نازک گردنوں میں سانپ جیسی سونڈ حائل ہو جاتے ہیں۔ اور ہر طرف خوشی سے ہاتھی چنگھاڑنے لگتے ہیں۔ پھر حسین صبح ڈر کر یا خوش ہو کر اپنا چہرہ دکھاتی ہے)

اُردو پڑھیے

اور

اُردو گھر گھر

پھیلایئے

اور اُردو کی ترقی میں

حصّہ لیجیے

عائشہ خاتون

دھرتی کے لال

کردار:-

لوہا- سونا- بھائی
چاندی بہن
زمیں ماں

(محل کے سامنے کا حصّہ- چاندی اور سونا بیٹھے باتیں کر رہے ہیں)

سونا:- اری اوری چاندی باندی

چاندی:- دیکھو بھائی- تم بڑے ہو تو کیا ہوا؟ زبان سنبھال کر بولا کرو۔

سونا:- کیا مطلب؟

چاندی:- اب میں بڑی ہوگئی ہوں۔ مجھے آپ تب کہہ کر مت پکارا کیجئے حضور، میرا نام ہے چاندی۔

سونا:- ہاہاہا، اچھا چاندی صاحبہ! کیا ابھی آپ گانا گا رہی تھیں؟

چاندی:- گا تھوڑی رہی تھی، شاعری کر رہی تھی بھیا!

سونا:- اوہو، تو آپ شاعر بھی ہیں۔

چاندی:- صرف شاعر ہی نہیں، مصوّر بھی ہوں، اداکار بھی ہوں۔

سونا:- ارے تم یہ سب کیسے بن گئیں؟ میں نے تو تمہیں کبھی کچھ کرتے دیکھا نہیں۔

چاندی:- کچھ کرے مری بلا- میں تو چاندی ہوں چاندی- جی ہاں جس کے پاس پہنچ جاؤں وہ کچھ سے کچھ بن جاتا ہے۔

سونا:- وہ کیسے؟

چاندی:- تجوریوں میں بند رہتے رہتے تمہاری عقل بھی کند ہوگئی ہے بھیا- اسی لئے تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔

سونا:- تم میری عقل کو کند بتا کر میری بے عزتی کر رہی ہو۔

چاندی:- بے عزتی! کیا کہہ رہے ہو بھیا! میں نے تو سن رکھا ہے کہ سونا عزت اور بے عزتی کی پرواہ ہی نہیں کرتا۔ اس کے لئے بے عزتی بھی عزت کی بات ہے۔

سونا:- تم نے مجھے اتنا بے شرم سمجھ رکھا ہے؟ ہونھ!

چاندی:- نہیں بھیا! میں نے نہیں دنیا نے۔

سونا:- چپ رہو، بڑی دنیا والی بنی ہو- چھوٹا منہ بڑی بات!

چاندی:- چھوٹا منہ رکھ کر بڑی بات وہی کرسکتا ہے جس کے پاس زر ہو- اور پھر میں تو خود زر بیہ ہوں- رہی بات "دنیا والا" ہونے کی تو یہ بھی خیر تمہاری میں کہہ کا زید ٹھہری-!

سونا:- اوہو، دادی اماں! کیا کہنے ہیں آپ کے تجربے کے-

چاندی:- دیکھو بھیا! اس معاملے میں تم مجھ سے نہیں جیت سکتے۔ جس طرح ہندوستانی عورتیں بس گھر میں رہتی ہیں۔ تمہاری دنیا بھی تجوریوں تک ہی محدود ہے۔ عورت اور سونا دونوں شرمیلے ہیں بھیا- تم کبھی باہر بھی نکلے ہو تو عورت کی بیاہ میں کبھی گلے سے لپٹے ہو- کبھی کسی کی انگلیاں پکڑے ہوئے۔

سونا۔ اَور کیا تمہاری طرح دَر دَر ٹھوکریں مارا پھرتا ہوں

چاندی: بھلا میں اَور دَر دَر ماری ماری پھروں۔ دَر دَر تو لوگ میرے لئے مارے پھرتے ہیں۔ میں تو سَیر کرتی ہوں۔ شان کے ساتھ جی۔ اَور کیا!

سونا۔ بڑی باتونی ہو گئی ہو!

چاندی:۔ ہاہاہا، باتونی! ذرا میرا کام دیکھو میرا کام۔ میری دُنیا دیکھو، اور بھیّا آج کل باتونی ہونا بُرا بھی تو نہیں۔ جسے باتیں کرنا نہیں آتیں اُسے اِس دُنیا میں لاتیں بھی نہیں ملتیں ساب اپنی طرف ہی دیکھ لو۔

سونا:۔ کیا مطلب؟ میں کس کی لاتیں سہتا ہوں۔

چاندی:۔ حقارت کی بھیّا، یوں تو پُرانے رِشی منی کہہ گئے ہیں کہ ساری خوبیاں سونے میں سما جاتی ہیں۔ لیکن بھیّا! آج کل تمہیں پوچھتا کون ہے، کوئی بھی نہیں۔ آپ کو بات تک تو کرنا آتی نہیں۔ مجھ سے پوچھئے کیوں! اِس لئے کہ آپ شرمیلے ہیں۔ آپ کی کوئی آواز نہیں اور میری!!

(ہر پتّے کو انگوٹھے پر اُچھال کر)

سُنو! کیا مدُھر جھنکار ہے۔ سنگیت کے ساتوں سُر روپے کی جھنکار میں پوشیدہ ہیں۔

سونا۔ زیادہ بولنے کے بجائے اگر تم مقابلہ کر کے دیکھو تو تمہیں پتہ چلے کہ میں تم سے کتنا بھاری ہوں۔

چاندی:۔ شاباش بھیّا شاباش۔ بات کرنے کی تمیز آنے لگی ہے۔ مگر بھیّا! ابھی تمہیں بہت مشق کرنا پڑے گی۔ یہ جمہوریت کا زمانہ ہے بھیّا، عام آدمی تو صرف مجھے چاہتا ہے۔ جس کے پاس میں نہیں رہتی وہ پریشان رہتا ہے اور جس کے پاس میں پہنچ جاتی ہوں وہ اس قدر خوش ہوتا ہے کہ ہاتھوں سے اُٹھا کر دل کے پاس رکھتا ہے جہاں دل کی دھڑکن ہر وقت مجھے لوریاں سُناتی رہتی ہے۔

سونا:۔ دل کے پاس۔ کیا مطلب؟

چاندی:۔ بھیّا! تمہارے زیور بھلے ہی بنتے ہوں۔ مگر تم میری بات نہیں سمجھ سکے۔ جب میں سیر کرتے کرتے تھک جاتی ہوں تو آرام کرتی ہوں۔ مگر کہاں؟ منی بیگ میں یہ کہاں رکھا جاتا ہے؟ کوٹ کی اندرونی بائیں جیب میں۔ بالکل دل کے پاس۔ سمجھے بھیّا!

سونا:۔ ہونہہ۔

چاندی:۔ تُم سے تو لوہے بھائی اچھے۔ کالے کلوٹے ہیں تو کیا۔ ٹن ٹن، تڑا تڑ کچھ نہ کچھ بولتے تو رہتے ہیں۔ کیا کہوں۔ سچ تو کہنا ہی پڑتا ہے تینوں بہن بھائیوں میں ایک، تم ہی ہو شرمیلے۔ ڈر کے مارے پیلے۔ دُوسرے لوہے بھائی ہیں کالے کلوٹے۔ بازاروں میں بے بھاؤ بکتے پھرتے ہیں۔ بس ایک میں ہی ہوں جس کی ہر جگہ عزت ہے۔ جسے سب پیار کرتے ہیں۔ کالے کلوٹے لوہے بھائی کو تو بھائی کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔

سونا:۔ (اُونچی آواز سے) لوہے بھائی! لوہے بھائی! آنے دو لوہے بھائی کو ابھی تمہاری مرمّت کراتا ہوں۔ (کالے رنگ کے میلے کپڑے پہنے ہوئے۔ ہاتھ میں ہتھوڑی لیے ہوئے لوہا بھائی داخل

ہو تو یہیں۔

سونا:۔ ہاں بھیا

لوہا:۔ ہاں بھائی (آواز میں سختی) کون بلا رہا ہے۔ کام نہیں کرنے دیتے۔

(حیران ہو کر) سونا! تم؟۔ تم نے پکارا؟ تم یہاں کیسے؟ لاکھ بار میں نے کہا کہ تمہارا باہر جانا خطرے سے خالی نہیں، مگر تم پھر بھی باہر دکھائی دے رہے ہو۔

سونا:۔ بھیا! یہ چاندی آپ کی بے عزتی کر رہی تھی۔ آپ کو کالا کلوٹا کہہ رہی تھی۔ اس لئے میں نے آپ کو بلا لیا۔

لوہا:۔ (چاندی کی طرف دیکھ کر) اچھا تو چاندی بھی یہیں ہے (سونے سے) سونا! تیرے دماغ میں صرف عزت اور بے عزتی ہی بھری ہے یا اور کچھ بھی ہے؟ اور کیوں ری چاندی! تو بہت باتونی ہو گئی ہے۔ کام سے جی چرانے لگی ہے۔

چاندی:۔ بھیا! کام تو وہ کرتے ہیں جنھیں آرام کرنا نہیں آتا۔ جو کام کرتے ہیں انھیں آج کل کی زبان میں مزدور کہتے ہیں۔

سونا:۔ دیکھئے بھیا! یہ آپ کو مزدور بتا رہی ہے۔ یہ آپ کی توہین ہے۔

لوہا:۔ پھر وہی عزت اور توہین۔ سونا تم ابھی تک نہیں بدلے ہو۔ چلو اندر تمہاری طرف سے تو مجھے دن رات پریشانی رہتی ہے۔

(سونا جاتا ہے)

چاندی:۔ بھیا! سونا کو آپ بہت ڈانٹتے ہیں۔ وہ تو یونہی ڈر کے مارے پیلا پڑا رہتا ہے۔

لوہا:۔ اور تو؟

چاندی:۔ ہاہا میں؟ چاند کی چاندنی کی طرح اجلی اور بے داغ کیوں بھیا! زہر کا رنگ کالا ہوتا ہے نا!!

لوہا:۔ (مسکرا کر) چاندی! تم اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتی ہو۔ خیریت یہ ہے کہ تمہاری ساری ہوشیاری میں سمجھتا ہوں۔ مگر تمہاری طرح میں زندگی کا مقصد باتوں کو نہیں کام کو سمجھتا ہوں۔ کتنا کام کرنا پڑتا ہے۔ کسانوں کے لئے ہل بنانے ہیں۔ کھیت ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ کارخانے مجھ سے مشینیں مانگ رہے ہیں۔ عوام کی زندگی کا ہر لمحہ میری طرف دیکھ رہا ہے۔ کاش تم سمجھ سکتیں کہ میرے اوپر کتنی بڑی ذمہ داری ہے۔ میرے اوپر کتنا بوجھ ہے۔

چاندی:۔ بھیا! کیا بوجھ اٹھانے والے جانور کو گدھا کہتے ہیں۔

لوہا:۔ (ایک چپت لگا کر، کان پکڑتا ہے) میں بات سے نہیں۔ کان پکڑ کے سمجھاتا ہوں۔ احمق کہیں کی۔ سمجھی!

چاندی:۔ (روتے ہوئے) ماں، ماں! دیکھو! یہ کالا کلوٹا مجھے مار رہا ہے۔

لوہا:۔ (چیخ کر) پھر وہی شرارت۔ کام چور۔ جان لے لوں گا۔ ٹھیک کر کے ہی مانوں گا۔ چل۔

(کان پکڑ کر کھینچتا ہے۔ چاندی چلاتی ہے۔ زمین (ماں) دوڑتی ہوئی آتی ہے)

ماں:۔ ارے یہ کیا؟ تم لوگوں کو ہو کیا گیا ہے؟ میں ذرا بھی سامنے سے ہٹی، تم لوگوں نے لڑنا شروع کر دیا۔ اب چھوڑ دو بھی چاندی کو۔

لوہا:۔ چھوڑ دوں، نہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ ماں! تمہارے ہی پیار نے اسے بگاڑ دیا۔ میں آج اسے ٹھیک ہی کر چھوڑوں گا۔

ماں:۔ تو پہلے اسے چھوڑ تو دے۔ میں اسے دیکھتی ہوں۔ پھر

اِس سے عاجز آگئی ہوں۔ کتنا ہی
ماروں، پیٹوں، مگر وہ اپنی حرکتوں
سے باز نہیں آتی۔

سونا۔ (دخل دے کر) ماں! یہ میرا بھی
مذاق اُڑا رہی تھی۔

ماں:۔ چلو چپ رہو۔ تم بھی شکایت کرنے
لگے۔ "تیکھے" کہیں کے۔ (لوہے
سے) لوہے بیٹا! تمہیں تو پورے
گھر کے کماؤ پوت ہو۔ تمہارے
اوپر تو بہت بڑی ذمّہ داری
ہے۔ تمہیں اتنی جلدی غصّہ
نہیں آنا چاہیے۔

لوہا:۔ ماں! میری بات چھوڑو، اِس
چاندی کو سمجھاؤ۔ اِس کا غرور
ایک دن اسے لے ڈوبے گا۔ میں
کہے دیتا ہوں۔

ماں:۔ تم کیا کہتے ہو۔ میں خود سمجھتی ہوں۔
کتنی بار اِس سے کہا کہ کچھ کام کیا
کر مگر ———

لوہا:۔ مگر وگر کچھ نہیں۔ ماں جو بیٹا ہے
تم اسی کو دباتی ہو۔ میں کیا کیا
کروں۔ کتنا کروں۔ کتنی ذمّہ
داری اُٹھاؤں۔

ماں:۔ بیٹے کام کرنے میں تو بڑائی ہے۔
تمھیں تو میرے نقشِ قدم پر چل
کر دُنیا میں ہر ایک کی خدمت
کر رہے ہو۔ تمہیں تو میرے
مقصدِ زندگی کو سمجھ ہو۔ جانے
یہ سونا اور چاندی کہاں سے
پیدا ہو گئے۔ جن کی طبیعت
میں میری ایک بھی بات نہیں آئی۔

لوہا:۔ ماں! تمہاری خاموش عبادت
کے سامنے تو میں ہار جاتا ہوں
چاہتا ہوں کہ میں بھی تمہاری
طرح بن جاؤں، تمہاری ہی
طرح میری زندگی کا مقصد بھی
صرف خدمت ہو۔ مگر جب کوئی
چھیڑ دیتا ہے۔ تو پھر مجھے بہت
جلد غصّہ آجاتا ہے۔

ماں:۔ بیٹے اس دنیا میں تمھیں سب کچھ
سہنا پڑے گا مجھے تو یہ دیکھ کر
بڑی خوشی ہوتی ہے کہ تم میرے
نقشِ قدم پر چل رہے ہو۔

چاندی:۔ اور مجھے دیکھ کر؟

سونا:۔ اور مجھے دیکھ کر؟

ماں:۔ جس دن سے تم لوگ جنتا کی
خدمت کرنا، اُس دن مجھ سے
یہ سوال کرنا۔ اب میں جاتی ہوں۔

لوہا:۔ ماں۔ پرنام۔

ماں:۔ بھگوان تجھے سُکھی رکھے
(ماں چلی جاتی ہے۔)

لوہا:۔ بھائی سونا اور چاندی! تمہیں
[illegible] پر ترس نہیں آتا
[illegible] وہ کتنی محنت کرتی
ہے۔ کیا ہم سب کا فرض یہ نہیں
ہے کہ ہم اُن کی خدمت کریں۔
تم نے سُنا نہیں وہ کہہ رہی تھی
کہ ان دونوں سے تو میں پریشان
ہوں۔ بھیّا بڑھیا ماں کو تنگ
نہیں کرنا چاہیے۔

چاندی:۔ بھیّا۔ اب میں تمہاری بات
مانوں گی۔ اب کبھی ماں کو تنگ
نہیں کروں گی۔ ابھی ابھی میں نے
ایک چھوٹی سی نظم کہی ہے، سُناؤں؟

لوہا:۔ پھر وہی شاعری۔ اور کام؟

چاندی:۔ بھیّا! بس یہ چھوٹی سی نظم
سُن لو۔ پھر میں کام میں لگ
جاؤں گی۔

لوہا:۔ اچھا سناؤ!

چاندی:۔ (سناتی ہے)

ماں کی جے، مٹّی کی جے
سچّی میٹھی ممتا کی جے
ماں کی جے، مٹّی کی جے

لوہا:۔ ارے یہ تو بڑی اچھی نظم ہے۔
چل سونا! تو بھی آ۔ ہم سب مل
کر گائیں۔

ماں کی جے، مٹّی کی جے
سچّی میٹھی ممتا کی جے

(رانیشور دیال دوبے کے ایک
ہندی ڈرامے کی بنیاد پر)

FEBRUARY, 197

PAYAM - I - TALEEM

NEW DELHI - 25.

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)
۱۵۲۸ - پٹودی ہاؤس، دریا گنج - دہلی ۶



9(3)

پیامِ تعلیم

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

ماہنامہ

پیام تعلیم

نئی دہلی

شمارہ ۳ جلد ۹

مارچ ۱۹۷۲ء

ایڈیٹر:- محمد حسین حسّان ندوی

صدر دفتر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

شاخ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

شاخ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

قیمت فی پرچہ

۶۰ پیسے

سالانہ چندہ چھ روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا۔

فہرست مضامین

بچّوں کی کتابیں

مذہب

ارکانِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	-/۵۰
آں حضرت	الیاس احمد مجتبیٰ اردو ہندی	-/٦۵
پاک کہانیاں دو حصوں میں	مقبول احمد سیوہاروی	۲/۳۵
چار یار	الیاس احمد مجتبیٰ	۱/۳۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۲/۲۵
رسول پاکؐ	عبدالواحد سندھی	۱/۸۰
عقائد اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۵۰
مسلمان بیبیاں	مولانا اعجاز الحق قدوسی	-/۷۵
نبیوں کے قصے	خواجہ عبدالحق فاروقی	۱/۲۵
ہمارے رسولؐ	" " "	۱/٦۵
ہمارے نبی	سید نواب علی رضوی اردو -/۷۵ ہندی	-/۴۰

معلومات

آدمی کی کہانی	مشتاق احمد	۱/۲۵
انوکھا عجائب خانہ	محمد حسین حسان (چار حصے)	۱/۸۰
بجلی کی کہانی	علی احمد خاں	-/۵۰
بڑے دادا کی کہانی	محمد عبدالغفور	-/٦۵
تاریخ ہند کی کہانیاں اوّل	خجستہ سلطان	-/۸۰
" " " دوم	ضیاء الرحمٰن	۱/-
" " " سوم	مشتاق احمد اعظمی	۱/۸۰
" " " چہارم	" " "	-/۹۵
جاپانوں کی کہانی	محمد امین	-/۷۵
خود صفائی کے طریقے	رقیہ منظور الامین	-/۸۵
دنیا کے بچے	محمد حسین حسان	-/۸۰
دنیا کے بسنے والے	بشیر حسین زیدی	-/۷۵
دہلی	ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی	۱/۸۰
رابندر ناتھ ٹیگور	فدا حسین	۱/۲۵
سماجی زندگی اول	احمد پٹیل و غلام ابرار	-/٦۵
" " دوم	" " " "	-/۸۰
" " سوم	" " " "	-/۸۱
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	۱/۳۰
سمندر کے نیچے	" " "	۲/-
قدرت کے کرشمے	ادارہ	-/٦۲
سیر انیس	محمد حسین حسان	۱/۲۵
ہماری پارلیمنٹ	کیلاش چندر	۱/۵۰

کہانیاں، ڈرامے اور ناول

اس نے کیا کر نہ جانا (کہانیاں)	آصفہ مجیب	-/۳۷
پریم کی جیت (ڈراما)	اسداللہ کاظمی	-/۳۷
تانبیل خاں (کہانی)	محمد حسین حسان	-/۳۰
ترکوں کی کہانیاں (کہانیاں)	مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	-/۵۵
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول)	م۔ نسیم	۱/۵۵
تین اناڑی (ناول)	عصمت چغتائی	۱/۴۰
چقماق کی ڈبیہ (کہانی)	برکت علی فراق	-/۴۰
چمپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی)	محمد معین	-/۳۵
ستاروں کی سیر (ناول)	کرشن چندر	-/۷۵
گونگے دادا (سچا ناول)	مجیب احمد خاں	-/۷۵
لال مرغی (کہانی)	عبدالواحد سندھی	-/۵۰
مزہ چکھائیں گے (کہانی)	مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	-/۳۵
مزے دار پہیلیاں (پہیلیاں)	محمود علی خاں	-/۳۵
ننھا ٹٹو (کہانی)	خورشید سلطان	-/۴۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

بچّوں سے باتیں

سید منیر الحسن صاحب مرحوم کو تو آپ اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں۔ ان کی نظمیں اور مضمون پیامِ تعلیم میں چھپتے رہے ہیں۔ مدرسہ ابتدائی کے بہت کامیاب اور دل عزیز استاد تھے۔ پچھلے مہینے (۱۰ فروری کو) ان کا اچانک انتقال ہوگیا۔ دل کی حرکت بند ہوگئی۔ انّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

مرحوم ۱۰ فروری کو صبح ہی صبح مہرولی تشریف لے گئے تھے۔ ایک سمنار میں شرکت کرنا تھی۔ جامعہ کے چند اور حضرات بھی ساتھ تھے۔ مہرولی پہنچ کر چکر آیا۔ تھوڑی دیر میں سنبھل گئے۔ پھر دو چار قدم چلے ہوں گے کہ لڑکھڑا کر گرنے لگے۔ ساتھیوں نے سنبھالا۔ فوراً اسپتال لے گئے۔ مگر راستے ہی میں انتقال ہوگیا۔

مرحوم پیامِ تعلیم کے لیے مضمون ہی نہیں لکھتے تھے بلکہ اسے بچّوں میں مقبول بنانے میں بھی دل وجان سے کوشش کرتے تھے۔ بہت ہنس مکھ تھے۔ ہر ایک سے ہنس کر ملتے تھے۔ بہت محبت اور خلوص سے باتیں کرتے تھے۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ ان کی باتیں سنتے ہی رہو۔ یہی وجہ تھی جامعہ میں ہر ایک انھیں دل سے چاہتا تھا۔ اور ان کے انتقال کی خبر سنتے ہی جامعہ ملیہ کے سارے ادارے فوراً بند ہوگئے۔ خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کے محترم والد دونوں بھائیوں بیوی اور بچوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

پیامِ تعلیم کا ڈراما نمبر عام طور پر پسند کیا گیا۔ جامعہ کی برادری نے ہماری کوششوں کو خاص طور پر سراہا۔ ان کے علاوہ باہر کی ڈاک سے بھی برابر تعریفی خط آرہے ہیں۔ اس پرچے میں گنجائش نہیں ہے۔ اگلے پرچے میں ہم چند خطوط شائع کرسکیں گے۔

کئی اچھے اچھے ڈرامے، ڈراما نمبر میں شائع نہ ہوسکے تھے۔ ان میں سے تین اس پرچے میں شائع ہورہے ہیں۔ باقی اپریل میں شائع ہوں گے۔ گنجائش کی کمی کی وجہ سے ہم انھیں شائع نہیں کرسکے تھے۔ ہمارے مضمون نگار حضرات معذرت قبول فرمائیں۔

ہمارے بہت سے ساتھیوں اور بہت سے پیامیوں کی رائے ہے کہ اگلا نمبر کہانی نمبر ہو۔ ہمیں بھی اس تجویز سے اتفاق ہے۔ ہم نے کوشش ابھی سے شروع کردی ہے۔ کوشش یہی ہوگی کہ اچھی سے اچھی کہانیاں "کہانی نمبر" کی زینت ہوں۔ دعا کیجیے ہماری کوششوں کو کامیابی نصیب ہو۔

مکتبہ پیامِ تعلیم کی اسکیم عام طور پر پسند کی جارہی ہے۔ ہم نے پچھلے پرچے "ڈراما نمبر" میں آٹھ کتابوں کا اعلان کیا تھا۔ یہ چھپ کر شائع ہوگئی ہیں۔ ان کے علاوہ دو کتابیں اور تیار ہوگئی ہیں۔ اس وقت پریس میں ہیں

انشاءاللہ بہت جلد چھپ کر شائع ہو جائیں گی۔

پچھلے پرچہ میں ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ اسکیم میں چھوٹے بچوں کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ اور کئی کتابیں اُن کے لیے لکھی جا رہی ہیں۔ اوپر کی دونوں کتابیں۔ انھی کے لیے ہیں۔ ان دونوں میں چھوٹے چھوٹے قصے ہیں۔ بڑے مزے کے ہیں۔ بہت ہی سادہ اور آسان زبان میں لکھے گئے ہیں۔ ہمارے ننھے منے عزیز انھیں خاص طور پر پسند کریں گے۔

اچھا ایک بات بتائیے۔ آپ نے اپنے گھر میں چھوٹی موٹی لائبریری تو بنائی ~~[illegible]~~ اپنے مطلب کی کتابوں کی بنا ہو تو بھی بنا ڈالیے۔ ہم آپ کی مدد کریں گے مکتبہ پیامِ تعلیم کی کتابوں پر تو ہم آپ کو دس فی صدی کمیشن بھی دیں گے۔ یہ کتابیں جس تیزی کے ساتھ تیار ہو رہی ہیں اور شائع ہو رہی ہیں انھیں دیکھتے ہوئے ان شاء اللہ تھوڑے ہی دنوں میں آپ کی لائبریری کو لوگ دیکھنے آیا کریں گے اور اس سے فائدہ بھی اٹھایا کریں گے۔ بچوں کی اور بھی بہت سی کتابیں ہمارے ہاں موجود ہیں۔ مکتبہ سے ہمارا ایک اور رسالہ "کتاب نما" بھی بہت دنوں سے نکل رہا ہے۔ اس رسالے میں وقتاً فوقتاً بچوں کی کتابوں کی فہرست بھی چھپتی رہتی ہے اسے منگا کر دیکھیے۔

پچھلے سال سے جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ایک نئی اسکیم شروع کی ہے۔ بہت سے لوگ اردو نہیں جانتے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ جو زبان وہ جانتے ہیں اس زبان کے ذریعے انھیں اردو سکھائی جائے۔ سرِدست ہندی کے ذریعے اردو سکھانے کا انتظام کیا گیا ہے خوشی کی بات ہے جناب عبدالغفار مدھولوی صاحب کو اس اسکیم کا انچارج بنایا گیا ہے۔ یہ دھن کے پکے ہیں۔ رات دن اسی کام میں لگے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اسکیم بہت کامیاب ہو رہی ہے۔

فارم IV حسب قاعدہ ۸ بابت پیامِ تعلیم

۱۔ مقامِ اشاعت :۔ جامعہ نگر نئی دہلی

۲۔ وقفۂ اشاعت :۔ ماہانہ

۳۔ پرنٹر :۔ سید احمد علی ہندوستانی جامعہ نگر نئی دہلی

۴۔ پبلشر :۔ سید احمد علی ہندوستانی جامعہ نگر نئی دہلی

۵۔ ایڈیٹر :۔ محمد حسین حسّان ندوی ہندوستانی جامعہ نگر نئی دہلی

۶۔ مالکان :۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵

۷۔ کمپنی کے سرمائے کے ایک فی صد سے زیادہ کے حصہ دار۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

اسلام جیم خانہ کینیڈی سی فیس بمبئی

میں تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

سید احمد علی

جناب حرمت الاکرام

بچہ اور چاند

جگ مگ کرتا تاروں میں شہزادے جیسا چاند
اپنا روپہلا تاج سنبھالے، وہ آکاش پہ اُبھرا چاند
کان میں باجی کے پہنا دو، مُنّا سے کہہ دو پی جائے
چاندی کا اک بالا ہے یا دودھ کا ہے اک پیالہ چاند
جانے کس نے سجا دیا ہے، نیل گگن کی چادر پر
بیلے کی اک پھول کی صورت، اُجلا اُجلا پیارا چاند
دوج کا چاند عجب ہے جیسے مونچھیں اپنے بھیا کی
بالکل بھائی سا لگتا ہے چودھویں کا پورا چاند
آئینے میں اس کو اتاریں، اس سے کھیلیں، جی بہلائیں
تم کیا جانو، بچّوں کی خاطر ہے رات کا تحفہ چاند
چلو چلیں، امّی سے پوچھیں، دیکھیں وہ کہتی ہیں کیا!
بحث چھڑی ہے گڈّو اور پپّو میں کہ ہے یہ کس کا چاند
دکھلاتے چل کر یاروں کو، انھیں دور سے للچاتے
کاش ہماری محفل میں پل دو پل کو آ جاتا چاند
بڑھنا گھٹنا تو اک کھیل ہے، اس کی کوئی بات نہیں
پیار بڑھا کر کیوں آخر میں دے جاتا ہے دھوکا چاند
دوڑیں اس کے پیچھے پیچھے، گریں تو گر کر پھر اٹھ جائیں
آسماں ہوتا اک پھلواری، تتلی جیسا اُڑتا چاند
بڑھیا چرخہ کات چکے تو ہم اس سے کچھ بات کریں
کب وہ لمحہ آئے گا، کب ہم کو اتنا دے گا چاند
ذرا بڑے ہوں پڑھ لکھ لیں تو پوچھیں اس میں راز ہے کیا
جانے کتنی عمر ہے اس کی لیکن ہوا نہ بوڑھا چاند

سید خواجہ محسن الدین، ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ
ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول
حیدرآباد

ڈِکشنری جَان سَن

(انگلستان کا مشہور شاعر اور ادیب)

"ڈکشنری جان سن" ——— یہ نام تمھیں کچھ عجیب سا لگتا ہوگا۔ کیوں کہ ڈکشنری ایک کتاب ہے۔ اور جان سن ایک آدمی ——— یہ دونوں ایک جگہ کیسے ہوگئے؟ ہاں ہو تو گئے اور تمھارا تعجب بھی اپنی جگہ درست ہے، تو پھر آؤ تمھیں بتائیں کہ ان دونوں ناموں سے ایک نام کیسے بن گیا؟

آج سے قریب قریب پونے تین سو برس پہلے انگلستان میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ تم پوچھو گے "کس مقام پر"؟ لو، وہ بھی سن لو، لچ فیلڈ گاؤں میں، یہ گاؤں لندن سے اتنے ہی فاصلے پر ہے کہ اگر اس مقام سے بگھی میں بیٹھ کر نکلو تو پورے تین دن لگتے ہیں لندن پہنچنے میں۔

ایک چھوٹا سا گاؤں، وہاں ایک گرجا گھر، گرجے کے چاروں طرف بازار، بازار میں کئی دکانیں، اُن میں پرانی کتابوں کی دکانیں زیادہ اور سبھی دکانوں کے لئے وہ گاؤں زیادہ مشہور بھی تھا۔ ذرا سوچ کر بتاؤ کہ وہاں کے لوگوں کو کون سی چیز زیادہ پسند ہوگی! کیا کہا؟ "کتابیں" ہاں! ٹھیک ہے، انھیں کتابیں ہی زیادہ پسند تھیں، نئی اور پرانی کتابیں وہ بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔

ان ہی دکانوں میں ایک دکان میکائیل جان سن

کیا مقابلہ کرتا۔ مگر قسمت کا مارا اولاد سے محروم تھا۔ اولاد آرزو کرتے کرتے تقریباً مایوس ہوگیا تھا کہ اللہ میاں کی دیکھو، وہ سوکھی ڈالی کو جس طرح ہرا بھرا کرتے ہیں اسی بوڑھے کی یاس کو آس سے بدل دیا یعنی بڑھاپے میں ایک بیٹا دے کر اس کے اندھیرے گھر میں اُجالا کر دیا۔ نے گرجا گھر لے جا کر سیموئل جان سن اس کا نام رکھوا

ڈھائی برس گزرنے نہ پائے تھے کہ سیموئل بری بیمار پڑ گیا۔ ڈاکٹروں نے بھی مایوس ہو کر اس کے علاج سے ہاتھ اٹھا لیا۔ طے ہوا کہ اسے لندن لے جایا جائے کے لیے نہیں ملکہ ملکہ سے چھُوانے کے لیے۔ اس زمانے عقیدہ تھا کہ بیمار بچوں کو اگر ملکۂ وقت چھو لے تو وہ اچھے ہو جاتے ہیں۔ الغرض اسے لندن لے جایا گیا، مگر نے دوسرے بیمار بچوں کے ساتھ اسے اپنے سیدھے کی انگلی سے چھو بھی لیا مگر اسے اچھا ہونا تھا نہ ہوا۔ جیسی گئی ویسی لوٹی اور اپنے گھر پہنچ کر اللہ میاں گڑگڑا کر عرض کیا، اگر تو چاہتا ہے کہ وہ ہمارے کا سہارا بن کر رہے تو اسے رہنے دے، ورنہ ہم د بہلا لیں گے کہ "ہمارے ہاں کوئی اولاد ہی نہ ہوئی" نہ تھی ملکہ درد بھرے دل کی آواز تھی اور ایسی ہی آ

آنکھ جاتی رہی، گردن سوج گئی اور تمام عمر ویسی ہی رہی
بھی بڑا بے ڈھب ہوگیا۔ لیکن کوے کا بچہ کوے کو
ا ہوتا ہے، سیمول کے ماں باپ اُسے سینے سے لگاتے
دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔

سیمول روزانہ باپ کے ساتھ اس کی دکان پر جاتا
۔ وہاں کتابیں نیچے اوپر کر دیتا تھا، مگر باپ اس پر ذرا
بگڑتا تھا۔

وہ اب اسکول جانے کے قابل ہوا۔ چھوٹے سے
۔سے ہیں اے۔ بی۔ سی۔ ڈی سیکھی۔ ڈام براؤن کے مدرسے
یا وہ کچھ لکھنے اور پڑھنے کے قابل بنا۔ گرامر اسکول میں
ریک ہو کر تھوڑی لاطینی بھی سیکھ لی۔ اسے کھیلوں سے
ئی دلچسپی نہیں تھی، اسکول سے واپس ہونے تک اس
باپ اس کے لیے پُرانی کتابوں سے اچھے اچھے جملوں،
مدہ عبارتوں اور آسان نظموں کا انتخاب کر کے رکھتا تھا
میول انھیں بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ اس طرح اس
ے دل میں کتابوں سے لگن اور مطالعے کا شوق پیدا کیا۔
پ کی دوکان نے اس کے لیے بہت اچھا میدان فراہم
یا یہیں سے سیمول کے دماغ میں تصنیف اور تالیف کا
خیال پیدا ہوا۔

سیمول انیس برس کا ہوا تو اس کے باپ نے
آکسفورڈ یونیورسٹی میں اس کے داخلے کی کوشش کی
آکسفورڈ یونیورسٹی ان دنوں صرف امیر گھرانے کے بچوں
کے لیے مختص تھی۔ سیمول جیسے غریب لڑکے کو وہاں کون
پوچھتا تھا، مگر قسمت کی یاوری سے اُسے وہاں داخلہ
مل گیا۔ وہاں اس نے مشکل سے دو برس گزارے مگر
اس اثنا میں اس نے یونیورسٹی کے کتب خانے کو چھان
ڈالا اور ادب، فلسفہ اور شاعری کے وہ انمول موتی
چُنے جو کئی سال سے لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھے۔

اِسی یونیورسٹی میں جانسن نے طے کیا کہ اسے ادیب
اور مصنف بنا چاہیے۔ مگر وہ ارادے کا پکّا نہ تھا۔ ایسے
کئی منصوبے بنے اور بگڑے۔ مفلسی الگ پیچھا کیے ہوئے
تھی۔ باپ کا کاروبار کوئی سلیقے کا کاروبار نہ تھا۔ اُسے اس
بات کا بھی پتہ نہ تھا کہ اس کی دکان نفع میں چل رہی ہے یا
نقصان میں۔ اس دوران میں وہ بُری طرح بیمار پڑ گیا۔
صحت یابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ تو سیمول کو خبر دی
گئی، وہ آیا۔ باپ نے اس کی آنکھوں کے سامنے آخری سانس
لی۔ اب گزر بسر کا سوال پیدا ہوا تو اس نے آکسفورڈ یونیورسٹی
کو خیرباد کہہ دیا۔

اللہ میاں نے جانسن کو بلا کا حافظہ دیا تھا لیکن
وہ بڑا لاابالی تھا۔ کسی کتاب کو اس نے شروع سے آخر
تک کبھی نہیں پڑھا۔ بس دو چار ورق اِدھر اُدھر اُلٹے
پلٹے اور کتاب وہیں رکھ دی۔ یہ حال تھا اس کے پڑھنے کا
مگر جو کچھ پڑھتا اسے خوب یاد رکھتا تھا بلکہ ضرورت پڑے
لفظ بہ لفظ سنا دیتا تھا۔

نوکری کے لیے اس نے ایک مدرسے میں درخواست
دی۔ مدرسے والوں نے اس کی درخواست واپس کر دی۔
وجہ یہ بتائی کہ جانسن بدصورت ہے۔ اس کی حرکتیں عجیب
سی ہیں بچے اس پر ہنسیں گے اور مدرسے کا ڈسپلن خراب
ہوگا۔ ایک اور جگہ اسے نوکری تو ملی۔ لیکن وہ کوئی اچھا
استاد ثابت نہ ہوا۔ اس لیے مدرسے کے مالک سے لڑ جھگڑ
کر برمنگھم چلا گیا۔ وہاں پر اس کے ایک دوست نے ترجمے کا
کام دلایا۔ معاوضے کے طور پر اسے ایک سو پانچ شلنگ ملے۔
یہ اس کی پہلی کمائی تھی۔ اس کام کو چھوڑ کر ادبی رسالوں
اور اخباروں میں مضمون بھیجنے کا تہیہ کیا، لیکن کامیا

نہ ہوئی۔ بیروزگاری میں اس نے ایک بیوہ سے شادی بھی کرلی۔ پہلے وہ اکیلا تھا، اب ایک سے دو ہوگئے، جینا اور مشکل ہوا۔ بیوی اپنے ساتھ کچھ رقم لائی تھی وہ بھی ختم ہوگئی اُس نے ایک مدرسہ کھولا مگر وہ بھی زیادہ دنوں تک نہ چل سکا۔ اس لیے وہ مجبور ہو کر لندن پہنچ گیا تاکہ وہاں کوئی نوکری مل جائے تو بیوی کو بھی وہیں بلوالے۔

تلاشِ روزگار میں لندن کی سڑکوں پر وہ مارا مارا پھرتا۔ اسی دوران میں اس نے ایک ڈرامہ لکھا، کئی نظمیں لکھیں۔ اب لوگ اس سے واقف ہونے لگے لندن کی ایک بڑی لائبریری میں نوکری ملی۔ اس کے لاابالی پن کی وجہ سے وہ زیادہ دن نہ چلی، پارلیمنٹ کے ممبروں کی تقریریں شائع کرنے کا کام ملا۔ وہاں اس نے جی لگا کر لکھنا شروع کیا، جس سے وہ خوب چمکا معاوضہ بھی کافی ملنے لگا۔ جب اسے شہرت اور فراغت نصیب ہوئی تو اس نے انگریزی زبان کی ڈکشنری لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ اب تم پر واضح ہوگا کہ سیمول جانسن کو ڈکشنری جانسن بھی کیوں کہا جاتا ہے؟

ڈکشنری انگریزی زبان کا لفظ ہے اُسے اردو میں لغت کہتے ہیں۔ لغت لکھنا یا اسے ترتیب دینا معمولی بات نہیں۔ اس کے لیے بڑی محنت اٹھانی پڑتی ہے۔ یہ کام ایسے ہی شخص سے ممکن ہے جو کئی زبانوں کا ماہر ہو، جس کا مطالعہ اور حافظہ دونوں کافی اچھے ہوں اور جس زبان کی لغت لکھی جا رہی ہے اس پر اسے پورا پورا عبور حاصل ہو۔ اس کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس زبان کے استادوں اور ماہروں نے لفظوں کو کن کن معنوں میں اور کس [illegible] انداز سے اپنی تحریر یا تقریر میں استعمال کیا ہے۔ بنی بنائی کتاب وہ ایک روپے میں ہمارے ہاتھوں میں آجاتی ہے اس کے لکھنے میں جو مصیبت اٹھانی پڑتی ہے اس کا ہمیں کوئی اندازہ نہیں۔

ہر پڑھے لکھے کو ایسی کتاب کی ضرورت تھی وہ چاہتا تھا کہ اس کی ڈکشنری ہر اس شخص کے کام آئے جو ادب کی سچی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ کسی لفظ کو نوٹ کرنے سے پہلے دیکھتا تھا کہ بڑے بڑے استادوں نے اسے کن معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ہمالہ کی چوٹی سر کرنا اتنا مشکل نہ تھا، جتنا اس کام کا بیڑا اٹھانا۔ جب تک ادب کا کافی ذخیرہ نہ ہوا اور ہر لفظ کو خوب پرکھ کر نہ دیکھا جائے اس وقت تک ایک انچ آگے بڑھنا ممکن نہ تھا۔

اُس کا طریقہ یہ تھا کہ معیاری کتابوں سے بڑی بڑی عبارتیں چُن لیتا تھا۔ ان پر پنسل کے نشان لگا کر حاشیے میں وہ حرف لکھ دیتا جس سے کوئی لفظ اپنی ترتیب کے لحاظ سے شروع ہونے کو ہوتا اور انھیں اسی ترتیب سے کاپی نویسوں کو دیتا تھا۔ کاپی نویس ان عبارتوں کو نقل کرکے انھیں حروف کے لحاظ سے ترتیب دے کر جانسن کے ملاحظے میں دوبارہ پیش کرتے تھے۔ عبارتوں کے انتخاب میں جانسن بڑی احتیاط سے کام لیتا تھا۔ وہ دیکھتا کہ مصنف کس پایے کا ہے، اس کے اخلاق اور کردار کا کیا عالم ہے، وہ عقیدے کا کیسا ہے اور اس نے کہیں معیار سے گرا ہوا ادب تو پیش نہیں کیا۔

بے چارے نے واقعی کڑی محنت اٹھائی۔ ان دنوں بجلی کی روشنی نہیں تھی۔ اندھیری راتوں میں اپنے بند کمرے میں بیٹھا ایک جلتی ہوئی موم بتی پر جھکا جاتا اور

کی مدھم روشنی میں کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ جسم پر کپڑے برابر نہ ہوتے۔ ایک آنکھ سے عبارتیں ٹٹولتا۔ اور ان پر پنسل کے نشان لگاتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس کی کمر درد کرتی آنکھ الگ ستاتی، وہ کبھی سوج جاتی اور کبھی سرخ انگارہ بن جاتی۔ اس سے پانی بہنے لگتا صبح اٹھ کر اس کی بیوی دیکھتی کہ غریب کتابوں کی ڈھیر میں آدھا کھپا ہوا ہے۔

آٹھ سال کی لگاتار محنت کے بعد ڈکشنری کی مہم اس نے سر کرلی، سرپرستوں کے بل بوتے، ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائی تھی۔ جس کو خیر و خوبی کے ساتھ منزل تک پہنچایا، دل کی سچائی، کام کی لگن اور اللہ پر بھروسے نے اس سے وہ کام لیا جو رہتی دنیا تک اس کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ جانسن بھی مطمئن تھا کہ اس کی محنت ٹھکانے لگی ہے، مفلسی اس سے دور ہو رہی ہے اور فراغت قدم چومنے کھڑی ہے۔ ایسے میں اس کی بیوی نے اُسے جدائی کا داغ دیا مسز جانسن جوں کہ اس کے دل و جان میں بس گئی تھی۔ اس لیے وہ اس کے خیال سے محو نہ ہو سکی۔ تنہائی جانسن کو کاٹ کھانے آتی تھی۔ اس لیے اب وہ ادبی اور سماجی انجمنوں میں زیادہ اٹھنے بیٹھنے لگا۔ وہ جہاں بھی جاتا شمعِ محفل اور جانِ انجمن بن جاتا۔ اہلِ لندن اس کا لوہا مان چکے تھے۔ لیکن اب دوسرے ملکوں کے لوگ بھی اسے سر آنکھوں پر بٹھانے لگے۔

دن بدل گئے، پہلے جانسن کو پیسے کی ضرورت تھی اب پیسے کو جانسن کی ضرورت ہے۔ وہ پہلے ناشروں کے گھروں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ اب ناشر اس کے گھر کا طواف کر رہے ہیں۔ دولت اس کی لونڈی اور فراغت اس کا غلام بن چکی تھی۔ اس کی بیوی مرتے ہوئے بھی اس پر احسان کر گئی کہ جاتے جاتے اس کی غریبی بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ اس کا گھر مہمان سرا بنا ہوا تھا۔ اُس نے فقیری میں بھی شاہی کی۔ اسی زمانے میں باس ول سے بھی اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ اس کا بہترین دوست اور مددگار بن گیا۔ اسے اپنے وطن اسکاٹ لینڈ کی سیر کرائی۔ اسی دور میں انگلستان کے ایک مشہور ادیب گولڈ اسمتھ سے جانسن کی ملاقات ہوئی۔ یورپ کے کئی ملکوں کی سیر کر کے جب لندن واپس آیا تو اُس پر ضعیفی کے آثار شروع ہوئے، کمزوری بڑھ گئی، دمہ کی شکایت نے زور پکڑا۔ اس کے باوجود اس نے ادبی کام کو برابر اپنا مشغلہ بنائے رکھا۔ اس پر اعصابی دورے بھی پڑتے تھے۔ سڑک پر جب وہ چلتا تو کبھی آہستہ آہستہ چلتا، جیسے چہل قدمی کر رہا ہو، پھر ایک دم اپنی رفتار اتنی تیز کر دیتا جیسے کوئی پریشانی کی خبر سن کر بے ساختہ دوڑ رہا ہو۔ کبھی تو سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا چلتا تو کبھی لمبے لمبے قدم ڈال کر آگے نکل جاتا۔ کبھی سڑک کے کنارے کے کھمبے گنتے ہوئے گزرتا تو کبھی درخت پر یکایک ہی چڑھ جاتا۔ وہ ایک دفعہ اپنے ایک دوست کے ساتھ قریب کی ایک پہاڑی پر چڑھا اور اس سے کہا کہ "لڑھکنے کو جی چاہتا ہے" یہ کہتے ہوئے چٹان پر لیٹ گیا اور لڑھکتے لڑھکتے پہاڑی کے دامن میں پہنچ گیا۔

جانسن موت سے بہت ڈرتا تھا اس لیے وہ ہمیشہ یادِ الٰہی میں مصروف رہتا تھا۔ ایک دن اس پر فالج کا حملہ ہوا دوستوں نے بہتیرے علاج کرائے، لیکن کوئی علاج کارگر نہ ہوا قریب قریب ۷۶ سال کی عمر میں فالج کا جب دوسرا حملہ ہوا، تو بے چارہ بچ نہ سکا۔ اس کی موت کی خبر عام ہوئی، ساری دنیا نے سوگ منایا۔ اسے ویسٹ منسٹر ایبی میں دفن کیا گیا جو بہت بڑا اعزاز ہے۔

جناب خلیق انجم اشرفی

انصاف ایسے ہوتا ہے (ڈراما)

(ایک الجیریا کی کہانی کو سامنے رکھ کر لکھا گیا)

میں نے جس ڈرامے کا ترجمہ شروع کیا تھا۔ وہ دہلی کے ہائر سکنڈری کے کورس میں داخل ہے۔ کتاب کا نام ہے (SIXONEACT PLAYS) سکس ون ایکٹ پلے۔ یہی ڈراما ایک کہانی (SAGACIOUS QAZI) کے روپ میں ایک تر یسٹھ سال پرانی (۱۹۰۸ کی چھپی ہوئی) کتاب میں موجود ہے۔ غالباً ان ہے کہ ڈراما نگار نے اسی کہانی کو ڈرامے کی شکل میں ڈھالا ہے۔ ڈرامے کے بارے میں نوٹ ہے کہ یہ الف لیلہ کی کہانی ہے۔ لیکن یہ قطعی غلط ہے۔ حقیقتاً یہ ایک الجیریائی کہانی ہے۔ ڈرامے اور کہانی کے کرداروں میں معمولی سا فرق ہے۔ مثلاً کہانی میں خلیفہ کا نام شیخ ابو عکاش ہے اور وہ الجیریا کے خلیفہ ہیں۔ ڈرامے میں اس نام کی جگہ مصطفےٰ ہے۔ (یہ بات ذہن میں رہے کہ الف لیلہ کا مرکزی کردار خلیفہ ہارون رشید ہے) کہانی میں ایک کردار فلسفی ہے۔ ڈرامے میں فلسفی کی جگہ ادیب ہے۔ کہانی میں جھگڑا بیوی پر ہے۔ ڈرامے میں غلام پر۔ غرض اس طرح کے معمولی فرق ہیں۔ میں نے ان دونوں سے استفادہ کرکے اور اپنی طرف سے مناسب کتر بیونت کرکے یہ ڈراما تیار کیا ہے۔ خلیق انجم

کردار:- (جس ترتیب سے وہ اسٹیج پر آتے ہیں)

شیخ ابو عکاش :— خلیفہ

علی :— لنگڑا فقیر

قاضی

ادیب

کسان

قصائی

تیل فروش

عدالت کے افسر و سپاہی وغیرہ

پہلا منظر

جگہ :- الجیریا کے کسی شہر کی ایک آباد سڑک

راوی :- "شیخ ابو عکاش، الجیریا کے بارہ مشہور اور طاقتور قبیلوں کے انصاف پسند حکمران کو معلوم ہوا ہے کہ اس کی حکومت میں ایک شہر کا قاضی سوجھ بوجھ اور دانائی میں حکیم لقمان کا ہم سر ہے۔ اس اطلاع کی تصدیق کے لیے وہ خود بھیس بدل کر ایک گھوڑے پر سوار اس شہر کی جانب روانہ ہو گیا ہے۔"

علی :- (ابو عکاش کی عبا کا دامن پکڑ کر) اس اللہ کے نام پر کچھ اس غریب لنگڑے محتاج کو مل جائے مہربان!

ابو عکاش :- (چند درہم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے) "لو خدا تم پر رحم فرمائے۔ (علی اب بھی اس کی عبا کا دامن نہیں چھوڑتا) کیوں، اب کیا ہے؟ کیا میں نے تمہارا سوال پورا نہیں کر دیا؟

علی :- وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن کیا شریعت کا یہ حکم نہیں کہ تو نہ صرف اپنے بھائی کو خیرات دے بلکہ ہر طرح اس کی مدد کر۔

ابو عکاش :- تمہاری بات ذہن میں تمہارے

لئے کیا کر سکتا ہوں؟

علی :۔ "آپ مجھے انسانوں اور جانوروں کے پیروں تلے، کچلنے سے بچا سکتے ہیں میرے مہربان آقا۔

ابو عکاش :۔ بھلا وہ کیسے؟"

علی :۔ "مجھے اپنے گھوڑے پر بٹھا کر اور مجھے بازار کے نزدیک کسی محفوظ جگہ پر اُتار کر جہاں مجھے بھیک زیادہ مل سکتی ہے۔"

ابو عکاش :۔ "بہت خوب۔ آؤ۔ چڑھ جاؤ۔"

(جھک کر لنگڑے بھکاری کو چڑھنے میں مدد دیتا ہے اور آخر کار وہ شہر پناہ میں داخل ہو کر بازار کے قریب پہنچتے ہیں)

"یہی وہ جگہ ہے نا جہاں تم رُکنا چاہتے ہو؟

علی :۔ "جی ہاں۔"

ابو عکاش :۔ (بے صبری سے) :۔ تو پھر جلدی سے اُتر جاؤ۔

علی :۔ "میں کیوں اُتروں؟ اُترو گے تو تم۔

ابو عکاش :۔ (حیران ہو کر) ہیں؟ وہ کیوں میرے دوست؟

علی :۔ "تاکہ میں گھوڑا لے سکوں۔

ابو عکاش :۔ (اور زیادہ حیران ہو کر)۔ "تاکہ میں گھوڑا لے سکوں — کیا مطلب؟

علی :۔ "مطلب بالکل صاف ہے۔ یہ گھوڑا میرا ہے۔ اگر تم اس گھوڑے سے سیدھی طرح نہ اُترے تو میں یہ معاملہ قاضی کے سامنے پیش کروں گا۔ شاید تمھیں معلوم نہیں کہ یہ عقل مند قاضی کا شہر ہے اور اُس کا فیصلہ میرے ہی حق میں ہوگا۔"

ابو عکاش :۔ "مگر وہ فیصلہ تمہارے حق میں کیوں کرے گا جب کہ گھوڑا میرا ہے؟"

علی :۔ "جب قاضی تمہیں دیکھے گا۔ یہ دیکھے گا کہ تمہاری مضبوط ٹانگیں جو اللہ نے تمہیں چلنے کے لیے عطا کی ہیں اور پھر مجھ پر نظر ڈالے گا۔ میری یہ لنگڑی ٹانگ دیکھے گا تو فوراً میرے حق میں فیصلہ دے دے گا کیونکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ اس گھوڑے کی مجھے زیادہ ضرورت ہے۔"

ابو عکاش :۔ "لیکن اگر وہ ایسا کرے گا تو اُسے عقل مند کہنا حماقت ہوگی۔"

علی :۔ (بے حیائی سے ہنستے ہوئے) :۔ "وہ ہے تو عقل مند لیکن غلطی تو ہر انسان سے ہوتی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ اُس سے بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں کون ہے جو گواہی دے گا کہ گھوڑا تمہارا ہی ہے۔

ابو عکاش :۔ (آپ ہی آپ بڑبڑاتا ہے) "بھئی واہ، خدا نے خود ہی یہ موقع فراہم کر دیا۔ اب میں اُس قاضی کی ذہانت کی جانچ بذات خود کر سکتا ہوں۔"

ابو عکاش :۔ "تمہارے مطلب کی بات نہیں مکار بھکاری۔ میں تم سے متفق ہوں۔ آؤ قاضی کے پاس چلیں۔

دوسرا منظر

(جگہ :۔ عدالت کا کمرہ)

(راوی) :۔ "ادیب اور کسان ایک غلام کی ملکیت پر لڑ پڑتے ہیں۔ دونوں کا دعویٰ ہے کہ غلام اُن کا ہے۔ غلام اتفاقاً گونگا بہرا ہے اور بتا نہیں سکتا کہ اس کا اصلی مالک کون ہے۔ شیخ ابو عکاش جب عدالت کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو ان کا معاملہ قاضی کے سامنے پیش کیا جا چکا ہے)

قاضی :۔ "کیا ادیب۔ کسان اور غلام حاضر ہیں؟"

افسر :۔ (ادب سے جھکتے ہوئے) "حاضر ہیں عالی جناب۔

قاضی :۔ "کسان کو پہلے اپنا بیان دینے

کی اجازت دی جاتی ہے۔"

کسان: (آگے بڑھ کر قاضی کے سامنے ادب سے جھکتے ہوئے) انصاف پرور۔ یہ لڑکا جو آپ کے حضور میں حاضر ہے، میرا غلام ہے۔ میں نے اسے پچھلے ہفتے ہی خریدا ہے۔ اس شخص نے اسے چرا لیا۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ میرا غلام مجھے واپس دلادیں۔"

ادیب:۔ (بے صبری سے) "یہ دُرست نہیں حضور۔ یہ لڑکا برسوں سے میرا غلام ہے۔ میں نے اسے بہت کچھ سکھا دیا ہے، حضور۔ لیکن افسوس کہ اس کسان نے اسے پچھلے ہفتے میرے یہاں سے چرا لیا اور اب کہتا ہے کہ اس نے اسے بازار سے خریدا ہے۔ میں التجا کرتا ہوں کہ میرا غلام مجھے واپس دلوادیں۔ میں اپنے کچھ ایسے دوستوں کی گواہی دلوا سکتا ہوں جنھوں نے اسے بارہا میرے گھر پر دیکھا ہے۔"

قاضی:۔ "ہمیں تمہارے دوستوں کی مدد کی ضرورت نہیں۔ تمہاری خوشنودی کی خاطر وہ حق کا خون بھی کرسکتے ہیں۔ اس مقدمہ کا فیصلہ ہم خود کریں گے۔ اس غلام لڑکے کو ہمارے پاس چھوڑ دو اور کل حاضر ہو۔" (کسان اور ادیب ادب سے سر جھکا کر کمرۂ عدالت سے باہر نکل جاتے ہیں) "دوسرا مقدمہ؟"

افسر:۔ "ایک قصائی اور تیلی کا معاملہ ہے حضور۔"

قاضی:۔ "انھیں آگے آنے دو۔" (وہ دونوں آگے آتے ہیں۔ تیلی نے قصائی کی کلائی تھام رکھی ہے) "ہم پہلے قصائی کا بیان سنیں گے۔"

قصائی:۔ (ادب سے جھک کر) "حضور قاضی صاحب۔ میں اس تیلی کی دکان پر تیل خریدنے گیا اور اسے دام دینے کے لیے جیب سے بہت سے سکے نکالے۔ اتنے بہت سے سکے دیکھ کر اس تیلی کے دل میں لالچ آگیا۔ اور اس نے میری کلائی پکڑ کر جھٹکا دیا تاکہ میرے سکے چھین لے۔ میں چلانے لگا۔ لیکن اس نے پھر بھی مجھے نہیں چھوڑا۔ اس لیے ہم اسی طرح آپ کی عدالت میں حاضر ہوگئے انصاف پرور! میں اپنے سکے ہاتھ میں پکڑے اور یہ میری کلائی تھامے۔ حضور، میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ سکے میرے ہیں۔"

قاضی:۔ "اور تیلی، تم کیا کہتے ہو؟"

تیل فروش:۔ "سرکار، یہ آدمی میری دکان سے تیل خریدنے آیا۔ جب میں نے اسے تیل کی بوتل دے دی تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ایک اشرفی بھنا سکتا ہوں؟ میں نے مٹھی بھر سکے نکال کر ایک پیپے پر گننے کے لیے رکھے، اس نے جھپٹ کر سکے اٹھا لیے۔ اور بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اس کی کلائی تھام لی اور چلانے لگا "چور چور"۔ میرے چلانے کے باوجود اس نے سکے نہیں چھوڑے اور میں اسے اسی طرح پکڑے ہوئے آپ کے حضور میں لے آیا۔ عظیم قاضی، تاکہ آپ اس مقدمہ کا فیصلہ کرسکیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ سکے میرے ہیں۔"

قاضی:۔ "اچھا، یہ سکے میرے پاس چھوڑ جاؤ اور کل حاضر ہو۔" (وہ دونوں سکے افسر کے حوالے کرکے ادب سے جھکتے ہیں اور پھر

کمرۂ عدالت سے نکل جاتے ہیں) کوئی
اور مقدمہ ؟
افسر:۔ عالی جناب۔ اگلا مقدمہ دو آدمیوں
کا ہے جو ایک عمدہ عربی گھوڑے
کو اپنی ملکیت بتاتے ہیں۔
قاضی:۔ اچھا انھیں بھی پیش کرو۔
(شیخ ابو عکاش اور علی آگے آکر
ادب سے جھک جاتے ہیں۔ قاضی
شیخ ابو عکاش سے مخاطب ہوتا ہے)
"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"
شیخ ابو عکاش:۔ (دوبارہ ادب سے جھک کر)
حضور! میرا نام مصطفیٰ ہے۔ میں
بہت دور سے آپ کا شہر دیکھنے آیا
تھا۔ شہر پناہ کے دروازے پر میری
ملاقات اس لنگڑے بھکاری سے
ہوئی۔ اس نے مجھ سے اللہ کے
نام پر بھیک مانگی اور اس کے
بعد مجھ سے درخواست کی کہ اسے
گھوڑے پر بٹھا کر بازار تک لے
چلوں۔ جب ہم بازار میں پہنچے
تو اس نے یہ کہہ کر اترنے سے انکار
کر دیا کہ گھوڑا تو اس کا ہے اور یہ
کہ اسے صحیح فیصلہ کرنے والے
انصاف پرور قاضی، آپ اسی
کے حق میں فیصلہ فرمائیں گے
کیونکہ آپ یہ دیکھیں گے کہ گھوڑے
کی زیادہ ضرورت اسی کو ہے۔

عالی جناب۔ یہی اس مقدمہ
کا سچا بیان ہے۔
قاضی:۔ اچھا اب بھکاری کا بیان
ہو۔
بھکاری:۔ سرکار! یہ بیان صحیح
نہیں۔ میں اپنے اس گھوڑے
پر سوار، بازار کی طرف
جا رہا تھا کہ میری نظر ایک مسافر
پر پڑی جو تھکن سے نیم مردہ
ہو رہا تھا۔ مجھے ترس آیا۔
اور میں نے اسے بازار تک
اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر
چلنے کی دعوت دی۔ اس نے
فوراً یہ پیش کش قبول کر لی۔
اور میرا شکریہ بھی ادا کیا لیکن
جب ہم بازار میں پہنچ گئے تو
اس وقت میری حیرت کی
انتہا نہ رہی۔ جب اس شخص
نے یہ کہتے ہوئے گھوڑے
سے اترنے سے انکار کر دیا
کہ گھوڑا اس کا ہے۔ اس پر
میں اسے فوراً آپ کے حضور
میں لے آیا تاکہ آپ اس کا
فیصلہ فرما سکیں۔
قاضی:۔ اچھا گھوڑا یہاں چھوڑ جاؤ
اور کل صبح حاضر ہو۔

تیسرا منظر

جگہ:۔ کمرۂ عدالت
راوی:۔ ان دلچسپ مقدموں کی خبر
عام لوگوں تک پہنچ گئی ہے اور
فریقوں کے علاوہ ایک بڑا ہجوم
ان عجیب مقدموں کا فیصلہ سننے
کے لیے عدالت کے کمرے کے
سامنے جمع ہے۔
قاضی:۔ "ادیب اور کسان کہاں ہیں؟"
افسر:۔ (ادب سے سر جھکاتے ہوئے) وہ
حاضر ہیں عالی جناب اور قصائی
اور تیلی اور وہ شخص جو خود کو
مصطفیٰ کہتا ہے اور وہ لنگڑا
بھکاری علی بھی۔"
قاضی:۔ پہلے ادیب کو پیش کرو (ادیب
آگے آکر ادب سے جھک جاتا ہے)
یہ غلام تمہارا ہے اسے اپنے گھر
لے جاؤ۔ افسر! اس جھوٹے کسان
کو پچاس کوڑے لگواؤ تاکہ
اسے اس چوری اور جھوٹ کا
مزا معلوم ہو (ادیب خوش خوش
اپنے غلام کے ساتھ نکل جاتا ہے
سپاہی کسان کو باہر لے جاتے ہیں)
اب وہ قصائی اور تیلی آگے
آئیں۔ قصائی، یہ ہیں تمہارے
سکے۔ یہ رقم سچ مچ تمہاری ہے
اور اس تیلی کا اس پر کوئی حق
نہیں۔ جاؤ خدا حافظ۔"

قصائی :۔ الحمدُللہ، کہ میری معصومیت ثابت ہو گئی (ادب سے جھک کر باہر چلا جاتا ہے)

قاضی :۔ افسر، اِس تیلی کو چالیس کوڑے لگواؤ تاکہ یہ آئندہ بے ایمانی نہ کر سکے (سپاہی تیلی کو باہر لے جاتے ہیں) اب مصطفیٰ اور علی آگے آئیں۔ مصطفیٰ! کیا تم دوسرے گھوڑوں کے درمیان اپنا گھوڑا پہچان سکتے ہو؟

مصطفیٰ (شیخ ابوعکاش) :۔ یقیناً عالی جناب۔

قاضی :۔ تو ہمارے پیچھے آؤ۔

چوتھا منظر

جگہ :۔ اصطبل

(قاضی، مصطفیٰ اور افسر اندر داخل ہوتے ہیں)

قاضی :۔ ہاں بتاؤ مصطفیٰ اِن میں تمہارا گھوڑا کون سا ہے ۔؟

مصطفیٰ :۔ (اپنے گھوڑے کے پاس جاتے ہوئے) :۔ یہ رہا عالی جناب۔

قاضی :۔ ٹھیک ہے مصطفیٰ۔ جاؤ کمرۂ عدالت میں واپس جاؤ۔ افسر! اب تم علی کو یہاں لاؤ (مصطفیٰ واپس جاتا ہے اور چند لمحوں کے بعد افسر علی کے ہمراہ داخل ہوتا ہے)

قاضی :۔ ہاں علی! اب تم بتاؤ کہ ان میں کون سا گھوڑا تمہارا ہے گھوڑے کے قریب جاکر اُس پر ہاتھ رکھو تاکہ بغیر کسی شک و شبہ کے یہ معلوم ہو سکے کہ تمہارا گھوڑا کون سا ہے؟

علی :۔ (بڑے اعتماد کے ساتھ اُسی گھوڑے کے پاس پہنچ کر)۔ یہ ہے حضور میرا گھوڑا ہے۔

قاضی :۔ "بہت خوب" اب کمرۂ عدالت میں واپس چلو۔

پانچواں منظر

جگہ :۔ کمرۂ عدالت

قاضی :۔ مصطفیٰ گھوڑا تمہارا ہے۔ اصطبل جاکر اُسے لے لو۔ افسر اِس بدمعاش بھکاری کو پچاس کوڑے لگواؤ۔ یہ اِسی کا مستحق ہے۔ کیونکہ اِس نے اپنے محسن سے غداری کی ہے۔ الحمدُللہ، کہ ہمارا آج کا کام بہ خیر و خوبی ختم ہوا۔ (مصطفیٰ کے علاوہ سب یہ سُن کر کمرۂ عدالت سے باہر نکل جاتے ہیں) اب کا ہے کا انتظار ہے مصطفیٰ! کیا تم ہمارے فیصلے سے مطمئن نہیں۔

مصطفیٰ :۔ یقیناً اے قاضی۔ ہم آپ کے فیصلوں سے مطمئن ہیں لیکن یہ جاننا پسند کریں گے کہ آپ نے یہ درست فیصلے کیونکر کیئے۔ کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے مقدمے کے فیصلے کے علاوہ بقیہ دونوں مقدموں کا فیصلہ بھی ایسا ہی درست تھا۔ پہلے یہ جان لیجئے کہ ہم شیخ ابوعکاش ہیں، والیِ الجیریا۔ اور دائرۃ الحکومت سے محض آپ کی ذہانت، قوتِ فیصلہ اور انصاف کا امتحان لینے آئے تھے۔ ہمیں یہ معلوم ہوا کہ آپ واقعتہً ایک ذہین و عقل مند قاضی ہیں۔ ہمیں بتائیے کہ آپ ان فیصلوں پر کیسے پہنچے۔ ہم یہ جاننے کے لیے بے چین ہیں۔

(قاضی حیران ہو کر اُٹھتا ہے۔ شیخ کے سامنے ادب سے جھک کر اُس کی عبا کو بوسہ دے کر کہتا ہے)

قاضی :۔ امیر المومنین کا اقبال بلند ہو

شیخ ابوعکاش (بے چینی سے) اُٹھئے اور مجھے اپنے فیصلوں کی داستان سنائیے!

قاضی :۔ خلیفۃ المسلمین۔ یہ بہت آسان سی بات تھی۔ عالی جاہ نے ملاحظہ فرمایا کہ مَیں نے کل اپنے فیصلوں کو آج پہ ملتوی کر دیا تھا۔

شیخ :۔ ہاں، ہم نے دیکھا۔

قاضی :۔ بس آج صبح میں نے غلام کو بلا کر اشاروں سے اپنی دوات بھرنے کو کہا۔

یہ کام اُس نے اِس صفائی اَور ہوشیاری سے کیا، گویا سینکڑوں بار پہلے بھی کر چکا ہو۔ مَیں نے خود سے کہا: "یہ لڑکا کسی کسان کا غلام نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور اُس ادیب کا غلام ہے"۔

شیخ :- خوب، اَور وہ قصائی؟ آپ نے اِس کے بارے میں کیسے فیصلہ کیا؟

قاضی :- آپ نے ملاحظہ فرمایا تھا امیر المومنین کہ اُس تیلی کے ہاتھ اور کپڑے تیل میں سنے ہوئے تھے؟

شیخ :- یقیناً ہم نے دیکھا تھا۔

قاضی :- "پچھلی رات ہم نے وہ سکّے ایک برتن میں ڈال کر اُس میں پانی بھر دیا۔ آج صبح جب مَیں نے اُسے دیکھا تو پانی پر تیل کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔ مَیں نے دل سے کہا: "اگر یہ سکّے تیلی کے ہوتے تو انھیں چکنا ہونا چاہیے تھا۔ لیکن چوں کہ ایسا نہیں ہے، اِس لیے قصائی سچّا ہے۔

شیخ :- بہت خوب۔ اَور بہار! گھوڑا؟ آپ نے اِس کے بارے میں سچّا فیصلہ کیوں کر کیا؟

قاضی :- عالی جاہ! یہ مقدمہ واقعی مشکل تھا اَور آج صبح تک مَیں بڑے شش و پنج میں تھا۔

شیخ :- "ہمارا خیال ہے، لنگڑے نے گھوڑا نہیں پہچانا۔ کیوں؟"

قاضی :- اِس کے برعکس غریب پرور، اُس نے فوراً صحیح گھوڑے پر ہاتھ رکھ دیا۔

شیخ :- (حیران ہو کر) تب آپ نے کیسے پتا لگایا کہ وہ اِس کا اصل مالک نہیں۔

قاضی :- خلیفۃُ المسلمین! میں آپ کو علیحدگی میں اصطبل دیکھنے کے لیے اِس لیے نہیں لے گیا تھا کہ آپ اپنا گھوڑا پہچان لیتے ہَیں یا نہیں، بلکہ یہ دیکھنے کے لیے لے گیا تھا کہ گھوڑا بھی آپ کو پہچانتا ہے یا نہیں۔ جب آپ اُس کے نزدیک پہنچے تو جانور نے اپنی گردن آپ کی جانب گھما کر پیار سے آپ کو دیکھا۔ اِس کے برعکس جب بھکاری نے اُس پر ہاتھ رکھا تو اُس نے اپنی کنوتیاں یوں ہلائیں جیسے اُسے اِس کی یہ حرکت پسند نہ آئی ہو۔ بس اُسی لمحہ مَیں نے جان لیا کہ آپ ہی اصل مالک ہَیں۔

شیخ :- (خوشی اور حیرت سے کھڑا ہو جاتا ہے) اللہ نے آپ کو عام انسانوں سے زیادہ عقل بخشی ہے اَور آپ واقعی اِس لائق ہیں کہ ہماری جگہ پُر کریں۔ لیکن ہم خود کو اِس لائق نہیں سمجھتے کہ آپ کی جگہ پُر کر سکیں۔ لیکن اے ذہین قاضی! آج سے آپ ہمارے نائبُ السّلطنت ہیں۔ ہمارا یہ حکم عدالت کے صفحات میں درج کیا جائے۔

(قاضی جُھک کر شیخ کی عبا کو بوسہ دیتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

جناب ساحر بھوپالی

اندرا گاندھی کا نعرہ

تفریق کا ہر نقش مٹانے کو اُٹھی ہوں
مَیں قوم کی تقدیر بنانے کو اُٹھی ہوں

جس آگ نے پھونکا ہے مرا خرمن ہستی
وہ آگ ہر اک دِل میں لگانے کو اُٹھی ہوں

تخریب پسند اُس کو مٹانے پہ تُلے ہیں
مَیں ہند کے گلشن کو بچانے کو اُٹھی ہوں

کرنا ہے مجھے ہند کے دستور میں ترمیم
ہر ایک کو اِنصاف دِلانے کو اُٹھی ہوں

یہ فرقہ پرستی، یہ غریبی، یہ جہالت
مَیں نام و نشاں اِن کا مٹانے کو اُٹھی ہوں

ہے ایکتا کے دم ہی سے قوموں کی ترقّی
یہ بھولا سبق یاد دِلانے کو اُٹھی ہوں

مَیں آج ہر اک ظالم و جابر کی جبیں کو
مظلوموں کے قدموں پہ جھکانے کو اُٹھی ہوں

دو ساتھ مرا، گر تمھیں احساسِ وفا ہے
مَیں ظُلم کی بُنیاد ہلانے کو اُٹھی ہوں

مَیں جیتوں گی تو آپ بھی جیتیں گے مرے ساتھ
سچائی کے پرچم کو اُڑانے کو اُٹھی ہوں

ہے مختصر الفاظ میں بس یہ مرا پیغام
اِنساں کو مَیں اِنسان بنانے کو اُٹھی ہوں

پروا نہیں ساحر جو مری جان بھی جائے
مَیں نعرۂ حق آج لگانے کو اُٹھی ہوں

تصنیف :- ٹیگور

ترجمہ جناب محمد حمید عثمانی

ڈاک گھر

بنگلہ ڈراما

مادھو دت :- بڑی مشکل آپڑی ہے۔ یہ جب تک میرے یہاں نہیں آیا تھا۔ کوئی فکر ہی نہیں تھی۔ لیکن جب کہیں نہ کہیں سے آہی گیا تو اب اُس کے چلے جانے سے میرا گھر گھر نہ رہ جائے گا۔ کوی راج جی! آپ کی کیا رائے ہے اس کے بارے میں؟

کوی راج :- اگر بڑی عمر لے کر آیا ہے تو کافی عرصہ زندہ بھی رہ سکتا ہے۔ مگر آیور وید میں جس طرح لکھا ہے اُس کے مُطابق تو ــــ

مادھو دت :- کیا مطلب؟

کوی راج :- شاستروں میں لکھا ہے کہ صفرا (پت) بخار اور بلغم تینوں کی ایک ساتھ خرابی ہو تو۔

مادھو دت :- بس بس! آپ بار بار اشلوک نہ پڑھیے، اِس سے یہ ڈر اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ صرف یہ فرمائیے کہ ایسے میں کیا کرنا چاہیے۔

کوی راج :- (نسوار لیتے ہوئے) بہت احتیاط برتنی ہوگی۔

مادھو صاحب :- یہ تو آپ نے بالکل درست فرمایا۔ لیکن کن چیزوں سے احتیاط کرنی ہوگی۔ یہ بات بھی صاف فرما دیجئے۔

کوی راج :- میں تو پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ اسے باہر جانے کی اجازت بالکل نہ دیجئے۔

مادھو صاحب :- ابھی بچہ ہے۔ اِسے دِن رات کمرے میں روکے رہنا بہت مشکل ہوگا۔

کوی راج :- اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ جاڑے کی ہوا اور دُھوپ دونوں اس بچے کے لیے زہر ہیں۔ شاستروں میں لکھا ہے۔ مرگی، بخار، کھانسی، یرقان (کنول) وغیرہ

مادھو دت :- رہنے دیجئے۔ رہنے دیجئے اپنا سب شاستر وا ستر۔ ٹھیک ہے۔ کمرے میں بند رکھنا ہے تو یہی سہی۔ کیا اور کوئی صورت نہیں؟

کوی راج :- نہیں کوئی نہیں۔ کیونکہ ہوا اور دھوپ دونوں سے اندیشہ ہے۔

مادھو دت :- یہ تو بتائیے! آپ کے اِن اندیشوں کی وجہ سے مجھ پر کیا گزرے گی؟ خیر اسے چھوڑیئے۔ مگر آپ کا علاج بے حد سخت ہے۔ بیماری کی تمام تکلیفیں یہ بیچارا چُپ چاپ برداشت کر لیتا ہے مگر۔ لیکن آپ کی دوا کھاتے وقت اِسے جو تکلیف ہوتی ہے اُسے دیکھ کر کلیجا منہ کو آتا ہے۔

کوی راج :- یہ تکلیف جتنی سخت ہے اِس کا پھل بھی اتنا بڑا

ہے۔ اِسی سے تو ہمارے رِشی چون نے کہا ہے، میٹھی بات کا اور کڑوی دوا کا اثر بہت اچھا ہوا کرتا ہے۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔ (اسٹیج سے چلے جاتے ہیں)

(ٹھاکر دا داخل ہوتے ہیں)

مادھو دت :۔ یہ لیجئے ٹھاکر دا آ رہے ہیں اب بیڑا غرق ہوا۔

ٹھاکر دا :۔ کیوں تم مجھ سے اتنا ڈرتے کیوں ہو۔

مادھو دت :۔ لڑکوں کا دماغ خراب کرنے میں تم ماہر جو ہو۔

ٹھاکر دا :۔ تم خود بچے نہیں رہے اور تمھارے گھر میں کوئی بچہ نہیں، تمھیں کس بات کی فکر ہے؟

مادھو دت :۔ گھر میں ایک بچہ لے تو آیا ہوں۔

ٹھاکر دا :۔ وہ کیسے؟

مادھو دت :۔ میری بیوی کسی بچے کو گود لینے کے لیے پاگل ہو رہی تھی۔

ٹھاکر دا :۔ وہ تو میں بہت دن سے سن رہا تھا، مگر تم تو اِس بات پر راضی نہیں ہو رہے تھے۔

مادھو دت :۔ جانتے تو ہو بھیا، بڑی مصیبتوں سے پیسہ جمع کیا ہے۔ دوسرے کی اولاد کہیں سے آ کر میری محنت کی کمائی اڑا دے یہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ لیکن اِس بچے سے مجھے لگاؤ ہو گیا ہے۔

ٹھاکر دا :۔ اِسی سے تو اُس کے اُوپر اتنا روپیہ خرچ کر رہے ہو اور اسے بہترین مصرف سمجھ رہے ہو۔

مادھو دت :۔ پہلے دولت جمع کرنا ایک طرح کا نشہ تھا۔ میں روپیہ جمع کیے بغیر رہ نہیں سکتا تھا اور اب یہ سوچ کر جو دھن دولت جمع کر رہا ہوں وہ اِس لڑکے کو ملے گی۔ مجھے روزگار میں ایک طرح مزا ملنے لگا ہے۔

ٹھاکر دا :۔ بہت خوب، بہت خوب، یہ تو بتاؤ لڑکا کہاں سے پا گئے؟

مادھو دت :۔ یہ میری بیوی کا گاؤں کے رشتے سے بھتیجا لگتا ہے۔ بچپن ہی میں بچارے کی ماں مر گئی تھی اور پھر اُسی دن اُس کا باپ بھی چل بسا۔

ٹھاکر دا :۔ اچھا تب تو میں اُس سے ضرور ملوں گا۔

مادھو دت :۔ کوی راج جی کہہ رہے تھے کہ اتنی سی جان اُس پر صفرا (پت) اور بلغم وغیرہ سب کی خرابی پیدا ہو جانے کی وجہ سے اُس کے بچنے کی زیادہ امید نہیں اِس کا بس ایک علاج ہے کہ اُسے جاڑے کی ہوا اور دھوپ سے بچا کر بند کمرے میں رکھا جائے۔ بچوں کو گھروں سے باہر نکالنا تمہارا اِس بڑھاپے کا شوق ہے اِسی لئے تم سے ڈرتا ہوں۔

ٹھاکر دا :۔ فضول باتیں نہ کرو۔ میں بھی جاڑوں کی ہوا اور دھوپ کی طرح خطرناک ہو گیا ہوں؟ مگر میں گھر کے اندر کھیلے جانے والے کھیل بھی جانتا ہوں۔ اپنا کام کاج نپٹا آؤں تو اِس بچے سے دوستی کر لوں۔

(امل گپتا داخل ہوتا ہے)

مادھو دت :۔ کیا ہے امل؟

امل :۔ میں کیا آنگن تک بھی نہیں جا سکتا؟

مادھو دت :۔ نہیں بیٹے۔

امل :۔ وہاں، جہاں پھوپھی دال دل رہی ہیں۔ وہ دیکھئے جہاں گلہری اپنی دُم پر سارا بوجھ ڈالے دونوں ہاتھوں میں دال کی ٹکی لے کر کٹر کٹر کر کے کھا رہی ہے۔ کیا

وہاں بھی نہ جا سکوں گا؟

مادھوری:- "نہیں میرے لال۔"

امل:- میں گلہری ہوتا تو بہت اچھا ہوتا۔ مگر پھوپھا جان! مجھے باہر کیوں نہ جانے دیجئے گا؟

مادھوری:- کوی راج نے کہا ہے باہر جانے سے تم اور بیمار ہو جاؤ گے۔

امل:- کوی راج کو یہ کیسے معلوم ہو گیا۔

مادھوری:- کیسی باتیں کرتے ہو امل، بھلا کوی راج جی کو بھی نہ معلوم ہوگا؟ انھوں نے کتنی موٹی موٹی کتابیں پڑھ ڈالی ہیں۔

امل:- کتابیں پڑھ کر ہی کیا سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے؟

مادھوری:- ارے تم اتنا بھی نہیں جانتے؟

امل:- (گہری سانس لے کر) میں نے کوئی کتاب پڑھی ہی نہیں اس لیے کچھ نہیں جانتا۔

مادھوری:- بڑے بڑے پنڈت تمھاری ہی طرح ہوتے ہیں۔ وہ بھی اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلتے۔

امل:- باہر نہیں نکلتے؟

مادھوری:- بولو، کس وقت باہر نکلیں؟ وہ لوگ دن رات بیٹھے کتابیں پڑھا کرتے ہیں اور انھیں کسی طرف دیکھنے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ بیٹا امل تم بھی بڑے ہو کر پنڈت ہی بننا بیٹھ کر بڑی بڑی کتابیں پڑھنا۔ سب دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔

امل:- نہیں نہیں پھوپھا جان، آپ کے پیروں پڑوں، میں پنڈت نہیں بنوں گا۔

مادھوری:- تم کیسی باتیں کرتے ہو

امل:- میں تو سوچتا ہوں اگر میں پنڈت ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

امل:- ہماری کھڑکی سے جو پہاڑ نظر آتا ہے میرا جی چاہتا ہے اس پہاڑ کے پار چلا جاؤں۔

مادھوری:- کیا پاگلوں جیسی بات کرتے ہو، کام کاج کچھ نہیں خواہ مخواہ کا خیال: "اس پہاڑ کے پار جاؤں گا۔" سوچنے کی بات ہے جب پہاڑ ایک چار دیواری کی طرح اوپر کی جانب اونچے ہوتے چلے گئے ہیں تو ان کے اس پار جانا بھی منع ہوگا۔ ایسا نہ ہوتا تو اتنے بڑے بڑے پتھر اکٹھا کرنے کا جھنجھٹ کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی؟

امل:- آپ کا خیال ہے کہ وہ منع کرتا ہے۔ مگر مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ زمین باتیں نہیں کر سکتی۔ اس لیے نیلے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر بلا رہی ہے۔ بہت دور رہنے والے لوگ گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں وہ بھی دوپہر کے وقت کھڑکی کے پاس اکیلے بیٹھے ہوئے یہ پکار سن سکتے ہیں۔ میرے خیال میں پنڈت لوگ نہیں سن پاتے۔

مادھوری:- وہ تمھاری طرح نہ تو پاگل ہیں نہ یہ سب سننا ہی چاہتے ہیں۔

امل:- کل میں نے اپنی طرح کا ایک پاگل آدمی دیکھا تھا۔

مادھوری:- سچ مچ! بتاؤ تو وہ کیسا تھا؟

امل:- اس کے کندھے پر بانس کا ایک لٹھ تھا، لٹھ کے سرے پر ایک پوٹلی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک لوٹا تھا۔ وہ پرانا سا ناگرا جوتا پہنے اسی میدان کے راستے اس پہاڑ کی جانب جا رہا تھا۔ میں نے اسے بلا کر پوچھا "تم کہاں جا رہے ہو"؟ اس نے کہا۔

"یونہی چل پڑا ہوں، کہیں بھی نکل جاؤں گا۔" میں نے پھر پوچھا۔ "کیوں جا رہے ہو؟" اُس نے بتایا۔ "کام ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔" بتائیے پھوپھا جان! کام کیا ڈھونڈنا پڑتا ہے؟

ماد صورت :۔ پھر کیا ڈھونڈنا نہیں پڑتا تو؟ نہ جانے کتنے لوگ کام کی تلاش میں نکلتے ہیں۔

اصل :۔ اچھا میں بھی اِن لوگوں کی طرح کام کی تلاش میں نکلوں گا۔

ماد صورت :۔ اور اگر کام ڈھونڈنے سے نہ ملا تو؟

اصل :۔ ڈھونڈنے سے نہ ملا تو اَور ڈھونڈوں گا۔ ہاں تو وہ آدمی جو ناگرا جوتا پہنے تھا، چلا گیا۔ میں دروازے کے قریب کھڑا دیکھتا رہا۔ اُس جگہ جہاں گولر کے درخت کے نیچے جھرنا بہتا ہے وہاں اُس نے لٹھ رکھ کر جھرنے کے پانی یا دھیرے دھیرے اپنے پَیر دھوئے پھر پوٹلی کھول کر اُس نے ستّو نکالے اَور پانی میں گھول کر کھانے لگا۔ کھانے کے بعد اُس نے پھر پوٹلی باندھ کر پیٹھ پر ڈال لی اَور پتھروں پر سے کپڑے چڑھا کر جھرنے کے پانی میں اُترا اَور پانی کاٹتا ہوا مزے سے پار نکلا چلا گیا۔ میں نے پھوپھی جان سے کہہ رکھا ہے اِس جھرنے کے کنارے جا کر میں بھی ایک دن ستّو کھاؤں گا۔

ماد صورت :۔ پھوپھی جان نے کیا جواب دیا؟

اصل :۔ پھوپھی جان نے کہا کہ تم اچھے ہو جاؤ پھر تمھیں اِس جھرنے کے پاس لے جاؤں گی اور وہاں ستّو کھلاؤں گی۔ میں کب اچھا ہوں گا؟

ماد صورت :۔ اب زیادہ دیر نہیں بیٹے!

اصل :۔ دیر نہیں!! لیکن میں اچھا ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔

ماد صورت :۔ کہاں جاؤ گے؟

اصل :۔ بہت سے لہرا کر بہتے ہوئے جھرنوں میں پیر ڈبوتا انھیں پار کرتا نکل جاؤں گا۔ دوپہر کو جب سب لوگ کمروں میں دروازے بند کیے لیٹے رہتے ہیں، اُس وقت میں نہ جانے کہاں سے کہاں بہت دور کام کی تلاش میں چلتے چلتے پہنچ جاؤں گا۔

ماد صورت :۔ اچھا پہلے ٹھیک تو ہو جاؤ۔

اصل :۔ مگر پھر مجھے پنڈت بننے کے لیے نہ کہیے گا پھوپھا جان!

ماد صورت :۔ تم کیا بننا چاہتے ہو اصل؟

اصل :۔ ابھی مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا ہے۔ اچھا میں پھر سوچ کر بتاؤں گا۔

ماد صورت :۔ لیکن تم اِس طرح انجانے بدیسی بدیسی لوگوں کو بُلا بُلا کر اُن سے باتیں نہ کیا کرو۔

اصل :۔ مگر مجھے یہ بدیسی لوگ بہت اچھے لگتے ہیں۔

ماد صورت :۔ یہ اگر تمہیں پکڑ لے جائیں تو؟

اصل :۔ ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔ لیکن مجھے تو کوئی پکڑ کر بھی نہیں لے جاتا۔ سب مجھے بس بٹھائے رکھتے ہیں۔

ماد صورت :۔ اچھا اب میں جا رہا ہوں مجھے بہت کام ہیں لیکن بیٹے یاد رکھنا باہر نہ نکل جانا۔

اصل :۔ کہیں نہ جاؤں گا۔ مگر راستے کے کنارے اِس کمرے میں بیٹھا رہوں گا۔

(باقی اگلے پرچے میں)

ڈرامہ نمبر ۲ آپ نے بہت پسند کیا

اور اب؟

انتظار کیجیے . . . . . .

کہانی نمبر ۳ کا

یہ ڈرامہ نمبر ۲ سے بھی زیادہ دلچسپ ہوگا۔

تمنا مظفر پوری

بنانؔ طفیلی

دنیا کے بہت سے ظریف یا مسخرے لوگوں کی کہانیاں آپ سن چکے ہیں کبھی ہندوستان کے مشہور حاضر جواب بیربل کے لطیفے تو کبھی ترکی مُلّا نصیرالدین کے دل چسپ چٹکلے۔

عرب کے ملکوں میں بھی ایک ظریف آدمی اپنی دل چسپ باتوں کی وجہ سے مشہور ہے اس کا نام ہے "بنان طفیلی" بنان طفیلی اپنے کھانے پینے کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوا۔ وہ بہت پیٹو تھا۔ اور ہر وقت کھانے پینے ہی کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ کسی قسم کی محفل ہو وہ باتوں باتوں میں کھانے پینے کا ذکر اس طرح نکال لیتا کہ لوگ حیران رہ جاتے۔ بنان طفیلی کے اس کھانے پینے کی عادت کی وجہ سے آج بھی ہندوستان میں بن بلائے مہمانوں کو طفیلیا یا طفیلی کہتے ہیں۔

آج اسی مسخرے بنان طفیلی کے چند لطیفے سنیے۔

ایک مرتبہ ایک امیر نے بنان طفیلی کی دعوت کی۔ جب غلام نے خشک حلوے کے بڑے بڑے ٹکڑوں کا خوان سامنے رکھا تو امیر نے ایک ٹکڑا اٹھا کر طفیلی کو دیا۔ حلوے کا ٹکڑا لیتے ہوئے طفیلی نے قرآن شریف کی ایک آیت پڑھی۔

"تحقیق تمھارا خدا ایک ہے۔"

امیر نے دو ٹکڑے اور دیئے تو طفیلی نے کہا

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔"

"ہم نے ان کی طرف دو پیغمبر بھیجے۔"

امیر نے تین ٹکڑے اور دیے تو اس نے کہا۔

"پھر ہم نے تین سے عزت بڑھائی۔"

امیر نے چار ٹکڑے اور دیے تو اس نے کہا

"چار پرندے لے لو۔"

امیر نے پانچ ٹکڑے حلوے کے اور دیے تو طفیلی نے کہا۔

"وہ کہتے ہیں کہ پانچ ہیں۔"

امیر نے چھ ٹکڑے دیے تو اس نے کہا۔

"خدا نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کیا۔"

امیر نے سات ٹکڑے دیے تو اس نے کہا۔

"ہم نے تم پر سات آسمان بنائے۔"

امیر نے آٹھ ٹکڑے دیے تو اس نے کہا۔

"مدینے میں نو گروہ تھے۔"

دس ٹکڑے ملے تو اس نے کہا۔

"یہ ہے اس کی پوری تعداد۔"

امیر نے گیارہ ٹکڑے دیے تو طفیلی نے عرض کیا۔

"خدا کے نزدیک مہینوں کی تعداد گیارہ ہے۔"

امیر نے جھلا کر پورا خوان طفیلی کے سامنے رکھ دیا طفیلی نے آخر میں یہ آیت پڑھی۔

"ہم نے اسے ایک لاکھ یا اس سے زیادہ کی طرف کھینچا"

اس طرح طفیلی نے قرآن شریف کی آیتوں سے امیر کو لاجواب کر دیا۔

ایک مرتبہ طفیلی سے کسی نے پوچھا بتاؤ تمھیں قرآن شریف کی کون سی آیت زیادہ پیاری معلوم ہوتی ہے۔ اس نے جواب دیا۔

میری پیاری آیت ہے مَا لَکُمْ لَا تَاکُلُوْنَ "تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم کھاتے نہیں۔"

پھر لوگوں نے پوچھا تم کون سی آیت پر زیادہ عمل کرتے ہو۔ تو اس نے کہا۔

کُلُوْا وَ اشْرَبُوْا "کھاؤ اور پیو"

پھر لوگوں نے پوچھا۔ بتاؤ طفیلی تم کون سی دعا پڑھتے ہو۔ اس نے کہا۔

"رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَائِدَۃً مِّنَ السَّمَاءِ اے خدا ہم پر آسمان سے کھانا نازل فرما۔"

ایک مرتبہ بنان طفیلی کہیں جا رہا تھا۔ راستے میں اسے زوروں کی بھوک لگی۔ اتفاق سے نزدیک کے ایک گاؤں میں اس کا ایک ملاقاتی گویا رہتا تھا وہ اس کے ہاں چلا گیا۔ گویے نے اسے بہت دیر تک بٹھائے رکھا اور کھانے کے واسطے کچھ نہ پوچھا ادھر طفیلی کو بھوک کی شدت نے بے چین کر ڈالا اور اس طرف گویے نے رباب اٹھایا اور طفیلی سے پوچھا۔

"تمھیں کون سی لے پسند ہے؟"

طفیلی نے کہا: "مجھے اس وقت ہنڈیا کے پکنے کی آواز پسند ہے۔"

ایک مرتبہ بنان طفیلی بھوکا پیاسا ایک دور دراز قصبے میں پہنچا۔ ایک جگہ پر بہت سے لوگ جمع تھے اور کچھ لوگ رو پیٹ رہے تھے۔ طفیلی نے پوچھا تو پتہ چلا کہ کوئی مر گیا ہے۔ طفیلی نے کہا۔

"اگر آپ لوگ مجھے کھانا کھلا دیں تو میں اسے زندہ کر دوں گا۔"

لوگوں نے طفیلی کو خوب جی بھر کے کھانا کھلایا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد طفیلی نے پوچھا۔

"مرنے والا کیا کرتا تھا؟"

لوگوں نے کہا پٹواری تھا۔

طفیلی فوراً بھڑک اٹھا اور لوگوں کو سخت سست کہنے لگا۔ ساتھ ہی کھانا کھاتے میں افسوس کرنے لگا۔ لوگوں نے طفیلی کے اس رویّے کو دیکھ کر پوچھا۔ آخر کیا بات ہوئی۔ جو آپ اس قدر برہم ہیں۔

طفیلی نے کہا۔ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ مرنے والا پٹواری ہے۔ اگر کوئی اور ہوتا تو میں فوراً اسے زندہ کر دیتا۔ لیکن یہ تو پٹواری ہے اور پٹواری صرف اک بار مرتا ہے، اسے کوئی زندہ نہیں کر سکتا۔" اور وہاں سے چل دیا۔

بنان طفیلی کی عادت تھی کہ کہیں بھی دعوت ہو رہی ہو وہ ضرور پہنچ جاتا۔ شادی بیاہ میں براتیوں میں شامل ہو جاتا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بڑا دلچسپ اس کے ساتھ پیش آیا۔ جس نے اسے بڑی پریشانی میں ڈال دیا تھا۔

عباسی خلافت کے زمانے میں بہت سے بناوٹی نبی پیدا ہونے لگے تھے۔ خلیفہ وہ ایک کو روز ہی پھانسی دلوا دیا کرتے۔ ایک روز صاف ستھرے لباس میں کچھ لوگ ایک طرف جاتے ہوئے نظر آئے۔ طفیلی سمجھا کہ یہ لوگ کہیں دعوت میں جا رہے ہیں۔ ساتھ میں سپاہیوں کو دیکھا تو سمجھا کہ یہ بڑے اور معزز لوگ ہیں اور ضرور کسی بڑی جگہ جا رہے ہیں۔ جھٹ وہ بھی ان میں چپکے سے شامل ہو گیا۔

جب خلیفہ کے دربار میں سب لوگ پہنچے تو ان سبھوں کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ طفیلی سخت پریشان ہوا کہ وہ اس بلا میں خود بخود آن پھنسا ہے۔ لہٰذا اب بچ نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس نے بڑھ کر خلیفہ کی خدمت میں عرض کی۔

"امیر المومنین میں بنان طفیلی ہوں۔ میں ان لوگوں میں دعوت کے لالچ میں شامل ہو گیا تھا۔ میری عادت سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ مجھے کھانے پینے کی فکر سے فرصت کہاں کہ میں نبی بننے کے جھمیلے میں پڑ دوں۔"

خلیفہ اسے جانتے تھے۔ پھر سپاہیوں نے دس آدمیوں کو گرفتار کیا تھا۔ طفیلی کا نمبر گیارھواں تھا لہٰذا خلیفہ نے اسے چھوڑ دیا۔ اس طرح بنان طفیلی کی جان بچی ورنہ دعوت کھانے کے لالچ میں بے چارے کو جان سے ہاتھ دھونا پڑتے۔

ڈراما

جناب شاکر حسن
چاند
موریا۔ دربھنگہ

ایک پونڈ گوشت



(شکسپیر کے ایک ڈرامے "مرچنٹ آف وینس" سے اپنایا گیا)

کام کرنے والے

ڈیوک :۔ جج
انٹونیو:۔ وینس کا سوداگر
بے سینیو:۔ انٹونیو کا دوست
گریشیانو:۔ بے سینیو کا نوکر
شائیلوک :۔ یہودی
پورشیا:۔ عورت وکیل مرد کے بھیس میں

(۱)

(وینس کی عدالت کا منظر۔ انٹونیو، بے سینیو اور گریشیانو داخل ہوتے ہیں)

ڈیوک :۔ اچھا، تو کیا انٹونیو عدالت میں حاضر ہے؟

انٹونیو:۔ جی ہاں! میں مقدمے کی کارروائی شروع ہونے کا منتظر ہوں۔

ڈیوک :۔ تمہارے معاملے میں مجھے گہرا دکھ ہے۔ یہاں تمہیں ایک ظالم شخص سے مقابلہ کرنا ہے۔ اس میں نہ تو انسانی جذبہ ہے اور نہ رحم۔

انٹونیو:۔ میں نے سنا ہے حضور نے اس کے سخت دل کو نرم بنانے کے لیے بڑی کوشش کی ہے۔ لیکن وہ اپنی بات پر اٹل ہے۔ اس لیے میں سب کچھ برداشت کرنے کو خوشی سے تیار ہوں۔

ڈیوک :۔ جاؤ اور یہودی کو عدالت میں پیش کرو۔

(شائیلوک داخل ہوتا ہے)

ڈیوک :۔ جگہ دو اور اسے ہمارے سامنے کھڑا ہونے دو۔ شائیلوک! سارا جہان یقین رکھتا ہے اور میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ تم انٹونیو سے اپنی نفرت کو بہت بڑھاوا دے رہے ہو۔ ہر شخص کو امید ہے کہ آخری وقت میں تم رحم دلی دکھاؤ گے۔ مجھے یقین ہے کہ سزا کے طور پر انٹونیو کے ایک پونڈ گوشت کا جو تمہارا دعوے ہے؟ اسے تم چھوڑ دو گے۔ اسے تجارت میں جو نقصان ہوا ہے۔ اس کی بنا پر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم اس پر رحم کرو گے۔ یہاں تک کہ قرض کا کچھ حصہ معاف بھی کر دو گے۔

شائیلوک :۔ حضور کو میں نے پہلے ہی بتا دیا ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ دستاویز کے مطابق مجھے جو ملے گا وہی لوں گا۔ اگر آپ مجھ سے یہ پوچھیں کہ میں تین ہزار ڈیوکیٹ (ایک سکہ) کے بدلے انسانی گوشت کیوں پسند کرتا ہوں تو میں یہی جواب دوں گا کہ انٹونیو سے مجھے سخت نفرت ہے اور اسی وجہ سے میں دستاویز پر زور دے رہا ہوں۔

بے سینیو:۔ ظالم کہیں کا! اپنی بے رحمی کو چھپانے کے لیے کوئی جواب نہیں ہے۔

شائیلوک:۔ اپنے جواب سے میں
آپ کو خوش کرنے کے لیے
مجبور نہیں ہوں۔
بے سینیو:۔ کیا لوگ اُن چیزوں کو
ختم کر دیتے ہیں جو اُن کو پیاری
نہیں ہوتیں۔
انٹونیو:۔ میں تم سے اِلتجا کرتا ہوں،
اُس یہودی سے بحث مت کرو۔
اِس سے بہتر ہے کہ تم سمندر کے
کنارے جا کر کھڑے ہو جاؤ اور
سمندر کو حکم دو کہ وہ اپنی لہریں
کم کرے۔ اِس سے یہ بہتر ہے کہ
تم بھیڑیوں سے پوچھو کہ وہ
میمنے کو کیوں مارتا ہے۔ یہ اِس
سے بہتر ہے کہ تم درختوں سے
کہو کہ وہ اپنی شاخوں کو نہ
ہلائیں اور شور نہ کریں۔ تم
اِس یہودی کے دل کو ہرگز نرم
نہیں بنا سکتے۔ اِس لیے میں
تم سے اِلتجا کرتا ہوں کہ اور
زیادہ اِلتجا نہ کرو۔ مجھے نتیجے
کا پھل برداشت کرنے دو اور
یہودی کو بقایا لے لینے دو۔
بے سینیو:۔ تمہارے تین ہزار ڈوکیٹ
کے بدلے یہ لو چھ ہزار۔
شائیلوک:۔ اگر تم مجھے اِس کا چھ گنا
بھی دو تو میں اِسے نہیں لوں گا۔
میں اپنے شرط نامے کے مطابق
ہی لوں گا۔
ڈیوک:۔ اگر تم کسی پر رحم نہیں کرتے
تو خدا سے رحم کی اُمید کیسے
کر سکتے ہو؟
شائیلوک:۔ میں نے کوئی گناہ نہیں
کیا۔ پھر خدا سے کیوں ڈروں؟
آپ کے اپنے نوکر ہیں کیا میں
آپ سے کہوں "اُنھیں آزاد
کر دیجیے۔" آپ جواب دیں گے
"نوکر میرے ہیں"۔ میں بھی آپ
کو اِسی طرح کا جواب دوں گا
ایک پونڈ گوشت میرا ہے اور
میں اُسے لوں گا۔ اگر آپ اِسے
دلانے سے انکار کریں گے تو
آپ قانون کو پیچھے ڈال رہے
ہیں۔ میں فیصلہ چاہتا ہوں
بولیے کیا مجھے یہ مِل سکتا ہے۔
ڈیوک:۔ جب تک کہ ایک قابل وکیل
نہ پہنچ جائے اُس وقت تک
کے لیے عدالت کی کارروائی
بند رکھنے کا مجھے حق ہے۔ اِس
مقدمے پر بحث کرنے کے لیے
میں نے اُنھیں مدعو کیا ہے۔
بے سینیو:۔ انٹونیو! خوش ہو جاؤ،
ہمت بلند رکھو۔ تمہارے خون
کا ایک قطرہ برباد ہونے سے
پہلے میں اپنے جسم کا گوشت،
خون، ہڈیاں اور سب کچھ
اِس یہودی کو دے دوں گا۔
(عدالت برخاست ہوتی ہے۔ پردہ
گرتا ہے)

(۲)

(عدالت کا منظر۔ وکیل کے بھیس میں
پورشیا داخل ہوتی ہے)
ڈیوک:۔ خوش آمدید! اپنی جگہ
لیجیے۔ کیا آپ اِس مقدمے کے
بارے میں جانتے ہیں؟
پورشیا:۔ میں سب کچھ جانتا ہوں یہاں
کون سوداگر ہے اور کون یہودی؟
ڈیوک:۔ انٹونیو اور شائیلوک
سامنے کھڑے ہو جاؤ۔
پورشیا:۔ کیا تمہارا نام شائیلوک
ہے؟
شائیلوک:۔ جی میرا ہی نام
شائیلوک ہے!
پورشیا:۔ تمہارا معاملہ عجب قسم کا ہے۔
پھر بھی وینس کے قانون میں
ایسا کچھ نہیں جو تمہیں اسے
پیش کرنے سے روکے۔ تم
سوداگر ہو نا؟
انٹونیو:۔ جی ہاں!
پورشیا:۔ کیا تم شرط نامے کو قبول
کرتے ہو؟

انٹونیو:- ہاں کرتا ہوں۔

پورشیا:- تب تو یہودی کو ضرور ہی رحم دل ہونا چاہیئے۔

شائیلوک:- کیا یہ ضروری ہے۔ مجھے رحم دلی دکھانے کے لیے کون مجبور کرسکتا ہے؟

پورشیا:- رحم زبردستی سے نہیں ہوتا۔ یہ تو قدرتی طور پر ہوتا ہے۔ ہم سبھوں کو ایک دوسرے پر رحم کرنا چاہیئے۔

شائیلوک:- رحم سے مجھے کوئی مطلب نہیں۔ میں انصاف مانگتا ہوں۔

پورشیا:- لیکن انصاف کو ہمیشہ رحم سے نرم بنانا چاہیئے۔

شائیلوک:- مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ میں وہی لوں گا جو شرط نامے سے مجھے ملتا ہے۔

پورشیا:- کیا وہ روپیہ چکا دینے کے قابل نہیں؟

بے سینیو:- جی ہاں، یہاں عدالت میں اسے دیتا ہوں۔ اس کا دس گنا دینے کو تیار ہوں۔

شائیلوک:- میں اسے کبھی نہیں لوں گا۔

پورشیا:- مجھے دستاویز دیکھنے دیجیے۔

شائیلوک:- یہ رہی دستاویز۔

پورشیا:- تمہارے روپیوں کا دس گنا تمہیں دیا جا رہا ہے۔

شائیلوک:- قسم ہے! قسم ہے!! میں نے قسم کھائی ہے کہ سزا کے علاوہ کچھ نہیں لوں گا۔

پورشیا:- شائیلوک! رحم دل بنو۔ اپنے پیسے کا دس گنا لو اور دستاویز کو پھاڑ ڈالنے دو۔

شائیلوک:- میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ دنیا میں ایسی کوئی طاقت نہیں جو میرے ارادے کو بدل دے۔

انٹونیو:- میں بالکل سچے دل سے عدالت سے فیصلہ سنانے کی التجا کرتا ہوں۔

پورشیا:- اچھا تو یہ فیصلہ ہے کہ اس کی چھری کے لیے تم اپنا سینہ تیار رکھو۔

شائیلوک:- واہ قابل جج۔ واہ! اچھے نوجوان۔

پورشیا:- انٹونیو! اپنا سینہ کھولو۔

شائیلوک:- واہ! اس کا سینہ۔ دستاویز بھی یہی کہتا ہے۔ ہے یا نہیں قابل جج؟

پورشیا:- ہاں! ایسا ہی ہے۔ کیا گوشت وزن کرنے کے لیے یہاں ترازو ہے؟

شائیلوک:- میرے پاس تیار ہے۔

پورشیا:- اس کے زخموں کو بند کرنے کے لیے تمہیں ایک ڈاکٹر رکھنا پڑے گا۔ ممکن ہے خون بہنے سے وہ مر جائے۔

شائیلوک:- کیا دستاویز میں اس کا ذکر ہے؟

پورشیا:- اس بات کا ذکر تو نہیں لیکن اس سے کیا؟ تم خیرات کے خیال سے ایسا کر سکتے ہو۔

شائیلوک:- میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ دستاویز میں تو ایسا کچھ نہیں۔

پورشیا:- تم سوداگر؟ کیا تمہیں کچھ کہنا ہے؟

انٹونیو:- مختصراً میں تیار ہوں۔ بے سینیو لاؤ اپنا ہاتھ مجھے دو۔ الوداع! یہ مت سوچنا کہ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ اپنی بیوی کو میرا سلام کہہ دینا۔

بے سینیو:- میری بیوی مجھے اتنی ہی پیاری ہے جتنی اپنی زندگی۔ لیکن تمہیں بچانے کے لیے میں خوشی خوشی اپنی زندگی، اپنی بیوی اور سارا جہان چھوڑ سکتا ہوں۔

پورشیا:- سوداگر کا ایک پونڈ گوشت تمہارا ہے۔ اور گوشت تمہیں اس کے سینے سے کاٹنا ہوگا۔

شائیلوک:- واہ! اچھے منصف! بہت
ہی عقل مند منصف۔ آؤ —
تیار ہو جاؤ۔

پورشیا:- ذرا ٹھہرو! کچھ دوسری بات
بھی ہے۔ یہ دستاویز تمہیں
خون کا ایک قطرہ بھی نہیں دیتا۔
"ایک پونڈ گوشت" دستاویز
میں یہی لفظ ہے۔ اب اپنا ایک
پونڈ لے لو۔ لیکن اس کے کاٹنے
میں تم خون کا ایک قطرہ بھی
نہیں بہا سکتے۔ اگر ایسا کیا تو
تمہیں اپنی ساری زمین اور
جائداد سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

شائیلوک:- کیا یہی قانون ہے؟

پورشیا:- ہاں!

گریشیانو:- واہ فاضل جج! دیکھو
یہودی کو!

شائیلوک:- میرے پیسے کا دس گنا
دے دیجئے اور انٹونیو کو چھوڑ
دیجئے۔

بے سینیو:- یہ ہے روپیہ۔

پورشیا:- ذرا ٹھہرو! جلدبازی نہیں
اسے سزا کے علاوہ اور کچھ نہیں
ملے گا۔

گریشیانو:- اے یہودی! واہ!
فاضل جج، عقل مند منصف۔

پورشیا:- گوشت کاٹنے کے لیے تیار
ہو جاؤ۔ نہ تو خون بہانا، نہ
ٹھیک ایک پونڈ گوشت سے
کم یا زیادہ کاٹنا۔ اگر ٹھیک
ایک پونڈ سے کم یا زیادہ
کاٹو گے، یہاں تک کہ بال
کے وزن کے برابر بھی تو تمہاری
موت ہو گی اور ساری جائداد
ضبط کر لی جائے گی۔

گریشیانو:- واہ اچھے منصف!

پورشیا:- یہودی! اب رکتا کیوں ہے؟

شائیلوک:- مجھے میری پونجی ہی دے
دیجئے اور جانے دیجئے۔

بے سینیو:- یہ لو، رقم تیار ہے۔

پورشیا:- کھلی کچہری میں اس نے
پیسے لینے سے انکار کیا ہے
اسے صرف انصاف ملے گا اور
دستاویز!

شائیلوک:- کیا مجھے میری پونجی
بھی نہیں ملے گی؟

پورشیا:- سزا کے علاوہ اور کچھ
نہیں مل سکتا۔

شائیلوک:- میں التجا کرتا ہوں
مجھے جانے دیا جائے۔ میری
طبیعت ٹھیک نہیں۔

ڈیوک:- انٹونیو آزاد ہے۔ میں
عدالت برخاست کرتا ہوں

(پردہ گرتا ہے)

ترانہ

نا محمد حسین خان محسن اجمیری
ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ بیسک اسکول

"کھیلیں کودیں قدم بڑھائیں مِل کر ہم سب سارے
ننھے مُنّے بچّے ہم سب دیش کی آنکھ کے تارے

پڑھنا لکھنا کام ہمارا خدمت کرنا کام ہمارا
روشن جگ میں نام ہمارا علم و ہُنر کے ہم شہ پارے
کھیلیں کودیں قدم بڑھائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہَے اسکول ہمارا نیارا یعنی علم کا ہے گہوارہ
ہم کو ہے یہ جان سے پیارا بَن جا ساتھی بھولے بھالے
کھیلیں کودیں قدم بڑھائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہم کو آپس میں اُلفت ہَے مِل جُل کر رہنا عادت ہَے
بھائی چارہ ہی فطرت ہَے گورے ہوں وہ یا ہوں کالے
کھیلیں کودیں قدم بڑھائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اونچا دیش کا نام کریں گے دیش پہ اپنی جان بھی دیں گے
امن و اماں کے حامی محسن ہم ہیں بہادر اور جیالے
کھیلیں کودیں قدم بڑھائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ماہنامہ علیم حیدرآباد

جانوروں اور پرندوں کی حیرت ناک رفتار

کیاآپ بتاسکتے ہیں دنیا میں سب سے زیادہ
وڑنے والا جانور کون سا ہے؟ چیتا! ہرن؟
ڑا؟ جی نہیں! جی نہیں!! یہ اعزاز ایک ننھی
مکھی ابوٹ مکھی (BOT FLY) کو حاصل ہے
ے گھوڑوں کی بیماری پھیلتی ہے۔ یہ مکھی
ے ٹیسنی کہتے ہیں افریقہ میں پائی جاتی ہے، اور
قدر تیزی سے اڑتی ہے کہ ہمارے تیز رفتار
بٹ ہوائی جہاز بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ آپ
یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یہ مکھی (۸۱۸) میل فی گھنٹہ
رفتار سے اڑتی ہے۔ یعنی آواز کی رفتار سے
ی تیز۔ اور ہماری دنیا کے اردگرد چکر لگانے کے لیے
ے صرف ۷۱ گھنٹے چاہییں۔ بوٹ فلائی جب اڑتی
ہے تو خاص قسم کی بھنبھناہٹ ہوتی ہے اگر یہ آہستہ
ہستہ اڑے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک دھندسی
ری نظروں کے آگے سے گزر گئی۔

برخلاف اس کے گھونگھا انتہائی سست رفتار
تا ہے۔ مسلسل سائنسی تجربوں کے بعد حساب لگایا
ا ہے کہ گھونگھا گھنٹہ بھر میں ۲۵ انچ سے زیادہ
ملہ طے نہیں کرسکتا۔ انتہائی تیز اور انتہائی سست
ری کی ان دو مثالوں کو چھوڑ کر دوسرے
زروں اور پرندوں کی رفتار میں کوئی غیر معمولی
فرق نہیں پایا جاتا۔

گھوڑ دوڑ میں دوڑنے والے گھوڑوں، گرے ہاؤنڈ اور پیغام رسانی کے لیے استعمال کیے جانے والے کبوتروں کے علاوہ دوسرے جانوروں کی ٹھیک ٹھیک رفتار کے بارے میں عام طور سے لاعلمی پائی جاتی ہے موٹر کار اور ہوائی جہازوں نے اب جانوروں کی رفتار کی حقیقی جانچ کا کام نسبتاً آسان بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہمیں کافی معلومات حاصل ہیں۔

یہ تو آپ جانتے ہیں چیتا ہندوستان اور افریقہ میں پایا جاتا ہے۔ شوقین لوگ اسے شکار کے لیے بھی سدھاتے ہیں۔ یہ خونخوار جانور وقت پڑنے پر کہیں رُکے بغیر ایک میل فی منٹ کی رفتار سے دوڑتا ہے یہی چیتے کی انتہائی رفتار ہوتی ہے۔ گرے ہاؤنڈ دوڑ میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور ہرن جو دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا ہے اکثر چیتے کا ترنوالہ بن جاتا ہے۔ لیکن چیتا زیادہ دیر تک اپنی اس رفتار کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ شروع میں بلاشبہ اس کی رفتار بہت زیادہ تیز یعنی ستر میل فی گھنٹہ ہوتی ہے لیکن صرف دو سکنڈ کے اندر اندر یہ رفتار گھٹ کر ۴۵ میل فی گھنٹہ ہو جاتی ہے۔

چھریرے جسم والا سانبھر جسے آپ نے اکثر چڑیا گھر

ب دیکھا ہوگا۔ ایک گھنٹہ میں بہ آسانی تیس میل فاصلہ طے کرسکتا ہے انٹیلوپ قسم کا ایک جانور "امپالا" جو صرف افریقہ میں پایا جاتا ہے دم لیے بغیر فی گھنٹہ چالیس میل کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے پھر بھی چیتا ان دونوں کو بہ آسانی شکار کر لیتا ہے۔ گرے ہاونڈ بڑی بھیانک شکل اور لٹکے ہوئے جبڑوں والا کتا ہے جو ۳۷ تا ۴۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا ہے۔

یہ بات واقعی حیرت انگیز ہے کہ ڈر اور خوف کی حالت میں اور بالعموم جب ان کا پیچھا کیا جائے تو تمام جانور انتہائی تیز رفتار کے ساتھ دوڑتے ہیں۔ آپ جانیں جان کسے پیاری نہیں ہوتی۔ ایک مرتبہ ایک خرگوش کو کار سے باندھ دیا گیا تو وہ متواتر دو گھنٹوں تک ۴۴ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا رہا۔

اکثر خرگوش چھوٹے فاصلے اس سے زیادہ تیز رفتار سے طے کرسکتے ہیں۔ ہاتھی اور گینڈا اپنے بے ڈھنگے اور بھاری بھرکم جسموں کے باوجود ۲۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتے ہیں۔ لیکن بہت جلد تھک جاتے ہیں اور تھوڑی ہی دیر میں اپنی مقررہ رفتار دو میل فی گھنٹہ پر آجاتے ہیں۔

عمدہ قسم کا گھوڑا ۱۱ سکینڈ میں ۲۲۰ گز دوڑتا ہے جبکہ ایک تیز رفتار انسان یہی فاصلہ تقریباً دگنے وقت میں طے کرتا ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گھوڑے کی رفتار انسان کی رفتار سے دوگنی ہے۔ کنگرو جب برق رفتاری سے دوڑتے ہیں تو بڑے ہی عجیب لگتے ہیں۔ کنگرو اپنے لمبے لمبے پیروں کی وجہ سے اکثر گھوڑوں پر سبقت لے جاتے ہیں۔ لومڑی اپنی جان بچانے کی خاطر چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگتی ہے بھیڑیے کی رفتار بھی تقریباً اتنی ہی ہوتی ہے۔

"ایمو" ایک ایسا حیرت انگیز اور تیز رفتار پرندہ ہے جو سرے سے اڑ ہی نہیں سکتا۔ البتہ دوڑ سکتا ہے اس کے لمبے اور طاقتور پیر زیبرا اور سانبھر کے ساتھ دوڑنے کے لیے موزوں ہوتے ہیں اس لیے یہ بھی گلوں میں رہتا ہے۔

آسٹریلیا کے اس عجیب و غریب پرندے نما جانور کی رفتار، کنگرو کی رفتار سے کچھ ہی کم ہوتی ہے۔ اس کی ایک قسم تو ایسی ہوتی ہے جو بآسانی (۳۰) فیٹ چھلانگ جاتی ہے۔ یہ نا حیرت کی بات ہرن کی طرح ایمو قابل لحاظ فاصلے تک اپنی یکساں رفتار کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

اب پرندوں کی اڑان کے بارے میں سنیے۔ مختلف قسم کے پرندوں کی اڑنے کی رفتار کے سلسلے میں اب تک کافی تحقیقات کی جاچکی ہے۔ آپ نے باز اور عقاب کے نام ضرور سنے ہوں گے۔ یہ پرندے انتہائی تیز رفتار سے اڑنے والے پرندے کہے جاتے ہیں۔ عقاب تو فی گھنٹہ ایک سو دس میل کی رفتار سے اڑتا ہے۔ تمام اقسام کے شاہین اپنی تیز اڑان کے لیے مشہور ہیں تاہم ان میں شکاری باز کو فوقیت حاصل ہے۔

باز کی پرواز کے بارے میں مختلف روایتیں مشہور ہیں کہ وہ غیر معمولی رفتار سے پرواز کرتا ہے۔ لیکن اس کا کوئی سائنسی ثبوت نہیں باز عمودی سمت میں فضا سے زمین کی طرف (۸۰) میل فی گھنٹہ سے کچھ زیادہ

رفتار سے جھپٹتا ہے۔ لیکن اس کی عام پرواز ۶۵ میل فی گھنٹہ سے زائد نہیں ہوتی۔ ابابیلیں ایک سو میل فی گھنٹہ سے بھی زائد رفتار سے اڑ سکتی ہیں ایک مرتبہ ایک ابابیل کو کار کے ذریعہ اس کے گھونسلے سے دس میل دور لے جاکر چھوڑ دیا گیا۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ابابیل صرف ۴۴ سیکنڈ میں اپنے گھونسلے پر واپس پہنچ گئی اس طرح ابابیل کی اوسط رفتار ۱۱۰ میل فی گھنٹہ ہوئی۔ سدھائے ہوئے کبوتر جنھیں بعض شوقین ٹکڑیوں کی شکل میں اڑاتے ہیں، موسم خوشگوار ہو تو ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ سکتے ہیں۔ سمندری بگلے بھی تقریباً اسی رفتار سے ایک سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ ایک قسم کے آبی پرندے ڈرایون گیم برڈس (DRIVEN GAME BIRDS) جن کی مدد سے شکار بھی کھیلا جاتا ہے۔ فی گھنٹہ دس میل کی رفتار سے اڑتے ہیں۔ جنگلی ہنس کے اڑنے کی رفتار ۶۰ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ لیکن تمام سمندری پرندوں کی رفتار ہمیشہ یکساں طور پر برقرار نہیں رہتی۔ اکثر و بیشتر پرندے بعض صورتوں میں اپنی اوسط رفتار سے بھی زائد رفتار سے اڑنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں۔

اور بھی سمندر کی دنیا تو سب سے نرالی ہے۔ اور پراسرار، کبھی کبھی سمندر کی تہوں میں پائے جانے والے جانوروں اور پودوں کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات ہوتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ مثلاً تونی مچھلی (TUNY) جو کھائی جاتی ہے اور تلوار مچھلی جسے سمندری دنیا کی تیز رفتار مچھلی ہونے کا دعویٰ ہے چھوٹے فاصلے کو ۳۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے طے کرتی ہے ایک مچھلی ماکرل بھی ان سے پیچھے ہے۔ تونی مچھلی کا وزن پانچ سو سیر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ماکرل اور تونی مچھلیاں کنارے آکر انڈے دیتی ہیں۔ سالومن مچھلی جب کانٹے میں پھنس جاتی ہے تو خوف اور دہشت کے مارے ۲۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی ناک کی سیدھ میں بڑھتی چلی جاتی ہے۔ پائیک PIKE دیو پیکر وحشی مچھلی کی رفتار پندرہ میل ہوتی ہے۔ جانوروں اور پرندوں کی طرح اکثر حالتوں میں مچھلیوں کی رفتار بھی متاثر ہوجاتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بعض جانور اور پرندے جو اپنی سست رفتاری کے باعث ضرب المثل بن چکے ہیں۔ ان کی رفتار عام اندازہ سے کہیں زیادہ ہے۔ مثلاً سلوکھا ایک مچھلی ہے۔ جو ایک فیٹ سے زیادہ فاصلہ تک نہیں تیر سکتی۔ لیکن دریائے امیزان میں پائی جانے والی سلوکھی مچھلی چارے کی تلاش میں کم از کم دو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے تیر کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتی ہے۔

دراصل پانی کی گہرائیوں میں مختلف قسم کی بیلوں اور آبی پودوں کا ایک جال سا پھیلا ہوا ہوتا ہے جس کی بنا مچھلیوں کے لیے کسی خاص سمت میں مقررہ رفتار سے تیرنا ممکن نہیں۔ اور پھر مچھلیاں عموماً گہرے پانی میں رہتی ہیں جہاں انھیں کچھ زیادہ ہی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سرد ممالک کے مقابلے میں گرم علاقوں کے جانور زیادہ تیز رفتار اور پھرتیلے ہوتے ہیں۔

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابنِ بطوطہ

(جنوری ۷۸ء سے سلسلہ ملائیے)

اس آدمی نے مجھے نوٹوں کی ایک گڈی دے کر کہا "یہ تمہاری دعوت ہے۔ اب تم جاؤ مگر یہ نہ سمجھو کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ وہ تمہارے پاس ہے۔"

شیخ اوحدالدین سے جب میں نے اس واقعہ کا ذکر کیا تو بولے "یہ کوئی نہیں جانتا کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ پچاس برس ہوئے کہ یہاں سے چلا گیا تھا۔ ایک سال سے پھر آگیا ہے۔ بادشاہ، امیر، وزیر اس کی زیارت کو آتے ہیں تو نہایت قیمتی تحفے دیتا ہے۔ فقیروں کو خیرات دیتا ہے۔ مگر غار میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی۔ یہ اگلے زمانے کی باتیں کرتا ہے اور پیغمبر آخرالزماں کا ذکر کرتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علیؓ کا ذکر کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی بہت تعریف کرتا ہے۔ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر میں اس زمانے میں ہوتا تو ان کے ساتھ دیتا۔ ان سب لوگوں نے فقیر کی عجیب عجیب باتیں سنائیں۔

شیخ اوحدالدین نے بتایا کہ ایک دفعہ میں اس کے پاس گیا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاتھ پکڑتے ہی مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک عالی شان محل میں کھڑا ہوں اور فقیر سنہرا تاج پہنے تخت پر بیٹھا ہے۔ خوبصورت لونڈیاں، دائیں بائیں کھڑی ہیں نہریں بہہ رہی ہیں اور درختوں سے پھل خود ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں۔ ایک سیب میں نے اٹھا کر کھانا چاہا تو آنکھ کھل گئی۔ فقیر میرے سامنے کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔ پھر میں کئی مہینے بیمار رہا اور فقیر کے پاس جانا چھوڑ دیا۔

لوگوں کو یقین ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ مگر نماز پڑھتے کسی نے نہیں دیکھا۔ ہاں روزے ہمیشہ رکھتا ہے۔

شہر پہنچ کر معلوم ہوا کہ شاہ چین (قاآن) کا حکم آیا تھا کہ مجھے دربار میں بھیج دیا جائے۔ بحری راستے سے یا جس راستے سے جانا چاہوں۔ میں نے کہا "بحری راستے سے جانا چاہتا ہوں۔"

میرے واسطے ایک جہاز نہایت شاندار تیار کر دیا گیا۔ حاکم نے میرے ساتھ آدمی کر دیے۔ قاضی اور مسلمان سوداگروں نے بہت سا زادِ راہ ساتھ کر دیا راستے بھر حکومت کی طرف سے دعوت رہی۔

"شہر فن چن تو" دس دن چل کر ہم "فن چن تو" پہنچے۔ یہاں کے مسلمانوں کو ہماری خبر پہنچ گئی تھی۔ شیخ الاسلام اور مسلمان سوداگر ہمارے استقبال کے لیے آئے۔ استقبال جلوس کے ساتھ نوبت نقارے بج رہے تھے گھوڑے پر ہمیں سوار کرایا گیا۔ ان کے ساتھ سرکاری اہلکار بھی تھے۔

اس شہر میں چار فصیلیں ہیں۔ ایک میں غلام اور چوکیدار رہتے ہیں۔ دوسری میں لشکر اور حاکم شہر تیسری میں مسلمان۔ چوتھی میں چینی۔ چینیوں کی آبادی سب سے زیادہ ہے۔

شہر کے چار دروازے ہیں۔ ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک تین میل کا فاصلہ ہے ہم یہاں شیخ ظہیر الدین قرلانی کے مکان پر ٹھہرے۔

میں اس شہر میں پندرہ دن ٹھہرا اور پھر شہر "خنسا" چلا گیا۔ خنسا شہر کے چھ حصے ہیں۔ یہاں میرے استقبال کے لیے قاضی فخر الدین اور شیخ الاسلام آئے۔ عثمان بن عفان کا خاندان ان کے ساتھ تھا۔

عثمان بن عفان کا خاندان بڑا ذی مرتبت ہے۔ حکومت نے انھیں سفید جھنڈا اور نوبت نقارے رکھنے کی اجازت دی ہے۔ ان کے ساتھ شہر کا حاکم مع سازوسامان کے استقبال میں شریک تھا۔

خنسا میں یہودی، عیسائی اور ترک رہتے ہیں۔ ترک سورج کی پوجا کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی بستی الگ ہے اور سب مسلمان اچھے حال میں ہیں۔ شہر کا حاکم چینی ہے۔ رات ہم نے حاکم کے ہاں گزاری اور مسلمانوں کی بستی میں چلے گئے۔

بستی میں، جیسا کہ ہم نے ابھی بتایا ہے۔ عثمان بن عفان کا خاندان بہت سربرآوردہ ہے۔ ان کی بنائی ہوئی مسجد بھی ہیں۔ جامع مسجد ہے، خانقاہ ہے، اسے عثمانیہ کہتے ہیں۔ اور پھر اوقاف ہیں۔ یہ پورا خاندان صدقہ اور خیرات دینے میں مشہور ہے۔ یہاں ہم پندرہ دن ٹھہرے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی مسلمان دعوت کرتا تھا۔ اور ایک سے بڑھ کر ایک خاطر مدارات کرتا تھا۔

میں نے کسی جگہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزی اور ان کے چغے کا ذکر کیا ہے کہ راجہ نے مجھ سے لے لیا اور میں اس کی نذر کرنے پر مجبور ہوگیا۔ یہ واقعہ اسی شہر خنسا میں پیش آیا تھا۔

یہاں ایک بڑا میدان ہے۔ اس میں مزدوروں اور کاریگروں کے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ یہ کاریگر کپڑا اور جنگی سامان بناتے ہیں۔ ان میں سولہ سو استاد ہیں اور باقی شاگرد ہیں، جن کی تعداد چھ سات ہزار سے کم نہیں ہے۔ ان مزدوروں کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں اور سوائے بازار چلے جانے کے کسی کے گھر پر ملنے جلنے کے لیے نہیں جا سکتے۔

دس سال تک کام کرنے کے بعد ہر ایک مزدور کی بیڑیاں کاٹ دی جاتی ہیں اور اسے اختیار رہتا ہے کہ چاہے سرکاری کام کرے یا آزاد رہے۔ مگر حکومت سے باہر نہیں جانے دیتی . . . . ہر آدمی جس کی عمر پچاس برس کی ہو جاتی ہے، کام سے مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے اور حکومت اسے گزارہ (یا پنشن) دینے لگتی ہے۔ "ساٹھ برس والے بچے سمجھے جاتے ہیں اور

کوئی قانون ان پر عائد نہیں ہوتا۔ بڑے بوڑھوں کو اتا (بابا) کہا جاتا ہے۔ اتا ترکی لفظ ہے۔

حیرت انگیز تماشہ یہاں ایک امیر کی دعوت میں ایسا تماشہ دیکھا ہے جسے کبھی نہیں بھول سکتے۔ کھانا کھانے کے بعد بازی گر آگئے۔ امیر نے کہا۔ ہمارے مہمانوں کو ایسا تماشا دکھاؤ کہ یہ حیران رہ جائیں۔

بازی گر نے لکڑی کی ایک گیند اٹھائی جس کے سوراخوں میں لمبے لمبے تسمے بندھے تھے اور اس گیند کو اتنی زور سے اچھالا کہ ہماری نگاہوں سے غائب ہوگئی۔ پھر اس نے اپنے ایک شاگرد کو اشارہ کیا اور وہ تسمے پکڑ کر چڑھتا چلا گیا۔ اتنی دور تک چڑھتا چلا گیا کہ ہم میں سے کوئی اسے دیکھ نہ سکتا تھا۔ نیچے والے بازی گر نے آواز دے کر کہا "آجاؤ" مگر وہ نہ آیا۔ اس پر نیچے والا بازی گر بے تحاشا اوپر چڑھتا چلا گیا اور ہماری نگاہوں سے غائب ہوگیا۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ چیخ پکار کی آوازیں آنے لگیں اور جو بازی گر پہلے چڑھا تھا اس کا ہاتھ کٹ کر گرا۔ پھر دوسری ٹانگ اور پھر دھڑ سے باقی دھڑ نیچے گر پڑا اور وہ بازی گر جو بعد میں چڑھ کر گیا تھا، غصہ میں فوں فوں کرتا نیچے اتر آیا۔ اس کے کپڑے خون میں لت پت ہو رہے تھے۔ آنکھیں غصہ سے لال تھیں۔ پھر اس نے امیر کو جھک کر سلام کیا اور چینی زبان میں دعائیں دینے لگا۔ امیر نے اسے انعام دیا۔

انعام لے کر اس نے لاش کے ٹکڑوں، ہاتھ پاؤں اور دھڑ کو ملا کر رکھا اور جونہی لاش کے ٹکڑوں پر ٹھوکر ماری، مقتول بازی گر بھلا چنگا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

قاضی فخرالدین نے میری گھبراہٹ دیکھی تو کہا۔ یہ سب نظر بندی تھی کوئی چڑھا نہ اترا نہ کسی کو قتل کیا نہ خون بہا۔ یہ سن کر میں حیرت سے انگشت بدنداں رہ گیا۔ کیا عجیب کمال تھا۔

چین کے شہروں میں بانس کی کاریگری کمال پر ہے۔ بانسوں کی نہایت خوب صورت اور رنگین رکابیاں طباق اور سرپوش بنائے جاتے ہیں۔ انھیں زمین پر پھینکو تو ٹوٹتے نہیں۔ ان میں گرم کھانا رکھو تو خراب نہیں ہوتے۔ ان کا رنگ نہیں بدلتا اور دھونے سے صاف ہو جاتے ہیں۔ یہ طباق اور رکابیاں وغیرہ ہندوستان، خراسان، اور دوسرے ملکوں تک جاتی ہیں۔

(باقی اگلے پرچہ میں)

جناب داؤد انصاری (بی۔ اے۔ آنرز)

جانباز شکاری

(بنگلہ زبان کی ایک انعام یافتہ کہانی کو اردو میں اپنایا گیا)

سوئٹزرلینڈ کے شہر آلٹڈرف کے پُررونق بازار کی ایک کشادہ سڑک پر خوب چہل پہل تھی۔ سڑک پر چلنے والوں کے درمیان ایک لمبا چوڑا خوب بھاری بھرکم شخص گزر رہا تھا اس کے شانوں پر ایک بڑی کمان لٹک رہی تھی اور تیروں سے بھرا ترکش پیچھے پیٹھ پر تھا۔ کسرتی بدن، چوڑا سینہ، کشادہ پیشانی اور چہرے پر گھنی بھوری داڑھی نے اس کی شخصیت کو بارعب اور پُرکشش بنا دیا تھا۔ لوگوں کی نگاہیں برابر اسی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ وہ جدھر سے گزرتا لوگ اسے دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کرتے۔ "ہاں یہی ہے وہ مشہور و معروف تیر انداز ولیم ٹیل یہی ہے۔ کہتے ہیں اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا۔"

جی ہاں! وہ ولیم ٹیل ہی تھا۔ اس نے سوئٹزرلینڈ کے پہاڑی علاقہ میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا لی تھی اور وہیں اپنے چھوٹے سے کنبے کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ ہرن اور دوسرے جنگلی جانوروں کا شکار کرتا تھا اور ان کی قیمتی کھالوں کی فروخت سے بیوی بچوں کی پرورش کرتا۔ کبھی کبھار قرب و جوار کے دریاؤں میں ماہی گیری کے لیے چلا جاتا۔

جس دن کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس دن وہ جنگلی جانوروں کی کھالیں فروخت کرنے شہر آیا ہوا تھا۔ اور اچھی خاصی رقم حاصل کر کے واپس جا رہا تھا اچانک آسٹرین فوج کے سپاہیوں کی ایک جماعت نے اسے آگھیرا۔ اُس اچانک محاصرے سے بوکھلا گیا اور سوالیہ نظروں سے سپاہیوں کو دیکھنے لگا۔ ایک سپاہی نے سامنے اونچے ستون پر رکھے ہوئے ایک تاج کی طرف اشارہ کرکے گرج دار آواز میں کہا: "جانتے ہو، اس تاج کی تعظیم کرنا تمھارا فرض ہے۔" ٹیل کو سپاہیوں کے نرغے میں دیکھ کر لوگوں کی بھیڑ اکٹھا ہونے لگی۔

"لیکن میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا ہے۔" ٹیل نے نرمی سے کہا۔

"تم نے کیا ہے۔" اُس سپاہی نے ٹیل کی کمان اور ترکش کو اپنے قبضے میں لیتے ہوئے کہا: "شاہی تاج کے سامنے تم نے اپنا سر نہیں جھکایا۔ شہنشاہ آسٹریلیا کی شان میں گستاخی کی ہے۔"

"میرا سر کسی غیر ملکی طاقت کے سامنے نہیں جھک سکتا۔" ٹیل نے اپنا سینہ فخر سے اونچا کرتے ہوئے کہا۔ اس کی ہمت و جرأت دیکھ کر لوگ عش عش کرنے لگے۔ عین اس وقت مجمع کے اندر ایک سنسنی سی پھیلنے لگی اور لوگ کترا کر دائیں بائیں ہٹنے لگے۔ ظالم حکمراں گیسلر ایک سفید رنگ کے گھوڑے پر سوار، اپنے حفاظتی دستے کے ہمراہ اس جانب چلا آ رہا تھا۔

یہ وہی گیسلر تھا جس کی رو سے شہنشاہ آسٹریا ایک خود دار سوئیس قوم کے گلے میں غلامی کا طوق ڈالنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس کی خدمات کے صلے میں اسے سوئٹزر لینڈ کا حکمراں مقرر کر دیا گیا تھا۔ یہ بڑا ہی جابر اور سخت دل انسان تھا۔ سوئیس قوم اس کے ظلم سے بے حد نالاں تھی۔ اُس نے ملک کے اندر چھوٹے بڑے تمام شہروں کے ہر چوراہے پر ایک بلند ستون کے اوپر شاہی تاج کا ایک نمونہ نصب کرایا تھا اور ایک قانون نافذ کر دیا تھا کہ ادھر سے گزرنے والا ہر شخص تاج کے سامنے سر جھکا کر چلے۔ حکم عدولی کی سزا موت تھی۔

ٹیل نے تاج کے سامنے نہیں جھکایا تھا اس کی تعظیم نہیں کی تھی۔ اس جرم کی پاداش میں اسے گیسلر کے روبرو پیش کیا گیا۔ لیکن ہزاروں سوئیس باشندوں کی طرح وہ بھی غلامی کی ذلّت آمیز زندگی پر موت کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کے دل میں باغیانہ جذبات ابھر رہے تھے اس ظالم حکمراں کی موجودگی نے اس کے احساسات پر تازیانے کا کام کیا اور اس نے گیسلر کے سامنے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اس کا سر کسی غیر ملکی حکومت کے سامنے خم نہیں ہو سکتا۔

گیسلر نے غصے سے آنکھیں لال پیلی کرتے ہوئے کہا" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم شہنشاہ آسٹریا کو اپنا بادشاہ تسلیم نہیں کرتے ہو۔"

دفعتاً مجمع کو چیرتا ہوا اور ڈیڈی۔ ڈیڈی! .... پکارتا ہوا ایک نو دس سال کا لڑکا آگے آیا۔ تھوڑی دیر کے لیے لوگوں کی توجہ اس طرف ہو گئی اور گیسلر کا سوال بغیر جواب کے رہ گیا۔

لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر گیسلر نے ٹیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لوگوں سے دریافت کیا" کیا یہ بچہ اس مغرور اور سرکش آدمی کا ہے؟" ان حالات میں اپنے بچے کو دیکھ کر طرح طرح کے اندیشے ولیم ٹیل کے دل میں آنے لگے۔ اس نے تقریباً چیخ کر کہا" اسے چھوڑ دو۔ وہ میری پہلی اولاد ہے۔" مجمع کے اندر ایک بار پھر اضطراب پھیل گیا اور لوگوں کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔ ظالم گیسلر کی خونخوار آنکھیں کسی انجان مسرت سے چمکنے لگیں۔

"خوفزدہ ہونے کی بات نہیں۔" اس نے ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ ٹیل کو دیکھتے ہوئے کہا" میری ذات سے اُسے کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ اس کو کسی طرح کی تکلیف ہوگی تو تم سے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ بچے کو نزدیک کے ایک درخت سے باندھ کر اس کے سر پر ایک سیب رکھ دیا جائے۔

"کیوں؟ اس کا مقصد؟" ٹیل نے پریشان ہو کر کہا۔

"میں نے سنا ہے کہ تم بانگ لین کے ایک مشہور تیر انداز ہو۔" گیسلر نے ایک ظالمانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا" اور تمھارا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ آج تمھاری قابلیت کا امتحان ہو جائے گا۔ شہنشاہ آسٹریا کی شان میں ناشائستہ کلمات استعمال کرنے کے جرم میں تمھاری موت یقینی تھی۔ لیکن تمھیں زندہ رہنے کے لیے ایک موقع دیا جاتا ہے۔ اگر تم نے ایک تیر سے اپنے بچے کے سر پر رکھے ہوئے سیب میں سوراخ کر دیا تو تمھاری جان بخش دی جائے گی۔ نشانہ خطا ہونے یا بچے کو کسی قسم کی ضرب پہنچنے کی صورت میں تمھارا سر یہیں قلم کر دیا جائے گا۔"

غم اور غصے سے کانپتے ہوئے ٹیل نے کہا" ظالم! ایک بار نظر اٹھا کر اس پھول کی طرح معصوم بچے کو

دیکھ کر وہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر میرا نشانہ کامیاب ہو جائے۔"

سنگ دل گیسلر نے تلخ لہجے میں کہا "میں فضول باتیں سننے کا عادی نہیں ہوں۔ تیر چلاؤ یا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

ٹیل نے اپنے بچے کو درد بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے میں مرنے کے لیے تیار رہوں۔"

"لیکن" گیسلر گرجا "اس سے پہلے تمھارے بچے کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔"

نفرت اور حقارت سے ہونٹ چباتے ہوئے ٹیل نے کہا "اچھا مجھے تیر اور کمان واپس دیجیے۔ لیکن میری ایک درخواست ہے کہ بچے کا چہرہ درخت کی طرف رکھا جائے۔"

گیسلر نے اس کی بات مان لی اور بچے کو درخت کی طرف رخ کر کے باندھ دیا گیا۔ اس وقت تک لوگوں کی کثیر تعداد شاہراہ پر اکٹھا ہو چکی تھی جس کی وجہ سے آمد و رفت بھی رک گئی تھی۔ کچھ عجب سماں تھا۔ مجمع پر گورستان کی سی خاموشی طاری تھی۔ ٹیل کے لیے یہ سخت امتحان کا وقت تھا۔ ہاتھوں کی ذرا سی لرزش اس کے بچے کی جان لے سکتی تھی۔ پھر اس حالت میں ٹیل کو بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا۔

ایک سپاہی نے کمان اور ترکش پیش کیا۔ ٹیل نے ترکش سے دو تیر نکالے۔ ایک اپنے کمر بند میں اڑس لیا اور دوسرا کمان پر رکھا۔ تھوڑی دیر تک آسمان پر نظریں کیے کوئی مناجات پڑھتا رہا۔ پھر نشانہ ٹھیک کرنے لگا ہر شخص اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا یہ روح فرسا منظر دیکھ رہا تھا۔ دل کانوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

یکایک تحسین، آفرین کے نعروں سے پورا میدان گونج اٹھا۔ سیب کو دو ٹکڑے کر کے تیر درخت میں پیوست ہو چکا تھا۔

"بہت خوب" گیسلر نے اپنا وار خالی جاتے ہوئے دیکھ کر کہا "لیکن یہ بتاؤ تم نے دو تیر کیوں منتخب کیے تھے؟"

"اگر ایک تیر میرے بچے کے لیے موت کا پروانہ ثابت ہوتا تو دوسرا تمھیں واصلِ جہنم کر دیتا۔" ٹیل نے نڈر ہو کر جواب دیا۔ اس کی حد سے بڑھتی ہوئی جرات اور بے باکی نے گیسلر کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ وہ کچھ دیر تک قہر آلود نگاہوں سے ٹیل کو گھورتا رہا۔ پھر بولا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمھارا وجود میرے لیے ایک مستقل خطرہ بنا رہے گا۔ مجھے بے حد افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے ایسے زہریلے ناگ کی جاں بخشی کا وعدہ کر لیا ہے۔ بہرکیف تمھاری موت کی سزا حبسِ دوام میں بدل دی جاتی ہے۔ اب تمھیں اپنی زندگی میرے محل کے تنگ و تاریک تہ خانوں میں گزارنی پڑے گی۔" ٹیل کو فوراً حراست میں لے لیا گیا اور اس جگہ لے جایا گیا جہاں آسٹریائی حکمراں کا خصوصی جہاز دریائے اری میں لنگر انداز تھا۔

بندرگاہ سے روانہ ہو کر جہاز جب دریا کے بیچوں بیچ پہنچا۔ تو یکایک ہوا کی رفتار تیز ہو گئی۔ دریا کی خاموش اور پرسکون سطح پر زبردست تلاطم برپا ہو گیا تھا۔ اور پھر زوردار گرج اور چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ ہوا کے قیامت خیز جھونکوں سے جہاز کسی سوکھے ہوئے پتے کی طرح ڈولنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دریا بھی اس ظالم حکمراں کا وجود اپنے

سینے پر گراں محسوس کر رہا تھا اور اسے اٹھا پھینکنے کے لیے جانفشانی کر رہا تھا۔

ان نازک لمحوں میں دریائے اُری میں جہاز رانی کے فرائض انجام دینا کم از کم آسٹریائی باشندوں کے بس کی بات نہ تھی۔ جہاز قابو سے باہر ہوا جا رہا تھا اور اسے سنبھالنے کے لیے ان کی ہر کوشش رائیگاں ثابت ہو رہی تھی۔

اچانک انھیں خیال آیا کہ اس طوفانی ماحول میں دریائے اُری میں جہاز رانی کا وسیع تجربہ ٹیل کو تھا۔ گیسلر کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے ٹیل کو فوراً جہاز سنبھالنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد اس کے ہاتھ پاؤں کی بیڑیاں کھول دی گئیں۔

اب جہاز ٹیل کے اشارے پر چلنے لگا۔ وہ چاہتا تو آسانی سے جہاز کو کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش کر دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کا ذہن کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ ایک بار جب جہاز ندی کے درمیان ابھری ہوئی جزیرہ نما پہاڑی کے پاس پہنچا تو وہ اچانک جہاز سے کود کر بھاگا اور پل بھر میں لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بارش اس وقت بھی دھواں دھار ہو رہی تھی اور ہر طرف سفید دھوئیں کی چادر سی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ ایک گھنی جھاڑی کی آڑ میں چھپ گیا۔ آج اس نے ظالم حکمراں کے ظلم و تشدد سے سوئس قوم کو نجات دلانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا، خواہ اس کے لیے اسے اپنی جان کی بازی ہی کیوں نہ لگانی پڑے۔

کچھ دیر کے بعد جب بارش ختم ہو گئی تو اسے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ گیسلر کے آدمی اس کی تلاش میں نکل پڑے تھے۔ اسی درمیان گیسلر کی کڑک دار آواز سنائی دی" اگر وہ دوبارہ پکڑا گیا تو اس کے ساتھ اس کے خاندان کا بھی نام و نشان اس صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے گا۔" یہ سن کر ٹیل نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے۔

سپاہی اسے تلاش کرتے ہوئے کافی دور نکل گئے تو وہ جھاڑی میں سے باہر نکلا اور ایک بڑی چٹان کی آڑ میں ہو گیا، جہاں سے وہ گیسلر کو صاف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی کمر ٹٹولی۔ دوسرا تیر ابھی تک وہیں موجود تھا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اُس نے نشانہ درست کیا اور تیر چھوڑ دیا جو سیدھا پرواز کرتا ہوا گیسلر کے سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست ہو گیا۔ ظالم نے ایک دل خراش چیخ ماری اور تھوڑی دیر تڑپ کر خاموش ہو گیا۔

سوئس عوام کو جب گیسلر کی غیر متوقع موت کی خبر ملی تو انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ دلوں میں بغاوت کی دبی ہوئی چنگاریاں شعلے بن اٹھیں اور ایسی جنگِ آزادی کا آغاز ہوا کہ سوئٹزرلینڈ میں آسٹریائی حکومت کی بنیاد اکھڑ گئی۔ اور سوئس عوام ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئے۔ ٹیل کی بہادری کا یہ کارنامہ آج بھی وہاں کے ہر شخص کی زبان پر ہے۔

پیام تعلیم

Regd. No. D. 1457.

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-25.

برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)
١٥٢٨ - پٹودی ہاؤس - دریا گنج - دہلی ۶

پیامِ تعلیم



مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

ضروری

پیام تعلیم بہت پابندی کے ساتھ ہر ماہ کی ۲۷ تاریخ کو ڈاک کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ کسی مہینے پرچہ نہ ملنے پر زیادہ سے زیادہ ۱۰ تاریخ تک شکایت کرنے پر دوسرا پرچہ بھیجا جاسکتا ہے اس کے بعد شکایت کے ساتھ ساٹھ پیسے کے ٹکٹ بھیجیے (منیجر)

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی ۲۵

شمارہ ۴ جلد ۹

اپریل ۱۹۷۲ء

ایڈیٹر:۔ محمد حسین حسان ندوی

صدر دفتر: مکتبہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

شاخ: مکتبہ ... اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

شاخ: مکتبہ ... پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ: ... شمشاد مارکیٹ علی گڑھ ۲

قیمت فی پرچہ

۶۰ پیسے

سالانہ چندہ چھ روپے

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا۔

بچوں کی کتابیں

مذہب

ارکانِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	-/۵۰
آں حضرت	الیاس احمد مجیبی	-/۶۵
پاک کہانیاں (دو حصوں میں)	مقبول احمد سیوہاروی	۲/۲۵
چار یار	الیاس احمد مجیبی	۱/۳۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبد الحئی فاروقی	۲/۲۵
رسول پاکؐ	عبد الواحد سندھی	۱/۸۰
عقائدِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	-/۵۰
مسلمان بیبیاں	مولانا اعجاز الحق قدوسی	۵
نبیوں کے قصے	خواجہ عبد الحئی فاروقی	۱/۲۵
ہمارے رسولؐ	" "	۱/۶۵
ہمارے نبی	سید نواب علی رضوی اُردو -/۷۵	ہندی -/۴۰

معلومات

آدمی کی کہانی	مشتاق احمد	۱/۲۵
انوکھا عجائب خانہ	تجمل حسین حسان (چار حصے)	۱/۸۰
بجلی کی کہانی	علی احمد خاں	-/۵۰
ڈر دادا کی کہانی	محمد عبد الغفور	-/
تاریخ ہند کی کہانیاں اوّل	خجستہ سلطان	-/۸۰
" " دوم	ضیاء الرحمٰن	۱/-
" " سوم	مشتاق احمد اعظمی	۱/۸۰
" " چہارم	" " "	-/۹۵
چٹانوں کی کہانی	محمد امین	-/۷۵
خبر رسانی کے طریقے	رفیعہ منظور الامین	-/۸۵
دنیا کے بچے	تجمل حسین حسان	-/۸۰
دنیا کے بسنے والے	بشیر حسین زیدی	-/۷۵
دہلی	ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی	۱/۸۰
رابندر ناتھ ٹیگور	فدا حسین	۱/۲۵
سماجی زندگی اوّل	احمد پٹیل و غلام ابرار	-/
" " دوم	" " "	-/۸۰
" " سوم	" " "	-/۸۱
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	۱/۳۰
سمندر کے نیچے	" " "	۲/-
قدرت کے کرشمے	ادارہ	-/۶۳
سرانیس	محمد حسین حسان	۱/۲۵
ہماری پارلیمنٹ	کیلاش چندر	۱/۵۰

کہانی، ڈرامے اور ناول

اس نے کیا کر نہ جانا (کہانیاں)	آصفہ مجیب	-/۳۷
پریم کی جیت (ڈراما)	اسد اللہ کاظمی	-/۳۷
تانبیل خاں (کہانی)	محمد حسین حسان	-/۳۰
ترکوں کی کہانیاں	مرتبہ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	-/۵۵
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول)	م۔ ندیم	۱/۵۰
چقماق کی ڈبیہ (کہانی)	برکت علی فراق	-/۴۰
تین اناڑی (ناول)	عصمت چغتائی	۱/۴۰
تہپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی)	محمد معین	-/۳۵
ستاروں کی سیر (ناول)	کرشن چندر	۱/۷۵
کوئے دادا (سچا ناول)	مجیب احمد خاں	-/۷۵
لال مرغی (کہانی)	عبد الواحد سندھی	-/۵۰
مزہ چکھائیں گے (کہانی)	مرتبہ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	-/۳۵
مزے دار پہیلیاں (پہیلیاں)	محمود علی خاں	-/۶۵
ننھا ٹٹو (کہانی)	خورشیدہ سلطان	-/۳۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

بچّوں سے باتیں

مارچ کے پہلے ہفتے میں بمبئی کے مشہور روزنامہ اخبار انقلاب کے ایڈیٹر اور مالک جناب عبدالحمید انصاری کا اچانک انتقال ہوگیا۔ دل کی حرکت بند ہوگئی۔ انقلاب بمبئی کا بہت پُرانا اخبار ہے۔ اب سے بیس پچیس سال پہلے ہمارے ساتھی سید احمد ولی صاحب نے بھی اس میں کام کیا تھا۔ ولی صاحب فرماتے ہیں کہ اُس وقت بھی لگ بھگ دس گیارہ ہزار چھپتا تھا۔ مرحوم انصاری صاحب کوئی بہت بڑے سرمایہ دار نہیں تھے مگر ان کے پاس ایک دولت تھی بہت بڑی دولت اپنے کام سے لگن اور اس کام کو اچھے سے اچھا بنانے کی دُھن۔ انقلاب کو بہتر سے بہتر بنانے میں انھوں نے رات دن ایک کر دیا تھا۔ پہلے یہ لیتھو میں چھپتا تھا۔ مرحوم نے اس کے لیے آفسٹ مشین کا انتظام کیا۔ ظاہر ہے اخبار کچھ سے کچھ ہوگیا مگر انھیں اب بھی اطمینان نہیں ہوا۔ آفسٹ کی ایک اور بڑی مشین منگوائی جو ایک ہی وقت میں کئی رنگ چھاپتی ہے۔ اب اخبار کا رنگ اور بھی نکھر گیا — خوب صورت لکھائی، خوب صورت چھپائی۔ صاف ستھری کئی کئی رنگ کی تصویریں۔ غرض خوبصورتی اور خوش نمائی کے اعتبار سے اُردو کے سب روزنامہ اخباروں میں اس کا نمبر اوّل ہوگیا مگر کامیابی کی اس منزل تک پہنچنے کے لیے مرحوم کو کیسی کچھ کھکھیڑ اُٹھانی پڑی۔ یہ بھی ایک داستان ہے۔ ہمیں ان کے عزیزوں سے دلی ہمدردی ہے۔ خدا ان کو صبر کی توفیق دے۔ ہمیں یقین ہے کہ انقلاب مرحوم کے انتقال کے بعد بھی اسی شان، اسی اہتمام سے شایع ہوگا۔

ہم کتنے دنوں سے اپنے پیاموں سے پیامِ تعلیم کے خریدار بڑھانے کی درخواست کر رہے ہیں۔ مگر پیامیوں نے ابھی تک اتنی توجہ نہیں کی جتنی توجہ کی اُن سے اُمید تھی۔ ہماری اُردو زبان شمالی ہند کی مادری زبان ہے۔ یہیں پلی بڑھی، یہیں پروان چڑھی، یہیں سے سارے ہندوستان میں پھیلی۔ اس زبان کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے تو اس کے خلاف سب سے پہلے انہی کی آواز اٹھتی ہے۔ بڑی اچھی بات ہے۔ مگر ان کی سمجھ میں یہ بات بھی آجائے تو کیسا اچھا ہو کہ اُردو کی کچھ عملی خدمت بھی ضروری ہے۔ اُردو اخبار، رسالے کتابیں خرید کر پڑھے جائیں تاکہ اُردو کی ترقی کا کام آپ سے آپ آگے بڑھے۔

اس وقت تو اس کام کا بیڑا جنوبی ہند خصوصاً مہاراشٹر اور آندھرا پردیش نے اُٹھایا ہے۔ یہاں اخبار اور رسالے بھی زیادہ بکتے ہیں۔ کتابیں بھی

زیادہ بکتی ہیں۔ ہمارے ہاں کی کتابوں اور رسالوں کی کھپت بھی وہیں زیادہ ہے۔ اور آپ کو یہ سُن کر بڑا تعجب ہوگا۔ بڑا اچنبھا ہوگا کہ بڑودہ (گجرات) جیسی جگہ میں محترمہ مسز انور جہاں صدیقی ہماری درخواست سے اس قدر متاثر ہوئیں۔ اس قدر متاثر ہوئیں کہ اب تک ۷۰ خریدار مرحمت فرما چکی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے پیامی اس مثال سے اچھا سبق حاصل کریں گے!

اچھا اب ایک خوش خبری بھی سنیے۔ جناب رشید حسن خاں صاحب کو شاید آپ جانتے ہوں۔ آپ کی اُردو زبان کے ماہر ہیں۔ ہندوستان کے بڑے پائے کے لوگوں میں ہیں۔ ہم بہت دنوں سے درخواست کر رہے تھے کہ پیام تعلیم کے لیے بھی کچھ لکھیے۔ وعدہ تو انھوں نے کرلیا تھا مگر غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے وقت نہ نکال سکے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ باوجود مصروفیت کے انھوں نے بہت ہی اچھا، بہت قیمتی مضمون مرحمت فرمایا ہے۔ یہ انوکھا بہت ہی پیارا مضمون آپ اگلے پرچے میں پڑھیے گا۔ محترم خاں صاحب نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔

اس پرچے میں آپ ہوائی جہاز کی کہانی پڑھیے۔ دو ڈرامے پڑھیے اور اچھے اچھے مضمون پڑھیے۔ اگلے پرچے میں انشاء اللہ ایک اور ڈراما شایع ہوگا اور کئی اور اچھے اچھے مضمون اور کہانیاں شایع ہوں گی۔

مکتبہ پیام تعلیم کی دس کتابوں کا ذکر ہم پچھلے پرچے میں کر چکے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور انشاء اللہ جاری رہے گا۔ یہ کتابیں ہماری اُمید سے زیادہ پسند کی جارہی ہیں۔ اسی لیے ہماری ہمت بڑھی ہے آپ نے منگا کر پڑھی ہیں؟ نہ پڑھی ہوں تو جلد منگا کر پڑھیے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان کا پہلا اڈیشن جلد ہی ختم ہوجائے گا۔

کچھ دلچسپ کتابیں

تانبیل خاں (محمد حسین حسّان) - پھوسے میاں کی مزے دار آپ بیتی۔ کوئی انھیں پکڑ کر پانی کے جہاز پر لے گیا۔ جہاز ڈوب گیا۔ یہ بچ گئے۔ پھر کیا ہوا؟ یہ کہانی میں پڑھیے۔ بڑی مزے دار کہانی ہے۔ قیمت ۳۰ پیسے

تین اناڑی (عصمت چغتائی) گگّو، ہیلو اور ٹیٹو۔۔ تین بچے کیسی کیسی انوکھی شرارتیں کرتے ہیں۔ شرارتوں سے بھرپور یہ ناول بالکل بچوں کی زبان میں لکھا گیا ہے۔ بڑا ہی دلچسپ ناول ہے۔ قیمت ۱/۴۰

چقماق کی ڈبیا (برکت علی فراق) جادو کی ایک چھوٹی سی ڈبیا کے کارنامے۔ اس ڈبیا نے ایک غریب سپاہی کو سپاہی سے "سپاہی بادشاہ" بنا دیا۔ بہت مزے دار کہانی ہے۔ قیمت ۴۰ پیسے

کومے واوا (مجیب احمد خاں) اس دلچسپ کتاب میں جنوبی امریکہ کے ملک برازیل کے گھنے جنگلوں میں رہنے والے قبیلوں اور انوکھے جانوروں کے حالات بڑے ڈرامائی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ بھلا مجال کیا، جو آپ کتاب شروع کرنے کے بعد ہاتھ سے رکھ دیں۔ اپنے انداز کی بالکل انوکھی کتاب ہے۔ قیمت ۱/۷۵

جناب کیفت احمد صدیقی

امتحان کے دن

پڑھنے میں دل لگاؤ اب امتحاں کے دن ہیں
کھیلوں سے جی چراؤ اب امتحاں کے دن ہیں
راتوں کو چند گھنٹے پڑھنے کے بعد ہی تم
آنکھوں میں نیند لاؤ اب امتحاں کے دن ہیں
پچھلے پہر بھی اپنے بستر پہ جاگ کے تم
پڑھنے کو بیٹھ جاؤ اب امتحاں کے دن ہیں
تم اپنے ہر سبق کو ہر روز یاد کر کے
استاد کو سناؤ اب امتحاں کے دن ہیں
درجہ سے غیر حاضر ہونا بہت برا ہے
اسکول روز جاؤ اب امتحاں کے دن ہیں
علم و ادب کی شمعیں روشن کرو دلوں میں
تقدیر جگمگاؤ اب امتحاں کے دن ہیں
ناکامیوں کا ہر غم دل سے نکال پھینکو
خوش ہو کے مسکراؤ اب امتحاں کے دن ہیں
وہ علم و فن کی منزل تم کو پکارتی ہے
آگے قدم بڑھاؤ اب امتحاں کے دن ہیں

جناب عبدالحق خاں صاحب پرنسپل، ہائر سکنڈری اسکول جامعہ

ہوائی جہاز کی کہانی

پُرانے زمانہ میں نہ شوں شوں کرنے والے انجن تھے۔ نہ سرپٹ دوڑنے والی موٹریں تھیں۔ نہ سمندر کی چھاتی پر تیرنے والے بڑے بڑے جہاز تھے۔ اگر کوئی چیز تھی تو وہ آدمی کے من میں آسمان پر اُڑنے کی خواہش تھی۔ بے چارہ للچائی ہوئی نظروں سے آسمان پر اُڑتی ہوئی چڑیوں کو دیکھا کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ کتنا مزا آئے اگر مجھے بھی کسی طرح آسمان میں اُڑنے کا گُر معلوم ہو جائے اور میں بھی نیلے آسمان میں سفید بادلوں کے نیچے اُڑتا پھروں۔ نیچے ہرے بھرے کھیتوں، گھنے جنگلوں، بڑے بڑے تالابوں، گہرے سمندروں اور اُونچے اُونچے پہاڑوں کو دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوگی۔

بہت زمانے تک انسان ایسی ہی باتیں سوچتا رہا۔ آخر "جان ڈیمین" نام کے ایک صاحب نے پہلی بار اُڑنے کی ہمت کی۔ اُنھوں نے بہت سے پر جمع کیے اور اپنے لیے چڑیوں کی طرح دو پنکھ بنائے اور لوگوں سے کہا "میں ان پنکھوں کی مدد سے یہاں سے سو میل اُڑ کر فرانس پہنچ جاؤں گا۔" یہ کہا اور ایک قلعے کی دیوار پر چڑھ کر چھلانگ لگائی تو اوندھے منہ زمین پر! بے چارے کی ٹانگ ٹوٹی سو الگ اور لوگوں [illegible] کی ہنسی اڑائی سو الگ۔

اس کے بعد سو برس تک کسی نے پنکھ لگا کر اُڑنے کی ہمت نہیں کی۔ سنہ ۱۷۴۲ء میں فرانس کے ایک دوسرے منچلے نے بڑی ہمت سے پھر پروں کے پنکھ بنائے اور اپنے مکان کی اُوپر کی منزل سے چھلانگ لگائی۔ لیکن آسمان میں اُڑنے کے بجائے یہ بے چارے زمین پر گرے۔ بانہیں ٹوٹ گئیں اور ایک ٹانگ بھی۔

بات یہ ہے کہ آدمی چڑیوں سے کہیں بھاری ہوتا ہے۔ چڑیوں کی طرح اُڑنے کے لیے اُس کی بانہیں اسی کے مطابق کافی بڑی اور لمبی ہونی چاہئیں۔ اور اُنھیں ہلانے کے لیے جسم میں اتنی ہی پھرتی اور طاقت بھی ہونی چاہیے۔

یہ بات جب لوگوں کی سمجھ میں آگئی تو انھوں نے پنکھ لگا کر چڑیوں کی طرح اُڑنے کے بجائے کسی اور ڈھنگ سے سوچنا شروع کیا۔ دو آدمیوں کی ٹانگیں ٹوٹتی دیکھ کر ہمت ہار کر بیٹھ نہیں رہے۔

اب فرانس کے دو بھائیوں نے جو "مانٹ گال فیر" کے نام سے مشہور تھے ایک غبارہ بنایا۔ اُن کا بنایا ہوا غبارہ پتلے کپڑے کا تھا۔ اس غبارے کے نیچے ایندھن کا ایک ڈھیر اس طرح جلایا گیا کہ غبارے میں دُھواں تو اچھی طرح بھر جائے مگر آگ نہ لگ سکے۔ غبارہ اُڑا تو ضرور لیکن دُھوئیں سے نہیں بلکہ

بارے کے اندر ہوا گرم ہو جانے سے۔ ہوا جوں جوں رم ہوتی ہے توں توں ہلکی ہوتی جاتی ہے اور ب ہلکی ہوتی ہے تو اوپر کو اٹھتی ہے۔ یہ غبارہ ے میل اُڑنے کے بعد جب اس کے اندر کی ہوا ھنڈی ہو گئی تو زمین پر اُتر آیا۔ یہ غبارہ پہلی سیدھی ادی مشین تھی جسے آدمی نے پہلی بار ہوا میں اُڑایا تھا۔

دو مہینے بعد "گال فیر" نے پھر ایک غبارہ اُڑایا اور ں مرتبہ اس میں ایک بھیڑ اور ایک مُرغی اور ایک خ بھی سوار کرا دی گئی اور جب یہ تینوں یاتری ڈیڑھ ار فٹ کی بلندی سے ٹھیک ٹھاک اُتر آئے تو دمی کے اُڑنے کی خواہش اور بڑھ گئی۔ اور فرانس ے رہنے والے دو دوستوں نے اُڑنے کی ٹھانی۔ روزیر" اور اُس کے دوست بیس منٹ تک پیرس ہر پر اُڑتے پھرے۔ یہی دونوں ساتھی دُنیا کے ب سے پہلے اُڑنے والے آدمی تھے۔

غبارہ میں ہوا گرم ہو جانے سے آگ لگ جانے ا ڈر تھا۔ اس لئے لوگوں نے سوچا کہ غبارہ میں کوئی ہلکی چیز بھری جائے۔ انھی دنوں یہ پتہ چلا کہ ئٹ روجن گیس ہوا سے ہلکی ہے۔ بس پھر کیا تھا بارون کے لیے ریشم کے تھیلے بنائے گئے اور انھیں لی نائٹ روجن گیس سے بھرا جانے لگا۔ تھیلوں ر پالش کر دی جاتی تھی تا کہ اندر سے گیس نکلنے نہ ے اور اُن پر بارش کا اثر نہ ہو۔

ان گیس کے غباروں سے لوگوں نے لمبی لمبی ترائیں کیں۔ بڑی بڑی اونچائی تک ہو آئے۔ اس مانے میں ایک جرمن نے گیس کے تھیلوں والے کچھ الئ جہاز بنائے جو بہت کامیابی کے ساتھ اُڑے

لیکن بدقسمتی سے ایک ایک کر کے سب طوفانوں میں پھنس کر برباد ہو گئے۔

غبارے میں اُڑ کر آدمی کا جی نہیں بھرا۔ وہ تو چڑیوں کی طرح اُڑنا چاہتا تھا اس لیے اُڑنے کے نئے نئے ڈھنگ سوچے جانے لگے اور اُنیسویں صدی کے آخر میں گلائیڈر بنائے گئے۔

گلائیڈر بغیر مشین اور انجن کے ہوائی جہازوں کو کہتے ہیں۔ وہ بہت ہلکے ہوتے ہیں اور کسی ٹیلے یا پہاڑی کے ڈھال سے پھسل کر ہوا میں اُڑ سکتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ نیچے سے اُوپر نہیں جا سکتے تھے صرف اُوپر سے نیچے کو آ سکتے تھے۔ اور وہ بھی اُس وقت جب ہوا بالکل بند ہو۔

سب سے پہلا گلائیڈر جنوبی امریکہ کے رہنے والے "مانٹ گومری" نے بنایا تھا لیکن جس گلائیڈر کے بارے میں ہم اچھی طرح جانتے ہیں اُسے ایک جرمن نے بنایا تھا جس کا نام "لی لین تھل" تھا۔ اُس کے گلائیڈر کا ڈھانچہ سرکنڈوں کا بنا ہوا تھا۔ سرکنڈوں پر کپڑا مڑھا ہوا تھا۔ وزن میں صرف بیس سیر تھا۔

اب لوگوں نے گلائیڈر میں مشین جوڑنے کی سوچی جس سے وہ ہوا میں زیادہ دیر تک ٹھہر سکیں۔ ایسی پہلی مشین پیلچر نام کے ایک انگریز نے بنائی۔ پہلی اڑان میں تو وہ مشین کام دے گئی لیکن دوسری اُڑان میں خراب ہو گئی۔ گلائیڈر زمین پر گر گیا۔ اور پیلچر کی موت ہو گئی۔ پیلچر کی مشین کا حال سن کر ہر دیس میں مشین بنانے کے لئے نئے طریقوں پر غور ہونے لگا۔ انھی دنوں امریکہ میں دو بھائی تھے جو رائٹ بھائیوں کے نام مشہور تھے۔

اب تک غبارے اور گلائیڈر ہوا کے رحم وکرم پر ہی اُڑتے تھے۔ ان کو موڑنا اور گھمانا آدمی کے بس کی بات نہ تھی۔ "رائٹ بھائیوں" نے اپنے گلائیڈر کے پیچھے ایک پتوار لگائی۔ جس طرح کشتی کا رُخ کشتی کی پتوار سے بدلا جاتا ہے اُسی طرح اس پتوار کی مدد سے اُڑتے ہوئے گلائیڈر کا رُخ بدلا جا سکتا تھا۔ اب تک گلائیڈر صرف اوپر سے نیچے کی طرف آ سکتا تھا۔ اب اُنھوں نے ایک ایسی مشین بنائی جس کی مدد سے گلائیڈر نیچے سے اُوپر کو بھی اُڑنے لگے۔ اور رائٹ بھائیوں کی یہ سب سے بڑی کامیابی تھی۔ اُنھوں نے ایک انجن بنایا تھا اور اسے اپنے گلائیڈر میں جوڑ دیا تھا۔

دسمبر ۱۹۰۳ء کی صبح کو تیز ہوا چل رہی تھی لیکن رائٹ بھائیوں نے پروا نہیں کی اور دونوں نے باری باری چار بار گلائیڈر کو اُڑایا۔ آدمی کی بنائی ہوئی یہ مشین جو ہوا سے بھاری تھی پہلی بار اپنی طاقت سے زمین کو چھوڑ کر اُڑی۔ سچ پوچھئے تو یہ پہلا ہوائی جہاز تھا۔ اسی سے آدمیوں نے چڑیوں کی طرح اُڑنا سیکھا لیکن ابھی بہت کچھ کرنا تھا اور وہ بھی بہت جلد ہوگیا۔ "فورمنٹ" اور "وِلے رُو" نے رائٹ بھائیوں کی طرح ہوائی جہاز بنائے جو تیز رفتار بھی تھے اور لمبی لمبی اُڑانیں کرنے کے قابل بھی۔

اُس دن سے لے کر آج تک سائنس میں روز بروز ترقی ہو رہی ہے۔ اور ایک سے ایک تیز رفتار ہوائی جہاز بنائے جا رہے ہیں۔ آج ہمارے پاس جو ہوائی جہاز ہیں وہ کچھ ہی گھنٹوں میں ہم کو سینکڑوں میل لے جاتے ہیں۔ سائنس کی اس دریافت نے ہماری زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اب دنیا کے سب ملک ایک دوسرے کے بہت پاس آگئے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی ضرورتیں پوری کرنا آسان ہوگیا ہے اور آپس کے تعلقات میں بھی بہتری ہونے کے امکانات پیدا ہو رہے ہیں۔

ایسے ایسے ہوائی جہاز بھی بنائے گئے ہیں جو ہوا اور پانی دونوں میں آسانی کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ لڑائی کے دنوں میں کئی طرح کے ہوائی جہاز بنائے گئے۔ دشمن کے ملک پر گولے برسانے، چھتریوں کی مدد سے فوج اُتارنے اور لڑائی کا سامان لانے لے جانے کے لیے بہت مددگار ثابت ہوئے۔ اس لیے پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم میں ہوائی جہاز بنانے کی صنعت نے بڑی ترقی کی اور لوگوں نے طرح طرح کے اچھے اور بہتر ہوائی جہاز بنائے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ۔

آخر ہوائی جہاز ہے کیا؟ ہوائی جہاز کا ڈھانچہ اور اس کا انجن دونوں ہی اُسے اُڑنے میں مدد دیتے ہیں۔ اس کے پنکھ اور اس کا ڈھانچہ اس طرح سے بنایا جاتا ہے کہ ہوا میں اُڑتے وقت اُسے اوپر جانے کی قوت اپنے آپ ملتی رہے۔ جتنی تیزی سے وہ دوڑے گا اتنا ہی اُوپر جانے کا زور اُسے ملتا جائے گا جس طرح کشتی کو آگے بڑھانے کے لیے ہم پانی کو پیچھے پھینکتے ہیں اسی طرح ہوائی جہاز کے پنکھ ہوا کو پیچھے پھینکتے ہیں۔ وہ پنکھ مشین اور پٹرول کی مدد سے بہت ہی تیزی سے چلائے جاتے ہیں۔ ہوائی جہاز کو اُڑنے اور اُترنے میں بھی ان سے سہارا ملتا ہے۔ ہوائی جہاز اپنی پونچھ سے سمت بدلتا ہے۔ اُسے اُڑنے

کے لیے پہلے کچھ دیر تک تیزی سے زمین پر دوڑنا پڑتا ہے۔ پھر ایسے بھی ہوائی جہاز ہیں جو بغیر دوڑنے کے ہی اُوپر چڑھ جاتے ہیں۔ انھیں ہیلی کوپٹر کہتے ہیں۔ اب ایسے بھی ہوائی جہاز بن گئے ہیں جن میں پنکھ نہیں ہوتے ہیں۔ وہ بھاری دباؤ کی گیس سے چلتے ہیں۔ انھیں جیٹ ہوائی جہاز کہتے ہیں۔ اس طرح کے کچھ ہوائی جہاز تو اتنی تیزی سے اُڑتے ہیں جتنی تیزی سے آواز بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ تک نہیں پہنچ سکتی۔

نثار اعظمی

فِطرت کا پیام - بچّوں کے نام

خُدا نے ہے بنایا یہ زمین و آسماں بچّو !　　اِسی کے دَم سے قائم ہے ہمارا گلستاں بچّو
یہ سبزہ زار یہ ہریالیاں کھیتوں کی پودوں کی　　اِنھیں کے فیض سے ہے یہ زمیں جنّت نشاں بچّو
وہ صبح و شام کا منظر حسیں اور شب کے آتے ہی　　فلک پر ہیں درخشاں ماہ و انجم کہکشاں بچّو
سویرے صبح چڑیاں اُٹھ کے میٹھے گیت گاتی ہیں　　کرو مالک کو تم بھی یاد، ہوتی ہے اذاں بچّو
گُلاب و لالہ و نسرین، سمن جوہی کی خوشبوئیں　　انار و سیب، آم، انگور اور نارنگیاں بچّو
یہ ساری نعمتیں تم پر فدا ہیں تم پہ قرباں ہیں　　اِنھیں دیکھو یہ قُدرت کی ہیں سب رعنائیاں بچّو
اُسی کا ہے کرم پڑھتے ہو تم اسکول جاتے ہو　　تمھیں بھی علم کا بننا ہے بحر بے کراں بچّو
اُجالا علم و حکمت کا زمانے بھر میں پھیلا دو　　کہ جس سے جہل کی چھٹ جائیں سب تاریکیاں بچّو

اِنھیں رنگین نظّاروں کا یہ پیغام ہے ورنہ
زبانِ شاعرِ فطرت ہے بس اک ترجماں بچّو

امل:۔ کہاں پکڑلے جاؤگے۔ بہت دور؟ اس پہاڑ کے پار۔

پہرے دار:۔ سیدھے راجہ کے پاس اگر لیتا جاؤں۔

امل:۔ راجہ کے پاس؟ مجھے لے چلونا۔ لیکن مجھے تو کوی راج نے باہر جانے کو منع کیا ہے۔ مجھے کوئی کہیں بھی نہیں لے جاسکے گا۔ مجھے دن رات بس یہیں بیٹھا رہنا ہوگا۔

پہرے دار:۔ کوی راج نے منع کیا ہے؟ اخاہ! تو یہ بات ہے، جبھی سے تمھارا چہرہ سفید ہوگیا ہے، آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑگئے ہیں، تمھارے ہاتھوں پر نسیں اُبھر آئی ہیں۔

امل:۔ پہرے دار تم گھنٹہ نہ بجاؤگے؟

پہرے دار:۔ ابھی وقت نہیں ہوا۔

امل:۔ کوئی کہتا ہے وقت گزرا جا رہا ہے، کوئی کہتا ہے وقت نہیں ہوا۔ اچھا جب تم گھنٹہ بجاؤگے تب ہی وقت ہوگا۔

پہرے دار:۔ کہیں اس طرح بھی ہوتا ہے؟ وقت جب ہو جائے گا تو میں گھنٹہ بجا دوں گا۔

امل:۔ بہت اچھا لگتا ہے تمھارا گھنٹہ، مجھے سننے میں بہت اچھا لگتا ہے۔ دوپہر کو جب ہمارے گھر میں سب کھا پی چکتے ہیں، پھوپھا جان نہ جانے کہاں کام پر چلے جاتے ہیں، پھوپی جان رامائن پڑھتے پڑھتے سو جاتی ہیں، ہمارا چھوٹا سا کتّا آنگن کے اُس کونے میں سائے میں دُم میں منہ چھپائے سوتا رہتا ہے اس وقت تمھارا گھنٹہ بجتا ہے۔ ٹن ٹن، ٹن ٹن، تمھارا گھنٹہ کیوں بجتا ہے؟

پہرے دار:۔ گھنٹہ سب سے یہی کہتا ہے "وقت ٹھہرا نہیں رہتا بس گزرتا رہتا ہے"۔

امل:۔ پھر کہاں جاتا ہے؟ کس دیس؟

پہرے دار:۔ یہ بات کوئی نہیں جانتا۔

امل:۔ وہ دیس کوئی دیکھ کر نہیں لوٹا؟ میرا بہت جی چاہتا ہے وقت کے ساتھ چلا جاؤں اس دیس۔ جہاں کی باتیں کوئی نہیں جانتا وہاں بہت دور ــــ

پہرے دار:۔ اس دیس سب کو جانا ہوگا بیٹے۔

امل:۔ مجھے بھی جانا ہوگا؟

پہرے دار:۔ اور نہیں تو کیا۔

امل:۔ لیکن کوی راج نے تو مجھے باہر جانے سے منع کیا ہے۔

پہرے دار:۔ کسی دن ہوسکتا ہے کوی راج خود لے جائیں۔

امل:۔ نہیں نہیں تم ان کو نہیں جانتے وہ بس پکڑ کر بٹھا ہی دیتے ہیں۔

پہرے دار:۔ ان سے بڑے جو کوی راج ہیں وہ آکر چھڑا دیتے ہیں۔

امل:۔ میرے وہ اچھے والے کوی راج کب آجائیں گے مجھے اب بیٹھے رہنا اچھا نہیں لگتا۔

پہرے دار:۔ ایسی باتیں نہیں کرتے بیٹے!

امل:۔ میں تو بس جہاں مجھے بٹھا رکھا ہے بیٹھا ہوا ہوں۔ وہاں سے میں باہر ہی نہیں نکلا۔ مگر تمھارا گھنٹہ جب بجتا ہے، ٹن ٹن ٹن، تو میرا دل نہ جانے کیا ہونے لگتا ہے۔ اچھا پہرے دار۔

پہرے دار:۔ کیا بیٹے؟

امل:۔ اچھا وہ اس طرف بڑے سے مکان پر جھنڈا لہرایا گیا ہے اور وہاں سب لوگ آ جا رہے ہیں، وہاں کیا ہوا ہے؟

پہرے دار:۔ وہاں نیا ڈاک گھر قائم ہوا ہے۔

امل:۔ ڈاک گھر [illegible]

پہرے دار:۔ یہ لڑکا بھی خوب ہے! ارے راجہ کا ڈاک گھر ہے اور کس کا ہوگا۔

امل:۔ راجہ کے ڈاک گھر میں راجہ کے سب خط آتے ہوں گے۔

پہرے دار:۔ اور کیا۔ دیکھنا ایک دن تمھارے نام بھی خط آئے گا۔

امل:۔ میرے نام خط آئے گا! میں تو ابھی بچہ ہوں۔

پہرے دار:۔ چھوٹے بچوں کو راجہ اتنے اتنے سے چھوٹے چھوٹے خط لکھتے ہیں۔

امل:۔ یہ تو بڑا اچھا ہے۔ وہ مجھے کب خط لکھیں گے؟ تمھیں کیسے پتہ چلا کہ وہ مجھے خط لکھیں گے؟

پہرے دار:۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تمھاری کھڑکی کے سامنے سنہرے رنگ کا اتنا بڑا جھنڈا لہرا کر ڈاک گھر کیوں کھولتے۔

(یہ لڑکا مجھے بہت اچھا لگتا ہے)

امل:۔ اچھا راجہ کے پاس سے میرے نام خط آئے گا تو کون مجھے لا کر دے گا۔

پہرے دار:۔ راجہ کے بہت سے ڈاک ہرکارے ہیں۔ تم نے نہیں دیکھا؟ سینے پر گول گول تمغے پہنے ادھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں۔

امل:۔ اچھا تو وہ لوگ کہاں پھرتے رہتے ہیں۔

پہرے دار:۔ گھر گھر، ملک ملک ——— (اس کے سوالات سن کر ہنسی آتی ہے)

امل:۔ بڑا ہو کر میں راجہ کا ڈاک ہرکارہ بنوں گا۔

پہرے دار:۔ ہاہا ہاہا ڈاک ہرکارہ! یہ بہت بڑا کام ہے۔ دھوپ ہو چاہے بارش، امیر غریب سب کے گھر خط بانٹتے رہنا یہ بہت بڑا کام ہے۔

امل:۔ تم ہنس کیوں رہے ہو۔ مجھے یہ کام سب سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔ نہیں نہیں تمھارا کام بھی بہت اچھا ہے۔ جب دھوپ نکلتی ہے اور دوپہر سائیں سائیں کرنے لگتی ہے، تب گھنٹہ بجتا ہے، ٹن ٹن ٹن ——— اور پھر کبھی کبھی رات کو اچانک اٹھ کر دیکھتا ہوں گھر میں دیا بجھ گیا ہے اور باہر اندھیرے میں گھنٹہ بج رہا ہے ٹن ٹن ٹن۔

پہرے دار:۔ وہ دیکھو مکھیا آ رہا ہے۔ میں اب بھاگوں یہاں سے۔ وہ اگر دیکھ لے کہ یہاں بیٹھا تم سے باتیں کر رہا ہوں تو مشکل میں پھنس جاؤں گا۔

امل:۔ کہاں کہاں! مکھیا کہاں ہیں۔

پہرے دار:۔ وہ رہا بہت دور، سر پر گول پتوں کی بڑی سی چھتری لگائے۔

امل:۔ اسے راجہ نے مکھیا بنایا ہے۔

پہرے دار:۔ ارے نہیں خود ہی مکھیا بن بیٹھا۔ جو کوئی اسے مکھیا نہیں مانتا یہ اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ سب ہی تو اس سے ڈرتے ہیں۔ سب کے ساتھ دشمنی ہی کر کے وہ اپنا کام چلاتا ہے۔ اب چلوں میرے کام کا حرج ہو رہا ہے۔ کل صبح آ کر تمھیں سارے شہر کی خبریں سنا جاؤں گا۔

(چلا جاتا ہے)

امل:۔ راجہ کے یہاں سے روز ایک خط آیا کرے تو بہت اچھا ہو۔ یہیں کھڑکی میں بیٹھے بیٹھے پڑھا کروں۔ مگر میں تو پڑھ نہیں سکتا۔ کون پڑھ کر سنائے گا۔ پھوپھی جان تو رامائن پڑھتی ہیں کیا راجہ کا لکھا پڑھ سکیں گی؟ کوئی نہ پڑھ سکے گا تو سنبھال کر رکھ لوں گا۔ بڑا ہو کر پڑھوں گا۔ ڈاک ہرکارہ اگر مجھے نہ پہچان سکا تو؟

مسافر عاشق ہرگانوی

توتے کی زمینداری

جنوبی امریکہ کی ریاست کولمبیا کے دارالسلطنت وکٹوریہ میں ایک زمیندار رہتا ہے اس کی عمر اس وقت ۱۰۱ برس ہے۔ یہ زمیندار اور کوئی نہیں، ایک توتا ہے، جس کا نام لوئی ہے۔

۱۸۷۱ء میں جب برطین نے کولمبیا کو برٹش شہنشاہیت کا ایک صوبہ بنایا تھا تب لوئی صرف آٹھ سال کا تھا اور اس کی پرورش ایک جہاز کے مزدور کے گھر ہو رہی تھی۔ وہیں اس نے گندی گندی گالیاں بکنا اور دیسی شراب پینا سیکھ لیا تھا۔ یہ دونوں عادتیں اس میں آج بھی باقی ہیں۔

وکٹوریہ کے بڑے بوڑھوں کو جب سے یاد ہے انھوں نے اسے محترمہ ولسن کے بنگلے میں دیکھا ہے۔ محترمہ ولسن کے والد برٹش کولمبیا کے خوش حال تاجر تھے۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے کافی جائداد چھوڑ گئے۔

اس جائداد میں کولمبیا پارلیمنٹ کے اوپر والی پہاڑی کا وہ بنگلہ بھی شامل ہے جس میں محترمہ ولسن رہا کرتی تھیں اور جسے وہ ۱۹۴۹ء میں اپنی موت کے بعد اپنے پالتو توتے لوئی کے لیے چھوڑ گئی ہیں۔

محترمہ ولسن کو لوئی سے اس قدر لگاؤ اتنی محبت تھی کہ وہ اسے کار میں لے کر گھومنے جایا کرتی تھیں۔ گر لوئی کو سا[illegible]

اور وہ چیخنے چلانے لگتا تھا۔ آخر لوئی کی خاطر محترمہ ولسن نے بجلی سے چلنے والی کار خریدی۔ اس میں شور بالکل نہیں ہوتا تھا، مگر لوئی کو یہ سواری بھی راس نہ آئی اور وہ کار ہمیشہ کے لیے گیرج میں بند کر دی گئی۔

محترمہ ولسن کی موت کے بعد ۱۹۱۳ء ماڈل کی اس ہپ ایٹس کار کو نکالا گیا تو پتہ چلا کہ وہ پورے سو میل بھی نہیں چلی تھی۔

محترمہ ولسن کے لیے تو لوئی کا ساتھ ہی کافی تھا مگر احساس تھا کہ خود لوئی کے لیے صرف ان کا ساتھ ہی کافی نہیں ہے، اس لیے انھوں نے موری نامی توتا خرید کر لوئی کی تنہائی دور کر دی۔

موری کی عمر لوئی سے چالیس سال کم ہے۔ محترمہ ولسن کو موری سے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس گھر میں لوئی کو ہمیشہ فوقیت حاصل رہی۔

محترمہ ولسن نے اپنی وصیت میں بھی موری کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ زندگی کے آخری دنوں میں وہ لوئی اور اپنے مالی یوئے واہ وونگ کے سوا اور کسی سے نہیں ملتی تھیں۔ اپنے مرنے کے بعد وہ تقریباً چالیس لاکھ روپیہ اور ایک عالی شان بنگلہ چھوڑ گئیں۔

ان کی موت کے بعد ان کے رشتہ داروں نے یہ [illegible]

بنگلہ ایک شخص ابرام کے ہاتھ بیچ دیا۔ ابرام نے فیصلہ کیا کہ اسے گرا کر کوئی منزلہ عمارت بنوالے۔ لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ کیونکہ محترمہ ولسن نے اپنی وصیت میں بالکل صاف صاف لکھ دیا تھا کہ لوئی زندگی بھر اسی بنگلے میں رہے گا۔ اور کسی بھی صورت میں اسے کسی دوسری جگہ اور دوسرے ماحول میں منتقل نہیں کیا جاسکتا۔

محترمہ ولسن کی موت سے لوئی کو گہرا صدمہ پہنچا تھا اور وہ بیمار اور خاموش رہنے لگا تھا۔ اس وقت لوئی کی عمر ۸۶ برس تھی۔ لوئی کی بیماری سے ابرام بہت خوش ہوا تھا کہ چلو اب لوئی مرجائے گا۔ لیکن لوئی مرا نہیں۔ بلکہ بہت دنوں تک زندہ رہنے کے لیے جلد ہی صحت یاب ہوگیا۔

محترمہ ولسن کی وصیت میں یہ بھی لکھا تھا کہ مالی ووَنگ جب تک زندہ رہے گا وہی لوئی کی خدمت کرے گا اور اس کی تنخواہ لوئی کی جائداد سے دی جاتی رہے گی۔ ووَنگ لوئی کی ہر طرح سے خدمت کرتا ہے۔ وقت پر بادام اور ابلے ہوئے انڈے کھلاتا ہے اور برانڈی پلاتا ہے۔

ابرام نے جب یہ دیکھا کہ لوئی مرنے کے بجائے صحت یاب ہوگیا ہے اور ابھی اس کے مرنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تو اس سے صبر نہ ہوسکا اور اس نے وہ بنگلہ وکٹوریہ کے دو آدمیوں کے ہاتھ فروخت کردیا۔ ان دونوں نے بنگلے پر اپنے قبضے کے لیے عدالتی کارروائی کی، مگر ووَنگ نے لوئی کی پیروی کرنے کے لیے وکٹوریہ کے سب سے مشہور وکیل کو رکھ کر عدالت سے بنگلہ لوئی کے حق میں کرالیا کہ جب تک لوئی زندہ ہے تب تک محترمہ ولسن کا بنگلہ لوئی کی ملکیت مانا جائے گا اور اس کی آمدنی پر لوئی کا ہی اختیار رہے گا۔

۱۹۶۳ء میں لوئی کا خدمت گار ووَنگ سخت بیمار ہوگیا تھا تب لوگوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ ووَنگ مرنے والا ہے۔ یہ افواہ سن کر ووَنگ نے لوئی کے وکیل کی مدد سے عدالت سے یہ حکم نامہ حاصل کرلیا کہ اس کی موت کے بعد لوئی کی خدمت کے لیے عدالت انتظام کرے گی۔

کچھ لوگوں نے یہ افواہ بھی پھیلائی کہ لوئی مرگیا ہے اور ووَنگ بازار سے لوئی جیسا ایک دوسرا توتا خرید لایا ہے۔ ووَنگ نے اس خبر کی تردید کے لیے اخبار کے نامہ نگاروں کو اپنے یہاں مدعو کیا۔ نامہ نگار جب لوئی کی کھڑکی کے قریب پہنچے اور ان میں ایک نے لوئی کہہ کر آواز دی تو لوئی نے جواب میں "ووَنگ" کہا اور آنے والوں کو گھور کر دیکھنے لگا چند سکینڈ تک گھورنے کے بعد وہ چلانے لگا "ووَنگ ووَنگ" ابے او نامعقول ووَنگ"۔ ظاہر تھا کہ وہ آنے والوں پر ناراض ہو رہا تھا اور ووَنگ سے جواب طلب کر رہا تھا کہ یہ لوگ یہاں کیوں اور کس کی اجازت سے آئے ہیں۔

ووَنگ کا کہنا ہے کہ لوئی ۳۰۰ سال کی عمر پاکر مرے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ ۲۱۶۳ء تک محترمہ ولسن کا بنگلہ اسی طرح لوئی کے قبضے میں رہے گا۔

چندہ ہمیشہ منی آرڈر سے بھیجا کیجیے۔ وی پی منگانے میں آپ کا نقصان ہے۔ منیجر

جناب حسن بشیر

میری کتاب لوٹا دو

(بڑے لڑکوں کے لیے)

مری کتاب مری کائنات لوٹا دو
خدا کے واسطے میری حیات لوٹا دو

مری کتاب نہ چھینو کہ روشنی یہ ہے — مری کتاب نہ پھاڑو کہ زندگی یہ ہے
مری کتاب شرارت سے باز رکھتی ہے — مری کتاب مسرّت کا ساز رکھتی ہے
مری کتاب کا ہر لفظ تول کر دیکھو — مری کتاب میں سب کچھ ہے کھول کر دیکھو
مری کتاب میں انسان کی کہانی ہے — مری کتاب میں پھولوں کی شادمانی ہے
مری کتاب اندھیروں سے جنگ کرتی ہے — مری کتاب جہالت کو تنگ کرتی ہے
مری کتاب ہی مرکز ہے علم و حکمت کا — مری کتاب ہی دریا ہے مہر و الفت کا
مری کتاب حقیقت بیان کرتی ہے — مری کتاب امنگیں جوان کرتی ہے
مری کتاب تلاش و عمل پہ اُکسائے — مری کتاب بلندی پہ سب کو پہنچائے
مری کتاب زمیں آسماں پہ بھاری ہے — چہار سمت اسی کا تو فیض جاری ہے
سرور و کیف کی دولت نہاں اسی میں ہے — سکون و امن کی جنّت نہاں اسی میں ہے
اسی میں پنڈت و ملّا کی دشمنی کم ہے — اسی میں گنگ و جمن کا حسین سنگم ہے
اسی میں رام، مہاویر اور گوتم ہے — اسی میں روحِ محمدؐ ہے، ابنِ مریم ہے
ہنسی میں بات نہ ٹالو ذرا کہا مانو — اسی میں نورِ خدا ہے اگرچہ پہچانو
جنونِ شوق میں شیشہ کو یوں نہ چور کرو — خدا کے واسطے مجھ کو نہ اس سے دور کرو
مفکّروں کا سخن، دل کی بات لوٹا دو — پیمبروں کی خدائی صفات، لوٹا دو

مری کتاب مری کائنات لوٹا دو
خدا کے واسطے میری حیات لوٹا دو

زاہد اقبال

کوہِ نور

اِس وقت دنیا میں تقریباً آدھی درجن الماس موجود ہیں۔ لیکن کوہِ نور ان سبھوں میں افضل ہے۔

اِس کے مشہور ہونے کی وجہ ایک یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ یہ بہت ہی وزنی ہے۔ دوسرے اس سے بہت سی تاریخی روایتیں وابستہ ہیں۔ جب کبھی "کوہِ نور" کا نام ذہن میں آتا ہے۔ بدنصیب مغل شہنشاہ محمد شاہ کی بے بسی پر آنکھوں سے آنسو کے بجائے خون ٹپکتا ہے۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ کوہِ نور کس زمانے میں اور کہاں پایا گیا۔ پرانی روایتوں پر اعتبار کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اس کی عمر ہزاروں سال کی ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ازکم پانچ ہزار سال تک یہ ہندوستان کے قدیم راجاؤں کے قبضے میں رہا اور جب سلطان علاؤالدین خلجی نے مالوا کے راجہ کو شکست دی تو یہ ہیرا اس کے قبضے میں آیا ـــــ پھر ۱۵۲۶ء میں یہ ہمایوں کے قبضے میں آیا ـــــ ہمایوں کے بعد اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں نے مغلیہ سلطنت کی امانت سمجھ کر اس کا بے حد احترام کیا۔ اورنگ زیب حکمراں ہوا تو اس نے اسے تختِ طاؤس میں لگا کر تختِ طاؤس کی زینت میں اضافہ کیا۔

مغل شہنشاہوں کی نگاہ میں اس کی کیا اہمیت تھی۔ اس حقیقت کا انکشاف تاریخ خود کرتی ہے جب نادر شاہ کے ہاتھوں مغل شہنشاہ محمد شاہ کی شکست ہوتی ہے تو محمد شاہ نادر شاہ کے حوالے سب کچھ کر دیتا ہے مگر چھپاتا ہے تو صرف ایک ہیرا لیکن چونکہ بدنصیبی سائے کی طرح ساتھ چل رہی تھی اس لیے نادر شاہ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ محمد شاہ نے اس کو اپنے صافہ میں چھپا لیا ہے۔ اس لیے جب وقت وہ محمد شاہ کو دوبارہ تخت پر بٹھانے لگتا ہے تو یہ خواہش ظاہر کرتا ہے کہ ہم دونوں آپس میں صافہ بدل لیں۔ اور اس طرح محمد شاہ کے سر سے صافہ لے کر نادر شاہ اپنے سر پر رکھنا چاہتا ہے تو "ہیرا" زمین پر گر جاتا ہے اس کی چمک اور صفائی کو دیکھ کر نادر شاہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور بے ساختہ نادر شاہ کے منہ سے نکلتا ہے ـــــ "کوہِ نور" اور تب ہی سے یہ "ہیرا" "کوہِ نور" کے نام سے مشہور ہے۔

نادر شاہ کے بعد یہ ہیرا اُس کے بدنصیب بیٹے کو ملا پھر اس نے احمد شاہ ابدالی کو اور احمد شاہ ابدالی نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کو دیا۔ اس کے بعد عرصے تک یہ ہیرا اُسی خاندان میں رہا اور پھر مختلف ہاتھوں میں ہوتا ہوا رنجیت سنگھ تک پہنچا۔ رنجیت سنگھ کی موت ہوئی تو ہیرا لاہور کے خزانے میں چلا گیا اور پھر جب ۱۸۴۹ء میں پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو ملکہ وکٹوریہ کے

تاج کے لیے لندن بھیج دیا گیا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ہیرا جسے انگریزی میں گریٹ مغل (GREAT MOGHAL) کہتے ہیں۔ یہی کوہ نور ہے۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دوسرا ہیرا ہے جو ۱۶۵۰ء میں کوہ نور میں دریائے کرشنا کے ساحل پر پایا گیا تھا اور جس کا وزن ۲۸۰ قیراط تھا۔

لیکن افغانی روایت کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ افغانوں کے مطابق احمد شاہ ابدالی کو یہ ہیرا نادر شاہ کی بیوی نے خدمات کے صلہ میں دیا تھا اور اس وقت سے یہ ہیرا فرمانروایانِ افغانستان کے پاس رہا یہاں تک کہ جب محمد زئی خاندان کی حکومت شروع ہوئی تو امین الدولہ شاہ شجاع کے حکم سے یہ ہیرا لے کر ہندوستان چلا آیا ـــــ لیکن جب لاہور پہنچا تو کچھ انگریز تاجروں کو علم ہو گیا اور انھوں نے اس سے زبردستی چھین لیا اور لندن بھیج دیا۔ امین الدولہ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ اُسے جنون سا ہو گیا۔ وہ اس ہیرے کو حاصل کرنے کے لیے لندن گیا۔ جہاں اُس نے ملکہ وکٹوریہ سے درخواست کی کہ اُسے یہ ہیرا واپس کر دیا جائے۔ لیکن جب اس کی درخواست قبول نہیں ہوئی تو اس نے بڑی حسرت سے کہا: "کم سے کم مجھے ایک نظر دکھا دو۔"

چنانچہ یہ ہیرا اس کو دکھایا گیا۔ ہیرا دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کافی دیر تک روتا رہا پھر ہندوستان آیا لیکن زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکا ـــــ افغانستان میں یہ قصہ بہت ہی مشہور ہے کہ ہر شخص یہ وصیت کر جاتا ہے کہ اس ہیرے کو واپس لانے میں اپنی ساری کوشش صرف کر دیں ـــــ چنانچہ جب ۱۹۱۹ء میں افغانی وفد ہندوستان سے واپس گیا اور جب افغانی سرحد پر افغانی سرداروں نے اس کا استقبال کیا تو ان میں سے ایک نے سلام کرنے سے پہلے بڑی ہی حسرت سے پوچھا۔ "کوہ نور بھی ساتھ لایا ہے یا نہیں۔" لیکن وفد کی خاموشی سے ہی وہ سب کچھ سمجھ گیا اور ٹھنڈی ٹھنڈی سانس لینے لگا۔

مظہر باری چکدیوی

حیرت انگیز پنکھا

ایک تھا بادشاہ اسے طرح طرح کے پنکھے جمع کرنے کا شوق تھا۔ اس کے پاس ہر طرح کے پنکھے تھے جتنے قسم کے پنکھے اس وقت تک بنے تھے۔ سب اس کے پاس تھے۔ ایک دن اس کے محل میں ایک پنکھے والا پہنچا۔ حیرت انگیز پنکھے لے کر۔ اس نے بادشاہ کو بتایا کہ دنیا میں آج تک ایسے پنکھے نہیں بنے ہیں۔

بادشاہ نے پنکھوں کو دیکھا تو اسے کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ بالکل معمولی پنکھے تھے۔ جو عام طور پر بازاروں میں ملتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا: "مجھے تو اس میں کوئی عجیب و غریب بات نظر نہیں آتی۔ اس کی قیمت کیا ہے؟"

پنکھے والا:۔ جہاں پناہ! پنکھے کی خوبیوں کو دیکھتے اس کی قیمت بہت کم ہے۔ صرف سو روپے۔

بادشاہ:۔ سو روپے! دو ٹکے کا معمولی پنکھا اور یہ قیمت اس پنکھے میں کیا خوبی ہے؟

پنکھے والا:۔ حضور! یہ پنکھا ہزار سال چلے گا۔ اس کی گارنٹی ہے۔

بادشاہ:۔ اسے دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے کہ ایک ہفتہ ہی چل جائے تو بہت ہے۔ تم دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہو۔

پنکھا والا:۔ دھوکا اور آپ کو؟ جہاں پناہ میں آپ کو دھوکا دے کر جاؤں گا کہاں؟ ہزار برس نہ چلے تو اس کا میں ذمے دار ہوں۔

بادشاہ کو یقین تو نہ آیا پھر بھی وہ پنکھا سو روپے میں خرید لیا گیا۔ اور اسے ساتویں دن حاضر ہونے کا حکم دے دیا گیا۔ ایک ہفتہ ہوتے ہوتے پنکھا ردی ہو گیا۔ بادشاہ کو امید تو نہ تھی کہ وہ پنکھے والا آئے گا۔ مگر عین وقت پر وہ ساتویں دن حاضر ہو گیا۔ آتے ہی اس نے پنکھے کی خیریت دریافت کی۔

بادشاہ نے کہا "کہتے تھے کہ ہزار سال چلے گا۔ وہ دیکھو تمھارا پنکھا ٹوٹا پڑا ہے۔"

پنکھے والا:۔ پنکھا تو گارنٹی شدہ ہے۔ ہزار سال چلتا ہے معلوم ہوتا ہے آپ کے یہاں کسی کو پنکھا جھلنا نہیں آتا۔ پنکھا جھلا کیسے جاتا تھا؟

بادشاہ: اچھا تو اب یہ بھی سیکھنے کی ضرورت ہے کہ پنکھا کیسے جھلا جاتا ہے؟

پنکھے والا:۔ یہ تو بتانا ہی ہوگا۔ آخر ایک ہی ہفتے میں اس کی یہ حالت کیسے ہو گئی؟

بادشاہ نے پنکھا اٹھایا اور جھل کر دکھا دیا۔

پنکھے والا:۔ آ گئی بات سمجھ میں۔ میں بھی سوچ رہا تھا

آخر کیا بات ہے۔
جناب والا! آپ سر کو کھڑا رکھتے ہیں اور پنکھے کو ہلاتے ہیں۔ اس میں پنکھے کا کیا قصور! آپ کے جھلنے کا ڈھنگ ہی غلط ہے۔ آپ پنکھا پکڑ کر سامنے کھڑا رکھیے اور سر کو ہلائیے۔ پنکھا ضرور ہزار سال چلے گا۔ آپ ختم ہو جائیں گے لیکن پنکھا ختم نہیں ہوگا۔"

(مرکزی خیال ہندی سے)

بقیہ صـ ۲۸

جیسے کہہ رہی ہو" مجھے چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو۔"

ایک صبح جمیل نے چڑیا کو دیکھا تو دنگ رہ گیا سنہری چڑیا کے ننھے ننھے پر نیچے ڈھلک آئے تھے اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

شاہد نے اسے دیکھا تو کہا" میاں جمیل اب یہ بے چاری چند گھنٹوں کی مہمان ہے اسے "اڑا" چھوڑ دو ورنہ اس کی موت کی ذمہ داری تم پر ہوگی تمہاری گردن پر ایک ننھی سی جان کا خون ہوگا۔"

یہ سن کر جمیل نے جلدی سے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ سنہری چڑیا کی آنکھوں میں زندگی کی چمک آ گئی۔ وہ پھر سے باہر نکلی اور فضاؤں میں اڑ گئی۔

جمیل کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے اس نے بہت بڑے راز کو پا لیا ہے۔ اسے آج معلوم ہوا کہ آزاد رہنے اور آزاد کرنے میں کتنا لطف آتا ہے غلامی میں سونا بھی ملے تو بے کار ہے۔ زندگی کی سچی خوشی آزادی میں ہے۔ اسی لیے انسان، چرند پرند سب آزادی کو عزیز جانتے ہیں۔

بقیہ صـ ۳۳

الہ دین:۔ بس جلد از جلد اس محل اور ساری دولت کے ساتھ سلطان کے شہر پہنچا دو۔

(الہ دین اور اس کی بیوی شہزادی فاطمہ اپنے محل کے ساتھ سلطان کے شہر کو واپس پہنچ جاتے ہیں)

سلطان:۔ ایک ہفتہ گزر چکا — کہاں ہے وہ چور — دھوکے باز الہ دین — جس نے میری پیاری بیٹی کو واپس ڈھونڈ لانے کا وعدہ کیا تھا۔ اب اس کا کوئی نشان تک نہیں — میری پیاری بیٹی فاطمہ! — کہاں ہے تو؟
— میں تجھے ڈھونڈ نکالوں گا۔
— تیرے لیے اپنی فوج بھیجوں گا۔
— اوہ — یہ کیا — میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں — محل!
— الہ دین کا محل — میرے داماد کا محل — کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں —
نہیں وہ یہاں آ رہے ہیں۔
— میری پیاری لڑکی فاطمہ۔
— اور میرا چہیتا داماد — الہ دین — آؤ — آؤ۔
میرے پیارے بچو! — تم نے مجھے موت سے بچا لیا۔ ہا ہا —

جناب ذوالنورین صدیقی مسعود

ممتا کے بول

کتنا کومل، کتنا سُندر میرا راج دلارا
سورج بھی ہے، چندا بھی ہے میری آنکھ کا تارا
خواب میں آکر پریاں کھیلیں اس سے آنکھ مچولی
پھول گلستاں کا شرمائے دیکھ کے صورت بھولی
مجھ کو قدرت نے بخشا ہے تحفہ کتنا پیارا
کتنا کومل، کتنا سُندر میرا راج دلارا
سات سمندر پار سے مُنّا آئے گا جب پڑھ کر
دیش کا اونچا نام کرے گا بن کر قوم کا رہبر
اس کے دم سے ہر سُو ہوگا دھرتی پہ اُجیارا
کتنا کومل، کتنا سُندر میرا راج دلارا
سُکھ کے گلشن میں پھر ہر سُو پریم کا پھول کھلے گا
دیپ خوشی کا روشن ہوگا سب کو چین ملے گا
مُنّا میرا پھیلائے گا جگ میں بھائی چارا
کتنا کومل، کتنا سُندر میرا راج دلارا
اپنے مُنّے کو میں دوں گی ایسی دُلہن لاکر
دیکھ کے جس کو چھپ جائے گا چندا بھی شرما کر
مُنّے کا جو مُنّا ہوگا وہ بھی ہوگا پیارا
کتنا کومل، کتنا سُندر میرا راج دلارا
لب پر میرے یہی دعا ہے مُنّا ہو خوش قسمت
نازل کرنا ہر دم یارب اس پہ اپنی رحمت!
پھولوں ہی کی سیج ملے اور خوشیوں کا گہوارا
کتنا کومل، کتنا سُندر میرا راج دلارا

خلیق انجم اشرفی

کچھ لطیفے مُلّا نصر الدین آفندی کے

جس طرح ہمارے ہندوستانی ادب میں بیربل، مُلّا دو پیازہ میں شیخ اور لال بجھکّڑ کے لطیفے ہنسنے ہنسانے کا سامان ہیں اسی طرح چینی ترکستان میں نصر الدین آفندی کا کردار ہے۔ نصر الدین کو سب لوگ مُلّا نصر الدین کے نام سے جانتے ہیں۔ چین سے لے کر ترکی تک اُن کا نام ہے۔

مُلّا جی کا پورا نام نصر الدین آفندی تھا لیکن لوگ عموماً آفندی یا مُلّا کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ ماوراالنہر (چینی ترکستان) کے یونغار نامی جگہ کے رہنے والے تھے۔ مُلّا صاحب اپنے چٹکلوں اور حاضر جوابیوں کے لیے مشہور تھے۔

چینی ترکستان کی زبان ترکی سے ملتی جلتی ہے اور مُلّا کے لطیفے ظاہر ہے کہ سب سے پہلے اسی مقامی زبان میں لکھے گئے ہوں گے۔ اس کے بعد ان کا ترجمہ دنیا کی بڑی بڑی زبانوں مثلاً انگریزی، چینی، عربی، فارسی، ترکی، اردو، ہندی اور بہت سی دوسری بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

مُلّا جی کے لطیفے آپ اس سے پہلے بھی کئی بار "پیامِ تعلیم" اور دوسرے رسالوں میں پڑھ چکے ہوں گے۔ لیجیے اب ان کے ایسے لطیفوں اور چٹکلوں کا ایک انتخاب پڑھیے جو شاید آپ نے اس سے پہلے نہ پڑھے ہوں گے۔

مُلّا اور چور

ایک روز مُلّا نصر الدین کی بیوی نے ان کی قمیص دھو کر آنگن میں لکڑی کے ایک خشک ٹھٹھے پر سوکھنے کو پھیلا دی۔ مُلّا جی شام کو گھر واپس آئے تو اتنے تھکے تھے کہ آنگن میں اِدھر اُدھر نظر ڈالے بغیر سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے اور بستر پر لیٹتے ہی گہری نیند سو گئے۔ آدھی رات میں آنکھ کھلی تو آنگن کی طرف دیکھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں ٹھٹھے پر پڑی ہوئی قمیص پر نظر گئی۔ انھیں گمان ہوا کہ ہو نہ ہو کوئی چور ہے۔ چپکے سے اُٹھے۔ بندوق نکالی اور قمیص پر نشانہ لگا کر فائر کر دیا۔ قمیص ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ زمین پر گر پڑی۔

فائر کی آواز سن کر اُن کی بیوی کی آنکھ کھل گئی، اُنھوں نے پوچھا "کیا ہے؟" "جی کچھ نہیں" مُلّا جی بولے "ایک چور آنگن میں کھڑا تھا میں نے اُسے مار گرایا۔ اب کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ اطمینان سے سو جاؤ۔ صبح ہم اس کی لاش ہٹا دیں گے۔"

دوسری صبح مُلّا جی کو پتہ چلا کہ وہ تو ان کی اپنی قمیص تھی۔ اسی کو اُنھوں نے گولی کا نشانہ بنایا تھا۔

اپنے گالوں پر تھپڑ مارتے ہوئے بیوی سے بولے "دیکھا اللہ میاں کتنے رحم دل ہیں۔ ذرا سوچو اگر میں قمیص کے اندر ہوتا تو آج تم بیوہ ہو چکی ہوتیں۔"

زندہ مُردہ

ایک رات مُلّا نصرالدین ایک قبرستان کے پاس سے گزر رہے تھے اتنے میں اُنھوں نے کچھ گھڑ سواروں کو اسی طرف آتے دیکھا۔ مُلّا نے سوچا یہ لوگ کچھ ایسے ویسے معلوم ہوتے ہیں۔ بس چُپکے سے ایک "تازہ کھُدی ہوئی قبر میں لیٹ گئے۔ لیکن ان گھڑ سواروں نے انھیں دیکھ لیا تھا اور وہ بڑے حیران ہو رہے تھے کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ وہ قبر کے پاس آئے اور زور سے پوچھا "کون ہو تم؟"

آفندی نے قبر سے سر نکالا اور بولے "میں — میں اس قبر میں دفن کیے جانے والے مُردوں میں سے ایک ہوں۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ رات کے وقت ایک مُردے کو قبر سے باہر نکلنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟"

"بس تازہ ہَوا کے لیے۔"

"کیا مُردے کو بھی تازہ ہَوا کی ضرورت ہوتی ہے؟"

"ہاں ہاں ...... تم لوگ ٹھیک ہی کہتے ہو۔ میں غلطی پر تھا۔" یہ کہتے ہوئے وہ دُوبارہ قبر میں لیٹ گئے۔

مُلّا کی گائے

مُلّا کی بیوی اپنی گائے بیچنا چاہتی تھیں۔ بڑی مرکھنی تھی۔ دُودھ بھی کم دیتی تھی۔ مُلّا اسے لے کر بازار گئے۔ خریدار آتے گائے دیکھتے لیکن اسے خریدے بغیر واپس چلے جاتے۔ مُلّا ہر ایک سے کہتے۔ "یہ تو ممکن ہے کہ آپ اس گائے سے دُودھ حاصل نہ کر سکیں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ اس کی سینگوں کی مار سے بچ جائیں۔"

لوگ ان کی بات سُنتے اور اپنا راستہ لیتے۔ بھلا کس کی شامت آئی تھی جو ایسی گائے خریدتا۔

ایک گڈریا دیر سے مُلّا کی باتیں سُن سُن کر حیران ہو رہا تھا کہ بھلا کیسا سیدھا آدمی ہے۔ اس نے مُلّا سے کہا "لاؤ میں تمھاری گائے بیچ دوں۔"

مُلّا جی نے اس کی طرف احسان مندانہ نظروں سے دیکھا۔ "ارے میاں تم۔ بڑے نیک ہو۔ خدا تمھارا بھلا کرے۔" اور گائے کی رسّی اُسے تھما دی۔

گڈریے نے اس کی رسّی پکڑ کر چلّانا شروع کیا۔ "ذرا اس گائے کو دیکھیے۔ کیسی سیدھی کیسی نیک ہے۔ روزانہ پندرہ سیر دُودھ بھی دیتی ہے۔ آپ اسے خرید کر کبھی گھاٹے میں نہیں رہیں گے۔"

یہ سنتے ہی مُلّا نے اس سے گائے کی رسّی جھپٹ کر چھین لی اور بولے "اگر گائے اتنی نیک اتنی سیدھی ہے اور روزانہ پندرہ سیر دُودھ دیتی ہے تو میں اسے کیوں بیچوں۔"

برتن کی موت

ایک دن مُلّا نے اپنے ایک پڑوسی سے کوئی برتن اُدھار لیا۔ ایک ہفتہ کے بعد اُنھوں نے اسے ایک چھوٹے سے برتن کے ساتھ لَوٹا دیا۔ پڑوسی بہت حیران ہوا اور اُن سے پوچھا کہ انھوں نے اس میں یہ

چھوٹا برتن کیوں رکھ دیا۔

"بھئی بات یہ ہے" مُلّا جی بولے "جس دن میں نے تم سے یہ برتن اُدھار لیا اُس کے دوسرے ہی دن تمھارے برتن نے یہ بچّہ دیا۔"

"واہ بھئی واہ، یہ تو بڑی حیرت انگیز بات ہے۔ آیندہ اگر آپ کو کسی برتن کی ضرورت ہو تو بے دھڑک مجھ سے آکر لے لیجیے۔" پڑوسی خوشی خوشی برتن لے کر گھر کے اندر چلا گیا۔

کچھ روز بعد مُلّا جی پھر برتن اُدھار مانگ لائے۔

ایک ہفتہ گذر گیا۔ دو ہفتے گذر گئے۔ یہاں تک کہ ایک مہینہ گذر گیا لیکن مُلّا جی نے برتن واپس نہ کیا۔ پڑوسی بڑا پریشان ہوا اور برتن واپس مانگنے پہنچا۔

مُلّا جی آنکھوں میں آنسو لیے باہر آئے اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولے۔ "صبر کرو اللہ کی مرضی یہی تھی۔ تمھارا برتن تو میرے گھر آنے کے دوسرے ہی دن مر گیا تھا۔ میں اس کی خبر تمھیں چالیس روز بعد دینا چاہتا تھا تاکہ تم اس کا چالیسواں کر سکو۔"

یہ سُن کر پڑوسی کو غصّہ آ گیا۔ چیخ کر بولا "کیا تم پاگل ہو گئے ہو مُلّا جی۔ کیا دُنیا میں کوئی ایسا برتن بھی ہے جو مرجاتا ہو۔ میرا برتن واپس کر دو۔"

"کیسے عجیب آدمی ہو تم۔" مُلّا جی بولے "اگر تم نے اس بات پر یقین کر لیا تھا کہ تمھارا برتن بچّہ دے سکتا تھا تو اب اس بات پر کیوں یقین نہیں کرتے کہ وہ مر بھی سکتا ہے۔"

شرم

ایک دن ایک چور نے مُلّا جی کے گھر میں نقب لگائی۔ مُلّا جی اسے دیکھ کر ایک الماری میں چھپ گئے۔ چور نے سارا گھر دیکھ لیا لیکن لے جانے کے قابل کوئی چیز نہ ملی تو آخر میں اس نے الماری کھولی اور مُلّا جی کو دیکھ کر بولا "یہ تم الماری کے اندر کیا کر رہے ہو؟"

"میں اس شرم کے مارے یہاں چھپ گیا تھا کہ میرے گھر میں کوئی ایسی چیز نہیں جو تم لے جا سکو" مُلّا جی نے فوراً جواب دیا۔

پیاسی جیب

ایک دن مُلّا نصیرالدین ایک دن شادی میں گیے۔ ایک مہمان نے خوب مٹھائیاں کھائیں بھی اور اپنے لبادے کی بڑی جیب میں خوب بھر بھی لیں۔ مُلّا جی نے دیکھ لیا اور ایک چائے دانی اُٹھا کر چپکے سے اس کے پیچھے پہنچے اور اس کی جیب میں گرم گرم چائے ڈالنے لگے۔

مہمان نے چونک کر دیکھا اور شرمندہ ہونے کے بجائے اُلٹے مُلّا پر برس پڑا۔ "یہ تم میری جیب میں چائے کیوں اُنڈیل رہے ہو؟"

"میرے بھائی۔ میرا مقصد تمھیں نقصان پہنچانا نہیں" مُلّا نے جواب دیا۔ "میں نے دیکھا کہ تمھاری جیب نے اتنی مٹھائیاں کھالی ہیں۔ اب اسے پیاس لگی ہوگی۔ بس اسی لیے میں نے اسے چائے پلانی شروع کر دی۔"

پُرانا چاند

کسی نے مُلّا نصیرالدین سے پوچھا "مُلّا جی یہ تو بتائیے کہ ہر مہینہ نیا چاند نکلتا ہے تو پُرانا چاند کہاں جاتا ہے؟"

"ارے جاتا کہاں ہے۔ اللہ میاں اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے ستارے بنا دیتے ہیں۔" مُلّا جی نے جھٹ جواب دیا۔

زمین کا بوجھ

ایک روز مُلّا کے کچھ دوستوں نے ان سے پوچھا "بھئی یہ تو بتائیے کہ صبح ہوتے ہی لوگ اِدھر اُدھر چاروں طرف کیوں جانے لگتے ہیں؟"

"ارے کتنے بے وقوف ہو تم لوگ۔" مُلّا نے کہا۔ "یہ تو بالکل صاف بات ہے۔ اگر سب لوگ ایک ہی سمت میں چلے جائیں تو زمین ان کے بوجھ سے جھک کر اُلٹ نہ جائے گی۔"

چوتھی نصیحت

ایک دن مُلّا نصرالدین نے کچھ روپیہ کمانے کی سوچی۔ بس پھر کیا تھا۔ ایک لمبی رسّی لی اور بازار پہنچ کر سامان اُٹھانے والے مزدوروں میں شامل ہو گئے۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک آدمی مزدوروں کی طرف بڑھا اور سب کو مخاطب کرکے بولا "میرے پاس شیشے کے برتنوں سے بھری ہوئی ایک پیٹی ہے۔ جو بھی اسے میرے گھر تک لے جائے گا میں اسے تین اچھی نصیحتیں کروں گا۔"

"یہ تو بے وقوف بنانا ہے۔" مزدور بولے اور اس شخص کی طرف ذرا بھی توجہ نہ کی لیکن مُلّا نے سوچا کہ روپیہ تو کسی وقت بھی کسی طرح سے مل سکتا ہے، مگر اچھی نصیحت ملنا دشوار ہے۔ مجھے اس کی نصیحتیں سُننی چاہییں تاکہ کوئی سبق حاصل کر سکوں۔"

یہ سوچ کر وہ اس شخص کی طرف بڑھے اور اس کی پیٹی اُٹھا کر رسّی سے باندھ لی اور چل دیے۔ اس کے پیچھے پیچھے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اُنھوں نے اس شخص سے پوچھا "اچھا اب پہلی نصیحت بتائیے۔"

وہ شخص بولا "کبھی ایسے شخص کی بات نہ ماننا جو کہے کہ پیٹ بھرے سے بھوکا رہنا اچھا ہے۔"

"بھئی واہ یہ تو بڑی اچھی نصیحت ہے۔" مُلّا جی بولے۔

تھوڑی دور اور چلے تو مُلّا نے پوچھا "اچھا اب دوسری نصیحت بتائیے۔"

اس شخص نے کہا "کبھی ایسے شخص کو سچا نہ سمجھنا جو یہ کہے کہ گھوڑے کی سواری سے پیدل چلنا بہتر ہے۔"

"سبحان اللہ یہ بھی بڑی عمدہ بات ہے" مُلّا نے خوش ہو کر کہا۔

وہ کچھ اور دور چلے تو مُلّا نے تیسری نصیحت کرنے کو کہا۔

وہ شخص بولا "ایسے آدمی کی بات کا یقین نہ کرنا جو یہ کہے کہ اس نے تم سے بے وقوف بھی کوئی مزدور دیکھا ہے۔"

ابھی اس شخص نے اپنی بات مشکل ہی سے ختم کی ہو گی کہ مُلّا نے پیٹی اُٹھا کر زمین پر پھینک دی اور رسّی کھولتے ہوئے بولے "اور تم بھی اس آدمی کی بات کا یقین نہ کرنا جو یہ کہے کہ اس پیٹی میں کوئی برتن بھی ثابت بچا ہے۔"

احمد عثمانی (مالیگاؤں)

سچّی خوشی

شاہد اور جمیل محلے کے بچوں کے ساتھ اکثر کھیتوں کی سیر کو جاتے تھے۔ ایک دن جمیل نے ایک چڑیا کا گھونسلا دیکھا، وہ اس درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور گھونسلے کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ ایک سنہری چڑیا تھوڑی تھوڑی دیر بعد آتی ہے اور گھونسلے میں دانہ رکھ کر اڑ جاتی ہے۔ اس کی ننھی سی چونچ ہر دفعہ دانوں سے بھری رہتی ہے۔ لیکن یہ دانے اتنے کم ہوتے کہ سو پھیروں میں مشکل سے ہزار دانے ہوتے ہوں۔

"دیکھو! بے چاری چڑیا کتنی محنت کرتی ہے۔" جمیل نے شاہد سے کہا "کیوں نہ اسے پکڑ کر پنجرے میں بند کر دیں اور اسے کھانے کی ہر چیز دے دیں تب یہ بہت خوش ہوگی۔"

"نہیں" شاہد نے کہا "تمھیں معلوم نہیں کہ یہ چڑیا آزادی پسند ہے۔ اسے پنجرے میں بند کر دیا جائے تو یہ مر جائے گی۔"

جمیل کو شاہد کی یہ بات کسی طرح نہ بھائی۔ اس نے سوچا بھلا اتنی محنت کرکے بے چاری اپنا کھانا حاصل کرتی ہے اگر اسے اپنی غذا خود بخود مل جائے تو وہ ضرور خوش ہوگی۔ یہی سوچتا ہوا گھر لوٹ آیا اور چڑیا کو پکڑنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔

محلّے میں ایک چڑی مار تھا، جال بچھا کر چڑیاں بٹیریں اور تیتر پکڑا کرتا تھا۔ جمیل نے اس چڑی مار سے سنہری چڑیا کو پکڑنے کے متعلق پوچھا اس نے کہا "یہ چڑیا جال میں نہیں پھنستی۔ اس کو رات میں جب وہ اپنے گھونسلے میں میٹھی نیند سو رہی ہو پکڑا جاتا ہے۔" جمیل نے اپنے چند دوستوں کو چڑیا پکڑنے کے لیے تیار کیا اور ایک رات وہ سب اس درخت کے نیچے پہنچ گئے۔

درخت بہت بڑا نہ تھا۔ جلد ہی دو لڑکے اوپر پہنچ گئے اور گھونسلے سمیت چڑیا کو نیچے اتار لائے۔ جمیل چڑیا کو پاکر بہت خوش ہوا۔ اس نے سوچا کہ اب اس نے چڑیا کو دانہ تلاش کرنے کی محنت سے بچا لیا۔ ایک خوبصورت پنجرا خریدا۔ دانہ پانی رکھنے کے لئے دو چھوٹی چھوٹی کٹوریاں خریدیں سنہری چڑیا کو پنجرے میں بند کر دیا اور دانہ پانی کھلانے لگا۔

لیکن ننھی چڑیا روٹھ گئی تھی وہ دانے اور پانی کو منہ نہ لگاتی تھی۔

تین چار دن بیت گئے۔ چڑیا ہر وقت پنجرے میں چاروں طرف پھڑپھڑاتی۔ باہر نکلنے کی کوشش کرتی، آخر تھک جاتی اور اداس ہو کر چوں چوں کرتی۔

مبشر احمد عرسی

الہ دین کا چراغ

ایکٹ ۱

(پہلا منظر)

(الٰہ دین اور اُس کے کچھ ساتھی شہر کی ایک سڑک کے کنارے کھیل رہے ہیں)

الٰہ دین :- آؤ ساتھیو — گولیاں کھیلیں۔

ایک ساتھی :- ہاں .... ضرور۔ لیکن تم تو اِس کھیل میں ماہر ہو اور ہار ہمیشہ ہماری ہوتی ہے۔ ہماری تمام گولیاں تم جیت لیتے ہو..... ہم تم سے یہ کھیل نہیں کھیل سکتے جب تک ہماری پچھلی گولیاں واپس نہ کر دو۔

الٰہ دین :- اچھا بھئی اپنی گولیاں واپس لے لینا۔ چلو شروع کریں اب کھیل۔

(کھیلنا شروع کرتے ہیں کہ ایک اجنبی وارد ہوتا ہے)

اجنبی :- الٰہ دین .... الٰہ دین ..... میرے بیٹے اِدھر آنا ذرا۔

(الٰہ دین اجنبی کی جانب دوڑتا ہے)

ایک ساتھی :- الٰہ دین .... الٰہ دین .... کیا تم اِس شخص کے ساتھ جا رہے ہو.... ہمارے کھیل کا کیا ہوگا۔ واپس کب آؤ گے۔

(الٰہ دین سُنی اَن سُنی کر دیتا ہے)

واہ بھئی، وہ چلا گیا... اُس سے اپنی گولیاں واپس لینی تھیں .... اب ہم کھیل بھی تو نہیں سکتے۔

اجنبی :- کیوں بیٹے تم مُصطفیٰ درزی کے بیٹے ہو نا.... مجھے اُن کے گھر تک لے چلو... اِسی گلی میں ہے نا اُن کا مکان؟

الٰہ دین :- جی ہاں ہم یہیں اسی گلی میں رہتے ہیں مگر میرے باپ کو مَرے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا۔

اجنبی :- ہیں.... یہ کیا کہتے ہو... ہائے۔ (اجنبی الٰہ دین کو اپنے سینے سے لپٹا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا ہے)

یہ تو بڑا بُرا ہوا... تمہارا باپ میرا بھائی تھا..... آہ کتنی مُدّت سے میں اُس کی تلاش میں تھا.... میں نے اُس کے لئے دُنیا کا کونا کونا چھان مارا.... بڑی مشکل سے یہاں کا پتا لگا تھا.... لیکن افسوس میں نے بڑی دیر کر دی۔ ہم ... ہم اٹھارہ سال پہلے جُدا ہوئے تھے... اُس وقت اُس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی.... آہ میرے بھائی .... سچ مچ وہ بڑا رحم دل تھا... بیٹے افسوس ہے تم یتیم ہو گئے۔ .... فکر نہ کرو میں تمہیں بالکل باپ کی طرح چاہوں گا...... تمہاری گزر مشکل سے ہو رہی ہو گی .... آؤ میں تمہیں دولت

سے مالا مال کر دُوں... میرے پیچھے چلے آؤ... یہاں گھاٹیوں میں ایک وادی کے درمیان مَیں نے اپنی دَولت چُھپا رکھی ہے..... چلو ہم یہ ساری دَولت تمہارے گھر لے آئیں۔

(دوسرا منظر)

(الٰہ دین اور اجنبی ایک وادی میں داخل ہوتے ہیں)

اجنبی:۔ "الٰہ دین.... میرے بیٹے.... دیکھو وہ بڑا سا پتھر، جس کے درمیان پیتل کی انگوٹھی لگی ہے.... پتھر کو انگوٹھی سے پکڑ کر باہر کھینچ لینا.. تمہیں وہاں ایک بڑا سا سوراخ نظر آئے گا۔ بغیر کسی گھبراہٹ کے تم سوراخ کے اندر چلے جانا۔ غار کے اندر تمہیں ایک جلتا ہُوا چراغ دکھائی دے گا.... بس اُس چراغ کو تم اُوپر لے آنا۔ مَیں یہاں تمہارا انتظار کروں گا۔

(الٰہ دین پتھر کو انگوٹھی سے پکڑ کر کھینچتا ہے)

الٰہ دین:۔ توبہ توبہ.... یہاں تو گھُپ اندھیرا ہے۔ مَیں تو اندر جانے کا نہیں، اندھیرے سے مجھ کو ڈر لگتا ہے۔"

اجنبی:۔ "نہیں میرے بیٹے.... آہستہ آہستہ قدم آگے بڑھاتے جاؤ، راستہ خود بخود نِکل آئے گا.. ... لو یہ انگوٹھی اپنی اُنگلی میں پہن لو۔ اِس کے ہوتے ہُوئے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

(الٰہ دین سوراخ سے غار میں داخل ہوتا ہے)

الٰہ دین:۔ یا خدا ـــ یہ سونے چاندی کا ڈھیر.... ہیرے جواہرات کا انبار..... کتنا شاندار ہے یہ غار.... یہاں کوئی مَوجود بھی تو نہیں.... لیکن نہیں ـــ مَیں نہیں گھبراؤں گا.... جب تک میرے پاس انگوٹھی ہے کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا.... لیکن وہ پُرانا چراغ کہاں رکھا ہے؟ـــ چچا نے کہا تھا کہ وہ بہیں جَل رہا ہے.... اہا ..... وہ رہا چراغ..... لیکن یہ چراغ کتنا میلا، گندہ اور پرانا ہے۔

(الٰہ دین چراغ رکھ لیتا ہے۔ اِس کے علاوہ جتنے ہیرے جواہرات اُس کی جیبوں میں آ سکتے ہیں بھر لیتا ہے۔ اور غار کے سوراخ کے پاس واپس آ جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنے اجنبی چچا کو کھڑا دیکھ کر بڑا خوش ہو جاتا ہے)

اجنبی:۔ ت.... ت تم لے آئے چراغ .... شاباش چلے آؤ اُوپر.... مگر پہلے مجھے وہ چراغ تو دے دو.... لاؤ۔

الٰہ دین:۔ مگر مجھے پہلے اُوپر تو آ لینے دیجئے.... پھر مَیں آپ کو وہ چراغ دے دُوں گا۔

اجنبی:۔ نہیں.... جب تک تم مجھ کو وہ چراغ نہ دو گے مَیں اُوپر آنے میں تمہاری مدد نہ کروں گا۔

الٰہ دین:۔ نہیں، مَیں اُوپر آنے کے بعد ہی آپ کو وہ چراغ دُوں گا۔

اجنبی:۔ بے وقوف لڑکے..... اگر ایسا ہی ہے.... تو جا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اِس اندھیرے غار میں بند ہو جا... بغیر کھانے پانی کے مر جائے گا.... مَیں جادُوگر ہُوں۔ تو نہیں جانتا مَیں کیا کچھ کر سکتا ہُوں۔

(اجنبی غار کے مُنہ پر پتھر دھکیل کر چلتا بنتا ہے اور الٰہ دین اندر بند ہو جاتا ہے)

اللہ دین :- ہائے یہ کیا ہوگیا — مَیں
بھوکوں مر جاؤں گا - میری
ماں گھر میں رو رہی ہوگی....
مَیں کیا کروں خدایا....
(وہ زور زور سے رونے لگتا ہے اور
ہاتھوں سے سر پیٹنے لگتا ہے....
اچانک ایک اجنبی شکل کا خوف ناک
جن اُس کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے)
جن :- مَیں اِس انگوٹھی کا غلام ہُوں
آقا.... جس کو تم نے پہن رکھا
ہے.... حکم فرمائیے میرے
آقا.... مَیں آپ کا ہر حکم
ماننے کو تیار ہُوں -
اللہ دین :- (سہمے ہوئے انداز میں)
.... تم.... تم اِس انگوٹھی کے
غلام ہو — ؟ کیا تم میرے چچا
سے زیادہ طاقت ور ہو —
مجھے — اِن ہیروں اَور چراغ
کے ساتھ میرے گھر پہنچا دو
.... کیا تم پہنچا سکو گے -
جن :- کیوں نہیں آقا — ابھی تھوڑی
دیر میں -

(تیسرا منظر)

(اللہ دین گھر واپس لوٹ آتا ہے)
ماں :- اللہ دین.... میرے لعل....
اب تک تم کہاں تھے ؟ ساری
رات مَیں نے تمہارے لئے
روتے گزار دی -
اللہ دین :- مَیں لڑکوں کے ساتھ کھیل
رہا تھا کہ ایک اجنبی نے مجھ کو
قریب بُلایا - اُس نے بتایا
کہ وہ میرا چچا ہے - وہ مجھے
ایک وادی میں لے گیا اَور
مجھ سے زمین کے ایک اندھیرے
سوراخ میں اُتر کر ایک جلتا
ہُوا چراغ لے آنے کو کہا - پھر
وہ مجھے غار میں چھوڑ کر سوراخ
بند کر کے چلا گیا - وہ میرا چچا
نہیں تھا - بلکہ جادُو گر تھا -
پھر ایک اجنبی شکل کے آدمی
نے میری مدد کی اور گھر تک
پہنچایا - وہ اِس انگوٹھی کا
غلام ہے جو جادُو گر نے مجھے
دی تھی.... یہ لیجئے ماں....
ہیرے جواہرات.... یہ سب
مَیں غار سے اُٹھا لایا ہُوں -
ماں :- (ہاتھ اُٹھا کر) خدایا تیرا شکر
ہے — تو نے میرے بیٹے کو
سلامت واپس لوٹایا پھر اتنی
دَولت بھی دی - بُرے دِنوں
کا خاتمہ کیا - اب ہم خوش رہ
سکیں گے — لیکن بیٹے!
تمہارا یہ چراغ بہت گندہ
ہے ؟ جب تک اِسے دھویا
نہ جائے استعمال کے قابل
نہیں - لاؤ اِس کو صاف
کر دُوں -
(اُس کی ماں چراغ کو صاف کرنے
کے لئے رگڑنا شروع کرتی ہے -
اچانک ایک دُوسری ہیبت ناک
اجنبی شکل کا جن نمُودار ہوتا ہے اَور
سامنے آ کھڑا ہوتا ہے)
دُوسرا جن :- مَیں اِس چراغ کا غلام
ہُوں - اے نیک عَورت !
مَیں تیرے لئے کیا کر سکتا ہُوں -
ماں :- (ڈر سے چیخ مارتی ہے لیکن جب
ہوش بجا ہوتے ہیں)... تم....
کیا تم اِس چراغ کے غلام ہو ؟
.... تب تو کھانے کے لئے
اچھی اچھی چیزیں حاضر کرو -
ہم بہت بھوکے ہیں -
دُوسرا جن :- ابھی حاضر کئے دیتا ہُوں -
(اچانک ایک بڑی سی میز نمُودار
ہو جاتی ہے - جس پر بڑے قرینے
سے چاندی سونے کے برتن رکھے
ہیں - اِن میں قسم قسم کے مزے
کے کھانے رکھے ہیں - ماں، بیٹا
خوشی خوشی کھانا کھانے لگتے
ہیں)

ایکٹ نمبر ۲

(پہلا منظر)

(الٰہ دین شہزادی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی ماں کو اس غرض کے لئے سلطان کے پاس بھجواتا ہے)

سلطان :۔ اے نیک عورت۔ کیا بات ہے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم ایک عرصے سے مجھ سے ملنے کے لئے یہاں آرہی ہو، سب حاضرین واپس ہوجاتے ہیں پر، تم انتظار میں کھڑی رہتی ہو۔

ماں :۔ جی حضور والا۔ میں آپ سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کا انتظار کیا کرتی تھی۔

سلطان :۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو اے نیک عورت۔

ماں :۔ ظلِ الٰہی.... میرے لڑکے نے آپ کی حضور میں یہ تحفہ روانہ کیا ہے۔

سلطان :۔ اوہ.... کتنے قیمتی ہیرے ہیں یہ۔ کیا ہی شاندار تحفہ ہے۔ کیا تمہارے بیٹے نے انہیں اپنے خزانے سے بھیجا ہے؟

ماں :۔ جی ہاں سرکار۔ میرا لڑکا شہزادی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ شہزادی کے سوا اور کسی سے شادی کرنے کو تیار نہیں۔

سلطان :۔ کیا کہا۔ تمہارا لڑکا شہزادی سے شادی کرنا چاہتا ہے.... ہاہا.... ٹھیک ہے....... پہلے اس سے ایک بہترین گھوڑے پر اپنی فوج کے ساتھ ایک شہزادے کی طرح شاہی لباس میں آنے کو کہو۔ اور ہاں ساتھ ہی اپنی دلہن شہزادی کے لئے اَن گنت ٹوکروں پر لدے ہوئے ہیرے، جواہرات اور سونے کے زیورات بھی ہوں، تب مجھے اپنی لڑکی کو اس سے بیاہ کرتے ہوئے بڑی خوشی ہوگی۔

ماں :۔ یہ بات، تو وہ ضرور ہی کرے گا حضور۔ اس کے علاوہ شہزادی کے لئے ایک عالی شان محل بھی بنوائے گا۔

(الٰہ دین چراغ کے جن کی مدد سے ایک عالی شان محل تعمیر کرتا ہے اور انگوٹھی کے جن کی مدد سے ہیرے، جواہرات اور سونے کے زیورات کا ڈھیر جمع کر لیتا ہے۔ پھر وہ بڑے کرّوفر کے ساتھ سلطان کے پاس حاضر ہوتا ہے۔ سلطان اس کی شان و شوکت سے بڑا خوش ہوتا ہے اور اپنی لڑکی فاطمہ کی شادی الٰہ دین سے کر دیتا ہے)

(دوسرا منظر)

(الٰہ دین اور شہزادی اُن کے عالی شان محل میں ہیں)

الٰہ دین :۔ میری پیاری شہزادی فاطمہ۔ میں تین دن کے لیے شکار کو جارہا ہوں۔ تمہاری دل بستگی کے لئے تمہاری سہیلیاں اور خدمت گار موجود رہیں گی۔ مگر خدارا محل سے باہر نہ جانا اور کسی غیر کو محل میں آنے نہ دینا۔

فاطمہ :۔ کیا کہا۔ سرتاج۔ آپ شکار کو جارہے ہیں۔ آپ کی غیر موجودگی میں تنہا کیسے رہ سکوں گی۔ مگر آپ کی مرضی۔ ہاں میں کسی غیر کو محل میں نہ آنے دوں گی۔

(الٰہ دین شکار کے لئے روانہ ہوجاتا ہے۔ دوسرے دن وہ اجنبی جادوگر جس نے چچا کہلوا کر الٰہ دین کو نقصان پہنچانا چاہا تھا۔ محل کے قریب چراغ فروخت کرنے والے کے بھیس میں آتا ہے)

جادوگر :۔ (الٰہ دین کے محل کے قریب آواز لگاتا ہے) پرانے چراغوں کے بدلے نئے چراغ۔ گندے چراغ دے کر نئے چمکیلے چراغ لے لو۔

شہزادی فاطمہ :۔ (اپنی خدمت گار سے)۔ سنتی ہو۔ وہ شخص پرانے

چراغ کے بدلے نئے چراغ دے
رہا ہے۔
خدمت گار:۔ ہاں مالکن وہ شخص ایسا
ہی کہہ رہا ہے۔
شہزادی:۔ کیوں نہ ہم اپنے شوہر کے
اس گندے چراغ کو نئے سے
بدل لیں۔ جاؤ، اس چراغ کو
دے کر نیا چراغ لے آؤ۔
(خدمت گار پرانا چراغ دے کر نیا
چراغ لے آتی ہے۔ جادوگر دل میں
پھولا نہ سماتا ہوا شہر سے دور چلا
آتا ہے اور چراغ کو رگڑتا ہے)
دوسرا جن:۔ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں
میرے آقا — میں اس چراغ کا
غلام ہوں۔
جادوگر:۔ الٰہ دین کے لیے تم نے ہی
محل تعمیر کیا تھا۔
دوسرا جن:۔ جی ہاں میرے آقا —
میں نے ہی تعمیر کیا تھا۔
جادوگر:۔ اور انگوٹھی کے جن نے الٰہ دین
کو ہیرے جواہرات اور زیورات
سے مالا مال کیا ہوگا۔؟
دوسرا جن — جی ہاں آقا۔
جادوگر:۔ اب اس الٰہ دین کے محل کو،
شہزادی کو تمام دولت کے ساتھ
میرے یہاں لے آؤ۔ تم کر سکو گے
یہ کام؟

دوسرا جن:۔ ابھی کچھ ہی دیر میں آقا۔
(تاریک منظر)
(الٰہ دین شکار سے واپس لوٹتا ہے
— محل کو غائب پاتا ہے تو بڑا
پریشان ہو جاتا ہے اور دوڑا دوڑا
سلطان کے ہاں حاضر ہوتا ہے)
الٰہ دین:۔ حضور — غضب ہو گیا —
ہائے افسوس — کہاں ہے میرا
محل — کہاں ہے میری پیاری
فاطمہ۔
سلطان:۔ چپ — دھوکے باز —
بند کرو منہ اپنا۔ مجھ سے بات
نہ کرو۔ کہاں ہے میری پیاری
بیٹی؟ — تم نے اس کو کیا
کر دیا — تم جادوگر ہو — مجھے
یہ معلوم نہ تھا۔
الٰہ دین:۔ نہیں سرکار — میں جادوگر
نہیں — جادوگر ایک اور شخص
ہے جو میرا دشمن ہے۔ ضرور
یہ اسی کے کرتوت ہیں۔ اسی
نے شہزادی اور محل کو غائب
کر دیا ہوگا — میں اس کو اس
کو اچھا سبق دوں گا — حضور
والا جلد ہی میں اپنے محل اور
پیاری فاطمہ کو ڈھونڈ نکالوں گا۔
(الٰہ دین شہر سے باہر آتا ہے اور
ایک تنہا مقام پر انگوٹھی رگڑتا ہے)

پہلا جن:۔ کیا حکم ہے میرے آقا!
الٰہ دین:۔ میرا محل کہاں ہے؟ — میری
فاطمہ کہاں ہے؟ — جہاں کہیں
ہوں لا دو۔
(جن الٰہ دین کو دور — بہت دور
ایک اجنبی مقام پر لے جاتا ہے اور
اس کو فاطمہ کے پاس چھوڑ دیتا ہے
جہاں فاطمہ قید تھی)
فاطمہ:۔ الٰہ دین — آپ — آپ یہاں
کس طرح پہنچے میرے سرتاج —
کم بخت جادوگر محل کے ساتھ
مجھے بھی یہاں لے آیا اور قید کر دیا۔
وہ کل ہی کہیں گیا ہے اور کہہ گیا
ہے کہ وہ جلد ہی واپس ہوگا اور
مجھ سے شادی کرے گا — یا
خدا تو نے میری سن لی — اچھا
آپ آ گئے سرتاج — آپ کے سوا
کون ہے جو میری مدد کرتا۔
الٰہ دین:۔ فاطمہ! — وہ پرانا چراغ
اس جادوگر نے کہاں رکھا ہے
تمہیں کچھ معلوم ہے؟
فاطمہ:۔ وہ پرانا چراغ! — وہ تو جادوگر
کے کمرے میں رکھا ہے۔
(الٰہ دین چراغ اٹھاتا ہے اور
رگڑتا ہے)
دوسرا جن:۔ آقا! — فرمائیے، کیا
حکم ہے؟ (باقی صہ ۲۲ پر)

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابنِ بطوطہ

(مسلسل)

چین کا امیر الامرا قرطی ہے۔ ہماری دعوت قرطی نے بڑے اہتمام سے کی، مسلمان باورچی بلائے ذبح کیے ہوئے گوشت کا انتظام کیا۔ اور تین دن تک ایک سے بڑھ کر ایک کھانا کھلایا۔ ہماری کشتی کے ساتھ اپنے بیٹے کو بھیجا جس کے ساتھ گانے والوں کی پارٹی تھی۔

گانے والے عربی فارسی میں راگ گاتے جاتے تھے اور کشتی پانی پر رواں دواں تھی۔ بڑا پُر لطف منظر تھا۔ امیر کا بیٹا فارسی گانا پسند کرتا تھا اور بار بار فارسی گانے کی فرمائش کرتا تھا۔

ان شعروں میں دو تین شعر میں نے یاد کر لیے جنھیں گویّے بار بار گاتے تھے اور امیر زادہ جھومتا تھا۔

تا دل بہ محبت دادیم
در بحر فکر افتادیم
چوں بہ نماز ایستادیم
توئی بہ جواب ایں دیدیم

اہلِ کشتی ایک دوسرے پر لیموں اور نارنگیاں پھینکتے جاتے تھے اور سفر خوش گوار ہوتا جاتا تھا۔ شام کو ہم امیر کے گھر میں واپس آ گئے۔ رات کو آرام کیا۔ گانا رات میں ہوتا رہا اور ان لوگوں نے عجیب عجیب راگ گائے۔ چین کے بعد خطا کا ملک ہوتا ہے۔

خان بالق

اسے خالفو بھی کہتے ہیں۔ چین اور خطا کا فرماں روا "قاآن" ہے اور یہ شہر "قاآن" کا دارالحکومت ہے (اب بھی دارالحکومت ہی ہے اور اسے پیکن کہتے ہیں)

ہمارا جہاز لنگر گاہ سے دس میل پر رُک گیا اور امیر البحر کو اطلاع دی گئی۔ بندرگاہ سے اجازت آ گئی تو ہم کنارے پر پہنچے۔

خان بالق دنیا کے بڑے شہروں میں ہے، اس کی آبادی چین کے دوسرے شہروں جیسی نہیں ہے دوسرے شہروں میں باغات اور درخت بستی میں ہیں اور خان بالق میں ہمارے ملک کی طرح

بستی کے باہر ہیں۔

یہاں میری ملاقات شیخ برہان الدین سے ہوئی یہ وہ ہیں جنھوں نے بادشاہ ہند کو لکھا تھا کہ میں ایسے بادشاہ کی ملازمت نہیں کرتا جو عالموں کو اپنے سامنے کھڑا رکھتا ہے۔ یہاں انھیں صدر جہاں کا خطاب ہے اور یہ تمام مسلمانوں کے شیخ ہیں۔

قاآن کا محل وسط شہر میں ہے جس میں سات دروازوں سے گذر کر جانا پڑتا ہے۔ پہلے دروازے پر کوتوال رہتا ہے جس کے دائیں بائیں پانچ سو پردہ دار رہتے ہیں۔ یہ لوگ محل کے دروازے کے نگہبان ہیں۔

دوسرے دروازہ پر پانچ سو تیرانداز، تیسرے پر پانچ سو نیزہ بردار، چوتھے پر پانچ سو تیغ زن، پانچویں پر وزیروں کا محکمہ جس میں بہت سے کمرے ہیں اور ایک اونچی شہ نشین پر سونے کی دوات رکھ کر وزیر اور اس کا پرائیویٹ سکریٹری بیٹھتے ہیں۔

اس کے بعد کے دروازہ پر تین کمروں میں حبشی ہندی اور چینی غلام بیٹھے رہتے ہیں۔ ان سب کا افسر چینی ہوتا ہے۔

میں جس زمانہ میں پہنچا تھا قاآن نہ تھا، اپنے چچیرے بھائی فیروز سے لڑنے گیا تھا قاآن کے چچیرے بھائی فیروز نے قراقرم اور باش بالغ میں جو دارالحکومت سے تین مہینے کے فاصلے پر ہے، بغاوت کردی تھی۔ قاآن مقابلہ کے لیے نکلا تو اس کے ساتھ ایک سو ڈویژن تھے اور ہر ڈویژن میں دس ہزار سپاہی تھے، بادشاہ کے نوکر اور شاہی رسالہ الگ تھا مگر جوں ہی قاآن دارالسلطنت سے نکلا، لشکر کے سردار باغی ہوگئے اور فیروز سے مل گئے کیونکہ اس نے چنگیز خاں کے قانون میں ردو بدل کردیا تھا، پھر انھوں نے قاآن کو لکھا کہ حکومت سے دست بردار ہوجائے اور فقط خطا کی جاگیر پر قناعت کرے۔ قاآن نہ مانا اور شکست کھاکر مارا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب قاآن کی لاش آئی تو تمام شہر سجایا گیا نوبت نقارے بجے اور ایک مہینے تک رقص و سرود کی محفلیں ہوتی رہیں۔

قاآن کی لاش کے ساتھ عزیزوں اور رشتہ داروں کی ایک سو لاشیں تھیں ایک تہہ خانہ میں جسے نہایت نفیس فرش سے آراستہ کیا گیا تھا قاآن کی لاش رکھ دی گئی آس پاس وہ تمام ہتھیار رکھ دئے گئے جن سے یہ لڑا کرتا تھا۔

سونے چاندی کے برتن جن میں یہ کھانا کھاتا تھا۔ چھ غلام جو زندہ تھے اور چار لونڈیاں جو زندہ تھیں تہہ خانے میں پہنچا دئے گئے جن کے پاس پانی پلانے کے برتن تھے۔

تہہ خانے کے اوپر دروازہ بنایا گیا اور اسے مٹی سے بند کردیا گیا اور اس پر اونچا ٹیلا بنا دیا گیا، اور اس طرح ایک لاش کے ساتھ دس زندہ آدمی زندہ درگور کر دئے گئے۔

پھر چار گھوڑے لائے گئے اور انھیں اتنا دوڑایا گیا کہ تھک کر چور چور ہوگئے ان میں ہلنے جلنے کی سکت بھی نہ رہی۔ ان زندہ گھوڑوں کو لکڑیوں میں پرو کر لٹکا دیا، یعنی لید کرنے کی جگہ لکڑیاں ٹھونسیں اور منہ کی طرف سے نکال دیں۔

قاآن کے قریبی رشتہ داروں کے لیے بھی

ایسی ہی قبریں تیار کی گئیں اور ان کے ساتھ بھی ان کے ہتھیار وغیرہ رکھے گئے۔ ہر قبر پر تین تین گھوڑے لٹکائے گئے اور باقی پر ایک ایک گھوڑا۔

بیگمات اور خواصیں چالیس دن قبر پر خیمہ لگا کر رہیں اور کچھ ایسی تھیں جنھوں نے سال بھر تک قبر کو نہ چھوڑا۔

قاآن کے بعد فیروز تخت پر بیٹھا اس نے اپنا دارالحکومت قراقرم قرار دیا تاکہ ماوراء الہند اور ترکستان سے جہاں اس کے چچاؤں کی حکومت تھی قریب رہے۔ ابھی فیروز اچھی طرح جمنے نہ پایا تھا کہ قاآن کے ساتھ والوں نے لوٹ مار اور فساد شروع کر دیا۔

یہ حالت دیکھ کر شیخ برہان الدین اور دوسرے معزز مسلمانوں نے مجھے مشورہ دیا کہ چین چلے جاؤ عام بغاوت پھوٹ پڑی تو راستے غیر محفوظ ہو جائیں گے پھر مجھے فیروز کے پاس لے گئے فیروز نے تیس آدمی میرے ساتھ کر دئے اور ہدایت کر دی کہ راستہ بھر میرے کھانے پینے کا انتظام رکھیں اور تکلیف نہ ہونے دیں۔ آخر ہم خطا ہوتے ہوئے زیتون پہنچ گئے۔

رُخ

زیتون میں ہندوستان جانے کے لیے جہاز تیار کھڑے تھے جس میں ایک جہاز جاوا کے مسلمانوں کا تھا ان لوگوں نے مجھے دیکھا تو پہچان لیا اور بہت خوش ہوئے۔ ابھی جہاز میں دس ہی دن گذرے تھے کہ ہوا بدل گئی اندھیرے اور بارش کے طوفان نے ہمیں گھیر لیا۔ بارش لگاتار ہو رہی تھی دس دن سورج نکلا تو ہوا نے ہمیں ایسے سمندر میں ڈال دیا تھا جسے ہم میں سے کوئی نہ جانتا تھا، نہ تو آگے بڑھ سکتے تھے نہ واپس چین جا سکتے تھے۔

۴۳ دن تک سمندر میں بھٹکتے پھرے۔ ۴۳ دن بعد سمندر میں دس میل پر ایک پہاڑ نظر آیا، سخت حیرانی تھی، کہ سمندر کے پانی پر یہ کیسا پہاڑ ہے اتنے میں پہاڑ اوپر اٹھا اور سمندر کا پانی نظر آنے لگا۔ یہ دیکھ کر ناخدا کے ہوش اڑ گئے ملاح رونے لگے اور سب کے سب ایک دوسرے کو رخصت کرنے لگے۔ میں نے پوچھا تو بتایا یہ رُخ جانور ہے۔ اگر اس کا رُخ ہماری طرف ہو گیا تو جہاز کے بچاؤ کی کوئی شکل نہیں ہے۔

خدا کا کرنا کہ ہوا پلٹ گئی اور ہمیں دوسری طرف لے گئی اور پھر ہمیں رُخ کی صورت نظر نہ آئی اور ہم میں سے کوئی اسے نہ دیکھ سکا۔ یہاں سے ہم سماترا پہنچے۔

سماترا کا سلطان ملک الظاہر ہے۔ یہاں اس کے لڑکے کی شادی میں شرکت ہوئی اور ہمیں شادی کے مراسم دیکھنے کا موقع ملا۔

شادی

اوّل محل کے صحن میں ایک ممبر بنایا گیا جس پر ریشمی کپڑے بچھے ہوئے تھے۔ ممبر تیار ہو گیا تو دلہن آئی۔ دلہن پیدل تھی اور چہرہ کھلا ہوا تھا۔ بادشاہ اور امیروں کی بیگمات بھی چہرے کھولے دلہن کے ساتھ ساتھ تھیں ان میں کوئی دلہن کا دامن اٹھائے تھی۔ کوئی پائنچے سنبھال رہی تھی۔ (باقی آئندہ)

آدھی ملاقات

کچھ ڈراما نمبر کے بارے میں

آپ کا ارسال کردہ پرخلوص اور حسین تحفہ "ڈراما نمبر" کی شکل میں ہمدست ہوا۔ میں آپ کی عنایات گراں مایہ کے بوجھ تلے پہلے ہی اپنے آپ کو کچھ دبا دبا محسوس کرتا ہوں اور اب کچھ اور دب گیا۔ اظہار ممنونیت کے لیے کھوکھلے الفاظ کا سہارا لینا کچھ ٹھیک نہیں سمجھتا پھر بھی کیونکہ رسم دنیا یہی ہے اس لیے بے حد ممنون ہوں۔

۹۶ صفحات کی ضخامت میں صف اوّل کے فن کاروں کے قلم سے نکلے ہوئے ۱۴ معیاری ڈرامے۔ دو فکر انگیز معلوماتی مضامین اور سات خوبصورت نظمیں غرض وہ سب کچھ ہے جو پیام تعلیم کی اعلیٰ روایات کا طرۂ امتیاز ہوا کرتا ہے۔ آپ کی مخلصانہ اور ان تھک جدوجہد کی دستاویز ڈراما نمبر صوری و معنوی ہر دو اعتبار سے منفرد، لاجواب اور بے مثال ہے۔ سرورق پر ذوق نظر کو فرحت دینے والے خوبصورت اسٹیج کا دیدہ زیب منظر دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ مندرجات میں ملک کے مشاہیر فن کاروں کے نام پیام تعلیم کے وسیع ترین حلقۂ اثر کے غماز ہیں۔ کیف احمد صدیقی کی مختصر منظوم تخلیق پسند آئی۔ محترم عبدالغفار صاحب نے اپنے مختصر سے مضمون میں جامعہ کے ڈراموں کی مفصل و مکمل تاریخ سمو دی ہے۔ محترمہ صالحہ عابد حسین کا ڈراما قومی یک جہتی کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں میں نمایاں کردار ادا کر سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ موصوفہ کے اس ڈرامے کو ملک کی سبھی زبانوں میں ترجمہ کرا کر ملک کے گوشے گوشے میں اسٹیج کیا جائے (جو کہ مرکزی قومی یک جہتی کمیٹی کا کام ہے) ڈراما اپنے موضوع کے اعتبار سے بے حد افادیت بخش اور اثر انگیز ہے۔ اس خوبصورت شاہکار کے لیے میری دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔ اظہر افسر صاحب کا ڈراما پڑھ کر کچھ ایسا لگا کہ بس یونہی رواروی میں لکھا گیا ہے۔ حالانکہ موصوف سے کسی بہترین چیز کی توقع تھی۔ خلیق انجم صاحب کا ڈرامہ پر معلوماتی مقالہ خاصے کی چیز ہے۔ نو آر موزوں کے لیے یہ مضمون مشعل راہ کا کام دے گا۔ سلیم تمنائی نے پاکستان کے ناعاقبت اندیش سیاست دانوں کے ذریعہ وہاں کے سیاسی اسٹیج پر کھیلے گئے خونچکاں ڈرامے کی تمثیل بڑے خوبصورت انداز میں پیش کی ہے۔ یوسف ناظم صاحب کی تعریف اپنے چھوٹے منہ سے کرنا سورج کو چراغ دکھلانے کے مترادف ہوگا۔ ان کے ڈرامے کی جتنی بھی تعریف کی جائے پھر یہی کہنا پڑے گا کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ اس لیے "سب سے بھلی چپ" ان کے علاوہ فرحت قمر۔ غلام یزدانی۔ مناظر عاشق اور عزیزہ عائشہ صاحبہ کے ڈرامے بھی غنیمت ہیں۔ حصۂ نظم میں قمر بارانوی، آزاد بارانوی اور ناوک حمزہ پوری کی نظمیں اچھی لگیں۔

کمترین محبوب راہی

پیام تعلیم کا "ڈراما نمبر" بے حد دلچسپ اور خوبصورت

ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ بچوں کے لیے مفید ثابت ہوگا اور ڈرامے کے سلسلے میں اُن کی ضرورتوں کی تکمیل میں اہم رول ادا کرے گا۔ میری طرف سے اس کی اشاعت پر مبارک باد قبول فرمائیے۔

امید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔ فقط والسلام علیٰ خیر الانام۔

مخلص بدیع الزماں خاں۔ داپولی ضلع رتناگیری

'ڈراما نمبر' بدست ہوا۔ شکریہ

آپ کا پچھلا خط ملے تو ایک ماہ کا عرصہ ہوا جس میں آپ نے "ڈراما نمبر" سے متعلق لکھا تھا۔ ان دنوں میں کچھ مصروف رہا اور خیال تھا کہ ذرا فرصت ملتے ہی کوئی ایک ڈراما ارسال کروں۔ ابھی الجھا ہوا ہی تھا کہ 'ڈراما نمبر' آگیا۔ یوں تو 'پیام تعلیم' کے عام نمبر بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔ پھر ان خاص نمبروں کا تو کچھ پوچھیے ہی نہیں۔ "قہقہہ نمبر" کے کچھ ہی عرصہ بعد یہ 'ڈراما نمبر' نکالنا واقعی بہت بڑی بات ہے۔ اتنے دقیع اور معیاری نمبر پیش کرنا تو آپ ہی کا حصہ ہے۔ اس کے لیے آپ کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا اس کا تو ہم صرف تصور ہی کر سکتے ہیں۔ 'ڈراما نمبر' میں شایع شدہ ڈراموں کے تعلق سے رائے دینا واقعی بہت مشکل کام ہے۔ ۱۴ ڈرامے! اور ایک سے ایک اچھا!

ڈرامے کی کہانی کافی معلومات افزا ہے۔ "کایا پلٹ"۔ "بلاک نمبر"۔ "انوکھا مقدمہ" "ہمارا آدرش" اور "مچھلی کا شکار" بہت پسند آئے۔

میری طرف سے نیک تمنائیں اور مبارک باد قبول فرمائیے۔

آپ کا ولی تنویر۔ حیدرآباد

پیام تعلیم ڈراما نمبر موصول ہوا۔ یاد آوری و مہر نوازی کا تہ دل سے شکریہ۔ 'ڈراما نمبر' اردو ادب میں ایک مفید قیمتی اضافہ ہے۔ بچوں کے ادب میں ڈراموں کی بہت کمی ہے۔ خصوصاً ایسے ڈرامے جو سبق آموز، قیمتی اور سماجی ہوں جو موجودہ دور میں اتحاد و اتفاق اور یک جہتی کے مقصد کو پورا کر سکیں۔ ڈراما نمبر میں تمام ڈرامے لاجواب ہیں۔ خصوصاً "بڑا مزا اس ملاپ میں ہے" پُر اثر ڈراما ہے۔ "کسان کا شکار" بہت خوب ہے۔ "ہمارا آدرش" اور "تلوار ٹوٹ گئی" بہت عمدہ ڈرامے ہیں۔

مہر دردلوی

ڈراما نمبر پڑھ لیا ہے اور بحیثیت مجموعی پسند آیا ہے۔ میں نے تمام ڈراموں کو مندرجہ ذیل چار اصولوں پر پرکھا ہے:-

۱- آیا ڈراما فن ڈراما کے تمام اصولوں کو مدنظر رکھ کر لکھا گیا ہے یا نہیں۔

۲- ڈراما آسانی سے اسٹیج کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔

۳- ڈراما صحیح معنوں میں بچوں کا ڈراما ہے یا نہیں۔

۴- ڈراما دلچسپ ہے یا نہیں۔

ان اصولوں پر صرف تین ڈرامے پورے اُترے۔ پہلا ہے محترمہ صالحہ عابد حسین کا ڈراما "بڑا مزا اس ملاپ میں ہے...." اور باقی دو تامل ڈراما "کھوٹا سکہ" اور انگریزی ڈراما "کرکٹ کا کپتان"۔ یہ تینوں ڈرامے بہت عمدہ اور قابل تعریف ہیں۔

تین ریڈیائی ڈرامے، اظہر افسر صاحب کا "مچھلی کا شکار"۔ عزت قمر صاحب کا "بلاک نمبر" اور غلام یزدانی صاحب کا "کایا پلٹ" بھی دلچسپ ہیں۔ ان میں اظہر افسر صاحب کا ڈراما تو ریڈیو سے نشر ہو چکا ہے۔ (باقی ص۴۴ پر)

اِدھر اُدھر سے

پیسا کا مینار بہت زیادہ جھک گیا ہے

پیسا۔ ۳۱ر فروری۔ پیسا کے مشہور "لیننگ ٹاور" کے گرنے کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ ماہرین کی ایک بین الاقوامی کمیٹی نے جو اس مسئلہ پر ۱۹۶۵ء سے کام کر رہی ہے یہ انکشاف کیا ہے کہ اس کا جھکاؤ بڑھ رہا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک طرف کو تیزی سے جھک رہا ہے۔

کمیٹی نے اپنی اس کھوج کا حال اٹلی کے پبلک ورکس کے وزیر جناب سیلوے ٹور لاری سلا کو بھیج دیا ہے۔ وزیر موصوف نے اس مسئلہ کا حل یہ سوچا ہے کہ ایک بین الاقوامی مقابلہ منعقد کریں جس میں دنیا بھر کے ماہرین تعمیر اور انجینیئر اس مینار کو گرنے سے بچانے کی تجویزیں بتائیں۔

'ہندوستان ٹائمز'

پلاسٹک ٹیوب گھر

ایک پلاسٹک ٹیوب گھر جسے حال ہی میں وفاقی جمہوریہ جرمنی میں تعمیر کیا گیا ہے۔ اسے یونگ ٹیوب کہتے ہیں۔

یہ ۵۷ اسکوائر میٹر یونگ ٹیوب شیشے کا بنا ہوا ہے۔ آسانی سے ایک گھنٹے میں بنایا جاسکتا ہے۔ جس کی تعمیر پر ۷۰ ہزار روپے لاگت آتی ہے۔

یہ گلاس فائبر جسے "PALATAL" کہتے ہیں' پلاسٹک کی ایک نئی اور انتہائی مضبوط ایجاد ہے۔ سورج کی سخت گرمی اور انتہائی سردی اور سمندر کے نمکین پانی کا اس پر اثر نہیں ہوتا۔ یہ پلاسٹک ٹیوب گھر اسٹیل کے پائے پر تعمیر ہوا ہے اور اس میں پانی' بجلی' گیس اور ٹیلی فون وغیرہ پائپوں اور تاروں کے ذریعے پہنچائے گئے ہیں۔ اس میں وہ تمام قسم کے آرام مہیا ہیں جو باورچی خانے سے ڈرائنگ روم اور مطالعہ گاہ سے سونے کے کمرے تک ہوتے ہیں۔

کاغذ کا پُل

یہ ایک کاغذ کا پُل امریکہ کی ایک پیپر مینوفیکچرنگ کمپنی نے تیار کیا ہے۔ یہ کاغذ کا پُل اتنا مضبوط ہے کہ ۳۰ ٹن وزن کو بآسانی برداشت کرسکتا ہے۔ یہ ۹۰۷ میٹر لمبا ہلکے وزن کا پُل ہے اور ایک خاص ڈیزائن کے کاغذ سے بنا ہے۔ فی الحال یہ پُل تجارتی استعمال کے لیے نہیں ہے۔ اس کے ڈیزائنر کا کہنا ہے کہ اس پُل کو بذریعہ ہیلی کوپٹر اس کے استعمال کے مقام پر بآسانی رکھا جاسکتا ہے۔ مظاہرہ کے دوران اس کاغذ کے پُل پر سے چھ ٹن کا ٹرک گذارا گیا تھا جس سے کاغذ کی مضبوطی اور اس کی ...

ثابت ہوتی ہے۔

ایک انوکھی گاڑی

یہ نئی ایجاد دو سلنڈر اور ۲۵ ہارس پاور سے چلنے والی گاڑی ہے۔ جو پانی، کیچڑ اور دلدل، برف یا ریت یا سیدھی یا ڈھلوان پہاڑی پر ایک لہر کے مانند چلتی ہے۔ اور نہروں اور تالابوں کے پانی پر اِس پار سے اُس پار آسانی جاسکتی ہے۔

اس عجیب وغریب گاڑی کا نام سولو-۵۰، ہے جسے مغربی جرمنی کی ایک فرم نے بنایا ہے۔

کیا آپ اچھے شہری ہیں؟

(دلیپ کھنہ - امام باڑہ)

کیا آپ گھر کی کھڑکی سے گندہ پانی یا کوڑہ کرکٹ گلی میں پھینک دیتے ہیں - اور وہ بھی نیچے دیکھے بغیر؟

کیا آپ کیلے وغیرہ کھاکر چھلکے راستے ہی میں پھینک دیتے ہیں؟

کیا مستری، دھوبی، درزی وغیرہ کا کام کرنے میں جھجک اور شرم محسوس کرتے ہیں؟

کیا آپ مستری، دھوبی، درزی وغیرہ کو بار بار تقاضے کے بغیر ہی اجرت دے دیتے ہیں؟

کیا آپ راستے میں گرے ہوئے کسی آدمی کو دیکھ کر اس سے اظہار ہمدردی یا مدد کرنے کے بجائے منہ موڑ کر نکل جاتے ہیں۔ اس کا مذاق تو نہیں اُڑاتے؟

کیا آپ راستے میں اس ڈھنگ سے چلتے ہیں جیسے کوئی کام نہ ہو؟

کیا آپ راستے پر اس طرح سے چلتے ہیں کہ آپ کی چھتری یا چھاتے کی نوک پیچھے چلنے والوں کو لگ جائے؟

کیا آپ ٹرین میں دوسرے کے کھڑے رہتے ہوئے بھی ٹانگیں پھیلا کر سوجاتے ہیں؟

کیا آپ کسی کی دعوت منظور کرنے کے بعد ٹھیک وقت پر پہنچ جاتے ہیں؟

کیا آپ گاڑی میں جگہ ہوتے ہوئے بھی دوسرے مسافروں کو چڑھنے سے روکتے ہیں؟

اِن سوالات کی کسوٹی پر خود کو پرکھیے۔ اور ان پر دس دس نمبر دیتے جائیے۔ اس طرح اگر آپ نمبرؔ تک پہنچ جائیں تو آپ یقیناً اچھے شہری کہلانے کے مستحق ہیں (انقلاب بمبئی)

صفحہ ۳۸ کا بقیہ:

فرحت قمر صاحب کے ڈراما "بلاک نمبر" ہی کے مرکزی خیال پر مبنی ایک دوسرا ڈراما بھی کئی بار ریڈیو سے نشر ہوچکا ہے۔

سلیم تمنائی صاحب کے ڈرامے "جنگل کانپ گیا" اور غازی صاحب کے ڈرامے "اور تلوار ٹوٹ گئی" کی زبان بڑی مشکل ہے۔ فقط آپ کا خادم خلیق انجم اشرفی

'ڈراما نمبر' کی رسید بھیج ہی نہیں سکا۔ تعریف کروں گا تو آپ کہیں گے مذاق کر رہا ہوں۔ نہیں کروں گا تو اپنے ساتھ بے ایمانی ہوگی۔ آپ نے نمبر نکالنے کا عہد کر رکھا ہے۔ سنتا ہے آپ کی کوئی کتاب شائع ہوئی ہے۔ بمبئی پہنچ جائے گی تو ظاہر ہے مجھے بھی پڑھنے کا موقع مل جائے گا۔ یوسف ناظم بمبئی۔


بچوں کے لئے
مزید کہانیاں
نظمیں
اور
ڈرامے
بچوں کا کھلونا
بچوں کے مشہور شاعر شفیع الدین نیر کی
۳۲ اچھی اچھی نظموں کا مجموعہ
بچوں کے اختر
نور دلچسپ نظمیں
آؤ ڈرامہ کریں
شمو کی عید
کی سبق آموز کہانی۔
کی کہانی

پیام تعلیم

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی ۲۵

شمارہ ۵ جلد ۹

مئی ۱۹۷۲ء

ایڈیٹر:-

محمد حسین حسّان ندوی

صدر دفتر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اُردو بازار دہلی ۶

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے

سالانہ چندہ چھ روپے

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر سیّد احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے
جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے
شائع کیا۔

بچوں کی کتابیں

مذہب

ارکانِ اسلام — مولانا اسلم جیراجپوری ۔/۵۰
آں حضرت — الیاس احمد مجیبی اردو ہندی ۔/۶۵
پاک کہانیاں دو حصّوں میں — مقبول احمد سیوہاروی ۲/۳۵
چار یار — الیاس احمد مجیبی ۱/۳۰
خلفائے اربعہ — خواجہ عبدالحئی فاروقی ۲/۲۵
رسول پاکؐ — عبدالواحد سندھی ۱/۸۰
عقائدِ اسلام — مولانا اسلم جیراجپوری ۱/۵۰
مسلمان بیبیاں — مولانا اعجاز الحق قدوسی ۔/۷۵
نبیوں کے قصّے — خواجہ عبدالحئی فاروقی ۱/۲۵
ہمارے رسول — " " " ۱/۶۵
ہمارے نبی — سیّد نواب علی رضوی اردو ۱/۷۵ ۔ ہندی ۔/۴۰

معلومات

آدمی کی کہانی — مشتاق احمد ۱/۲۵
انوکھا عجائب خانہ — محمد حسین حسّان (۴ حصّے) ۱/۸۰
بجلی کی کہانی — علی احمد خاں ۔/۵۰
بڑے دادا کی کہانی — عبدالغفور ۔/۶۵
تاریخ ہند کی کہانیاں اوّل — خجستہ سلطان ۔/۸۰
" " " دوم — ضیاء الرحمٰن ۱/۔
" " " سوم — مشتاق احمد اعظمی ۱/۸۰
" " " چہارم " " ۔/۹۵
چٹانوں کی کہانی — محمد امین ۔/۷۵
خبر رسانی کے طریقے — رقیہ منظور الامین ۔/۸۵
دنیا کے بچے — محمد حسین حسّان ۔/۸۰
دنیا کے بسنے والے — بشیر حسین زیدی ۔/۷۵

دہلی — ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی ۱/۸۰
رابندرناتھ ٹیگور — صفدر حسین ۱/۲۵
سماجی زندگی اوّل — احمد شبیل و غلام ابرار ۔/۶۵
" " دوم " " " " ۔/۸۰
" " سوم " " " " ۔/۸۱
سمندر کے کنارے — سلطانہ آصف فیضی ۱/۳۰
سمندر کے نیچے " " " ۲/۔
قدرت کے کرشمے — ادارہ ۔/۶۲
میرا نیس — محمد حسین حسّان ۱/۲۵
ہماری پارلیمنٹ — کیلاش چندر ۱/۵۰

کہانیاں، ڈرامے اور ناول

اس نے کیا کرنہ جانا (کہانی) — آصفہ مجیب ۔/۳۷
پریم کی جیت (ڈراما) — اسد اللہ کاظمی ۔/۳۷
تابیل خاں (کہانی) — محمد حسین حسّان ۔/۳۰
ترکوں کی کہانیاں (کہانیاں) — مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔/۵۵
جمیس بارخاں کے کارنامے (ناول) — م ۔ ندیم ۱/۶۵
تین آنا ڑی (ناول) — عصمت چغتائی ۱/۴۰
چقماق کی ڈبیہ (کہانی) — برکت علی فراق ۔/۴۰
چھاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی) — محمد معین ۔/۳۵
ستاروں کی سیر (ناول) — کرشن چندر ۱/۷۵
کوے دادا (سچا ناول) — مجیب احمد خاں ۱/۷۵
لال مرغی (کہانی) — عبدالواحد سندھی ۔/۵۰
مزہ چکھائیں گے (کہانی) — مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔/۳۵
مزے دار پہیلیاں (پہیلیاں) — محمود علی خاں ۔/۶۵
ننھا ٹٹو (کہانی) — خورشیدہ سلطان ۔/۳۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ جامعہ نگر نئی دلی ۲۵

بچوں سے باتیں

مئی کا مہینہ جامعہ والوں کے لئے خاص طور سے رنج و غم کا مہینہ ہے اس مہینے نے جامعہ والوں کے لئے تاریخی حیثیت اختیار کرلی ہے، مخدوم و محترم ذاکر صاحب اسی مہینے تو اچانک ہم سے جدا ہو گئے تھے۔

ذاکر صاحب یوں تو سب کے تھے۔ سارے دیس کے تھے مگر جامعہ والوں سے تو ان کا رشتہ ایسا تھا جیسا ایک کنبے کے بزرگ کا ہو۔ ذاکر صاحب نے ٹوٹی پھوٹی شکستہ حال جامعہ کو اپنے مخلص ساتھیوں کی مدد سے رات دن ایک کرکے ایسا بنا دیا کہ تھوڑے ہی دنوں میں سارے دیس کی نگاہیں اسی پر اٹھنے لگیں اور اب جامعہ کا قدم برابر آگے کی طرف ہے تو یہ سمجھ لیجئے کہ یہ ان کی اور ان کے ساتھیوں کی محنت کا پھل ہے۔ انھیں کے خلوص کی برکت ہے۔

ہمارے محترم حفیظ صاحب نے ذاکر صاحب پر مضمون لکھنے کا وعدہ کیا تھا اور باوجود انتہائی مصروفیت کے وقت کے وقت ایک اچھا سا مضمون مرحمت فرمایا۔

جامعہ نے مرحوم کی یادگار میں ایک علمی ادارہ بھی ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے نام سے قائم کر دیا ہے اس نے کام بھی شروع کر دیا ہے اور آئندہ اس سے بہت امیدیں ہیں۔ ہمارے دیس کی سرکار مرحوم کے شایانِ شان مقبرہ بھی بنوا رہی ہے۔ ذاکر حسین میوزیم کے لئے عمارت بھی بنوا رہی ہے۔ مقبرے کی عمارت چند دنوں میں مکمل ہو جائے گی۔

پچھلے مہینے ایک اور بزرگ شخصیت اس دنیا سے اٹھ گئی۔ حضرت مولانا فخر الدین کا نام شاید آپ نے سنا ہو جمعیۃ العلمائے ہند کے صدر تھے، دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے بعد دیوبند میں اونچے درجے کو وہی حدیث پڑھاتے تھے۔ لگ بھگ پچاس برس سے پڑھنے پڑھانے کا شغل جاری تھا۔ بہت دنوں مرادآباد کے مدرسے میں رہے۔ اب پندرہ برس سے دیوبند میں یہی خدمت انجام دے رہے تھے۔ اس دینی کام کے ساتھ ساتھ آزادی کی لڑائی میں بھی پورا حصہ لیا کئی بار جیل بھی گئے۔ بڑی بھاری بھرکم اور باوقار شخصیت تھی۔ خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ اور ان کے عزیزوں کو صبر کی توفیق دے۔

کہانی نمبر کی تیاری شروع ہو گئی ہے۔ محترم غلام ربانی صاحب مجتبیٰ یزدانی صاحب (حیدرآباد) کی کہانیاں آگئی ہیں محترمہ رضیہ سجاد ظہیر صاحبہ کی کہانی بھی آگئی محترم حفیظ الدین صاحب ندوی بہت مزے کی بہت اچھی کہانی لکھ رہے ہیں۔ جناب خلیق انجم اشرفی جناب فرحت قمر، جناب غلام حیدر، جناب حلیم ندوی، جناب اجتبا ندوی صاحب نے وعدہ کیا ہے۔ اپنی بیماری کی وجہ سے میں فرداً فرداً خط نہیں لکھ سکا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے کرمفرما خصوصاً جناب خاور جبل پوری، جناب یوسف ناظم اور دوسرے ساتھی اس تحریر کو میری درخواست سمجھ لیں گے اور نوازش فرمائیں گے۔ ہاں حمید عثمانی صاحب (الہ آباد) کی کہانی بھی انشاء اللہ دفتر میں پہنچ جائے گی۔ تمام مواد فراہم ہوتے ہی کہانی نمبر کی اشاعت کا اعلان کر دیا جائے گا۔

اس بیماری کی وجہ سے میں گھر سے نہیں نکل پاتا ہوں

اور مجھ میں اور خوشنویس یا کاتب صاحبان میں فاصلہ کچھ اور زیادہ ہو گیا ہے۔ اس گڑبڑ کی وجہ سے کئی مستقل عنوان شامل نہیں ہو سکے۔ ابن بطوطہ والے مسلسل مضمون کی قسط بھی نہ چھپ سکی ڈاک گھر کی تیسری قسط بھی حبیب عثمانی صاحب وقت پر نہ بھیج سکے یہ دونوں مضمون اور دوسری دلچسپ چیزیں اگلے پرچے میں پڑھیے گا۔

ہم نے پچھلے پرچے میں محترم رشید حسن خاں کے مضمون کا ذکر کیا تھا۔ وہ اس پرچے میں چھپ رہا ہے اسے ضرور پڑھیے آپ کے کام کی بہت کام کی چیز ہے۔ رشید حسن خاں صاحب نے اسے بہت دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ آپ پڑھنا شروع کریں گے تو بس پڑھتے ہی چلے جائیے گا مضمون خاصا لمبا ہے۔۔ قسطوں میں چھپے گا۔

اس کے علاوہ محترمہ صالحہ عابد حسین کی ایک دلچسپ کہانی ہے اور آج کل کے آتے خطوں کے مطابق محترمہ کئی مہینے سے بیمار ہیں۔ صحت کے لیے دعا کیجیے۔ پیام تعلیم نیا ایڈیٹر پیام تعلیم پر شفقت فرماتی ہیں۔ پیام تعلیم کے لیے نیا کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی ہیں۔ بہت سے مضامین، قصوں، کہانیوں کے علاوہ ان کی دو چیزیں "عجب الدماغ" اور "سفرنامہ ترکی و ایران" شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ دونوں ان شاء اللہ جلد کتابی صورت میں شائع ہوں گی۔

اس کے علاوہ دو اور کہانیاں پڑھیے۔ سب سے بڑا پاپی اور ... صاحب کی مزے دار کہانی ... اور ... ایک بہت ہی مزے دار ... کی کہانی۔ گاؤں کی شادی۔ اس کے علاوہ بہت سی اچھی اچھی نظمیں۔ پچھلے دنوں ... کا ... واقعہ ... تھا۔ اس کا حال بھی خلیق انجم صاحب کی زبان سے سنیے۔

خلیق انجم صاحب آپ کے ایک بہت ہی اچھے ناول کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس کی پہلی قسط بھی جون کے پرچے سے شروع ہوگی۔ ناول کا نام ہے "مونگے کا جزیرہ"۔

مکتبہ پیام تعلیم کی سرگرمیاں بھی جاری ہیں۔ اب تک دس کتابیں تو شائع ہو چکی ہیں۔ تین اور کتابیں ۱۔ عقل کا سودا۔ ۲۔ جنگل کا بادشاہ ۳۔ بدنصیب شہزادی۔ انشاء اللہ بہت جلد بازار میں آجائیں گی۔

ہمارے عزیز دوست اظہر افسر صاحب اب سے نہیں تیس چالیس سال سے بچوں کے ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ مدح و ستائش کی تمنا کے بغیر اپنی دھن میں لگے ہیں۔ ان کا یہ کام انعام و اکرام سے بالاتر ہے۔

ابھی ابھی یہ خوش خبری ملی ہے کہ ادارہ ترقیٔ و اشاعت اردو کمیٹی نے اس سال اظہر افسر صاحب کے ڈراموں کے مجموعے "بھول ہی بھول" کو انعام کا مستحق قرار دیا ہے۔ ہم اس سلسلے میں اظہر افسر صاحب سے زیادہ اس ادارے کو مبارک باد کا مستحق سمجھتے ہیں جس نے اپنے انتخاب میں اس سوجھ بوجھ سے کام لیا۔

ضروری

پیام تعلیم بہت پابندی کے ساتھ ہر ماہ کی ۷ر تاریخ کو ڈاک کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ کسی مہینے پرچہ نہ ملنے پر زیادہ سے زیادہ ۱۰ر تاریخ تک شکایت کرنے پر دوسرا پرچہ بھیجا جا سکتا ہے اس کے بعد شکایت کے ساتھ ساٹھ پیسے کے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے۔

منیجر

کرامت اللہ اکرام

گرمی کا سورج

اُونچا ہوتا ہے آہستہ آہستہ، تھرّاتا سُورج
چھیڑتا، نغمے پیارے پیارے، صبح کے ساز بجاتا سُورج
کلیوں کے مُنہ چومتا، پیڑوں کو بالے پہناتا سُورج

اوس کے موتی چُن چُن کر جانے کس نگری کو پہنچاتا
کھیلتا ساحل کے پودوں سے، ریتی کا سینہ گرماتا
ندی کے پانی کو بلّور کے ٹکڑے سا چمکاتا سُورج

چاندی کی پوشاک ہے تن پر، چہرے پر ہے نُور کا سہرا
آنکھوں میں ہیرے کی دمک ہے، ماتھے پر ہے تاج سنہرا
اک الّھڑ شہزادے سا نکلا ہے، دھوم مچاتا سورج

چھتوں، منڈیروں کو سہماتا۔ میناروں کو آنکھ دکھاتا
سڑکوں کی چھاتی دہکاتا۔ بازاروں کو آنکھ دکھاتا
کرنوں کے بھالے تانے، میدانوں کو دھمکاتا سُورج

دیپک کا انداز چھپا ہے گرم ہواؤں کی تانوں میں
کمرے ہیں سلگے سلگے سے، آگ بھری ہے دالانوں میں
لو کے سوا نیزے پر آیا بل کھاتا، اٹھلاتا سُورج

جناب رشید حسن خاں

حرفوں کا جادو

آیئے آج آپ کو ایک نئے بزرگ سے ملائیں۔ جناب رشید حسن خاں صاحب سے۔ بڑوں کی دنیا میں تو بہت دنوں سے مشہور ہیں۔ اُردو کے بہت بڑے عالم ہیں یوں کہیئے کہ بہت بڑے ریسرچ اسکالر ہیں۔ ریسرچ اسکالر وہ لوگ کہلاتے ہیں جو علمی مسئلوں کی تحقیق اور چھان بین میں لگے رہتے ہیں۔ رشید حسن خاں صاحب نے بھی ایک مدّت سے اردو زبان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے۔ رات دن اسی میں لگے رہتے ہیں۔ مکتبہ جامعہ کی خاص طور پر سرپرستی فرماتے ہیں۔ مکتبہ ایک عرصہ سے معیاری کتابیں یا کلاسکس شائع کر رہا ہے۔ رشید حسن خاں صاحب نے اس کام میں مکتبے کی خاص طور پر مدد کی ہے۔

ہماری بہت دنوں سے خواہش تھی کہ خاں صاحب سے آپ کے پیام تعلیم کے لئے بھی کچھ لکھوائیں۔ مگر کچھ تو وہ تحقیق کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ کچھ یہ خیال تھا کہ بچوں کے لئے بچوں کی زبان میں لکھنا ان کے لئے مشکل تھا پر اپنے [illegible] ہے کا خیال بھی تھا۔ آخر ایک دن ہمت کر ہی ڈالی اور ایسی چیز لکھ دی کہ بس پڑھ کر دیکھیے۔ خاں صاحب نے سچ مچ جادو جگایا ہے۔ ایسی پیاری نکھری ستھری، ایسی صاف اور سادہ زبان لکھی ہے کہ مضمون پڑھ کر مزہ آجائے گا۔

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھیے کہ جو باتیں مضمون میں لکھی ہیں۔ وہ آپ کے لئے کتنی کارآمد ہیں۔ بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ ان کے مضمون کی پہلی قسط ہے۔ آئندہ سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ خاں صاحب کو یہ احساس ہوگیا ہے کہ وہ بچوں کے لیے بھی لکھ سکتے ہیں۔ اور یہ احساس ہمارے لیے بہت کارآمد ہے۔

(ایڈیٹر)

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ!
وہی زمانہ، جب کھیلنے کے دن ہوتے ہیں اور کہانیوں کی راتیں۔ معلوم نہیں، وہ دن کدھر چلے گئے، وہ راتیں کہاں کھوگئیں! موسم بدلتے ہی سنہرے پرندے لمبی اڑانیں بھر کے، دور بہت دور چلے گئے۔ کب لوٹیں گے، کچھ معلوم نہیں۔ اب اتنے دن بعد کیا لوٹیں گے!

سی نئی دُنیا میں رہ بس گئے ہوں گے۔
سی کیسی کہانیاں سُنی ہیں اُن دنوں۔ بوڑھے ہونٹھوں
ےُ بول آج بھی کانوں میں رس گھول رہے ہیں۔
ے دیو کہ خیال آتے ہی آدمی راستہ بھول جائے۔
پریاں کہ یاد آتے ہی چاندنی پھیل جائے۔ آخر میں
یت اور جھوٹ کی ہار۔ بادشاہ، شہزادے، پیر
،، پریاں، دیو۔ خوف ناک پہاڑ، سنسان جنگل،
موجود۔ کہنے کا وہ ڈھنگ کے لفظوں سے تصویر
ئے۔ ایسا معلوم ہو کہ سامنے، بالکل پاس پرچھائیاں
ہی ہیں۔ اب بڑھیں، اب بولیں، اب کچھ ہوا۔
ٹی سے سیدھے بیٹھ گئے، کبھی ڈر کے مارے
ں دبک گئے۔

اتنے دنوں بعد سب کہانیاں تو کیا یاد رہتیں،
ہی کسی کہانی کا کوئی ٹکڑا اچانک یاد آ جاتا ہے۔
وا کے جھونکے سے راکھ کی تہ ہٹ جائے اور
یاں چمک اٹھیں۔ کل شام کو چھوٹے صاحب
ے خالد، روز کی طرح، اپنی بہن نادرہ سے لڑ جھگڑ
ہے۔ کہانیوں کی کسی کتاب پر چھینا جھپٹی ہو رہی
۔ یہ خالد صاحب بھی کسی کہانی کا کردار معلوم ہوتے
ہن سے لڑیں گے اور باہر دوستوں سے گھل
ے رہیں گے۔ بڑوں کے سامنے سیدھے بن جائیں
جیسے پنڈت شانتا رام کی غریب گلے۔ جہاں
بچی اور ہ ن کی طرح قلانچیں بھرنے لگے۔ پڑھنے
میں بہن سے پیچھے ہیں۔ لڑائی جھگڑے میں آگے
چاہتے ہیں۔ عام طور سے لڑکیاں آج کل پڑھائی
لڑکوں سے آگے ہیں۔ لڑکے بے چارے اس میں
مقابلہ کر نہیں پاتے؛ جھگڑا کیا کرتے ہیں۔ کھسیانی

بلی کھمبا نوچے —— پُرانی سُنی ہوئی ایک کہانی کا دھندلا سا خاکا اچانک سامنے آ گیا اور اب معلوم ہوا کہ اس کہانی میں تو ایک بہت گہری بات چھپی ہوئی تھی۔

کہانی کی شروعات کچھ اِس طرح ہوتی تھی کہ ایک شہزادی شام کے وقت اپنے باغ میں ٹہل رہی تھی۔ ایسی خوب صورت کہ پریاں اس کے سامنے شرما جائیں۔ گلاب کے پھول کی طرح نازک، گنگا کے پانی کی طرح پاک۔ وقت کی بات کہ اُدھر سے ایک دیو، پہاڑ جیسے کالے تخت پر بیٹھا ہوا اڑا چلا جا رہا تھا۔ نیچے جو نظر پڑی تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ نیچے اُتر آیا۔ شہزادی اِس بلا کو دیکھتے ہی غش کھا کر گر پڑی۔ دیو نے اُسے اُٹھا کے اپنے تخت پر رکھ لیا اور سرّاٹا بھر کے اپنے جادو کے قلعے میں جا پہنچا۔

اس شہزادی کا ایک بھائی تھا، بڑا بہادر، بہت سچا۔ وہ قسم کھا کے محل سے نکلا کہ جس طرح بھی ہوگا، اپنی بہن کو اُس دیو کی قید سے چھڑا کر لاؤں گا۔ اللہ کا نام لے کے چل کھڑا ہوا۔ دن رات چلنے سے کام تھا۔ ایک دن ایک جنگل میں گزر ہوا، جہاں ایک بہت بوڑھے درویش خدا کی عبادت میں ڈوبے ہوئے تھے، روشن چہرہ، نورانی داڑھی۔ شہزادہ اُن کے قدموں پر گر پڑا اور اپنی داستان سُنائی۔ اُن بزرگ کو ترس آیا۔ انھوں نے ایک نقش لکھ کر دیا اور کہا کہ جب تم یہاں سے آگے ایک اور جنگل میں پہنچو گے، تو جنگل کے بیچوں بیچ میں ایک قلعہ دکھائی دے گا۔ قلعے کی دکھنی دیوار میں کہیں پر ایک لال پتھر لگا ہوا ہوگا، یہ نقش اُس پتھر پر اپنے ہاتھ سے لکھ دینا اور پھر خدا کی قدرت کا تماشا دیکھنا۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ ہر حرف، ہر لفظ، ہر لکیر، بالکل اسی طرح سے بنے جس طرح اس پرچے میں ہے۔

شہزادہ خدا کا شکر ادا کرتا ہوا آگے بڑھا۔ کئی دن رات چلنے کے بعد ایک ہیبت ناک جنگل میں پہنچا۔ پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ کانٹوں سے کپڑے تار تار ہو گئے تھے۔ سامنے قلعہ تھا، جس کی دیواریں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ شہزادے نے اُس نقش کو لال پتھر پر لکھ دیا۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ ناامیدی نے شہزادے کو بدحواس کر دیا غافل سا ہو گیا۔ اُسی غفلت میں یہ نظر آیا کہ وہی درویش پاس کھڑے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ آنکھ کھول اور دیکھ، تیسری اور چوتھی سطر میں ایک ایک حرف بدل گیا ہے۔ اچانک شہزادے کی آنکھ کھُل گئی۔ پاس جا کے دیکھا تو سچ مچ دو حرف بدل گئے تھے۔ فوراً اُن کو صحیح صحیح لکھ دیا۔ لکھ کر ہٹا ہی تھا کہ بادل گرجنے لگے۔ چاروں طرف دھواں پھیل گیا۔ آسمان سے بجلی تڑپ کے گری اور پتھر کے پاس سے دیوار ٹوٹ کر گر پڑی۔

کہانی تو لمبی ہے اور پوری یاد بھی نہیں۔ لیکن وہ چھوٹی سی بات، جس کی طرف اُس زمانے میں دھیان کبھی نہیں گیا تھا، اب آئینے کی طرح روشن معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ہر لفظ میں ایک خاص تاثیر چھپی ہوئی ہے۔ وہ تاثیر کیا ہے، وہ اُس کے معنی ہیں جن میں اثر چھپا ہوا ہے۔ مگر اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ لفظ کو صحیح صحیح لکھا جائے۔ ہم کو یہ معلوم ہو کہ کس لفظ میں کون کون سے حرف ہیں اور کس ترتیب کے ساتھ ان کو لکھا جائے گا۔ یہ نہ معلوم ہوا اور کوئی غلطی ہو جائے تو لفظوں کی صورتوں میں معنی کا جادو نہیں پیدا ہوگا ساری لکھاوٹ بے کار۔

ایک دفعہ یہ مصیبت مجھ پر بھی پڑ چکی ہے۔ ایسی نصیحت ہوئی کہ آج تک یاد ہے۔ ہوا یوں کہ اُردو پڑھانے والے مولوی صاحب نے ایک دفعہ یہ کہا کہ چھٹی کی ایک درخواست لکھ کر دکھاؤ۔ یہ اسکول کے زمانے کی بات ہے۔ خوشی خوشی درخواست لکھی اور کاپی پیش کر دی۔ خوب جی لگا کے اور بنا بنا کے عبارت لکھی تھی۔ خیال یہ تھا کہ شاباشی بھی ملے گی اور سارے کلاس میں سب سے اچھے نمبر بھی ملیں گے۔ ہوا اُلٹا۔ درخواست شروع اس طرح کی تھی:

بخدمت جناب پرنسپل صاحب۔

جناب عالی، گذارش یہ ہے کہ .....

ان سطروں ہی کو مولوی صاحب نے پڑھا تھا کہ ماتھے پر گہری گہری اور موٹی موٹی شکنیں پڑ گئیں۔ عینک اتار کے میز پر رکھ دی اور آنکھیں نکال کے یوں دیکھا کہ میں تو سہم گیا۔ پھر جو انھوں نے مزاج پوچھا ہے تو توبہ بھلی۔ ذرا دیر کے بعد مولوی صاحب نے فرمایا کہ دیکھو، آج تو سمجھائے دیتا ہوں۔ آیندہ ایسی غلطی ہوئی تو مرغا بنا دوں گا۔ بلکہ پیٹھ پر دوا اینٹیں بھی رکھ دوں گا۔

جی ہاں، اُن دنوں یہ سب ہو سکتا تھا۔

غضب خدا کا میرا شاگرد اور درخواست تک نہ لکھ پائے۔ استغفراللہ، لاحول ولا قوۃ! ایک دو منٹ اس میں نکل گئے۔ خدا خدا کر کے مولوی صاحب نے پھر عینک لگائی۔ یہ اس کا اعلان تھا کہ غصّہ ختم اور پڑھائی لکھائی شروع۔

اب مولوی صاحب نے بتایا کہ دیکھو میاں! ان دو سطروں میں دو تو کھُلی کھُلی غلطیاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ تم نے جناب کے ساتھ صاحب بھی لکھا ہے۔ یا تو شروع میں جناب لکھو، یا آخر میں صاحب۔ دونوں لفظوں

کا مطلب تو ہوا جیسے تم کہو: آئس کریم کا برف۔ یا جیسے انگریزی میں کہو: بلنڈر مسٹیک .... ارے بھائی! پرانے لوگوں کی باتیں چھوڑو۔ وہ لوگ تو دو تین سطروں میں القاب آداب لکھا کرتے تھے۔ رات گئی، بات گئی۔ وہ دن ختم ہوئے وہ روش اٹھ گئی۔ اب نئی زندگی کی صبح طلوع ہو چکی ہے۔ اور ہر چیز قاعدے قرینے کے سانچوں میں ڈھال کر، سلیقے سے سجائی جا رہی ہے۔ اب اِن قاعدوں کی پابندی لازم ہے۔ لہٰذا یاد رکھو کہ خط ہو، عرضی ہو، کوئی اور کاغذ ہو، نام کے ساتھ بس ایک لفظ لکھو۔ یہ نہیں کہ جیسے "بہ خدمت جناب لالا رام پرشاد صاحب" لکھ ڈالا۔ جس طرح بہت سے لوگ خطوں کے پتوں میں اور خطوں کے شروع میں لکھا کرتے ہیں۔ ارے بھئی! تم تو اسکول میں پڑھتے ہو۔ تم بھی انھی سب کی طرح لکھنے لگے تو پھر فرق کیا رہا۔ "جناب لالا رام پرشاد" لکھو یا "لالا رام پرشاد صاحب" لکھو۔ فالتو لفظوں کے ردّے کیوں جماتے ہو۔ یاد رکھو کہ زیادہ غلطیاں اسی لیے ہوا کرتی ہیں کہ لوگ ضرورت سے زیادہ لفظ استعمال کیا کرتے ہیں۔ بات چیت میں ہو یا لکھائی میں، بات ایک ہی ہے۔

دوسری غلطی اِس سے بھی زیادہ بڑی ہے۔ اور یہ تو ایسی غلطی ہے کہ اِس پر تو تم کو آج ضرور مرغا بننا چاہیے تھا۔ خیر تم نے گزارش، ذال سے لکھا ہے۔ اس کے معنی ہوئے چھوڑنا۔ بھلا عرض کرنے اور چھوڑنے میں کتنا فرق ہے؟ اندھیرے اجالے والا فرق ہے۔ عرض کرنے اور پیش کرنے کے معنی میں گزارش کو ز سے لکھا جائے گا۔

لگے ہاتھوں اِسی خاندان کے دو چار لفظ اور بھی یادداشت کی کاپی میں ٹانک لو۔ یہ لفظ بھی عام طور سے تحریر میں آتے رہتے ہیں۔ اچھا، پہلے جڑ کو پکڑو، تاکہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جائے۔ فارسی میں ایک مصدر ہے: گذشتن۔ اس کے معنی ہیں: گزرنا۔ اس میں ز نہیں، ذال ہے۔ اس سے جتنے لفظ بنیں گے، وہ سب ذال سے لکھے جائیں گے۔ ان سب لفظوں میں گزرنے اور چلنے کے معنی پائے جائیں گے۔ اب لفظ لکھو: گذشتہ۔ اس لفظ کے معنی ہیں: پچھلا، گزرا ہوا۔ جیسے گذشتہ مہینے میں کھیل ہوا تھا۔ اسی طرح یارانِ گذشتہ۔ یعنی گزرے ہوئے دوست، وہ دوست جو اس دنیا سے جا چکے ہیں۔

اسی طرح رہ گذر، راستے کے معنی میں۔ ابھی یہ دو ہی لفظ کافی ہیں۔ اب بات یہ ہوئی کہ گذشتہ اور گذر کو ہمیشہ ذال سے لکھا جائے گا۔ جیسے رہ گذر۔ گذرگاہ۔ یارانِ گذشتہ۔ گذشتہ لوگ۔ درگذر (چھوڑ دینا۔ معاف کر دینا)

گزارش کو ہمیشہ ز سے لکھا جائے گا۔ اس کے معنی ہیں: پیش کرنا۔ عرض کرنا۔ اگر اس کو ذال سے لکھ دو گے تو معنی ہو جائیں گے: چھوڑنا۔ یہ بالکل دوسرا لفظ بن جائے گا۔ یہ خاندان ہی دوسرا ہے۔ اِسی طرح ایک اور لفظ ہے: کارگزاری۔ اِس میں بھی ز ہے۔ یہ اسی گزارش کا ٹکڑا ہے کہتے نہیں ہیں کہ "کیا کارگزاری دکھائی ہے"؟

یہ لفظ گذشتہ، گذرگاہ، راہ گذر۔ اور گزارش۔ سب فارسی سے چل کر اردو میں آئے ہیں۔ اصل میں فارسی زبان کے لفظ ہیں۔ لیکن اب ہمارے اپنے ہیں۔

گزرنا، خاص اردو کا لفظ ہے اس کو ہمیشہ ز سے لکھا جائے گا۔ گزرا، گزر گیا، گزر گئے۔ اسی سے ایک اور لفظ بنتا ہے: گزارا۔ جیسے: گزارے بھر کی رقم مل گئی۔ یا: جیسے تیسے گزارا ہو رہا ہے۔ یا جیسے: ہمارا ان کے گھر گزارا نہیں ہوگا۔ ہر جگہ ز لکھی جائے گی۔

(باقی)

منہ سے کہنا اور کرنا اور ہے

جناب شفیع الدین نیرؔ

ایک دن کا ذکر ہے سنئے ذرا — مل کے کچھ چوہوں اک جلسہ کیا
اپنے جلسے کی بڑھائی قدر بھی — اک چوہے کو بنایا صدر بھی
مدعا یہ تھا کہ بلی سے بچیں! — اس کے حملوں سے سلامت رہ سکیں
سب نے کی کوئی نہ کوئی چیز پیش — ہوگئی آخر میں یہ تجویز پیش
گھنٹی اک اس کے گلے میں ڈال دیں — یوں بلا بلی کی سر سے ٹال دیں!
دور سے گھنٹی کی جب آواز آئے — چوہا ایک ایک اپنے گھر میں بھاگ جائے
سب نے اس تجویز کی تائید کی — ہوگئی چوہوں کے گھر میں عید سی
واہ وا کا غل ہوا اس بات پر — تالیوں سے گونج اٹھے دیوار و در

اک چوہا ان میں کچھ ایسا بھی تھا — جس نے کھائی تھی زمانے کی ہوا
پہلے تو تجویز ان سب کی سنی — اس نے آہستہ سے پھر تقریر کی
یہ طریقہ گو بظاہر خوب ہے — اس سبب سے آپ کو مرغوب ہے
چاہیئے لیکن ذرا سا غور بھی — سوچیئے اس بات کو کچھ اور بھی
بات اتنی سی مجھے دیجئے بتا — کون گھنٹی باندھنے کو جائیگا!
سن کے یہ باتیں ہوئے خاموش سب — ہوگیا کافور ان کا جوش سب

منہ سے کہنا اور ہے کرنا ہے اور
کیجیئے اس بات پر نیرؔ کی غور

(پیام تعلیم جون ۱۹۳۷ء سے)

عابد عد یطاالدین

تین سال بیت گئے

دن گزرتے دیر نہیں لگتی۔ ذاکر صاحب کو جدا ہوئے تین برس ہو گئے۔ ایسا لگتا ہے آنکھ جھپکتے یہ مدت گزر گئی۔ نہ معلوم ایسے کتنے برس گزر جائیں گے مگر ان کی یاد دلوں میں تازہ رہے گی۔ یہی مئی کا مہینہ تھا جس میں حسنِ اخلاق کی یہ تصویر مٹ گئی۔

اچھوں کی یاد کے لئے، کسی موسم، کسی مہینے، کسی دن یا کسی مقررہ وقت کی قید نہیں ہے۔ وہ منوں خاک کے نیچے دبے رہتے ہیں۔ ان کا جسم مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے مگر ان کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں میں سمائی ہوتی ہے تصور میں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔ ایک ایک بات پر ان کی خوش ادائی یاد آتی ہے۔

مرنے والوں کو یاد کر کے ہم ان پر احسان نہیں کرتے نہ وہ ہماری یادوں کے محتاج ہیں جو کچھ نیکیاں اور اچھے کام اس دنیا میں وہ کر گئے ہیں۔ وہ ان کا ترکہ اور ورثہ ہے۔ جو ہمارے لئے وہ چھوڑ گئے ہیں۔ اس کی جزا تو انھیں خزانہ غیب سے ملے گی مگر ہم اس میں کچھ اضافہ کر سکتے ہیں نہ کمی البتہ اس نیکی کی دولت سے ہم اپنی زندگیوں کو سنوار سکتے ہیں۔

ذاکر صاحب کی ذات ایسی نیکیوں اور خوبیوں سے بھری ہوئی تھی کہ عمل کی کسوٹی پر پرکھو تو خالص سونے کی طرح کھری نکلتی تھیں اور جو ان کے جتنے قریب ہوتا تھا اتنا ہی ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ نیکیوں کے سردار ہمارے آقا رسول اللہ کے متعلق تاریخ کے صفحے گواہی دے رہے ہیں کہ جو ان سے جتنا قریب تھا اتنا ہی وہ ان کی سچائی اور نیک کرداری کا قایل تھا چنانچہ ان کی نبوت کا اقرار کرنے والے اور ان کی سچائی پر ایمان لانے والوں میں سب سے پہلے ان کی رفیقہ حیات (بیوی) بھائی اور قریبی لوگ تھے۔ اخلاق کی یہ خوبی سنت رسول کہلاتی ہے۔

ذاکر صاحب ایک سچے اور اچھے مسلمان تھے۔ وہ رسول کی سنتوں پر عمل کرنا اخلاق و انسانیت کی معراج سمجھتے تھے اسی پاک سنت کا سایہ ان کی زندگی پر پڑا تھا۔ جو لوگ رات دن ان سے واسطہ رکھتے تھے اندر اور باہر سے ان کی زندگی کو ہر روز ہر لمحہ دیکھتے تھے آج وہ ان کے دین و ایمان کی پاکیزگی کے سچے گواہ ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا بدبخت ہو جس پر سایہ بھی پڑ گیا ہو اور ان سے منحرف رہا ہو۔

سوائے پیغمبروں کے کوئی ایسا انسان نہیں ہے جس سے خطائیں اور غلطیاں نہ ہوئی ہوں۔ ذاکر صاحب بھی اپنی اونچی سے اونچی نیکیوں اور خوبیوں کے باوجود ایک انسان تھے۔ وہ اس بات سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ حالی نے کیا اچھی فکر کی بات بتائی ہے

نیکوں کو نہ بد ٹھہراؤ اے فرزند
ایک آدھ ادا ان کی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص نہیں انار کی لطافت میں
ہوں اس میں اگر گلے سڑے دانے چند

ان کی زندگی کو انصاف کے ترازو میں تولو تو معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں ایسے انسانوں کا پیدا ہونا، خاندان، سماج، علم کی برکتوں کے علاوہ فیض نبوی کا پرتو بھی تھا۔ ایمان کی خوشبو اور اسلام کا چلن ان

ذات میں ایسے جمع ہو گئے تھے کہ انھیں دیکھ کر غیر مسلموں کے دلوں میں اسلام کی عظمت و وقار بڑھتا تھا۔ مسلمانوں کا ایمان تازہ ہوتا تھا وہ سچ مچ ایک پیر و مرشد کے منصب پر فائز تھے۔ ان میں جذب و کشش ان کے اسلامی اخلاق کی بدولت تھی۔ ان کی توجہ سے نہ معلوم کتنے دلوں کی بجھی ہوئی چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھی کتنے مردہ دلوں میں زندگی کی سوت جاگ گئی۔

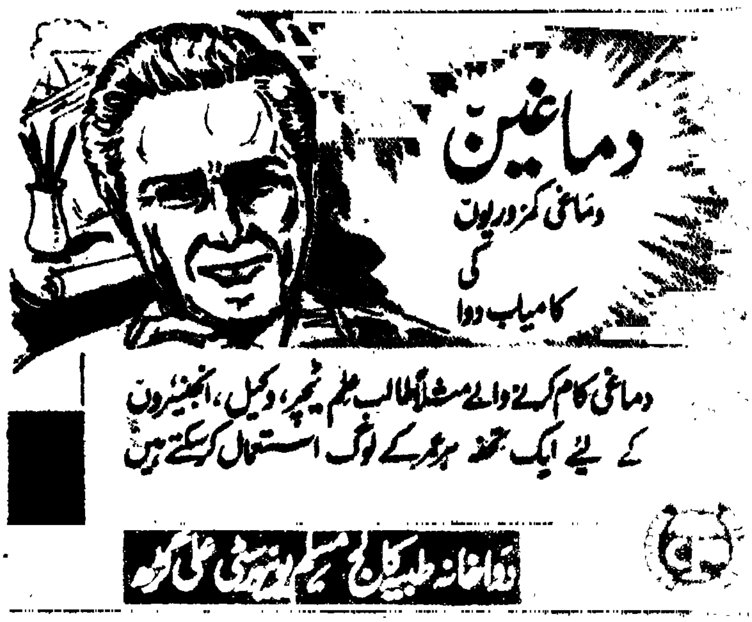
وہ دراصل انسان گر اور مسیحا تھے۔ انھوں نے بے شمار انسانوں کو ان کی کھوئی ہوئی انسانیت ڈھونڈ ڈھونڈ کر عطا کی اور دل پر ایک عالم کا اتنا بوجھ اٹھایا۔ کہ اس کا اٹھنا ان کے بس سے باہر ہو گیا اور اسی بوجھ تلے دب گئے۔

ڈاکٹر صاحب اتنے اچھے اور اتنے بڑے انسان بنے بنائے ہوئے نہیں پیدا ہوئے تھے اور نہ خاندان و سماج کی قینچیوں سے ان کی تربیت کی تھی اور نہ استادوں کی نگرانی نے انھیں اتنا سنوار دیا تھا۔ بے شبہ یہ چیزیں بھی ان کی زندگی کو خوبصورت بنانے میں مدد دیتی رہیں لیکن دراصل ان کا اچھا کردار ان

بے سوچ بچار کر اچھے کاموں سے چننے اور ان کو پورا کرنے کے لیے اپنے میں شکتی، صلاحیت اور قابلیت پیدا کرنے کی لگن سے پیدا ہوا، اور یہ لگن ایک دو روز کی نہ تھی زندگی بھر مسلسل آخری سانس تک ساتھ لگی رہی جس نے انھیں ایک اچھا ہادی صحیح رہنما، پکا مسلمان اور ساتھیوں کے دلوں میں گھس جانے والا اور گھس کر لگن پیدا کر دینے والا حبیب و محبوب بنا دیا۔ ان کی سوانح عمریاں لکھی جا رہی ہیں اور لکھی جائیں گی چھوٹوں کے لیے بھی بڑوں کے لیے بھی ممکن ہے اُن سے۔

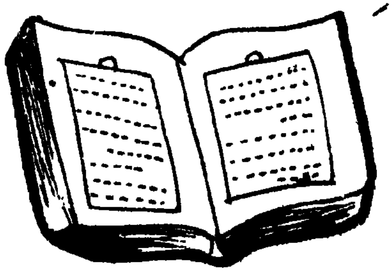
بہت سے سبق آموز (سبق سکھانے والے) واقعات پہلی بار لوگوں کے سامنے آئیں گے۔ ان کی زندگی پر سے بہت سے پردے پڑے ہوئے تھے۔ یہ پردے اٹھنے سے پہلے وہ پردہ کر گئے۔ جب زندگی کے ان گوشوں پر روشنی پڑے گی تو سب جانیں گے کہ کیسی بے بہا دولت ہم سے چھن گئی اور تہ خاک ہو گئی۔ ع

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔



جناب حافظ تقوی

کتاب



جگمگاتے علم کے موتی مرے دامن میں ہیں!
رنگ چھلکاتے، مہکتے گل مرے گلشن میں ہیں
علم کے انمول ہیروں کی دمکتی کان ہوں
اور ہر پروانۂ علم و ہنر کی جان ہوں
شمع ہے علم اور میں اس شمع کا فانوس ہوں
علم کا نغمہ جو گاتا ہو وہی ناقوس ہوں
مجھ میں ہیں محفوظ صدیوں کے پرانے واقعات
مجھ میں قصّوں اور فسانوں کی بسی ہے کائنات
علم و حکمت کے خزانوں کا امیں ہے میرا دل
میں نہ ہوتی تو نہ ہوتا علم تم تک منتقل
مجھ میں ہیں لکھے ہوئے پیغام ربِّ پاک کے
سچ جو پوچھو تو یہ ہیں انعام ربِّ پاک کے
جس سے باقی ہے نشانِ علم و فن ہے میری ذات
جس سے ہے شادابِ حکمت کا چمن ہے میری ذات
میں ہوں تنہائی کی ساتھی، میں ہوں انساں کی شفیق
میرے ہی دم سے تو پاتے ہیں سکوں میرے رفیق۔
چاہتے ہیں جو مجھے ہوتے ہیں وہ سب کامیاب
پیارے بچّو! میں تمھاری ہوں وہی پیاری کتاب

آصفہ مجیب

ایک ہو جاؤ

کشمیر کے ایک گاؤں میں ایک ہرا بھرا باغ تھا پھولوں کی عجب بہار تھی معلوم ہوتا آکاش پر تارے کھلے ہیں۔ لالہ کے چراغ سے جل رہے تھے۔ سنبل اور بنفشہ پھولا ہوا۔ چشمے جاری۔ ہوا خوشبو سے مہکتی تھی۔ وہاں شکار بہت تھا۔ شکاری جال لگا کر چڑیاں پکڑا کرتے۔

ایک کوّا مدتوں سے ایک اونچے پیڑ پر رہتا تھا۔ اسے اپنا وطن بہت عزیز تھا۔ شاخ پر بیٹھا اوپر نیچے دیکھا کرتا۔ ایک دن ایک شکاری جلدی جلدی پیڑ کی طرف آ رہا تھا۔ کوّا ڈر گیا کہ شاید اسے پکڑ لے۔ گھنے پتوں میں چھپ کر جھانکنے لگا کہ اب وہ کیا کرتا ہے۔ پیڑ کے پاس آ کر شکاری نے جال بچھایا اور دانا بکھیر کر چھپ گیا۔ ذرا ہی دیر میں کبوتروں کا ایک جھنڈ کا جھنڈ آیا۔ ان میں ایک، سب کا سردار تھا۔ اس کا نام مطوقہ تھا۔ وہ بڑا عقلمند تھا۔ سب اس کی بات مانتے تھے۔ اس کے کہنے پہ چلتے تھے۔ اسی میں اپنی بھلائی دیکھتے تھے۔

دانے پر جو نظر پڑی، کبوتر اُدھر لپکے۔ مطوقہ نے منع کیا "دوستو ٹھہرو، ہوشیار رہو۔ ہر دانے کے پیچھے ایک جال بچھا ہوتا ہے۔" کبوتر بھوک سے بے تاب تھے۔ ان پر نصیحت کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ مطوقہ نے جب دیکھا کہ یہ حریص کچھ نہیں سن رہے ہیں خود ان سے الگ ہونا چاہا مگر تقدیر اسے بھی کھینچ لے گئی۔ ایک دم سب دانے پر ٹوٹ پڑے۔ دانا منہ میں جانا اور جال میں پھنسنا۔

مطوقہ چیخ پڑا "میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ سوچ لو بے سوچے سمجھے کام کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔"

کبوتر بڑے حیران اور شرمندہ تھے۔ شکاری دوڑ کر آیا وہ بڑا خوش تھا کہ اتنے بہت سے کبوتر ہاتھ لگے اب تو چاندی ہی چاندی ہے۔ کبوتروں کی جو اس پر نظر پڑی تو گھبرا کر پھڑپھڑانے لگے اور سب اپنی اپنی طرف سر پر پٹخ کر جال سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔

مطوقہ نے سمجھایا "دوستو تم سب الگ الگ جال سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہو۔ دوسروں کی پروا نہیں۔ دوستی کا تقاضہ یہ ہے کہ سب مل کر ایک دوسرے کو چھڑانے کی کوشش میں لگ جاؤ۔ ساتھ ساتھ ایک دل ایک جان ہو کر بازوؤں کی قوت آزماؤ۔ ممکن ہے کہ دوستی اور اتفاق کی برکت سے آزادی پاؤ۔"

کبوتروں نے اس کی بات مان لی۔ ان میں جیسے نئی جان آ گئی۔ ایک مرتبہ مل کر جو سب نے زور لگایا جال زمین سے اکھڑ گیا۔ وہ جال سمیت اُڑ گئے۔ شکاری ہکا بکا رہ گیا۔ پھر بھی اس امید میں کہ یہ تھک کر گر جائیں تو پکڑ لے، پیچھے بھاگا۔

کوے نے سوچا کہ یہ تو عجیب ہی واقعہ ہے۔ شاید مجھ پر بھی کبھی ایسا وقت پڑے تو دیکھنا چاہیے کہ اب یہ کیا کریں گے۔ اور وہ کبوتروں کے پیچھے اڑ گیا۔ شکاری لالچ میں ان پر نظریں جمائے دوڑ رہا تھا۔

اِدھر مطوقہ کے اشاروں پر اس کی قوم اڑی چلی جا رہی تھی۔ جب دیکھا کہ شکاری پیچھا نہیں چھوڑ رہا ہے تو آبادی کی طرف اڑ گئے۔ شکاری کی نظروں سے اوجھل ہو گئے اور وہ مایوس ہو کر لوٹ گیا۔

اب کبوتروں کے حواس ذرا ٹھکانے ہوئے انھوں نے مطوقہ سے پوچھا "اب ہم جال سے کیسے نکلیں گے؟" اس نے سوچ کر جواب دیا "میری رائے میں بغیر کسی مخلص دوست کی مدد کے ہم اس مصیبت سے نہیں چھوٹ سکتے۔ قریب ہی میرا ایک گہرا دوست چوہا رہتا ہے۔ اس کا نام زیرک ہے۔ ممکن ہے وہ ہمیں اس بلا سے چھڑائے۔

وہ ایک ویرانے میں ایک بل کے پاس اترے۔ چوہا دوست کی آواز سن کر فوراً باہر نکل آیا۔ اس حال میں اسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پوچھا "میرے دوست بڑا تعجب ہے اتنے عقل مند ہو کر تم کیسے اس آفت میں پھنسے؟"

مطوقہ نے حسرت سے جواب دیا "بھائی تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ دانا دیکھ کر عقل پر پردہ پڑ گیا۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ وہ لوگ جو علم، عقل، سوجھ بوجھ اور بڑائی میں مجھ سے کہیں زیادہ ہیں تقدیر پر ان کا بھی کچھ زور نہیں چلتا۔"

زیرک نے تسلی دی "سچ کہتے ہو۔ اور پریشان نہ ہونا چاہیے خدا کے سب کام مصلحت کے ہوتے ہیں۔ اس میں ضرور ہماری کچھ بھلائی ہوتی ہے۔ پھول میں کانٹے ہوتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ مطوقہ کے پھندے کاٹنے لگا۔ اس نے روکا "دوست پہلے میرے دوستوں کے بند کاٹو بعد میں میرے۔" چوہے نے سنی ان سنی کر دی۔ اس نے پھر کہا "اگر تم چاہتے ہو کہ میری تمھاری دوستی بنی رہے تو میری بات مانو پہلے میرے دوستوں کو چھڑاؤ۔ تو تمھارا مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔"

زیرک بولا "حد کر دی تم نے۔ تمھیں اپنی ذات کی پرواہ نہیں مگر اپنے دوستوں کا حق تو پہچانو۔ ان کی خوشی پوری کرنے دو۔"

مطوقہ نے کہا "مجھے برا بھلا نہ کہو، ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری مجھ پر ہے، اور میں بھی ان ہی مدد سے شکاری کے چنگل سے بچا ہوں مجھے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ مجھے چھڑانے کے بعد تم تھک رک گئے تو شاید ان کو نہ چھڑا سکو لیکن مجھے تو ہر حال میں تم چھڑا ہی لوگے اور وہ قید میں رہیں اور میں چھوٹ جاؤں تو مجھے کوئی خوشی نہ ہوگی۔ مصیبت میں ہم شریک تھے راحت میں بھی ان کا ساتھ چاہتا ہوں۔"

زیرک نے اس کی اچھی عادت اور طبیعت کی تعریف کی اور کہا "اسی وجہ سے ان کو تم پر اتنا بھروسہ ہے اور تم نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا ہے۔" یہ کہہ کر بڑی محنت سے وہ کبوتروں کے بند کاٹنے میں مشغول ہو گیا۔ ایک ایک کر کے سب آزاد ہو گئے۔ وہ آسمان کی طرف سر اٹھائے آزادی کی فضا میں اڑنے کے لیے پر تول رہے تھے شکرانے اور خوشی کے گیت ان کے گلوں سے پھوٹ نکلے۔ چوہے سے رخصت لی اور خوشی کے نعرے لگاتے آشیانے کی طرف اڑ گئے۔

چوہا اپنے بل میں چلا گیا۔ کوے پر ان سب باتوں،

بہت اثر ہوا اور اس کا چوہے سے دوستی کرنے کو بھی چاہا۔ اس نے سوچا اتنے اچھے دوست دنیا میں کہاں ملتے ہیں۔ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔ آہستہ سے بل کے پاس آکر آواز دی۔ چوہے نے پوچھا کون ہے؟ اُس نے کہا۔ "میں کوّا ہوں تم سے ایک ضروری کام ہے۔"

چوہا بڑا عقل مند تھا۔ دنیا دیکھے ہوئے تھا اس نے زمین کے اندر ایسے راستے بنا رکھے تھے جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ جب خطرہ ہوتا بڑی حکمت سے ان سے کام لیتا۔ کوّے کی آواز سن کر غصّے سے بولا "تم کو مجھ سے کیا کام۔ مجھ سے تم سے مطلب؟"

کوّے نے شروع سے آخر تک جو کچھ دیکھا تھا سب حال بیان کیا اور کہا۔ "تمھارا اخلاق، وفاداری اور مروّت دیکھ کر مجھے معلوم ہوا کہ دوستی کا پھل کتنا میٹھا ہوتا ہے۔ اس کی بدولت کبوتروں کی جان بچی اور اسی وجہ سے میرے دل میں تم سے دوستی کی آرزو پیدا ہوئی اور میں نے یہاں آنے کی ہمت کی۔ میں سچے دل سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔"

چوہے نے پیچ و تاب کھا کر جواب دیا۔ "میرے تمھارے بیچ دوستی کا راستہ بند ہے۔ کہیں مشرق اور مغرب مل سکتے ہیں۔ جو چیز ممکن نہ ہو اُسے تلاش کرنا ایسا ہے جیسے خشکی میں ناؤ ترانا، یا دریا میں گھوڑا دوڑانا اور جو ایسی بات کرے اُسے خود اپنی بے وقوفی پر ہنسنا چاہیے۔ چلو یہاں سے میں ایسا شکار نہیں جو کہ تمھارے جنگل میں پھنس جاؤں۔"

کوّے نے سر جھکا لیا اور دُکھ سے بولا۔ "ایسی باتیں نہ کرو۔ میں دنیا کی مصیبتوں سے پناہ لینے تمھارے در پہ آیا ہوں اس کی مٹی سر پر لگاؤں گا۔ چاہے مارو دھکّے دو نہیں جاؤں گا۔"

کوّے نے کہا" اے کوّے بہت باتیں نہ بنا۔ میں تمھاری جنس کو خوب جانتا ہوں۔ تم مجھے اپنا لقمہ بناؤگے۔"

یہ بات تیر کی طرح کوّے کے دل پر لگی۔ پھڑپھڑا کر کہا" زیرک ذرا عقل سے کام لو۔ تمھیں ستا کر مجھے کیا ملے گا اور دوستی کرنے میں ہزار فائدے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی مدد کریں گے کسی پر مصیبت پڑی تو چھڑائیں گے، بھلائی کے کام کریں گے۔ دنیا میں آگ لگی ہے۔ قوم، رنگ، نسل، دھرم پر کٹی مرتی ہے۔ ہم نیا سنسار بسائیں گے۔ دشمنی کو جڑ سے اکھاڑ کر پریم اور ایکتا کے پھول کھلائیں گے۔ کوئی کسی کا حق نہ مارے نہ ستائے۔ میرے سر پہ ہاتھ رکھو۔"

چوہے نے جواب دیا" تم نے تو بیکار کی رٹ لگا رکھی ہے۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ذرا سا بگڑ جاؤگے تو طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لوگے۔ اپنی خصلت پر اتر آؤگے۔ اگر دونوں قوت میں برابر ہوں جب بھی خیر ہے جیسے شیر اور ہاتھی۔ ان دونوں میں کون جیتے گا کہہ نہیں سکتے مگر ایک کمزور ہو تو مانی ہوئی بات ہے کہ ہار اسی کی ہوگی جیسے چوہا اور بلّی۔ بھیڑیا اور بکری ہے۔ زمانہ نے کتنی کروٹیں بدلیں لیکن اس فرق کو نہ مٹا سکا۔ میں تمھارے پاس بیٹھوں تو دنیا مجھ پر ہنسے گی۔" کوّے نے کہا" شکر ہے ہم دونوں میں اصلی دشمنی نہیں ہے اگر میری قوم کو تم سے عارضی عداوت ہو بھی تو میرا دل تو آئینے کی طرح صاف ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تمھارا دل اس کی گواہی دے گا۔"

چوہا سوچ کر بولا" خصلت نہیں بدلتی۔ مجھے ایک

ی کی مثال یاد آرہی ہے حضرت بڑے عقل مند بنتے
ں میری آنکھوں دیکھی بات ہے۔ ایک آدمی نے
تی آگ سے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر سانپ کی
ن بچائی۔ وہ چھوٹتے ہی اسے کاٹنے دوڑا کتنی بڑی
طی کی اس نے بڑی مشکل سے سانپ کو مارا تب
ن بچی۔"
کوے نے سر ہلا کر کہا" تم نے بہت پتے کی بات کہی
ن جواہرات سے میرا دماغ روشن ہوگیا مگر تمہارا
خلاق اور مروّت اس سے بڑھ کر ہے۔ جو اچھے ہوتے
ں جلد دوست بن جاتے ہیں۔ ہمیشہ نبھاتے ہیں سونے
پیالہ دیر میں ٹوٹتا ہے۔ ٹوٹ جائے تو جلدی سے
ڑ جاتا ہے۔ مٹی کا برتن ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ
اتا ہے اور کبھی نہیں جڑتا۔ میری باتیں دل میں رکھ کر
ہم نکال دو۔ دوستی کا دروازہ کھولو، تمہارا دامن
ڑی مشکل سے ہاتھ آیا ہے، اسے چھوڑ کر نہیں
اؤں گا۔ اس وقت تک نہ کھاؤں گا نہ پیوں گا
نہ سوؤں گا۔"
چوہے نے ایک قدم آگے بڑھ کر جواب دیا" میں
ں دل وجان سے تمہارا دوست ہوں، مجھے جو کچھ کہنا
تھا میں نے کہا مگر میرا دل جب سے تم نے بات شروع
ی تبھی سے کھنچ رہا تھا۔ دل میں بجلی سی کوند گئی"۔ یہ
ہہ کر وہ سوراخ کے سامنے آکھڑا ہوا۔ کوا خوشی سے
پھول گیا۔ اُچھل کر کہا" مگر اب بھی کچھ گھبرا رہے ہو؟"
اُس نے کہا" گھبراتا تو گھر سے باہر کیوں آتا
تم سے ملنے کی خوشی میں اور دوستی کے اس اونچے
مقام پر پہنچنے کے لیے جو تم نے بتایا سارے شک اور
شبہے دھول کی طرح اڑ گئے۔ لیکن تمہارے بھائی بند

جو ہیں ان سے ڈر لگ رہا ہے۔ تمہاری طرح تو وہ
نیک نہیں ہوں گے وہ میرا برا چاہیں گے۔"
کوا سینہ تان کر بولا" مجال ہے کسی کی جو میرا
دوست وہ تمہارا دوست ہوگا۔ میرے دوستوں سے
سے یہی شرط ہے جو تم سے اچھی طرح ملے گا ملے چاہے
جیسا غیر ہو۔ اور جو تمہارا بُرا چاہے گا اس کا مجھ سے
کوئی ناتا نہیں ہے چاہے میرا باپ ہو۔ تمھیں کوئی بُری
نظر سے دیکھے گا تو وہیں ڈھیر کر دوں گا۔"
چوہے کا دل ان باتوں سے مضبوط ہوگیا تو وہ
باہر آیا۔ دونوں بہت خوشی سے ملے۔ کوا کئی دن
وہاں ٹھہرا۔ چوہے نے خوب مہمان نوازی کی ایک
دن اس نے کہا" بھائی اب تم یہیں رہا کرو اپنی بیوی
بچوں کو بھی لے آؤ۔ دونوں دوست پاس رہیں گے۔"
کوے نے جواب دیا" ہے تو اچھا مگر یہ جگہ مجھے کچھ زیادہ
پسند نہیں ہے، آبادی کے قریب ہے ہر وقت کھٹکا
لگا رہتا ہے۔ ایک باغ ہے بڑا اچھا خوب سبزہ ہے
میٹھا پانی ہے۔ پھل پھلاری سب کچھ ہے۔ سمجھو جنت
ہے میرا ایک دوست کچھوا بھی وہاں رہتا ہے۔ میرا
جی چاہتا ہے کہ تمھیں وہاں لے چلوں، باقی عمر وہیں
گزار دیں۔ تینوں دوست پاس رہیں گے۔" چوہے نے
خوش ہو کر کہا:" چلو، تم جہاں لے لو میں تیار ہوں۔
تمہارا ساتھ ہو بس اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں چاہیے
تمہارا دامن پکڑ کے اب نہیں چھوڑوں گا۔ یہ میرا اصلی
وطن نہیں ہے۔ یہاں آنے کا قصہ پھر کبھی سناؤں گا۔"
کوے نے زیرک کی دُم چونچ میں پکڑ لی اور
اُڑ گیا۔ جس وقت وہ باغ میں پہنچا اتفاق سے کچھوا
چشمے کے کنارے مزے سے ٹہل رہا تھا۔ ایک سیاہ سایہ

اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ ڈر گیا اور جلدی سے پانی کے اندر چلا گیا۔ کوّے نے آہستہ سے چوہے کو زمین پر اتارا اور دوست کو بلایا۔ کچھوا چھپ چھپ کرتا باہر آیا، خوشی سے جھوم کر بولا: "ارے تم آگئے۔ اتنے دن سے کہاں تھے؟"

کوّے نے سب حال سنایا۔ چوہے سے دوستی ہونے سے کچھوا اور خوش ہوا اور کہا "یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ تم یہاں آگئے۔"

اتنے میں کیا دیکھا کہ ایک ہرن بے تحاشا بھاگا چلا آرہا ہے ایسا لگتا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے۔ اسے پکڑنا چاہتا ہے۔ کچھوا پانی میں کود گیا کوّا درخت پر بیٹھ گیا اور چوہا بل میں گھس گیا۔ ہرن پانی کے کنارے بے ہوش سا کھڑا ہو گیا۔ کوّے نے دور دور تک نظر دوڑائی کہ کوئی ہے یا نہیں مگر وہاں کوئی نہیں دکھائی دیا دوستوں کو آواز دی کہ چلے آؤ۔ دونوں نکل آئے۔ کچھوے نے دیکھا کہ ہرن سہما ہوا پانی کو دیکھ رہا ہے مگر پیتا نہیں ہے۔ کہا "پیاس لگی ہو تو پی لو۔ ڈرو نہیں۔ دوستوں میں آئے ہو۔ کہاں سے آرہے ہو۔" ہرن نے وحشت سے اِدھر اُدھر دیکھ کر جواب دیا "میں اس جنگل میں تنہا رہتا ہوں۔ شکاری ہر وقت میرے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اس وقت ایک بڈھے کو میں نے دیکھا کہ میری تاک میں ہے۔ اس سے بھاگ کر یہاں پہنچا۔"

کچھوا بولا: "بالکل نہ ڈرو یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ جی چاہے تو تم بھی ہمارے دوست بن جاؤ۔ ہم تین ہیں چوتھے تم ہوگے۔ دوست جتنے زیادہ ہوں اچھا ہے ہم بھائی بھائی کی طرح رہتے ہیں ایک کا دکھ دوسرے کا دکھ ایک کی خوشی دوسرے کی خوشی۔ اس میں سب کا بھلا ہے

چوہے نے ہرن کو خوش کرنے کے لیے اچھی سی کہانی سنائی۔ کوّے نے میٹھی میٹھی باتیں کیں۔ ہرن نے دیکھا کتنے اچھے دوست ہیں دل و جان سے ان میں مل گیا ایسی امن اور امان کی فضا اسے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس کی ساری وحشت اور بے سروسامانی کافور ہو گئی۔ دوستوں نے اس کو صلاح دی کہ یہاں سے زیادہ دور نہ جانا بس چشمے کے پاس رہو پاس ہی ایک میدان تھا۔ وہاں سب اکٹھا ہو کر خوب چہلیں کرتے، کھیلتے کودتے۔

ایک دن کچھوا کوّا اور زیرک تینوں ٹھیک وقت سے وہاں پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر ہرن کا انتظار رہا جب زیادہ دیر ہوئی تو فکر ہوئی کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ یہ صلاح ٹھہری کہ کوّا اڑ کر جائے اور اس کی خبر لائے۔

کوّا ذرا سی دیر میں چیختا ہوا آیا سب کے دل دہل گئے کہ کوئی بری خبر لایا ہے۔ اس نے رو کر کہا "بھیا ہرن تو جال میں پھنس گئے۔ سوائے بھائی زیرک کے اس مصیبت سے کوئی نہیں چھڑا سکتا۔ لیکن جلدی کرو۔" چوہا فوراً بھاگا کوّا اسے راستہ بتانے کے لیے ساتھ ہو گیا۔ دوڑ دھوپ کر کے دونوں پہنچے۔ چوہے نے اپنا سر پکڑ لیا اور بولا "یہاں تم کیسے پہنچے اور مصیبت میں پھنس گئے۔" ہرن کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کہا "کیا بتاؤں، میری تقدیر۔" چوہا جال کاٹنے لگا۔ کچھ دیر بعد کچھوا بھی رینگتا ہانپتا وہاں پہنچ گیا اور ہائے وائے کرنے لگا۔ ہرن نے کہا "بھائی تم کیوں آئے۔ تمھارا یہاں آنا تو میری قسمت

بھی بڑھ کر مصیبت ہے۔ تم نے کیوں کٹ کٹ مچایا۔ کہیں شکاری آجائے تو کیا کروگے۔ جال کٹ گیا تو میں تو بھاگ کھڑا ہوں گا۔ یہ دونوں بھی اپنی جان بچالیں گے۔ مگر تم تو نہ بھاگ سکتے ہو نہ مقابلہ کرنے کی طاقت ہے۔" کچھوے نے جواب دیا "کیسے نہ آتا تم یہاں مصیبت میں پڑے ہو۔ میں وہاں کس طرح چین سے بیٹھا رہتا۔ صبر نہیں آیا۔ تم سب کے بغیر جو زندگی گزرے وہ کس کام کی۔ فکر نہ کرو ابھی تم چھوٹ جاؤگے۔ تو ہم سب اطمینان سے چلیں گے۔"

اور سچ مچ شکاری آگیا۔ جال کٹ گیا تھا ہرن چھلانگ مار کر بھاگا کوّا اور چوہا بھی چھپ گیا۔ میاں کچھوے اسی جگہ قطب کی طرح جمے تھے۔ شکاری حیران تھا۔ ہرن غائب ، جال کٹا پڑا ہے۔ یہ کس نے کیا۔ ادھر اُدھر دیکھا کوئی نظر نہ آیا۔ یہ کیا ماجرا ہے۔ دیکھا تو کچھوا پڑا ہوا ہے۔ شکاری کو خالی ہاتھ جانے پر شرم آتی۔ اس نے کچھوے کو اٹھا کر تھیلے میں ڈال لیا۔ اور شہر کی طرف چل پڑا۔

دوست جمع ہوئے اور انھیں پتہ چلا کہ کچھوا پکڑا گیا تو سر پیٹ لیا۔ ایک مصیبت سے چھٹکارا ملا تو دوسری پڑی۔ سب واویلا مچا رہے تھے اور یہی دکھڑا رو رہے تھے۔ آخر کوّا بولا "دوستو ہائے ہائے کرنے سے کیا ہوگا۔ ان باتوں کا وقت نہیں ہے ہمیں اپنے دوست کو چھڑانے کے لیے کوئی تدبیر کرنا چاہیے۔"

چوہا اپنے پنجوں پر کھڑے ہو کر مخاطب ہوا۔ "ایک تدبیر میری سمجھ میں آتی ہے۔ اگر ہرن بڑے ہرن شکاری کے سامنے اس طرح لنگڑاتا ہوا جائے جیسے چوٹ کھائی ہے۔ کوّا اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر ایسا ظاہر کرے جیسے کوّا اُسے نوچنا چاہتا ہے۔ ہرن کو دیکھ کر شکاری سمجھے گا کہ یہ زخمی ہے اور اسے پکڑنے دوڑے گا کچھوے کو کہیں ڈال دے گا۔ ہرن اتنی دیر شکاری کو دوڑائے کہ میں کچھوے کو تھیلے سے نکال سکوں"

دوستوں نے اس کی رائے کو بہت سراہا۔ ہرن اور کوّا جس طرح زیرک نے بتایا شکاری کے سامنے آئے شکاری جھکے میں آگیا اور کچھوے کو زمین پر پھینک کر ہرن کو پکڑنے لگا۔ ہرن لنگڑا لنگڑا کر اسے اپنے پیچھے بھگاتا جاتا۔ اتنی دیر میں چوہے نے تھیلے کا منہ کھول دیا اور کچھوا نکل آیا۔ بہت دیر کے بعد جب ہرن شکاری کے ہاتھ نہ آیا وہ تھک کر چور ہوگیا اسی جگہ واپس آیا۔ اس نے دیکھا جھولا کٹا پڑا ہے اور کچھوا غائب غلّا۔ اس کی حیرت کی انتہا تھی۔ کیسی کیسی باتیں اس نے دیکھیں کوئی ان کو مانے گا۔ ہرن کا جال کٹنا۔ اس کا بھاگنا۔ پھر سوانگ بھر کر سامنے آنا۔ پیٹھ پر کوّے کا منڈلانا۔ اور پھر تھیلے کا کٹنا اور کچھوے کا غائب ہونا۔ یہ سب کس کی حرکتیں ہیں اور یہ سب سوچ کر اس کے دل میں ڈر سا گیا۔ دل میں کہا بھاگو یہاں سے معلوم ہوتا ہے یہاں دیو پری رہتے ہیں۔ یہاں کبھی شکار کھیلنے نہ آنا چاہیے نہ جانوروں کو ستانا چاہیے۔ جھولا پھینک کر بھاگا۔ اور نیت کی کہ خود کبھی نہ آئے گا اور دوسروں کو بھی منع کرے گا۔

اس کے جانے کے بعد سب دوست جمع ہو کر خوشیاں منانے لگے۔ اتفاق اور دوستی کی برکت سے ان کی سب مشکلیں کٹ گئیں۔ پھر کبھی کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑی۔ مل جل کر مزے میں رہتے۔

جناب نسیم شولاپوری

کھیل کے بعد

شام ہوئی تو ٹن، ٹن، ٹن اسکول کی گھنٹی چلّائی۔
شکھ کا سانس لیا سب نے، لو جھنجھٹ سے چھٹی پائی
آئی چہروں پر شادابی، ہونٹوں پر مسکان کھلی!
دل سینوں میں بلّیوں اُچھلا خوف مٹا، تسکین ملی
بستے اپنے گھر میں رکھ کر سب گلیوں میں دوڑ پڑے
ایسا شور مچایا مل کر، دیوار و در گونج اُٹھے
جگّو، موہن، سوہن، انور، ارشد، اجمل بھی آئے
کالے رامو، گورے اطہر، موٹے اکمل بھی آئے
شامو، انجم، دولت آیا، دولت کے بھائی آئے
لنگڑا آتا اور بھی آیا، داور کے ساتھی آئے
ایک سے بڑھ کر ایک کھلاڑی، ایک سے بڑھ کر ایک دلیر
سب کے سب جب آپہنچے تو کیوں ہوتی پھر کھیل میں دیر
ایک طرف میدان جما ہے، کُشتی اور کبڈّی کا
کھیل شروع ہے ایک طرف لنگڑی کا آنکھ مچولی کا

کوئی ٹخ ٹخ ٹخ ٹخ کرتا تانگہ بن کر بھاگے ہے
کوئی چھک چھک انجن بن کر اپنا شور مچائے ہے
کوئی اونچی شاخ پہ چڑھ کر چلاتا ہے زوروں سے
بھاگ رہے ہیں کوئی پیچھے، تتلی، ٹڈوں، بھونروں کے
ڈوری اور پتنگیں لے کر کچھ بھاگے میدانوں میں
جن کو نفرت تھی کھیلوں سے جا بیٹھے وہ باغوں میں
گلی، ڈنڈے، لٹو، بلے، گیند نے سب کو موہ لیا
ڈوب گیا ہر دل خوشیوں میں دن بھر کا دکھ دور ہوا
اے خوشیوں کے راجکمارو، شاد رہو آباد رہو
غم کے پنجوں سے دنیا میں تم ہر دم آزاد رہو
جتنا چاہو، کھیلو، کودو، پھولو، اور پھلو جگ میں
لیکن اس کے بعد پڑھو تم دل سے نام کرو جگ میں

جناب ناظم میواتی سہرامی

سب سے بڑا پاپ

شاید تم اچھی طرح جانتے ہو کہ "نوبل پرائز" علمی و ادبی دنیا کا سب سے زیادہ معزز اور قیمتی انعام ہے یہ انعام دنیا کی ساری زبانوں کے ادب کو سامنے رکھ کر اور خوب اچھی طرح جانچ پرکھ کر کسی کو دیا جاتا ہے۔ اس لیے اس انعام کا پانے والا نہ صرف اپنی زبان بلکہ ساری دنیا میں ادب واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں یہ ادبی انعام آنجہانی رابندر ناتھ ٹیگور کو مل چکا ہے۔ وہ بنگلہ زبان کے سب سے بڑے عالم، ادیب، شاعر اور افسانہ نگار تھے۔ انھیں عالمی ادب میں بھی بہت بلند مرتبہ حاصل ہے۔

موآنو ہمانیت بھی اسپین کے بہت بڑے ادیب شاعر اور ناولسٹ ہیں۔ وہ ایک چوتھائی صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے عالمی ادب میں دنیا کی پست قوموں کے دکھ، درد کی حمایت اور ہمدردی میں بہت کچھ لکھتے رہے ہیں اور انسانی عظمت اور برتری کے وقار کو تسلیم کرانے کے لیے اپنے قلم کے ذریعے ایک انقلاب برپا کرنے کی پیہم کوشش کرتے آرہے ہیں۔ انھیں بھی ادبی مضمون کا "نوبل پرائز" مل چکا ہے۔ اسے ان کی اس عظیم خدمت کے صلہ میں ایک عالمی اعتراف سمجھنا چاہیے۔ آج ہم موصوف کے ایک مختصر افسانہ کے اسپینی زبان سے ہندی ترجمہ کو معاصر "نونیت" کے شکریہ کے ساتھ اردو میں پیش کر رہے ہیں۔

بوگا دس ہزار غلاموں کا آقا اور موروں کا ایک سردار ہے۔ وہ سسرال جانے کے لیے تیار ہوا۔ اس نے زرہ بکتر باندھا۔ ایک قدیم خاندانی رسم کے مطابق اکیلے ہی اپنے گدھے کی پیٹھ پر بیٹھا، ارمانوں کی ایک دنیا لیے روانہ ہوا۔ وہ دن بھر کڑی دھوپ میں سارا دن اور ساری رات، چلتا رہا۔ اتنی جانفشانی کے بعد وہ دوسرے دن صبح سویرے سسرال کی سرحد پر پہنچا۔

پرانی رسم کے مطابق وہیں ڈیرہ ڈنڈا ڈال دیا۔ اور اپنے سسر کے پاس یہ رسمی پیغام بھیجا کہ روایتی طور پر اس کی رہنمائی کا انتظام کیا جائے۔

دستور کے مطابق اس کی بیوی اکیلے ہی ایک گدھے کی پیٹھ پر سوار اس کی رہنمائی کے لیے گاؤں کی سرحد پر آئی۔

اپنی بیوی کو دیکھ کر وہ بھی آگے بڑھا۔ دونوں نے قریب ہو کر اپنے اپنے گدھے کی پیٹھ پر بیٹھے ہی بیٹھے ہاتھ بڑھا کر ملائے اور پُر محبت بھرے الفاظ میں اظہارِ مسرت کیا۔

میاں بیوی کے اس ملن کے موقع پر ان کے دو گدھے بھی آمنے سامنے آئے اور اپنی فطری عادت کے مطابق دونوں نے پہلے تو کان ہلائے۔ اس کے بعد ناک سکوڑی اور

پھر اس طرح خاموش ہو گئے۔ جیسے کوئی سائل اپنے سوال کے نامکمل جواب پر سراپا انتظار بن گیا ہو۔

بوگا نے گدھوں کا یہ تماشا دیکھا تو اس پر ایک خاص اثر پڑا۔ اسے بہت تعجب ہوا۔ وہ محوِ حیرت ہو کر رہ گیا۔ اسے اپنی بیوی کی موجودگی کا بھی ہوش نہ رہا۔ وہ ساری دنیا سے بے خبر ہو کر بس ایک ہی تماشا دیکھتا رہا اور دیکھتا ہی رہا۔

اس کی بیوی نے نہ صرف یہ کہ پُرخلوص درخواست کی بلکہ بڑی منت وسماجت بھی کی آخر بہت زیادہ اصرار کے بعد وہ اپنی سسرال جانے کے لیے راضی ہوا مگر کسی حال میں بھی ان دو گدھوں کا وہ عجیب و غریب طریقہ، کسی جواب کے انتظار کا وہ مایوس کن انداز اور اداس اور سپاٹ زندگی کا وہ تکلیف دہ منظر اس کے دماغ کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو سکا۔ یہ واقعہ نے بوجھی جانے والی پہیلی کی شکل میں ایک عقدۂ لاینحل بن کر کلنے ٹی کی طرح ہمیشہ چبھتا رہا۔

ان دو اجنبی گدھوں کی اتفاق ہی سے ملاقات ہو گئی لیکن آخر کیوں یہ کسی قدیم آشنا کی طرح ایک دوسرے کا منہ ایک اداس خاموشی سے دیکھتے رہے۔

اس فکر میں اس کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا اور ہنسی خوشی سب کچھ حرام ہو گیا۔ اسے اپنی زندگی بھی ایک بوجھ معلوم ہونے لگی۔

ساری سلطنت میں اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص سرجا بوگا کے سوال کا جواب دے گا۔ اس کے اندیشوں کا ازالہ اور اس کی مایوسی کو دور کر دے گا، اسے ایک اونٹ اشرفیاں انعام میں دی جائیں گی۔ پورب، پچھم اور اتر دکھن یوں کہیے کہ چار دانگ عالم سے بڑے بڑے عالم و فاضل، عاقل و عادل، فقیر و درویش، اور سادھو سنت آئے اور انھوں نے بوگا کو مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے سوال کا تشفی بخش جواب نہ دے سکے۔ بوگا اسی فکر میں دن دونا اور رات چوگنا لاغر اور دبلا ہو گیا۔

ایک شام کی بات ہے کہ جب سارے غلام دن بھر کی سخت محنت کے بعد گھر لوٹ رہے تھے تو ایک بوڑھا غلام اپنے آقا کی خدمت میں حاضر ہوا اور آداب کورنش بجا لایا اس کے بعد بولا "آقا! اگر اجازت ہو اور مجھے موقع دیا جائے تو میں محترم داماد صاحب کے سوال کا جواب دے سکتا ہوں انھیں مطمئن کر سکتا ہوں۔

سردار کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ اسے اسی وقت اپنے داماد کے پاس لے گیا۔ بوگا نے بھی فوراً بے ساختہ اپنے اندیشہ کو سوال کی شکل میں رکھ دیا۔ غلام نے جواب میں عرض کیا۔

"آقا۔ بہت پرانے زمانے کی بات ہے کہ ایک مرتبہ دنیا کے سارے گدھوں نے مل کر ایک جلسۂ عام کیا اور انسانی مظالم سے نجات دلانے کی ترکیبیں سوچیں لیکن کچھ نتیجہ نظر نہ آیا تو بہ اتفاق آرا ایک خاص گدھے کو اپنا نمائندہ بنا کر دربار خداوندی میں بھیجا گیا وہ گدھوں کی نسل پر انسانی مظالم کی داستان خود اپنی زبان سے پیش کرے اور مظلوم گدھوں کی نجات یا رہائی کا فرمان یا پروانہ حاصل کر لائے۔ حضور والا وہ نمائندہ گدھا خدا کے دربار سے ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔ دنیا کے سارے گدھے اس کی واپسی کا بڑی شدت سے انتظار کر رہے ہیں، مخلوقات کی یہ

گونگی اور مجبور نسل اس سے زیادہ اور کر ہی کیا سکتی ہے اس کی بے بسی کا مشاہدہ آپ خود ہی کر چکے ہیں، جب کبھی دو گدھے خواہ آشنا ہوں یا نا آشنا آپس میں ملتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کا استقبال اس چھبتے سوال سے کرتے ہیں۔ "کہو بھئی! تمھیں ہمارے لیڈر کی واپسی کی کچھ خبر ہے؟" اس سوال کے جواب میں ایک ساتھ دونوں کے دلوں میں ہمدردی اور محبت کے جذبات امنڈ آتے ہیں۔ لیکن مثبت جواب نہ ملنے کے سبب مایوسی کے اتھاہ سمندر میں خاموش ڈوب جاتے ہیں کھسکنے کا نام بھی نہیں لیتے۔

آقا! آپ کو معلوم نہیں۔ یہ کوئی نیا تماشا نہیں یہ آج سے نہیں بلکہ صدیوں قبل سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ پھر بھی یہ گدھے مایوس نہیں ہوئے، شاید اسی وجہ سے گدھوں کو بے وقوف سمجھا جاتا ہے اور دنیا کے سارے بے وقوفوں کو بھی گدھا کہا جاتا ہے۔ آقا! آپ کیا جانیں کہ آزادی کی تمنا کیا ہے؟ آپ کو ہم کیسے سمجھائیں کہ جب یہ تمنا دل میں گھر کر جاتی ہے تو کسی حال میں بھی چین لینے نہیں دیتی۔

لوگا نے بوڑھے غلام کا تشریحی بیان سنا تو اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھا۔ اسے اپنے سوال کا ایک اطمینان بخش جواب مل چکا تھا۔ اس جواب میں اس کی قدیم روحانی پیچیدگی کا حل بھی موجود تھا۔ آج اسے بنی نوعِ انسان کی قدر و قیمت کا احساس بھی ہو چکا تھا۔ لوگا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، وہ رونے لگا۔ خوب رویا، دیر تک روتا رہا۔ جب روتے روتے طبیعت کچھ ہلکی ہوئی تو اٹھا اور اس بوڑھے غلام کے آگے گھٹنے ٹیک کر بولا۔ "اے بوڑھے! ہماری نسل نے تمھاری نسل سے ہمیشہ ظلم کیا۔ آج مجھے اس کا اس کا احساس ہے۔ اس لیے میں اپنے آبا و اجداد کے نمائندہ کی حیثیت سے ان مظالم کی تم سے معافی چاہتا ہوں۔ اور آج سے میں نے اپنے سارے غلاموں کو آزاد کر دیا۔ آج مجھے اچھی طرح محسوس ہوا کہ کوئی انسان کبھی کسی اپنے ہی جیسے انسان کو جانور کی طرح غلام بنا کر رکھے تو یہ سب سے بڑا پاپ ہے۔"

جناب آفاق احمد

ویت نام کی کہانی

سو گٹھاؤں والا بانس کا درخت

ہندوستان کو کہانیوں کا دیس کہتے ہیں۔ لیکن دنیا کا کون سا دیس ہے جہاں کہانیاں نہ سنی جاتی ہوں۔ بڑی محنت سے تیار کرکے کہانیاں کہنے والے کہانیاں کہتے ہیں۔ اور کیا بچے کیا بڑے۔ اتنے ہی شوق سے انھیں سنتے ہیں۔

آج ہم تمہیں جو کہانی سنائیں گے وہ بہت دور دیس کی ہے۔ اسے ویت نام کہتے ہیں۔ اسے بھی لوگ ہمارے دیس کی طرح قصے کہانیوں کا دیس کہتے ہیں۔ یہ کہانی جب ہم نے انگریزی میں پڑھی تو بہت اچھی لگی اور آج اسے ہی ہم تمہیں اپنی زبان میں سنا رہے ہیں۔

کہتے ہیں بہت دن پہلے کی بات ہے جب اس ملک میں ایک چالاک بڑے میاں رہتے تھے۔ ان کی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ ان بڑے میاں کا کاروبار بہت پھیلا ہوا تھا۔ اکیلے ان سے چلایا نہ جاتا تھا۔ سوچنے لگے۔ کیوں نہ ایک لڑکے کو نوکر رکھا جائے جو اسے سنبھالے۔

تھوڑی تلاش کے بعد انھیں ایک کام کا لڑکا مل گیا۔ انھوں نے سوچا لڑکے کو لالچ کے جال میں پھنسایا جائے تاکہ وہ خوب جی لگا کر کام کرے اور بڑے میاں خوب دولت کمائیں۔

انھوں نے لڑکے کو ایک دن اپنے پاس بلایا اور کہا "دیکھو اگر تم نے خوب محنت سے کام کیا تو میں اپنی بیٹی کا بیاہ تم سے کر دوں گا۔"

لڑکا اس وعدہ سے بہت خوش ہوا۔ اس نے دل و جان سے کام کرنا شروع کر دیا۔ خواہ کوئی موسم ہو، گرمی ہو، سردی ہو، بارش ہو، سویرے بہت جلد اٹھ جاتا۔ اور رات گئے تک کام میں جٹا رہتا۔

لڑکے کی محنت رنگ لائی۔ بڑے میاں کے پاس خوب دھن دولت جمع ہو گیا۔ ان کا شمار اپنے دیس کے بڑے رئیسوں میں ہونے لگا۔

بڑے میاں امیر ہوئے تو ان کی نیت بدل گئی۔ انھوں نے سوچا "ارے میں تو اتنا رئیس ہوں، شہر میں میرا بڑا مان ہے۔ میں اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی ایک نوکر سے کر دوں گا۔ تو میرا سب مذاق اڑائیں گے۔"

نیت کا بدلنا تھا کہ انھوں نے اپنا وعدہ توڑنے کی ٹھانی اور اپنی بیٹی کی شادی شہر کے سب سے بڑے رئیس کے بیٹے سے طے کر دی۔

بڑے میاں کے یہاں کام کرنے والا لڑکا بڑا بھولا بھالا تھا اسے کچھ خبر ہی نہیں تھی کہ کیا ہو رہا تھا۔ اسے اپنے کام سے کام تھا۔

آخر وہ دن آگیا جب بڑے میاں کی بیٹی کی شادی تھی۔ انھوں نے لڑکے کو بلایا اور کہا "جنگل جاؤ، اور ایک ایسا بانس کا درخت اٹھا کر لاؤ جس میں سو گٹھائیں ہوں۔ بس تم ادھر وہ بانس اٹھا کر لائے اور میں نے تم سے اپنی بیٹی کو بیاہا۔"

لڑکا خوشی خوشی جنگل چلا گیا۔ وہ تمام دن جنگل میں مارا مارا پھرتا رہا۔ لیکن اسے بانس کا کوئی ایسا درخت نہیں ملا جس میں سو گٹھائیں ہوں۔

اپنی اس ناکامی پر وہ بڑا اداس ہوا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

یکایک ایک سفید بالوں والا' دیوتاؤں جیسی صورت والا بوڑھا آدمی اس کے پاس آیا۔ اس نے پوچھا:

"میاں صاحبزادے۔ آپ کاہے کو رو رہے ہیں؟"

لڑکے نے اپنی پوری کہانی سنائی۔

ارے واہ اتنی سی بات کے لیے روتے ہو۔ چلو اٹھو، بانس کے درخت کاٹنا شروع کر دو۔ اس وقت تک کاٹتے رہو جب تک سو گٹھائیں تمہارے پاس جمع نہ ہو جائیں۔ پھر انھیں میرے پاس لاؤ۔" بڑے میاں نے آس بندھائی۔

لڑکے کی ہمت بڑھی اور اس نے درخت کاٹنا شروع کر دیئے۔ آخر سو گٹھائیں جمع ہو گئیں۔ تو بوڑھے کے پاس لے کر آیا۔

بوڑھے نے کہا: "اب تم تین مرتبہ کہو۔ آپس میں ایک ہو جاؤ۔"

لڑکے نے ایسا ہی کیا۔ اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سو کی سو گٹھائیں آپس میں مل کر ایک ہو گئیں۔ اور ایک سو گٹھاؤں والا بانس کا درخت بن گیا۔

لڑکے کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے دیوتاؤں جیسے چہرے اور بگلے جیسے سفید بال والے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا۔ اور چاہا کہ درخت کندھے پر رکھ کر چلے۔ لیکن درخت تھا بہت لمبا! لڑکے سے چلا ہی نہیں گیا۔ وہ پھر زور زور سے رونے لگا۔ بوڑھے نے پوچھا: "میاں صاحبزادے۔ اب آپ کیوں رو رہے ہیں؟"

لڑکے نے بتایا کہ وہ درخت کو گھر کیسے لے جائے۔ یہ تو بہت لمبا ہے۔

بوڑھے کو بہت ترس آیا۔ اس نے دوسری ترکیب بتائی:

"اچھا دیکھو' ایسا کرو۔ تین دفعہ کہو۔ الگ ہو جاؤ۔"

لڑکے نے فوراً ایسا ہی کیا۔ سب گٹھائیں الگ ہو گئیں۔

اب اس نے ان سب کو ایک جگہ باندھا اور گھر کی طرف چلا۔

جب گھر پہنچا تو یہ دیکھ کر اسے بہت غصہ آیا کہ یہاں تو شادی کی دعوت اڑائی جا رہی ہے۔ اور دعوت کے بعد بیاہ ہونے والا ہے۔

لڑکے نے اپنی زبان سے کچھ نہ کہا۔ کندھے سے گٹھاؤں کے بنڈل کو نیچے اتارا۔ انھیں ایک لائن میں رکھا۔ اور پھر دھیرے دھیرے بولا۔

"آپس میں ایک ہو جاؤ۔ آپس میں ایک ہو جاؤ۔"

دیکھتے دیکھتے۔ ایک لمبا بانس کا درخت بن گیا۔ اس میں سو گٹھائیں تھیں۔

اس عجوبے کو دیکھ کر لڑکے کا مالک یعنی بڑے میاں درخت کے قریب آئے کہ دیکھیں ماجرا کیا ہے۔ ان کا درخت کے قریب آنا تھا کہ لڑکا زور سے چیخا۔

"آپس میں ایک ہو جاؤ۔ آپس میں ایک ہو جاؤ۔"

اور بڑے میاں بری طرح درخت سے چپک گئے۔

بڑے میاں کو چپکا دیکھا تو دولہا کے باپ سے نہ رہا گیا اور وہ ان کی مدد کو دوڑا۔ لیکن جوں ہی درخت کے قریب پہنچا۔ لڑکا تیزی سے بولا۔

"آپس میں ایک ہو جاؤ۔ آپس میں ایک ہو جاؤ۔"

اب دولہا میاں کے باپ بھی درخت سے چپک گئے۔

درخت کے آس پاس لوگوں کی بھیڑ لگ گئی۔ دولہا کا باپ کہنے لگا: "ارے مجھے اس درخت سے نجات دلاؤ۔ میں باز آیا ایسی شادی سے۔ بس اپنے بیٹے کو لے کر گھر چلا جاؤں گا۔"

بڑے میاں یعنی لڑکے کے مالک صاحب بھی گڑگڑائے۔

بیٹے! مجھے اس درخت سے چھڑاؤ۔ میں اپنی بیٹی کی شادی

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

جنابِ فخر الدین عارفی

جن کا فاؤنٹن پن

کام کرنیوالے

اشرف:۔ ذہین اور شریر، روزانہ نت نئی ترکیبیں سوچنے والا لڑکا!
شہناز:۔ ذہین مگر بھولی بھالی لڑکی! گڑیوں کی شادی رچانے کی شوقین، اشرف کی چھوٹی بہن۔
اختر صاحب:۔ سیدھے سیدھے مسلمان! اشرف و شہناز کے باپ۔

(پہلا منظر)

اشرف کا کمرہ! جو کمرہ کم کباڑ خانہ زیادہ ہے)

اشرف: (ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے) معاملہ نہایت سنگین ہے ــــ آخر........؟

(اور کچھ دیر سوچتا ہے اور پھر بڑبڑاتا ہے) ممی اور ڈیڈی سے مانگنے کا تو خیر کوئی سوال ہی نہیں ہے ــــ پر کیا کروں؟ کس سے مانگوں؟ لیکن مانگنا تو ہے ہی، بلا مانگے آخر کام بنے گا کیسے؟

(پاس ہی میز پر رکھے ہوئے اخبار کو اٹھا کر آنکھ ملتے ہوئے گہرے مطالعے میں ڈوب جاتا ہے)

بھلا آج آخری دن ہے، اگر نہیں دیکھا تو برسوں کا ریکارڈ مٹی میں مل جائے گا۔

(اخبار کو دور پھینک کر بے بسی کے عالم میں!)

یا اللہ تو رحم فرما، سنا ہے تو بڑا رحیم ہے، زیادہ نہیں، دامن پھیلا کر صرف دو روپے کی بھیک مانگتا ہوں، تجھ سے بھلا کیا پردہ تو، تو خوب جانتا ہے کہ ہر فلم کم از کم تین مرتبہ میں ضرور دیکھتا ہوں۔

اور ــــ

"نیا دور" صرف دو بار دیکھ سکا بیچارا آج اس کا آخری دن ہے، ولنگٹن ہال میری راہ تک رہا ہوگا۔

(کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد یکایک اچھل پڑتا ہے۔)

اہاہا...... کیا خوب ترکیب سوجھی ہے، مار لیا میدان ــ

(قلم اٹھا کر کچھ لکھنے لگتا ہے، لکھنے کے بعد کاغذ جیب میں رکھتے ہوئے)

"چلئے اشرف صاحب! کام منٹوں میں بنا (چٹکی بجا کر) بس منٹوں میں ــــ

(اور نیز تیز قدموں سے باہر نکل جاتا ہے)

(دوسرا منظر)

(شہناز کا چھوٹا مگر خوبصورت کشادہ کمرہ شہناز پٹارہ کھولے گڑیا کے کپڑے سی رہی ہے، اشرف آتا ہے)

اشرف: (خوشامدانہ لہجے میں) شہناز میری اچھی بہن کیا ہو رہا ہے؟

شہناز: (مسکراتے ہوئے) بھائی جان گڑیا کے لئے کپڑے سی رہی ہوں۔

اشرف: (سنجیدہ ہو کر) دیکھو شہناز اس وقت میں تمہارے پاس بہت ضروری کام سے آیا ہوں امید ہے تم مجھے مایوس نہ کرو گی

شہناز: (ٹھٹک کر) وہ تو میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔ خیر بولو کیا کام ہے؟

اشرف: (ہکلاتے ہوئے) وہ..... وہ تم پہلے کیسے سمجھ گئی تھیں؟

شہناز: (اٹھلا کر) تمہاری اس مکھن بازی سے ورنہ بھلا تم مجھے کب "شہناز! میری اچھی بہن" کہنے لگے —— تم تو شہنو، شہنو کی سدا رٹ لگائے رہتے ہو۔ میں تمہاری لاکھ منت سماجت بھی کرتی ہوں، لیکن تمہارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

اشرف: (بات بناتے ہوئے) نہیں نہیں وہ تو تمہیں میں یوں ہی پیار سے کہتا ہوں، اور تم ہو کہ برا مان جاتی ہو۔

شہناز: (بات کاٹ کر) خیر چھوڑو بولو کیا بات ہے؟

اشرف: (اشتیاق سے) دیکھو تمہیں اس وقت مجھے صرف دو روپے دینے ہیں —— بس اتنی معمولی سی بات ہے۔

شہناز: (تنک کر) میرے پاس پیسے ویسے بالکل نہیں ہیں۔

اشرف: (کچھ گھبرا کر) وہ..... وہ نہیں ہوں گے لیکن یہاں تو پیسے کی کوئی بات بھی نہیں ہے۔ مجھے تو روپے چاہئیں —— روپے تو ضرور ہوں گے۔

شہناز: (تیوری چڑھا کر) نہ پیسے ہیں نہ روپے، میں خود پریشان ہوں۔ اگلے مہینے گڑیا کی شادی ہے اور یہاں.....

اشرف: (بات کاٹتے ہوئے) اسی لئے تو کہہ رہا ہوں —— روپے دے دو۔ ہمارا بھی کام بن جائے گا اور تمہارا تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ تمہیں اپنے روپے بھی واپس مل جائیں گے اور گڑیا کی شادی بھی رچے گی میں خوب دھوم دھڑکے سے گڑیا کی شادی کر دوں گا اور تمہارا ایک پیسہ بھی خرچ نہ ہوگا۔

شہناز: ہونہہ، بڑے چتر بنتے ہیں ایک مجھی کو الو سمجھ لیا ہے۔ باتیں بنا کر پیسہ لینا خوب جانتے ہیں اور واپسی کے وقت منہ چھپائے پھرتے ہیں۔

اشرف: (ہکلاتے ہوئے) نہیں..... نہیں اس بار وعدہ کرتا ہوں، بالکل پکا۔ کہو تو کاغذ لکھ دوں۔

شہناز: (جھلا کر) تو بہ، پیسے نہیں ہیں تو کہاں سے دوں گی۔

اشرف: (بات بنتی دیکھ کر جھوٹ بولتے ہوئے) تم سینما دیکھنے کا کہہ رہی ہو —— اس ماہ تو میں نے کسی ہال کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ سارا جیب خرچ تو سادھو مہاتما کی نذر کر دینا پڑا۔

شہناز: (قدرے تعجب سے) سادھو مہاتما کی نذر کیوں کر دیئے؟

اشرف: ایک بے حد انمول رتن معلوم کرنے کی خاطر، اس لئے نیاز نذر میں ساری رقم صرف ہو گئی۔ بہر حال تمہیں ان سب باتوں سے کیا......

شہناز: (بات کاٹ کر اشتیاق سے) مگر بات کیا تھی۔ مجھے بھی بتاؤ نا؟

اشرف: تمہارے پیٹ میں کون سی بات ٹکتی ہے جو بتا دوں۔

شہناز: (چڑ کر) اچھا تو نہ بتلاؤ۔ مجھے کیا پڑی ہے جاننے کی کوئی پیٹ میں درد تھوڑے ہو رہا ہے۔

اشرف: (بات بگڑتی دیکھ کر) میری شہنو! تو، تو خواہ مخواہ ذرا سی بات میں ناراض ہو جاتی ہے تجھے نہ بتلاؤں گا بھلا!

شہناز: دیکھیے بھائی جان! آپ نے مجھے پھر شہنو کہا، میں آخری بار کہے دے رہی ہوں ہاں، آیندہ مجھے شہنو وہنو کہا تو اچھا نہ ہوگا ..... اچھے بھلے نام کو آپ نے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

اشرف: (بوکھلا کر) اچھا بابا معاف کر دو، آج سے میں تمھیں شہناز آپا کہوں گا، اب تو خوش ہونا؟

شہناز: (خوش ہوتے ہوئے) اچھا تو بتائیے کیا بات تھی؟ سادھو مہاتما کی نذر کیوں کر دینے پڑے؟

اشرف: (بات بنتی دیکھ کر مسکراتے ہوئے) ہاں ہاں ضرور بتاؤں گا، مگر پہلے وعدہ کرو اس بات کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔

شہناز: اچھا وعدہ کرتی ہوں۔

اشرف: پکا؟

شہناز: بالکل پکا!

اشرف: (اپنا گڑھا ہوا فرضی قصہ سناتے ہوئے) بات یہ ہے کہ ہمالیہ پہاڑ سے ایک بہت بڑے سادھو مہاتما آئے ہوئے تھے۔ کل جوں ہی میں اسکول سے نکلا اتفاق سے ان سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے مجھ سے بہت سے سوالات پوچھے مثلاً ـــــ تم کہاں رہتے ہو؟ کیا پڑھ رہے ہو؟ تمہارے ڈیڈی کا شبھ نام کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ... میں نے ان کے تمام سوالوں کے جواب فرفر دے دیے۔ وہ بہت خوش ہوئے اور بولے "ہاتھ پر تیرے بہت گہری ہے لکیر اور تجھ کو عن قریب ملنے والا ہے کسی خفیہ (چھپے ہوئے) خزانے کا سراغ۔ جلد ہی ہوگا تو سب پر حکمراں۔ ایشور تجھ پر بہت ہے مہرباں۔

شہناز: (خوشی سے اچھلتے ہوئے) کیا کہا خفیہ خزانے کا سراغ؟ سر پر شہنشاہی کا تاج؟

اشرف: (بات بنتی دیکھ کر) تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے سادھو مہاتما کبھی غلط نہیں بولتے۔ ابھی اور سنو گی تو دنگ رہ جاؤ گی۔

شہناز: (بڑی بے قراری سے) تو کہونا جلدی!

اشرف: (جیب سے ایک فاؤنٹن پن اور اپنا لکھا کاغذ نکال کر) یہ دیکھو یہ فاؤنٹن پن مجھے سادھو مہاتما نے ہی دیا ہے جانتی ہو اس پین کا کیا کام ہے؟

شہناز: (اشتیاق سے) کیا؟

اشرف: (کچھ خوف زدہ ہوتے ہوئے) یہ جن کا فاؤنٹن پن ہے۔

شہناز: (قریب چیختے ہوئے) جن کا فاؤنٹن پن؟

اشرف: (منہ پر انگلی رکھتے ہوئے) اوہ! آہستہ بولو، کوئی سن لے گا۔

شہناز: (ایک دم دھیمی آواز کر کے) اچھا اچھا پھر؟

اشرف: (کاغذ شہناز کی طرف بڑھاتے ہوئے) یہ دیکھو

اس پر تین خانے بنے ہیں، دیکھ رہی ہو نا؟ اور ہر خانے میں ایک جن کا نام ہے۔ کہیں بھول نہ جاؤں اس لئے لکھ لیا ہے کون سے جن کا کیا کام ہے وہ بھی میں نے لکھ لیا ہے۔

بھولا: اس کا کام مجھے میرے حکم پر روپے لا کر دینا ہوگا۔

جالا: اس کا کام رنگ برنگ کی کھانے پینے کی چیزیں لا کر دینا ہوگا۔

مالا: یہ تمام خفیہ خزانوں کے پتے بتائے گا۔

پھر تو مجھے نہ روپیوں کی کمی ہوگی اور نہ کسی چیز کی تنگی۔ دنیا کے آرام و آسائش کی ساری چیزیں میرے قدموں میں ہوں گی۔

شہناز: (خوشی سے اچھلتے ہوئے) تب بھیا جلدی سے کچھ منگاؤ نا! مجھے گیّا کا پیڑا، منیر شریف کا لڈو اور بنگال کا رس گلا بہت پسند ہے۔

اشرف: (منہ بسور کر) پگلی تجھے عقل سے ذرا واسطہ نہیں ہے ایسا ہی ہوتا تو پھر تیرے آگے کوئی ایک گھنٹے سے کیوں دماغ خراب کرتا۔ اب تو میرے سر میں درد بھی ہو چلا۔

شہناز: (تعجب سے) مگر.....؟

اشرف: (ہمت نہ ہارتے ہوئے) ارے پگلی ابھی تو اصل کام ہی باقی ہے۔ بڑے پیر صاحب کے مزار پر فاتحہ پڑھنا — نیاز نذرانہ .....

شہناز: (تنک کر) تو جاؤ نا جلدی یہاں کیا کر رہے ہو؟

اشرف: (اکتاتے ہوئے) ارے جانے ہی کے لئے تو یہاں گھنٹوں سے حضور کی منت سماجت کر رہا ہوں، اگر میرے پاس روپے ہوتے تو پھر......

شہناز: (آنکھیں پھاڑ کر) سچ؟

اشرف: (کچھ تیز آواز میں) اتنی دیر تک مغز کھایا پھر وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔ اب میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ ہے اور سو فیصدی سچ ہے۔

شہناز: (کچھ دیر تک سوچنے کے بعد الماری تک جاتی ہے اور دو روپے کا ایک بالکل نیا نوٹ نکال کر اک ذرا مشکوک نگاہوں سے گھورتے ہوئے اشرف کے حوالے کرتی ہے۔)

اشرف: اچھا میں جاتا ہوں یہ فاؤنٹن پن اور کاغذ تم اپنی ہی الماری میں حفاظت سے رکھ دو۔

(شہناز کچھ خوف کھاتے ہوئے الماری میں بند کر دیتی ہے۔ اور اشرف سیٹی بجاتا ہوا کمرے سے نکل جاتا ہے)

(تیسرا منظر)

(شہناز اپنے کمرے میں بیٹھی بے چینی سے اشرف کا انتظار کر رہی ہے۔ اختر صاحب آتے ہیں)

اختر صاحب: ارے شہناز بیٹی تو آج ٹہلنے نہیں گئی؟

شہناز: (جھوٹ بولتے ہوئے) نہیں ڈیڈی بس فوراً آ ہی رہی ہوں۔

اختر صاحب: اچھا تیرے لئے فاؤنٹن پن میں لے آیا ہوں اشرف نے تجھے دیا؟

شہناز: (بوکھلا کر) ہائیں پین آپ لائے ہیں؟

اختر صاحب: ہاں بیٹی..... تمہارا تقاضا تھا اور میں روز

بھول جاتا تھا آج اتفاق
سے یاد پڑ گیا تو لیتا آیا۔
کیا تمہیں پسند نہیں؟
شہناز: (غصہ سے رو پڑنے
کے قریب) تو اس نے
مجھے دھوکا دیا ——
سب جھوٹ کہا۔ اور میرا
روپیہ (رونے لگتی ہے)
اوں! اوں!! میرا روپیہ
میرا روپیہ!!!
اختر صاحب: (حیرت سے)
کد روپیہ —— ؟
شہناز: (روتے ہوئے) ہاں
روپیہ، اشرف نے جن کا فاؤنٹن
پن ......
(آواز حلق میں اٹک جاتی ہے)
اختر صاحب: (آنکھیں پھاڑ کر)
جن کا فاؤنٹن پن؟
شہناز کوئی جواب نہیں دیتی زور زور
سے رونے لگتی ہے۔ اختر صاحب حیران
و پریشان کھڑے ہیں (پردہ گرجاتا ہے)

ترجمہ پروفیسر ضیاء الدین

بچّہ اور اُستاد

(ٹیگور کی ایک نظم)

اماں! مجھ سے بھول ہوئی اور میں نے کہہ دیا
سات اٹھے چھپّن، بس ماسٹر صاحب بگڑ گئے!
اماں! اُس میلے پر جو پانچ پیسے کا رنگین کھلونا
تم نے مجھے لے دیا تھا میں نے اپنی کتاب کے پیچھے چھپا
رکھا تھا
کسی لڑکے نے ماسٹر صاحب سے کہہ دیا اور وہ
سخت بگڑ گئے میرا وہ کھلونا لے کر توڑ پھوڑ، دور
پھینک دیا! اور کہنے لگے: "بس رات دن تیرا دھیان
کھیل کود میں رہتا ہے شریر! پڑھنے لکھنے میں ذرا
تیرا جی نہیں لگتا!"
اماں! اب میں کس سے جا کر کہوں؟
ماسٹر صاحب کا کوئی استاد نہیں؟
میں ابھی اس سے جا کر شکایت کروں
اماں! کیا ماسٹر صاحب کے گھر میں کوئی کھلونا نہیں،
کیا وہ کبھی کسی کھلونے سے کھیلتے ہی نہیں؟ نہ دن
کو نہ رات کو؟
کبھی کھیلتے ہی نہیں؟
کبھی کسی گلی کوچے میں اپنے کسی کھلونے سے
کھیل کر وقت ضائع نہیں کرتے؟
اگر ان کا وہ کھلونا کوئی غصے میں آ کر دے
مارے تو اماں کہو کیسا ہو؟
ماسٹر صاحب کے دل پر کیسی گزرے؟

ہماری ایک نئی اسکیم

مکتبہ پیامِ تعلیم

اس سال (۱۹۷۲ء) سے ہم نے ایک نئی اسکیم شروع کی ہے، آپ کے لیے چھوٹی چھوٹی خوب صورت کتابیں تیار کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اس وقت اس سلسلے کی ذیل کتابیں تیار ہو چکی ہیں۔

۱۔ بھیڑیے کے بچے	ترجمہ از قرۃ العین حیدر صاحبہ	-/۵۰
۲۔ ہرن کے بچے	" " " "	-/۵۰
۳۔ میاں ڈھینچو کے بچے	" " " "	-/۵۰
۴۔ شیر خاں	" " " "	-/۵۰
۵۔ لومڑی کے بچے	" " " "	-/۵۰
۶۔ بہادر	" " " "	-/۵۰
۷۔ سونے کا پنجرہ اور دوسری کہانیاں	احسان الحق صاحب	-/۶۵
۸۔ چچا غالب	مرتبہ محمد حسین حسّان ندوی	۱/۷۵
۹۔ چینی کی گڑیا	" " "	-/۵۰
۱۰۔ بہادر سیّاح	" " "	-/۶۵

پیامِ تعلیم کے تمام خریداروں کو مکتبہ پیامِ تعلیم اور مکتبہ جامعہ کی کتابوں پر دس فی صدی کمیشن دیا جائے گا۔

جناب خلیق انجم اشرفی

کتابوں کے عالمی میلے کی سیر

اتوار کا دن تھا۔ ڈیڑھ بجا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر میں لیٹا ہی تھا کہ اچانک حسنین۔ رعنا، گمنی اور شائستہ میرے کمرے میں گھس آئے۔ رعنا بولی بھائی صاحب، کچھ یاد بھی ہے آپ کو؟ آج چھبیس مارچ ہے۔ اتوار کا دن ہے۔ کتابوں کے عالمی میلے کو لگے آٹھ دن ہو گئے۔ پورے آٹھ دن۔ اور آپ نے وعدہ کیا تھا آج وہاں لے چلنے کا۔ کیا تھا نا؟

میں:۔ "تو مجھے کب انکار ہے۔ مگر بھئی عالمی میلا دیکھنے کا شوق تو تم لوگوں کو اتنا ہے لیکن اس کے بارے میں تم لوگوں کو پتہ بھی ہے کیوں لگا ہے؟"

حسنین:۔ "جی ہاں۔ اس لیے کہ یونیسکو نے ۱۹۷۲ء کو عالمی کتابی سال قرار دیا ہے اور اسے منانے کے لیے یہ میلا لگا ہے۔"

میں:۔ "بالکل ٹھیک۔ مگر یہ یونیسکو کیا ہے؟"

رعنا:۔ "بھائی صاحب یہ اقوام متحدہ کا ایک ادارہ ہے۔ اس کا پورا نام ہے "یونائیٹڈ نیشنس ایجوکیشنل، سائنٹفک اینڈ کلچرل آرگنائزیشن" یعنی اقوام متحدہ کا تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارہ، اس کا ہیڈ کوارٹر فرانس کی راجدھانی پیرس میں ہے اور اس کے مقاصد ہیں تعلیم، سائنس اور ثقافت کے ذریعہ دنیا میں امن کو فروغ دینا اور دنیا کے ہر ملک میں ایسے حالات پیدا کرنا کہ ہر بچہ اسکول جا سکے اور اس طرح دنیا سے جہالت کا خاتمہ ہو سکے۔"

میں:۔ "خوب۔ آج کل تو تمہاری جنرل نالج بڑی اچھی ہو رہی ہے۔"

حسنین:۔ "کیوں نہ ہو؟ آج کل دن رات جنرل نالج کی کتاب جو گھونٹا کرتی ہیں۔"

میں (ہنس کر):۔ "خیر یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اچھا میاں حسنین۔ آپ اخبار بہت پڑھتے ہیں۔ اب آپ کا بھی امتحان ہو جائے۔ آپ یہ بتائیے کہ یہ میلا لگایا کس نے ہے؟"

حسنین:۔ "بھائی صاحب۔ اسے وزارت تعلیمات کے زیر سرپرستی نیشنل بک ٹرسٹ نامی قومی ادارے نے فیڈریشن آف پبلشرس اور بک سیلرس ایسوسی ایشن کی مدد سے لگایا ہے۔"

میں:۔ "بالکل ٹھیک، اچھا بھئی اب جلدی کرو۔ میلہ کا وقت ہو گیا ہے۔ چلو چلیں۔"

پندرہ منٹ بعد ہم سب ونڈسر پلیس (جو نئی دہلی) میں میلے کے عظیم الشان گیٹ کے باہر کھڑے تھے۔ کاروں۔ اسکوٹروں اور بسوں کا ایک ہجوم تھا جن سے کتابوں کے متوالے اور کتابی کیڑے۔ مرد، عورتیں۔ بوڑھے بچے اور جوان اتر اتر کر میلے کے ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ ہم نے بھی ٹکٹ خریدا اور گیٹ سے گزر کر ہال میں داخل ہوئے۔ راستے کے دونوں طرف دور تک خوبصورت اسٹال لگے تھے۔ ان میں کتابیں ہی کتابیں بڑے حسین اور انوکھے انداز میں سجی نظر آ رہی تھیں۔

سب بچے یک زبان ہو کر بولے، "آہا کتنی پیاری... پیاری اور کتنی ڈھیر ساری کتابیں"!

میں بولا۔ "ہاں بھئی، یہ دنیا کے بہت سے ملکوں اور خود ہمارے ہندوستان کے کونے کونے سے آئی ہوئی کتابیں ہیں۔ آؤ اب باری باری سے ایک ایک اسٹال کی کتابوں پر نظر دوڑاتے جائیں"۔

زیادہ تر اسٹالوں پر انگریزی کی کتابیں تھیں۔ پہلے مختلف ملکوں فرانس، برطانیہ، امریکہ، چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ اور بنگلہ دیش کے اسٹال تھے۔ ان پر ان ممالک میں رائج زبانوں یعنی فرانسیسی، بنگالی اور چیک زبان کی کتابیں تھیں۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ ہر اسٹال پر بچوں کی کتابیں ضرور تھیں دھنک کے رنگوں میں ویسی ہی دلکش اور دیدہ زیب لیکن بہت مہنگی۔ شائستہ بولی: "بھائی صاحب۔ کتابیں تو بڑی پیاری ہیں لیکن بہت مہنگی بھی ہیں"۔ رشمی ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: "اے کاش۔ اردو میں بھی بچوں کی ایسی ہی رنگ برنگی اور خوبصورت کتابیں شائع ہوتیں"۔

آگے بڑھے تو ایک طرف بڑے سے کپڑے کے ٹکڑے پر لکھا تھا: "نیشنل اگزبیشن" (قومی نمائش) اندر داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ دستور کے تحت منظور شدہ تمام پندرہ ہندوستانی زبانوں کے اسٹال ہیں۔ سبھی اسٹال خوبصورتی اور سلیقے سے سجے تھے۔ دیواروں پر انعام یافتہ ادیبوں کے فوٹو اور مشہور ادیبوں کے اور راہ نماؤں کے کتابوں اور مطالعے کے بارے میں مشہور مقولے لگے تھے۔ نہرو جی کی بات بچوں کو بہت پسند آئی: "میں نے صرف ایک فضول خرچی اپنا رکھی ہے اور اسے چھوڑنا بہت مشکل ہے اور وہ ہے کتابیں خریدنا"۔ لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ یہ تمام "موٹو" فوٹوؤں پر لکھی عبارت اور اسٹالوں کے نام صرف ہندی اور انگریزی میں تھے۔ بلکہ جس زبان کا اسٹال تھا اس زبان میں بھی اسٹال کا نام اور موٹو ہونا چاہیئے تھے۔ اردو کے اسٹال میں بچے بڑے شوق سے داخل ہوئے لیکن بچوں کو اپنے مطلب کی کتابیں نہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی مجھے یہ بھی نظر آئی کہ ایک ہی مصنف کی کئی کئی کتابوں تھیں جبکہ بہت اچھے ادیبوں کی ایک بھی کتاب نہ تھی۔ اردو کے اسٹال کے کونے میں ایران کا اسٹال تھا۔ جہاں فارسی کی تھوڑی سی کتابیں لگی تھیں۔ وہاں سے باہر نکلے تو لاؤڈ اسپیکر پہ اعلان ہو رہا تھا: "ہال سے باہر آیئے اور دوسرے اسٹال دیکھئے"۔

باہر نکلے تو ایک بڑے احاطہ میں جگہ جگہ لکڑی کا رڈ بورڈ اور بانس کے بنے چھوٹے بڑے خوبصورت اسٹال نظر آئے۔ کچھ اسٹال ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے تھے اور زیادہ کتابوں کو شائع کرنے والے اور فروخت کرنے والے ہندوستان کے مشہور ادارے کے۔ ریاست مدراس کا... اسٹال سب سے خوبصورت تھا اور سبھی کو پسند آیا۔ اس کے علاوہ گجرات، اڑیسہ اور بنگال کے اسٹال بھی تھے گیان پیٹھ، نیشنل بک ٹرسٹ، ہند پاکٹ بکس، کتابستان محل اور چلڈرن بک ٹرسٹ کے اسٹال بھی بڑی خوبصورتی سے سجائے گئے تھے۔ رنگ برنگی کتابوں کو بچے بڑے شوق سے دیکھ رہے تھے۔ چلڈرنس بک ٹرسٹ کے اسٹال میں داخل ہوئے تو وہاں ہندی انگریزی اور اردو کی خوبصورت کتابیں سجی تھیں۔ یہ سبھی بچوں کی کتابیں تھیں۔ رعنا بولی: "بھائی صاحب یہ ادارہ تو بہت خوبصورت کتابیں چھاپتا ہے کس کا ہے یہ؟" میں نے کہا "یہ شنکر صاحب کا ادارہ ہے وہی جو شنکر ویکلی نکالتے ہیں۔ اور بچوں کے مصوری اور مضمون نویسی کے بین الاقوامی مقابلے کراتے ہیں"۔ لیکن بھائی صاحب رشمی بولی، شنکر صاحب کو اردو

میں بھی کتابیں شائع کرنی چاہیئں تا۔" میں نے کہا تم کہتی تو ٹھیک ہو لیکن ابھی تو وہ بہت سی زبانوں میں کتابیں نہیں شائع کر رہے۔ شاید کبھی اردو کا بھی نمبر آجائے۔"

اب ہم لوگوں کو مکتبہ جامعہ کے اسٹال کی تلاش تھی۔ آخر ایک بڑے اسٹال کے اندر داخل ہوئے تو ایک کونے میں ہمدرد دواخانہ کے بغل میں جامعہ کا اسٹال بھی نظر آیا۔ جس پر جامعہ کی منتخب کتابیں، پیام تعلیم کے سالنامے اور خاص نمبر اور بچوں کی کتابیں سجی تھیں۔ شائستہ اسے دیکھ کر بولی: "بھائی صاحب یہ میلے والے بڑے خراب ہیں۔ انھوں نے ہمارے پیام تعلیم کے دفتر کو بہت کم جگہ دی ہے اور بات تھی بھی ٹھیک۔ جامعہ جیسے ادارے کو اس سے زیادہ نمایاں اور بڑی جگہ ملنی چاہئے تھی۔ اب سب بہت تھک چکے تھے کتابوں کی رنگ برنگی فہرستوں کا ڈھیر سنبھالے باہر نکلے اور میلے کی باتیں کرتے گھر کی طرف چل پڑے۔

دستو گھٹاؤں والا بانس بقیہ صفحہ ۲۷ کا

تم سے ہی کروں گا۔"

لڑکے نے وعدہ لیا اور یہ گانا شروع کر دیا۔

"الگ ہو جاؤ، الگ ہو جاؤ۔"

درخت کی سب گھٹائیں ایکدم الگ ہو گئیں اور وہ دونوں ان کی جکڑ سے آزاد ہو گئے۔

لڑکے نے اپنے مالک کی لڑکی سے شادی کر لی اور ہنسی خوشی اپنی زندگی گزارنے لگا۔ ●●

کچھ معلوماتی کتابیں

آستین کا سانپ	محمد حسین حسان	۵۰/-
برف کا گھر	"	۵۰/-
برف کے تیرتے پہاڑ	مجیب احمد خاں	۵۰/-
بادشاہ کے کپڑے	مشیر فاطمہ	۵۰/-
بے گناہ مجرم	شفیق الرحمن قدوائی	۵۰/-
تاؤ کے ایڈیشن	محمد حسین حسان	۵۰/-
چاند	"	۷۵/-
تین سوال	عبداللطیف اعظمی	۵۰/-
چھوٹی کی چوٹ	معین الدین	۷۵/-

وقت کی قدر

جناب فرحت قمر

ایک شکاری روز جنگل میں شکار کرنے جایا کرتا۔ جنگل میں اسے سب سے اچھی چیز خرگوش لگتے۔ ننھے ننھے سفید سفید روئی کے گالے جیسے خرگوش! اپنی دم کی کنڈلی بنا کر بیٹھتے تو ایسا لگتا جیسے کوئی سیٹھ اپنی گدّے دار چوکی پر بیٹھا ہو۔ شکاری چپکے چپکے ان کو دیکھتا لیکن جیسے ہی خرگوش اس کی آہٹ پاتے۔ گیند کی طرح اچھلتے کودتے جھٹ اپنی جھاڑی میں جا چھپتے۔ شکاری سوچا کرتا کتنا اچھا ہو جو کسی دن اسے کوئی زندہ خرگوش مل جائے اور وہ اسے اپنے گھر لے جا کر پالے۔

اور ایک دن اس کو ایک کی جگہ دو خرگوش مل گئے ننھے ننھے روئی کے گالے جیسے دو خرگوش کے بچے۔ دونوں ایک جھاڑی میں پڑے سو رہے تھے۔ شکاری نے دبے پاؤں ان کے پاس جا کر ان کو پکڑ لیا۔ اور گھر لے آیا۔

اپنے دونوں بچوں کو جھاڑی میں نہ پا کر خرگوش کے بچوں کے ماں باپ پریشان تو بہت ہوئے۔ لیکن کر بھی کیا سکتے تھے جنگل میں کوئی تھانہ تو ہوتا نہیں کہ بچوں کے کھوئے جانے کی رپورٹ لکھا دیتے۔ بس چپ بیٹھ رہے بے چارے رو دھو کر۔

شکاری نے خرگوش کے دونوں بچوں کو بڑے شوق سے پالا اور ان کے نام بھی رکھے۔ ایک کا نام منکی اور دوسرے کا نیکی رکھ دیا۔ شکاری کے گھر کے بچوں کی اور آس پڑوس کے بچوں کی دوستی نیکی اور منکی سے بہت جلدی ہو گئی۔ جب بھی موقع ملتا سب مل جل کر کھیلتے۔ کوئی بچہ ان کے لئے گھاس کی ہری ہری پتیاں لاتا۔ تو کوئی شلجم کے پتے۔ کوئی ان کو پالک کھلاتا تو کوئی ان کو روٹی کھلانے کی کوشش کرتا۔

نیکی اور منکی کے لئے کیلے کے چھلکے بھی لاتے اور وہ انہیں بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ بچے جی میں کہتے بھئی واہ۔ یہ خوب رہی۔ کیلا وہ خود کھائیں اور چھلکے نیکی اور منکی کو۔

شکاری نے نیکی اور منکی کے لئے رہنے کو زمین میں ایک بڑا سا گھروندا گاڑ دیا تھا۔ بچوں کی آواز سن کر دونوں اچھل کر گھروندے سے باہر نکل آتے اور ہنس ہنس کر کے ان کے ساتھ کھیلتے۔ ویسے اچھلنے کودنے اور کھیلنے میں زیادہ دلچسپی منکی کو تھی۔ وہ کبھی چین سے بیٹھ ہی نہیں سکتا تھا۔ نیکی چاہتے زیادہ وقت اپنے گھروندے کے اندر ہی گزارتے۔ اور زیادہ تر سوتے رہتے۔ وہ چاہتے کہ ان کو کھانے پینے کا سامان بھی گھروندے کے اندر ہی مل جائے۔ اور منکی ـــ وہ خوب اچھلتا کودتا ـــ چوہے کی طرح دو پیروں پر بیٹھ کر تیزی سے اپنی گردن ادھر ادھر گھماتا۔ اور لمبے لمبے کان ہلا کر طرح طرح کے تماشے کرتا۔

جاڑوں کے دن آئے تو نیکی اور منکی کافی بڑے ہو گئے بس یہ سمجھو کہ پورے خرگوش بن گئے۔ صبح ہوئی تو منکی اٹھ بیٹھتا اور اچھل کر اپنے گھر سے باہر نکلتا۔ نیکی کو اٹھانے کے لئے وہ اس کو خوب جھنجھوڑتا مگر نیکی دھیرے دھیرے ایک آنکھ کھولتا پھر دوسری کھولتا اور کروٹ بدل کر پہلے ایک آنکھ بند کر لیتا پھر دوسری بند کر لیتا۔ اس طرح وہ کئی بار جگایا جاتا اور کئی بار سو جاتا۔ اسے اس

بات سے مطلب نہیں تھا کہ سورج کافی اونچا ہو گیا ہے۔ اور اب سونے کا وقت نہیں ہے تنگ آکر منکی اکیلے ہی ہری بھری گھاس کا ناشتہ کر کے باہر دھوپ میں آ بیٹھتا۔

روز ایسے ہی ہوتا۔

گھر کے سامنے بچوں کا ایک اسکول تھا۔ منکی دھوپ سینکتے وقت بھی اپنا وقت بیکار نہ کھوتا۔ اسکول کے بچوں کو کھیلتے کودتے پڑھتے لکھتے بہت دھیان سے دیکھتا۔ ان کو جو کچھ پڑھایا جاتا اس کو سنتا۔ اور پھر بہت کچھ سوچتا۔ جاڑوں جاڑوں میں ہی فیس کا ایک پیسہ دیئے بغیر کام کی بہت سی باتیں سیکھ لیں منکی چاہتا تھا کہ نیکی بھی یہ سب کچھ سیکھے۔ مگر نیکی ٹھہرا جنم کا سست۔ اسے کیا پرواہ کہ اس کے دن یونہی بیکار کٹ رہے ہیں۔

ایک دن منکی نے ماسٹر صاحب کو کہتے سنا — "جنگل کی کھلی ہوا تندرستی کے لئے بہت اچھی ہوتی ہے۔ جنگل میں رہنے والے جانور کتنے تندرست، کتنے پھرتیلے اور کتنے ہشاش بشاش ہوتے ہیں۔ انھیں جانوروں کو جب پال لیا جاتا ہے تو وہ .. دھیرے دھیرے سست اور کاہل ہو جاتے ہیں۔ کیوں؟ ان کو جنگل کی کھلی ہوا اور آزادی کے ساتھ بھاگ دوڑ کا موقع جو نہیں ملتا۔

یہ بات سن کر منکی نے خوب سوچا اور پھر دل میں ٹھان لی کہ وہ بھی اب جنگل میں جا کر رہے گا۔ یہ بات اس نے اپنے بھائی نیکی سے بھی کہی مگر وہ بولا" ارے بھائی اب اس آرام کی زندگی کو چھوڑ کر کون جنگل میں جائے" مگر جب منکی نہ مانا اور چل ہی پڑا تو نیکی بھی دھیرے دھیرے اس کے ساتھ ہو لیا۔

دونوں گھر سے نکلے تو اچھی طرح سویرا نہیں ہوا تھا۔ مگر جب وہ شہر سے نکل کر جنگل میں پہنچے تو تھوڑی تھوڑی روشنی ہونے لگی تھی۔ جنگل میں خوب چہل پہل تھی۔ چڑیاں .. چہچہا رہی تھیں۔ چھوٹے موٹے جانور ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ نیکی اور منکی دونوں کو جنگل کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ اس لئے کافی پریشان تھے۔ وہ تو یہ کہیے کہ ان کو ایک بوڑھا خرگوش مل گیا۔ منکی نے اس کے سامنے آکر ہاتھ جوڑ کر کہا

"دادا جی سلام"۔

نیکی نے بھی آدھا ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "دادا جی سلام"

تم کون ہو بیٹے۔ تمھیں پہلے کبھی ادھر نہیں دیکھا۔

منکی نے اپنی ساری کہانی کہہ سنائی اور بوڑھا خرگوش ان دونوں کو اپنے گھر لے گیا۔ اس نے جلد ہی دونوں کو یہ سب کچھ بتا دیا کہ انھیں جنگل میں کیا کرنا چاہیئے اور کیسے رہنا چاہیئے۔

منکی کو جنگل کی زندگی بہت بھائی۔ خوش نیکی بھی تھا مگر سست پڑے پڑے بے کار وقت کھونے کی عادت اس نے وہاں جا کر بھی نہیں چھوڑی۔ وہ تازہ تازہ گھاس کھاتا اور خوب سوتا۔ منکی کو نکمے بیٹھنا پسند نہیں تھا۔ وہ ایک دن۔ بوڑھے خرگوش سے بولا۔

دادا میں کچھ کام کرنا چاہتا ہوں۔

"کام" بوڑھے خرگوش نے کہا "یہاں کیا کام ہے گھاس کھانے اور اچھلنے کودنے کے سوا؟"

"نہیں دادا میں بے کار نہیں بیٹھ سکتا۔ شہر میں رہ کر میں نے بہت سی اچھی باتیں آدمیوں سے سیکھی ہیں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ وہ باتیں میں جنگل میں رہنے والے اپنے بھائیوں کو بھی سکھاؤں"

بوڑھے خرگوش نے کئی باتیں پوچھیں۔ اور منکی نے بڑے اچھے ڈھنگ سے اس کا جواب دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ تیار ہو گئی ایک یوجنا (اسکیم) اور جھاڑیوں کے پیچھے بن گیا ایک چھوٹا سا اسکول! منکی جی بنے ہیڈ ماسٹر اور نیکی جی بنے ماسٹر، خرگوشوں کے ننھے منے سفید سفید بچے اچھلتے کودتے روز سویرے آتے

اور اپنی دم کا گدا بنا کر لائنوں میں بیٹھ جاتے۔ نیچی مہاشے اب بھی دیر تک سوتے تھے۔ اس لیے وقت پر پہنچتے ہی کیسے — سارا کام منکی کو ہی سنبھالنا پڑتا۔

جنگل کے اس اسکول کی خبر جنگل کے راجہ شیر تک پہنچ گئی اور وہ اپنے منتری لومڑی مہاراج کو لے کر ایک دن سویرے سویرے اسکول دیکھنے آ پہنچے۔ چھپ کر انہوں نے کافی دیر تک خرگوش کے بچوں کو لائن میں کھڑے ہو کر پی۔ ٹی کرتے دیکھا۔ اور پھر منکی کی اچھی اچھی باتیں سنیں۔ شیر راجہ بہت خوش ہوئے اور جھاڑی سے باہر نکل کر منکی کو شاباش دینے لگے۔

راجہ کے آنے کی خبر سن کر ساری خرگوش برادری وہاں اکٹھا ہو گئی۔ اور شیر صاحب نے کہا۔

"میں منکی کے کام سے بہت خوش ہوا ہوں۔ اس لئے اس کو اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے علاوہ ساری خرگوش برادری کا مکھیا بھی بناتا ہوں۔"

سب خرگوشوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں اور جب تالیوں کی دھپ دھپ کم ہوئی تو منکی نے اپنے بھائی کو انعام دلانے کی بات سوچ کر کہا۔

"مہاراج میرا بھائی بھی میرے اسکول میں کام کرتا ہے"

"کہاں ہے وہ اسے بھی بلاؤ" شیر نے کہا۔ مگر نیچی وہاں کہاں وہ تو پڑے سو رہے تھے۔ جب ایک خرگوش نے ان کو جا کر شیر راجہ کے آنے کی خبر سنائی تو وہ گھبرا کر سیدھے اپنے بل سے نکل کر چلے آئے۔

شیر نے نیچی کو دھیان سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی نیند تھی۔ شیر نے ذرا زور سے پوچھا: "کہاں تھے تم؟"

"ج۔ جی۔ م۔ م۔ میں تو یہیں تھا۔"

یہ جھوٹ تھا اور شیر جو جنگل کا [illegible] تھا کافی سمجھدار تھا۔ اس نے نیچی کا جھوٹ بھی بھانپ لیا۔ اور اس کے دیر تک سونے اور وقت کی کھونے کی عادت کو بھی اور پھر نیچی کو اس کی بری عادت جتا کر تھوڑی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد شیر راجہ بولے۔ دیکھو کل سے تم سب سے پہلے اسکول آیا کرو اور یہ سارا میدان اپنی دم سے صاف کیا کرو۔ اور یہ جو چست و چالاک خرگوش سامنے کی لائن میں بیٹھا ہے یہ اب ماسٹر بنے گا

نیچی کے لیے سویرے اٹھنے کا کام تھا تو بہت کٹھن مگر کیا کرتا راجہ کا حکم جو تھا ماننا ہی پڑا۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

کتابوں کی باتیں (بقیہ صفحہ ۴۷)

علاوہ بھی اگر کتاب میں تصویریں ہوتیں تو ان کی افادیت دوبالا ہو جاتی اور وہ ان میں زیادہ دلچسپی لے سکتے۔

کاغذ ان تمام کتابوں کا سفید۔ کتابت و طباعت معیاری اور قیمتیں اس مہنگائی کے دور میں جبکہ ہر چیز بازار کے مول بک رہی ہے۔ نہ صرف مناسب بلکہ سستی کہی جا سکتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ تمام کتابیں اس قابل ہیں کہ انھیں بچوں کے ادب میں نمایاں جگہ دی جائے اور نہ صرف بچے بلکہ بڑے بھی انھیں پڑھ کر اپنے خالی وقت کو دلچسپ اور مفید بنائیں۔ پورے سیٹ کی قیمت چھ روپے پانچ پیسے ہے اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی سے مل سکتی ہیں۔

●●

کتابوں کی باتیں

خلیق انجم

اردو میں بچوں کے ادب کی طرف سے جو بے توجہی برتی گئی ہے اس کا ازالہ کرنے کے لیے حال ہی میں مکتبہ جامعہ کی زیر سرپرستی مکتبہ پیام تعلیم کا قیام عمل میں آیا ہے اور اس نے بچوں کے لیے ان کی دلچسپی کے موضوعات پر مختلف کتابیں شائع کرنے کا ایک مکمل پروگرام بنایا ہے۔ زیر تبصرہ آٹھ کتابیں اس منصوبے کے تحت نکلنے والی کتابوں کا پہلا سیٹ ہیں۔ پہلی چھ کتابوں کے نام ہیں۔ بھیڑیے کے بچے۔ ہرن کے بچے۔ میاں ڈھینچو کے بچے۔ شیر خاں لومڑی کے بچے اور بہادر۔ یہ تمام کتابیں جانوروں کے بارے میں ہیں ان سب کتابوں کے مصنف اور پیر و منسکایا ہیں۔ اور ترجمہ محترمہ قرۃ العین حیدر کا ہے۔ باقی تمام کتابوں کے نام سے ظاہر ہے کہ وہ کن جانوروں کے بارے میں ہیں۔ بہادر ایک گھوڑے کی داستان ہے۔ ان کتابوں میں کہانی کے انداز میں بچوں کی زبانی ان جانوروں کے بارے میں بہت مفید اور دلچسپ معلومات دی گئی ہیں۔ یہی باتیں اگر کسی مضمون کی شکل میں ہوں تو شاید بچے اسے پڑھیں بھی نہیں لیکن کہانی کی شکل میں یہ اتنی دلچسپ ہیں کہ ایک دفعہ شروع کر کے رکھنے کو جی نہ چاہے۔ یہ تو مصنف کا کمال ہے لیکن مترجم کی محنت کم نہیں۔ ترجمہ طبعزاد لکھنے سے زیادہ مشکل ہے اس کے لیے دونوں زبانوں پر قدرت ہونا ضروری ہے۔ محترمہ قرۃ العین حیدر اردو کی بھی ادیبہ ہیں اور انگریزی کی بھی اور انھیں دونوں زبانوں پر یکساں عبور حاصل ہے بلکہ ترجمہ کا فن بھی انھیں خوب آتا ہے۔ ان کے ترجموں سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ طبعزاد ہیں یا ترجمے اور یہی مترجم کی کامیابی ہے۔ ان کتابوں کے ترجمے میں بھی یہی خوبی ہے۔ بڑی میٹھی اور ستھری اور خوبصورت زبان میں ترجمہ کی۔

ساتویں کتاب "سونے کا پنجرہ" احسان الحق صاحب کی تین کہانیوں "سونے کا پنجرہ"۔ "خالی صندوق" اور "سمجھ لو" کا مجموعہ ہے۔ تینوں کہانیوں کا مرکزی خیال مشہور کہانی کار اینڈرسن کی کہانیوں سے لیا گیا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ کہانیاں بڑے پیارے انداز بڑی میٹھی اور آسان زبان میں لکھی گئی ہیں اور یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ یہ طبعزاد نہیں بچے تو بچے ہیں بڑے بھی ان کہانیوں کو اتنی دلچسپی اور شوق سے پڑھیں گے۔ اور مزہ یہ ہے کہ یہ کہانیاں سبق آموز بھی ہیں۔

آٹھویں کتاب "چچا غالب" پیام تعلیم کے غالب نمبر کے دس منتخب مضامین اور چچا غالب کے "قادر نامہ" کا مجموعہ ہے مرتب ہیں پیام تعلیم کے ایڈیٹر حسین حسان صاحب غالب کے بارے میں بچوں کے لیے جتنی باتیں دلچسپی کا باعث ہو تی ہیں وہ اس مجموعہ میں آگئی ہیں۔ اور اس سے مرتب کے حسن ترتیب کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتابوں کے ٹائٹل یوں تو خوبصورت اور جاذب نظر ہیں لیکن "چچا غالب" پر سے غالب کی تصویر ہی غائب ہے اور اس کے بجائے ایک سیدھا سادا ڈیزائن ہے۔ پہلی چھ کتابوں کا ٹائٹل ایک ہی ہے اس کے بجائے اگر ہر کتاب پر اس جانور ہی کی تصویریں ہوتیں جس کے بارے میں ہے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ "سونے کا پنجرہ" کا ٹائٹل یوں تو بڑا خوبصورت ہے لیکن کہانیوں کے مرکزی خیال سے زیادہ مطابقت نہیں رکھتا اور بچوں کی کسی کتاب کا ٹائٹل ہو سکتا ہے۔ ٹائٹل کے

دیکھیے صفحہ ۳۹

egd. No. D 1457

5 MAY, 1972

Payam-i-Taleem

NEW DELHI-25.

برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)
۱۵۲۸۔ پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دہلی


1 1 JUL 1972

ماهنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی ۲۵

شمارہ ۷ جلد ۹

جولائی ۱۹۷۲ء

ایڈیٹر

محمد حسین حسان ندوی

دفتر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
شاخ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اُردو بازار دہلی ۶
شاخ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳
شاخ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علیگڑھ ۲

قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے

سالانہ چندہ چھ روپے

پرنٹر پبلشر سیّد احمد دلی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ لبرٹی آرٹ پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شایع کیا۔

فہرست مضامین

بچّوں کی کتابیں

مذہب

ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	/۵۰
آں حضرت	الیاس احمد مجیبی اردو ہندی	/۴۵
پاک کہانیاں دو حصوں میں	مقبول احمد سیوہاروی	۲/۳۵
چار یار	الیاس احمد مجیبی	۱/۳۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۲/۲۵
رسول پاکؐ	عبدالواحد سندھی	۱/۸۰
عقائد اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۵۰
مسلمان بیبیاں	مولانا اعجاز الحق قدوسی	/۷۵
نبیوں کے قصے	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۱/۲۵
ہمارے رسولؐ	〃 〃 〃	۱/۶۵
ہمارے نبی	سید نواب علی رضوی اردو ہندی	/۴۰

معلومات

آدمی کی کہانی	مشتاق احمد	۱/۲۵
انوکھا عجائب خانہ	محمد حسین حسان (چار حصے)	۱/۸۰
بجلی کی کہانی	علی احمد خاں	/۵۰
بڑدادا کی کہانی	محمد عبدالغفور	/۶۵
تاریخ ہند کی کہانیاں اوّل	خجستہ سلطان	/۸۰
〃 〃 دوم	ضیاء الرحمٰن	۱/۰
〃 〃 سوم	مشتاق احمد اعظمی	۱/۸۰
〃 〃 چہارم	〃 〃	/۹۵
جانداروں کی کہانی	محمد امین	/۷۵
خبر رسانی کے طریقے	رضیہ منظور الامین	/۸۵
دنیا کے بچے	محمد حسین حسان	/۸۰
دنیا کے بسنے والے	بشیر حسین زیدی	/۷۵

دہلی	ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی	/۸۰
رابندر ناتھ ٹیگور	صفدر حسین	۱/۲۵
سماجی زندگی (اوّل)	احمد پٹیل و غلام ابرار	/۶۵
〃 〃 (دوم)	〃 〃 〃	/۸۰
〃 〃 (سوم)	〃 〃 〃	/۸۱
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	۱/۳۰
سمندر کے نیچے	〃 〃 〃	۲/۰
قدرت کے کرشمے	ادارہ	/۶۲
میرا قلیش	محمد حسین حسان	۱/۲۵
ہماری پارلیمنٹ	کیلاش چندر	۱/۵۰

کہانیاں، ڈرامے اور ناول

اس نے کیا کرنا چاہا (کہانیاں)	آصفہ مجیب	/۳۷
پریم کی جیت (ڈراما)	اسد اللہ کاظمی	/۳۷
تابیل خاں (کہانی)	محمد حسین حسان	/۳۰
ترکوں کی کہانیاں (کہانیاں)	مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	/۵۵
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول)	م۔ ندیم	۱/۵۵
تین اناڑی (ناول)	عصمت چغتائی	۱/۴۰
چقماق کی ڈبیا (کہانی)	برکت علی فراق	/۴۰
چھپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی)	محمد معین	/۳۵
ستاروں کی سیر (ناول)	کرشن چندر	۱/۷۵
کوے دادا (سچا ناول)	مجیب احمد خاں	۱/۷۵
لال مرغی (کہانی)	عبدالواحد سندھی	/۵۰
مزہ چکھائیں گے (کہانی)	مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	/۳۵
مزیدار پہیلیاں (پہیلیاں)	محمود علی خاں	/۶۵
ننھا ٹٹو (کہانی)	خورشیدہ سلطان	/۳۰

بچوں سے باتیں

جولائی کے مہینے میں عام طور پر کالج اور اسکول کھل جاتے ہیں۔ بچیاں اور بچے چند دنوں میں نئے جوش اور ولولے کے ساتھ اسکولوں میں داخلہ لیں گے۔ خوب شوق سے پڑھیں گے نئے، پرانے ساتھیوں سے میل ملاقات ہوگی۔ ساتھی مل جل کر پڑھائی کا، تفریح کا پروگرام بنائیں گے۔ خوب مزے آئیں گے۔

پچھلے دنوں مہاراشٹر کے اسکولوں کا نتیجہ نکلا ہے اس صوبہ میں خاص بات یہ ہے کہ بچے خاص خاص مضمونوں میں امتیازی نمبر حاصل کرتے ہیں تو اخباروں میں ان کے نام شائع کئے جاتے ہیں۔ اور انھیں انعام بھی دیا جاتا ہے۔ نیچے ہم ان خوش نصیب بچوں کے نام شائع کرتے ہیں۔

تو ہاں بھئی سب سے پہلے تو ہم تمھیں یہ بتائیں کہ لگ بھگ دو لاکھ چونتیس ہزار میں سے ایک لاکھ سات ہزار پاس ہوئے سب سے زیادہ نمبر کٹی سنبیو شری نیواس راج۔ ایچ راجہ چنتامنی راو پٹوردھن ہائی اسکول سانگلی) نے حاصل کئے۔ سات سو میں ۶۷۱ نمبر۔ پہلے پچاس طالب علموں میں شاملیوں نمبر (میرٹ ۲۱) علی حسین محمد بھائی (مدرسہ ہائی اسکول پونا ۲) کا ہے۔

اردو کا پہلا انعام (سو روپیہ) سعیدہ فاطمہ شاہ محمد (اینگلو اردو گرلس ہائی اسکول پونا) دوسرا انعام (پچاس روپے) اسی اسکول کے طالبہ شیخ قیصر جہاں محمد جعفر کو ملا۔

عربی کا پہلا انعام (سو روپے) نجم الدین صادق علی (سیفی ہائی اسکول پایدھونی بمبئی) کو ملا۔ فارسی کا پہلا انعام (سو روپے) فاروق احمد اکبر علی (انجمن ہائی اسکول بوری بندر) جرمنی کا پہلا انعام (سو روپیہ) قریشی ضیاء احمد غلام محی الدین پروٹسٹنٹ ہائی اسکول پونا ۲ کو ملا۔ ایڈمنسٹریشن اور سوکس کا دوسرا انعام (ایک سو پچاس روپیہ) پٹھان اسرار احمد یٰسین (کرونز ہائی اسکول پونا ۱) کو ملا ہے۔ ورکشاپ ٹیکنالوجی کا پہلا انعام (سو روپے) قادری عبدالعزیز رب مجید کو ملا ہے سردے انگ کا پہلا انعام (سو روپے) دیشمکھ آفتاب حاجی میاں (راو کے گنڈویا۔ ودیامندر دھولیا) کو ملا ہے۔

جعفر قاسم موسی گولڈ میڈل فاروق احمد اکبر علی (انجمن ہائی اسکول بمبئی) کو ملا ہے۔ آر۔ ام۔ سیانی خوجہ شیشی موشیل اسکالرشپ (۷۰ سالانہ) کچھانی دلشاد بانو بدرالدین (پیرجی بھائی اللہ رکھا لال جی بھائی ساجن گرلس ہائی اسکول ڈونگری) کو ملا ہے۔ لارڈ سینڈ ہرسٹ اسکالرشپ بلقیس لے لطیف دکو جعفر سلیمان گرلس ہائی اسکول بمبئی ۳) کو ملا ہے۔ دائی۔ عبدالحسین سنگاپوروالا اردو اسکالرشپ۔ سیدہ فاطمہ شاہ محمد (اینگلو اردو گرلز ہائی اسکول پونا ۱) کو ملا ہے۔ سر فریک ساوٹر اسکالرشپ (فارسی) شیخ رئیسہ وزیر نیک بائی بیرام جی جیجی بھائی پرائز (یونانی اور زولاجی میں سب سے زیادہ

نمبر پانے والے) کے درے خاں محمد اسماعیل خاں (مخیداد ہائی اسکول دہور تعلقہ مہار ضلع تلایہ) کو ملا ہے۔

ہم ان سب بچوں اور بچیوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔

محترم رشید حسن خاں صاحب کا مضمون بچوں نے، بڑوں نے استادوں نے سبھی نے پسند کیا۔ اور سب نے اس بات کا اعتراف کیا۔ ایسی مفید اور کار آمد باتیں خاں صاحب نے ایسی میٹھی زبان میں ایسے دلچسپ انداز میں لکھی ہیں کہ بنا پڑھے جی نہیں مانتا۔ مضامین کا یہ سلسلہ ان شاء اللہ بہت دنوں تک چلے گا۔

ایک بڑا دلچسپ مضمون کیف صاحب کی نظم اور کئی دوسری نظمیں اور کئی چیزیں، اس پرچے میں شامل نہیں ہو سکیں۔ یہ سب مواد ایک کاتب کو دیا گیا تھا۔ دقت کی بات، بے چارے اچانک بیمار ہو گئے اپنے وطن چلے گئے۔ غالباً اپنے ساتھ مسودے بھی لے گئے۔ یہ سب چیزیں اگلے پرچے میں شایع ہوں گی۔ دعا کیجیے کہ کاتب صاحب جلد تندرست ہو کر آ جائیں۔

مونگے کا جزیرہ والی کہانی آپ کو پسند آئی۔ بہت دنوں سے آپ کا تقاضا تھا کہ پیام تعلیم میں ایڈونچر یا مہم بازی کی کہانیاں شایع کی جائیں۔ خلیق انجم صاحب کی نوازش سے آپ کی یہ فرمائش پوری ہو گئی۔ خوشی کی بات ہے کہ آپ نے اسے بھی پسند کیا۔ کہانی اچھی خاصی لمبی ہے قسط وار چھپے گی۔ اس پرچے میں دوسری قسط چھپ رہی ہے۔

آم ہمارے دیس کا قومی پھل ہے۔ ویسے تو دوسرے ملکوں میں بھی ہوتا ہے لیکن جو بات دیسی آم میں ہوتی ہے وہ بات اور جگہوں کے آموں میں کہاں اور پھر جس طرح لوگ باغ میں پکنک مناتے تھے خوب جی بھر کے آم کھاتے تھے خوب چہلیں کرتے تھے۔ بڑی دلچسپی رہتی تھی۔ ہمارے نیر صاحب نے بہت دنوں پہلے بچوں کی پکنک کا دلچسپ حال لکھا ہم پیام تعلیم کے پرانے پرچے سے نقل کرتے ہیں۔ موسم کا ہے۔ پڑھیے اور لطف اٹھایئے۔

ایک عزیز نے پچھلے (جون کے) پیام تعلیم کی بہت کی ہے ہلکی سی شکایت بھی کی ہے کہ پرچے میں کہانیاں ہیں۔ تو بھئی ہم کوشش تو یہی کرتے ہیں کہ پرچے میں تھوڑی تھوڑی سبھی چیزیں ہوں، کبھی کبھی اس میں کمی بیشی ہو جاتی ہے۔ ویسے ہم آپ کو ایک بات بتا دیں۔ ہمیں شروع سے لگ بھگ تیس چالیس سال سے برابر اس فکر میں ہیں کہ اپنے پیامیوں میں نئی نئی باتوں کا شوق پیدا ہو۔ کہانیوں کے علاوہ، سائنس، صنعت، اور دوسری چیزوں کا مذاق ان میں رچ بس جائے۔ اردو پڑھنے والے بچے اور بڑے ابھی تک بس کہانیوں، ناولوں، افسانوں پر ریجھے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ہمیں آگے بڑھنا ہے ترقی کرنا ہے خالی کہانیاں پڑھ کر ہم ترقی نہیں کر سکتے۔

اب کے پرچہ نہ پہونچنے کی شکایتیں ذرا زیادہ آئیں۔ دفتر سے پرچہ پوری احتیاط سے بھیجا جاتا ہے پھر نہ جانے کیا بات ہے۔؟ آئندہ اور احتیاط کی جائے گی۔ جن جن پیامیوں کی شکایتیں آئی ہیں انھیں پرچہ فوراً بھیج دیا گیا ہے۔

ایڈیٹر

جناب محمد عبداللہ شرقی

سورج

چمک اپنی سب کو دکھا دینے والا — زمانے کو روشن بنا دینے والا
وہ پورب میں دیکھو نظر آ رہا ہے — اُجالا زمانے میں پھیلا رہا ہے
وہ دیکھو، اندھیرے کو اس نے مٹایا — وہ دیکھو ابھی رات کو دن بنایا
ہمیشہ سے ہے بس یہی کام اس کا — کہ سورج ہے اے دوستو نام اس کا
سویرے اُفق پر وہ بادل رنگیلے — ہیں کچھ سُرخ، کچھ زرد، کچھ نیلے پیلے
ابھی ابر میں تھا، ابھی پھر وہ نکلا — حسیں کس قدر ہے یہ سورج کا مکھڑا
غضب کی چمک ہے، بلا کی دمک ہے — ٹھہرتی نہیں آنکھ، کیا اس میں شک ہے
اِسی کی تو گرمی سے بڑھتے ہیں پودے — مہکتے ہوئے پھول خوش رنگ پتے
نکھرتی ہے ہر چیز پر کیا جوانی — فضا ہے سویرے کی کتنی سُہانی
جنھیں چاند پر ہے اترنے کا دعویٰ — میسّر ہو سورج پہ بھی ان کو جانا!

خِرد کی بدولت جو پہنچے وہاں تک
یہ انسان جائیں گے آخر کہاں تک

جناب سید حسن خاں صاحب

لفظوں کا جادو

(تیسری قسط)

پچھلی بار ان لفظوں کا ذکر کیا گیا تھا جن میں ذال آتی ہے۔ اب ز کی باری ہے۔ اس کے بعد اور حرفوں کی بات کی جائے گی۔

ہاں تو تیسری بات یہ تھی کہ گزارش کو ز سے لکھا جائے گا۔ اسی گزارش والے گزار سے بنے ہوئے یہ لفظ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔

شکر گزار [شکر ادا کرنے والا] بکار گزاری [بہت کام کرنا، مستعدی سے کام کرنا] مال گزاری [زمین کا سرکاری محصول]

گزرنا، اردو کا مصدر ہے۔ اس میں بھی ز ہے اس سے بہت سے فعل بنتے ہیں۔ جیسے گزرا، گزرا ہوا گزر گیا، گزرتا ہے، گزرے گا وغیرہ۔ گزر بسر، یہ دو لفظ کبھی کبھی ایک ساتھ بولے جاتے ہیں۔ جیسے: گزر بسر کی کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔

گزارنا بھی اسی گزرنا کی ایک دوسری صورت ہے اس میں بھی ز ہے۔ اس سے بھی بہت سے فعل بنتے ہیں گزارا بھی اسی سے بنتا ہے۔ جیسے کوئی کہے۔ کہ "اب ان کے ساتھ ہمارا گزارا نہیں ہو سکتا۔ یا جیسے گزارے بھر کو تو کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام تو سب نے سنا ہوگا۔ اور بھلا کیوں نہ سنا ہوگا! کعبے شریف کو پہلے پہل آپ ہی نے بنایا تھا۔ ان کے والد یا چچا کا نام آزر تھا۔ اس میں بھی ز ہے کبھی کبھی غلطی سے اس کو ذال بھی لکھ دیا جاتا ہے۔ ہاں ایک چھوٹی سی.. کتاب۔ آزر کا خواب تو تم نے دیکھی ہی ہوگی وہ یہی لفظ ہے۔

ذال سے آذر بھی ایک لفظ ہے۔ مگر وہ بالکل دوسرا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں آگ۔ ایک مشہور شہر آذربائیجان کا نام شاید تم نے اخبار میں پڑھا ہو۔ اس میں یہ ذال والا آذر ہے۔

ایک اور مشہور پیغمبر تھے زکریا علیہ السلام۔ یہ لفظ زکریا بھی ز سے ہے۔ اسے بھی کبھی ذال سے مت لکھنا یہ لفظ ناموں میں بھی آتا رہتا ہے۔ ایک مشہور نام.. رفیق زکریا صاحب کا تم نے سنا ہی ہوگا۔ بمبئی کے مشہور قومی کارکن اور مقبول سیاسی رہنما ہیں۔ اور یہاں کلکتہ میں زکریا اسٹریٹ ایک مشہور علاقے کا نام ہے اخباروں میں یہ نام بھی آتا رہتا ہے۔

زاد۔ یہ لفظ دوسرے لفظوں کے آخر میں آتا ہے جیسے آدم زاد [حضرت آدمؑ کی اولاد ـ آدمی] دیو زاد [دیو کی اولاد] شہزاد۔ زاد کی ایک صورت

شریف زادہ (شریف آدمی کی اولاد) اور [illegible] زادہ [illegible]
کیوں رہ جائے۔ اِسے بھی لکھ لو۔ معنی ہم کیا بتائیں۔ اس کے معنی تم لوگ خوب جانتے ہوگے۔ اور معنی جاننے کی کیا بات ہے، ایسے لوگوں کو تو دیکھا بھی ہوگا۔

زاد تو اصل لفظ ہے۔ اس کے آگے کبھی ہ کے بجائے ی لگاتے ہیں جیسے شہزادہ تو بادشاہ کا لڑکا ہوا اور لڑکی کو شہزادی کہا جائے گا۔ لو، ابھی ایک اور لفظ یاد آگیا۔ بہت دن ہوئے تھے جب سُنا تھا۔ اسے بھی کیوں چھوڑا جائے۔ یہ لفظ ہے مال زادی۔ بڑی بوڑھی عورتیں بے حد غصّے میں اس لفظ کو بول جایا کرتی ہیں۔ اس کے معنی بھی کسی بڑی بی سے پوچھنا۔

زار:۔ یہ لفظ بھی دوسرے لفظوں کے آخر میں آتا ہے۔ اور بہت کے معنی دیتا ہے جیسے گل زار (جہاں بہت پھول ہوں۔ باغ)۔ ریگ زار (جہاں ریت ہی ریت ہو۔ ریگستان)۔ خارزار (جہاں کانٹے ہی کانٹے ہوں)۔ چمن زار۔ لالہ زار۔ سبزہ زار۔

ایک لفظ ہے۔ اِزدِہام۔ اس کے معنی ہیں بھیڑ مجمع۔ اس کو غلطی سے کبھی ازدہام کبھی اژدحام اور کبھی اژدہام لکھ دیا جاتا ہے۔ یہ سب غلط ہے صحیح صورت اِزدِحام ہے۔

ایک اور لفظ جس میں کبھی کبھی قلم بہک جایا کرتا ہے، زخّار ہے۔ اس کے معنی ہیں، جوش مارتا ہوا۔۔۔ لہریں لیتا ہوا۔ یہ لفظ سمندر اور دریا کے ساتھ آتا ہے جیسے بحرِ زخّار۔ اس کو بھی ذ سے لکھنا غلط ہے۔

کئی نام ہیں جن میں ز ہے۔ ان کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ ان میں سے آزر اور زکریا کا تو ذکر اوپر آچکا نام ہے۔ زرتشت یا زردشت۔ یہ ایران کے ایک مشہور حکیم کا نام ہے۔ جنکو آتش پرست لوگ اپنا پیغمبر مانتے ہیں۔ آتش پرست ان لوگوں کو کہتے ہیں، جو آگ کی پرستش کرتے ہیں۔

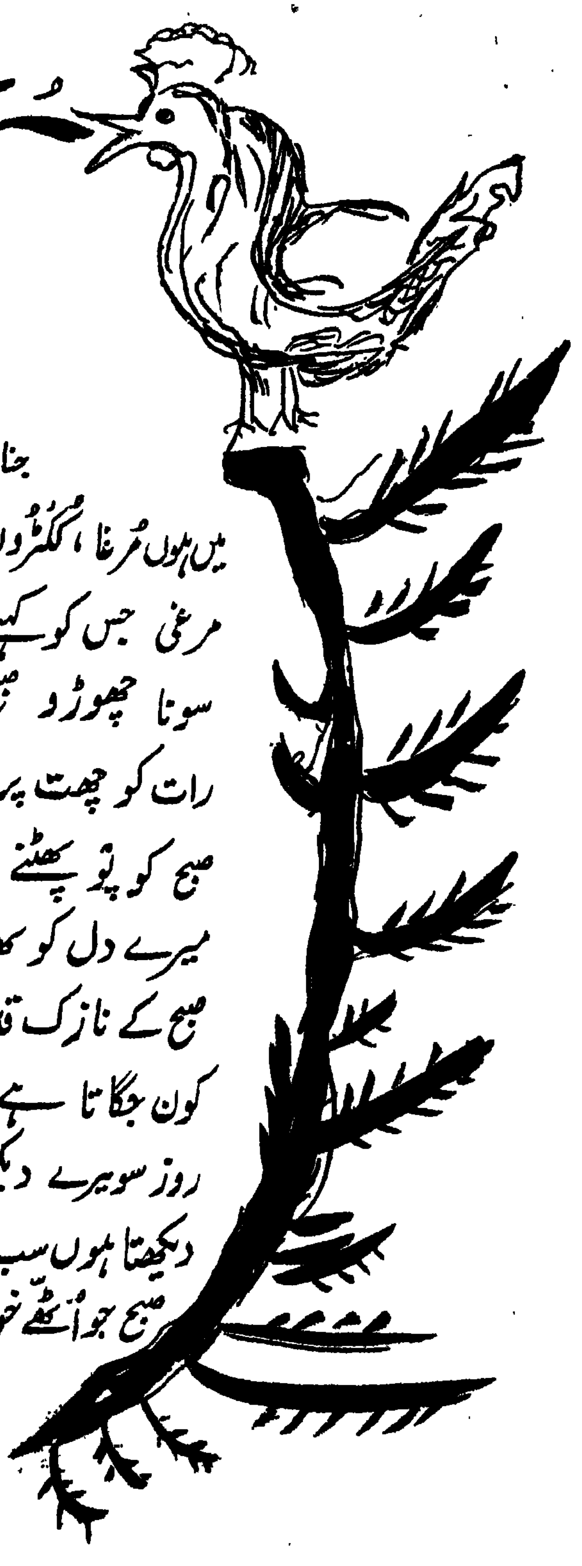
ایک نام ہے۔ عزرائیل۔ یہ موت کے فرشتے کا نام ہے۔ ایک اور بزرگوار ہیں۔ ان کا نام ہے عزازیل۔ ان کے کئی نام ہیں جن میں سے۔ ابلیس اور شیطان زیادہ مشہور ہیں۔ ان کی شہرت کا تو یہ حال ہے کہ کبھی کبھی مثال دینے کے لیے کہتے ہیں کہ وہ تو شیطان کی طرح مشہور ہے۔ یہ تو ہوئی شہرت۔ ان کے کارناموں کا حال ان کی ذات سے بھی زیادہ روشن ہے۔ شیطانی اور شیطنت کے لفظ آپ ہی کے نام سے بنے ہیں۔ اور بچّے ان لفظوں کا مطلب بڑوں سے کہیں زیادہ اچھی طرح جانتے ہوں گے۔

دنیا کے بے شمار لوگ ان کا کہنا مانتے ہیں لیکن ان کو اپنے ماننے والوں سے کبھی کبھی شکایت بھی ہو جاتی ہے ایسا ہی ایک دلچسپ واقعہ آپ بھی سن لیجیئے۔ بے حد دلچسپ واقعہ ہے۔ جی نہیں چاہتا کہ آپ کو اس سے محروم رکھا جائے۔ مگر پہلے ایک جملے کے معنی مطلب ذہن میں بٹھا لیجیئے۔ تب بات سمجھنے میں آسانی رہے گی۔ عربی کا ایک ٹکڑا ہے۔ هٰذا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب میرے خدا کی مہربانی سے ہوا ہے۔ نئے مکانوں کے دروازوں پر، چوکھٹ کے اوپر، کبھی کبھی اس کو لکھا ہوا ضرور دیکھا ہوگا۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اتنا بڑا مکان اگر بنا ہے تو یہ محض خدا کی مہربانی ہے۔ بندے میں کیا طاقت تھی

اب وہ دلچسپ قصّہ سُنیئے:

ایک صاحب نے بڑا عالی شان مکان بنوایا شاندار

ککڑوں کوں



جناب حافظ باقوی رائچوٹی

میں ہوں مرغا، ککڑوں کوں
صبح کا باجا، ککڑوں کوں
مرغی جس کو کہتے ہیں
اس کا راجا، ککڑوں کوں
سونا چھوڑو صبح ہوئی
اٹھو بھیّا، ککڑوں کوں
رات کو چھت پر سویا تھا
صبح کو جاگا، ککڑوں کوں
صبح کو پو پھٹنے میں ہے
میرا ساجھا، ککڑوں کوں
میرے دل کو بھاتا ہے
نور کا تڑکا، ککڑوں کوں
صبح کے نازک قدموں کی
چاپ ہوں سنتا، ککڑوں کوں
کون جگاتا ہے مجھ کو
خود ہوں اٹھتا، ککڑوں کوں
روز سویرے دیکھوں میں
رب کا جلوا، ککڑوں کوں
دیکھتا ہوں سب سے پہلے
دن کا اجالا، ککڑوں کوں
صبح جو اٹھے خوش قسمت
ہے وہ لڑکا، ککڑوں کوں
حافظ کو بھاتا ہے بہت
میرا گانا، ککڑوں کوں

مونگے کا جزیرہ

ار۔ ایم۔ بیلن ٹا

تلخیص و ترجمہ

خلیق انجم اشرفی

دوسری قسط

ہوش میں آنے پر میں نے دیکھا کہ ایک چٹان کے سائے تلے گھاس پر پڑا ہوں اور پیٹرکن میرے پہلو میں گھٹنوں کے بل جھکا میرے چہرے کو پانی سے دھو دھو کر سر کے ایک زخم سے بہنے والے خون کو روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔

آہستہ آہستہ میری طبیعت سنبھلی تو پیٹرکن کی آواز جیسے بڑی دور سے آتی سنائی دی: "کیا اب تمھاری طبیعت کچھ بہتر ہے؟"

رفتہ رفتہ موجوں کا شور بھی زیادہ تیز اور واضح ہوتا گیا۔ میں نے وطن سے دور بہت دور ایک غیر معروف (انجانے) جزیرے پر۔

حالات کے باعث اپنی موجودگی کے بارے میں سوچا جیک بڑی ہمدردی سے میری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں بازو کے سہارے اٹھا اور ایک ہاتھ سے سر کا زخم چھوا تو پتہ چلا کہ کچھ زیادہ ہی بڑا تھا۔ اور میرا کافی خون ضائع ہو چکا تھا۔

"ارے ارے رالف" جیک نے مجھے آہستگی سے دوبارہ لٹاتے ہوئے کہا "لیٹ جاؤ میرے دوست تم ابھی ٹھیک نہیں ہو۔ لو اس پانی سے اپنے ہونٹ تر کر لو۔ یہ میں ایک قریبی چشمے سے لایا ہوں۔ اور ہاں دیکھو ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالنا" اس نے مجھے بولنے کے لیے لب کھولتے دیکھ کر کہا۔ "میں تمھیں سب کچھ بتا دوں گا۔ تم خود جب تک مکمل آرام نہ کر لو۔ بات چیت نہ کرو۔"

"ارے بھئی جیک، اسے بولنے سے مت روکو" پیٹرکن نے کہا "میری سلامتی کے بارے میں اس کے سارے ڈر اب دور ہو چکے تھے اور وہ مجھے ہوا کے تیز جھکڑوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ٹوٹی ہوئی شاخوں سے روک بنا رہا تھا۔ حالانکہ یہ بالکل بیکار تھا۔ میں جس چٹان کے نیچے لیٹا تھا اس نے ہوا کا زور تقریباً ختم کر دیا تھا۔" اسے بولنے دو جیک" پیٹرکن نے اپنی بات جاری رکھی" پورے ایک گھنٹے تک کسی مردے کی طرح سفید اور اکڑے پڑے رہنے کے بعد اسے بولتا دیکھ کر کیسی خوشی ہوتی ہے۔ اور رالف تم۔ تم جیسا تو آدمی ہی نہیں دیکھا میں نے۔ تم شاید مرتے وقت بھی مسخرے پن سے باز نہ آؤ۔ تم نے میرے تو تمام دانت ہی جھاڑ دیئے تھے اور مجھے بس قتل کرتے کرتے چھوڑا ہے۔ اور اب ـــــ اب الیبابن رہے ہو گویا ہم کو اپنے مردہ ہونے کا یقین دلانا چاہتے ہو۔ تمھاری یہ بدمعاشی میں سب سمجھتا ہوں۔" جب پیٹرکن اپنی یہ تقریر جھاڑ رہا تھا میرا ذہن آہستہ آہستہ صاف ہوتا جا رہا تھا اور میں سمجھ رہا تھا کہ کیا ہو چکا ہے "کیا میرا مطلب پیٹرکن؟ میں نے تمھیں تقریباً مار ڈالا تھا؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"کیا مطلب ہے میرا؟ کیا میں انگریزی کے بجائے کوئی خیالی زبان بول رہا ہوں؟ کیا اسے فرانسیسی میں دہراؤں؟ کیا تمھیں یاد نہیں ......" "مجھے ـــ مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ سمندر میں گرنے کے بعد کیا ہوا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں" میں نے رک رک کر کہا۔

"خاموش رہو پیٹرکن" جیک نے ہاتھ اٹھا کر کہا "تمھیں معلوم نہیں کہ رالف کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں ہے۔ میں تمھیں سب کچھ بتائے دیتا ہوں۔ رالف، یہ تو تمھیں یاد ہی ہوگا کہ جب جہاز ٹوٹ گیا تو ہم تینوں سمندر میں کود پڑے تھے۔ اسی وقت میں نے دیکھا تھا کہ چپو کے تمھارے سر سے ٹکرانے سے یہ زخم ہو گیا تھا اور تم نیم بے ہوش ہو گئے۔ اسی نیم بے ہوشی کے عالم میں تم نے پیٹرکن کی گردن پکڑ لی۔ تمھیں کچھ ہوش نہیں تھا کہ تم کیا کر رہے ہو۔ اور اسی عالم میں تم نے دورِ بین جیسے تم اپنے ہاتھ میں اس طرح پکڑے تھے گویا وہ تمھاری زندگی ہو پیٹرکن کے منہ پر ماری ....."

"منہ پر ماری! پیٹرکن حیرت سے چلایا "ارے بندۂ خدا یوں کہو کہ میرے حلق سے نیچے اتارنے کی کوشش کی۔ اُف گلے میں ابھی تک خراش پڑی ہے" یہ کہہ کر وہ اپنے گلے پر ہاتھ.. پھیرنے اور بن بن کر کراہنے لگا۔

"خیر خیر تو ہوا سو ہوا" جیک نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "تو رالف تم نے اس کی گردن اسی طرح تھامے رکھی تو مجھے ڈر لگا کہ سچ مچ ہی تم اسے مار نہ ڈالو۔ لیکن پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ پیٹرکن نے چپو کو بہت مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اس لیے میں نے تمھیں ساحل کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی اور خدا کے کرم سے ہم بغیر کسی خاص دقت کے ساحل تک پہنچ گئے کیونکہ چٹانوں کے اندر پانی بالکل پرسکون تھا۔"

"لیکن جہاز کا کیا حشر ہوا جیک؟" پیٹرکن نے سوال کیا" میں جس وقت رالف کی نگرانی کر رہا تھا. تم چٹانوں پر چڑھے ادھر ہی دیکھ رہے تھے. کیا تم نے یہ کہا تھا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا؟"

"نہیں، یہ کہا تھا کہ اس کے ٹکڑے سمندر کی تہہ میں پہنچ گئے" جیک نے جواب دیا.

جیک چپ ہوا تو تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھاگئی اور میرا یہ اندازہ شاید غلط نہیں تھا. کہ ہم میں سے ہر ایک اس عجیب حادثہ پر غور کر رہا تھا جہاں تک میرا تعلق ہے میں یہ نہیں کہہ سکتا. کہ میرے خیالات بڑے خوش کن تھے. بہرحال ہم ایک جزیرے پر تھے. جیسا کہ جیک نے بتایا تھا لیکن اس پر کچھ آبادی بھی تھی یا نہیں، یہ مجھے معلوم نہ تھا. اگر وہاں کچھ لوگ رہتے تھے. تو اپنی معلومات کی بنا پر مجھے یقین تھا کہ ہم زندہ ہی بھون کر کھا لیے جاتے اور اگر یہ جزیرہ ویران ہوا تو پھر بھوک سے ہمارا مرنا لازمی تھا.

"اوہ" میں نے سوچا" اگر جہاز ڈوب گیا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا. ہم وہاں سے کھانے پینے کی چیزوں کو تو نکال لاتے اور اوزار نکال کر اس سے اپنے لیے کوئی پناہ کی جگہ بھی تیار کرتے لیکن اب. افسوس صد افسوس کہ ہم مارے گئے"

آخری الفاظ میں نے سوچنے کی بجائے زبان سے ادا کر دیئے.

"مارے گئے" جیک چلایا" ارے کہو بچ گئے"، اور یہ کہہ کر وہ ہنس دیا.

"اور تم لوگوں کو کچھ معلوم ہے کہ ہما بدولت کیا سوچ رہے ہیں" پیٹرکن نے اکڑ کر کہا. ما بدولت کا خیال ہے کہ ہمارے لیے بہترین اور عمدہ ترین حادثہ ہوا ہے. ذرا سوچیئے تو تین جہاز راں لڑکوں کے لیے کیا سنہرا موقع ہے. ایک جزیرہ ہمارا اپنا ہے. ہم اس پر بادشاہی کے نام پر قبضہ کرلیں گے. یہاں کے کالے باشندے کو اپنی رعایا بنالیں گے اور اس طرح ہم یقیناً بہت بڑے بن جائیں گے. جیک تم بادشاہ بن جانا. رالف وزیر اعظم اور میں ....."

"لیکن فرض کرو یہاں پر آدمی رہتے ہی نہ ہوں تب؟"

"تب ہم ایک خوبصورت گھر بنائیں گے اس کے چاروں طرف ایک بڑا دلکش باغیچہ ہوگا جس میں طرح طرح کے رنگین اور حسین پھول ہوا کے جھونکوں پر جھومتے ہوں گے اور ہم کھیتی کریں گے، جوتیں گے، بوئیں گے، کاٹیں گے، پکائیں گے، کھائیں گے، اور سوئیں گے، بس مزے کریں گے"

"سنجیدہ بنو پیٹرکن. جیک نے گمبھیر آواز میں کہا. وہ اسی طرح پیٹرکن کو جسے ہر بات مذاق میں اڑا دینے کی عادت تھی مسخرے پن سے روکتا تھا" ہم اس وقت بڑی مشکل حالات سے دوچار ہیں. اگر یہ کوئی ویران جزیرہ ہے تو ہمیں شاید جنگلی جانوروں کی طرح رہنا پڑے. ہمارے پاس کسی طرح کے اوزار یا ہتھیار نہیں. ایک چاقو تک نہیں ....."

"چاقو ادھر تو ہے" پیٹرکن نے یہ کہتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈال کر نکالا. تو اس میں ایک چھوٹا جیبی چاقو تھا. ایک پھل کا اور وہ بھی ذرا سا ٹوٹا ہوا.

"ہونہہ. کچھ نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے. لیکن اب آؤ." جیک یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا.

"ہم کچھ کرنے کے بجائے وقت ضائع کر رہے ہیں. رالف تم اب چلنے کے قابل ہو گئے ہو گے. اب پہلے تو یہ دیکھیں کہ ہماری جیبوں میں کیا ہے. اس کے بعد ہم پہاڑ پر چڑھ کر دیکھیں گے کہ کس قسم کا جزیرہ ہے. جس پر ہمیں قسمت اور حالات لے آئے ہیں کیونکہ اچھا ہو یا برا یہ بہرحال ایک نامعلوم مدت کے لیے ہمارا وطن بنے گا (باقی آئندہ)

ریل

واحد پریمی

دکن بمبئی میل چلی
چھک چھک کرتی ریل چلی
شہروں شہروں بستی بستی
جنگل جنگل وادی وادی
صحرا صحرا ندی ندی
منزل منزل آگے بڑھتی
دکن بمبئی میل چلی
چھک چھک کرتی ریل چلی

اپنے دل میں آگ لگائے
کاندھوں پر ایک بوجھ اٹھائے
آندھی طوفاں سے ٹکراتی
گرمی سہتی سردی کھاتی
دکن بمبئی میل چلی
چھک چھک کرتی ریل چلی

ہر دم کر لو اچھے کام
جیون ہے چلنے کا نام
دنیا کو یہ پاٹھ پڑھاتی
ہنستی گاتی ہنستی گاتی
دکن بمبئی میل چلی؛
چھک چھک کرتی ریل چلی

(نیا سبق)



رابندر ناتھ ٹیگور

(۴)

ترجمہ: حمید عثمانی صاحب

(امل بستر پر پڑا ہوا ہے)

امل: پھوپھا جان کیا آج میں اس کھڑکی تک بھی نہ جا سکوں گا؟ وید جی نے منع کیا ہے؟

مادھب دت: ہاں بیٹے روزانہ وہاں بیٹھنے ہی سے تو تمھاری بیماری بڑھی ہے۔

امل: نہیں پھوپا جان ایسا نہیں ہے۔ اپنی بیماری کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم، مگر وہاں بیٹھے رہنے سے میں بہت ٹھیک رہتا ہوں۔

مادھب دت: وہاں بیٹھے بیٹھے تم نے شہر کے ہر بچے بوڑھے سے دوستی کر لی ہے۔ میرے دروازے کے سامنے روز ایک میلا سا لگا رہتا ہے۔ اس طرح کہیں طبیعت ٹھیک رہ سکتی ہے؟ ذرا دیکھو تو آج تمھارا چہرہ کتنا اتر گیا ہے۔

امل: میرا دوست فقیر مجھے کھڑکی کے پاس نہ دیکھ کر شاید واپس چلا جائے۔

مادھب دت: تمھارا فقیر کون ہے؟

امل: وہی جو روز آتا ہے اور دیس بدیس کی باتیں [illegible] سنتا ہوں، مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔

مادھب: کون فقیر میں تو کسی فقیر کو نہیں جانتا۔

امل: ٹھیک یہی وقت ہے اس کے آنے کا۔ آپ کے پیر پڑوں آپ اس سے جاکر کہہ آیئے کہ وہ ایک بار میرے کمرے میں آ جائے۔

(فقیر کے بھیس میں ٹھاکر دا داخل ہوتے ہیں)

امل: یہی تو ہے! یہی تو ہے۔ فقیر آؤ میرے بستر پہ بیٹھو

مادھب: یہ کیا! یہ تو ——

ٹھاکر دا: (آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے) میں فقیر ہوں۔

مادھب: تم کیا نہیں ہو یہ میں سمجھ ہی نہیں سکا۔

امل: اس مرتبہ تم کہاں گئے تھے بابا؟

ٹھاکر دا: میں کورنچو دیپ جزیرے گیا تھا۔ وہاں سے بس ابھی واپس آ رہا ہوں۔

مادھب: کورنچو دیپ!

ٹھاکر دا: اتنا حیران کیوں ہوتے ہو۔ مجھے بھی اپنی طرح سمجھ رکھا ہے؟ میرے جانے میں کوئی خرچ نہیں ہوتا جہاں جی چاہے جا سکتا ہوں۔

امل: (تالیاں بجا کر) تم بہت مزے کرتے ہو۔ یاد ہے

تم نے کہا تھا کہ جب میں اچھا ہو جاؤں گا تو تم مجھے اپنا چیلا بنا لوگے۔

ٹھاکر دا: اچھی طرح یاد ہے۔ گھر سے نکلنے کے تمام منتر سکھا دوں گا۔ پھر تو سمندر پہاڑ جنگل کہیں بھی کوئی چیز رکاوٹ نہ بن سکے گی۔

مادھب: یہ تم لوگ کیا پاگلوں کی طرح باتیں کر رہے ہو۔

ٹھاکر دا: بیٹا امل میں پہاڑ وہاڑ یا سمندر سے نہیں ڈرتا۔ مگر تمھارے پھوپھا جان کے ساتھ ویدجی شامل ہو جائیں تو میرے منتر کو ہار ماننا پڑے گی۔

امل: نانا پھوپھا جان آپ ویدجی سے کچھ نہ کہئے گا۔ میں اسی جگہ لیٹا رہوں گا کچھ نہ کروں گا۔ لیکن جس دن میں اچھا ہو جاؤں گا اسی دن فقیر کا منتر لے کر چلا جاؤں گا۔ ندی، پہاڑ، سمندر پھر مجھے کوئی چیز نہ روک سکے گی۔

مادھب: بری بات بیٹے۔ ہر وقت چلے جانے کی بات نہ کیا کرو۔ یہ سن کر میرے دل کو تکلیف پہنچتی ہے۔

امل: کورنچو دیپ کیسا جزیرہ ہے مجھے بتاؤ تو بابا۔

ٹھاکر دا: وہ بڑی حیرت انگیز جگہ ہے۔ وہ چڑیوں کا دیس ہے۔ وہاں آدمی نہیں رہتے۔ چڑیاں نہ باتیں کرتی ہیں نہ چلتی پھرتی ہیں۔ وہ بس گانے گاتی ہیں اور اڑتی پھرتی ہیں۔

امل: واہ کتنے مزے کی بات ہے۔ سمندر کے کنارے ہے نا یہ سب۔

ٹھاکر دا: سمندر کے کنارے نہیں تو پھر کہاں ہے۔

امل: سب پہاڑ نیلے رنگ کے ہیں۔

ٹھاکر دا: نیلے پہاڑ پر تو ان کے گھونسلے ہیں۔ شام کو انھی پہاڑوں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی پڑتی ہے تو جھنڈ کے جھنڈ ہرے رنگ کی چڑیاں واپس لوٹتی ہیں۔ آسمان کا رنگ، چڑیوں کا رنگ، پہاڑ کا رنگ رنگوں کا ایک طوفان سا آجاتا ہے۔

امل: پہاڑ پر جھرنا ہے۔

ٹھاکر دا: دھت تیرے کی۔ جھرنے کے بغیر کہیں پہاڑ ہوتا ہے۔ بالکل ایسا لگتا ہے جیسے ہیرے گلا کر ڈھال دیا گیا ہو اور جھرنے کے ناچ کا کیا کہنا۔ کناروں کو ٹھانگ ٹھانگ بجاتے ہوئے کل کل جھر جھر کرتا ہوا جھرنا سمندر کے اندر چھلانگ لگا دیتا ہے۔ کسی وید کے باپ کی مجال نہیں کہ اسے ذرا دیر کو بھی کہیں روک سکے۔ اگر چڑیاں مجھے ایک لاچار، معمولی سا انسان سمجھ کر ایک کوٹھڑی میں نہ رکھتیں تو اسی جھرنے کے پاس ان کے ہزاروں گھونسلوں کے قریب ایک ٹھکانا بنا کر سمندر کی لہریں تکتے تکتے سارا دن گزار دیتا

امل: میں اگر چڑیا ہوتا تو

ٹھاکر دا: پھر تو بڑی مشکل ہوتی۔ میں نے سنا ہے تم نے دہی والے سے کہہ رکھا ہے کہ بڑے ہو کر تم دہی بیچوگے۔ چڑیوں میں تمھارا دہی کا کاروبار ٹھیک سے جم نہ پاتا۔ ممکن ہے کچھ نقصان ہو جاتا۔

مادھب: اب بھلا میری کون سنے گا۔ ایسا لگتا ہے تم لوگ مجھے پاگل کر دوگے۔ میں تو چلا۔

امل: پھوپھا جان میرا دہی والا آکر چلا گیا؟

ِدھب: چلا نہیں گیا تو اور کیا۔ تمھارے دوست فقیر
کا بوریا بستر اٹھائے کو رنچو دیپ کی چڑیوں
کے گھونسلوں کے درمیان اڑتے پھرتے رہنے
سے تو اس کا پیٹ بھر نہیں سکتا تھا۔ وہ تمھارے
لیے ایک مٹکی دہی رکھ گیا ہے اور کہہ گیا ہے
کہ اس کے گاؤں میں اس کی بھانجی کی شادی
ہے۔ جس کے لیے وہ کلمی پاروار (جگہ کا نام ہے)
بانسری والوں کو کہنے جا رہا ہے اس لیے اسے
وقت نہیں مل سکا۔

امل: وہ تو کہہ رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ اپنی چھوٹی
بھانجی کی شادی کر دے گا۔

ٹھاکر دا: پھر تو لگتا ہے بڑی مشکل ہوگی۔

امل: وہ کہہ رہا تھا کہ وہ میرے ہی برابر ہوگی۔
وہ ناک میں کیل پہنے ہے، اس کی ساری، لال
دھاریوں والی ہے، وہ صبح کے وقت اپنے
ہاتھ سے کالی گائے کو دوہ کر، مٹی کے کورے
برتن میں مجھے پھین والا دودھ پلائے گی اور شام
کو جہاں گائے وغیرہ باندھی جاتی ہیں۔ وہاں
چراغ جلا کر میرے پاس آ کر بیٹھے گی اور
سات بھائی چمپا کی کہانی سنائے گی۔

ٹھاکر دا: واہ واہ یہ تو بڑی اچھی بیوی ہوگی میں تو فقیر
آدمی ہوں میرا ہی بھلا ہو اب اس کی شادی کر ہی
دو۔ تم ہاں کر دو تو اس کے گھر میں بھانجیوں کی
کمی نہیں۔

مادھب: چلو ہٹو اب تمھاری یہ سب سنی نہیں جاتی
(چلا جاتا ہے)

امل: بابا! کھوپا جان تو چلے گئے اب تم چپکے سے مجھے بتا دو ڈاک گھر میں میرے نام راجہ
کی چٹھی آگئی ہے۔

ٹھاکر دا: سنا تو میں نے بھی ہے ان کی چٹھی روانہ ہوگئی
ہے پر ابھی راستے میں ہے۔

امل: راستے میں! کس راستے میں۔ اس راستے
میں جو بارش کے بعد آسمان صاف ہو جانے
پر بہت دور نظر آتا ہے؟

ٹھاکر دا: ایسا لگتا ہے جیسے تم سب جانتے ہو۔ ہاں
اسی راستے میں تو ہے۔

امل: میں سب جانتا ہوں بابا۔

ٹھاکر دا: یہی تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ تمھیں کس طرح
پتہ چلا؟

امل: یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ جیسے یہ سب میں آنکھوں
سے دیکھ رہا ہوں۔
ایسا لگتا ہے جیسے میں نے کئی مرتبہ دیکھا ہے۔
بہت دن پہلے۔ کتنے دن پہلے یہ یاد نہیں۔
میں بتاؤں میں کیا دیکھتا ہوں؟ میں دیکھ رہا
ہوں کہ راجہ کا ہرکارہ بالکل اکیلا پہاڑ سے
اتر رہا ہے۔ اس کے بائیں ہاتھ میں لالٹین ہے،
کندھوں پر ڈاک کا تھیلا۔ نہ جانے کتنے دنوں،
کتنی راتوں سے بس وہ اترتا چلا آ رہا ہے ندی
کے کنارے پہاڑوں کے بالکل نیچے جہاں جھرنے
کا راستہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہاں ٹیڑھی میڑھی
ندی کے راستے پر وہ چلتا ہی چلا آتا ہے۔
ندی کے کنارے جوار کے کھیت میں اس کی پتلی
سی گلی پر ہوتا ہوا چلا آ رہا ہے۔
اس کے بعد ایکھ کے کھیت میں، اس کے

پاس اونچی اونچی مینڈھ کا سلسلہ ہے۔ اس مینڈھ کے اوپر وہ چلتا چلا آرہا ہے۔ رات دن برابر چلا آرہا ہے۔ جھیں جھیں کوئی کیڑا بول رہا ہے۔ ندی کے کنارے ایک بھی آدمی نہیں ہے صرف چہا (ایک چڑیا) دم ہلا ہلا کر ادھر ادھر پھدک رہا ہے۔ میں سب دیکھ رہا ہوں جتنا وہ نزدیک آتا جاتا ہے۔ میرا دل خوش ہوتا جاتا ہے۔

ٹھاکردا: اتنی نئی آنکھ تو میری نہیں پھر بھی تمھارے دیکھنے کے ساتھ ساتھ میں بھی دیکھتا جاتا ہوں۔

امل: اچھا بابا جس کا یہ ڈاک گھر ہے تم اس راجہ کو جانتے ہو؟

ٹھاکردا: جانتا نہیں تو کیا۔ میں روز اس کے پاس بھیک لینے جاتا ہوں۔

امل: یہ تو بہت اچھا ہے۔ میں اچھا ہو جاؤں تو میں بھی اس کے پاس بھیک لینے جاؤں گا۔

ٹھاکردا: بیٹے تم کو بھیک مانگنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ انھیں جو کچھ دینا ہوگا وہ یوں ہی دے دیں گے۔

امل: نہیں میں اُس کے دروازے کے سامنے کھڑا ہو کر "بھلا ہو" کہہ کر بھیک مانگوں گا۔ میں اکتارہ بجا کر ناچوں گا۔ یہ ٹھیک رہے گا!

ٹھاکردا: ہاں۔ ہاں یہ بہت اچھا ہوگا۔ تم کو ساتھ لے جانے سے مجھے بھی پیٹ بھر بھیک ملے گی۔ تم کس چیز کی بھیک مانگو گے۔

امل: میں کہوں گا کہ مجھے اپنا ڈاک ہرکارہ بنا دیجیے۔ میں لالٹین ہاتھ میں سنبھالے گھر گھر آپ کے خط پہنچاؤں گا۔ جانتے ہو بابا ایک آدمی نے مجھ سے کہا ہے اچھے ہو جانے پر وہ مجھے بھیک مانگنا سکھائے گا۔ میں اس کے ساتھ جہاں جی چاہے گا بھیک مانگتا پھروں گا۔

ٹھاکردا: کون ہے وہ بتاؤ تو

امل: چھدامی

ٹھاکردا: کون چھدامی؟

امل: وہی جو لنگڑا ہے اور اس کی آنکھیں بھی خراب ہیں۔ وہ روزانہ میری کھڑکی کے قریب آتا ہے۔ بالکل میری ہی طرح کا ایک لڑکا اسے پہیوں والی گاڑی پر بٹھائے گھوما کرتا ہے۔ میں نے اس سے کہہ رکھا ہے کہ میں اچھا ہو جاؤں گا تو اسے گاڑی پر بٹھا کر گھومتا اس کے ساتھ پھروں گا۔

ٹھاکردا: پھر تو بڑا مزا آئے گا۔

امل: اسی نے مجھے بتایا ہے کیسے بھیک مانگتے ہیں وہ مجھے سکھا دے گا۔ پھوپا جان سے میں نے اس کو بھیک دینے کے لیے کہا تھا تو وہ بولے وہ بنا ہوا اندھا لنگڑا ہے۔" اچھا وہ جھوٹ موٹ کا اندھا بنا ہے مگر اس کی آنکھوں سے سچ مچ دکھائی نہیں دیتا۔

ٹھاکردا: ٹھیک کہتے ہو بیٹے وہ دیکھ نہیں پاتا اتنی اصلیت ہے۔ اسے اندھا مانو یا نہ مانو اسے بھیک نہیں ملتی وہ تمھارے پاس کس لیے بیٹھا رہتا ہے؟

امل: میں اس کو "کہاں کیا ہے" بتاتا رہتا ہوں اس لیے وہ میرے پاس بیٹھتا ہے۔ بچارا دیکھ نہیں پاتا۔ آپ جن دیسوں کی باتیں مجھے بتاتے ہیں میں وہ سب اسے سنایا کرتا ہوں۔ آپ نے

مجھے اُس دن ہلکا دیس کا قصہ سنایا تھا۔ جہاں کسی چیز کا وزن نہیں۔ جہاں تھوڑا سا اچھل کر پہاڑ پار کیا جا سکتا ہے۔ اسی ہلکا دیس کی کہانی سن کر وہ بہت خوش ہو رہا تھا۔ اچھا بابا اس دیس کو کس طرف سے جایا جا سکتا ہے۔

ٹھاکردا: اندر کی طرف سے ایک راستہ ہے۔ لیکن اس کا تلاش کرنا مشکل ہے۔

امل: وہ بچارا اندھا ہے شاید اسے نظر نہیں آتا۔ اُسے در بدر بھیک ہی مانگنا پڑے گی۔ یہی سوچ کر اسے دکھ ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا تم بھیک مانگنے جاتے ہو تو کتنا گھوم پھر لیتے ہو سب اتنا نہیں گھوم پھر پاتے۔

ٹھاکردا: بیٹے گھر میں بیٹھے رہنے سے تمہیں اتنا رنج کیوں ہے۔

امل: نہیں نہیں رنج نہیں ہے۔ پہلے مجھے جب گھر میں بند کر دیا گیا تھا تو مجھے ایسا لگتا تھا جیسے دن کٹ ہی نہیں رہا ہے۔ اب اپنے راجہ کا ڈاک گھر دیکھ لینے کے بعد سے مجھے اچھا لگنے لگا ہے۔ اس کمرے میں پڑے ہی پڑے اچھا لگتا ہے۔ ایک دن میری چٹھی آ پہنچے گی۔ یہ بات سوچ سوچ کر میں بہت خوش خوش بیٹھا رہ سکتا ہوں۔ لیکن راجہ کی چٹھی میں کیا لکھا ہوگا یہ میں نہیں جانتا۔

ٹھاکردا: یہ نہیں جانتے تو کیا ہوا تمہارا نام تو لکھا ہے گا۔

مادھب: تم دونوں آدمیوں نے مل کر کیا جھنجھٹ کھڑا کر دیا ہے۔

ٹھاکردا: کیوں اس سے کیا ہوا۔

مادھب: ہمارے بچن کھیلنے راجہ کو ایک گمنام خط لکھ دیا ہے۔

ٹھاکردا: ساری باتیں راجہ کو معلوم ہو جایا کرتی ہیں کیا ہم یہ نہیں جانتے؟

مادھب دت: تو پھر سمجھ بوجھ کر کام کیوں نہیں کرتے راجہ بادشاہ کا نام شامل کر کے اس طرح کی باتیں کیوں کرتے ہو تم لوگ مجھے کسی مصیبت میں پھنسا دو گے

امل: بابا کیا راجہ خفا ہوں گے؟

ٹھاکردا: کہنے دو سب کو۔ کیوں خفا ہوں گے؟ میں بھی تو دیکھوں! میری طرح کے فقیر اور تمہاری طرح کے بچّے سے خفا ہو کر وہ کس طرح حکومت میں کامیاب ہوں گے۔ میں بھی دیکھوں گا!

امل: دیکھو بابا آج صبح سے میری آنکھوں کے سامنے رہ رہ کر اندھیرا چھایا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سب خواب ہو۔ بالکل چپ چاپ رہنے کو جی چاہتا ہے۔ باتیں کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ کیا راجہ کی چٹھی نہ آئے گی؟ اگر ابھی ابھی یہ کمرہ غائب ہو جائے۔ اگر

ٹھاکردا: (امل کو پنکھا جھلتے ہوئے) آئے گی چٹھی۔ آج ہی آئے گی۔

(باقی)

ننھا پھول

صبح بہار تو ہے — شام قرار تو ہے
موسم کی دلکشی کا — نقش و نگار تو ہے
مثل گلاب تو ہے — رنگین خواب ہے تو
جو دل کو تازگی دے — ایسا رُباب ہے تو
آنکھوں کا نور تجھ سے — دل کا سرور تجھ سے
تجھ سے ہی نازِ فردا — ہر اک غرور تجھ سے
تو چاند کا ہے جھومر — تو ہے گُلِ صنوبر
معصوم ہے تو اتنا — جیسے فرشتہ پیکر
تیری یہ توتلاہٹ — اللہ رے قیامت
دلکش ادھوری باتیں — دیتی ہیں کتنی لذّت
تو یوں ہی گنگنائے — سارے جہاں کو بھائے
سب کے گلے سے لگ کر — سب کو گلے لگائے
نفرت سے تو نہ دیکھے — مسلم نہ ہندو پرکھے
تو گود سب کی جائے — تو میل سب سے رکھے

تجھ سے زمانہ سیکھے
الفت کا بیج بونا
تو سب کے واسطے ہے
ایک چاند سا کھلونا

خالد رحیم

جناب محمد شفیع الدین نیّر

آموں کی بہار

ساون کا مہینہ تھا۔ بادل گھرے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑنے لگی تو لطف اور بھی دوبالا ہوگیا۔ گرمی سے نڈھال ہو رہے تھے۔ اس خشکی اور تری سے دل نہال ہوگئے۔

بچے اپنے بستے لے کر مدرسے آچکے تھے مگر پڑھنے لکھنے کو دل کسی کا نہ چاہتا تھا۔ کچھ نیچے کہنے لگے۔ "اگر آج کسی باغ کی سیر کی جائے تو کیسا رہے۔"

اتنی بات کا منھ سے نکلنا تھا کہ "کیا کہنا ہے کیا کہنا ہے" کی صدائیں ہر طرف سے آنے لگیں۔

حنیف نے کہا۔ "اور سیر بھی آموں کے باغ کی۔ سیر کی سیر کریں آم کے آم کھائیں۔"

سعیدہ بولیں۔ "اور رسی بھی لیتے چلیں۔ آم کے پیڑ کی شاخ میں جھولا ڈالیں اور مزے سے جھول جھول کے ساون کے گیت گائیں۔"

سب نے اس تجویز پر صاد کیا۔

حنیف میاں اور بی سعیدہ پڑھنے لکھنے میں بھی کافی تیز تھے۔ اس لیے ہیڈ ماسٹر صاحب ان کا بہت خیال رکھتے تھے اور ان کا کہنا بھی نہ ٹالتے تھے۔ سب نے انھی سے کہا۔ تم ہی ہیڈ ماسٹر صاحب سے درخواست کرو۔

خدا کا کرنا، ادھر یہ پہنچے اُدھر اور درجوں کے لڑکے بھی اُن کے پاس آچکے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بچوں کی درخواست رد نہ کر سکے۔

اسی وقت گھنٹہ بجا۔ استاد اور سب لڑکے اسکول کے میدان میں جمع ہوئے۔ کرائے کی لاریاں آئیں، بچے اور تمام استاد ان میں بیٹھ کر خوش خوش قطب صاحب (مہرولی) روانہ ہوئے کہ وہاں کسی باغ میں جاکر آم کھائیں اور قطب مینار کے پاس ہری ہری گھاس کے تختوں پر لوٹ لگائیں۔ موقع ہو تو کبڈی جمائیں دو گھڑی جی بہلائیں اور واپس آجائیں۔

خیر صاحب یہ قافلہ بڑی شان سے روانہ ہوا۔ پھاٹک سے لاریاں نکلی تھیں کہ بچوں نے شور مچانا شروع کیا۔ ایک لاری میں اردو پڑھانے والے استاد بھی تھے کہنے لگے "بھئی چیخنا اور شور مچانا ہے تو آم کی نظم ہی کیوں نہ گاؤ وہی بچوں کے تحفے والی۔"

بچے یہ سن کر ایسے خوش ہوئے جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔ سب مل کر سریلی آواز میں گانے لگے:

دیکھو دیکھو آم انوکھے ان سے بڑھ کر آم نہیں
رس بھی ان کا میٹھا میٹھا ریشے کا بھی نام نہیں
پیلے پیلے میٹھے میٹھے باغ سے چن کر لائے ہیں
گو دا زیادہ گٹھلی چھوٹی کھانے میں سب اچھے ہیں

کھٹّا ان میں ایک نہیں ہے، کھا دیکھو ہم سچے ہیں
گھنڈی توڑو، آم لگا کر مُنہ سے جھٹ پٹ پی جاؤ
پیلے رس کا شربت آؤ غٹ غٹ پی جاؤ
ہرے بھرے باغوں میں کل تک بے فکری سے رہتے تھے
مینہ میں نہا کر خوش ہوتے تھے۔ ریچھ نہ کوئل تھے
کوئل کُو کُو کر کے ان کو راگ سناتی تھی۔
ان کا گانا سن کر ان کے دل کی کلی کھل جاتی تھی
مور کے پھولوں کے بستر پہ ان کو سلا کر لائے ہیں
آندھیوں اور لوؤں سے بچ کر یہ بازار میں آئے ہیں

ابھی اتنے ہی شعر ہونے پائے تھے کہ قطب صاحب کے ایک باغ میں پہنچ گئے۔ بچے لاریوں سے اُتر اُتر کر ادھر اُدھر پھیل گئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ آم کے بڑے بڑے درخت ہیں۔ بہت گھنے گھنے، بہت سے آموں سے لدے پھندے۔ یہ آم کچھ بڑے بڑے ہیں۔ آدھ آدھ سیر کے۔ کچھ چھوٹے ہیں، کچھ ہرے ہیں، کچھ پیلے، کچھ سیندوری، شکلیں بھی عجیب عجیب ہیں۔ کچھ [illegible] کچھ لمبوترے۔

[illegible] چاروں طرف آموں کی رکھوالی کر رہے ہیں۔ اگر ان کے گوپھیے کا ڈر نہ ہو تو طوطوں کے جھنڈ آموں کو بھلا کب چھوڑیں۔ کتر کتر کر سارے باغ کا ستیاناس کر دیں۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کے کہنے پر نذر ایک استاد باغ والے کے پاس گئے۔ کچھ لڑکے بھی ساتھ ہو لئے۔ ایک استاد نے پوچھا۔ کہو بھئی چودھری کچھ آم وکاؤ بھی ہیں؟

باغ والا: جی ہیں کیوں نہیں۔ لیجے، خوب کھائیے اور جتنے چاہئیں گھر باندھ کر لے جائیے۔ پچھلے سال آتے تو باغ میں خاک اُڑتی نظر آتی۔ پر اس سال تو آم کی بڑی افراط ہے۔

استاد: مگر چودھری آپ کے ہاں کس کس قسم کے آم ہیں؟

باغ والا: ماسٹر جی اس باغ میں دیسی اور تخمی آم بھی ہیں اور قلمی آم بھی ہیں۔ قلمی آموں میں بمبئی، دسہری، لنگڑا، ثمر بہشت، فجری وغیرہ ہر طرح کے آم ہیں۔ ایسے میٹھے اور رسیلے کہ بس ہونٹ چاٹتے رہ جائیے گا۔ بڑے اچھے پیڑ ہیں۔ کسی پیڑ کا کوئی آم چکھ کر دیکھئے۔ بہت خوشبودار، بہت خوش ذائقہ۔ گٹھلی اتنی سی، گودا بہت سا۔ اور پھر ماسٹر جی دیسی آموں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ گھنڈی توڑ منہ سے لگائیے اور اس طرح غٹا غٹ پی جائیے جیسے شربت کا گلاس منہ سے لگا ہو۔

اُستاد: آپ کے ہاں ٹپکا ہی ٹپکا ہے۔ یا پال بھی ہے۔

باغ والا: جی ہاں، پال بھی ہے بالکل تیار ہے اور اور قسم کے آم درکار ہوں تو دوسرے باغوں سے وہ بھی آسکتے ہیں۔

ماسٹر حنیف نے پوچھا: تمہارے ہاں تو تاپری بھی ہے؟ بی بی سعیدہ پوچھنے لگیں۔ اور آپ کے ہاں لکھنؤ کا سفیدہ بھی ہے۔ یہ سن کر سبھی ہنس پڑے۔ بھلا دلی کے باغ میں لکھنؤ کا سفیدہ! باغ والا بھی خوب ہنسا۔

غرض کچھ دیر اسی طرح کی بات چیت ہوتی رہی بھاؤ تاؤ ہوتا رہا۔ آخر دو من دیسی اور کچھ تراش کر کھانے کے لیے قلمی آم خریدے گئے اور بھئی آموں کا ڈھیر لگ گیا۔ آپ جانئے۔ آموں کو دیکھ کر کون قرار سے رہ سکتا ہے۔ بچے ان ڈھیروں پر حملہ کرنا چاہتے تھے

ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا " ابھی نہیں اک ذرا ٹھہرو"
انھوں نے بالٹیوں میں پانی بھر وایا۔ پانی میں
ل دوا ڈلوائی۔ اس میں آم بھگوئے اور دھوے
گئے۔ لڑکوں کی جماعت وار ٹولیاں بنیں۔ ہر ایک ٹولی
حصہ الگ ہوگیا۔ اور ہر ٹولی میں ایک ایک دو دو
ستاد بھی شریک ہوئے۔

کچھ دیر تو سب نے بڑے مزے سے آم کھائے
سی نے چوس کے۔ کسی نے تراش کر قاشیں بنائیں اور
وب جی بھر کر کھائیں۔ اب ذرا پیٹ جو بھرا تو شرارت
ی سوجھی۔ دیکھئے کیا ہیں کہ گٹھلیوں کی اور چھلکوں کی ہر
رف چاند ماری ہو رہی ہے۔ ایک صاحب خاموشی
سے بیٹھے آم چوس رہے ہیں کہ آم کی ایک گٹھلی کھٹاک
سے ان کے سر پر لگی سر جھنا گیا مگر پتہ نہ لگا کہ کس نے
یہ نشانہ لگایا۔ بہت گھبرائے، مگر مجبوراً انھیں بھی..
میدان میں آنا پڑا۔

اب کیا تھا کسی کے سر پر کسی کے کندھے پر کسی
کی توند پر چوٹ کی چوٹ لگی کپڑے الگ خراب ہوئے
مگر کسی نے برا نہیں مانا۔ قہقہوں کی آوازوں سے باغ
گونج اٹھا۔ سارے باغ میں گٹھلیوں، چھلکوں کا فرش
بچھ گیا۔ گھنٹے سوا گھنٹے بڑا لطف رہا۔

یہ چہل پہل دیکھ کر بہت سے گاؤں والے بھی جمع
ہوگئے۔ وہ بھی بچوں کو اچھلتا، کودتا، ہنستا، کھیلتا، دیکھ
کر ہنسنے اور خوش ہونے لگے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بیچ میں
نہ آکودتے تو یہ منظر کچھ دیر اور باقی رہتا۔

انھوں نے کہا اب بس کرو۔ کافی کھیل چکے۔ پھر سب
کے ہاتھ منہ دھلوائے۔ کپڑے ٹھیک کرائے۔ آس پاس
کے دیہات سے دودھ منگالیا تھا۔ ایک ایک گلاس سب

کو پلوایا۔ کہنے لگے۔ آم کھانے کے بعد دودھ پینا بہت
ضروری اور مفید ہوتا ہے۔

سعیدہ اور ان کی سہیلیاں آم کے ایک موٹے
سے گدرے یا ٹہنے میں جھولا ڈال چکی تھیں۔ اور مزے
سے جھول رہی تھیں۔ کچھ لڑکے ادھر سے فارغ ہوئے
تو ادھر پہنچے اور لڑکیوں سے اجازت لے کر باری باری
جھولنا شروع کیا۔ بعض لڑکوں نے ایسی پینگیں بڑھائیں
کہ دیکھ دیکھ جی ڈرتا تھا۔

ایک طرف کبڈی کا پالا ہوا۔ "چل کبڈی چل کبڈی"
اور وہ مارا وہ مارا کی دھوم مچی۔

ادھر یہ ہو رہا تھا ادھر قدرت کچھ اور انتظام
کر رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے کالی گھٹائیں گھر کر آگئیں۔
چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ پہلے ہلکی ہلکی بوندیں آئیں
اور پھر ایسی موسلا دھار بارش ہوئی کہ اللہ دے اور بندہ
لے۔ ایسا لگتا تھا کہ بادل کو جتنا برسنا ہے آج ہی برس
لے گا۔ باغ میں پانی ہی پانی ہوگیا۔ بیٹھنے کا بھی ٹھکانا
نہ رہا۔

اس بارش کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ کیا استاد
کیا شاگرد سب ایک رنگ میں رنگ گئے۔ خدا خدا کر کے
بوندیں تھمیں بادل چھٹے پر اب ہوا جو چلی تو مارے سردی
کے سب کپکپانے لگے۔ چار طرف ایک خاموشی سی چھائی
ہوئی تھی۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ حنیف صاحب
کا اچانک پیر پھسلا اور دھڑام سے زمین پر۔ سارے
کپڑے کیچڑ میں لت پت۔ اب تو لوگوں کو ہنسنے اور
قہقہے لگانے کا خوب موقع ملا۔ بے چارے حنیف کو۔
تھوڑی چوٹ تو لگی مگر پارٹی میں جان آگئی اور پھر
وہی ہنسی خوشی اور وہی چہل پہل دوبارہ لوٹ آئی۔

یہ اب دن ڈھلنے لگا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا "چلو واپس چلو"۔ یہ سنتا تھا کہ سب جھٹ پٹ لاریوں میں بیٹھ گئے۔ اور اسکول آکر دم لیا۔

بی سعیدہ اپنے ساتھ کچھ کچے آم لیتی آئی تھیں حنیف نے یونہی مذاق میں پوچھا: "کیوں بہن ان کا کیا بنے گا؟"

بی سعیدہ ہنس کر بولیں۔ "واہ بھیا واہ۔ آپ کو یہ بھی پتہ نہیں۔ یہ کچے آم بھی بہت کام کے ہیں۔ چٹنی ان کی بنائیے۔ اچار ان کا بنائیے۔ مربّا ان کا ملتا ہے۔ پھر لو سے بچنے کے لئے ان کا پنّا بنا کر پیتے ہیں۔ انھیں گڑ یا شکر میں پکاتے ہیں۔ بڑے مزے کا ہوتا ہے۔ اسے گڑنبا کہتے ہیں۔ اس کی قاشیں بنا کر سکھا لیتے ہیں اسے امچور یا آم کی کھٹائی کہتے ہیں۔ دال یا سالن میں ڈالتے ہیں میں تو اماں جان سے کہہ کر ان کا اچار ڈلواؤں گی۔۔۔۔ تو جناب اس کی اتنی چیزیں بنتی ہیں یا اور سمجھاؤں۔۔۔۔ کچھ اور سبق پڑھاؤں۔" حنیف صاحب کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے۔ ساتھیوں نے پھر ایک بار فرمائشی قہقہہ لگایا۔

یہ سیر کیسی خوش گوار رہی۔ آم کے باغ میں کیسا مزہ کیسا لطف آیا۔ بچوں کے دلوں پر اس کا اثر مدتوں رہا۔

(پیام تعلیم کے ایک پرانے پرچے سے)



بجناب شاہد علی وردھا

اُستاد کا رتبہ

زمانہ جانتا ہے علم ہے سب سے بڑی دولت — ہر اک انسان پر واجب ہے اس کی قدر اور قیمت
یہ دولت وہ ہے جو بڑھتی ہے ہر دم خرچ کرنے سے — نہیں مٹتا ہے اس کا نام اس دنیا میں مرنے سے
اسے حاصل کرے جو آدمی انسان بنتا ہے — وہ اہلِ علم ہو کر ہر طرح ذی شان بنتا ہے
حصولِ علم ہی دنیا میں رازِ کامیابی ہے — اسی کے دم سے روشن آج شمعِ کامرانی ہے
اسی کے ہاتھ نے ہر قوم کو اونچا اٹھایا ہے — اسی نے اشرف المخلوق انسان کو بنایا ہے
اسی سے ہم نے طبقاتِ فلک کا راستہ پایا — کرشمہ علم ہی کا ہے کہ انسان چاند تک پہنچا
کرشمے کیسے کیسے علم کا پتلا دکھاتا ہے — جو ناممکن ہو اس کو ہر طرح ممکن بناتا ہے
علومِ ظاہری اور باطنی دنیا میں ہیں جتنے — وہ سب اُستاد ہی نے سارے عالم کو ہیں سکھلائے
جب اتنی علم کی قیمت ہے تو جو علم سکھلائے — نہ کیوں پھر اپنے رتبے کے مناسب مرتبہ پائے
ہو دولت مند کوئی چاہے کوئی ملک کا راجہ — مگر استاد کا دُنیا میں ہمسر ہو نہیں سکتا
جو ہیں اہلِ نظر کرتے ہیں وہ استاد کی عزت — سمجھتے اہلِ دل ہیں کیا ہے اس کی قدر اور قیمت
مگر ہم ہیں کہ قدر و منزلت کرتے نہیں اس کی — اسی باعث نہیں ملتی ہے ہم کو علم کی پونجی
اگر تم چاہتے ہو یہ زمانے میں رہو بڑھ کر — تو اُستادوں کے قدموں کو جگہ دو اپنی آنکھوں پر

عزیزو ساتھیو گر تم کو شوقِ کامرانی ہے
تو یہ پیغامِ نصرت ہے جو شاہد کی زبانی ہے

چوری کا خاتمہ

جناب شاکر حسین چاند

اکبر پور اور آس پاس کے علاقوں میں چوری کی نئی نئی وارداتیں ہورہی تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے دن کسی نہ کسی کے یہاں چوری ضرور ہوجاتی۔ یکے بعد دیگرے سبھی ذی حیثیت لوگ چوری کا شکار ہورہے تھے۔

اس بلا سے بچنے کے لئے لوگوں نے بہت سی تدبیریں اختیار کیں لیکن ہمیشہ انہیں ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ نہ جانے کتنی راتیں لوگوں نے جاگ جاگ کر گزاریں۔ کہ جیسے ہی چور آئے وہ لوگ مل کر انھیں رنگے ہاتھوں گرفتار کرلیں۔ لیکن جس گاؤں کے لوگ جاگتے وہاں تو چوری نہ ہوتی، پاس کے کسی دوسرے گاؤں میں ہوجاتی۔ اس طرح لوگ چوروں کو پکڑ نہیں پارہے تھے اور ان کی کارستانیاں بڑھتی جارہی تھیں لوگوں کا قیاس تھا کہ چوروں کا ایک باقاعدہ گروہ ہے۔ اور علاقے کے قریب قریب ہر گاؤں کے ایک دو آدمی اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے جس گاؤں کے لوگ جاگتے ہیں۔ وہاں تو چوری نہیں ہوتی پاس کے کسی دوسرے گاؤں میں ہوجاتی ہے۔ چوری کے اس جرم کو اس حد تک بڑھتے دیکھ کر عام لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ سر شام ہی لوگ دروازہ بند کرلیتے تھے۔

اکبر پور کا مکھیا ایک چالاک آدمی تھا۔ وہ امیر بھی بہت تھا۔ اس کے باپ دادا اتنے امیر نہیں تھے۔ لیکن اس نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کمایا۔ وہ کافی مالدار ہوگیا تھا دولت ہی کی وجہ سے گاؤں والوں پر اس کا رعب بھی بہت تھا۔ اور اسی دولت کے بل پر وہ وہاں کا مکھیا بن بیٹھا تھا۔

گاؤں والوں کو کبھی کبھی مکھیا جی کا اتنی جلدی امیر بن جانا کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ لیکن اس کا رعب اور خوف اتنا تھا کہ لوگ ایک دوسرے سے اس حیرت کی بات کا اظہار کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ چوری کو روکنے کے لئے مکھیا جی نے ایک اعلان کیا۔ جس کے مطابق کسی بھی چور کو رنگے ہاتھوں پکڑنے والے آدمی کو چور کے گھر کی ساری چیزیں انعام میں دے دی جائیں گی۔

اکبر پور میں فضلو نام کا ایک بےحد غریب آدمی رہتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ فضلو کے باپ دادا امیر تھے لیکن وہ بھی اسی خوفناک چوری کا شکار ہوگئے

بیچارہ فضلو کسی طرح محنت مزدوری کرکے اپنے چھوٹے سے کنبے کا خرچ چلاتا تھا۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے اس کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ اور وہ مزدوری کرنے کے قابل نہیں رہا تھا جو کچھ گھر میں سامان موجود تھا۔ اس کی بیماری میں بک گیا۔ کھانے کو بھی گھر میں کچھ باقی نہ رہا۔ بیماری کی وجہ سے وہ سوتے میں بڑبڑانے بھی لگا تھا۔

ایک رات فضلو کا ایک دوست اس سے ملنے کے لئے آیا۔ اس نے فضلو کو مکھیا جی کے اس اعلان کے بارے میں بتایا جو اس کے بیمار پڑنے کے بعد کیا گیا تھا۔ یہی سب باتیں کرتے کرتے فضلو سو گیا۔ اس کے بعد اس کا دوست بھی اٹھ کر چلا گیا آدھی رات کے قریب فضلو کی بیوی کی آنکھ کھل گئی کیونکہ

اس نے کوئی آواز سنی تھی اس نے سنا کہ فضلو بول رہا تھا۔

" چور۔ چور۔ پکڑو۔ پکڑو !!" اس کی بیوی بھی بغیر کچھ سوچے سمجھے چیخ اٹھی۔

" چور۔ چور۔ پکڑو۔ پکڑو !!"

اتفاق کی بات چور اس وقت پڑوس کے ایک گھر میں چوری کر رہے تھے انھوں نے آواز سنی اور بھاگے اس وقت تک پڑوس والے بھی جاگ چکے تھے۔ لوگ ٹارچ لے کر آواز کی طرف دوڑے۔ انھوں نے کئی آدمیوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا اور ان کا پیچھا کیا۔ کچھ چور تو بھاگ نکلے۔ مگر ایک پیچھے رہ گیا۔ اس نے دوڑتے ہوئے پیچھے کی طرف دیکھا اور اسی وقت دیوار سے ٹکرا گیا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

دوڑتے ہوئے لوگ اس کے پاس پہنچے۔ لیکن جب ٹارچ جلا کر لوگوں نے چور کو دیکھا تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اپنی آنکھوں پر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیوں کہ چور تو ان کے گاؤں کا مکھیا تھا۔ اب ان لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ وہ اتنا امیر کیسے بن گیا۔

دیوار سے ٹکرانے کی وجہ سے اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ خون کافی نکل آیا تھا

بہت دیر کے بعد جب وہ پوری طرح ہوش میں آیا تو اس نے جرم کا اقبال کر لیا۔ اور اپنے گروہ کے سبھی چوروں کے نام بھی بتا دیئے۔ اس نے بتایا کہ چونکہ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ کوئی اسے پکڑ ہی نہیں سکتا اس لئے اس نے ایسا اعلان کیا۔ دوسری بات یہ کہ اسے ڈر تھا کہ اگر وہ اعلان نہیں کرے گا تو لوگ اس پر شک کرنے لگیں گے۔

دوسرے روز چوروں کے گھروں کی سب چیزیں ضبط کر لی گیئں۔ اور انہیں چوری کے شکار لوگوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اعلان کے مطابق فضلو کو مکھیا جی کے گھر کی چیزوں کا مالک بنا دیا گیا۔ دولت حاصل ہو جانے کی خوشی میں فضلو تندرست ہو گیا۔

یہ خبر پڑوس کے گاؤں میں بھی آناً فاناً پھیل گئی اور سبھی لوگ خوش تھے کہ چوری کا خاتمہ ہو گیا۔

جناب اثر صہبائی

زبیرؔ کے نام

اے میرے لختِ جگر، نورِ نظر، راحتِ جاں
ہر خوشی تجھ پہ زمانے کی نچھاور کر دوں۔

(۱)
آج تک خواب جو دیکھے تھے سہانے میں نے
ان حسین خوابوں کی اک جاگتی تعبیر ہے تو
ایک مدت سے جو ارمان تھے میرے دل میں
اُنہی ارمانوں کی منہ بولتی تصویر ہے تو

(۲)
کون آیا ہے چمن میں لئے فصلِ گل کو
ہر کلی کھِل اٹھی پھولوں کو ہنسی آئی ہے
میری قسمت میں خوشی کا تو کہیں نام نہ تھا
تجھ کو پایا تو زمانے کی خوشی پائی ہے

(۳)
زندگی نام ہے اک جہدِ مسلسل کا زبیرؔ
اس میں کچھ مرحلے دشوار بھی آسان بھی ہیں
عزم محکم ہے تو کانٹوں پہ بھی آئے گی بہار
یعنی تخریب میں تعمیر کے سامان بھی ہیں

(۴)
میری حسرت ہے یہی میری تمنا ہے یہی
تو بڑا ہو کے زمانے میں بڑا نام کرے
ہر زباں پر ہو تیرا ذکر، تیری تعریفیں
ہر نفس تجھ پہ خدا بارشِ انعام کرے

(۵)
اب تو رہ رہ کے نکلتی ہے یہی دل سے دعا
چاند کی طرح تیرے بخت کا انداز رہے
انکساری تیری فطرت بنے اس عزم کے ساتھ
تو ستاروں کی طرف مائل پرواز رہے
اے میرے لختِ جگر، نورِ نظر، راحتِ جاں

سفرنامہ ابن بطوطہ

(مولانا مقبول احمد سیوہاروی)

معلوم ہوا کہ شادی کے دن ہر ایک کا پردہ اٹھ جاتا ہے. کیا غریب کیا امیر ہر ایک ان بیگمات کو دیکھ سکتا ہے۔ دلہن کے سر پر سہرا تاج تھا اور اس کے ساتھ چالیس بیگمات تھیں۔

پھر دلہن ممبر پر بیٹھی. سامنے ناچنے گانے والیاں اپنے کمالات دکھا رہی تھیں. اتنے میں دولھا زرق برق لباس پہنے آیا. ہاتھی پر سوار تھا. اور سر پر سہرا تاج تھا. دولھا کے دائیں طرف ایک سو شہزادے اور امیرزادے سفید لباس پہنے زرکار گھوڑے کداتے چلے آ رہے تھے. یہ سب لڑکے تھے اور دولھا کے ہم عمر تھے.

دولھا کے آتے ہی روپیوں اور اشرفیوں کی بکھیر کی گئی ایک طرف بادشاہ بیٹھا تھا. دولھا نے بادشاہ کے قدم چومے اور ممبر پر دلھن کے پاس جا بیٹھا.

دلھن نے دولھا کے ہاتھوں کو چوما اور برابر جا بیٹھی پھر پان آئے. دولھا نے دلھن کے منہ میں پان دیا. اور دلھن نے دولھا کے منہ میں پان دیا. دولھا نے اپنے منہ میں رکھ کر دلھن کے منہ سے منہ ملایا. اور اپنے منہ کا پان دلھن کے منہ میں دیا. اس کے بعد پردہ ڈال دیا گیا. اور دونوں کو ممبر سمیت اٹھا کر محل میں پہنچا دیا گیا. اس کے بعد کھانا لایا گیا.

سماترا میں میرا قیام دو مہینے رہا. سماترا سے کولم کولم سے کالی کٹ پہنچ کر اپنے ملک کی طرف چلا. دلی جانے کو جی.. چاہا مگر بادشاہ کے ڈر سے ہمت نہ ہوئی.

محرم ۷۴۸ھ کی دسویں تاریخ تھی کہ ظفار پہنچ گیا۔ اور سمندر کے راستے سے مسقط پہنچ گیا. پھر شیراز گیا. جہاں.. قاضی مجدالدین کی زیارت کی.

دمشق پہنچ کر شیخ نورالدین سخاوی سے ملاقات ہوئی.

سمندری سفر اور جگہ جگہ کی آب و ہوا نے اور پھر بیس برس کی مدت نے مجھ میں اتنی تبدیلی پیدا کردی تھی. کہ سخاوی صاحب نے مجھے پہچانا نہیں. اور جب میں نے بتایا کہ ابن بطوطہ ہوں تو مجھ سے لپٹ گئے.

سخاوی صاحب سے معلوم ہوا کہ یہاں مدرسہ ظاہریہ میں میرے ایک ہموطن عالم ہیں. میں ان سے ملنے گیا کہ وطن کا حال معلوم کروں اور جب یہ معلوم ہوا کہ میرے والد رحلت کر گئے ہیں بس والدہ رہ گئی ہیں تو بڑا رنج ہوا

حلب پہنچا تو ایک نیا واقعہ سننے میں آیا۔

یہاں ایک درویش تھے جنھیں شیخ المشائخ کہتے تھے شہر عینتاب کے باہر پہاڑ میں رہتے تھے. ان کے پاس دور دور سے لوگ آتے تھے. اور دعا کراتے تھے.

شیخ المشائخ کا ایک مرید تھا. اس نے شادی نہ کی تھی۔ یہ مرید ایک دن باتیں کرتے کرتے بولا. پیغمبر بغیر شادی کے نہ رہ سکتے تھے مگر میں رہ سکتا ہوں. شیخ المشائخ نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دی. قاضی کو خبر پہنچی تو اس نے گواہ طلب کئے اور جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ مرید نے ایسے جملے کہے تھے. اور پیر نے تائید کی تھی. تو دونوں کو قتل کرا دیا. قتل کا فتویٰ چاروں مذہب کے

قاضیوں نے متفقہ طور پر دیا تھا۔

شہاب الدین مالکی، ناصر الدین اورہم حنفی۔ تقی الدین ابن صائب شافعی۔ عزیز الدین دمشقی حنبلی ان سب کا یکساں فتویٰ اور یکساں فیصلہ تھا۔

اسی زمانے میں دمشق اور دمشق کے آس پاس۔ غزہ، حمص، عجلون میں وبا پھوٹ پڑی۔ دمشق کا تو یہ حال ہوا کہ ایک ایک دن میں دو دو ڈھائی ڈھائی ہزار آدمی مرنے لگے۔ یہ ۷۴۹ھ کا سال تھا۔

جب میں قاہرہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ قاضی عزیز الدین بن بدر الدین ایک بڑی جماعت کے ساتھ مکہ معظمہ تشریف لے جا رہے ہیں۔ اس قافلے کا نام رجبی تھا، کیونکہ رجب کے مہینے میں چلا تھا۔

قاہرہ سے چل کر مکہ معظمہ پہنچا اور رمضان المبارک کا پورا مہینہ مکہ میں گزارا۔ مکے کے بزرگوں میں میری ملاقات شیخ شہاب الدین حنفی۔ شہاب الدین طبری۔ ابو محمد یافعی۔ نجم الدین اصفونی سے ہوئی۔

حج کر کے شامی قافلے کے ساتھ مدینہ پاک گیا۔ پھر قاہرہ واپس آگیا۔

قاہرہ میں امیر المومنین ابو عنان کی اتنی شہرت سنی۔ کہ تیونس جانے کا شوق پیدا ہو گیا۔ یہ ۷۵۰ھ کی بات ہے۔ چھوٹی کشتی میں سوار ہو کر پہلے جربہ گیا اور کچھ دور تک جہاز میں بیٹھ کر تیونس پہنچ گیا۔ اور ابو الحسن والیِ تیونس سے ملاقات ہوئی۔

یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ میری والدہ بھی اس جہانِ فانی سے رحلت کر گئیں۔ یہاں سے اندلس چلا گیا یہ وہ زمانہ تھا کہ الفانسو دس مہینے سے جبل الطارق گھیرے پڑا تھا۔ چاہتا تھا کہ اندلس سے مسلمانوں کو نکال دے کہ وبا نے اُسے ہلاک کر دیا۔

جبرالٹر کو جبل الطارق اور جبل الفتح (فتح کا پہاڑ) بھی کہتے ہیں۔ یہاں رملہ، سہیل اور پھر مالقہ پہنچا۔ مالقہ اندلس کا پایۂ تخت ہے۔ مالقہ کے چینی کے برتنوں پر سنہرا کام ہوتا ہے۔ یہاں کے انار بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ انھیں یاقوتی کہتے ہیں۔

غرناطہ: غرناطہ کی کون تعریف کر سکتا ہے۔ دُنیا کی تمام خوبیاں غرناطہ میں جمع ہیں۔ اس کی تعریف کے لیے پوری ایک کتاب بھی کافی نہیں ہو سکتی۔

غرناطہ کا فرمانروا ابو الحجاج یوسف بن سلطان اسمٰعیل ہے۔ ان دنوں بیمار تھا۔ اس لیے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ سلطان کی والدہ نے میرے لیے کچھ اشرفیاں بھیجیں۔ غرناطہ میں جن بزرگوں سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ یہ ہیں۔ ابو القاسم محمد بن احمد الحسینی محمد بن ابراہیم بیانی، قاضی ابو البرکات، مشہور شاعر ابو جعفر احمد بن رضوان جس کا کمال یہ ہے کہ قطعاً ناخواندہ اور جاہل ہے مگر بے مثال شعر کہتا ہے۔ شیخ الشیوخ عمر بن شیخ الصالح ابو عبداللہ محمد بن محروق۔ انھی کی ہم راہی میں شہر نیرہ کے کھنڈرات دیکھنے کا موقع ملا۔

غرناطہ میں حاجی عبداللہ سمرقندی، حاجی احمد تبریزی حاجی حسین خراسانی۔ حاجی علی ہندی، حاجی رشید ہندی زیادہ مشہور ہیں۔

یہاں سے امیلا، سلا ہو کر مراکش پہنچا۔

مراکش: بہت خوبصورت اور کشادہ شہر ہے۔ مسجدیں بڑی شاندار ہیں۔ ایک مینار اتنا بلند ہے کہ اس پر چڑھ کر سارے شہر کا منظر سامنے آجاتا ہے۔ مراکش ویران ہوتا جا رہا ہے۔ واپس کلا اور سے گزر کر فاس پہنچا۔ اور۔۔

سوڈان چلا گیا۔ یہ ۱۳۵۳ء کا سال تھا۔

تغازی:۔ یہ نمک کا شہر ہے تغازی کے گھروں اور مسجدوں کی دیواریں نمک کی ہیں چھتیں اونٹوں کی کھال کی ہیں یہاں نمک کی کان ہے۔ زمین کھودی جاتی ہے تو نیچے اوپر نمک کی سلیں ملتی ہیں۔ حبشی یہاں سے نمک کی سلیں لے جاتے ہیں۔

تغازی کا پانی بے حد کھاری ہے مکھیاں بکثرت ہیں یہاں ہم نے بڑی مشکل سے دس دن گزارے۔ کچھ دور چلنے پر ایسا جنگل ملا جہاں ریت کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہوا کے زور سے ریت کے ٹیلے بن جاتے ہیں۔

اس سے اگلا جنگل صاف ہے۔ چوروں کا ڈر بھی نہیں ہے یہاں جنگلی گائیں بکثرت ہوتی ہیں۔ انھوں کتوں سے شکار کرتے ہیں۔ گائے کا گوشت کھایا جاتا ہے تو پیاس بڑھ جاتی ہے۔ اور بخار آ جاتا ہے۔ سانپ بھی بکثرت ہوتے ہیں۔

سوڈان:۔ ربیع الاول میں ہم سوڈان کے پہلے شہر میں پہنچے۔ اس کا نام ہیل یا سا ہے۔ یہاں کا ہر آدمی ماموں کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ وراثت بھی بھانجے کو پہنچتی ہے یہ رواج میں نے یا تو یہاں دیکھا یا مالا بار میں۔ یہ لوگ مسلمان ہیں۔ نماز کے پابند اور حافظ قرآن ہیں۔ عورتیں مردوں سے پردہ نہیں کرتیں۔

مالی شہر جاتے ہوئے ہمارا راستہ بڑے آرام سے گذرا۔ یہاں ہر طرح کا امن ہے اور تنہا سفر کیا جا سکتا ہے جگہ جگہ سایہ دار درخت ہیں۔ اتنے بڑے کہ ان کے سایے میں قافلے ٹھہر سکتے ہیں کھوکھلی جڑوں میں برسات کا پانی بھر جاتا ہے تو اسے پیتے ہیں۔ بعض درختوں میں شہد کے چھتے لگے رہتے ہیں۔ لوگ انہیں توڑ کر لے جاتے ہیں۔

میں نے ایک ایسا درخت دیکھا جس کھوکھل میں ایک جلاہا بیٹھا کپڑا بن رہا تھا۔ یہاں لوگ کدو سکھا کر چھلکے کے پیالے بناتے ہیں۔ ان پر پھول بنے بنا کر کام میں لاتے ہیں۔

مالی کا بادشاہ اکثر ایک بلند برج میں جس کا دروازہ شاہی محل کے اندر ہے، بیٹھا جاتا ہے۔ برج کے دروازے لکڑی کے ہیں۔ جن پر چاندی چڑھی ہوئی ہے۔ دروازوں پر ریشم کے پردے پڑے رہتے ہیں۔

بادشاہ برج میں بیٹھتا ہے تو پردے اٹھا دیئے جاتے ہیں۔ اور دروازے کی جالی پر ریشمی جھنڈا لہرا دیا جاتا ہے۔ نوبت نقارے بجنے لگتے ہیں۔ پھر محل میں سے تین سو غلام نکل آتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے، کمانیں اور ڈھالیں ہوتی ہیں۔ نیزے والے دائیں بائیں اور کمانوں والے دونوں طرف بیٹھ جاتے ہیں۔ حبشیوں سے زیادہ کوئی قوم اپنے بادشاہ کا ادب نہیں کرتی۔

برج کے اجلاس کے وقت بادشاہ کسی کو بلاتا ہے تو یہ آدمی اپنا لباس اتار کر میلے اور پرانے کپڑے پہن لیتا ہے۔ میلی ٹوپی سر پر رکھ لیتا ہے پنڈلی تک پائنچے چڑھا کر زمین پر کہنیاں ٹیکتا ہوا جاتا ہے۔ بادشاہ بات کرتا ہے تو مجلس کے تمام لوگ سروں سے پگڑی اتار دیتے ہیں۔ اور جب تک بادشاہ بات کرتا رہتا ہے چپ چاپ سنتے رہتے ہیں۔

اگر کوئی آدمی اظہار وفاداری کرتا ہے۔ تو اپنی کمان کھینچ کر دفعتاً چھوڑ دیتا ہے جس سے آواز نکلتی ہے "جھن" اور جوں ہی بادشاہ کہتا ہے تو نے سچ کہا" تو اپنا عمامہ اتار دیتا ہے۔ اور سر پر خاک ڈالتا ہے گویا حد درجہ عاجزی کا اظہار کرتا ہے

دو عیدیں: یہاں میری دو عیدیں ہوئیں۔ اس لیے عید کے رسم و رواج دیکھنے کا پورا موقع مل گیا۔ سب سے دلچسپ رواج یہ ہے کہ ساز جس کے نیچے چھوٹے چھوٹے کدو لگے رہتے ہیں۔ بجایا جاتا ہے جس کے ساتھ گانا بھی ہوتا رہتا ہے۔ گانے والے بادشاہ کی تعریف کرتے ہیں اور اس کی لڑائی

باقی صفحہ ۳۴

مناظر عاشق ہرگانوی

ایک تین کھبے

میاں فرید کے گھر کے پیچھے ایک باغیچہ ہے۔ وہاں ایک درخت کی شاخ پر دو گھونسلے تھے۔ ایک چڑیا کا دوسرا توتے کا۔ چڑیا اور توتا پاس پاس رہتے تھے، مگر دونوں میں جان پہچان نہیں تھی۔

ایک دن شام کے وقت توتے نے دیکھا کہ چڑیا اپنے گھونسلے میں بیٹھی رو رہی ہے۔ کچھ دیر تک وہ اس کے رونے کی آواز سنتا رہا۔ آخر جب اس سے نہ رہا گیا تو وہ چڑیا کے گھونسلے کے پاس گیا اور بولا "بہن! کیا بات ہے۔ کیوں رو رہی ہو؟ کیا میں تمھاری کچھ مدد کر سکتا ہوں؟"

چڑیا نے کہا: "بھائی! کیا بتاؤں، میرے گھونسلے سے کوئی بچہ اٹھا لے گیا ہے۔"

توتا بولا "یہاں سے کون لے گیا ہوگا؟ اتنے سال ہو گئے یہاں رہتے آج تک ایسا نہ ہوا۔"

توتا اپنے گھونسلے میں چلا گیا۔ لیکن چڑیا کو اس کی یہ بات بری لگی۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی اور چڑے کا انتظار کرنے لگی جو بچے کو ڈھونڈنے گیا تھا۔

دوسری شام کو چڑیا نے دیکھا کہ توتا اپنے گھونسلے میں بیٹھا رو رہا ہے۔ چڑیا اپنے گھونسلے سے اڑ کر توتے کے گھونسلے کے پاس پہنچی اور بولی "توتے بھائی کیا بات ہے کیوں رو رہے ہو؟"

توتے نے کہا "بہن آج کوئی میرا بھی بچہ لے گیا ہے۔"

چڑیا بولی۔ "توتے بھائی، گھبراؤ مت۔ اس کے پر آنے لگے ہیں، کہیں اڑ گیا ہوگا۔" چڑیا اپنے گھونسلے میں جا بیٹھی۔ لیکن توتے کو بہت برا لگا۔ لیکن کیا کرتا۔ کل اس نے چڑیا کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا تھا۔

اس واقعہ کو گزرے ہوئے بہت دن ہو گئے۔ چڑیا اور توتے نے پھر انڈے دیئے اور ان سے بچے بھی نکل آئے۔

ایک دن چڑیا اپنے گھونسلے میں بیٹھی اپنے بچے کو پیار کر رہی تھی۔ توتے نے چڑیا کے گھونسلے کے پاس جا کر آواز دی "چڑیا بہن"۔ "چڑیا بہن" چڑیا بہت خوش ہوئی۔ وہ باہر آ کر بولی۔ "آؤ توتے بھائی، بیٹھو۔ آج ہماری یاد کیسے آ گئی؟"

توتے نے کہا۔ یہاں آس پاس ایک نٹ کھٹ لڑکا رہتا ہے۔ وہی ہمارے بچے چراتا ہے۔ میں نے اسے پھر منڈلاتے دیکھا ہے۔ اس لیے پریشان ہوں۔" چڑیا بھی پریشان ہو گئی۔ پھر دونوں نے سوچا کہ جگہ بدل دیں۔ مگر اتنے سالوں سے وہاں رہ رہے تھے اس لیے خواہش کے باوجود وہ جگہ نہ بدل سکے۔ آخر دونوں نے فیصلہ کیا کہ جب چڑیا بچوں کیلئے دانہ لانے جائے گی تب توتا دونوں گھونسلوں کی حفاظت کرے گا۔ اور جب توتا دانہ دنکے کی تلاش میں جائے گا تب چڑیا دونوں گھونسلوں کی حفاظت کرے گی۔

میاں فرید نے جب یہ دیکھا کہ دن میں توتا یا چڑیا میں سے ایک نہ ایک بیٹھا رہتا ہے تو فیصلہ کیا کہ وہ بچے چرانے

کا کام رات میں کرے گا۔ رات ہوتے ہی اس نے درخت پر چڑھ کر توتے کے گھونسلے میں ہاتھ ڈالا۔ توتا جاگ رہا تھا وہ انسان کی بو سے سمجھ گیا کہ فرید کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس نے فرید کے ہاتھ میں زور سے کاٹ لیا اور چلانے لگا تاکہ چڑیا بھی ہوشیار ہو جائے۔ فرید کو بڑا غصہ آیا۔ مگر کیا کرتا۔ اس کے ہاتھ سے خون بہنے لگا تھا۔ وہ درخت سے نیچے اتر آیا اور گھر کی راہ لی۔

دوسرے دن صبح.. چڑیا نے توتے سے پوچھا "تم رات کو کیوں چلا رہے تھے؟" توتے نے ساری بات بتا دی۔ دونوں بڑے دکھی ہوئے۔ اسی غم میں اس دن انھوں نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں اور جب شام ہو گئی تو پھر رونے لگے۔

چڑیا اور توتے کی آواز سن کر اسی درخت پر رہنے والے چمگادڑ کی نیند ٹوٹ گئی۔

چمگادڑ نے کہا۔ "کیوں دوستو کیوں رو رہے ہو؟ تمھارا تو سونے کا وقت ہو چکا ہے۔ اب تو صرف ہم جاگیں گے۔"

چڑیا اور توتے نے اپنے رونے کی وجہ اسے بتا دی۔

چمگادڑ نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "گھبراؤ مت، میں تمھاری مدد کروں گا لیکن تمھیں بھی میری مدد کرنی ہوگی۔ بولو تیار ہو؟"

چڑیا اور توتا دونوں فوراً ہی راضی ہو گئے۔ تب چمگادڑ نے بتایا: "وہ نٹ کھٹ لڑکا مجھے بھی تنگ کرتا ہے۔ میں دن میں جب الٹا لٹک کر سوتا رہتا ہوں تو وہ پتھر مارتا ہے۔" اس نے اپنے زخم دکھائے، پھر کہا: "رات میں میں بھی تمھاری حفاظت کروں گا اور دن میں تم میری حفاظت کرنا۔"

توتا اور چڑیا نے چمگادڑ کا شکریہ ادا کیا۔ اور مطمئن ہو کر سو گئے۔

لیکن ابھی رات کے دس ہی بجے تھے کہ فرید بڑی آہستگی سے باغیچہ میں داخل ہوا۔ اور درخت پر چڑھنے لگا۔ توتے اور چڑیا کی آنکھ کھل گئی۔ چمگادڑ فرید کی حرکتیں دور سے بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ آج فرید اپنے ساتھ ڈنڈا لے کر آیا تھا تاکہ توتے کی مرمت کر سکے جس نے اسے کاٹ کھایا تھا۔ لیکن وہ ابھی توتے پر ڈنڈا چلا بھی نہیں پایا تھا۔ کہ چمگادڑ اڑا اور اس کی ناک سے چپک گیا۔ فرید زور زور سے چلانے لگا مگر وہاں تھا کون جو اس کی سنتا۔

فرید جیسے تیسے درخت سے نیچے اترا اور گھر کی طرف بھاگ پڑا۔ توتا اور چڑیا بھی اپنے اپنے گھونسلے میں بیٹھے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد چمگادڑ لوٹ آیا۔ اس نے بتایا کہ فرید کے گھر والوں کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اور اتنی رات گئے باہر جانے پر فرید کو خوب سزا ملی ہے۔ اب وہ ہماری طرف رخ بھی نہ کرے گا۔

جناب محمد یاسین
مالی گاؤں

توانا وہ جو دانا ہو

ایک دن ایک بلّی نے ایک کسان کے گھر سے گوشت کا ٹکڑا چرا لیا۔ کسان نے اسے دیکھ لیا۔ لکڑی لے کر اسے دوڑایا بلّی بھاگتے بھاگتے پہاڑوں کی طرف نکل گئی

اتفاق سے ایک چیتا ادھر سے گذر رہا تھا۔ بلّی کو دیکھ چیتے کو بڑا اچنبھا ہوا۔ شکل و شباہت میں تو وہ اس سے بہت ملتی جلتی تھی مگر قد و قامت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

ادھر بلّی چیتے کو دیکھ کر ڈری جا رہی تھی اور اس سے دور بھاگنا چاہتی تھی کہ چیتے نے اسے بڑی نرمی سے پاس آنے کو کہا بلّی ڈری سہمی اس کے پاس پہنچی اور میاؤں کر کے کھڑی ہو گئی۔

چیتے کو بلّی کی آواز پر بھی تعجب ہوا

چیتے نے حیرت سے کہا۔ "تیری آواز کتنی باریک اور سُریلی ہے۔ کیا تو ہماری نسل سے نہیں۔ تیرے جسم کی شان و شوکت اور آواز کی گرج کو کیا ہو گیا۔؟ ہماری نسل کا خاصہ تو بے خوفی بے باکی اور نڈر پن ہے۔"

ہمدردی کے ان بولوں سے بلّی کی ڈھارس بندھی اس کا ڈر کچھ کم ہوا۔ اور اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "حضور میں بلّی کہلاتی ہوں۔ آپ ہی کی نسل سے ہوں۔ یہ میری مصیبت کی کہانی نہ سنیں تو بہتر ہے۔"

چیتے نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "بی بلّی مت رو۔ رونا دھونا شیر بچوں کو زیب نہیں دیتا۔ مجھے بتلاؤ تم پر کیا آفت آئی ہے۔ تمہارا دشمن کون ہے کس نے تمھیں اس حالت کو پہنچایا ہے۔؟"

بلّی نے آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔ "کسی دشمن کے ہاتھوں یہ مصیبت پڑی ہوتی تو صبر و شکر کر لیتی۔ رونا تو یہ ہے کہ یہ ساری آفتیں اس کے سبب ہیں جسے ہم دوست سمجھتے ہیں۔ ہمارا دوست ہی ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے۔"

چیتے نے کہا۔ "بی بلّی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دوست دشمن کیسے ہو سکتا ہے۔ دوست تو برے وقت کام آتا ہے دوست رازدار مددگار اور غمخوار ہوتا ہے۔ دوستی پر اپنی جان تک نچھاور کر دیتا ہے تمھارا دوست کیسا ہے۔ ایسا کون ہے جو دوستی کے پردے میں تم سے دشمنی کرتا ہے۔؟"

بلّی نے کہا۔ "انسان! اسی انسان کے ہاتھوں میری یہ درگت بنی ہے۔ اور اسی کے ڈر سے بھاگ کر اس جگہ پناہ کی خاطر پہنچی ہوں۔"

انسان سے چیتے کا سابقہ اب تک نہ پڑا تھا۔ نہ تو اس نے کبھی اسے دیکھا تھا اور نہ کبھی اس کا نام سُنا تھا۔

چیتے نے دریافت کیا۔ "یہ انسان کیا چیز ہے۔؟ انسان کیسا ہوتا ہے اور اس کی دوستی کیسی ہوتی ہے۔؟"

بلّی نے جواب دیا۔ "انسان دو پیروں والا جانور ہے بڑی سوجھ بوجھ رکھتا ہے ساتھ ہی ساتھ بڑا ظالم اور خطرناک بھی۔ نہ تو اس کی دوستی اچھی نہ دشمنی اچھی۔"

جنگل کی زندگی چھوڑ ہم انسانوں کے ساتھ دیہاتوں اور شہروں میں جا بسے کہ انسان کے ساتھ مزے کی زندگی گزاریں گے۔ مگر انسان بھی بڑا عجیب ہے۔ مہربانی کرنے پر آئے تو نہال کر دے اور ظلم کرنے پر آئے تو جان ہی لے لے۔

انسان بڑا ہی جذباتی بڑا ہی موڈی ہوتا ہے۔ کبھی شعلہ کبھی شبنم، کبھی آگ ہے تو کبھی پانی۔ ہم بلیاں اس کے گھروں کو چوہوں سے پاک کریں اور اس کے اناج اور غلے کی حفاظت کریں۔ اور اگر اتفاق سے کسی روز چوہے نہ ملیں اور اس پاپی پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے جہاں ہم نے اس کی کسی چیز پر ہاتھ صاف کیا کہ اس کے عتاب اس کے ظلم کا نشانہ بنے

آج بھی یہی ہوا۔ میں نے ہانڈی سے ذرا سا گوشت کا ٹکڑا اڑا لیا۔ تو لکڑی لے کر میرے پیچھے پڑ گیا۔ یہاں تک کہ مجھے جان بچانے کی خاطر بھاگ آنا پڑا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ انسان کے ہاتھوں ہمیں کیا کچھ سہنا پڑتا ہے۔ یقین الو اگر تم بھی اس کے پلے پڑ گئے تو تمھارا حال ہم سے بدتر ہوگا۔

چیتے کو بلّی کی اس بات سے بڑی چڑ ہوئی۔ فوراً تلخی سے بولا۔

" غلطی تو سراسر تمھاری ہے۔ تم لوگوں نے بھیک مانگنے اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ تمھیں مفت خوری کی عادت پڑ گئی ہے۔ ورنہ مجال ہے کہ آدمی تمھارا بال بھی بیکا کر سکے ہماری نسل ہمیشہ سے حکمرانی کرتی آئی ہے۔ غلام بن کر جینا ذلّت ہے۔ اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو بڑائی جتلانے والے کی دھجی ادھیڑ کر رکھ دیتا۔ میں اپنے کسی بھی ہم ذات کی بے عزتی برداشت نہ کر سکتا۔ چلو مجھے انسان کا پتہ بتاؤ تاکہ میں شیر کی نسل کی بے عزتی کا بدلہ لے سکوں۔ اور تمھیں مصیبت سے چھٹکارا دلوں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"

بلّی نے کہا۔" اگر ایسا ہو تو گویا آپ نے اپنا فرض پورا کیا۔ جنگل کے راجہ کا انصاف ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ مگر یاد رکھیئے انسان بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ اس کا مقابلہ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ سوائے موت کے اس پر کوئی فتح نہیں پا سکتا۔"

چیتے نے غرّاتے ہوئے کہا۔" گھبراؤ مت آگے آگے چلو اور انسان تک میری رہنمائی کرو۔ پھر دیکھنا میں کیسے اس کی تکا بوٹی کرتا ہوں۔"

غرض بلّی اور چیتا چل پڑے بلّی آگے آگے چیتا اس کے پیچھے پیچھے دونوں آبادی کی طرف جا رہے تھے۔ بلّی بار بار چیتے کو چوکنا اور خبردار رہنے کی تاکید کرتی رہی یہاں تک کہ دونوں کسان کے کھیت میں پہنچے۔ اس وقت کسان درخت کی گھنی ڈالیاں کاٹ رہا تھا۔ بلّی چیتے کو اس درخت تک لے گئی اور کسان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔" انسان یہی ہے اور یہ کہہ کر درخت کی اوٹ میں چھپ گئی۔

چیتا غرّایا۔ اس نے گرج کر کہا۔ اے شیطان ملعون کیا تو ہی انسان ہے۔ کیا تو ہی ہے جس نے ہماری نسل کو ذلیل و خوار کیا ہے۔؟"

کسان اس اچانک مڈبھیڑ سے گھبرا گیا۔ مگر کمال خوبی سے اپنے خوف کو دبا لیا اور جواب دیا۔" ہاں۔ ہاں۔ میں ہی انسان ہوں۔ کیا تجھے کوئی اعتراض ہے۔؟"

چیتا ڈانٹنے کے انداز میں بولا۔" بلیوں پر بڑائی جتانے کا تمھیں کیا حق پہنچتا ہے۔ ان پر ظلم و ستم ڈھانا کہاں کا انصاف ہے۔؟"

کسان نے اس کا جواب یوں دیا۔" ہمارا بڑا حق ہے۔ بلّی پر کیا موقوف، ہم تمام جانوروں کو پکڑ سکتے ہیں۔ اپنی مرضی کے مطابق انھیں رکھ سکتے ہیں۔ مگر ہم ناانصاف نہیں۔ بلاوجہ کسی پر زیادتی نہیں کرتے۔"

چیتا گرج کر بولا" تجھے یہ حق کیسے حاصل ہے؟ ذرا میں

بھی تو سنوں !"

کسان نے کہا۔ "انسان مخلوقات میں سب سے زیادہ اشرف ہے۔ ہمیں اس زمین کا مالک بنا کر بھیجا گیا ہے۔ ہم دل رکھتے ہیں دماغ رکھتے ہیں، عقل و دانش کے مالک ہیں اور انھی چیزوں کی وجہ سے ہمیں برتری حاصل ہے۔"

چیتا بپھر کر بولا۔ ایسا لگتا ہے کہ تجھے اپنی عقل پر بڑا گھمنڈ ہے اپنی طاقت پر بڑا ناز ہے میں ابھی غرور کے سر کو نیچا کرتا ہوں آ مقابلے کے لئے تیار ہو جا۔"

کسان نے جب دیکھا کہ بچنے کی کوئی صورت نہیں تو اس نے بڑی ہوشیاری دکھائی اور بولا۔ میں تیرے ساتھ لڑنے کو تیار ہوں تو تو جنگل کا راجہ ہے تمام درندوں میں سب سے زیادہ بہادر اور دلیر کوئی بھی جانور تیرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

چیتا اپنی تعریف سن کر پھولا نہ سمایا اور گردن اکڑا کر بولا "بے شک تو سچ کہتا ہے۔ کون ہے جو بہادری اور دلیری میں میری برابری کر سکے۔"

کسان نے کہا۔ "جنگل کا راجہ بے مثال ہے تو انصاف بھی ویسا ہی ہونا چاہیئے۔"

چیتے نے کہا "یہ بھی سچ ہے ہم انسانوں کی طرح ہر کسی کو ذلیل و خوار نہیں کرتے۔"

اس پر کسان نے کہا "پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک نہتا آدمی تم سے لڑے۔ تمہارے پاس تیز پنجے ہیں نکیلے دانت ہیں اور بھرپور طاقت ہے اور میرے پاس میری طاقت بھی نہیں۔

چیتے نے کہا "تم نے اپنی طاقت کہاں رکھ چھوڑی ہے۔"

کسان بولا۔ "گھر پر۔"

چیتے نے کہا۔ جا اپنی طاقت لے آ جب تک میں یہیں ٹھہرتا ہوں۔"

اس بات پر کسان نے زور کا قہقہہ لگایا اور کہا تم بھی بڑے عجیب ہو۔ مقابلے کے لئے تو بڑی شان اور بڑے طیش میں آئے تھے۔ جب علم ہوا کہ انسان جیسے قوی دشمن سے مقابلہ ہے تو میری غیر موجودگی میں بھاگ جانا چاہتے ہو۔ میں اتنا بیوقوف نہیں جو تمھارے جھانسے میں آجاؤں۔"

چیتے نے کہا۔ ہم بھاگنے والوں میں سے نہیں۔ تم جب تک نہیں لوٹتے میں اسی جگہ انتظار کروں گا۔

کسان بولا۔ "میں جانوروں سے اچھی طرح واقف ہوں جانور بڑے چھوٹے اور مکار ہوتے ہیں۔ بڑے بزدل اور ڈرپوک ہوتے ہیں۔ کمزور پر حملہ کرتے ہیں اور طاقت ور سے بھاگتے ہیں۔ اور تم بھی تو بلی کی ذات سے ہو۔ میں تم لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ بلی بھی چوری کرتی ہے اور بھاگ جاتی ہے۔"

چیتا جھلا اٹھا اور بولا۔ "کیوں جانوروں پر تہمت دھرتا ہے۔ قسم لے لے جو میں اپنی جگہ سے حرکت بھی کروں۔"

کسان بولا۔ تم جانوروں کی قسم کا کوئی اعتبار نہیں اگر واقعی تم بھاگنے والوں میں نہیں تو میں تجھے اس درخت سے باندھے دیتا ہوں تاکہ مجھے اطمینان رہے پھر گھر جا کر اپنی طاقت لاتا ہوں تب فیصلہ ہوگا کہ بڑا کون ہے۔ تو۔ یا میں ---!"

چیتا کسان کی چال نہ سمجھ سکا۔ اس کی تجویز مان لی کسان نے پاس پڑی ہوئی رسّی سے چیتے کی گردن میں پھندا ڈال کر اسے درخت سے باندھ دیا۔ اور پھر جلدی سے کلہاڑی لے کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔ "اب بول کیا بولتا ہے۔ اب تیری سمجھ میں آئے گا۔"

چیتے نے معصومیت سے کہا۔ "کیا سمجھ میں آئے گا۔؟"

کسان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہی کہ ذلت وخواری کیا ہوتی ہے۔ قید اور آزادی میں کیا فرق ہے اور یہ کہ انسان کو بزرگی اور بڑائی کیوں حاصل ہے"؟ کسان نے وضاحت کی! "تو میرے ہاتھوں اپنی آزادی کھو بیٹھا۔ میں نے تجھ پر فتح پائی جب تک تو زندہ رہے گا یہ پھندا تیری گردن میں پڑا رہے گا۔ اگر بلّی کی طرح بے ضرر رہا تو خیر ورنہ اگر زور آزمائی کی تو نقصان کا خود ذمہ دار ہوگا"!

چیتے نے کہا "مگر ابھی تو ہماری لڑائی بھی نہیں ہوئی تو تو اپنے گھر سے اپنی طاقت لینے جا رہا تھا"۔

کسان نے کہا۔ "بے وقوف۔ میری طاقت تو میری زبان میں ہے جس کی مٹھاس نے تجھے خوش کیا اور اس خوشی میں تو اپنے کو بھول بیٹھا۔ میری طاقت تو میرا اپنا دماغ ہے جس سے میں نے تجھے پھانسنے کی ترکیب سوچی۔ میری طاقت تو میرے ان دونوں ہاتھوں میں ہے جن سے میں نے تیری گردن میں پھندا ڈال دیا۔ میں اگر چاہوں تو ابھی ابھی اس کلہاڑی سے تیرا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر دوں مگر نہیں۔ میں تجھے اس سے بھی کڑی سزا دوں گا۔ میں تجھے ایک پنجرے میں قید کر دوں گا تاکہ لوگ جنگل کے راجہ کا حشر دیکھیں اور تجھ پر ہنسیں"۔

احتجاج کرتے ہوئے چیتے نے کہا۔ "یہ تو انصاف نہیں سراسر دھوکا ہے"۔

کسان نے کہا۔ "جنگ وجدال میں سب جائز ہے اور لڑنے کے لئے تو تو خود آیا تھا۔ اسے دھوکا نہیں کہتے اسے تدبیر کہتے ہیں۔ تدبیر سے تقدیر بنتی ہے اور زندگی سنورتی ہے۔ باتدبیر کامیاب ہوتے ہیں اور بے تدبیر بے موت مرتے ہیں"۔

اتنا کہہ کر کسان کچھ آدمیوں کو لانے چلا گیا تاکہ چیتے کو زندہ لے جائے۔

کسان کے چلے جانے کے بعد چیتے نے بلّی سے کہا۔ جو درخت کی اوٹ سے یہ سب تماشہ دیکھ رہی تھی۔

"بلّی بی۔! میں تو بڑی مصیبت میں پھنس گیا۔ تم تو انسانوں کو اچھی طرح جانتی ہو۔ یہ بتلاؤ کہ اگر میں اپنی بڑائی چھوڑ کر اس کے سامنے گڑگڑاؤں اور تمہاری طرح میاؤں میاؤں کروں تو کیا چھٹکارا مل سکتا ہے۔؟

بلّی بولی۔ افسوس۔ اب اس سے کچھ فائدہ نہیں۔ اگر پہلے ہی سے بڑائی نہ جتاتے اور انسان کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آتے تو چھٹکارا ممکن تھا۔ اب اگر آپ اپنے آپ کو چوہے سے بھی چھوٹا تصوّر کریں اور میاؤں میاؤں کی جگہ چوں چوں بھی کریں تو نجات ممکن نہیں۔ (فارسی سے)

بقایا: ابن بطوطہ

اور اس کی بہادری کی تعریف کرتے ہیں۔ چھوکریاں بھی ساتھ ہی گاتی ہیں اور کمانوں کے کرتب دکھاتی جاتی ہیں۔ تمیں؟ غلام طبلے بجاتے ہیں اور ان کے چیتے سرخ ریشم کے ہوتے ہیں پھر چھوٹے چھوٹے نیچے آتے ہیں۔ قلابازی کرتے ہیں۔ اور تلواروں کے کرتب دکھاتے ہیں۔

سوڈان میں شاعر کو جالی کہتے ہیں۔ شاعر جب دربار میں آتے ہیں۔ تو تمام بدن پر پروں کو چپکا کر آتے ہیں۔ ایک لکڑی کا سر لگاتے ہیں۔ اس میں چونچ بنی رہتی ہے شعر پڑھتے ہیں تو چونچ ہی سے آواز نکلتی ہے اور بڑی مضحکہ انگیز صورت بن جاتی ہے۔

(باقی آئندہ)

کتابوں کی باتیں

ہندوستان کے غیر ملکی سیاح

(لکھنے والے ۔ ڈاکٹر ۔ کے ۔ سی ۔ کھنہ)

ہمارا دیس بہت بڑا دیس ہے ۔ جتنا یہ بڑا ہے اتنا ہی اس کا تمدن اس کے رہن سہن کے طور طریقے بہت پرانے ہیں بہت پرانے اور شائستہ ہیں جبھی تو دنیا خصوصاً ایشیا کے ملکوں کی اس پر خاص توجہ رہی ہے ۔ اب سے ہزاروں برس پہلے سے دوسرے ملکوں کے سیاح یہاں آکر سیاحت کرتے یا گھومتے پھرتے رہے ہیں ۔ یہاں کی تہذیب، یہاں کے لوگوں کی شرافت، رواداری اور شائستگی یہاں کے علوم وفنون اور مذہبی تحریکوں کا غور اور توجہ سے مطالعہ کیا ہے

ان سیاحوں میں سب سے پہلے میگا ستھنیز کا نام آتا ہے ۔ یہ اب سے دو ہزار چار سو برس پہلے کی بات ہے میگا ستھنیز یونانی بادشاہ سیلوکس کا سفیر بن کر ہندوستان آیا تھا اور موریہ خاندان کی راج دھانی پاٹلی پتر (موجودہ پٹنہ کے قریب) میں آکر ٹھہرا تھا میگا ستھنیز نے تمام ہندوستان کا دورہ کیا تھا

ہندوستان سے واپس جاکر اس نے یہاں کے حالات پر کتاب لکھی یہ کتاب تو ضائع ہوگئی لیکن دوسرے مصنفوں نے اپنی کتابوں میں اس کے کچھ حصے نقل کئے ہیں اور ان سے دیس کے ڈھائی ہزار برس پہلے کے حالات کا سرسری کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے ۔

میگا ستھنیز کے سات سو سال بعد چین کا ایک بودھ بھکشو فاہیان ہندوستان آیا ۔ اس وقت ہمارے دیس میں بودھ مذہب کا بول بالا تھا ۔ یہ مذہب باہر کے ملکوں چین وغیرہ میں پھیل گیا تھا ۔ فاہیان یہاں اس مذہب کے بارے میں اور زیادہ معلومات حاصل کرنے آیا تھا اور اسی طرف اس کی توجہ زیادہ تھی پھر بھی اس نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے ۔ اس سے ہندوستان کے ۱۵ سو برس پہلے کے حالات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے ۔

فاہیان کے دو سو سال بعد ایک بودھ بھکشو ہیونگ سانگ ہندوستان آیا ۔ یہ بھی چینی تھا ۔ اور فاہیان کی طرح اپنی مذہبی تعلیم مکمل کرنے کو ہندوستان آیا تھا اس نے بھی اپنے سفرنامے میں اس دیس کے بارے میں دلچسپ حالات لکھے ہیں اور پھر دسویں صدی عیسوی میں ایک اور بڑا آدمی آیا ۔ البیرونی یہ عربی کا بہت بڑا فاضل تھا ۔ اس نے بھی یہاں آکر سنسکرت پڑھی اور پھر طب اور فلسفے وغیرہ کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا ۔ کتاب الہند کے نام سے ہندوستان کے علوم وفنون یہاں کے رہن سہن پر خود بھی ایک کتاب لکھی ۔ یہ کتاب اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے جو نہایت علمی انداز سے ہمارے دیس پر لکھی گئی ہے ۔ اس میں ہندوستان کے علوم وفنون کے علاوہ یہاں کے رسم ورواج اور رہن سہن پر روشنی پڑتی ہے ۔

مصنف جناب ڈاکٹر کھنہ صاحب نے کمال کیا ہے کہ ۴۸ صفحوں کی مختصر سی کتاب میں بڑے سلیقہ سے اور بہت ہی دلچسپ انداز میں ان چاروں سیاحوں کی لکھی ہوئی باتیں بتادی ہیں۔ کتاب نیشنل بک ٹرسٹ نے شائع کی ہے۔ آفسٹ پر چھپی ہے۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی ٹائٹل بہت خوبصورت اندر بےشمار تصویریں۔ ایک رنگ کی اور کئی رنگوں کی۔ اور قیمت کل ایک روپیہ آٹھ آنے۔ مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵، اور اس کی تمام شاخوں پر مل سکے گی۔

آؤ ناٹک کھیلیں۔ لکھنے والے۔ اوماآنند۔ ترجمہ از محترمہ رفیعہ منظور الامین۔

یہ کتاب ڈرامے کی تکنیک پر ہے یعنی ڈراما کیسے کھیلیں بچوں کے لیے لکھی گئی ہے اسی لیے مصنف نے کہانی کے انداز میں لکھی ہے۔ ابتدا کٹھ پتلی کے تماشے سے کی ہے۔ یہ تماشے دیکھ کر بچوں کے دلوں میں شوق پیدا ہوتا ہے۔ ہم بھی کیوں نہ ایسا ہی تماشا کریں۔ پھر ان بچوں کے ماموں بمبئی سے آگئے یہ بمبئی کے ڈراما کلب کے کرتا دھرتا تھے۔ دہلی میں کل ہند ڈراما فیسٹول میں میں شریک ہونے آئے تھے۔ اپنے ڈرامے کے سب کام کرنے والوں کو ساتھ لے کر آئے تھے۔ پھر تو گھر میں بڑی چہل پہل ہوگئی۔ ماموں کے ساتھ ڈرامے میں کام کرنے والوں کی پوری ٹولی تھی انھیں اداکار یا ایکٹر کہتے ہیں۔

ماموں سب بچوں کو تھیٹر لے گئے وہاں انھوں نے اسٹیج کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ بچوں کا شوق اور بھی بڑھا انھوں نے ماموں سے پوچھا۔ ڈراما کیسے کھیلا جائے۔ ماموں نے اس کے بارے میں ایسے سہل انداز میں بتائیں۔ کہ بچوں کی سمجھ میں آجائیں۔

دوسرے دن وہ اپنے ڈرامے کا ریہرسل دکھانے لے گئے۔ ڈراما دیکھنے کے بعد بچوں کو میک اپ وغیرہ کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوئیں پھر وہ اس اسکول میں لے گئے جہاں یہ سکھایا جاتا ہے کہ ڈراما کیسے کیا جاتے اس کا نام ہی نیشنل اسکول آف ڈراما ہے یہاں ایکٹنگ سکھائی جاتی ہے دیکھ سب کے سلسلے میں چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔ چیزوں کی تیاری کا کام سکھایا جاتا ہے۔ یہ سب چیزیں دیکھ کر تو بچوں کی آنکھیں کھل گئیں۔

اور پھر ان کا یہ ارادہ اور پختہ ہوگیا کہ خود بھی ڈراما کیا جائے۔ بس پھر کیا تھا۔ تیاریاں شروع ہوگئیں۔ سب سے پہلے ڈراما لکھا گیا۔ اداکاروں کا انتخاب ہوا۔ ان کے لیے لباس اور دوسری چیزیں تیار ہوئیں۔ ڈرامے کی مشق کرائی گئی یہ سب کچھ ہوگیا تو ایک دن مقرر کر کے بڑے اہتمام سے بچوں کا یہ ڈرامہ دکھایا گیا اور بہت کامیاب رہا۔

مصنف نے یہ سب باتیں کہانی میں کچھ ایسے دلچسپ انداز میں کہی ہیں کہ آپ کتاب شروع کر کے بس ختم کر کے دم لیں گے۔ رفیعہ نورالامین صاحبہ نے ترجمہ بھی بڑا نکھرا ستھرا کیا ہے ذرا ترجمہ پن نہیں ہے۔

کتاب نیشنل بک ٹرسٹ نے شائع کی ہے۔ گیٹ اپ کا خود ہی اندازہ لگا لیجئے ضخامت ۷۴ صفحات ہے لکھائی چھپائی بہت اچھی۔ کاغذ سفید بہت اچھا کئی کئی رنگوں کی بہت سی تصویریں۔ خوبصورت ٹائٹل اور قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ۔ مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر دہلی ۲۵۔ اور اس کی تمام شاخوں سے مل سکتی ہے

PAYAM-I-TALEEM
NEW DELHI-25.

11 JUL 1972

ہماری ایک نئی اسکیم

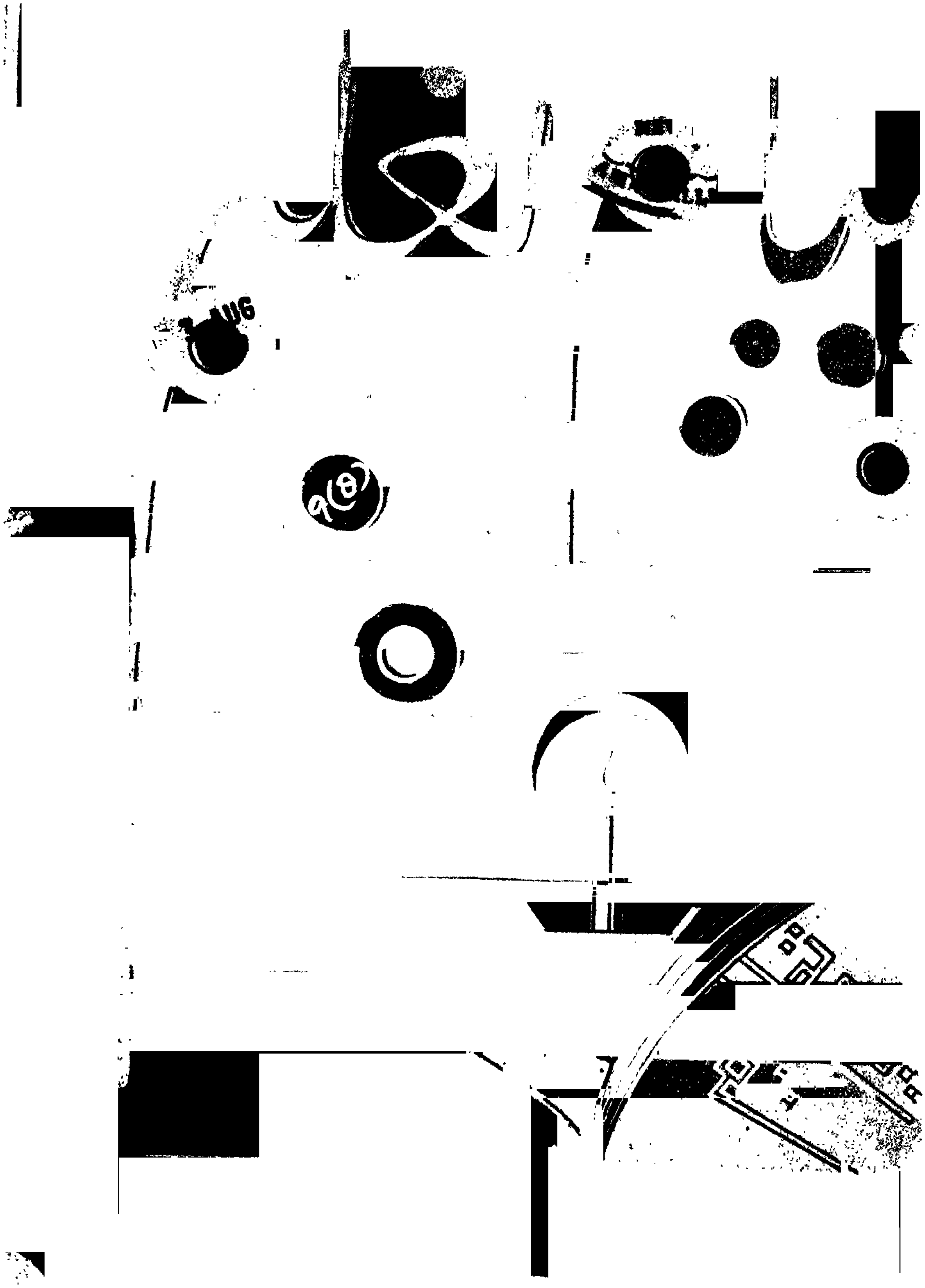
مکتبہ پیامِ تعلیم

اس سال (۱۹۷۲ء) سے ہم نے ایک نئی اسکیم شروع کی ہے، آپ کے لیے چھوٹی چھوٹی خوبصورت کتابیں تیار کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اس وقت اس سلسلے کی دس کتابیں تیار ہو چکی ہیں۔

۱۔ بھیڑیے کے بچے	ترجمہ از قرۃ العین حیدر صاحبہ	-/۵۰
۲۔ ہرن کے بچے	〃 〃 〃 〃	-/۵۰
۳۔ میاں ڈھینچو کے بچے	〃 〃 〃 〃	-/۵۰
۴۔ شیر خاں	〃 〃 〃 〃	-/۵۰
۵۔ لومڑی کے بچے	〃 〃 〃 〃	-/۵۰
۶۔ بہادر	〃 〃 〃 〃	-/۵۰
۷۔ سونے کا پنجرہ اور دوسری کہانیاں	احسان الحق صاحب	-/۶۵
۸۔ چچا غالب	مرتبہ۔ محمد حسین حسان ندوی	-/۷۵
۹۔ چینی کی گڑیا	〃 〃 〃	-/۵۰
۱۰۔ بہادر سیاح	〃 〃 〃	-/۶۵

پیامِ تعلیم کے تمام خریداروں کو مکتبہ پیامِ تعلیم اور مکتبہ جامعہ کی کتابوں پر دس فی صدی کمیشن دیا جائے گا

لیتھو آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)
۱۵۲۰، پٹودی ہاؤس دریا گنج دلی ۲۵



ماہنامہ

پیام تعلیم

نئی دہلی ۲۵

شمارہ ۸ ——— جلد ۹

اگست سنہ ۱۹۷۲ء

ایڈیٹر

محمد حسین حسان ندوی

صدر دفتر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی ۶

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ ۲

قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے

سالانہ چندہ چھ روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

فہرست مضامین

بچوں کی کتابیں

مذہب					
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	-/50	دہلی	ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی	-/80
آں حضرت	الیاس احمد مجیبی اردو ہندی	-/65	رابندر ناتھ ٹیگور	صفدر حسین	1/25
پاک کہانیاں دو حصوں میں	مقبول احمد سیوہاروی	2/15	سماجی زندگی (اول)	احمد شمیل و غلام ابرار	-/65
چار یار	الیاس احمد مجیبی	1/40	" " (دوم)	" " " "	-/80
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحی فاروقی	2/75	" " (سوم)	" " " "	-/81
رسول پاکؐ	عبدالواحد سندھی	1/80	سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	1/40
عقائد اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	1/50	سمندر کے نیچے	سلطانہ آصف فیضی	2/-
مسلمان بیبیاں	مولانا اعجاز الحق قدوسی	-/75	قدرت کے کرشمے (ادارہ)		-/42
نبیوں کے قصے	خواجہ عبدالحی فاروقی	1/25	میرانیس	محمد حسین حسان	1/25
ہمارے رسول	" " "	1/75	ہماری پارلیمنٹ	کیلاش چندر	1/50
ہمارے نبی	سید نواب علی رضوی اردو، ہندی	-/40	**کہانیاں، ڈرامے اور ناول**		
معلومات			اس نے کیا کر نہ جانا (کہانیاں)	آصفہ مجیب	-/37
آدمی کی کہانی	مشتاق احمد	1/25	پریم کی جیت (ڈراما)	اسد اللہ کاظمی	-/37
اتو کا عجائب خانہ	محمد حسین حسان (چار حصے)	1/80	تابیل خاں (کہانی)	محمد حسین حسان	-/30
بجلی کی کہانی	علی احمد خاں	-/50	ترکوں کی کہانیاں (کہانیاں)	مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	-/55
پڑدادا کی کہانی	محمد عبد الغفور	-/65	تیس مار خاں کے کارنامے (ناول)	م۔ ندیم	-/55
تاریخ ہند کی کہانیاں (اول)	نجمہ سلطان	-/80	ٹین اناڑی (ناول)	عصمت چغتائی	-/40
" " " (دوم)	ضیاء الرحمٰن	1/-	چقماق کی ڈبیا (کہانی)	برکت علی فراق	-/40
" " " (سوم)	مشتاق احمد اعظمی	1/00	چھپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی)	محمد معین	35
" " " چہارم	" "	-/95	ستاروں کی سیر (ناول)	کرشن چندر	75
پٹاخوں کی کہانی	محمد امین	-/75	کوے دادا (دیہاتی ناول)	مجیب احمد خاں	75
خبر رسانی کے طریقے	رقیہ منظور الامین	-/85	لال مرغی (کہانی)	عبد الواحد سندھی	50
دنیا کے بچے	محمد حسین حسان	-/80	مزہ چکھائیں گے (کہانی)	مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	5
دنیا کے بسنے والے	بشیر حسین زیدی	-/75	مزیدار پہیلیاں (پہیلیاں)	محمود علی خاں	
			ننھا ٹوٹو (کہانی)	خورشید سلطان	-/30

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی

بچوں سے باتیں

پچھلے مہینے (جولائی ۲، ۶۶ء) ہمارے ایک اور بزرگ ڈاکٹر عبدالمجید خواجہ (مالک سپلا کمپنی بمبئی) اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ مرحوم ہمارے سابق امیر جامعہ عبدالمجید خواجہ صاحب مرحوم کے قریبی عزیز تھے۔ قبلہ ذاکر صاحب کے ساتھیوں اور گہرے دوستوں میں تھے۔ جامعہ سے گہرا تعلق اور لگاؤ تھا اور وقتاً فوقتاً اس کی مالی سرپرستی فرماتے رہتے تھے۔ بمبئی میں سپلا کے نام سے انگریزی دوائیں تیار کرنے کا ایک کارخانہ قائم کیا تھا۔ اس کارخانے نے بہت ترقی کی۔ اس کا شمار دیس کے معتبر کارخانوں میں ہوتا ہے۔ مرحوم اپنی لڑکی سے ملنے ایران تشریف لے گئے تھے وہیں انتقال ہوگیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کے عزیزوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جناب رشید حسن خاں کا مضمون "حرفوں کا جادو" میں عام طور پر پیامی اور اُن کے بزرگ سبھی دل چسپی لے رہے ہیں۔ اس مضمون کے سلسلے میں دو تین غلطیاں ہوگئیں۔ مضمون کا صحیح عنوان "حرفوں کا جادو" تھا مگر غلطی سے "لفظوں کا جادو" چھپ گیا۔ دوسری غلطی بہت دل چسپ ہے۔ خاں صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا تھا "جناب" کے بعد "صاحب" لکھنا غلط ہے اور غلطی خود انھی کے نام کے ساتھ "جناب" اور "صاحب" دونوں ایک ساتھ لکھ دیے گئے اس میں ہمارے کاتب صاحب کی نوازش کو زیادہ دخل ہے۔ ہمیں اس کا افسوس ہے لیکن خوشی کی بات ہے کہ خاں صاحب نے ہماری معذرت قبول فرمالی ہے۔

ایک تیسری بات اور۔ خاں صاحب نے "کلیاں پھندنے" لکھا ہے۔ ہم ابھی تک "کلی پھندنے" سنتے آئے تھے لیکن خاں صاحب کا اصرار ہے کہ "کلیاں" ہی صحیح ہے۔ انھی کی بات ٹھیک ہوگی۔ پر ہم نے تو اب تک "کلی پھندنے" ہی سنا تھا۔ "کلیاں" کانوں کو کچھ نامانوس سا لگا۔

رشید حسن خاں صاحب چھٹیوں کے زمانے میں اپنے وطن تشریف لے گئے تھے اور مضمون کی چوتھی قسط نہ لکھ سکے۔ جلد لکھنے کا وعدہ کیا ہے لیکن ہمیں وقت پر نہ ملی تو انشاء اللہ اگلے پرچے شامل ہوگی۔

"مونگے کا جزیرہ" والی کہانی کی اگلی قسط بھی ہمیں ابھی نہیں ملی ہے۔ یہ بھی وقت پر نہ ملی تو اگلے پرچے میں چھپ سکے گی۔

ابن بطوطہ کے سفرنامے کی داستان اس پرچے میں ختم ہو رہی ہے۔ بہت لمبی داستان تھی بہت لمبا سفر تھا۔ سنہ ۶۶ء سے شروع ہوا اور اگست سنہ ۶۸ء میں ختم ہوا۔ یہ جتنا طویل تھا جتنا لمبا تھا اتنا ہی دل چسپ اتنا ہی مزے دار تھا۔ کبھی کبھی پرچے میں یہ سلسلہ رک جاتا تھا تو پڑھنے والوں کے تقاضے آنے لگتے تھے۔ ابن بطوطہ کا یہ سفرنامہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس کی اہمیت ایک اور لحاظ سے بھی ہے اور بہت

زیادہ ہے۔ ابن بطوطہ کا یہ سفر لگ بھگ بیس برس میں ختم ہوا ہے۔ اس عرصے میں وہ ایشیا کے اکثر ملکوں میں گھوما پھرا چین اور قسطنطنیہ تک ہو آیا اور جہاں جہاں گیا وہاں کے رہن سہن، تہذیب و تمدن اور حکومت کے انتظام کے بارے میں اچھی خاصی تفصیل اور اس انداز سے لکھا کہ اب سے چھ سات سو برس پہلے کی تصویر آنکھوں تلے پھر جاتی ہے۔ ابن بطوطہ ہندوستان میں بھی کافی مدت رہا ہے اس لیے ہمارے دیس کا حال بھی اس نے تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کے ہندوستان کے سفر کے حالات ہی (خصوصاً بچوں کے لیے) کتابی صورت میں چھپ جائیں تو بڑا کام ہو جائے۔

اس پرچے میں محترم راج نرائن راز صاحب کا مضمون "آسمان گھر" کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے بہت دلچسپ اور معلوماتی مضمون ہے۔ امید ہے کہ آپ دل چسپی سے پڑھیں گے۔ محترم راج نرائن صاحب نے اس طرح کے اور بھی معلوماتی مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ یہ پیامِ تعلیم کی خوش نصیبی ہے کہ ایسے صاحبِ علم اور فاضل بزرگ اس کی سرپرستی فرماتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک اور مضمون دنیا کا سب سے بڑا سائنسی جہاز ہے۔ یہ بھی بہت قیمتی اور معلوماتی مضمون ہے۔ اسے بھی ضرور پڑھیے۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ دنیا کی دوسری قومیں سائنس کے معاملے میں کتنا آگے بڑھ چکی ہیں۔

ہمارا دیس ۱۵ اگست کو آزاد ہوا تھا۔ یہ تقریب ہر سال منائی جاتی ہے۔ پیامِ تعلیم اس موقع پر بہت سی نظمیں شائع کر رہا ہے۔ آپ کو پسند آئیں گی۔ ہمیں آزاد ہوئے پچیس سال ہو چکے ہیں۔ یہ ۲۵ سالہ جشن اسی سال اگست میں خاص اہتمام سے منایا جا رہا ہے۔

پیامِ تعلیم کے "کہانی نمبر" کا ذکر کئی بار ان صفحوں میں آ چکا ہے۔ خیال ہے کہ کہانی نمبر ستمبر میں شائع کر دیا جائے۔ بڑی دقت یہ ہے کہ کہانی نمبر کے بہت سے مضمون جن صاحب کے پاس ہیں وہ ایک حادثے کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان میں سے بعض مضمون بہت اہم ہیں۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ یہ مضمون اور کہانیاں وقت پر مل جائیں اور ہم وقت پر یہ خاص نمبر شائع کر سکیں۔ آپ بھی دعا کیجیے۔

ہمارے ایک محترم ساتھی شاہد عظیم صاحب ایک رسالہ "اوور سیز فلاٹیر" کے نام سے انگریزی میں شائع کر رہے ہیں۔ یہ اخباری سائز پر ماہوار نکلتا ہے۔ اس میں ڈاک ٹکٹوں سے متعلق معلومات ہوتی ہیں۔ ٹکٹوں کے بارے میں دنیا بھر کی خبریں ہوتی ہیں۔ قلمی دوستی کے شوقینوں کے مکمل پتے ہوتے ہیں ڈاک کے نئے ٹکٹوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ کس طرح سہولت سے مل سکتے ہیں۔ رسالے میں اور بھی بہت سی دل چسپیاں ہوتی ہیں سالانہ قیمت تین روپے ہے نمونے کی کاپی پچاس پیسے میں ملتی ہے۔ ٹکٹ جمع کرنے والے شوقین پیامیوں سے ہم اس کی خریداری کی سفارش کرتے ہیں پتہ یہ ہے:۔

محمد شاہد عظیم ۱/۹۲۳-۳-۱۱ ملے پلی حیدر آباد ۱

اُجالا

ڈاکٹر امانت ایم اے پی ایچ ڈی

فلک سے صبح کا پیغام آیا
زباں پہ پھر خدا کا نام آیا
اُفق پہ نور کا سیلاب آیا
کہ پھر خورشیدِ[1] عالم تاب آیا
کوئی رنگوں کی بارش کر رہا ہے
اُجالے کو جہاں سے بھر رہا ہے
ذرا اٹھ کر حسیں منظر تو دیکھو
چمک اُٹھے ہیں بام و در تو دیکھو
پرندے چہچہاتے جا رہے ہیں
خدا کی حمد مِل کر گا رہے ہیں
بڑی جاں بخش تڑکے کی ہوا ہے
جہاں کا ذرّہ ذرّہ جی اٹھا ہے
خوشی سے پتّہ پتّہ ہِل رہا ہے
چمن کا غنچہ غنچہ کھِل رہا ہے
مشقّت سے بدن تھے چُور جن کے
وہ میٹھی نیند سب سو کر ہیں اُٹھے
لبھاتے تھے جنھیں رنگین سپنے
ہوئے مشغول سب کاموں میں اپنے
اگر دِن رات کا چکّر نہ ہوتا
مزہ جینے کا ہرگز کچھ نہ ہوتا
کرشمہ حق کی قدرت کا یہ دیکھو
ہیں کتنے اس کے احساں ہم پہ بچّو
کلی دِل کی امانت کھِل رہی ہے
ہمیں نعمت پہ نعمت مِل رہی ہے
نہیں کچھ انتہا اس کے کرم کی
بجا لاؤ خدا کا شکر تم بھی

تمھیں بھی چاہیے کچھ کام کرنا
بڑا ہو کر وطن کا نام کرنا

---

[1] دنیا کو روشن کرنے والا سورج۔

جناب راج نرائن راز

آسمان گھر

آپ نے اپنے شہر میں چڑیا گھر دیکھا ہوگا۔ عجائب گھر بھی یقیناً دیکھا ہوگا۔ لیکن شاید آسمان گھر کبھی نہیں دیکھا۔

"آسمان گھر؟"

ہاں۔ آسمان گھر۔ اور آسمان گھر سے میری مراد پلے نے ٹیرئم ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا عجائب گھر ہی ہے۔ اس عجائب گھر میں ہم مصنوعی یعنی انسان کا بنایا ہوا آسمان دیکھتے ہیں۔ یہ آسمان بالکل اسی طرح آسمان جیسا ہوتا ہے جو ہم سب اپنے سروں پر دیکھتے ہیں۔

اس آسمان پر ہم چاند، سورج، مریخ، مشتری، عطارد جیسے ستارے، سیارے اور دمدار تارے تک دیکھ سکتے ہیں۔ سیاروں کی گردش کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ ٹوٹتے ہوئے تاروں کو دیکھ سکتے ہیں اور جناب آسمان گھر میں دن نکلنے اور ڈوبنے کا منظر تو بے حد سہانا ہوتا ہے۔ غرض ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ مختلف وقتوں میں آسمان کیسا لگتا ہے۔

یہ مصنوعی آسمان قدرت کے بنائے ہوئے آسمان سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ ہم آسمان کو ایک وقت میں صرف ایک خاص حالت میں دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن مصنوعی آسمان کو ہم نہ صرف اس کی موجودہ حالت میں بلکہ صدیوں پہلے، اور حد تو یہ ہے کہ صدیوں بعد کی حالت میں بھی دیکھ سکتے ہیں صدیوں کا یہ سفر محض منٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔

اب آپ کے دل میں طرح طرح کے سوال پیدا ہوں گے۔ مثلاً یہ سب کیسے ہوتا ہے؟ سب سے پہلے یہ آسمان کس نے بنایا؟ کب اور کہاں بنایا؟ تو سنیے۔ انسان ستاروں اور سیاروں کی گردش کے ماڈل بنانے کی کوشش ایک زمانے سے کر رہا ہے سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں شمسی نظام کے ایسے میکانکی ماڈلوں کا رواج عام تھا۔ یہ ماڈل اپنے موجد، کارک واور یرے کے اول کے نام پر اوررے کہلاتے تھے۔ اوّل صاحب نے اس طرح کا اوررے، ۱۷۱۲ء میں بنایا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایسے ماڈل نامعلوم نہیں تھے۔

اوررے میں ہینڈل گھمانے سے مختلف سائز کے چھوٹے بڑے گولے مرکزی گولے یعنی سورج کے گرد گھومنے لگتے۔ ستاروں اور سیاروں کی گردشوں کی نقل اتارنے کی اور پھر ایسے ماڈل بنانے کی اور کوششیں بھی کی گئیں۔

لیکن صحیح معنوں میں کامیابی ۱۹۲۴ء میں پلے نے ٹیرئم یعنی آسمان گھر کی ایجاد سے ہوئی اس ایجاد کا سہرا جرمنی کی بصری آلے بنانے والی ایک کمپنی "زیس

سیر پا شروع میں یہ جینا میں تھا بعد میں اسے میونخ
منتقل کر دیا گیا۔

یہ ایک بہت بڑا اور پیچیدہ پروجیکٹر ہے لیکن عام سینما
جیکٹروں سے مختلف ہے۔ یہ لگ بھگ ڈھائی ٹن
زنی ہے۔ اس کے حصّوں یا پرزوں کی تعداد ۲۹ ہزار
ہے اسے تین سمتوں میں گھمایا جا سکتا ہے اس سے آسمان
و اس حالت میں دکھایا جا سکتا ہے جیسا کہ وہ زمین سے
سی بھی عرض بلد سے کسی بھی وقت دکھائی دیتا ہے آسمان
ھر میں ہم آسمان کی اس حالت کو بھی دیکھ سکتے ہیں جیسی
سی خاص صدی میں رہی تھی، یا آئندہ کسی صدی میں ہوگی۔

آسمان گھر یعنی اس انوکھے عجائب گھر میں کئی سو لوگوں
کے ایک ساتھ بیٹھنے کا انتظام ہوتا ہے۔ یہ سبھی ایک بڑے
اور پیچیدہ پروجیکٹر کے ارد گرد بیٹھتے ہیں، یہ پروجیکٹر
ایک ڈھانچے پر ٹکا ہوتا ہے اور زمین سے کوئی پندرہ فٹ
اونچا ہوتا ہے۔ آسمان گھر کی چھت گول گنبد جیسی اور
اسٹین لیس اسٹیل کی ہوتی ہے۔ اس کا قطر ۶۵ سے
۷۵ فٹ ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح سے پردے کا کام دیتا ہے۔

پہلے تو آسمان گھر میں بڑی تیز روشنی ہوتی ہے۔
پھر دھیرے دھیرے گھٹنے لگتی ہے پھر افق پر روشنی کی
محض ایک لکیر سی رہ جاتی ہے۔ پھر گنبد نما گول چھت
تاروں بھرے آسمان کی شکل اختیار کر لیتی ہے دیکھنے
والا محسوس کرتا ہے۔ وہ کسی بڑے بند کمرے میں نہیں
بلکہ رات کو کھلے میں تاروں بھرے آسمان کے نیچے
بیٹھا ہے۔ یہ درمیان میں رکھے اس بڑے اور پیچیدہ
پروجیکٹر کا کرشمہ ہوتا ہے۔

گویا آسمان گھر ایک طرح کا سینما گھر ہوا۔ یہ بات
بڑی حد تک ٹھیک بھی ہے لیکن جو ستارے اور سیارے
ہم وہاں دیکھتے ہیں، وہ آسمانی ستاروں کی محض تصویریں
نہیں ہوتے۔ اور پھر یہ پروجیکٹر کوئی معمولی پروجیکٹر
نہیں۔ یہ ۳۲ پروجیکٹروں کا ایک مجموعہ ہے۔

مصنوعی آسمان پر ان پروجیکٹروں سے ایک ساتھ
آٹھ ہزار نو سو ستارے نمودار ہوتے ہیں۔ یہ ۱۵ قسموں
کی مختلف تیز اور مدھم روشنیوں والے ہوتے ہیں۔ یہ
تعداد دراصل ان ستاروں کی ہے جنہیں آنکھ بہترین
حالات میں، بغیر کسی دوربین کی مدد کے دیکھ سکتی ہے۔

لیکن ایک بات عجیب ہے، ایک وقت میں زیادہ
سے زیادہ صرف تین ہزار تارے دیکھے جا سکتے ہیں اور
جناب آسمان میں چھوٹے بڑے کئی ارب ستارے ہیں۔

آسمان گھر میں رکھے ہوئے بڑے اور پیچیدہ پروجیکٹر
میں بجلی کی بہت سی کلیں، موٹریں وغیرہ ہوتی ہیں ان
کی مدد سے آسمان کی وہ حالت جو وہ دن بھر میں اختیار
کرتا ہے محض منٹوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے
علاوہ ستارے جتنی نقل و حرکت اور گردش دن بھر
میں کرتے ہیں، وہ نقل و حرکت اور گردش ایک منٹ
سے بھی کم وقت میں دیکھی جا سکتی ہے اسی طرح ایک
برس کے عرصے میں ہونے والی آسمان کی حالت کا
نظارہ چھ سیکنڈوں، ایک منٹ اور تین منٹوں میں
کیا جا سکتا ہے۔

جبھی تو ان کلوں کی بدولت صدیوں پہلے کا
آسمان دیکھا جا سکتا ہے اور مستقبل میں صدیوں کا سفر
محض منٹوں میں کیا جا سکتا ہے۔

آسمان گھر میں، ایک بات کا تجربہ تو خاص دلچسپی
کا باعث بنتا ہے۔ اگر زمین پر پانچ ہزار میل فی منٹ
کی رفتار سے شمال یا جنوب کی جانب سفر کریں تو آسمان

لے لوہے کی ایک سی قسم جس میں زنگ نہیں لگتا۔

کیسا دکھائی دیتا ہے۔ اس پروجیکٹر میں ایک کل ایسی بھی ہے جس کی بدولت ہم محض ایک منٹ میں بیس ہزار برسوں کا عرصہ عبور کر لیتے ہیں تاہم اکثر محسوس کیا گیا کہ ایسے میں نظارہ کرنے والے بڑے بے چین ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کو ستاروں، سیاروں کی تیز رفتار نقل و حرکت نہیں دکھائی جاتی۔

آسمان گھر میں ستاروں، سیاروں کے علاوہ دوسرے مناظر دکھانے والے آلات بھی ہوتے ہیں۔ ان کی بدولت ہم چاند گہن، سورج گرہن، شمالی و جنوبی روشنیاں ٹوٹتے ہوئے تارے، دمدار تارے اور بے حد خوبصورت رنگوں میں طلوع و غروب کے منظر دیکھ سکتے ہیں۔ یہ سب مل جل کر ایک جادوئی فضا پیدا کر دیتے ہیں۔ اور جب اس مصنوعی یعنی انسان کے بنائے ہوئے آسمان کی سیر ختم ہوتی ہے۔ تو بالآخر سورج نکل آتا ہے مصنوعی رات کے بعد دن کی مصنوعی روشنی پھیلنے لگتی ہے سہانے سنگیت کی ہلکی ہلکی دھنیں دن نکلنے کا احساس دلاتی ہیں۔ اور آسمان گھر کی بے حد تازہ ہوا اس احساس کو اور بڑھاتی ہے۔

آسمان گھر صرف تفریح کا نہیں تعلیم کا ذریعہ بھی ہے یہ ایک ہی وقت میں اسکول بھی ہے تھیٹر بھی ہے اور سینما بھی۔ یہ آسمانوں کے بھید بتاتا ہے لیکن ان کے وقار کو ٹھیس نہیں پہنچاتا بلکہ برقرار رکھتا ہے۔

دوسرے عجائب گھروں کی طرح اس کی تعلیمی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے ستاروں کے علم اور دوسرے علوم کی تدریس میں اس کا ایک خاص مقام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ترقی یافتہ ملکوں میں صرف شہروں ہی میں نہیں اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی آسمان گھر ہوتے ہیں۔ اور ہاں، اگر کلکتہ جانے کا کبھی موقع ملے تو وہاں کا آسمان گھر ضرور دیکھنا۔ بھولنا مت۔ اسے دیکھ کر سچ مچ آنکھیں کھل جائیں گی۔

گرمیوں کا موسم

کیف احمد صدیقی

آجکل گرمیوں کا موسم ہے

سارے اسکول میں ہے سناٹا
کوئی پڑھنے کو اب نہیں جاتا
جون کی چھٹیوں کا موسم ہے
آجکل گرمیوں کا موسم ہے

اب وہ پڑھنے کی دھوم دھام نہیں
کھیلنے کے علاوہ کام نہیں
اب تو آزادیوں کا موسم ہے
آجکل گرمیوں کا موسم ہے

اب تو کھیلیں گے خوب جی بھر کے
اور اڑائیں گے خوب گلچھرے
ہر طرف مستیوں کا موسم ہے
آجکل گرمیوں کا موسم ہے

سارا ماحول آگ کا دریا
گرد اڑاتی ہوئی یہ گرم ہوا
لو کی رت آندھیوں کا موسم ہے
آجکل گرمیوں کا موسم ہے

سنترے، بیر، ککڑیاں کھیرے
آم، تربوز، اور خربوزے
رس بھری لیچیوں کا موسم ہے
آجکل گرمیوں کا موسم ہے

رابندر ناتھ ٹیگور
ترجمہ: حمید عثمانی صاحب

ڈاک گھر

(۵)

ویدجی داخل ہوتے ہیں۔

وید۔ آج کا دن کیسا گذرا؟

امل۔ ویدجی آج بہت اچھا لگ رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سب درد دور ہو گئے ہوں۔

وید۔ یہ ہنسی تو ٹھیک نہیں معلوم ہوتی یہ جو کہہ رہا ہے کہ بہت اچھا لگ رہا ہے یہی خراب علامت ہوا کرتی ہے۔ ہم لوگوں کے چکر دھر دت نے کہا ہے۔

مادھب۔ دُہائی ویدجی! چکر دھر دت کی باتیں رہنے دیجئے اس وقت یہ بتائیے کہ ماجرا کیا ہے؟

وید۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب سنبھالنا مشکل ہو گا میں تو منع کر گیا تھا مگر شاید باہر کی ہوا لگ گئی۔

مادھب۔ نہیں ویدجی میں نے اسے چاروں طرف سے ڈھک کر رکھا تھا۔ اسے باہر بھی نہیں جانے دیا ہے دروازہ تقریباً بند ہی رہتا ہے۔

وید۔ اچانک نہ جانے کیسی ہوا چلی ہے میں دیکھ کر آ رہا ہوں تمھارے صدر دروازے سے ہو ہو کرتی ہوا بہہ رہی ہے۔ یہ قطعی ٹھیک نہیں، یہ دروازہ اچھی طرح قفل کنجی لگا کر بند کر دو۔ ایسا کیوں نہ کرو کہ ایک دن تمھارے پاس کوئی آنے ہی نہ پائے۔ کوئی آ ہی جائے تو کھڑکی سے آئے۔ وہ جس کھڑکی سے ڈوبتے ہوئے سورج کی دھندلی روشنی آ رہی ہے اسے بند کر دو۔ وہ بیمار کو بہت بے چین کر دیتی ہے

مادھب دت۔ آنکھیں بند کئے ہے۔ شاید سو رہا ہے۔ اس کا چہرہ ایسا نظر آتا ہے جیسے۔ جو اپنا نہیں۔ ویدجی اسے پکڑ کر لیتا آیا۔ اس سے محبت کی۔ ایسا لگتا ہے اب نہ روک سکوں گا۔

وید۔ یہ کیا تمھارے گھر مکھیا آ رہے ہیں۔ یہ کیا جھمیلا ہے۔ میں چلتا ہوں بھائی۔ لیکن تم جاؤ فوراً۔ اچھی طرح سے دروازہ بند کر دو۔ میں گھر پہنچتے ہی ایک گولی بھیج دوں گا۔ اسے کھلا کر دیکھنا اگر اسے بچنا ہے تو اسی سے زبردستی روک تھام کر سکو گے۔

(مادھب دت اور ویدجی چلے جاتے ہیں) مکھیا داخل ہوتا ہے۔)

مکھیا۔ کیا بات ہے لڑکے؟

ٹھاکردا۔ (جلدی سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہیں) ارے ارے چپ رہیے چپ۔

امل۔ نہیں بابا آپ سمجھے ہیں سو رہا ہوں۔ میں سو نہیں رہا تھا میں سب سن رہا تھا میں سب سن رہا ہوں۔ میں تو جیسے بہت دور کی باتیں بھی سن رہا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میری ماں اور میرے باپ میرے

سرہانے ہی باتیں کر رہے ہیں۔
مکھیا۔ ارے مادھب وقت آج کل تو تم لوگوں کے بہت
بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات ہو گئے ہیں۔
مادھب۔ کیا کہہ رہے ہیں مکھیا جی اس طرح مذاق نہ اڑائیے
ہم لوگ بے حد معمولی آدمی ہیں۔
مکھیا۔ تمہارا یہ لڑکا جو راجہ کی چٹھی کا انتظار کرتا رہتا ہے
مادھب۔ یہ تو بچہ ہے یہ پگلا ہے اس کی باتوں کو جانے دیجئے
مکھیا۔ نا نا اس میں تعجب کی کیا بات ہے تم لوگوں کی طرح
اونچا گھرانا راجہ اور پائیں گے کہاں۔ اسی لیے تو
دیکھو تمہاری کھڑکی کے ٹھیک سامنے راجہ کا نیا
ڈاک گھر قائم ہوا ہے (امل سے) ارے لڑکے تیرے
نام راجہ کی چٹھی آئی ہے۔
امل۔ (چونک کر اٹھتے ہوئے) سچ!
مکھیا۔ یہ کیا سچ نہیں ہو سکتا؟ تمہارے ساتھ راجہ کی
دوستی ہے (ایک سادہ کاغذ دیتے ہوئے) ہاہاہا
یہ رہی راجہ کی چٹھی۔
امل۔ مجھ سے مذاق نہ کرو بابا بابا تم بتاؤ کیا یہ سچ مچ
راجہ کی چٹھی ہے؟
ٹھاکردا۔ ہاں بیٹے میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں یہ انھی کی چٹھی ہے
امل۔ لیکن اس میں تو مجھے کچھ بھی لکھا نظر نہیں آتا۔ میری
آنکھوں کے سامنے سب سفید ہو گیا ہے۔ مکھیا جی
بتا دیجئے نا اس چٹھی میں کیا لکھا ہے۔
مکھیا۔ راجہ نے لکھا ہے کہ ہم آج کل میں ہی تم لوگوں کے
یہاں آ رہے ہیں۔ ہمارے لیے تم لوگ کھانے پینے
کا انتظام کر رکھنا محل اب ہمیں ایک منٹ بھی اچھا
نہیں لگتا۔ ہاہاہا۔
مادھب۔ (ہاتھ جوڑتے ہوئے) مکھیا جی (دہائی) آپ یہ سب
باتیں کر کے مذاق نہ اڑائیے۔
ٹھاکردا۔ مذاق ایسا مذاق یہ مذاق اڑائیں گے۔ اتنی
ہمت ہے ان کی۔
مادھب۔ ارے ٹھاکردا تم بھی پاگل ہو گئے ہو کیا؟
ٹھاکردا۔ ہاں میں پاگل ہو گیا ہوں اسی لیے تو سادے کاغذ
پر تحریر دیکھ رہا ہوں۔ راجہ نے لکھا ہے وہ خود
امل کو دیکھنے آ رہے ہیں۔ وہ اپنے راج وید کو ساتھ
لے کر آ رہے ہیں۔
امل۔ بابا وہ دیکھئے بابا ان ہی کا باجا گاجا بج رہا ہے۔
سن رہے ہو نا۔
مکھیا۔ ہاہاہا۔ یہ تھوڑا اور پاگل ہوئے بغیر نہ
سن سکیں گے۔
امل۔ مکھیا جی! میرا خیال تھا تم مجھ سے خفا ہو تم مجھے نہیں
چاہتے ہو۔ تم سچ مچ راجہ کی چٹھی لے آئے گے۔ میں
نے سوچا بھی نہیں تھا مجھے اپنے قدموں کی خاک دو
مکھیا۔ نہیں۔ اس لڑکے میں خلوص ہے عقل نہیں لیکن
دل بہت اچھا پایا ہے۔
امل۔ اتنی دیر میں چار پہر ہو گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے وہ
دیکھئے شام کا ستارا نکل آیا۔ بابا مجھے کیوں نہیں
نظر آ رہا ہے۔
ٹھاکردا۔ ان لوگوں نے دروازہ جو بند کر دیا ہے میں کھولے
دیتا ہوں (باہر کا دروازہ کھلتا ہے)
مادھب۔ یہ کیا یہ کیا۔ یہ کیا مصیبت۔
(باہر سے) دروازہ کھولو۔
مادھب۔ تم لوگ کون ہو۔
(باہر سے)
دروازہ کھولو۔

مادھب۔ مکھیا جی یہ ڈاکو تو نہیں ہیں؟
مکھیا۔ کون ہے؟ میں پنچن مکھیا ہوں تم لوگوں کو ڈر نہیں معلوم ہوتا ـــــ دیکھو آوازیں بند ہو گئیں پنچن کی آواز سن کر کوئی چوں نہیں کر سکتا چاہے جتنا بڑا ڈاکو ہو۔
مادھب۔ (کھڑکی سے سر نکال کر) دروازہ توڑ ڈالا ہے اسی لیے آوازیں آنا بند ہو گئی ہیں۔
(سفیر داخل ہوتا ہے)
سفیر۔ مہاراج آج رات کو آ رہے ہیں۔
مکھیا۔ ارے یہ کیا ہوا۔
امل۔ کتنی رات گئے سفیر صاحب کتنی رات گئے۔
سفیر۔ آج دوسرے پہر رات میں۔
امل۔ جب میرا دوست پہرے دار شہر کے (صدر) بڑے دروازے پر گھنٹا بجائے گا ڈھنگ ڈھنگ ڈھنگ ڈھنگ اس وقت؟
سفیر۔ ہاں اسی وقت۔ راجہ نے اپنے ننھے منے دوست کو دیکھنے کے لیے اپنے سب سے بڑے وید کو بھیجا ہے (راج وید داخل ہوتے ہیں)
راج وید۔ یہ کیا ہر طرف بند کر کے رکھا ہے۔ کھول دو کھول دو جتنے دروازے کھڑکیاں ہیں سب کھول دو (امل کا جسم چھوتے ہیں) بیٹے تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟
امل۔ بہت اچھا بہت اچھا وید جی مجھے اب اور کوئی بیماری نہیں۔ آہ سب کھول دیا ہے میں سب ستارے دیکھ سکتا ہوں اندھیرے کے اس طرف کے سب ستارے۔
راج وید۔ آدھی رات کو جب راجہ آئیں گے تو تم ان کے ساتھ بستر چھوڑ کر گھوم پھر سکو گے؟
امل۔ ہاں میں ایسا کر سکوں گا اگر باہر نکل سکا تو میں پہنچ جاؤں گا۔ میں راجہ سے کہوں گا اس اندھیرے آسمان پر قطبی ستارہ دکھا دیجئے۔ شاید میں نے یہ ستارہ کئی مرتبہ دیکھا ہے لیکن وہ کون سا ہے میں نہیں پہچانتا۔
راج وید۔ وہ سب پہچنوا دیں گے۔ (مادھب دت سے مخاطب ہو کر) یہ کمرہ راجہ کے آنے کے لیے خوب صاف کر کے پھولوں سے سجا رکھیے۔ (مکھیا کی طرف اشارہ کر کے) اس آدمی کو یہاں نہیں رہنے دیا جا سکتا۔
امل۔ نہیں نہیں وید جی۔ یہ میرے دوست ہیں۔ آپ جب آئے تھے تو انھوں نے ہی مجھے راجہ کی چٹھی لا کر دی تھی۔
راج وید۔ اچھا بیٹے جب یہ تمہارے دوست ہیں تو یہ بھی تمہارے کمرے میں رہیں گے۔
مادھب۔ (امل کے کان میں) بیٹے تمہیں راجہ بہت چاہتے ہیں۔ وہ خود آج آ رہے ہیں ان سے آج کوئی درخواست کرو ہم لوگوں کی حالت اچھی نہیں ہے تم کو تو معلوم ہے۔
امل۔ میں نے پہلے طے کر رکھا ہے آپ کو کوئی فکر نہیں ہونا چاہیے چچا جان
مادھب۔ کیا طے کر رکھا ہے۔
امل۔ میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے اپنے ڈاک گھر کا ہرکارہ بنا دیں۔ میں ملک ملک گھر گھر ان کے خط پہنچا دوں گا۔
مادھب۔ (سر پہ ہاتھ مار کر) واہ ری میری قسمت
امل۔ راجہ آئیں گے ان کے لیے کیا کھانا پکوایا ہے۔

انھوں نے کہا ہے وہ تمہارے گھر جو دال روٹی ہے
وہی کھائیں گے۔

۔ دال روٹی سمجھا جی آپ نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا۔
راجہ کی سب باتیں تم جانتے ہو۔ ہم لوگ تو کچھ
بھی نہیں جانتے۔

با۔ میرے گھر اگر کوئی آدمی بھیج دو تو راجہ کے لیے کچھ
اچھا اچھا۔۔۔

وید۔ کوئی ضرورت نہیں۔ اب تم سب لوگ خاموش
ہو جاؤ اسے نیند آ گئی اسے نیند آ گئی۔ میں بچے کے
سرہانے بیٹھوں گا۔ اسے نیند آ رہی ہے چراغ
کی روشنی بجھا دو اب آسمان کے ستاروں سے
روشنی آنے دو اسے نیند آ رہی ہے۔

سب۔ (ٹھاکر داس سے مخاطب ہو کر) ٹھاکر داس تم بت کی
طرح ہاتھ جوڑے بالکل چپ چاپ کیوں ہو۔
مجھے ڈر لگ رہا ہے یہ جو میں دیکھ رہا ہوں کیا یہ
اچھی علامتیں ہیں۔ یہ میرا گھر اندھیرا کیوں کیے
دے رہے ہیں۔ تاروں کی روشنی میں میرا کیا ہوگا

اکرہا۔ چپ رہو بے یقینی کی باتیں نہ کرو۔

(سدھا داخل ہوتی ہے)

سدھا۔ امل۔

وید۔ وہ سو رہا ہے۔

سدھا۔ میں اس کے لیے پھول لائی ہوں۔ اس کے ہاتھوں
میں نہ دے سکوں گی۔

راج وید۔ اچھا اپنے پھول دو۔

سدھا۔ وہ کب جاگے گا۔

راج وید۔ ابھی۔ جب راجہ آ کر اسے پکاریں گے۔

سدھا۔ تب تم لوگ اس کے کان میں یہ بات کہہ دینا۔

راج وید۔ کیا؟ بتاؤ۔

سدھا۔ کہہ دینا سدھا تم کو نہیں بھولی ہے۔

نیّر صاحب کی کتابوں کے نئے اڈیشن

بچوں کے ادیب اور شاعر محمد شفیع الدین صاحب نیّر کی کتابوں کے نئے اڈیشن مناسب ترمیم اور اضافے کے بعد حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ کتابیں نیّر کتاب گھر۔ جامعہ نگر نئی دہلی نے شائع کی ہیں۔ نیّر صاحب کی یہ اور باقی تمام کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے مل سکتی ہیں۔

جناب افتخار نظمی

سیدھا راستہ

(بڑے لڑکوں کے لئے)

آگہی[1] اور خیالات کے جوہر لے کر
آنکھ جاتی ہو اگر جہل[2] کے کاشانوں[3] میں
میں پہنچتا ہوں اگر علم کے گوہر لے کر
آسمانوں کے زمینوں کے تیرہ خانوں[4] میں

ہر طرف نور کی قندیل چمک جاتی ہے
زندگی پھول کی مانند مہک جاتی ہے

جستجو اور تجسس[5] کے صلہ میں یارو
ذہن بیدار[6] کو ملتا ہے خزانوں کا سراغ
اور ملتی ہیں اگر راہ میں راتیں یارو
یوں چمکتا ہے اندھیروں میں تجربوں کا چراغ

جیسے بجلی کوئی بادل میں چمک جاتی ہے
زندگی پھول کی مانند مہک جاتی ہے

بغض و نفرت کا زمانے میں کہیں نام نہ ہو
ہر جگہ امن ہو انصاف ہو لوگوں کے لئے
جن کا مسلک ہو وفا اور کوئی کام نہ ہو
ایسے مستوں کے لئے پیار کے بھگتو لئے

آسمانوں سے مئے ناب[7] چھلک جاتی ہے
زندگی پھول کی مانند مہک جاتی ہے

---

1. واقفیت
2. جہالت بے خبری
3. محلوں میں
4. اندھیرے گھروں
5. تلاش. کھوج
6. جاگتا ہوا
7. شراب

مولانا بدرالدین صاحب بی اے جامعہ

سردی، گرمی، برسات

(چند لڑکے گرم کپڑے پہنے، لحاف اوڑھے، بیچ میں چھوٹی سی انگیٹھی لیے گھیرا بنائے بیٹھے ہیں)

ایک لڑکا: ارے یار اس سردی نے تو ناک میں دم کر دیا، اس سے تو گرمی اچھی، کہیں نکل کر کام دھندا تو کر سکتے ہیں۔ سردی میں تو سارا دن یونہی بیکار جاتا ہے۔

دوسرا لڑکا: ارے بھائی نو بجے سے پہلے تو لحاف میں سے نہیں نکلا جاتا۔

تیسرا لڑکا: (لحاف کھولتے ہوئے) اچھا چلو اب چلنا تو پڑے گا ہی (تھر تھر کانپتے اٹھتے ہیں اور چل دیتے ہیں)

(ایک طرف سے چند لڑکوں کا ایک گروپ آتا ہے ململ کے کرتے پہنے گلے کھلے ہوئے ہاتھوں میں خوبصورت پنکھے لیے، ایک لڑکا رومال سے پسینہ پوچھ رہا ہے)

ایک لڑکا: ارے یار، اس گرمی نے تو حلیہ بیرنگ کر دیا ہے، صبح سات بجے سے گرم ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ رات بھر تپش رہتی ہے۔ نیند نہیں آتی۔ ہم تو تنگ آ گئے اس گرمی سے کوئی کام نہیں ہوتا۔

دوسرا لڑکا: ہاں یار، گرمی میں مکھی مچھروں کی بھی بھرمار ہو جاتی ہے۔ پڑھنے لکھنے کا تو موسم ہے ہی نہیں۔

(تیسرا گروپ آتا ہے)

(چھتریاں لگائے ہوئے کپڑے سمیٹے ہوئے گزرتے ہیں)

ایک آدمی: اُف۔ فوہ! اے بی بارش، اب تو رک جاؤ، لوگ پریشان ہو گئے۔ ارے بھئی چچا حمید بتاؤ تو بارش کی بھی کوئی حد ہے۔ سارا گھر ٹپک رہا ہے۔ کوئی سامان سوکھا نہیں ہے۔ کیا کریں کوئی کام بھی نہیں ہو پاتا۔ سارا دن گھر میں بیٹھے بیٹھے گذر جاتا ہے۔ اس بارش نے تو پریشان کر دیا۔

(تینوں گروپوں کے جانے کے بعد ایک بڑھیا بڑا سا لحاف اوڑھے، آکر ایک طرف گھٹنوں میں منھ دے کر بیٹھ جاتی ہے۔ ایک طرف سے ایک لڑکی چھتری لیے آتی ہے)

آنے والی: اے بی سردی سلام، کیسی اداس اداس بیٹھی ہو۔ خیر تو ہے۔

(دوسری طرف ایک لڑکی ہلکا لباس

پنکھے ہاتھ میں پنکھا لیے آتی ہے)

دوسری آنے والی : اوہو آج تو سردی برسات دونوں بہنوں سے ملاقات ہو رہی ہے۔

(سردی، برسات، گرمی کا استقبال کرتی ہے۔ آؤ بہن آؤ۔ بیٹھو دو گھڑی باتیں کریں)

(گرمی بیٹھ جاتی ہے۔) کہو بہن برسات کیا حال ہے۔ بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی۔

برسات : جی حال کیا ہے۔ اپنے حضرتِ انسان کا حال پوچھو جو کسی حال میں مطمئن نہیں۔

گرمی : اجی سب انسانوں کی تو مت کہو ہاں کاہل اور کام چوروں کی بات کرو تو ٹھیک ہے۔ اور رہے کام چور تو یہ کسی موسم سے خوش نہیں رہ سکتے۔

کوئی نئی بات ہو گئی ہے کیا؟

برسات : اجی نئی کیا، وہی پرانی بات ہے۔ صدیاں گزر گئیں مجھے سنتے سنتے حالانکہ سب کو معلوم ہے۔ میں ہر سال آتی ہوں اور اپنے وقت پر آ جاتی ہوں۔

یوں دس پانچ دن اِدھر اُدھر ہو جائیں وہ الگ بات ہے۔ مگر جب کبھی میں آؤں گی۔ ہر طرف انسانوں کی چیخ پکار شروع "ارے مر گئے۔ بارش نے ناک میں دم کر دیا۔ چھتیں بیکار ہو گئیں۔ بارش کوئی کام ہی نہیں کرنے دیتی۔"

اچھا اور اگر کسی سال میں نہ پہنچوں تو ہر طرف شور برپا ہوتا ہے۔ ہائے قحط پڑ گیا۔ زمین تڑخ اٹھی، تالاب، کنویں، سوکھ گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ انسان کو کیسے خوش رکھوں۔

گرمی : اجی بس ان کو تو ان کے حال پہ رہنے دو۔ ان کی باتیں پتھر سے مارنے کی ہیں۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ چراپونجی جہاں سب سے زیادہ تمھارا آنا جانا رہتا ہے۔ یوں کہو تمھارا پسندیدہ گھر چراپونجی ہے۔ اگر بارش واقعی کوئی کام نہیں کرنے دیتی تو چراپونجی کے لوگ تو پورے سال اپنے گھروں میں بیٹھے رہتے ہوں گے۔ بھلا وہ کیا کام دھندا کرتے ہوں گے۔"

"اری بہن تو، میری سے تو کہوں بس میرا ہی جگر ہے۔ جو ان انسانوں کی بھلی بری سن رہی ہوں۔

سب کو میرے آنے کا وقت معلوم ہے مگر جب میں آتی ہوں۔ بس ہر بچہ بڑا چیخنے لگتا ہے۔ ہائے گرمی ہائے پیاس ہائے جھلسا دیا۔ ہائے تڑپا دیا۔

اور اگر کبھی میں ذرا ہلکی بن کر آؤں آندھی دھاندی سے کر نہ پہنچوں تو پھر روتے ہیں۔۔ ہائے خربوزے ہائے تربوز پھیکے رہ گئے۔ ہائے لُو نہیں چلی۔

بھیا ان انسانوں کی تو کچھ پوچھو ہی مت

سردی : (سر اٹھاتی ہے) اری یہ تم نے کیا قصے چھیڑ دیے کیوں میرے زخم ہرے کر رہی ہو۔ کیا میرا بھی منھ کھلواؤ گی۔

"اری یہی رونا تو میں رو رہی تھی

آج بیٹھی ہوئی،
بھلا یہ بتاؤ: مجھ سے اچھا اور کون سا موسم ہوگا۔
ارے سردی آئی ہاضمہ ٹھیک ہوا۔ بھوک بڑھی۔ راتیں بڑی ہوئیں۔ لحاف میں بیٹھو خوب پڑھو لکھو،۔

جہاں میں آئی اور لگا شور مچانے، ہائے سردی میں ہاتھ نہیں کھلتے۔ گھر سے نہیں نکلا جاتا۔

نہ مکھی نہ مچھر نہ پنکھے کی ضرورت نہ باہر نکلنے کی۔ کھانے میں گاجر، شلجم، کھاؤ سیب کھاؤ خون بڑھاؤ۔ یہ سب میری برکتیں ہیں مگر یہ کام چور انسان، مجھ سے بھی نفرت کرتا ہے۔

میں پوچھوں ہوں (پوچھتی ہوں) بس سردی تمھارے ہی لیے رہ گئی ہے۔ لندن والوں کے لیے سردی نہیں ہے۔ جہاں سورج بھی اتفاق سے کسی دن نکلتا ہے۔ مگر تم سے زیادہ وہ لوگ کام کرتے ہیں۔ تم سے لاکھ گنا زیادہ ان کا ملک ترقی پر ہے۔

بات بس اتنی ہے کہ وہ کاہل کام چور اور بہانہ باز نہیں ہیں۔ اپنے وقت کی قدر کرتے ہیں۔ عمر بیکار نہیں گنواتے۔

چاہے گرمی ہو برسات ہو کتنی ہی ٹھنڈ ہو۔ مگر کام کے مقررہ وقت میں ڈٹ کر کام کرتے ہیں۔ اور آرام کے وقت خوب آرام کرتے ہیں۔

بھلا سوچو تو سہی کام چوروں سے تو گرم شہروں میں رہ کے دن بھر مزدوری نہیں ہوتی اپنے پیٹ کے لیے بھی۔ اور تین سنگھ ہلاری ۲۹ ہزار فٹ کی ہمالیہ کی بلندی پر چڑھ کر ہندوستان کا جھنڈا گاڑ آئے۔

"جہاں ہر زمانہ میں برف جمی رہتی ہے۔
بہنو! سچی بات یہ ہے کہ موسم کا رونا رونے والے، محنت سے بچنے والے، کام چور اور کاہل لوگ ہوتے ہیں۔

جنھیں کام کرنا ہوتا ہے۔ وہ ہر موسم اور ہر حال میں کام کرتے ہیں۔

ازبکستان میں قدیم ترین بودھی عبادت گاہ

تاشقند ۳۔ نومبر ازبکستان کے شہر ترمذ کے قریب واقع فیاض تپ پہاڑی پر بودھی عبادت گاہ کی صفائی کا کام مکمل ہوگیا ہے۔ یہ سوویت یونین کی سرزمین پر سب سے پرانی عبادت گاہ ہے۔ ماہرین اثار قدیمہ نے جب استوپا کے اطراف لگی ہوئی کچی اینٹوں کی پرت کو ہٹایا تو انھیں بہت ہی صاف اور پلاسٹر کی ہوئی سطح نظر آئی جس پر کنول کے پھول اور دائرے بنے ہوئے تھے۔ جو بودھ کی مثالی شبیہ ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ استوپا پہلی صدی قبل مسیح میں تعمیر کیا گیا تھا۔

جناب حسرت فہیم جانوی

یومِ آزادی

یہاں لہرا اُٹھا ہے امن کا پرچم، مرے بچو!
ہنسا ہے برگِ گل پر قطرۂ شبنم، مرے بچو!
فضا میں رحمتوں کا چھڑ گیا سرگم، مرے بچو!
مبارک یومِ آزادی، مبارک یومِ آزادی

کرو اب یاد وہ دن جب غلاموں کی سی تھی حالت
سلگتی رہتی تھی ہر دل میں بس اک آتشِ نفرت
مگر کام آ گئی اپنی شجاعت اور جواں ہمت
مبارک یومِ آزادی، مبارک یومِ آزادی

اسی دن کے لیے لاکھوں نے اپنا سر کٹایا تھا
کفن بردوش اک اک فرد جب میداں میں آیا تھا
بہادر تانتیا ٹوپے نے خون اپنا بہایا تھا
مبارک یومِ آزادی، مبارک یومِ آزادی

کیا قرباں اسی دن لکشمی بائی نے اپنے کو
ظفر سلطاں[1] کمر بستہ ہوئے رنگون چلنے کو
کیا باپو نے سچ آزاد[2] اور جوہر[3] کے سپنے کو
مبارک یومِ آزادی، مبارک یومِ آزادی

خدا کا شکر ہے بچو! وطن آزاد ہے اپنا
کبھی اُجڑا ہوا تھا جو، وہ گھر آباد ہے اپنا
جو دل ناشاد تھا پہلے وہ دل اب شاد ہے اپنا
مبارک یومِ آزادی مبارک یومِ آزادی

---

۱ پھانسی دی گئی ۲ مولانا آزاد ۳ مولانا محمد علی

جناب محمد امین ایم اے

انڈولا (زمبیا) سے نئی دہلی

بیامی شاید یہ بات بھولے نہ ہوں گے کہ میں بہت دنوں سے اپنے وطن سے دور افریقہ میں تعلیمی خدمت میں مصروف ہوں ایک عرصے تک اتھوپیا میں رہا۔ پھر زمبیا چلا آیا آج کل وہیں ایک تعلیمی ادارے سے میرا تعلق ہے تین سال زمبیا میں گزارنے کے بعد ابھی چند دن ہوائی جہاز سے وطن لوٹا ہوں۔ کئی مہینے کی چھٹیاں ہیں یہ چھٹیاں یہیں گزاروں گا۔

جی چاہتا ہے کہ اس ہوائی سفر کا دلچسپ حال آپ کو بھی سناؤں مگر اس سفر کا حال لکھنے سے پہلے بہتر یہ ہے کہ آپ زمبیا کا تھوڑا سا حال جان لیں اس ملک کے جغرافی، سماجی اور اقتصادی حال جاننے کا شوق اس لیے بھی ہونا چاہیے کہ آپ کے دیس نے اس ملک کے صدر کو امن انعام کا مستحق قرار دیا ہے تو پھر سنئے

جغرافی لحاظ سے براعظم افریقہ کے کئی خطے ہیں جیسے

۱۔ بحر روم کا علاقہ
۲۔ گرم ریگستانی یا صحرا کا علاقہ،
۳۔ استوائی علاقہ۔
۴۔ سوانا کا علاقہ۔
۵۔ مانسونی علاقہ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن سیاسی، تاریخی اور سماجی لحاظ سے افریقہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک وہ حصہ جو صحرائے اعظم کے شمال میں ہے اور دوسرا وہ جو صحرائے اعظم کے جنوب کا علاقہ ہے۔ ان دونوں علاقوں کے جغرافی، سماجی، تہذیبی اور تمدنی حالات ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔

زمبیا صحرائے اعظم کے جنوب میں ہے نسبتاً یہ ایک نیا ملک ہے ابھی ۱۹۶۴ء میں آزاد ہوا ہے پہلے اس کا نام شمالی روڈیشیا تھا آزادی کے بعد زمبیا کے عوام نے اپنے ملک کا نام بدل دیا اور اسے زمبیا کہنا پسند کیا۔

یہ وسطی افریقہ کا ملک ہے اور وسطی افریقن پلیٹو پر واقع ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی اوسطاً ۴۔۳ ہزار فٹ ہے۔ جبھی تو خط استوا کے قریب ہوتے ہوئے اس کی آب و ہوا نہایت خوشگوار اور معتدل ہے۔ سمندر سے یہ دور ہے اور اس کی سرحد کہیں بھی سمندر سے نہیں ملتی۔

اس کے پڑوسی ملک ملاوی، تنزانیا، زائر سے

ریپبلک (کانگو کن شاشا) انگولا، جنوبی مغربی افریقہ، بانس وانا، روڈیشیا اور موزمبیق ہیں۔ رقبے کے لحاظ سے قریب قریب یہ اتنا ہی بڑا ہے جتنا ہمارا یو پی لیکن آبادی میں یو۔ پی سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ یوں سمجھئے کہ اتنے بڑے علاقہ میں ۴۰ لاکھ آدمی آباد ہیں شہر معدودے چند ہیں قصبے بھی بس اتنے ہیں کہ آسانی سے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ چند مخصوص علاقوں کے علاوہ بہت سی زمین خالی پڑی ہے جہاں یا تو جنگل ہیں یا بش[1]

زمبیا کے اصلی باشندے بانتو (BANTU) نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو بنیادی طور پر حبشی ہیں اگرچہ کئی قبیلوں کے لوگ حبشی کہنے پر چراغ پا ہوتے ہیں اور یہ دعوٰی کرتے ہیں کہ وسطی افریقہ میں حبشی نہیں بستے بلکہ مغربی افریقہ اور جنوبی سوڈان وغیرہ میں حبشی نسل کے لوگ رہتے ہیں۔

قبیلے یہاں کل آٹھ ہیں جیسے بمبا، نینجا، لوزی وغیرہ ان میں سے ہر قبیلے کی زبان الگ ہے اگرچہ ان کا کوئی مخصوص رسم الخط (SCRIPT) نہیں ساری زبانیں رومن رسم الخط (اسکرپٹ) میں لکھی جاتی ہیں۔ کوئی مقامی زبان اتنی ترقی یافتہ نہیں ہے کہ اس کا پرچار سارے ملک میں کیا جائے اس لیے ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے اور اسکولوں میں فرانسیسی بھی سکھائی جاتی ہے۔ بمبا قبیلے کے لوگ حاوی ہیں اور انہی کی اکثریت ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی سے پہلے مختلف قبیلے ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے رہتے تھے ان میں سے بمبلارو (BAMBARO) قبیلے کے لوگ بلیٹو کی اونچائی پر رہتے تھے ان کا خاص پیشہ لوٹ مار تھا۔ آس پاس کے دوسرے کمزور قبیلوں پر چھاپا مارتے تھے ان کی گذر بسر زیادہ تر لوٹ مار پر تھی ان قبیلوں میں لوزی سب سے ذہین ہوتے ہیں اور یہ تعلیم میں بھی پیش پیش ہیں۔

۱۹۶۴ء سے زمبیا میں جمہوری حکومت ہے۔ یونیپ (U.N.I.P) یعنی یونائیٹڈ نیشنل انڈی پینڈنٹ پارٹی سب سے منظم اور مضبوط پارٹی ہے اور ان دنوں اسی پارٹی کی حکومت ہے۔ صدر کا نام ڈاکٹر ڈیوڈ کینتھ کونڈا ہے اور شروع سے حکومت کے یہی صدر ہیں۔ یونیپ انہی کی پارٹی ہے اور یہی سارے ملک پر حاوی ہیں۔ مخالفت میں کچھ اور پارٹیاں ہیں لیکن حکومت ان کو ختم کر کے ایک پارٹی کی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے اور ان دنوں اس کے متعلق وہاں کے عوام کی رائے معلوم کی جا رہی ہے۔

زمبیا کی پیداوار مکا، تمباکو، کساوا[2] وغیرہ ہیں لیکن ضروریات کے لحاظ سے یہ خودکفیل نہیں ہے تمباکو کے علاوہ بہت سی چیزیں جیسے پھل گیہوں، سبزیاں دوائیں کپڑے، مشین موٹرکار، ریل کے ڈبے اور انجن باہر سے درآمد کرتا ہے۔

خاص بات زمبیا کی یہ ہے کہ معدنیات میں یہاں

---

[1] بش کا مطلب ایسے علاقے ہیں جو حقیقتاً سوانا کے علاقے ہیں اور یہاں لمبی لمبی گھاس بکثرت اگتی ہے بیچ بیچ میں چھتری نما درخت بھی اُگے ہوتے ہیں لیکن زمبیا میں کوئی سوانا کا لفظ استعمال نہیں کرتا بلکہ سبھی بش کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ایسے ہی دو تین علاقوں میں اب بھی تسی تسی نام کی زہریلی مکھیاں پائی جاتی ہیں۔

[2] کساوا ہمارے دیس میں بھی بہت پیدا ہوتا ہے سب سے زیادہ کیرل میں اور پھر اس کے آس پاس کے علاقوں میں لاکھوں لاکھ ٹن پیدا ہوتا ہے۔ زمبیا کی طرح یہاں بھی اسے غریبوں کی غذا کہتے ہیں۔

تانبا بکثرت ہوتا ہے اور چلی کے بعد یہ دنیا کا دوسرا سب سے بڑا ملک ہے جو تانبے کی اینٹیں برآمد کرتا ہے۔ اس کے خریدار جاپان، جرمنی، اٹلی، نیدرلینڈ (ہالینڈ) اور انگلستان وغیرہ ہیں۔ خوش قسمتی سے اب تک دنیا کے حالات کچھ اس قسم کے رہے ہیں کہ تانبے کی قیمت گرنے نہیں پاتی ہے اور زمبیا نے خاصی دولت (فارن ایکسچینج) پونڈ اور ڈالر کی صورت میں جمع کر رکھی ہے اور بظاہر یہ ایک خوشحال ملک ہے اور بڑی تیزی کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کر رہا ہے لیکن جب دنیا کے حالات نارمل ہو جائیں گے اور دوسرے ملکوں میں بھی تانبے کی پیداوار بڑھ جائے گی تجارتی مقابلہ ہوگا اس حالت میں تانبے کی قیمت گرنے کا اندیشہ ہے۔ اسی لیے زمبیا کی حکومت پہلے کے مقابلے میں تانبے کی برآمد سے کمائے ہوئے روپے کو اب بہت سنبھل کر خرچ کر رہی ہے اور غیر ضروری خرچ رفتہ رفتہ کم کرتی جا رہی ہے۔

زمبیا کا خاص علاقہ اور اس کے اقتصادی ڈھانچے کا دل 'کاپربیلٹ (تانبے کا خطہ) ہے۔ دراصل یہ زمبیا کا ایک صوبہ ہے جہاں تانبے کی کانیں ہیں اور جہاں تانبا نکالنے والی بڑی بڑی کمپنیوں کے دفتر ہیں۔ زمبیا کو آگے بڑھانے اور خوشحال بنانے میں ان کمپنیوں کا بڑا ہاتھ ہے۔

لوساکا زمبیا کا دارالسلطنت ہے اور اس کا سب سے بڑا شہر ہے۔ آبادی ۲ ½ لاکھ ہے۔ دوسرا بڑا شہر کٹوے ہے اس کی آبادی ۲ لاکھ ہے۔ انڈولا تیسرا بڑا شہر ہے اس کی آبادی ۱ ½ لاکھ ہے۔ زمبیا میں کل یہی تین شہر ہیں جن سے آخری دو کاپربیلٹ (تانبے کے علاقے) کے شہر ہیں۔ ان کے علاوہ چند قصبے ہیں جیسے مفولیرا، چنگولا، لوئنشیا، کساما، منسا، لیونگسٹن وغیرہ وغیرہ۔

دنیا کا سب سے بڑا آبشار بھی زمبیا میں ہے اس کا نام وکٹوریا فال ہے (مقامی نام موسیوتنیا ہے)۔ یہ لیونگسٹن میں ہے۔ اور دریائے زمبزی پر ہے۔ سیاحوں کے لیے اس کی وہی حیثیت ہے جو ہمارے ملک میں تاج محل کی۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ باہر کے سیاح اگر زمبیا آتے ہیں تو محض وکٹوریا فال دیکھنے کے لیے (اس کا حال پھر کبھی آئندہ لکھوں گا)۔

ہاں تو جناب تین سال زمبیا میں گزارنے کے بعد میں چھٹیوں میں گھر آ رہا تھا۔ ہماری اڑان کی بکنگ انڈولا سے نئی دہلی تک تھی۔ ہوائی جہاز سے سفر منٹوں میں طے ہوتا ہے اور ہم چاہتے تو انڈولا سے لوساکا چلے آتے۔ اس کے بعد وہاں سے اڑ کر ۱۳ گھنٹے کے اندر اندر ہم سیدھے بمبئی اور دہلی آ جاتے لیکن چھٹیاں لمبی تھیں اور اس راستہ پر ہم کئی بار سفر کر بھی چکے ہیں اس لیے ہم نے سوچا کہ کیوں نہ اب کی بار ذرا نیا راستہ اختیار کیا جائے۔

غرض ۱۰ مئی ۱۹۷۲ء کو ہم ۱۰ ½ بجے صبح انڈولا سے روانہ ہوئے۔ اور آدھ گھنٹے کے اندر اندر لوساکا پہنچ گئے۔ لوساکا کے ہوائی اڈے پر ہم کئی گھنٹے ٹھہرے اور اب کی بار قریب سے اس کی ایک ایک چیز کا ہم نے جائزہ لیا۔ ایک طرف تانبے کا بنا ہوا برِّاعظم افریقہ کا ایک نقشہ ہے جس کے اندر زمبیا کا محلِ وقوع دکھایا گیا ہے۔ دوسری طرف تانبے کی ایک بہت بھاری چٹان رکھی ہے جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ زمبیا کے لیے اس قسم کی چٹانیں کتنی اہم ہیں۔

باقی آئندہ

مجھے وطن عزیز ہے

ظہیر غازی پوری

نہ مال و زر عزیز ہے نہ جان و تن عزیز ہے
میں اک وطن پرست ہوں مجھے وطن عزیز ہے

جہاں ہیں لالہ و سمن جہاں ہیں دشت بھی چمن
اسی زمینِ ہند کا شگفتہ پن عزیز ہے

وہ زندگی کی بت گری الورا و اجنتا میں
قدیم یادگار کا وہ بانکپن عزیز ہے

نشاط کا وہ صحنِ گل وہ حسن شالیمار کا
وہ پہلگام کا حسیں سہانا پن عزیز ہے

مری نظر سے پوچھئے نگر نگر کی دلکشی
مجھے اودھ عزیز ہے مجھے دکن عزیز ہے

یہ ٹیپوؤں کا ملک بھی یہ وشنوؤں کا دیش بھی
سوال ہو وقار کا تو کفن عزیز ہے

رہِ وطن میں صرف ہوں جو راحتیں حیات کی
تو ہر سفر عزیز ہے تو ہر وطن عزیز ہے

تمھیں عزیز ہو نہ ہو مجھے یہ فن عزیز ہے
جو کام آئے دیش کے وہی چلن عزیز ہے



جناب اے۔ اے بنظر

زندہ بھوت

(مزاحیہ ڈرامہ)

(صبح کا سہانا وقت ہے۔ گومتی دھیرے دھیرے بہ رہی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا دھیمی دھیمی چل رہی ہے۔ دریا کے کنارے ایک شخص سر جھکائے کھڑا ہے۔ چوڑی دار پاجامہ اور چکن کا کڑھا ہوا کرتا پہنے ہے۔ سر پر لکھنوا ٹوپی ہے۔ کپڑے میلے، کہیں کہیں دھبوں کا نشان۔ داڑھی مونچھیں بڑھی ہوئیں۔ سر کے بال اُلجھے ہوئے۔ ٹوپی سے باہر نکلے ہوئے۔ چہرے پر اداسی، نا اُمیدی اور پریشانی)

اتنے میں اودھ کے بادشاہ نصیر الدین حیدر نمودار ہوتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول ہے۔ دوسرے میں فرشی (حقے) کی جڑاؤ نَلی ہے اُن کے پیچھے موٹا ملاح ہے۔ یہ بھی لکھنوی لباس میں ہے۔ ملاح فرشی کو تھامے ہوئے ہے۔ (اسٹیج پر آکر) ملاح فرشی کو زمین پر رکھ دیتا ہے۔ اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

بادشاہ: (پھول سونگھتے ہوئے) ہم اب تھوڑی دیر آرام کریں گے۔

ملاح: (سر جھکا کر) جو حکم، عالم پناہ (جانے لگتا ہے)

بادشاہ: اور ہمارے آدمیوں کو ہمارا انتظار نہیں کرنا چاہئے

ملاح : (مُڑ کر) بہت خوب، غریب پرور (جاتا ہے)
بادشاہ : (قمرشی کی تلی کو منہ سے لگا کر دھواں چھوڑتے ہوئے) یا اللہ!
(کرسی پر بیٹھنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں کہ ایک شخص کو دیکھ کر ٹھٹھک جاتے ہیں) ارے!
(پھول ایک طرف پھینک کر آنکھیں مَل کر) خوب! ہم خواب تو نہیں دیکھ رہے ہیں؟ تو حسینی ہے؟
حسینی : (آگے بڑھ کر کورنش کرتا ہوا) عالم پناہ (بھرے گلے سے کم زور آواز میں) حسینی ہی غریب پرور کی خدمت میں آداب بجا لاتا ہے۔
بادشاہ : یا اللہ! تو زندہ ہے حسینی؟ تو تو مر چکا تھا؟
حسینی : حضور.....
بادشاہ : (حسینی کی طرف بڑھتے ہوئے) کیا مر کر زندہ ہوا ہے؟ یا تو جن بھوت ہے؟
حسینی : (حسینی پیروں پر گر کر) عالم پناہ! دونوں جہان کے آقا! آپ کے اقبال سے زندہ ہوں مگر موت سے بدتر عالیجاہ! مجھ پر رحم کیجیے۔ میں جن بھوت کچھ بھی نہیں ہوں۔ حقیقت ہوں، میرے مالک!
بادشاہ : (اُٹھاتے ہوئے) تب تو اتنے عرصے تک کہاں رہا! ہم تیری صورت دیکھنے کے لیے ترس گئے حسینی! یہ تیری کیا حالت ہو گئی ہے؟
حسینی : (دامن چومتے ہوئے، روتی آواز میں) جہاں پناہ کا اقبال بلند ہو! یہی خدا کا شکر کیا کم ہے کہ حضور کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہو گیا ہوں۔ ورنہ دشمنوں نے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

بادشاہ : (اونچی آواز میں) حسینی!
حسینی : درست کہہ رہا ہوں۔ حضور!
بادشاہ : (آنکھیں چڑھا کر) ہمارے عزیز خدمت گار پر کس نے قیامت ڈھانے کی جرأت کی؟ حسینی! سچ سچ بتا، ہم اس مکّار کی بوٹی بوٹی کتّوں سے نچوا ڈالیں گے۔
حسینی : (آنسو پونچھتے ہوئے) میرے آقا!..... جان بخشی جائے تو...... میں.... میں...
بادشاہ : (آرام کرسی پر بیٹھ کر) ہمارے پاس آ حسینی، خوف نہ کر اور سب کچھ بلا جھجک بیان کر دے۔
حسینی : (سنجیدگی سے) گستاخی معاف ہو بندہ پرور! میری شیریں باتوں اور لاجواب فقروں نے جس قدر آپ کے پاک قدموں کے نزدیک کیا۔ اسی قدر درباری ناراض ہوتے گئے۔ میرے فقرے انھیں برداشت نہیں ہوئے۔ وہ حسد کی آگ میں جلتے رہے۔ مگر حضور کے سامنے پھیکی ہنسی ہنسنے کے لیے وہ مجبور تھے۔ عالم پناہ کے ڈر سے وہ کچھ کہہ نہ سکے اور حضور! ان کے دلوں میں میرے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی — (دوبارہ چھلکے ہوئے آنسو پونچھ کر) اور پھر ایک روز وزیر اعظم نے مجھے گرفتار کر کے کانپور میں نظر بند کر دیا جہاں پناہ!
بادشاہ : (تڑپ کر) لیکن اُس نے تو ہم سے کہا کہ تم ہیضے سے مر گئے ہو؟
حسینی : (دامن پکڑ کر) کہا ہو گا، عالم پناہ، ضرور کہا ہو گا۔
بادشاہ : اور جب ہم نے لاش دیکھنے کی خواہش

ظاہر کی تو جانتے ہو کیا کیا؟

حسینی: قطعی نہیں، غریب پرور!

بادشاہ: (ہونٹ چباتے ہوئے) کہا کہ ہمیں ایسی جگہوں پر قدم تک نہیں رکھنا چاہیے۔ بڑے بڑے حکیم یہاں تک کہ شاہی طبیب بھی، جو تمھیں بچانے میں ناکام رہے۔ وہاں جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ بڑی خطرناک بیماری ہوتی ہے یہ۔ (زور دے سے کش لیتے ہوئے) اُف حسینی! ہم واقعی تمھیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ ان ظالموں نے یہ فریب کیا ہے!

حسینی: (دبی زبان سے) حضور!

بادشاہ: پھر کیا ہوا؟ تم یہاں کیسے آگئے؟

حسینی: (قدم بوسی کرتے ہوئے) وہی عرض کر رہا ہوں، دونوں جہاں کے آقا! چند دنوں کے بعد جب پہرے کی سختی کچھ کم ہوئی تو میں بھاگ نکلا اور عالم پناہ کی قدم بوسی کے لیے چھپتا چھپاتا لکھنؤ آیا۔ یہاں بھی بڑی مشکل تھی حضور کہ کہیں جاسوس پہچان نہ لیں اور پھر قید خانے میں ڈال دیا جاؤں۔ اس لیے جہاں پناہ! شاہی محلوں کے پاس پہنچنے کی ہمت نہ کر سکا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے آقا روزانہ صبح ساحل پر سیر کرنے آتے ہیں۔ چناں چہ۔ حضور آج آ پہنچا اور غریب پرور کے قدموں کی خاک......

بادشاہ: ہوں! (ایک جانب دیکھ کر۔ کھڑے ہوتے ہوئے تیز لہجے میں) تو وزیر کی یہ سب گستاخی ہے؟ اس نے تمہیں ہم سے جدا کیا۔ وہ ہم سے جھوٹ بولا۔

حسینی: (خوف سے کانپتے ہوئے) میں کیا کہہ سکتا ہوں، عالم پناہ!

بادشاہ: آؤ، ہمارے ساتھ۔ ہم اس گستاخی کی سزا اس مردود کو دیں گے۔ (ہاتھ پکڑ کر) تمھیں جس نے ہم سے جدا کیا ہے، اُسے ہم دنیا سے جدا کر دیں گے۔...

(تیزی سے حسینی کا ہاتھ پکڑے ہوئے جاتے ہیں)

منظر کی تبدیلی

وزیر اعظم اپنے کمرے میں سادی پوشاک پہنے ہوئے کھڑا ہے۔ آئینے کے سامنے ایک خوبصورت تختِ شاہی ہے۔ اُس کے قریب ہی چھوٹی سی صندل کی میز ہے۔ اس پر کھانے پینے کے برتن ہیں۔ ایک جاسوس داخل ہوتا ہے۔

جاسوس: حضور غضب ہو گیا۔

وزیر: کیا ہوا رحمت خاں؟

جاسوس: وہی قیامت پھر برپا ہوئی ہے حضور!

وزیر: صاف صاف کہو!

جاسوس: (پاس آکر کان میں پھسپھساتا ہے۔

وزیر اعظم چونک پڑتا ہے) اب کیا ہوگا حضور؟

وزیر: (کچھ سوچ کر چٹکی بجاتا ہے) کوئی بات نہیں۔ رحمت خاں (کان میں سمجھاتے ہوئے) سمجھ گئے نا؟

(تیز لہجے میں) تھوڑی سی بھی غفلت قیامت ڈھا دے گی، رحمت خاں! (پھر مسکراتا ہوا) جاؤ دیکھو، بادشاہ سلامت کتنی دیر میں محل

تا تعظیم
تشریف لا رہے ہیں؟
جاسوس: بہت خوب حضور

منظر کی تبدیلی

(اسٹیج پر ایک پہریدار پہرا دیتے ہوئے مستعدی سے کھڑا ہے۔ حسینی کا ہاتھ پکڑے غضب ناک حالت میں بادشاہ داخل ہوتے ہیں۔ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی ہیں۔ پہریدار کورنش کرتا ہے۔)

بادشاہ: (کڑک کر) اسے تم پہچانتے ہو؟
(پہریدار گھٹنوں تک جھکتے ہوئے سات مرتبہ سلام کرتا ہے۔ پھر بادشاہ کو آنکھیں پھاڑ کر خاموشی سے دیکھتا رہتا ہے)

بادشاہ: جواب دو! کیا یہ حسینی نہیں ہے، جسے بے عزت کر کے نکال دیا گیا تھا؟

پہریدار: (انتہائی سنجیدگی سے سر جھکا کر) گستاخی معاف ہو، جہاں پناہ! آپ زمین و آسمان کے مالک ہیں۔ میں حقیر تو آپ کے قدموں کی خاک ہوں۔ عالم پناہ مجھے تو جہاں دیکھنے کے لئے آنکھیں ملی ہیں۔ مردے کو میں کیسے دیکھ سکتا ہوں؟ غریب پرور! مجھے تو حسینی کہیں نظر نہیں آتا۔

بادشاہ: تم بے وقوف ہو۔ (تیزی سے حسینی کو لے کر ایک طرف جاتے ہیں۔ پہریدار دوسری طرف پردہ اٹھاتا ہے۔ یہ ایک خاص کمرہ ہے۔ ایک طرف اونچائی پر خوبصورت بڑی سی مسند ہے۔ مسند پر ایرانی قالین اور دو گاؤ تکیے رکھے ہیں۔)

بادشاہ: (مسند پر بیٹھ کر) رحمت! برکت!!
(دونوں آ کر سلام کرتے ہیں)

بادشاہ: (حسینی کی طرف اشارہ کر کے) اسے تم پہچانتے ہو؟ (دونوں چپ چاپ سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں)

بادشاہ: (چیخ کر) کیا یہ حسینی نہیں ہے؟

رحمت: اللہ رحم کرے، جہاں پناہ! آپ دونوں جہان کے مالک ہیں۔ آپ کو اللہ نے سب جگہ دیکھنے کی قوت بخشی ہے۔ ہمیں دنیا ہی دیکھنے کی اجازت ہے۔

برکت: اور عالم پناہ! ہمیں تو کوئی انسان نظر نہیں آتا ہے میرے آقا! ہماری مجبوریوں پر رحم فرمایا جائے۔

بادشاہ: (غصے سے سرخ ہو کر) تم دونوں اندھے ہو، دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے (دونوں خاموشی سے سلام کرتے ہوئے جاتے ہیں)

بادشاہ: (حسینی کو اپنے پاس بٹھا کر) کوئی ہے؟

چوبدار: (داخل ہو کر تعظیم بجالاتے ہوئے) حکم ہو عالم پناہ!

بادشاہ: (حسینی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) میرے ساتھ جو شخص بیٹھا ہوا ہے، وہ کون ہے؟

چوبدار: (حیرت سے اُدھر دیکھتا ہوا دھیمی آواز سے) حضور

بادشاہ: (تعجب میں غرق ہوتے ہوئے حسینی سے) حسینی، تم اس سے بات کرو!

حسینی: (گھبراہٹ کو مسکراہٹ میں چھپاتے ہوئے) جو حکم عالیجاہ!
(چوبدار سے) شیام لال! تم مجھے نہیں پہچانتے

(چوبدار پریشان نظروں سے اسی طرف دیکھتا رہتا ہے۔)

حسینی: (کچھ اونچی آواز سے) میں حسینی ہوں۔ تم نے مجھے نہیں پہچانا؟ جسے حضور اپنی جان سے زیادہ چاہتے ہیں، جس کے فقروں سے شاہِ عالم مچل، مچل جاتے تھے اور تم لوگوں کا ناطقہ بند ہو جاتا تھا۔ (چوبدار چپ رہتا ہے)

بادشاہ: (غصے سے چیخ کر) چوبدار!

چوبدار: حکم کیجئے عالم پناہ!

بادشاہ: تم نے کچھ سُنا؟ حسینی کیا کہہ رہا ہے؟

چوبدار: (عاجزی سے) جان بخشی جائے۔ دونوں جہاں کے مالک! میں نے کچھ نہیں سُنا۔ حضور کے علاوہ نہ میں کسی کو تختِ شاہی پر دیکھ رہا ہوں نہ آپ کے علاوہ کسی کی آواز سن رہا ہوں۔ میں مجبور ہوں، جہاں پناہ......

بادشاہ: بکواس بند کرو!

چوبدار: مگر سرکارِ عالم کے سامنے جھوٹ بولنے کی گستاخی نہیں ہوتی۔ مجبور ہوں۔ غریب پرور!

بادشاہ: نکل جاؤ۔

چوبدار: (معلوم کرتے ہوئے) جو حکم عالم پناہ! (جاتا ہے۔ بادشاہ اُس سے کچھ کہنا چاہتے ہیں کہ وزیر اعظم داخل ہو کر کورنش کرتا ہے)

بادشاہ: (تڑپ کر) وزیر اعظم!

وزیر: حکم فرمائیے عالم پناہ!

بادشاہ: حسینی کہاں ہے؟

وزیر: خطا معاف ہو، غریب پرور۔ عرصہ ہوا جب حضور کا جان سے زیادہ پیارا حسینی انتقال فرما گیا تھا۔ مجھے اُس کے نہ ہونے کا سخت افسوس ہے۔ اس کے لاجواب فقرے اور شیریں و دلکش باتیں اب سننے کو نہیں ملیں گی۔ حضور کو اُس کی یاد آج بہت پریشان کر رہی ہے۔ خادم اس بات کو سمجھتا ہے۔ عالم پناہ!..... لیکن اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں کہ وہ......

بادشاہ: (کانپتے ہونٹوں سے) تم جھوٹ بکتے ہو!

وزیر: قطعی نہیں عالیجاہ!

بادشاہ: (حسینی کی طرف اشارہ کر کے) تب یہ کون ہے؟ کیا یہ حسینی نہیں ہے؟

وزیر: (خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے) گستاخی معاف ہو، جہاں پناہ!..... وہاں تو کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا!

بادشاہ: (حسینی کی طرف دیکھ کر) حسینی!

حسینی: (اُٹھ کر) عالم پناہ!

بادشاہ: تمہیں وزیر اعظم کی صورت نظر نہیں آتی؟

حسینی: آتی ہے حضور!

بادشاہ: یہ محل، یہ میں، پہریدار اور چوبدار وغیرہ سب کچھ نظر آتا ہے؟

حسینی: جی ہاں، غریب پرور!

بادشاہ: میری باتیں سن رہے ہو؟

حسینی: جی ہاں، عالم پناہ!

بادشاہ: اور لوگوں کی باتیں بھی سنتے ہو؟

حسینی: جی ہاں، جہاں پناہ!

بادشاہ: (حیرت سے) تب تمہیں یہ لوگ کیوں نہیں دیکھ سکتے؟ تمہاری باتیں کیوں نہیں سن سکتے؟

حسینی: (سر جھکاتے ہوئے روتی آواز میں) میرے آقا!...... میں کیا کہوں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

وزیر: (پُر فکر لہجے) گستاخی معاف ہو، عالم پناہ! .... آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ جہاں پناہ؟ خدا رحم کرے..... کہیں آسیب کا سایہ.....

بادشاہ: ہم حسینی سے باتیں کر رہے ہیں۔ اپنے خادم سے۔ وہ تمہیں کیوں نہیں نظر آتا؟ اس کی باتیں تمہیں کیوں نہیں سنائی دیتیں؟ (پریشانی سے) پہریدار کو بھی وہ نہیں دکھائی دیتا۔ چوبدار کو بھی نہیں۔ خادموں نے بھی دیکھنے سے انکار کیا، اور.......

وزیر: (سنجیدگی سے) عالم پناہ! جو سامنے نہیں ہے، وہ کسی کو کیسے دکھائی دے گا؟ اس کی آواز کوئی کیسے سُن سکے گا؟

بادشاہ: (حسینی کی طرف دیکھتے ہوئے) تو کیا یہ حسینی نہیں ہے؟ (پیشانی پر خوف سے پسینا آجاتا ہے) یہ اس کا بھوت ہے؟ تو.......

حسینی: (گھبرا کر) جہاں پناہ!

وزیر: اللہ رحم کرے، آپ.......

بادشاہ: (بیٹھتی ہوئی آواز سے) میں کسی آسیبی گرفت میں آگیا ہوں!

(خوف سے کانپتے ہوئے حسینی کی طرف دیکھ کر)

تُو..... تُو...... حسینی کا بھوت.......

وزیر: عالم پناہ! زمین و آسمان کے مالک! میں نے آپ سے کتنی ہی مرتبہ عرض کیا تھا کہ حضورِ عالی تنہا کہیں نہ جایا کریں۔ خادم کو ڈر تھا کہ آپ کو تنہا پاکر ضرور کوئی آسیبی سایہ پریشان کرے گا۔ خدا نہ کرے کوئی آفت برپا ہو۔ (فکرمندی سے) مجھے لگتا ہے کہ حسینی کے جن نے حضور کے اُوپر ناپاک سایہ ڈالا ہے۔

بادشاہ: (حسینی کی طرف دیکھ کر گھبرائی ہوئی آواز میں) تُو تُو..... تُو حسینی نہیں ہے؟

وزیر: (آگے بڑھ کر) عالم پناہ! آپ کا بار بار اُدھر دیکھنا، کسی سے باتیں کرنا، شک پیدا کرتا ہے۔ خود کو سنبھالیے۔ ہمت سے کام لیجیے اور تلوار سے اس کافر رُوح کو بھگانے کی کوشش کیجیے۔

بادشاہ: (چیخ کر) بھوت! (آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں۔ ہاتھ کی تلوار چھوٹ جاتی ہے اور خوف سے بیہوش ہو کر گرتے ہیں۔ لیکن وزیر اُنھیں اپنی باہوں میں سنبھال لیتا ہے۔ اس کے بعد دو ہتھیار بند سپاہی آتے ہیں)

وزیر: (حسینی سے) نیک بخت اَب تو دفع ہو جا۔ اپنی اوقات مت بھول۔ کسی وزیر سے ٹکّر لینا اتنا آسان نہیں (سپاہیوں سے) لے جاؤ اس مردود کو۔ اب کبھی یہ دکھائی نہ دے۔ دونوں سپاہی حسینی کو پکڑ لیتے ہیں۔ وزیر اپنی کامیابی پر مسکراتا ہے۔

●●

لطیفہ

باپ: تم نے چڑیا گھر کو دیکھا؟ تمہاری کیا رائے ہے

لڑکا: میرے خیال میں ہاتھی اور کنگارو کو اپنی دُمیں بدل لینا چاہئیں۔

★

آزاد بارانوی صاحب

اندرا گاندھی

وطن کی آبرو ہیں، شان ہیں، سمان ہیں اندرا
وطن کا ذہن ہیں اندرا وطن کی جان ہیں اندرا

نہ دیکھے اب نگاہِ بد سے کوئی جانبِ بھارت
کہ اپنے دشمنوں کی موت کا اعلان ہیں اندرا

نشانہ آج تک کوئی نہیں دیکھا خطا ہوتے
تعجب ہے کہ کیا ارجن کا کوئی بان ہیں اندرا

اپوزیشن خس و خاشاک کی مانند بہتی ہے
خدا جانے کوئی آندھی ہیں یا طوفان ہیں اندرا

قیامت تک کریں گے فخر ہم جس کی قیادت پر
ہماری مادرِ گیتی کی وہ سنتان ہیں اندرا

گلستانِ وطن میں اب ہر جانب بہاریں ہیں
مسرت کا سبب ہیں، وجہِ اطمینان ہیں اندرا

وطن کی سرزمین پر خالقِ عالم کی جانب سے
کوئی انعام ہیں اندرا، کوئی وردان ہیں اندرا

مناسب ہے بہت اعزازِ بھارت رتن کا ان کو
نہیں شک و شبہ کچھ فخرِ ہندوستان ہیں اندرا

جواب ان کا نظر آتا نہیں آزاد دنیا میں
ہمالیہ کی طرح مضبوط اور ذیشان ہیں اندرا

دنیا کا سب سے بڑا سائنسی جہاز

یہ مضمون ہم روسی سفارت خانے کے ایک بلیٹن سے نقل کر رہے ہیں۔ مضمون میں کچھ مشکل لفظ آگئے ہیں۔ زیادہ تر سائنسی آلوں کے نام ہیں۔ انہیں سمجھنے کے لئے آپ کو اپنے ہاں کے سائنس کے استاد سے مدد لینا پڑے گی۔ اس مضمون کو پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ دوسرے ملک سائنس کے علم میں کہاں سے کہاں پہونچ گئے ہیں۔ شاید یہ بھی احساس ہو کہ ہم ان کے مقابلے میں ترقی کی کس منزل میں ہیں۔ ہم اسی مقصد سے اسے شائع بھی کر رہے ہیں۔ آزادی کے بعد ہمارے دیس نے سائنس کے میدان میں بہت ترقی کرلی ہے۔ اور اس رفتار میں اور بھی تیزی پیدا کرنے کی ضرورت ہے ـــــ اور ہم اردو پڑھنے والے ـــــ ابھی تک کہانیوں کے نشے میں مست ہیں۔ ـــــــــــــــــــ ایڈیٹر

"کاسموناٹ یوری گگارین" دنیا کا سب سے بڑا سائنسی جہاز ہے۔ سوویت یونین میں خلائی تحقیق میں حصہ لینے والے جہازوں کے بیڑے کا یہ دسواں جہاز ہے جو ۷۵۵ فٹ لمبا اور ۱۰۲ فٹ چوڑا ہے۔ اس کی پانی ہٹانے کی صلاحیت ۵۳ ہزار ٹن سے زیادہ ہے۔

ابھی چند سال پہلے تک بحری خلائی جہازوں اور عام جہازوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا تھا لیکن "یوری گگارین" کو دیکھتے ہی ایسا لگتا ہے کہ یہ کسی سائنسی افسانے سے نکلا چلا آرہا ہے۔

اس کے ایریل کی زبردست "تشتریاں" عرشے سے ۱۹۰ فٹ بلند ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ یہ ہر قسم کے تابع ستاروں اور خلائی جہازوں کے سگنل وصول کریں اور انھیں سگنل بھیجیں۔ کسی بھی مدار پر کسی خلائی جہاز کی صحیح پوزیشن ناپنے کی ان ایریلوں میں غیر معمولی قوت و صلاحیت ہے۔

"یوری گگارین" بجائے خود ایک چھوٹا سا شہر ہے اگر آپ اس کے ۱۲۵۰ کیبنو ، لیباریٹریوں اور ہالوں کو دیکھنا شروع کر دیں تو آپ کو آٹھ گھنٹے روز کے حساب سے چھ دن مسلسل چلتے رہنا پڑے گا۔

اس جہاز میں گیارہ عرشے ہیں۔ اور آٹھ لفٹوں کے ذریعے ان سب کو ملادیا گیا ہے۔ اس کے سینما ہال میں ۳۰۰ آدمیوں کی جگہ ہے اور اس کی لیباریٹری میں ۱۰ ہزار کتابیں ہیں۔ اسپورٹ کے لیے ایک پورا جمنازیم ہے تین سوئمنگ پول ہیں۔ اس کے سارے دفتر لیباریٹریاں اور کیبن ایر کنڈیشنڈ ہیں۔

اس جہاز کا خاص انجن ۱۹۰۰۰ ہارس پاور کا ہے

جو جہاز کو ۱۸ بحری میل کی رفتار سے چلا سکتا ہے۔ جہاز پر اس
کے علاوہ دو دوسرے بجلی گھر ہیں جو طرح طرح کی مشینوں اور
آلات کو چلاتے ہیں ان میں وہ موٹر بھی شامل ہیں۔ جو
ایریل کی زبردست "تشتریوں" کو اتنی آسانی سے گھما
دیتے ہیں جیسے کوئی کھلونا ہو۔
جہاز کے لیے ۱۶۰ آدمیوں کا عملہ درکار ہوگا۔ ان
میں سے زیادہ تر ماہر عورتیں اور مرد ہیں جو ہزاروں
پیچیدہ آلات سے کام لیتے ہیں لیکن یہ لوگ سائنسداں
نہیں ہیں۔ "یوری گگارین" اس وقت ۲۶۰ طبیعیات
دانوں، ہیئت دانوں، الیکٹرونیکات اور رسل ورسائل کی
تحقیق کرنے والوں، ریاضی دانوں، خلائی جہاز رانوں، موسمیات
کے ماہروں وغیرہ کو ساتھ لے کر سمندروں میں نکل کھڑا ہوتا
ہے۔
جہاز کا جو حصہ پانی کے اندر رہتا ہے وہ بھی اتنا ہی
دلچسپ ہے جتنا کہ پانی کے اوپر نظر آنے والا حصہ۔ اس میں
پچھلے عام رڈرز کے علاوہ سامنے کے حصے میں بھی دو بڑے
بڑے رڈرز ہیں۔ کمپیوٹر سے کنٹرول کیے جانے والے ایک
آلے کے تحت چلنے والے یہ رڈرز، جہاز کو سمندر میں حیرت
انگیز مستحکم حالات میں رکھتے ہیں۔
یہ اس لیے ضروری ہے کہ ایریل کی تشتریاں ٹھیک
سے کام کرسکیں اور جہاز کی ۱۰۰ سے زیادہ لیبارٹریوں کے
ہزاروں نازک سائنسی آلات محفوظ رہیں۔
اجنبی لوگوں کو اس بات پر حیرت ہوتی ہے اور پھر
ایسا لگتا ہے جیسے بہت سے سائنسی یونٹوں کی دیکھ بھال
کرنے والا کوئی ہے ہی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان
آلات میں لاکھوں "حقائق" آتے رہتے ہیں اور یہ
اسی وقت کام کرسکتے ہیں جب ماورائے انسانی الیکٹرونک

دماغ (کمپیوٹر) ہر وقت ڈیوٹی پر رہیں۔
یہ سب سے بڑا خلائی تحقیقی جہاز حیرت انگیز تیز رفتاری
سے بنایا گیا۔ اس کی ابتدا مارچ ۱۹۶۹ء میں ہوئی اور
ٹھیک سات مہینے بعد اسے سمندر میں اتار دیا گیا۔ لیکن اس
تیرتے ہوئے سائنسی مرکز میں سارے آلات مشینیں نصب
کرنے میں تقریباً دو سال لگ گئے۔
"یوری گگارین" نے صرف ایک ابتدائی آزمائشی
سفر (لینن گراد سے اوڈیسہ تک) کیا اور پھر دسمبر ۱۹۷۱ء
میں اس نے کام پر طویل مدت کے لیے جانے کے واسطے
لنگر اٹھایا۔
ایریل کی تشتریوں میں سے سامنے کی سب سے
بلند طشتری کا کام ہے سوویت یونین کے تابع سیارے
مولنیا کو سننے جو ہر قسم کے رسل ورسائل کے لیے استعمال
کیا جاتا ہے جن میں خلائی ٹیلی ویژن، فون وغیرہ بھی
شامل ہیں۔ سائنسی تحقیقی تابع سیارے (جیسے کہ کاسموس
سلسلے کے تابع سیارے) دوسرے ایریلوں کے ذریعے
جہاز سے رابطہ رکھتے ہیں۔ یہ دوسرے ایریل زمین سے
مدار کو چھوڑنے والے خلائی جہازوں سے رسل ورسائل
برقرار رکھنے کے لیے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔
عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ سوویت خلائی جہازوں سے
جو "اطلاعات" موصول ہوتی ہیں اسے پہلے "یوری گگارین"
پر ہی مرتب اور مدون کرلیا جاتا ہے اور پھر اسے خاص
(سامنے والے) ایریل کے حوالے کردیا جاتا ہے۔... سگنلز
کسی مولنیا تابع سیارے میں موصول ہوتے ہیں اور
پھر وہ انھیں سوویت یونین کے خاص ارضی کنٹرول مرکز
کو پہنچا دیتا ہے۔
جہاز پر نصب شدہ انتہائی پیچیدہ (باقی صفحہ ۳۵ پر)

سرزمینِ ہند

جناب افتخار نظمی (امراؤتی)

اِس سرزمیں پہ مجھ کو یہ زندگی ملی ہے
اس کی فضا میں ہم کو اپنی خوشی ملی ہے

پتھّر ہیں جس کے ہیرے، مٹی ہے جس کی سونا
پھولوں سے اس زمین کا سجتا ہے یہ بچھونا

گنگ و جمن سدا سے بہتی ہیں اس چمن میں
ہے پاسباں ہمالہ اب تک اسی وطن میں

سیراب ہیں یہاں پر سب کھیتیاں ہماری
پُرامن و پُرسکوں ہیں سب بستیاں ہماری

پھولوں کی سرزمیں ہے کشمیر جس کی وادی
فردوس کا نمونہ جس کی ہر ایک گھاٹی

تاج و اجنتا اس کی عظمت بتا رہے ہیں
علم و ہنر کی باتیں اب تک بتا رہے ہیں

مسجد شوالے اس کی تقدیس کے نشاں ہیں
چشمے ہر ایک جانب تہذیب کے رواں ہیں

آزادیِ وطن کو ہر حال میں بچائیں
دشوار مرحلوں کو سب مل کے طے کرائیں

اس کی ہر ایک رہ پر گلشن نئے اگائیں
اس کی پکار میں نظمی ہم جان بھی لگائیں

تب فرض ہوگا پورا ہر جا خوشی رہے گی
اپنے چمن پہ ہر دم اک تازگی رہے گی

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابنِ بطوطہ

(آخری قسط)

ایسے موقعے پر جن مضامین کے شعر پڑھے جاتے ہیں، بڑے عبرتناک ہوتے ہیں مثلاً

"اس تخت پر فلاں فلاں بادشاہ بیٹھ چکے ہیں انھوں نے اچھے اچھے کام کیے مخلوق انھیں یاد کرتی ہے اے بادشاہ اگر تو اچھے کام کرے گا تو خلقت تجھے یاد کرے گی ورنہ تیرا نام مٹ جائے گا۔

پھر شاعر اپنا سر بادشاہ کی گود میں رکھ دیتا ہے پھر سر اٹھا کر دائیں کندھے پر اور بائیں کندھے پر رکھ دیتا ہے۔ یہ رواج زمانۂ قدیم سے ہے اور اسلام لانے کے بعد بھی تبدیل نہ ہوا۔

عبرت ناک کہانی:۔ ایک دن میں دربار میں بیٹھا تھا کہ ایک عالم آیا۔ یہ عالم کسی دوسرے ملک سے آیا تھا۔ اس نے بادشاہ کے سامنے پُرجوش تقریر کی جس کی تصدیق قاضی نے کھڑے ہو کر کی۔ قاضی کی تصدیق کے بعد بادشاہ نے تصدیق کی۔ پھر ہر ایک نے اپنی اپنی پگڑی اتاری اور سروں پر خاک ڈالی۔ اس عالم نے اپنے خاص انداز میں کہا۔

"اے بادشاہ سن! میرے ملک میں ٹڈی دل آیا سے دیکھ کر خدا کے خوف سے ہر ایک آدمی لرزنے لگا خدا کے ایک نیک بندے نے ایک ٹڈی کو بلا کر پوچھا

"تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

ٹڈی نے جواب دیا: "جس ملک میں ظلم زیادہ ہوتا ہے ہم وہاں جاتے ہیں اور خدا کے حکم سے کھیتی اجاڑ دیتے ہیں۔"

بادشاہ نے پگڑی اُتار کر اور سر پر خاک ڈال کر کہا: "میں ظلم سے بیزار ہوں۔ جو کوئی ظلم کرے گا میں اُسے سزا دوں گا، اگر کسی کو ظلم کا حال معلوم ہوا اور مجھے خبر نہ دے اس کا عذاب خبر نہ دینے والے پر ہے۔"

پھر سب امیروں نے پگڑیاں اتار کر ظلم سے بیزاری ظاہر کی۔ سوڈان کا بادشاہ انصاف کے معاملہ میں کسی کی رعایت نہیں کرتا یہاں نہ مسافر کو چوروں کا ڈر ہے نہ مقیم کو۔ کوئی پردیسی آجاتا ہے اور یہاں مر جاتا ہے تو اس کے مال کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔ اور جب بھی کوئی وارث آتا ہے تمام مال اسے واپس دے دیا جاتا ہے۔

سوڈانی نماز کے بے حد پابند ہیں کوئی لڑکی یا لڑکا نماز نہیں پڑھتا تو اسے سزا دیتے ہیں۔

جمعہ کے دن مسجدوں میں اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ پہلے سے کوئی نہ پہنچے تو جگہ نہیں ملتی۔ اس دن ہر ایک آدمی صاف ستھرا لباس پہنتا ہے اور خوشبو لگا کر

مسجد میں جاتا ہے۔

قرآن مجید محنت سے یاد کرتے ہیں جو بچہ قرآن یاد کرنے میں کوتاہی کرتا ہے اس کے دونوں پاؤں میں بیڑی ڈال دیتے ہیں اور جب تک حفظ نہیں کر لیتا بیڑیاں نہیں کھولتے۔

ان تمام خوبیوں کے ساتھ ایک خرابی اتنی بڑی ہے جسے دیکھ کر مجھے بے حد دکھ ہوا۔ اور وہ یہ ہے کہ ان کی لونڈیاں نوکر عورتیں (ماما ئیں) چھوٹی چھوٹی لڑکیاں مادر زاد ننگی پھرتی ہیں۔

رمضان کے زمانے میں یہ بات زیادہ بدنما ہو جاتی ہے جبکہ امیروں کی باندیاں لونڈیاں کھانے کا اور افطار کا سامان لے کر بازاروں میں ننگی نکلتی ہیں اور جو عورت بادشاہ کے سامنے آتی ہے ننگی آتی ہے۔

رمضان کی ۲۷ تاریخ کو میں نے دیکھا کہ شاہی محل سے سو عورتیں جن کے ساتھ دو نوجوان شہزادیاں تھیں ننگی نکلیں۔ یہ بڑے شرم کی بات ہے اور ادب احترام کا یہ انداز بھی اچھا نہیں کہ سر پر خاک ڈال کر اپنی بے چارگی کا اظہار کیا جائے۔ نہ شاعروں کا یہ طریقہ کہ مسخروں کی شکل بنا کر اور بھانڈ بن کر چوبچ میں شعر سنائیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے حبشی مردار کتے اور گدھے کھا جاتے ہیں۔

مالی شہر سے جب میں واپس چلا تو دریائے نیل کی ایک شاخ میں جہاں مچھر بکثرت ہوتے ہیں۔ چاندنی رات میں دریا کے کنارے بڑے بڑے جانور پھرتے دیکھے۔ ہم سمجھے ہاتھی ہیں۔ مگر جب یہ سب کے سب آہستہ آہستہ سن کر پانی میں اترے تو معلوم ہوا کہ دریائی گھوڑے ہیں۔ دریائی گھوڑا خشکی کے گھوڑے سے بڑا اور مضبوط (موٹا) ہوتا ہے اس کا سر گھوڑے سے مشابہ اور پاؤں ہاتھی جیسے ہوتے ہیں۔ دریا میں تیرتے رہتے ہیں۔ مسافر اس ڈر سے کہ یہ کشتیاں ڈبو نہ دیں اپنی کشتیاں کنارے پہلے جاتے ہیں۔

دریائی گھوڑا پکڑنے کا طریقہ یہ ہے کہ نیزوں میں رسی باندھ کر دور سے نشانہ لگاتے ہیں۔ نیزہ گردن یا ٹانگ میں گھس جاتا ہے تو کھینچ لیتے ہیں نیزے کے ساتھ گھوڑا بھی کھنچ آتا ہے۔

بعض مقامات کے حبشیوں کے متعلق ایک بات میں نے یہ بھی سنی کہ آدمیوں کا گوشت کھا جاتے ہیں مگر گورے رنگ کے آدمیوں کا گوشت نہیں کھاتے۔ کہتے ہیں یہ کچا ہے نقصان کرتا ہے۔

اس کے بعد میں پھرتا پھراتا اپنے وطن میں پہنچ گیا اور اس طرح میرا اتنا لمبا سفر دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ۳۔ ذی الحجہ ۷۵۶ھ میں ختم ہو گیا۔ فالحمد للہ

اس لمبی کہانی میں کچھ لفظ، چند جگہوں کے نام آ گئے ہیں ان کی تشریح کر دی جائے تو آپ کے لیے کارآمد ہوگی۔

بھکر سے مراد شاید سکھر ہے۔ پاکستان کا مشہور شہر ہے (آج بہاول پور (پاکستان) کے قریب ہے کسی زمانے میں سندھ کی راجدھانی تھا۔

خداوندزادہ — مخدوم زادہ، بڑوں کی اولاد۔

سرستی — اسے اب سرسہ کہتے ہیں۔

دریائے نیل — یہ دریا تین ہزار میل لمبا ہے سال میں ایک بار اس میں طغیانی یا سیلاب آتا ہے طغیانی نہ ہو تو مصر میں پیداوار نہ ہو، اس ملک میں بارش نہیں ہوتی۔

لاہری۔ یہ شہر مدت ہوئی تباہ ہوگیا۔ کراچی کے آس پاس کہیں تھا۔

حوض شمسی۔ سلطان شمس الدین التمش کا بنایا ہوا حوض کسی زمانے میں پورا حوض سنگِ سرخ کا تھا۔ دیوارے اور پتھر ٹوٹ گئے ہیں ۷۵/۲ بیگھہ زمین میں ہے حوض کے کنارے حضرت شیخ عبدالحق رح محدث دہلوی کا مزار ہے۔

تکیت۔ متھرا کی سڑک سے ملا ہوا ضلع دہلی میں ایک پرانے گاؤں کا نام ہے۔

مسعود آباد۔ موجودہ دہلی سے بارہ میل۔ نجف گڑھ کے قریب اس کے فقط کھنڈر ہیں۔

سیلان۔ عرب کے لوگ لنکا (سیلون) کو سیلان کہتے ہیں

معبر۔ کرناٹک کا عربی نام

بقایا مضمون سائنسی جہاز ص ۳۳

اور حیرت انگیز آلات میں " اسٹیبی لائزرس " ہیں جو بڑے بڑے ایریئلوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ طوفان میں اس آلے کے زبردست الیکٹرونک کان اور آنکھ رہتے ہیں، اور جس طرف بھی چاہا جائے ادھر انتہا پائیداری کے ساتھ لگ جاتے ہیں۔

سمندروں میں تحقیق کرنے والے سائنس دانوں کے علاوہ یہ بات ہر شخص کو عجیب و غریب معلوم ہوتی کہ صرف جہاز کے ہلنے ڈولنے ہی کو صحیح نہیں کرنا ہوتا بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سخت طوفان میں جہاز کا اگلا حصہ ۱۰ تا ۲۰ انچ مڑ اور اینٹھ جاتا ہے کمپیوٹر اس بات کو مدنظر رکھتے ہیں اور سارے ایریئلوں کو ضروری ہدایات دیا کرتے ہیں جن کی وہ تعمیل کرتے ہیں۔

(سائنس کی دنیا روسی سفارت خانہ)

روس کے بچے

سوویت یونین میں بچوں کی دنیا بہت وسیع ہے ان کے لیے ایک لاکھ چالیس ہزار اسکول اور ۷۲۰۰۰ لائبریریاں ہیں۔ موسیقی اور آرٹ کے ساڑھے چار ہزار اسکول اور تقریباً ۶۰۰۰ کلب ہیں۔ ان کی اپنی ریلوے ہے۔ ایک سو سے زیادہ تھیٹر ہیں۔ بچوں کے لیے اخبار اور رسالے نکلتے ہیں جن میں "پانیرسکایا پراودا" شامل ہے جس کی تعداد اشاعت (ایک کروڑ ہے) تمام سوویت اخباروں سے زیادہ ہے۔

گزشتہ سال ۹۵ لاکھ بچوں نے کنڈرگارٹنوں اور نرسری اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ ان اداروں میں بچوں کی تعلیم و تربیت پر والدین کو خرچ کا ۲۰ فیصدی سے زائد نہیں ادا کرنا ہوتا ہے۔ باقی ریاست ادا کرتی ہے۔

عام تعلیم

عام تعلیم کے سوویت اسکولوں میں طلباء کی تعداد تقریباً ۵ کروڑ ہے جو آبادی کے پانچویں حصہ سے بھی زیادہ ہے گزشتہ سال بیک وقت ۱۶ لاکھ لڑکے اور لڑکیوں کے لئے نئے اسکول کھولے گئے ۱۹۷۵–۷۶ء تک مزید ۴۰ لاکھ طلباء کے لیے نئے اسکول تعمیر کئے جائیں گے۔ سوویت اسکولوں میں تعلیم کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا۔ والدین صرف نصابی کتابوں کی فراہمی کا خرچ برداشت کرتے ہیں جو اوسطاً ایک کتاب پر ۳۰ کوپک آتا ہے۔

گزشتہ پانچ برسوں کے دوران نصابی کتابوں کی تقریباً ۱۵ کروڑ کاپیاں سوویت عوام کی ۵۶ زبانوں میں شائع کی گئیں۔ سوویت یونین میں ۱۰۰ سے زیادہ قومیتیں آباد ہیں ان میں سے کوئی بھی قومیت اپنے بچے کو روسی زبان کے اسکول میں یا ایسے اسکول میں بھیج سکتی ہے جہاں اس کی مادری زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔

سوویت یونین میں شمال بعید اور مشرق بعید کی اقوام کو کچھ خصوصیت حاصل ہے۔ ریاست ان کے بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے خاص انتظام کرتی ہے۔

اس بار بھی گرمی کی تین ماہ کی چھٹیوں میں ریاست ان کے آرام اور تفریح پر خاص توجہ دے گی۔ شہر سے دور دیہاتی علاقہ میں دریا کے کنارے یا ساحل سمندر پر واقع پانیروں کے دس ہزار کیمپوں میں ۸۰ لاکھ نوعمروں کو شرکت کا موقع ملے گا۔ ان کیمپوں کا سارا خرچ ریاست اور ٹریڈ یونین کارخانے اور پنچایتی فارم برداشت کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ بچوں کے لیے متعدد سینی ٹوریم اور صحت گاہیں بھی موجود ہیں۔

●●

لطیفہ

ایک معائنہ کرتے ہوئے انسپکٹر نے استاد سے پوچھا کہ وہ بچوں کو کس طرح پڑھاتے ہیں۔ استاد نے جواب دیا "پہلے تو میں اپنے شاگردوں کو بتاتا ہوں کہ میں کیا بتانے والا ہوں پھر جو مجھے بتانا ہوتا ہے وہ انہیں بتا دیتا ہوں اور آخر میں انہیں یہ بتاتا ہوں کہ میں نے انھیں کیا بتایا ہے"

شہد کی مکھی

شہد کی مکھی کو دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے۔ اور ڈر بھی لگتا ہے۔ ان کی پانچ آنکھیں پانچ ہزار نھنھے ہوتے ہیں۔ ان کے پَر ایک منٹ میں گیارہ ہزار چار سو مرتبہ پھڑپھڑاتے ہیں۔ وہ ایک پونڈ شہد کو جمع کرنے کے لئے ۵۰ ہزار میل کا سفر طے کرتی ہیں۔ ان کے ڈنک کو حرکت دینے میں ۲۲ اعضا کام کرتے ہیں۔ شہد کی مکھی سننے کی طاقت سے محروم ہوتی ہے۔ ہم اسے کسی بھی طرح پالتو بنا نہیں سکتے کیونکہ وہ اپنی غذا کے معاملے میں خود کفیل اور خود مختار ہوتی ہے اور اس کے لیے وہ انسانوں کی محتاج نہیں ہوتی وہ اپنے پیغام بھنبھناہٹ کے ذریعے دوسروں تک پہونچاتی ہے۔ اگر اسے کسی دشمن کی موجوگی کا علم ہو جائے تو وہ چاروں طرف تیز بھنبھناہٹ کے ساتھ چکر لگاتی ہے۔ دوسری مکھیوں کو جو نہی نئی خبریں ملتی ہیں وہ سب باہر نکل آتی ہیں اور چھتے کے آس پاس چکر لگاتی ہیں۔ کسی کو اپنا گھر یعنی چھتا توڑنے نہیں دیتی ہیں۔ اس طرح سب مل کر اپنے گھر کی حفاظت کرتی ہیں۔

عبدالرحیم میمن پونہ

پیدل چلنے کا نیا ریکارڈ

وفاقی جمہوریہ جرمنی کے شہر ہیر فورڈ ہیلموٹ شیلے صاحب نے پچھلے دنوں امریکہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چار ہزار چھ سو چھپن (۴۶۵۶) کیلو میٹر کا فاصلہ طے کرکے پیدل چلنے کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ یہ فاصلہ انھوں نے ۵۹ دن، ۱۰ گھنٹے ۲۰ منٹ میں طے کیا۔

اس سے پہلے انگلستان کے ہردس ٹرلو، نے ۱۹۶۹ء میں لاس اینجلس سے نیویارک تک کا فاصلہ ۴۶ دن ۱۱ گھنٹے اور پچاس منٹ میں طے کیا تھا۔ اس لیے سفر میں ان کی بیوی اور بچہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ یہ دونوں کار میں بیٹھے شیلے صاحب کا ساتھ دیتے رہے وادی زوتا کے ریگستانی علاقے میں دھوپ کی شدت تھی ٹخنے سوج گئے تھے، پیروں کی انگلیوں اور ایڑیوں میں چھالے پڑ گئے تھے، مگر وہ بڑے صبر و استقلال کے ساتھ روزانہ دس بارہ میل پیدل چلتے رہے آخر ایک دن دور سے انھیں نیویارک کے آسمان سے باتیں کرتے مکانوں کی دھندلی دھندلی لکیری نظر آنے لگی۔ چند گھنٹوں کے بعد وہ نیویارک شہر کی حد میں داخل ہو گئے یہاں نیویارک کے میئر نے ان کا استقبال کیا اور شہر کی سنہری کنجی انعام میں دی۔ (اطلات جرمنی)

ازبیک ادارے میں نادر قلمی نسخے

تاشقند میں ازبیک سائنس اکادمی کے اِدارہ مشرقیات میں بہت سے نادر قلمی نسخے ہیں۔ بہت سے ہندوستان کی تاریخ سے متعلق ہیں۔ اور ان سے گیارھویں صدی سے انیسویں صدی تک ہندوستان کی سیاسی اور تہذیبی زندگی کی تصویر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ ہندوستان سے متعلق ان قلمی کتابوں میں سب سے اہم البیرونی کی کتاب "کتاب الہند"، ہے۔ اسے عام طور پر جغرافیائی، نسلی، تاریخی اور تہذیبی مواد کی ایسی قاموس سمجھا جاتا ہے جس کی مثال زمانہ وسطیٰ (بیچ کے زمانے) کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ کتاب الہند کا ترجمہ روسی زبان میں ہو چکا ہے (دنیا کی دوسری بڑی زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ خود اُردو میں بھی ہو چکا ہے)

(افکار و جائزے سوویت ایجنسی)

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی ۲۵

شمارہ ۱۰ جلد ۹

اکتوبر ۱۹۷۲ء

ایڈیٹر

محمد حسین حسان ندوی

فہرست مضامین

صدر دفتر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

شاخ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اُردو بازار دہلی ۶

شاخ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ ۲

قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے

سالانہ چندہ چھ روپے

پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے
پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
سے شائع کیا گیا

بچوں کی کتابیں

مذہب

ارکانِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	-/۵۰
آں حضرتؐ	الیاس احمد مجیبی اردو ہندی	-/۷۵
پاک کہانیاں دو حصوں میں	مقبول احمد سیوہاروی	۲/۳۵
چار یار	الیاس احمد مجیبی	۱/۳۰
خلفائے اربعہؓ	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۲/۲۵
رسولِ پاکؐ	عبدالواحد سندھی	۱/۸۰
عقاید اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	-/۵۰
مسلمان بیبیاں	مولانا اعجاز الحق قدوسی	-/۷۵
نبیوں کے قصے	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۱/۲۵
ہمارے رسولؐ	" "	۱/۶۵
ہمارے نبیؐ	سید نواب علی رضوی اردو ہندی	-/۷۵ -/۴۰

معلومات

آدمی کی کہانی	مشتاق احمد	۱/۷۵
انوکھا عجائب خانہ	محمد حسین حسان (چار حصے)	۱/۸۰
بجلی کی کہانی	علی احمد خاں	-/۵۰
پڑدادا کی کہانی	محمد عبدالغفور	-/۵۶
تاریخ ہند کی کہانیاں (اول)	خجستہ سلطان	-/۸۰
" " (دوم)	ضیاءالرحمٰن	۱/-
" " (سوم)	مشتاق احمد اعظمی	۱/۸۰
" " (چہارم)	" "	-/۹۵
چٹانوں کی کہانی	محمد امین	۱/۷۵
خبر رسانی کے طریقے	رفیعہ منظور الامین	-/۸۵
دنیا کے بچے	محمد حسین حسان	۱/-
دنیا کے بسنے والے	بشیر حسین زیدی	-/۷۵

دہلی	ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی	۱/۸۰
رابندر ناتھ ٹیگور	صفدر حسین	۱/۲۵
سماجی زندگی (اول)	احمد پٹیل و غلام ایاز	-/۵۶
" " (دوم)	" " " "	-/۸۱
" " (سوم)	" " "	-/۸۱
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	۱/۳۰
سمندر کے نیچے	" " "	۲/-
قدرت کے کرشمے	(ادارہ)	-/۶۲
میر انیس	محمد حسین حسان	۱/۲۵
ہماری پارلیمنٹ	کیلاش چندر	۱/۵۰

کہانیاں، ڈرامے اور ناول

اس نے کیا کرنہ جانا (کہانیاں)	آصفہ مجیب	-/۳۷
پریم کی جیت (ڈراما)	اسداللہ کاظمی	-/۳۷
تاتیں خاں (کہانی)	محمد حسین حسان	-/۳۰
ترکوں کی کہانیاں (کہانی)	مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	-/۵۵
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول)	م۔ ندیم	۱/۵۰
تین اناڑی (ناول)	عصمت چغتائی	۱/۴۰
چقماق کی ڈبیا (کہانی)	برکت علی فراق	-/۴۰
چھیادت کا آدم خور شیر (سچی کہانی)	محمد معین	-/۳۵
ستاروں کی سیر (ناول)	کرشن چندر	۱/۷۵
کوسے دادا (سچا ناول)	مجیب احمد خاں	۱/۷۵
لال مرغی (کہانی)	عبدالواحد سندھی	-/۵۰
مزہ چکھائیں گے (")	مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	-/۳۵
مزیدار پہیلیاں (پہیلیاں)	محمود علی خاں	-/۶۵
ننھا تتو (کہانی)	خورشید سلطان	-/۳۰

بچوں سے باتیں

یہ اکتوبر کا مہینہ ہے۔ ہمارے باپو (مہاتما گاندھی) اسی مہینے ۲ رتاریخ کو پیدا ہوئے تھے۔ باپو کے جنم دن یا یوم پیدائش کی یہ تقریب پورے دیس میں منائی جائے گی۔ دیس ہی کیا دیس سے باہر بھی منائی جائے گی۔ باپو کے ماننے والے دوسرے ملکوں میں بھی بہت ہیں۔ امریکہ میں نیگرو قوم کے ایک لیڈر ڈاکٹر لوتھر کنگ نے اپنی تحریک باپو کے بتائے ہوئے راستے پر چلا رہے ہیں۔

ہمارے بالکل پڑوس میں لنکا یا سیلون کا ایک چھوٹا سا ملک ہے یہاں ثانوی اسکول کے ایک استاد نے باپو کی بتائی ہوئی باتوں کی روشنی میں سماج سدھار کا کام کیا اور چھ سات سال میں اتنی کامیابی حاصل کی کہ باہر کے ملکوں میں ان کا نام ہو گیا۔ ان ماسٹر صاحب کے کارناموں کا مختصر سا حال ہم نے اس پرچے میں شائع کیا ہے۔ اصل مضمون انگریزی میں تھا، عزیزی شعیب حسان نے اسے اپنایا ہے۔ ذرہ لمبا ہو گیا تھا۔ دو قسطوں میں کرنا پڑا۔

محترم شفیع الدین صاحب نیر کی نظم باپو کا پیغام بھی اسی.. سلسلے میں شائع کی جا رہی ہے۔ بہت پیاری نظم ہے تمھیں یقیناً پسند آئے گی۔ محترم مقتوں کوثری صاحب عزیزی افضل امام جاوید احمد صاحب اور دوسرے حضرات کی چند نظمیں بھی اسی سلسلے میں شائع کی جا رہی ہیں۔

حرفوں کا جادو، موتیوں کا جزیرہ، انڈولا سے دہلی ہمارے سلسلہ وار مضامین ہیں۔ اور بہت پسند کئے جا رہے ہیں۔ حرفوں کا جادو، تو کیا بچوں کیا بڑوں، سب میں یکساں مقبول ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ

باوجود احتیاط کے رشید حسن خاں صاحب کے دو مضمون میں دو ایک غلطیاں ضرور رہ جاتی ہیں۔ کیا بتائیں پتھر کی لکھائی چھپائی میں چاہے کتنی ہی احتیاط کیجئے کچھ نہ کچھ بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔

محترم محمد اکرام صاحب (لکچرر ٹیچرس کالج) نے اس مرتبہ پھر نوازش کی ہے۔ اب کے ان کا مضمون کمپیوٹر پر ہے۔ یہ موضوع بڑا مشکل ہے پر آپ ذرا اس مضمون کو پڑھ کر تو دیکھئے، کس قدر.. آسان اور سادہ زبان میں اکرام صاحب نے اس مشکل مضمون کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

ہاں ایک مضمون اولمپک پر بھی ہے۔ یہ بھی وقت کی چیز ہے اس میں پرانے زمانے کے اولمپک مقابلوں کا تھوڑا سا حال ہے پھر اولمپک کھیلوں کا ذکر ہے۔ یہ مضمون ہمارے کھلاڑی پیامیوں کے لیے یقیناً پسند آئے گا۔

پچھلے مہینے ہم نے ایک خوش خبری سنائی تھی۔ مکتبہ پیام تعلیم کی طرف سے آٹھ کتابوں کا سیٹ اور شائع ہو گیا ہے۔ اس سیٹ میں پہلی کتاب تو محترمہ آصفہ مجیب کی ہے "جب اور اب" اب سے تیس چالیس برس پہلے ہمارے گھروں کا جو رہن سہن تھا جو رسم و رواج تھے۔ محترمہ آصفہ مجیب نے ان کا حال ایسی زبان میں لکھا ہے جو عام طور پر گھروں میں بولی جاتی ہے۔ اس لیے اس میں زبان کی مٹھاس ہے محاوروں کا نمک ہے۔ انداز بیان تو کیا کہنے ؟ دوسری کتاب دہلی ، "کوئے وادا" والے مجیب احمد خاں صاحب

کی کمی پوری ہے۔ پیامِ تعلیم میں چھپ چکی ہے۔ تیسری کتاب "تین گوڑیاں" اقبال صاحب کی لکھی مختصر لیکن بہت ہی دلچسپ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ لگ بھگ سب کہانیاں مختلف زبانوں کی ہیں بہت ہی دلچسپ ہیں۔

چار کتابیں (۱) "بدنصیب شہزادی" (۲) "عقل کا سودا" (۳) "جنگل کا راجہ" (۴) "تیس مار خاں" ابرار محسن صاحب کی کتابیں ہیں۔ پیامی ان کی بہت سی کتابیں پیامِ تعلیم میں پڑھ چکے ہیں۔ بچوں کی کہانیاں لکھنے کا بہت اچھا ڈھنگ انھیں آگیا ہے۔ یہ سب کہانیاں اس قدر مزے کی ہیں اس قدر مزے کی ہیں کہ پڑھ کر جی خوش ہو جائے گا۔ اور بھئی آٹھویں کتاب بندر کا گھر بھی اتنی ہی اچھی ہے پڑھیے اور مزے لیجیے۔

مگر بھئی ابھی تو ہمارے پروگرام کا سلسلہ جاری ہے۔ آٹھ کتابیں تھوڑے ہی دنوں میں اور تیار کر لی جائیں گی طے یہ ہوا کہ آٹھ آٹھ کتابیں ایک ساتھ شائع کی جائیں۔ اس سلسلے میں ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ بس اتنی کہ ہماری کوششوں کی سرپرستی کیجیے۔ دل کھول کر یہ کتابیں خریدیے۔ اس طرح ہمارا حوصلہ بڑھے گا۔ اور کام میں تیزی آئے گی۔

پچھلے پرچے میں ہم نے مکتبہ کے کاموں کا مختصر سا ذکر کیا تھا۔ اس ایک مہینے کی مدت میں اور بہت سی کتابیں چھپ گئی ہیں۔ ترقی اردو بورڈ اور نیشنل بک ٹرسٹ کی اردو کی کتابیں بھی مکتبہ چھاپ رہا ہے۔ اور اس کے اہتمام میں جتنی کتابیں چھپی ہیں۔ انھیں دیکھ کر سچ مچ آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔

اور ہاں بھئی سب سے اہم خبر تو آپ کے لیے "کہانی نمبر" کی ہے۔ یہ نومبر میں شائع ہوگا۔ آپ کو انتظار تو بہت کرنا پڑا

مگر ہمیں امید کیا یقین ہے کہ یہ جس وقت آپ کو ملے گا۔ انتظار کی ساری کلفت ختم ہو جائے گی۔ کہانی نمبر میں آپ محترمہ رضیہ سجاد ظہیر، محترم غلام ربانی، جناب حمید عثمانی برادرم غلام یزدانی۔ محترم محمد امین جناب اقبال امروہوی۔ عادل جعفری۔ جناب خلیق انجم مناظر عاشق اور دوسرے بہت اچھے اچھے ساتھیوں کی کہانیاں پڑھیے گا۔

اس مرتبہ ایک خاص بات یہ ہے کہ اپنے دیس کی مختلف زبانوں کی اور دوسرے ملکوں کی اچھی اچھی اور منتخب کہانیاں بھی ہمیں کافی تعداد میں مل گئی ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں خلیق انجم صاحب، سلام بن رزاق صاحب اور اقبال امروہوی صاحب سے بہت مدد ملی ہے۔ خلیق انجم صاحب نے تو ہمیں بہت سی کہانیاں مرحمت فرمائی ہیں۔ ان کے علاوہ۔ کہانی لکھنے والوں کا حال، کہانی کیسے لکھیں، بچے کو کس طرح کی کہانیاں اچھی لگتی ہیں یہ سب چیزیں بھی آپ کے کہانی نمبر میں ہوں گی۔ غرض یہ گلدستہ آپ کے لیے بہت ہی قیمتی اور انمول ہوگا۔ اس قیمتی گلدستے کی قیمت ہم نے بہت ہی کم رکھی گئی ہے۔ کل ڈیڑھ روپیہ۔ سالانہ خریداروں سے تو یہ بھی نہ لیے جائیں گے۔ بلکہ نومبر کے مہینے میں جو پیامی نئے خریدار بنیں گے ان سے علیحدہ قیمت یعنی ڈیڑھ روپیہ الگ سے نہ لیا جائے گا۔

اور آپ کے کہانی نمبر کی نظمیں بھی بہت شاندار ہیں محمد شفیع الدین صاحب نیر، محترم جناب حرمت الاکرام، پروفیسر امانت، جناب عبداللہ شرقی جناب ناوک حمزہ پوری جناب عبدالمتین نیاز اور دوسرے ساتھیوں کی نظمیں۔ آپ کو بہت ہی اچھی لگیں گی بعض نظمیں تو سچ مچ شاہکار ہیں۔

از محمد شمیم الدین نیّر

باپو کا پیغام

آؤ بچو! آؤ، ہم باپو کے چمن کی سیر کریں
پیارے باپو کے پیارے پیارے گلشن کی سیر کریں

پریم کے اس شاداب چمن میں ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں
ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں، الفت کا مینہ برساتی ہیں

یہ گلشن پریم کا مندر ہے، ہر کیاری پریم بھری اس کی
آنکھوں کو ٹھنڈک دیتی ہے۔ سرسبزی اور تری اس کی

ہیں رنگ برنگے پھول اس کے، ہر ہردے[1] کو سکھ دیتے ہیں
اس دیس کے رہنے والوں کے من کی چنتا[2] ہر[3] لیتے ہیں

اس باغ کے در پر شہنائی امن اور اماں کی بجتی ہے
اس باغ کے پیارے کنجوں میں الفت کی محفل سجتی ہے

"سب شانت رہیں سب شانت رہیں" سندیش[4] ہے یہ شہنائی کا
باپو کا سندیسہ پھیلائے، یہ کام ہے اس شہنائی کا

پابندی میں جو ہوتا تھا، وہ آزادی میں آج نہ ہو
انصاف کا جھنڈا لہرائے ظلم اور ستم کا راج نہ ہو

بھارت کا کوئی بھی باسی[5] بے چین نہ ہو بے چین نہ ہو
اب سب کے لیے اس بھارت میں بے چینی کا دن رین نہ ہو

اس ساز کی میٹھی تانوں سے گڑبڑ کے بادل چھٹتے ہیں
گڑبڑ کرنے والے پاپی، یہ باتیں سن کر کڑھتے ہیں

جو امن کے ہیں شیدائی نیتر وہ باپو کے گن گاتے ہیں
ہاں امن کے دشمن بھارت میں ان تانوں سے گھبراتے ہیں

---

[1] دل [2] پریشانی [3] ہر لینا دور کردینا [4] پیغام۔ [5] باشندہ رہنے والا

رشید حسن خاں صاحب

حرفوں کا جادو

((۵))

پچھلے شمارے میں بعض فاش غلطیاں کتابت کی راہ پاگئی تھیں مثلاً ص ۷ ۔ کالم ۲ ۔ سطر ۳ : "آخر کے لفظ کو شامل کرنے" یہاں لفظ کے بجائے "الف" ہونا چاہیے تھا

ایضاً سطر ۱۱ ۔ شروع سطر میں "لفظ" ہے ۔ اس کی جگہ "نقطہ" ہونا چاہیے تھا۔

کاتب صاحب ہمزہ اپنی طرف سے اکثر بڑھا دیتے ہیں ۔ جیسے ص ۸ ۔ کالم ۲ ۔ سطر ۵ "چاہیئے" اس کو "چاہیے" ہونا چاہیے تھا۔ اس کالم میں تین چار جگہ اس لفظ کی یہی درگت بنی ہے ۔ اسی طرح اسی صفحہ کے پہلے کالم میں : دیجئے اور دیکھئے ۔ ان کو بھی دیجیے اور دیکھیے ہونا چاہیے تھا۔

بیانیہ نشان : اس طرح ہوتا ہے ۔ کاتب صاحب اس کو :۔ لکھتے ہیں ۔ انھیں یہ سمجھا دیجیے کہ اب آیندہ سے وہ نقل مطابق اصل کیا کریں ۔ اپنی طرف سے اضافے نہ کیا کریں — اور ہاں کاتب صاحب بعض لفظوں کو ملا کر لکھ دیتے ہیں ۔ جیسے ۔ فنکار ، خوبصورت ، دلکش ، ان سے کہیے کہ خدا کے لیے نہ سہی تو گھگوان کے لیے ہی یہ ستم ظریفی رشید حسن خاں پر نہ کریں ۔ —— ایک آخری بات لفظ "یہ" لشکن کے بغیر صحیح نہیں ۔ ان سے کہیے کہ میرے مضمون میں ہر جگہ "یہ" لکھیں ۔ "یہ" نہیں ——

ذرا اس لفظ کو دیکھیے :

دوکان

آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ کیا لفظ ہے ؟ جی! کیا فرمایا : آپ نے یہی کہا نا کہ آدمی کے دو کان ہوتے ہیں ، وہی "دوکان" ہیں یہ ۔ بات تو آپ کی بالکل ٹھیک ہے ۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ میرا مطلب یہ نہیں تھا ۔ اچھا ایک اور طرح سے اس کو پوچھا جائے ۔ اگر لفظ کے بجائے ، ذرا اس جملے کو تو دیکھیے :

راشن کی دوکان پر آج بھیڑ لگی ہوئی ہے ۔

کہیے جناب ! اب آپ کیا کہتے ہیں ؟ کیا یہاں بھی وہی آدمی کے دو کان ہیں ؟ آپ کے دونوں جواب ٹھیک ہیں ۔ مگر اس لفظ کی صورت ٹھیک نہیں ۔ یہ جو ایک فالتو واؤ بیچ میں براجمان ہے ، اس

نے اچھے بھلے لفظ کی صورت کو بگاڑا ہے ۔ جیسے کسی کے ہاتھ میں پانچ کی جگہ چھے انگلیاں ہوں وہ چھٹی انگلی تو فالتو ہی کہلائے گی ۔ بُری بھی معلوم ہوگی ۔ پانچ انگلیوں کی وجہ سے سے ہاتھ کو پنجہ بھی کہا جاتا ہے ۔ اب یہ لفظ بھی جھگڑے میں پڑ گیا ۔ اب آپ ہاتھ کو کیا کہیں گے ۔ ۶ انگلیاں تو پانچ کی جگہ چھے ہو گئیں !!

بات یہ ہے کہ پرانے زمانے میں کچھ لفظوں میں پیش کو ظاہر کرنے کے لیے ایک واؤ بڑھا دیا جاتا تھا ۔ جیسے : اُس کو اوس اور اُدھر کو اودھر لکھا جاتا تھا مطلب یہ ہوتا تھا کہ کوئی شخص اُدھر کو اِدھر اور اُس کو اِس نہ سمجھے

زمانہ بدل گیا ، بہت سی چیزیں بھی بدل گئیں ، انھی کے ساتھ ایسے لفظوں میں سے یہ فالتو واؤ بھی نکل گیا ۔ لوگ سیدھے سبھاؤ اُس اور اُدھر لکھنے لگے ۔ مگر دو چار لفظ ایسے رہ ہی گئے جن کو کچھ لوگ اب بھی اُسی پرانے ڈھنگ سے لکھ دیا کرتے ہیں ۔ انھی دو چار لفظوں میں سے ایک یہ لفظ دکان بھی ہے ۔

خوب یاد کر لیجیے کہ اس لفظ میں واؤ ہرگز نہیں آئے گا ۔ اس کو واؤ کے بغیر لکھا جائے گا ۔ یعنی : دکان ۔ جب آپ "دوکان" لکھیں گے تو وہی مطلب ہوگا جو آپ نے پہلے بتایا تھا ۔ یعنی : آدمی کے دُو کان ۔

اسی طرح ایک مصدر ہے ۔ پہنچنا ۔ اس سے بہت سے فعل بنتے ہیں ۔ اس کو بھی بہت سے لوگ پہونچنا لکھ دیا کرتے ہیں ۔ یہاں بھی واؤ فالتو ہے ۔ اور گڑبڑ کر رہا ہے ۔ یاد رکھیے کہ پہنچنا کو اور اس سے بننے والے سارے لفظوں کو واؤ کے بغیر لکھا جائے گا ۔ جیسے : پہنچ ، پہنچا ، پہنچتا ہے ، پہنچے گا ، پہنچ گیا ، پہنچانا ، پہنچوایا وغیرہ ۔

پہنچا تو ایک فعل ہے جو پہنچنا سے بنا ہے اور ایک اِسم ہے ، جس کے معنی ہیں : کلائی یہ بھی واؤ کے بغیر لکھا جائے گا ۔ ایک بہت پرانا شعر یاد آیا ، جس میں یہ لفظ آیا ہے :

اس گل کی ، شاخِ گل سے بھی ، نازک کلائی ہے
گجرا جو پہنا پھولوں کا ، پہنچا لچک گیا

اب آپ سوچنے لگے ہوں گے کہ یہ ایسی بھی کیا نزاکت کہ پھولوں کے گجرے سے کلائی مڑک گئی ۔ ارے بھائی ! یہ تو شاعر ہے ۔ بات کو ذرا بڑھا کر کہا ہے ۔ کبھی کبھی بحث کیے بغیر بھی بات کو مان لینا چاہیے اور بھائی ، کہانیوں کی پریاں تو اس سے بھی زیادہ نازک ہوا کرتی ہیں ۔ ممکن ہے کہ یہ کوئی پری ہی ہو ۔

اسی پہنچے سے ایک اور لفظ بنا ہے: پہنچی۔ یہ ایک زیور ہے ہاتھوں میں پہننے کا۔ اب اس کا چلن اٹھ سا گیا ہے۔ لیکن آپ کی دادی جان یا نانی جان کے پاس ضرور ہوں گی۔ ایک بار دیکھ تو لیجیے کہ پہنچیاں کیسی ہوتی تھیں۔ اب تو چوڑیوں کا رواج بھی اٹھتا جا رہا ہے، پہنچیاں کون پہنے گا۔

ہاں یہ خیال رکھیے کہ جب آپ اُس یا اِس لکھیں تو الف کے نیچے زیر یا اُس کے اوپر پیش لگا دیا کیجیے، پڑھنے والے کو آسانی ہوگی۔

ایک اور لفظ لیجیے۔ منہہ۔ اس پر آپ پیش لگائیں گے تو یہ مُنہہ ہو جائے گا اور زیر لگائیں گے تو یہ مِنہہ ہو جائے گا۔ مِنہہ زیر کے ساتھ برستا ہے اور منہہ پیش کے ساتھ دھویا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں مُنہہ کو مونہہ بھی لکھا جاتا تھا۔

اسی طرح کے کچھ اور لفظ بھی اچھی طرح ذہن میں بٹھا لیجیے۔ ایک لفظ ہے موٹا۔ معنی تو معلوم ہی ہوں گے۔ اسی سے ایک لفظ بنتا ہے مُٹاپا۔ اب اِس مُٹاپے میں واؤ نہیں آئے گا۔ یعنی اس کو موٹاپا نہیں لکھیں گے۔

اسی طرح بوڑھا سے بُڑھاپا بنے گا۔ بوڑھاپا نہیں لکھا جائے گا۔ لوہا سے لُہار بنا ہے۔ لوہے کا کام کرنے والا۔ اس کو بھی واؤ کے بغیر لکھنا چاہیے۔

کپڑا بننے والے کو جُلاہا کہا جاتا ہے۔ اور اس کو پرانے زمانے میں جولاہا لکھا کرتے تھے۔ اب لُہار کی طرح یہ بھی واؤ کے بغیر جُلاہا لکھا جائے گا۔ اسی طرح لُوک سے جب لُکیلا بنے گا تو اس کو بھی واؤ کے بغیر لکھا جائے گا۔

ایک اور لفظ ہے جس میں بہت سے لوگ محض نہ جاننے کی وجہ سے ایک فالتو واؤ لکھ دیا کرتے ہیں، یہ لفظ ہے۔ خُرد۔ اس کے معنی ہیں 'چھوٹا'، اس کو خورد لکھ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس طرح معنی ہی چوپٹ ہو جاتے ہیں۔ خورد جب واؤ کے ساتھ لکھا جائے گا تو اس کے معنی ہوں گے 'کھایا'۔ یہ فارسی کے ایک مصدر خوردن کا ماضی ہے "اشیا سے خوردونوش" لکھتے بھی ہیں۔ مطلب ہوتا ہے: کھانے کی چیزیں۔ خُرد جس کے معنی ہیں 'چھوٹا' اس کو ہمیشہ واؤ کے بغیر لکھا جائے گا۔

(خ۔ ر۔ د) ہاں، اِس لفظ خُرد کے خ پر پیش لگا دیا کیجیے، ورنہ کوئی صاحب اس کو خِرد پڑھ لیں گے۔ جس کے معنی ہیں: عقل۔ خِردمند، اسی سے بنتا ہے، عقل مند۔

خُردبین کا لفظ بنا ہے۔ اس کے معنی اسکول میں اپنے سائنس کے ماسٹر صاحب سے پوچھیے گا۔ ——— اسی خُرد سے ایک اور لفظ بنا ہے، خُردہ۔ اس کے معنی ہیں: 'ریزگاری'، ٹکڑا۔ اور بھی کئی معنی ہیں۔

دو اور لفظ ہیں ایک ہے خرّم اور دوسرے
خرسند ۔ دونوں کے معنی ہیں : خوش ۔ ان کو بھی
واو کے بغیر لکھنا چاہیئے ۔

فارسی میں کچھ لفظ ایسے بھی ہیں ۔ جن میں
واو تو لکھا جاتا ہے ۔ لیکن پڑھنے میں نہیں
آتا ۔ قواعد کی زبان میں ایسے واو کو واو معدولہ
کہتے ہیں ۔ ایسے کچھ لفظ اردو میں بھی استعمال
میں آتے رہتے ہیں ۔ اور یہ سب لفظ واو
کے ساتھ ہی لکھے جاتے ہیں ۔ عام طور سے
استعمال ہونے والے لفظ یہ ہیں :

خوش ۔ خود ۔ خواہش ۔ خوردن ۔ خوراک ۔

ان کو واو کے ساتھ ہی لکھنا چاہیے ۔

ایک لفظ ہے : برخاست ۔ کہتے نہیں ہیں
کہ ایک تھانے دار کو برخاست کر دیا گیا ۔ یعنی نکال
دیا گیا ۔ اسے درخواست کے قیاس پر برخواست
لکھنا غلط ہے ۔ درخواست کو واو کے ساتھ
لکھا جائے گا ۔ اور برخاست کو واو کے بغیر
جیسے : محفل برخاست ہوگئی ۔

اب ایک بار ذرا سبق کو دہرا لیجیے ۔
دیکھیے ، نیچے جتنے لفظ لکھے ہوئے ہیں ۔ یہ
سب واو کے بغیر لکھے جائیں گے ۔

دُکان ۔ پہنچنا ۔ پہنچا ۔ پہنچی ۔ مُنہ ۔ مُٹاپا ۔
بڑھاپا ۔ کُمہار ۔ جُلاہا ۔ کُنبہ ۔

ایک ریشمی کپڑا ہوتا ہے ، بلکہ یوں کہیے کہ
ہوتا تھا ، جسے کمخواب کہتے تھے ۔ پرانے گھروں
میں شاید دو چار کپڑے اس سے بنے ہوئے
آئیں ۔ نام مگر اب بھی چلا جا رہا ہے ۔ اس
لفظ میں واو آئے گا ۔ کم خواب کے معنی ہیں :
کم روئیں والا ۔ مخمل کے مقابلے میں اس میں
رواں کم ہوتا تھا ۔ اسی لئے یہ نام پڑ گیا ۔

(باقی)

بقایا کتابوں کی باتیں صفحہ ۳۷

تھی ۔ کہانی کی کہانی نصیحت کی نصیحت ، واہ کیا کہنا ۔
بچیوں کو اکثر شکایت رہتی ہے کہ ان کے بارے
میں تو کوئی کچھ لکھتا ہی نہیں ۔ نہیں بھئی یہ کتابیں دونوں
کے لئے ہوتی ہیں ۔ ابھی جن نیّر صاحب کے بارے
ہم نے تمہیں بتایا تھا انھوں نے تو الگ سے بھی بچیوں
کے لئے کتابیں لکھی ہیں ۔ "منی کا گیت" اور "منی کا ..."
دونوں خاص بچیوں کے لئے ہیں ۔ ان میں بڑی پیاری
نظمیں ہیں ، منی کی لوری ہے ، چندا ماموں ، پریوں کا
ناچ ، گڈے کا سہرا ، ریل کا کھیل ۔ سب دیکھنا ۔
تو یہ نظمیں پڑھو گی ۔ ایک سے زیادہ زبانیں سیکھو
گھر بیٹھے دنیا کی سیر کرو ۔ دنیا جو ان کتابوں میں
بند ہے ۔ دنیا جو تم کو اپنے پاس بلا رہی ہے
(آل انڈیا ریڈیو بھوپال کے شکریہ کے ساتھ)

٭

مفتوںؔ کوثوی

مبارک یومِ آزادی مبارک!

پھر آزادی کا دن بخشا خدا نے — دلوں میں ہے خوشی، لب پہ ترانے
مسّرت خیز ہیں بچوں کے گانے — سرور و کیف برسائے فضا نے
جدھر دیکھو اُدھر پرچم ہی پرچم
نظر ڈالو جہاں خوشیاں ہیں پیہم

سہانی رُت ہے، موسم ہے سہانا — گھٹا تانے ہوئے ہے شامیانا
سروں پر ابرِ باراں کا یہ چھانا — لٹاتا ہے فلک اپنا خزانا
خوشی کے روپ فطرت بھر رہی ہے
گہر ہم پر نچھاور کر رہی ہے

بظاہر یومِ آزادی ہے تاباں — حقیقت میں یہ ہے جشنِ بہاراں
دھنک سے ہے فلک رنگین داماں — زمیں پھولوں کی کثرت سے فروزاں
زمین و آسماں، رنگیں نظارے
شریکِ جشنِ آزادی ہیں سارے

ہمیں ہے انسیت امن و اماں سے — مگر غافل نہیں تیغ و سناں سے
جو آزادی ملی عزمِ جواں سے — ہمیں محبوب تر ہے جسم و جاں سے
سبق دیتی ہے سہ رنگی پرچم
جدا ہوتے ہوئے بھی ایک ہیں ہم

ہمیں سب کو یہ تابانی مبارک — طربناکی، درخشانی مبارک
محبت کی فراوانی مبارک — خدا کی شانِ رحمانی مبارک
حسیں تر اور گلزار یہ وطن ہو
بہار افروز اور اپنا چمن ہو

آر۔ ایم ۔ بیلن ٹائن

تلخیص و ترجمہ :۔ خلیق انجم اشرفی

جزیرہ

(چوتھی قسط)

شفاف اور چمکیلی صبح کو سورج نکل رہا ہو اور اس کی کرنیں آپ کے چہرے کو چوم رہی ہوں تو کیا خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ میری آنکھ کھلی تو صبح کی خوشگوار ہوا نے میری رگ رگ میں تازگی کی لہر دوڑا دی ۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا اور اچانک نظر ایک توتے پر پڑی۔ یہ ننھا سا توتا پیٹرکن کے سر پر ایک جھولتی ہوئی شاخ پر بیٹھا تھا۔ اس کی خوبصورتی نے جیسے مجھ پر جادو کر دیا ۔ ننھے پرندے اپنا سر ادھر ادھر گھمایا اور پھر جھک کر نیچے کی طرف بڑے غور سے کچھ دیکھنے لگا ۔ میں نے نظریں نیچے کیں تو پیٹرکن کا کھاڑ جیسا منہ کھلا ہوا تھا۔ یہ عجیب پرندہ اس کے منہ میں جھانک رہا تھا ۔(اور شاید حیران ہو رہا تھا)

پیٹرکن اکثر میرے بارے میں کہتا تھا کہ خدا نے میرے خمیر میں مزاج کا جزشامل کیا ہی نہیں کیا اور اسی لئے میں لطیفے اور مزاحیہ جملے سمجھ ہی نہیں پاتا ۔ جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے وہ بڑی حد تک ٹھیک ہے ہاں اگر کوئی سمجھائے تو میں بھی لطیفوں کو دوسروں کی طرح بخوبی سمجھ لیتا ہوں ۔ اور اس کا لطف بھی لیتا ہوں ۔ لیکن اس کا پہلا اندازہ بالکل غلط ہے ۔ اب یہی دیکھئے کہ مجھے اس پرندے کی یہ حرکت بڑی مضحکہ خیز لگی ۔ اور میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر کسی طرح یہ ننھا منا پرندہ بے ہوش ہو کر یا پھسل کر پیٹرکن کے منہ میں جا پڑے تو کیا مزہ آئے ۔! انہی اوٹ پٹانگ خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک توتے نے سر جھکا کر ایک زور کی چیخ ماری پیٹرکن کی آنکھ کھل گئی ۔ اور وہ حیرت بھری ایک چیخ مارتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا ۔ اور اسی درمیان میں وہ بے وقوف پرندہ اڑ گیا۔

"کم بخت کہیں کا ۔" پیٹرکن نے منہ بنا کر اڑتے ہوئے پرندے کو گھونسہ دکھایا۔ آنکھیں ملیں اور پھر مجھ سے وقت پوچھا ۔ میں اس کے سوال پر مسکرا دیا ۔

ہماری گھڑیاں تو سمندر کی تہہ میں ہیں ۔ اس لئے اس سوال کا جواب دینا تو ممکن نہیں ہے ۔ ہاں اتنا بتایا جا سکتا ہے کہ سورج نکلے تھوڑی ہی دیر ہوئی ہے ۔

پیٹرکن کو جیسے ایک دم سب کچھ یاد آ گیا۔ اس نے شفاف اور چمکدار آسمان کی طرف دیکھا ۔ ایک لمبی

سانس لے کر تازہ ہوا پھیپھڑوں میں بھری۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ "ہرّا" کہہ کر اس نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں ملیں۔ آہستہ آہستہ ادھر اُدھر نظر دوڑائی جھاڑیوں کے ایک سوراخ سے اس کی نظر پرسکون اور ساکت سمندر پر پڑی اور جیسے چونک پڑا۔ ایک زور کی قلقاری ماری۔ اپنے کپڑے اتار کر تیزی سے ساحل کی ریت پر بھاگتا سمندر میں کود پڑا۔ اس کی قلقاری نے جیک کو چونکا دیا وہ کہنی کے بل تھوڑا سا اٹھا اور حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پیٹر کن کو سمندر میں دیکھ کر ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیک تیزی سے کوئی کام تبھی کرتا جب کوئی اسے اکسا دیتا۔ اب اس موقع پر بھی پیٹر کن کی حرکت نے اسے اکسا دیا۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ کپڑے اتار کر ایک طرف پھینکے۔ منہ پر آئے بالوں کو پیچھے جھٹکا اور شیر کی طرح ریت کو پھلانگتا سمندر میں اس زور سے کودا کہ پانی کی پھواروں نے پیٹر کن کو ڈھک لیا۔ جیک بہت ہی عمدہ تیراک اور غوطہ خور تھا۔ پانی میں کودا تو ڈالو وا کوئی ایک منٹ تک اس کا پتہ ہی نہ چلا اور پھر ظاہر ہوا تو ساحل سے خاصی دور یہ منظر دیکھ کر مجھے بھی جوش آگیا۔ میں نے بھی جلدی سے کپڑے اتار کر ایک طرف پھینکے اور جیک ہی کی طرح چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔ لیکن میرا پیر ایک شاخ سے الجھا اور دھڑام سے ریت پر گرا۔ اٹھ کر پھر دوڑا اب کے ساحل پر پڑے ہوئے ایک پتھر سے ٹھوکر کھائی اور گرتے گرتے بچا۔ شاید پیٹر کن کو یہ منظر بڑا دلچسپ لگا۔ اس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور مجھے "سست کچھوا" کہہ کر پکارنے لگا۔ البتہ جیک نے چلا کر کہا۔ "آؤ والف میں تمہاری مدد کروں گا۔" لیکن جب پانی میں کودا تو خود ہی پانی میں مزے سے تیرنے لگا۔ میں خاصا اچھا تیراک اور غوطہ خور تھا۔ جیک جتنا اچھا تو نہیں اس سے بہتر تیراک تو میں نے اپنی زندگی میں دیکھا ہی نہ تھا۔ ہاں پیٹر کن گنا بہتر تھا۔ جو تھوڑا بہت تیرنا جانتا تھا مگر غوطہ تو اسے آتا ہی نہ تھا۔

پیٹر کن ساحل کے قریب ہی تیرتا اور چکر لگاتا رہا میں اور جیک گہرے پانی میں چلے گئے۔ بیچ بیچ میں پتھروں کی تلاش میں تہہ میں غوطہ بھی مارتے وہ حیرت اور خوشی شاید زندگی بھر فراموش نہ کر سکوں۔ جو مجھے پہلی بار سمندر کی تہہ دیکھ کر ہوئی۔ جیسا کہ میں پہلے کہیں بتا چکا ہوں چٹانوں کے درمیان پانی کسی تالاب کی طرح ساکت تھا اور اس وقت تو ہوا بھی نہ چل رہی تھی۔ اس لئے سطح سے تہہ تک پانی بالکل شفاف تھا۔ اس جگہ اس کی گہرائی بیس سے تیس گز ہوگی۔ پھر بھی ہم تہہ آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔

میں نے اور جیک نے کم گہرے پانیوں میں اس امید کے ساتھ غوطے لگائے کہ شاید وہاں رنگ برنگے پتھر مل جائیں پتھر تو نہ ملے لیکن اس کوشش میں ہم ایسی جگہ پہنچ گئے جسے صحیح معنوں میں ایک حیرت انگیز باغ کہا جا سکتا ہے اس لیگون (چٹانوں کے درمیان کے ساکت پانی کا نام ہم نے یہی رکھا تھا) کی پوری تہہ ہر رنگ۔ ہر شکل اور ہر جسامت (سائز) کے مونگوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ان میں سب سے عام قسم لمبی شاخوں والا مونگا تھا اس کے جسم کا کچھ حصہ زردی مائل گلابی رنگ کا اور باقی بے داغ سفید رنگ کا تھا۔ ان مونگوں کے درمیان طرح طرح کی سمندری گھاس اگی ہوئی تھی۔ ان کے رنگ بس کچھ نہ پوچھئے۔ جتنے خوبصورت رنگ آپ کے ذہن میں آئیں وہ ان سے بھی زیادہ خوبصورت رنگوں کی تھیں اور

ایسی ہی پیاری پیاری ان کی شکلیں تھیں اور پھر پھولوں کے تختے ۔ ان کے درمیان لال، ہری ۔ نیلی، پیلی مچھلیاں کھیل رہی تھیں ۔ ہمارے وہاں پہنچنے پر بھی وہ اسی طرح کھیلتی رہیں ۔ ہماری کوئی پرواہ نہ کی۔

پہلے غوطے کے بعد سطح پر سانس لینے کے لئے ابھرے ۔ تو جیک نے بالوں سے پانی جھٹکتے ہوئے کہا "رالف ۔ زندگی میں ایسی حسین چیز کبھی دیکھی ہے؟"

"کبھی نہیں ۔" میں نے سر ہلا کر کہا ۔ ایسا لگتا ہے کہ گویا ہم پریوں کے دیس میں پہنچ گئے ہوں ۔ مجھے تو خود کو یقین دلانا مشکل ہو گیا ہے کہ یہ سب حقیقت تھی کوئی دلکش سہانا خواب تو نہیں ۔

"خواب ۔" جیک نے ڈوبے ڈوبے لہجے میں کہا "سچ پوچھو رالف تو مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ یہ سب ایک پیارا خواب ہے ۔ لیکن اگر یہ خواب ہے تو ہمیں اس خواب کی دلکشی جی بھر کے دیکھنی ہے ۔ یہ لو ۔ میں تو چلا نیچے ۔ میرے دوست ۔"

ہم نے دوسرا غوطہ لگایا اور پانی کے نیچے بھی ساتھ ساتھ رہے ۔ یہ دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ یہاں ہم اپنے وطن کے سمندر کی بہ نسبت زیادہ دیر تک پانی کے اندر رہ سکتے تھے ۔ میرا خیال تھا کہ یہ پانی کی گرمی کے سبب تھا ۔ پانی اتنا گرم تھا کہ بغیر کسی گھٹن کے وہاں دو تین گھنٹے گزار سکتے تھے ۔

جیک تہہ میں پہنچا تو اس نے مونگے کی شاخیں پکڑ لیں اور جھک جھک کر سمندری گھاس کے نیچے اور چٹانوں کے درمیان کچھ دیکھتا، ہاتھوں اور کہنیوں کے بل آگے بڑھنے لگا ۔ میں نے غور سے دیکھا تو اس نے نے ایک یا دو گھونگھا مچھلیاں (شل فش) اٹھا کر ہاتھوں میں دبالی ہیں ۔ اس کی دیکھا دیکھی میں نے بھی چند مچھلیاں اکٹھا کر لیں ۔ اچانک جیک نے ایک نیلی پیلی مچھلی پکڑنے کے لئے اس نے ہاتھ مارا ۔ لیکن وہ بس اس کی دم چھو سکا اور وہ صاف نکل گئی ۔ کھسیا کر وہ میری طرف پلٹا اور مسکرانے کی کوشش کی لیکن فوراً ہی اچھلا اور کسی تیر کی طرح سطح کی طرف بڑھا پیچھے پیچھے میں بھی تھا ۔ پتہ چلا کہ مسکرانے کی کوشش میں اس نے بہت سا نمکین پانی نگل لیا تھا ۔ چند منٹوں میں اس کی طبیعت بحال ہوئی ۔ اور ہم دونوں تیرتے ہوئے ساحل کی طرف بڑھے ۔

"میں کہتا ہوں رالف" وہ بولا ۔ میں نے واقعی سمندر میں ہنسنے کی کوشش کی تھی ۔"

"وہ تو میں نے دیکھا تھا ۔" میں نے جواب دیا ۔ اور میں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ تم نے اس مچھلی کو دم سے پکڑ بھی لیا تھا ۔ کیسا عمدہ ناشتہ ہوتا اگر وہ ہاتھ آجاتی ۔"

"ناشتہ ۔ یہ رہا بہت سارا ۔" اس نے ساحل پر دوڑتے ہوئے ہاتھ میں دبی ہوئی گھونگھا مچھلیاں دکھلاتے ہوئے کہا ۔ اور پھر زور سے بولا ۔" پیٹرکن ۔۔ ننھے بچے ۔ شاباش ۔ ذرا ان کو بنا تو ڈالو ۔ میں اور رالف جب تک کپڑے بدلتے ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ ان ناریلوں کے ساتھ یہ بڑا مزہ دیں گی ۔"

پیٹرکن نے جو کپڑے پہن چکا تھا جیک کے ہاتھ سے مچھلیاں لے لیں ۔ اور کلہاڑی کی نوک سے انہیں صاف کرنے لگا ۔ "خوب ۔ یہ ہے زوردار چیز" وہ بولا ۔" میری پسندیدہ غذا ۔"

"آہا تب تو بڑا اچھا ہے ۔" جیک بولا "اگر

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

جناب محمد امین ایم۔ اے

انڈولا (زیمبا) سے نئی دہلی

(تیسری قسط)

نیروبی سے جہاز ٹھیک وقت پر اڑا۔ اب ہم یسٹ افریقن ایرویز کے جہاز پر سفر کر رہے تھے۔ ہم دس بجے کے قریب خطِ استوا کو پار کیا اور ایرہوسٹس اعلان کیا کہ ہم جنوبی نصف کرے سے نکل کر شمالی نصف کرے میں داخل ہو رہے ہیں۔ خطِ استوا پر پہنچنے ے پہلے سارے مسافروں کو ایک ایک چھپا ہوا کارڈ خانے سمیت دے دیا گیا تھا۔ ہم نے اس پر خطِ استوار رکرنے کا صحیح صحیح وقت نوٹ کیا۔ اور پتہ لکھ کر واپس دیا۔ ہر مسافر کو یہ حق تھا کہ وہ اپنے جس دوست یا عزیز پتہ لکھ کر دے ایرلائن والے اسی پتہ پر آپ کا لفافہ بھیج دیں گے اس رح جب وہ کارڈ آپ کے دوست کو ملے گا۔ تو وہ اس ے لئے نایاب سا تحفہ ہوگا۔ اور وہ اس کی بڑی قدر کرے ۔

ہم ۱۱ رمئی ۱۹۷۲ء کو ۱۱ بجے تک عدیس ابابا نچ گئے۔ عدیس ابابا ایتھوپیا کا دارالسلطنت ہے یتھوپین پلیٹو پر واقع ہے۔ اس کی اونچائی سطح سمندر ۲۶۰۰ میٹر ہے۔ اس لئے اس کی آب وہوا خوش گوار بلکہ اچھی خاصی ٹھنڈی ہے۔

نیروبی کی طرح عدیس ابابا میں بھی ہمارا قیام طے تھا۔ اور ہر چیز کا انتظام ایرلائن کی طرف سے مقرر تھا۔ چنانچہ ۱۱ بجے کے قریب جب ہمارا جہاز بولے کے ہوائی اڈے پر پہنچا اور ہم ہوائی اڈے کی ساری ضروری کارروائی سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو ہوٹل لے جانے کے لئے ایرلائن کی بس تیار کھڑی تھی۔

بس میں بیٹھنے سے پہلے ہم نے سوچا کہ شہر جانے سے پہلے احتیاطاً ہوائی اڈے کے بنیک سے ایتھوپیا کی کچھ کرنسی لے لیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ جس ملک میں آپ جاتے ہیں۔ اور وہاں قیام کرتے ہیں۔ تو خرید و فروخت کے لئے آپ کے پاس اس ملک کی کرنسی ہونی ضروری ہے۔ وہاں کے لوگ غیر ملکی کرنسی یا پونڈ یا ٹریولرس چیک وغیرہ لینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ویسے تو ہمارے ٹھیرنے اور کھانے پینے کا انتظام ائرلائن کی طرف سے طے تھا۔ اور کسی خاص خرچ کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن احتیاطاً ہم نے دس ایتھوپین ڈالر (ایک

ڈالر میں روپے کے برابر ہوتا ہے) کے قریب
تاکہ ضرورت کے وقت کام آئے۔

$11\frac{1}{2}$ بجے کے قریب بس روانہ ہوئی اور ہم پونے
۵ بجے ہوٹل پہنچ گئے۔

وہاں ہمارے لئے کمرہ پہلے سے بُک تھا۔ ہم
اپنا سامان سنبھالا اور لفٹ سے تیسری منزل پر
گئے۔ موسم کافی ٹھنڈا تھا۔ کمرے کے دو حصے
سونے کا کمرہ الگ تھا اور نشست کا الگ۔
با کے ہوٹل کی طرح یہ ہوٹل بھی صاف ستھرا اور
سجایا تھا۔ اس کا نام اتھوپیا ہوٹل تھا۔ ہم نے
کیا۔ کپڑے بدلے اور لنچ کے لئے ڈرائنگ روم
گئے۔

ایتھوپیا سے ہم کو سعودی عرب جانا تھا
ب ہماری فلائٹ پرواز یا اڑان عدیس ابابا
راہ راست جدہ تھی۔ لیکن ہمارے پاس سعودی
کا ویزا (سعودی عرب میں داخل ہونے کا
ت نامہ قاعدہ یہ ہے کہ اپنے سفر کے دوران
پ کسی ملک میں ٹھہرنا چاہیں یا اس کی سیر کرنا
بانو پہلے سے اس کا اجازت نامہ لینا پڑتا ہے
یہ اجازت نامہ اس ملک کا سفارت خانہ جاری
ہے۔ اسی کو ویزا کہتے ہیں۔ اور اس کے بغیر آپ
گھنٹے سے زیادہ آپ کسی ملک میں قیام نہیں کر سکتے)
تھا۔

ہم نے کوشش کی تھی کہ ہم کو لوساکا سے یہ
مل جائے۔ لیکن زیمبیا میں عرب کا سفارت
نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں کامیابی نہیں ہوئی۔
تحقیق کے بعد یہ معلوم ہو گیا تھا کہ عدیس ابابا میں

عرب کا سفارت خانہ ہے۔ وہاں سے بآسانی ویزا مل
جائے گا۔

غرض کہ ہوائی اڈے پر اترتے ہی ہمیں سعودی عرب
کے ویزا کی فکر تھی۔ ہوٹل ایتھوپیا میں لنچ کے لئے جب ہم
نیچے گئے تو احتیاطاً معلومات کے دفتر سے ہم نے یہ معلوم
کرنے کی کوشش کی کہ کیا دوپہر سے پہلے پہلے ہمیں سعودی
عرب کے سفارت خانہ سے داخلے کا ویزا مل جائے گا۔
ریسپشن (Receptionist) والوں نے
ہمیں بتایا کہ لنچ کے لئے سفارت خانہ بند رہتا ہے
پھر ڈھائی تین بجے تک کھلتا ہے اور چھ بجے تک کھلا
رہتا ہے۔ احتیاطاً میں نے فون کر کے کام کے اوقات
معلوم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جواب ندارد۔ اس سے
میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ لنچ کے لئے سفارت خانہ بند ہو چکا
ہے اور ہم دو بجے وہاں جائیں گے۔ جلدی جلدی ہم نے
کھانا کھایا اور کھانے کے دوران اس ادھیڑ بن میں رہے کہ
ویزا آج بھی جائے گا یا نہیں۔ دو بجے ہم نے ٹیکسی کی اور سیدھے
عرب کے سفارت خانہ پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ سفارتخانہ
بند پڑا ہے اور چوکیدار گیٹ پر پہرہ دے رہا ہے۔ دریافت
کرنے پر معلوم ہوا کہ ویزا بننے کا آج کوئی سوال ہی نہیں ہے
اس کے لئے کل آنا پڑے گا۔ اور کام کے اوقات صبح ۹ بجے
سے دوپہر کے دو بجے تک ہیں۔ اب سوا دو بج چکے ہیں۔ اس
لئے سفارت خانہ بند ہو چکا ہے۔

یہ معلوم کر کے میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ دوسرے
دن یعنی ۱۲ مئی کو تو صبح ۹ بجے ال اٹالیا سے ہماری فلائٹ
بک تھی۔ اگر ۱۱ مئی کو ہمارا ویزا نہ بن پائے گا تو صبح کو بھلا
کیسے جا پائیں گے۔ اپنی پریشانی دور کرنے اور مشکل آسان
کرنے کے لئے میں بھاگ کر ال اٹالیا کے دفتر گیا۔ ان سے

سارا حال کہہ سنایا۔

ریسیپشنسٹ (Receptionist) نے بتایا کہ اگر آج آپ کا ویزا نہیں بن پائے گا تو آپ کو کل کی فلائٹ کینسل کرنی پڑے گی۔ میں نے ان سے کہا کہ ہم اپنی بکنگ کسی قیمت پر کینسل کرانا نہیں چاہتے۔ اور کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ عدیس ابابا کے بجائے ہم جدہ پہنچ کر وہاں سے ویزا بنوالیں۔

لڑکی نے بتایا "یہ ناممکن ہے۔ اول تو یہ کہ جدہ میں ویزا بنتا نہیں پھر یہ کہ عرب لوگ بہت (Rude) رُوڈ یا روکھے ہوتے ہیں۔ اور اگر آپ یہاں سے بغیر ویزا لئے چلے جائیں گے تو وہ جدہ سے آپ کو واپس کر دیں گے۔ آپ کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہیں کریں گے۔

الغرض یہ کہ ہمارا ویزا نہیں بن سکا۔ میں نے بہت بھاگ دوڑ کی۔ سفارت خانہ کے افسران کے گھروں پر گیا۔ اپنی مشکلیں بتائیں۔ اور اگر ہم عدیس ابابا میں ۲۴ گھنٹے سے زیادہ ٹھہر گئے تو کیا کیا نئے مسائل پیدا ہوں گے۔ ان کا ذکر کیا۔ سارے نشیب و فراز سمجھائے۔ لیکن سفارت خانہ والوں نے ہماری کوئی بات نہیں سنی۔ یوں سمجھو کہ وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اور مرغے کی ایک ٹانگ پر اڑے رہے۔ اب بات میری سمجھ میں آئی کہ وہ ایتھوپین لڑکی عربوں کو رُوڈ کیوں کہتی ہے۔ —

بادلِ نخواستہ، مایوس ہو کر میں اپنے ہوٹل واپس آگیا۔ اپنی بیگم سے سارا حال کہہ سنایا اور ویزا نہ بننے کی وجہ سے جتنے مسائل پیدا ہوں گے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے کمر بستہ ہونے کو کہا۔

اتفاق کی بات، ہائلے سلاسی یونیورسٹی کے سامنے سے جب میں گزر رہا تھا کہ اچانک میرا ایک پرانا ایتھوپین شاگرد مل گیا۔ اس نے مجھ کو دیکھا اور دیکھتے ہی پہچان گیا۔ بھاگ کر میرے قریب آیا۔ اور بڑی گرمجوشی سے ملا۔ میں نے مختصراً ویزا کا حال بتایا۔ پھر آمدم برسرِ مطلب یعنی اس سے اپنی مشکلات کا ذکر کیا۔

اس لڑکے کا نام ادھانا بیلے تھا۔ وہ ہر طرح ہماری مدد کرنے کو تیار۔ مشکل میں اگر کوئی کسی کی مدد کرے تو صحیح معنی میں وہی اس کا سچا دوست ہوتا ہے۔

ادھانا بیلے میرا پرانا شاگرد تھا (میں ایتھوپیا میں ۲۳ نومبر ۱۹۶۶ء سے ۳۰ اپریل ۱۹۶۹ء تک تھا) اسی دوران ادھانا بیلے کا پری بن سیبو (Comprehen) سیکنڈری اسکول میں میرا شاگرد رہ چکا تھا۔ یہ بے چارہ لاوارث اور یتیم تھا۔ محنت مشقت سے کچھ پیسے کماتا تھا اور اپنا سارا خرچ نکالتا تھا۔ یعنی وہ خود ساختہ انسان (Self made man) تھا۔ پڑھنے میں وہ بلا کا ذہین تھا اور ہر مضمون میں ممتاز پوزیشن لاتا تھا۔

اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے بعد ۱۹۶۷ء سے وہ یونیورسٹی میں داخل ہو گیا تھا۔ عدیس میں بھی کام کر کے خود اپنا اور اپنی تعلیم کا سارا خرچ نکالتا تھا۔ لیکن جس طرح یہ ہمارے ساتھ پیش آیا۔ اور ہماری مدد کرنے پر کمر بستہ ہوا۔ واقعی اس وقت وہ ہمارے لئے ایک فرشتے سے کم نہیں تھا۔ اس موقع پر مجھے جامعہ کالج کے پرانے دوست سنہا صاحب بہت یاد آئے۔ جب کبھی ہم سفر پر جاتے اور واپس کرنے کے بعد سنہا صاحب بے ساختہ پوچھتے کہ "کیا کوئی فرشتہ

۱۹۵۶ء میں پہلی بار جب انھوں نے مجھ سے یہ سوال پوچھا تھا۔ تو میں کچھ گھبرا سا گیا تھا۔ اور سوچنے لگا تھا کہ فرشتہ ملنا کیا معنی رکھتا ہے۔ لیکن پھر فوراً ہی یہ بات واضح ہوگئی کہ فرشتہ ملنے کا کیا مطلب ہے۔ عدیس ابابا میں ہمیں ادھانا ہیلے کے روپ میں سچ مچ ایک فرشتہ صفت انسان ملا جس نے ہماری اس طرح مدد کی کہ کیا کوئی اپنا سچا دوست یا قریبی رشتہ دار اپنے خاص وطن میں کام آئے گا۔

عدیس ابابا میں ہمیں چار دن ٹھہرنا پڑا۔ اس دوران سب سے تلخ تجربہ ویزا بنوانے کا تھا۔ کئی بار کی دوڑ دھوپ اور ادھانا ہیلے کے مقامی زبان امہرک بولنے کی وجہ سے کام تو بن گیا لیکن تجربہ یہ ہوا کہ آپ کو جس دوسرے ملک میں جانا ہو۔ روانگی سے پہلے جس ملک سے آپ روانہ ہو رہے ہیں وہیں سے ویزا بنوا لیجئے۔ یہ نہیں کہ راستے میں ٹھہر کر ویزا بنوائیں گے۔ اس سے بہت زحمت ہوتی ہے۔ اور آپ کو مقامی کرنسی، امیگریشن ڈیپارٹمنٹ (Immigratio Department) کو اطلاع کرنے، اپنا ٹکٹ بدلوانے۔ ٹکٹ کینسل ہونے کی وجہ سے فلائٹ کی نئی بکنگ کرانے اور اس کے لئے مقامی کرنسی میں ادائیگی کرنے کی وجہ سے زبردست پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

غرض عدیس ابابا سے ہمیں ۲۴ مئی ۱۹۸۰ء کو دوسری فلائٹ ملی۔ اس سے اڑ کر ہم اسمارا پہنچے۔ اسمارا ایتھوپیا کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے۔ اور اریٹریا کے صوبہ کا دارالسلطنت ہے۔ یہ سطح سمندر سے ۲،۰۰۰ میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ اس کی آبادی ۲ ½ لاکھ ہے۔ یہ بڑا ہی خوبصورت شہر ہے۔ بلکہ آپ یہ سمجھئے کہ یہ ایک اٹالین شہر ہے۔ یہاں ہمارے کئی ایک پرانے دوست تھے۔ یہاں ۶ گھنٹے ٹھہرنا تھا۔ اس لئے ہم لوگوں نے ٹیکسی کی اور اپنے دوستوں سے بغیر اطلاع کئے ملنے کے لئے نکل پڑے۔ اپنے ایک اٹالین دوست سے ملے۔ جن کے یہاں ایک بار ہم اتفاقیہ ٹھہر چکے تھے۔ اور وہ اور ان سینورا (اٹالین زبان میں سینورا بیگم کو کہتے ہیں) نے مہمان نوازی کا ایسا ثبوت دیا تھا۔ جو ہمیں آج تک یاد ہے (کبھی آئندہ اپنے تاثرات پیامیوں کے سامنے پیش کروں گا۔ اسے پڑھ کر تم اندازہ لگا نا کہ دنیا میں کیسے کیسے بے نظیر انسان رہتے ہیں۔ اور پڑوسی کا حق کتنے بہترین طریقہ سے سنبھالتے ہیں) مسز آگس ٹش انگریزی بہت اچھی بولتی تھیں۔ اس لئے بلا تکلف ہم ان سے باتیں کرتے رہے۔ اپنے دو تین عرب دوستوں سے بھی ملے۔ جو تین سال کے بعد یکایک مجھے دیکھ کر حیران ہوئے۔ ۴ بجے تک ہم ہوائی اڈے واپس آگئے۔ اور ۵ بجے کی اڑان کے لئے انتظار کرتے رہے۔

(باقی آئندہ)

اِدھر دیکھیے

آپ "کا کہانی نمبر" نومبر میں شائع ہو رہا ہے اچھی اچھی پیاری پیاری کہانیوں کا شاندار مجموعہ ہوگا۔

یاد رکھیے، یہ نمبر آپ حاصل نہ کر سکے تو ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔

کہانی نمبر کی قیمت ۴/۱ ہوگی، سالانہ خریدار بننے والوں سے یہ قیمت الگ سے نہ لی جائے گی۔

(منیجر)

جاوید احمد خاں

وطن کا ترانہ

ہمارا وطن ہے ہمارا چمن
ہمارا چمن کتنا پیارا چمن
اسی سے زمانے میں پھولیں پھلیں
بنے زندگی میں سہارا چمن
دل و جان سے اس پہ قربان ہوں
اگر ہم کو کر دے اشارا چمن
ہمیں اس چمن سے محبت رہے
رہے اپنی آنکھوں کا تارا چمن
ہمارے چمن میں ہیں رنگینیاں
ہمارے خدا نے سنوارا چمن
ہمارے چمن سے نکلتا ہے نور
کہ گویا ہے روشن ستارا چمن
سبھی رنگتوں میں سنور کر ہمیں
دکھاتا ہے رنگیں نظارا چمن
مٹا کر دلوں سے کدورت کا میل
بہاتا ہے الفت کی دھارا چمن
خدا سے ہے جاوید کی یہ دعا
کہ قائم رہے یہ ہمارا چمن

اولمپک کھیلوں کی کہانی

جناب افضل امام، کلکتہ

ورزشی اور تفریحی کھیلوں کا مقابلہ اب سے بہت دنوں پہلے بھی ہوتا تھا۔ اب سے ہزاروں برس پہلے کہتے ہیں لگ بھگ پانچ ہزار برس پہلے (تین ہزار قبل مسیح) میسوپوٹامیا (موجودہ عراق) میں اسی طرح مقابلے ہوتے تھے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلے ورزشی کھیلوں کے مقابلوں کا باقاعدہ اہتمام یونان نے کیا۔ مشہور ہے کہ یونان کے ایک سور ماہر کلیس اور اس ملک کے بادشاہ میں ٹھن گئی۔ ہرکلیس جیت گیا۔ اس نے بادشاہ کو قتل کر دیا اور اس کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس فتح کی خوشی میں اس نے ورزشی کھیلوں کے مقابلوں کا یا اولمپک کھیلوں کا اہتمام کیا۔ یہ ۱۲۵۳ قبل مسیح کی بات ہے یعنی اب سے ۳۲۲۵ برس پہلے کی۔

لیکن جس اولمپک کھیل کا باقاعدہ ریکارڈ ہے وہ ۷۷۶ قبل مسیح یونان کے ایک مقام اولمپیا میں ہوا بعد میں اسی جگہ کی مناسبت سے ان ورزشی اور تفریحی کھیلوں کے مقابلوں کا نام بھی اولمپک مقابلے رکھ دیا گیا۔ بعد میں یہ اولمپک مقابلے ہر چار سال بعد ہونے لگے۔

شروع شروع میں ان مقابلوں میں خالی گھوڑ دوڑ ہوا کرتی تھی۔ اور بعد میں کئی طرح کی پیدل دوڑوں، برچھا پھینکنے، ڈسکس پھینکنے، کشتی، اونچی کود (ہائی جمپ) لمبی کود (لانگ جمپ) کے مقابلے بھی شامل کر لئے گئے۔ اور مجلی سلوم ہے جیتنے والوں کو انعام کیا ملتا تھا، ؟ زیتون کے پیڑ کی ایک شاخ۔!
ان کھیلوں میں عورتیں شریک نہ کی جاتی تھیں۔

انھیں مقابلے دیکھنے کی بھی اجازت نہ تھی اور قانون کی خلاف ورزی پر موت کی سزا دی جاتی تھی۔

پھر یونان پر روم والوں یا رومیوں کا قبضہ ہو گیا۔ انھیں کھیلوں سے دلچسپی نہ تھی۔ ان کے ایک بادشاہ نے ۳۹۴ء میں یہ سلسلہ بالکل بند کر دیا۔

اولمپک کھیلوں کا یہ سلسلہ جس میں ملک ملک کے کھلاڑی حصہ لیتے تھے۔ ۱۸۹۶ء پھر سے شروع ہوا۔ ایک فرانسیسی بیرن پیرے دی "کوبرتن" یوں کہیے کہ اس سلسلے کے بانی ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ مختلف ملکوں کے کھلاڑی کھیلوں کے اس دوستانہ مقابلے میں شریک ہوں گے تو انھیں ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملے گا۔

ان اولمپک کھیلوں کا پہلا مقابلہ ۱۸۹۶ء میں اینتھنز میں ہوا اور اسی وقت سے یہ مقابلے دوسرے ملکوں کے بڑے بڑے شہروں میں چار چار سال کے بعد ہوتے رہے۔ چند شہروں کے نام یہاں دیے جاتے ہیں۔:- (پیرس ۱۹۰۰ء) لندن (۱۹۰۴) ۱۹۱۲ اور ۱۹۱۶ء کے مقابلے پہلی بڑی لڑائی کی وجہ سے نہ ہو سکے۔ پھر اینٹ ورپ (بلجیم ۱۹۲۰) دوبارہ فرانس ۱۹۲۴ء) اسٹرڈم نیدرلینڈ ۱۹۲۸ء) میں، لاس انجیلز (امریکہ ۱۹۳۲) برلن (۱۹۳۶ء) ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۴ء کے مقابلے دوسری بڑی لڑائی کی وجہ سے نہ ہو سکے۔ لندن میں (۱۹۴۸ء) ہلسنکی میں (۱۹۵۲) ملبورن (آسٹریلیا ۱۹۵۶ء) میں روم (اٹلی ۱۹۶۰) میں ٹوکیو (جاپان ۱۹۶۴ء) میں میکسیکو ۱۹۶۸ء) میں منعقد ہوئے۔

اولمپک کھیلوں کے یہ عالمی مقابلے دن پر دن مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔ ان مقابلوں میں شریک ہونے والوں کی اور تماشائیوں کی تعداد بھی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ میکسیکو میں ۱۹ کھیلوں کا مقابلہ تھا۔ اور ۱۲۴ ملکوں کے کھلاڑیوں نے ان میں حصہ لیا تھا۔ ۱۸۹۶ء میں ایتھنز (یونان) میں اولمپک کھیلوں کا جو عالمی مقابلہ ہوا تھا اس میں کُل بارہ ملک شریک ہوئے تھے۔ اور لگ بھگ ۳۵۵ کھلاڑیوں نے حصہ لیا تھا۔

اب سے چالیس سال پہلے اس بات کو کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ۱۰۰ میٹر کے فاصلے کو، دس سیکنڈ میں بھی کوئی طے کر سکتا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جب برلن میں مشہور کھلاڑی جے۔ سی اوونیس نے ۱۰۰ میٹر کی دوڑ ۱۰٫۳ سیکنڈ میں پوری کی تو لوگوں نے دانتوں تلے انگلی دبالی۔ لیکن ان مقابلوں کی بدولت کھلاڑیوں کی امنگیں، حوصلے بڑھتے رہے۔ فاصلے کم ہوتے گئے۔ اونچائیاں اچھلتی گئیں لمبائیاں گھٹتی گئیں

پھر بھی سو میٹر کی دوڑ کو ۱۰٫۳ سیکنڈ سے ۹٫۹ سیکنڈ میں طے کرنے میں ۳۲ سال لگ گئے امریکہ کے نیگرو دوڑاک ہنس نے میکسیکو میں یہ کارنامہ انجام دیا۔

۱۵ برس پہلے تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ ایک میل کی دوڑ کو ۴ منٹ سے کم وقت میں طے کرنا۔ اور سات فٹ سے اونچا کودنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ لیکن ۱۹۵۶ء میں چارلی دومس (امریکہ) نے فٹ ۱/ ۱۵ انچ اونچا کود کر ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ یہ بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ ۱۹۶۴ء میں روس کے ویلیری برومل نے

ساست میٹ پورے چھ انچ اونچا لود کر، امریکہ کا ۵۲ سال کا ریکارڈ توڑ دیا۔

اور یہی حال لمبی کود کا ہے۔ کچھ کھلاڑی تو پرانے ریکارڈ میں انچوں کے حساب سے اضافہ کرتے ہیں کچھ ایسے بھی ہیں جو انچوں نہیں فٹوں کے حساب سے آگے بڑھتے ہیں پچھلے اولمپک مقابلوں میں امریکہ کے نیگرو کھلاڑی باب بیمن نے ۲۹ فٹ ڈھائی انچ لمبی چھلانگ لگا کر سنسنی پیدا کر دی انھوں نے پچھلے ریکارڈ میں دو فٹ (انچ نہیں) کا اضافہ کیا۔

اولمپک کھیلوں میں سونے کا تمغہ حاصل کرنا اپنی جگہ خود بہت غیر معمولی بات ہے۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو ایک ساتھ کئی کئی تمغے حاصل کرتے ہیں۔ امریکہ کے نیگرو کھلاڑی مسٹر اووینس نے ۱۹۳۶ء میں ایک نہ دو اکٹھے چار تمغے حاصل کئے۔ سب کے سب سونے کے تمغے۔ روم کے اولمپک کھیلوں میں امریکہ کی نیگرو لڑکی ولی گوڈبن نے سونے کے پانچ تمغے حاصل کئے تھے۔

فن لینڈ کے پاوونیری، چیکوسلواکیہ کے جاتوپیک روس کے بلاڈمیر کوٹس اور والیری برومیل اولمپک کے عظیم کھلاڑی مانے جاتے ہیں۔ اولمپک کی انٹرنیشنل کمیٹی جس ملک کو اولمپک مقابلوں کے لئے چن لیتی ہے۔ وہ سالوں سال پہلے تیاریاں شروع کر دیتا ہے۔ تیاری بھی ایسی ویسی نہیں پورا شہر بسانا پڑتا ہے۔ اسی شہر میں ایک بڑا اسٹیڈیم ہوتا ہے کچھ چھوٹے چھوٹے اسٹیڈیم ہوتے ہیں۔ تیرنے کے تالاب ہوتے ہیں گھوڑ دوڑ کے میدان ہوتے ہیں کھلاڑیوں کے ٹھہرنے کے لئے پورا گاؤں ہوتا ہے اخبار والوں یا نامہ نگاروں کا پورا محلّے کا محلّہ ہوتا ہے یہ نامہ نگار اولمپک کی خبریں اپنے اپنے ملکوں کو برابر بھیجتے رہتے ہیں۔

جرمنی کے مشہور شہر میونخ میں بھی اولمپک کی تیاری کا کام برسوں سے ہو رہا تھا۔ یہ شہر ایک مربع میل میں بسا ہوا ہے۔ مرکزی اسٹیڈیم میں ۸۰ ہزار تماشائیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ اس اسٹیڈیم پر خیمے جیسی چھت ہے۔ یہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی چھت ہے۔ اس چھت کے نیچے دو اور چھوٹے چھوٹے اسٹیڈیم ہیں۔ ۹۵۰ فٹ اونچا ٹیلی ویژن کا مینار ہے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ ملکوں کے لوگ اپنے اپنے ٹیلی ویژن سیٹ پر یہ کھیل اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ پھر آس پاس ہری بھری پہاڑیاں ہیں ایک مصنوعی جھیل ہے۔ ایک زمین کے اندر چلنے والی گاڑی ہے۔ اور ہاں اولمپک پارک میں ایک گلی کا نام "روپ سنگھ لین" رکھا گیا ہے۔ روپ سنگھ دھیان چند کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ۱۹۳۲ء (لاس اینجلیز) اور ۱۹۳۶ء (برلن) میں وہ ہاکی کے بہت بڑے کھلاڑی مانے گئے تھے۔

ان دونوں اولمپک مقابلوں میں ہندوستان کی ہاکی ٹیم کو سونے کے تمغے ملے تھے۔ اس کامیابی میں روپ سنگھ کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس وقت میونخ جانے والی ہاکی ٹیم میں دھیان چند کے چھوٹے لڑکے اشوک کمار شامل ہیں۔

لگ بھگ دس ہزار کھلاڑیوں نے ان مقابلوں میں حصہ لیا چار ہزار نامہ نگار مختلف ملکوں سے آئے۔

۱۹۳۶ء میں اسی جرمنی کی راجدھانی برلن میں

اولمپک کھیلوں کا مقابلہ ہوا تھا۔ یہیں ایک نیا دستور
یا نئی رسم قائم ہوئی ہے۔ اولمپک مقابلے شروع ہونے
سے پہلے یونان کے مشہور مقام اولمپیا میں شمع جلائی
گئی۔ اور ہاتھوں ہاتھ اسی وقت جرمنی کے اولمپیا
گاؤں میں پہنچائی گئی۔ جب اولمپک کھیلوں کے افتتاح
کا شروع ہونے کی رسم ادا ہو رہی تھی۔ کوئی ۵۹۷۲
کھلاڑیوں نے اس جلتی ہوئی شمع کو جرمنی کے اولمپک شہر
تک پہنچایا تھا۔ اور جب سے یہ رسم بہت پابندی
سے جاری ہے۔

حصہ لینے والے ۱۲۲ ملکوں نے اپنے بہترین
اور چنے ہوئے کھلاڑی ان اولمپک مقابلوں میں
حصہ لینے کے لئے بھیجے تھے۔ مقابلہ کل ۱۲ کھیلوں
میں ہوا۔ مثلاً۔ ہاکی، فٹبال، والی بال، ہینڈ بال
جوڈو، کشتی، تیراکی، مختلف قسم کی دوڑیں، کشتیو کی
دوڑ، نشانہ بازی۔ برچھا پھینکنا، ڈسکس پھینکنا،
مکے بازی جمناسٹک وغیرہ۔ کل ۹۰۱۱ تمغے رکھے
گئے تھے ۴۴۳ سونے کے ۳۶۴ چاندی کے اور
۳۸۱ کانسے کے۔

اولمپک والوں کا نعرہ ہے "اونچے سے اونچا
تیز سے تیز۔ مضبوط سے مضبوط" اور اولمپک نشان
پانچ چھلے یا حلقے میں ایک دوسرے میں پھنسے ہوئے۔
ان میں ایک نیلا ہے ایک ہرا ہے ایک پیلا ہے اور
ایک کالا ہے۔ اولمپک کا جھنڈا سفید ہے۔ اور
اس کے بیچوں بیچ یا مرکز میں یہ پانچوں چھلے یا حلقے
اس تاریخی موقع پر بہت سے ملکوں نے یادگاری
ٹکٹ جاری کئے تھے۔

۲۶ اگست کو میلے کے افتتاح کے موقع پر تمام
(تقریباً دس ہزار) کھلاڑیوں کا شاندار جلوس نکلا۔
اولمپیا سے لائی ہوئی شمع ایک خاص جگہ رکھی گئی۔ یہ میلے
کے ختم یعنی گیارہ ستمبر تک یونہی جلتی رہی۔ کہتے ہیں افتتاح
کی یہ رسم دیکھنے اور یہ شاندار جلوس دیکھنے کے لئے اسی
ہزار تماشائی اسٹیڈیم میں موجود تھے۔

☆

بقایا ص ۱۳

طرح میں تمہیں قاعدے میں رکھ سکوں گا۔ ماسٹر پیٹرکن
تمہیں تو خود ہی معلوم ہے تم کسی بطخ سے بہتر غوطہ خور نہیں
ہو۔ اس لئے جناب جب تک آپ اچھے غوطہ خور
نہ بنیں گے۔ ناشتہ میں آپ کی یہ پسندیدہ چیز
آپ کو نہیں ملے گی۔"

کھانے کی اتنی ڈھیر سی چیزیں دیکھ کر مجھے واقعی
خوشی ہو رہی ہے" میں بولا۔ "کیوں کہ بھوک بھی
تو زوروں سے لگ رہی ہے۔"

اچھا۔ تو اپنا منہ ذرا اس سے بند کرو۔" پیٹرکن
نے ایک بڑی گھونگھا مچھلی میرے ہونٹوں پر لٹکاتے
ہوئے کہا۔

میں نے ہونٹ کھول دیئے اور خاموشی سے
اسے نگل گیا۔ اور واقعی وہ بڑی مزیدار تھی۔

اب ہم نے دن گزارنے کی نئی ترکیبیں سوچنی
اور منصوبے بنانے شروع کئے۔ آج ہمیں
آگ جلانے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کیوں کہ ہماری
دوربین کا شیشہ بہت عمدہ تھا۔ بھنی ہوئی
گھونگھا مچھلیاں اور ناریل کھاتے وقت ہم نے
اپنے مستقبل کے منصوبوں پر لمبی چوڑی بحث
چھیڑ دی

(باقی آئندہ)

ہماری ایک نئی اسکیم

مکتبہ پیام تعلیم

اس سال (۱۹۷۲ء) سے ہم نے ایک نئی اسکیم شروع کی ہے۔ آپ کے لئے چھوٹی چھوٹی خوب صورت کتابیں تیار کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ دس کتابیں پہلے چھپ چکی ہیں آٹھ دس ابھی پچھلے مہینے ستمبر میں شائع ہوئی ہیں ان کتابوں کے ٹائٹل تو اس قدر خوب صورت ہیں کہ آپ دیکھتے ہی پھڑک جائیں گے۔

۱۔ بھیڑیے کے بچے۔ ترجمہ از قرۃ العین حیدر صاحبہ ھ/۱
۲۔ ہرن کے بچے " ۵۰/-
۳۔ میاں ڈھینچو کے بچے " ۵۰/-
۴۔ شیر خاں " ۵۰/-
۵۔ لومڑی کے بچے " ۵۰/-
۶۔ بہادر " ۷۵/-
۷۔ سونے کا پنجرہ اور دوسری کہانیاں، احسان الحق ھ۴/
۸۔ چچا غالب۔ از محمد حسین حسان ندوی ۱/۷۵
۹۔ چینی کی گڑیا " ۵۰/-
۱۰۔ بہادر سیاح " ۶۵/-

نئی کتابیں:

۱۱۔ بدنصیب شہزادی۔ ابرار محسن ۱/-
۱۲۔ عقل کا سودا " ۷۰/-
۱۳۔ جنگل کا راجہ " ۱/-
۱۴۔ تیس مار خاں " ۹۰/-
۱۵۔ سند باد کا گھر خضر برنی ۴/۵-
۱۶۔ دلی دور ہے مجیب اللہ خاں ۵۰/-
۱۷۔ جب اور اب آصفہ مجیب ۱/۷۵
۱۸۔ تین کوڑیاں اقبال امروہوی ۱/۲۰

پیام تعلیم کے تمام خریداروں کو "مکتبہ پیام تعلیم" اور "مکتبہ جامعہ لمیٹڈ" کی تمام کتابوں پر دس فیصدی کمیشن دیا جائے گا۔

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

جناب اکرام احمد سائنس لکچرر
ٹیچرس کالج جامعہ

کمپیوٹر

کمپیوٹر کا مطلب ہے، حساب کرنے والی مشین۔ یہ مشین جمع، تفریق، ضرب، تقسیم، جذر، ریاضی کی ہر قسم کی مساوات حل کرنا وغیرہ وغیرہ سارے کام کر لیتی ہے۔ نہایت تیز رفتاری سے کرتی ہے۔ شروع شروع میں یہ کمپیوٹر بڑے سائز کے ہوتے تھے۔ اکیلا ایک کمپیوٹر کمرے کی ساری جگہ گھیر لیتا تھا پر اب نئے کمپیوٹر خاصے چھوٹے ہوتے ہیں

ہر اچھی دکان پر آپ نے کاؤنٹر پر ٹائپ رائٹر کی شکل کی مشین دیکھی ہوگی۔ آپ نے سامان خریدا دکاندار نے اس کی قیمتیں اس مشین سے چھاپیں بٹن دبایا اور میزان موجود۔ یہ ایک معمولی قسم کا سادہ کمپیوٹر ہے۔ اعلیٰ کمپیوٹر ایک پیچیدہ مشین ہے جو خود بخود حساب کر سکتی ہے یہ نیا کمپیوٹر جمع تفریق یا ضرب تقسیم کے پانچ لاکھ سوال ایک سکنڈ میں حل کر سکتا ہے

ایسے مسئلے بے شمار ہیں جن کا حل انسانی طاقت اور عقلِ سے باہر ہے لیکن کمپیوٹر ان کو نہایت تیزی سے حل کر سکتا ہے۔ امریکہ میں پچھلی مردم شماری کے اعداد و شمار کمپیوٹر کے ذریعے اکٹھا کئے گئے اور ان کا تجزیہ بھی کیا گیا۔ یہ کام صرف چند ہفتوں میں ہو گیا حالانکہ ۱۸۹۰ء کی مردم شماری کے آنکڑوں کا تجزیہ چھ سال میں ہوا تھا۔ ہمارے ہاں ابھی ابھی جو مردم شماری ہوئی ہے اس میں بھی اعداد و شمار کا تجزیہ کچھ حد تک کمپیوٹر کے ذریعے کیا گیا ہے۔

جدید کمپیوٹر تین منٹ میں اتنا کام کر سکتا ہے کہ ایک آدمی پوری زندگی میں بھی اتنا کام نہیں کر سکتا۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے دوران ایٹم بم بنانے کے سلسلے میں سائنسدانوں کے سامنے ریاضی کی ایسی گتھیاں تھیں جن کو وہ حل کرتے تو کم سے کم ۱۰ سال لگ جاتے۔ کمپیوٹر نے یہ کا م صرف دو ہفتوں میں کر دیا۔

کمپیوٹر کے استعمال کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ انجینیرنگ، سائنس، تجارت، کارخانوں اور ملوں، فوجی اور سرکاری کاموں میں ان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مردم شماری کا کام یہ کرتے ہیں۔ ڈاک خانوں میں ڈاک چھانٹنا کارخانوں اور مکانوں کے نقشے تیار کرنا موسم کی پیشن گوئی کرنا ان کے ذریعے ممکن ہے۔ کمپیوٹر سے ایک زبان کا ترجمہ دوسری زبان میں کیا جا سکتا ہے۔ اب تو ہوائی جہاز، میزائل راکٹ اور آبدوز کشتیاں بھی کمپیوٹر سے چلائی جا رہی ہیں۔

امریکہ کے کئی شہروں میں ریلوے کا پورا انتظام کمپیوٹر کرتے ہیں۔ مسافروں کو ٹکٹ یہ دیتے ہیں۔ ٹکٹ کی چیکنگ یہ کرتے ہیں۔ ریل کے ڈبوں کا دروازہ کھولنا اور بند کرنا ان کا کام ہے۔ ریل کو چلانا اور منزل پر پہنچانا ان کی ذمہ داری ہے۔ نہ کہیں ٹکٹ بیچنے والا ہے، نہ انجن ڈرائیور، نہ گارڈ نہ چیکر۔ سارے کام خود بخود ہو جاتے ہیں اور اس خوبی اور تیزی سے کہ نہ کہیں شور نہ کہیں بھیڑ۔

حد تو یہ ہے کہ شادی بیاہ طے کرانے اور قسمت کا حال
نے کے لیے بھی لوگ کمپیوٹر کا استعمال کرنے لگتے ہیں۔
ا پہلے میں لندن میں تھا ایک روز وہاں کے مشہور اسٹور
FRIDGE میں گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک بڑے
ڈ پر نظر پڑی۔ لکھا تھا۔
"یہاں کمپیوٹر سے قسمت کا حال جانا جا سکتا ہے" تجسّ
میں وہاں گیا بڑی الماری کی شکل کی ایک مشین رکھی
یکاؤنٹر پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ میں نے اُسے ۵ شلنگ
ے اُس نے ایک فارم بھرنے کے لیے دیا، نام، تاریخ
ئش، مشاغل، تعلیم وغیرہ لکھ کر میں نے فارم اس کو
س کیا۔ لڑکی نے ایک ٹائپ رائٹر پر کچھ ٹائپ کیا
سوراخوں والا کارڈ تیار ہو گیا اس کارڈ کو اُس نے مشین
ایک خانے میں رکھ دیا، کئی بٹن دبائے اور پانچ منٹ
کمپیوٹر نے ایک بڑا سا ٹائپ شدہ کاغذ باہر نکالا۔
س پر ہماری اگلی پچھلی زندگی کی بہت سی باتیں لکھی تھیں
کی اُن ہستیوں کے نام بھی درج تھے جن کی قسمت
ے میری اپنی قسمت ملتی جلتی تھی۔

یوٹر کی بناوٹ:- تفریحات کمپیوٹر کی ہو رہی تھی۔ اور
ابھی ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اعلیٰ
کا کمپیوٹر بہت پیچیدہ مشین ہے ہر کمپیوٹر میں چھ
ے ضرور ہوتے ہیں۔ ہر حصّہ یونٹ کہلاتا ہے۔ پہلے
کا نام ان پٹ یونٹ (INPUT UNIT) ہے
یہ وہ حصّہ ہے جہاں اعداد و شمار، اطلاعات اور ہدایتوں
شین میں داخل کیا جاتا ہے۔ تمام عددوں اور ہدایتوں
یرہ کو مشین میں داخل کرنے سے پہلے ان عددوں اور
یتوں وغیرہ کا ترجمہ مشین کی زبان میں کیا جاتا ہے مشینی
بان عموماً کاغذ پر سوراخوں کی شکل میں مقناطیسی ٹیپ
پر نشانات کی شکل میں ہوتی ہے
دوسرا حصّہ حافظہ یونٹ یا MEMORY UNIT
کہلاتا ہے۔ دو عددوں کو ضرب دیتے وقت ہم اپنے ذہن
پر زور دے کر وہ پہاڑے دہراتے ہیں جو کبھی ہم نے
بچپن میں حفظ کیے تھے۔ کمپیوٹر بھی ——— بہت سی
باتیں یاد رکھتا ہے۔ اور یہ ساری باتیں اُس کے حافظ
یونٹ میں جمع رہتی ہیں ایک نیا کمپیوٹر لاکھوں اطلاعات
یاد رکھتا ہے اور جب ہمیں ضرورت ہو اِن کو ہم کمپیوٹر
سے دریافت کر سکتے ہیں۔
تیسرا حصّہ ارتھمیٹک یونٹ (ARITHMETIC UNIT)
ہے۔ حساب کتاب کا سارا عمل یہاں ہوتا ہے جمع کرنا، گھٹا
ضرب دینا اور تقسیم کرنا اِس حصّے کا کام ہے ——— یہ کمپیوٹر
نہایت اہم حصّہ ہے۔ اِس کی جانچ ہر روز کی جاتی ہے
ذرا سی بھی خرابی اس حسابی یا ارتھمیٹک یونٹ (ARITHMETIC
UNIT) میں ہو جائے تو یوں سمجھئے کہ غضب ہو گیا جمع
میں لاکھوں کروڑوں کی غلطی یا ہیر پھیر ہو جاتی ہے۔
چوتھا حصّہ کنٹرول یونٹ (CONTROL UNIT)
ہے۔ حافظہ یونٹ سے ہدایتیں وصول کرنا اور مشین کے
مختلف سوئچوں اور خانوں میں اُن کو بھیجنا اس یونٹ
کام ہے یہ گویا پورے کمپیوٹر کو اپنے کنٹرول میں ر
پانچواں حصّہ کا نام آؤٹ پٹ یونٹ (OUTPUT
UNIT) ہے۔ کمپیوٹر سارا کام برقی (بجلی کے) اشارو
میں کرتا ہے اِس حصّے کا کام اِن اشاروں کو انگریزی
دوسری زبان میں ترجمہ کر کے چھاپنا ہے۔
غرض کمپیوٹر ایک پیچیدہ مشین ہے اس میں بیشمار
الیکٹرونیکل پرزے ہوتے ہیں۔ ریڈیو کے والو اور
ٹرانزسٹر سے آپ واقف ہیں۔ کمپیوٹر میں بہت

چھوٹے بڑے والو اور ٹرانزسٹر لگے ہوتے ہیں۔ ان کے
علاوہ کثیر تعداد میں (PULSE SHAPERS) اور
AMPLIFIERS (آواز اونچا کرنے والا آلہ) وغیرہ
استعمال کئے جاتے ہیں۔

کمپیوٹر کی زبان ہماری زبان سے مختلف ہوتی ہے
اُس کا حسابی نظام بھی ہمارے عام اعشاری نظام سے
مختلف ہوتا ہے۔ اعشاری نظام میں صفر سے ۹ تک
کُل دس ہندسے بار بار کام میں لائے جاتے ہیں۔ جبکہ
کمپیوٹر اپنا عمل دو عددی نظام سے کرتا ہے۔ دو عددی
نظام میں صرف دو ہندسے ہوتے ہیں صفر اور ایک
اعشاری نظام کی تمام رقوم اِن دو ہندسوں میں ظاہر
ہو جاتی ہیں اسی طرح اے (A) سے زیڈ (Z) تک تمام حروف بھی
اِن دو ہندسوں کی ترتیب سے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ دو
عددی نظام روزمرّہ کی زندگی کے لیے مناسب نہیں
لیکن کمپیوٹر کے لیے یہ بہترین ہے اس کو الیکٹرونی
سرکٹ میں تیزی سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

کمپیوٹر کے کام کو سمجھنے کے لیے ریاضی کا ایک
آسان سا سوال لیجئے۔ مان لیجئے، ہم 17 x 13 میں
سے 11 x 12 کو تفریق کرنا ہے۔ یہ سوال اگر آپ
خود حل کرنا چاہیں تو طریقہ یہ ہے کہ پہلے سوال کو پڑھ
لیں گے پھر 17 x 13 کی ضرب کر کے جواب لکھ لیں گے
اب 11 x 12 کو ضرب کریں گے اور پہلے حاصل ضرب
ہی سے دوسرے کو گھٹا دیں گے جواب مل جائے گا
کچھ اسی قسم کا عمل کمپیوٹر میں بھی ہوتا ہے۔

سب سے پہلے آپریٹر OPERATOR سوال
کو کمپیوٹر کی زبان میں چھاپتا ہے جو عموماً ایک ٹیپ
یا کارڈ پر سوراخوں کی شکل میں ہوتا ہے اس کام کو

"پروگرام تیار کرنا" کہا جاتا ہے اس پروگرام کو مشین
دیا جاتا ہے۔

کمپیوٹر میں سب سے پہلے 13 اور 17 کو ضر
ہے۔ حاصل ضرب اسٹور (STORE) میں داخل
ہے۔ اب اس طرح 12 اور 11 کے حاصل ضرب کو
STORE (STORE) میں بھیج دیا جاتا ہے۔
دونوں حاصل ضربوں کو نکال کر کمپیوٹر (TER
تفریق کرتا ہے اور آخری جواب آؤٹ پٹ ان
کے ذریعے آپریٹر (OPERATER) کو مل جاتا۔
(OPERATOR) کا کام جواب کو چھاپنا ہے۔

کمپیوٹر کی تاریخ بھی دلچسپ ہے۔ آپ نے
بال فریم ضرور دیکھا ہوگا۔ اس میں لوہے کے کئی
موتی پروئے ہوتے ہیں اور ان کی مدد سے چھوٹے
گنتی سکھائی جاتی ہے۔ اس قسم کا گنتارہ پرانے
یونان اور روم میں حساب کرنے کے لیے عام
جاپان میں آج بھی دکانوں اور گھروں میں اس
ہوتا ہے۔ اس کو ہم سب سے سادہ اور پہلا کمپیو
1642 میں فرانس کے ایک ریاضی داں
جمع کرنے کی ایک مشین بنائی اس میں کئی دانتے دا
ہیں۔ ہر پہیے میں دس دانتے تھے۔ جب پہ
چکر مکمل کرتا تھا تو دوسرے کا صرف ایک دا
اس اصول پر آج بھی جمع کرنے کی سادہ مشین
کوئی پچاس سال بعد جرمن کے مشہور فلسفی
داں ولیم لیبنز نے ایک ایسی مشین بنائی
جمع کے علاوہ ضرب کے سوال بھی حل کئے جا
کل ہاتھ سے چلائی جانے والی (ULATING
MACHINE حسابی مشین اسی اصول پر بنا

اس قسم کی مشین میں دس ہندسوں والے دو عددوں کو آٹھ سیکنڈ میں ضرب کیا جا سکتا ہے۔

پاسکل اور رینبتر   کی مشینیں زیادہ کارآمد ثابت نہ ہوئی۔ ڈی۔ ای۔ فیلٹ (D.E. FELT) نے پہلی بار ایسی مشین ایجاد کی جس کو کامیابی کے ساتھ بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا یہ 1887 میں بنائی گئی اور ٹائپ رائٹر کی شکل کی تھی۔ چند سال بعد ڈبلیو۔ ایس برروز (W.S BURROUGHS) نے اس سے بھی اچھی مشین بنا دی یہ جواب چھاپ کر دیتی تھی اور کھاتے کا سارا کام کر سکتی تھی۔ کاروباری دنیا میں اس مشین کے باعث ایک انقلاب آ گیا۔ آج شاید ہی کوئی ایسی فرم یا دفتر ہوگا جس میں بک کیپنگ (BOOK KEEPING) بل بنانے اور اکاؤنٹ رکھنے کے لیے مشینیں نہ ہوں بینک میں تو چیک تیار کرنے کے لیے بھی ایسی مشین کا استعمال ہونے لگا ہے۔

1890 کے آس پاس امریکہ میں (PUNCHED CARD (کارڈ میں چھید) والی مشینیں بنائی گئیں اب تک سارے کمپیوٹر انہی سے چلائے جاتے تھے۔ پہلا عام استعمال کا خودکار (AUTOMATIC) کمپیوٹر ۱۹۴۴ء میں ہارورڈ یونیورسٹی میں ڈاکٹر ایکن (AIKEN) نے ایجاد کیا۔ اس میں 23 ہندسوں والے 72 نمبروں کو اسٹور کیا جا سکتا تھا اور ان نمبروں کو یہ ۴ سکنڈ میں ضرب دے سکتا ہے۔ تقسیم کرنے کے لیے ۱۱ سکنڈ لگتے تھے دوسری جنگ عظیم میں اس کمپیوٹر کا استعمال ایٹم۔ بم بنانے کے لیے کیا گیا۔

۱۹۴۶ میں پہلا الیکٹرونک کمپیوٹر بنا۔ اور آج الگ الگ کاموں کے لیے ۵۰ سے زائد قسم کے کمپیوٹر موجود ہیں۔ ان میں سے بعض سیاروں اور تاروں کی گردش پر نگاہ رکھتے ہیں۔ غیر ممالک میں ایسے کمپیوٹر عام ہیں جن سے لوگ اپنی پسند کی چیزیں خرید سکتے ہیں یہ رقم وصول کرتے ہیں، فاضل رقم واپس کرتے ہیں اور سامان خریدار کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اب تو ایسے کمپیوٹر بھی بن گئے ہیں جن کے ذریعے بنا استاد کی مدد کے خود بخود علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔

نئے کمپیوٹر کی عمر ابھی ۲۵ سال ہے لیکن اس چھوٹی عمر میں ہی اس نے کمال کر دکھایا زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں اس کو دخل نہ ہو اس کی مدد سے ہر قسم کا کام آناً فاناً ہو جاتا ہے کمپیوٹر اور انسان دونوں کا بندھن اٹوٹ ہو گیا ہے ان کے مستقبل بھی ایک دوسرے سے وابستہ ہیں کمپیوٹر کا آغاز انسانی دماغ کے پھیلاؤ کی شکل میں ہوا تھا لیکن آج وہ انسان کا دوسرا دماغ ہے بلکہ وہ انسانی دماغ ہی کا ایک حصّہ ہے۔ اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کمپیوٹر کا مستقبل انسانیت کا مستقبل ہے۔

ترقی یافتہ ملکوں میں کمپیوٹر آدمی کے دماغ کا درجہ حاصل کر چکے ہیں ہمارے ملک میں بھی اس کے استعمال کی شروعات ہو چکی ہے اور ہمیں امید کرنی چاہئے کہ جلد ہی وہ ہماری زندگی کے اٹوٹ انگ بن کر وہ تمام کام کر سکے گا جو وہ دوسرے ملکوں میں کرتا ہے

(آل انڈیا ریڈیو کے شکریے کے ساتھ)



تم کہاں ہو؟



محمد حسین حسان ندوی

حسیب اور شعیب دونوں بھائی اپنے گھر کے پاس باغ میں کھڑے تھے۔ کھڑے کیا تھے گھر کے پیچھے والے جنگل میں سیر کی تیاری کر رہے تھے۔ صفیہ نے جو یہ دیکھا تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "کیا سچ مچ تم مجھے نہیں اکیلا چھوڑ جاؤ گے؟"

دونوں بھائی اپنی اپنی پتلی پتلی بنسیوں پر کانٹے کی ڈور لپیٹ رہے تھے۔ حسیب منہ اٹھا کر بولا "ارے اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے بھئی۔ بھلا جنگل میں لڑکیوں کا کیا کام۔ اچھا ہم تمھیں پھر لے جائیں گے۔"

"نہیں میرا تو ابھی جی چاہتا ہے۔ اگر تم نہیں لے جاتے تو نہیں جاؤں گی۔"

"نہیں بھئی۔ یہ بات نہیں کہ ہم تمھیں لے جانا نہیں چاہتے بلکہ یہ ہمیں کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔"

"ہاں ہاں"۔ میں سمجھ گئی کہ تم سمجھتے ہوگے کہ صفیہ بہن تمھیں راستے میں پریشان کرے گی۔ تمھاری سیر میں رکاوٹ ڈالے گی اسی لیے نہیں لے جانا چاہتے۔"

صفیہ یہ بات کہہ اور جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے میں گھس گئی۔

شعیب صاحب اکڑ کر بولے، "بھلا یہ بھی کوئی لڑکیوں کا طریقہ ہے۔ ہونہہ! بس ہر وقت بھائیوں کے پیچھے پیچھے لگی رہیں۔"

حسیب۔ "ہاں بھئی لڑکیوں کا جنگل میں جانا بالکل مناسب نہیں۔"

تھوڑی دیر کے بعد دونوں بھائیوں نے اپنی اپنی بنسیاں کندھے پر رکھیں اور چل پڑے۔ اکٹھ باسٹھ کرتے، کالے گھنے جنگل کے پتلے سے راستے کی طرف۔

چلتے چلتے دونوں ایک نالے کے پاس پہنچے اور اپنے اپنے کانٹے پانی میں ڈال کر بیٹھ گئے۔ مگر مچھلیاں نہ لگیں، کانٹے کے قریب بھی نہ آئیں منہ میں لینا تو الگ رہا۔ شعیب میاں تو تھوڑی دیر میں اکتا گئے، بولے "اپنی اپنی بنسیاں زمین میں گاڑ کر ہم لوگ اور آگے کیوں نہ بڑھیں، کیا عجب جو لوٹتے میں کوئی بڑی سی مچھلی پھنسی ہوئی ملے؟"

حسیب کو چھوٹے بھائی کی یہ تجویز پسند آئی۔ چند ہی منٹوں میں یہ اور آگے چلے۔ پر اب ان ننھے شکاریوں کے کندھے بھاری بھدی بنسیوں سے خالی تھے۔ ابھی تھوڑی دور گئے تھے۔ ارے یہ کیا! چلتے چلتے اچانک رک گئے۔ اے لیجیے ایک نئی بات دونوں ایک چٹان کے کنارے کھڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی کھوہ یا غار ہو۔ کھوہ کے ایک طرف راستہ سا اور بڑے بڑے پتھر کیسے بڑے بڑے بالکل سپاٹ کھوہ کے منہ پر ایسے لگتے تھے جیسے ہوا میں لٹکے ہوں یہ دیکھ کر دونوں بے حد خوش ہوئے۔ حسیب صاحب کھوہ کے اندر جانا چاہتے تھے۔ اندر جانے کے لیے پتھروں کو ہٹانا تھا۔ بڑی دیر تک زور لگاتے رہے۔ تب کہیں دو چھوٹے چھوٹے پتھر ذرا ادھر ادھر کھسکے نیچ

میں سوراخ سا ہوا۔

اب تو حبیب صاحب بڑی شان سے بولے۔ اگر میں پورا زور لگا دوں تو اس پتھر کو ہٹا سکتا ہوں۔"

مگر شعیب صاحب کو جلدی تھی بولے: اجی نہیں بھیا! بس ذرا سا اور کھول لیجیے پھر ہم تو کسی نہ کسی طرح اندر پہنچ ہی جائیں گے۔"

غرض بہت ہی سنبھل سنبھل کر، بڑی احتیاط سے بدن چرا کر ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل سوراخ میں گھسے۔ پر ابھی طرح اندر پہنچ بھی نہ پائے تھے کہ ایک زور کا دھماکہ ہوا۔ اڑ اڑا دھم! جیسے بم پھوٹا۔ دونوں سہم ہی تو گئے۔ زمین پر پہنچ گئے۔ مگر دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اوپر نگاہ کی تو مارے دہشت کے اور بھی برا حال ہوا۔ وہی پتھر جسے انھوں نے سرکایا تھا نیچے آ رہا تھا۔ کھوہ کا منھ قریب قریب بند ہو گیا تھا۔ اسے لیجیے اور پریشانی کی بات! یہ پتھر دو اور پتھروں کے بیچ میں گرا اور ان دونوں میں جیسے فٹ ہو گیا تھا پیوست ہو گیا تھا۔ انھوں نے غور سے دیکھا تو پتہ چلا۔

شعیب بہت گھبرائی گھبرائی آواز میں چلایا" ارے ہم تو پھنس گئے بھیا۔

ارے بھئی جیوٹ! دیکھو ہم ابھی راستہ بنالتے ہیں جیسے ہی غار کے منھ کے پاس جا کر ایک طرف کھودنے کی کوشش کی مگر کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ ساری جگہ بند تھی بس ایک ہی تدبیر تھی۔ اس گھسے ہوئے "پہلے" سپاٹ پتھر کے پرت پرت الگ کیے جائیں اور یوں نکلنے کا راستہ بنایا جائے۔ اور یہی انھوں نے کیا بھی۔ گھنٹوں اس کام میں لگے رہے۔ مگر ذرا سا سوراخ کر پائے۔ بہت ذرا سا۔ پر تھے دھن کے پکے۔ ہمت نہ ہاری اور برابر لگے رہے۔ ارے دونوں اچانک رک کیوں گئے۔ کانوں میں کوئی آواز آئی۔ جیسے کوئی پکار رہا ہو۔ ارے ہو یہ تو صفیہ بہن کی آواز ہے۔

"شعیب، شعیب، ارے حبیب میاں شعیب تم کہاں ہو؟"

"یہ یہ رہے۔ ا۔ ں۔ ہم یہاں ہیں صفو" حبیب گھبرائی ہوئی آواز

میں چلایا۔

یہاں غار میں ہیں کیا ہم تمھیں نظر نہیں آ رہے ہیں؟

صفیہ تھکی ہاری غار کے منھ پر آ کھڑی ہوگئی کہنے لگی۔ میں دوپہر تک تمھاری راہ تکتی رہی جب کھانے کے وقت بھی تم نہ آئے تو میرا تو ماتھا ٹھنکا ہو نہ ہو کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی اور بس میں نکل کھڑی ہوئی۔

تم اکیلی ہی آئی ہو؟ حبیب نے ذرا سے سوراخ میں سے پوچھا

اور کیا۔ اکیلی تو آئی ہوں۔ تمھیں تو معلوم ہے کہ آج گھر پر اماں کے سوا کوئی نہ تھا۔ اور اماں کو تمھاری بھلا کیا پرواہ۔ اس نے تو ہانڈی چولھا کیا اور اب اس کی بلا سے تم کھاؤ یا نہ کھاؤ۔ پر میرے تو دل بیٹھی ہوئی تھی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم مل گئے۔ پر اب سمجھ نہیں آتا کہ تمھیں باہر کیسے نکالوں؟

حبیب میاں بڑی متانت سے بولے "صفو ہماری جان کی تمھارے نزدیک کچھ بھی قیمت ہے تو کوئی تدبیر تو کرنی پڑے گی کسی کو مدد کے لیے بلانا پڑے گا۔

اتنا سننا تھا کہ صفیہ ہوا ہو گئی۔ جیسے بجلی کوند جائے اور ذرا میں ایک پڑوسی کو ساتھ لے، واپس آئی۔ پڑوسی کے پاس سبل اور کدال تھی۔ ان دونوں کی مدد سے اس نے بات کی بات میں پتھر ہٹا دیا۔ اور یہ دونوں پھنسے ہوئے سیلانی آزاد ہو گئے۔ جان بچی لاکھوں پائے۔

رات کو دونوں بھائی اپنے مزے سے بستر پر لیٹے تھے۔ حبیب میاں اپنے اوپر لحاف ڈالتے ہوئے بولے "میں بڑی دیر سے سوچ رہا ہوں۔ اس وقت صفیہ صفو رحمت کا فرشتہ بن کر پہنچ نہ جاتی تو آج کی سیر کیسی رہتی؟

شعیب: "اچھا میں بھی کچھ یہی سوچ رہا تھا۔" حبیب دبے اشتیاق سے "کیا جو شعیب یہی کہ صفیہ صفو کو چھوڑ کر سیر کا کسی پکنک کا پروگرام بنانا غلط ہے۔ حبیب "اور آئندہ میں کسی ایسی جگہ جاؤں جہاں اپنی صفو کو نہ لے جا سکوں؟"

اتحاد

محمد شفیع تمنا

اینٹ اینٹ سے آتی ہے آواز یہی ہر بار   اتحاد کی بنا پہ قائم ہوا ہے یہ مینار
سُن لو ان میں اگر نہ ہوتا اک سے اک کا میل   چور چور ہو کر گر جاتا، ہو جاتا مسمار
کیسے ہو سکتا ہے کر لو اک انگلی سے کام   کتنی خام خیالی ہے یہ سوچو تو اک بار
بگاڑ کے آپس کے قومیں ہوتی ہیں برباد   بچّو "پھوٹ" کی اس لعنت سے رہنا تم ہشیار
اسی سے کر لو اندازہ ہے ملاپ بھی کیا چیز   اک پاؤں سے رستہ چلنا ہے کتنا دشوار
ایک نہ سمجھے سب کو جو، جو سب سے میل نہ رکھے   پھر کیا اسے ہے تمنّا اپنے وطن سے پیار

مٹا سکے گا اسے کوئی کیا "اتحاد" ہو جس میں
بچّو اس کے آگے ایٹم بم بھی ہے بے کار

ترجمہ از: محمد شعیب حسان بی اے

لنکا کے گاندھی

آپ نے لنکا یا سیلون کے اری صاحب کا نام سُنا ہوگا۔ عجیب وغریب شخصیت ہے۔ لوگ انھیں لنکا کا گاندھی کہتے ہیں۔ اری صاحب نے تھوڑے ہی دنوں میں لنکا کے بہت سے پچھڑے ہوئے دیہاتوں کی کایا پلٹ دی۔ ان میں کچھ ایسی ہمدردی بعل مناہبت انسانی دوستی ہے سماج سدھار کا کچھ ایسا جذبہ ہے کہ سن کر حیرت ہوتی ہے۔ یہی نہیں کام کرنے کا اس قدر ولولہ جوش، ساتھ ہی اس قدر سوجھ بوجھ اور مستقل مزاجی ہے کہ کسی رکاوٹ کو دھیان میں نہیں لاتے۔ بس اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ اسی لئے کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔

اری کا پورا نام اہنگامے ٹیوڈار یار تنے ہے۔ بڑا لمبا نام ہے۔ ان کے یار دوست انھیں صرف اری کہتے ہیں۔ اور اسی نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ اری صاحب کولمبو کے ایک ثانوی یا سکنڈری اسکول میں استاد ہیں۔

ارے! آپ سیلون کو نہیں جانتے؟ ہمارے دیس کے جنوب میں چھوٹا سا ملک ہے۔ سمندر کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت جزیرہ۔ لنکا یا سیلون اسی کو تو کہتے ہیں۔ ہمارے دیس میں یہ لنکا کے نام سے زیادہ مشہور ہے جنوبی ہندوستان کے بہت سے لوگ وہاں بس گئے ہیں۔ اور ہاں بھئی اسی لنکا کے مہاراجہ راون نے تو رام چندر جی سے ٹکر لی تھی۔ اور بے چارہ ہار گیا تھا۔ لنکا کے بارے میں ایک بات اور بھی مشہور ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ میاں کے منع کرنے پر بھی گیہوں کا دانہ کھا لیا۔ اللہ میاں نے انھیں سزا دی اور جنت سے نکال دیا۔ آدم علیہ السلام لنکا کے پہاڑ پر جا گرے ان کے قدم کا نشان اب تک باقی ہے۔ سیکڑوں برس سے لوگ اس قدم مبارک کی زیارت کو جاتے ہیں۔

ہم نے ابھی کولمبو شہر کا ذکر کیا تھا۔ یہ لنکا کی راج دھانی ہے۔ بڑا خوبصورت۔ بہت صاف ستھرا شہر ہے۔ شان وشوکت میں یہ دلی، کلکتہ، مدراس، بمبئی تو کیا یورپ کے بڑے بڑے شہروں کا مقابلہ کرتا ہے۔

پر بھئی آپ کولمبو یا چند دوسرے بڑے شہروں کو چھوڑ کر لنکا کے دیہات کی سیر کریں تو آپ کو شہری اور دیہاتی زندگی میں بہت فرق نظر آئے گا۔ لنکا کی دیہاتی زندگی اتنی خوشگوار نہیں ہے۔

لنکا کے لوگ اس فرق کو محسوس کرتے تھے۔ مگر اس

فرق کو دور کرنے کی تدبیر کسی کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ آخر کولمبو کے ایک ثانوی اسکول کا استاد جھنڈا لے کر اٹھا اور اس نے اپنی سوجھ بوجھ اور پکے ارادے اور مستقل مزاجی کے بل پر وہ کام کر دکھایا کہ دنیا حیران رہ گئی۔

ثانوی یا سکینڈری اسکول کے استاد بھی ہمارے "اری" صاحب تھے۔ اری صاحب نے دیکھا کہ ان کے دیہاتی بھائیوں کی حالت بہت خراب خستہ ہے۔ تکلیفیں پریشانیاں اور مصیبتیں اٹھاتے اٹھاتے ان میں بے حسی سی پیدا ہو گئی ہے۔ ہوتے ہوتے آگے بڑھنے کا ترقی کرنے کا جذبہ جیسے بالکل ختم ہو گیا ہے۔ اری صاحب کا دل ان کی دردناک حالت دیکھ کر بہت دکھا۔ اور ان کی اصلاح اور فلاح وبہبود کے لئے ان کے دل میں اس قدر شدید جذبہ پیدا ہوا کہ زیادہ دنوں تک وہ اسے دبا نہ سکے اور سدھار کے کاموں میں لگ گئے۔

اب یہ بھی سنئے کہ انھوں نے یہ کام شروع کیسے کیا۔ اسکول کی چھٹیوں سے پہلے۔ کلاس میں اپنے شاگردوں کے سامنے ایک تقریر کی۔

"آج میں تمھیں ایک گاؤں کے ۳۷ خاندانوں کا حال بتاؤں گا۔ جو قابل رحم زندگی گزار رہے ہیں اپنی اس افسوس ناک حالت کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ وہ تو صرف اس بات کے گنہ گار ہیں کہ بیچاروں نے بہت ہی غریب گھرانوں میں جنم لیا ہے۔ یہ ہمارے سماج کے سب سے پست اور گرے ہوئے لوگ ہیں۔ ان کے گاؤں والوں نے انھیں گاؤں سے باہر کر دیا تھا۔ ان غریبوں اور دھتکارے ہوئے مظلوموں نے ان گاؤں سے دور اپنی جھونپڑیاں بنالی ہیں۔ دھیرے دھیرے ان کی بستی نے گاؤں کی شکل اختیار کر لی۔ یہ لوگ جہاں کہیں نوکری کی تلاش میں جاتے ہیں دھتکار دیئے جاتے ہیں آخر پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے انھوں نے بھیک مانگنے کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔"

اس مختصر سی تقریر کے بعد اری نے کہا۔ میرا خیال ہے ہم لوگ ان کی مدد کر کے سماج میں انھیں مناسب مقام دلا سکتے ہیں۔ اچھا تو بتایئے آپ میں سے کتنے اپنی چھٹیاں قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ کافی دیر تک بات چیت کا بحث کا سلسلہ چلا۔ آخر تیئس لڑکوں نے اس کام کے لئے حامی بھری۔

اور جب چھٹیاں ہوئیں تو ان تیئس ناتجربہ کار لیکن پرجوش نوجوانوں کا چھوٹا سا جتھا اس گاؤں میں پہنچ گیا۔ گاؤں کا نام کا ناٹولاوا ہے۔ کولمبو سے تقریباً ۱۰۰ کلومیٹر دور ہے اس لئے بسوں کا سہارا لینا پڑا۔

سماج سدھار یا کمیونٹی ڈولپمنٹ کا پروگرام اس اس ڈھنگ سے کرنا چاہیئے کہ سارا کام خود گاؤں والے کریں۔ اس کام میں ان کی مدد کرنے والے ان کی رہنمائی کریں خود کام کم کریں۔ اس طرح گاؤں والوں میں اپنا کام خود کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا خود اعتمادی پیدا ہوگی۔ مراری صاحب نے بھی اس بات کا خاص دھیان رکھا۔ گاؤں والوں کو (جوان شہری لوگوں کو دیکھ کر حیران تھے پریشان تھے کچھ کچھ ڈرے سہمے بھی تھے) بلا کر سمجھایا کہ یہ نوجوان آپ کے لئے خود کوئی کام کرنے نہیں آئے۔ ہاں آپ کے کاموں میں مدد مزدور کریں گے۔ اور پھر اری صاحب اور ان کے ساتھیوں نے پھاوڑا اور بیلچہ سنبھالا اور کام میں جٹ گئے۔

اس دن تو گاؤں والوں کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی لیکن رات کے وقت ان کے گاؤں کے بڑے بوڑھوں

نے گاؤں کے نوجوانوں کو سمجھایا کہ یہ ہمدرد اور بھلے لوگ شہر سے تمہاری مدد کو آئے ہیں۔ تمہارا کام کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ کام تمہیں خود کرنا چاہیئے تھا کچھ سمجھدار نوجوانوں نے آپس میں مشورہ کیا اور دوسرے دن شہر والوں کا ہاتھ بٹانے کا پکّا ارادہ کر لیا۔

اور پھر چند ہی دنوں کے اندر ہی اندر گاؤں میں نمایاں تبدیلی نظر آنے لگی۔ بہت سی چیزیں نئے سرے سے بن گئیں۔ مثلاً بانسوں کی جھونپڑیاں دوبارہ بنائی گئیں۔ بناتے وقت ان کی مضبوطی کا خاص خیال رکھا گیا۔ پاخانے کا تصوّر ان لوگوں کے ذہن میں تھا ہی نہیں پرانے دستور کے مطابق رفع حاجت کے لئے کھیتوں میں جاتے تھے۔ گاؤں ہی میں ان کے لئے پاخانے بنائے گئے۔ عام استعمال کے لئے اور پینے کے لئے صاف اور تازہ پانی میسّر نہ تھا۔ اس کے لئے ایک کنواں کھودا گیا کنوئیں کے اندر اینٹوں کی چنائی کی گئی۔ من بھی اینٹوں کی پکّی بنوائی گئی۔ کھیتوں کو پھر سے ٹھیک کیا گیا۔ تاکہ پیداوار پہلے سے اچھی ہو اور زیادہ ہو جگہ جگہ ناریل کے پودے لگائے گئے کہ بڑے ہو کر آمدنی کا ذریعہ بنیں۔ ان کاموں کے ساتھ اری اور ان کے ساتھیوں نے ایک اور کام کی طرف بھی توجہ کی۔ گاؤں میں بنائی کے کام کی بنیاد ڈال دی۔

دن بھر کی ان مصروفیتوں کے علاوہ وہ رات کے وقت یہ لوگ طرح طرح کی کلاسیں لیتے تھے۔ عمر اور طبقے کے اعتبار سے لوگوں کو کام کی باتیں بتاتے تھے۔ مثلاً جوانوں کو طرح طرح کے کھیل سکھاتے تھے۔ عورتوں کو ٹوکریاں بننے کا ڈھنگ بتاتے تھے۔ کسانوں کو مصنوعی کھاد کے استعمال اور نئے طریقے سے کھیتی باڑی کے طریقے بتاتے تھے۔ اور پورے گاؤں کو حفظانِ صحت کی باتیں بتاتے تھے۔

لگ بھگ گیارہ دن گزارنے کے بعد نوجوانوں کا یہ چھوٹا سا قافلہ شہر واپس گیا۔ اور اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ اتنی تھوڑی مدّت میں گاؤں کی حالت کچھ سے کچھ ہو گئی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ گاؤں والوں میں اپنے اوپر اعتماد کرنے کا جذبہ پیدا ہو چکا ہو اور اپنے آپ کو بھی قابل سمجھنے لگے تھے۔

اری صاحب کا کہنا ہے کہ اگر یہ چند سرپھرے اس گاؤں میں نہ جاتے تو یہ دھتکارے ہوئے لوگ اسی پستی اور زبوں حالی میں پڑے رہتے انھیں کبھی یہ احساس نہ ہوتا کہ وہ اس دنیا میں کچھ کر سکتے ہیں۔

مگر یہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اس کا ایک تاریک رخ بھی ہے بہت افسوسناک! بچارے اری صاحب نے دوسروں کے لئے اتنی کھکھیڑ اٹھائی پر خود ان کے ساتھ کیا ہوا۔؟

ان کے ساتھ گاؤں جانے والے شاگردوں کو ان کے سرپرستوں نے اجازت تو دے دی۔ مگر انھوں نے اور دوسرے لڑکوں کے والدین نے یہ بات سخت ناپسند کی کہ اونچی ذات اونچی سوسائٹی کے یہ لڑکے اچھوتوں میں جا کر رہیں۔ ان کے ساتھ مل کر کام کریں۔ انھوں نے اسکول چلانے والوں پر پورا اثر ڈالا اور اری صاحب اسکول سے معطّل کر دیئے گئے۔

مگر اری صاحب تو بہت بااصول بہت پکّے ارادے کے آدمی تھے۔ انھوں نے اس حادثے کو ہنسی خوشی برداشت کیا اور اپنے دوستوں سے کہا۔ بھئی دیکھئے جب کبھی کوئی نئی تحریک چلی ہے تو اس کی مخالفت بھی اسی شدت

سے ہوتی ہے۔ لوگ نئی باتوں نئی قدروں کو آسانی سے قبول نہیں کرتے مگر یہ انھوں نے کہا میرا کام ملک کے لوگوں میں اونچ نیچ کا فرق مٹانا ہے۔ اس بات پر آمادہ کرنا ہے کہ دیش کے دیہات کے پچھڑے ہوئے لوگوں کی ترقی کے لئے کام کریں۔ اس طرح کریں کہ کام میں ان پچھڑے ہوئے لوگوں کا حصہ زیادہ ہو اور سماج سدھار والے یا سوشل ورکران کی رہنمائی کریں۔ اور ان کے ساتھ مل کر تھوڑا بہت کام بھی کریں۔

وہ مخالفوں سے کہتے "پرانی تہذیب کو زندہ رکھنا ہمارا فرض ہے مگر اس پرانی تہذیب میں نئی قدروں کو بھی شامل کرلیں تو اور بہتر ہے"

مگر اسکول سے نکالا جانا ان کے کام کے لئے مفید ثابت ہوا۔ کچھ لوگوں نے تو انھیں ان کے کام کی وجہ سے جانا۔ اور کچھ لوگوں کے کانوں میں ان کے نکالے جانے کے بعد ان کا نام پڑا۔

اب اری صاحب کے پاس ان لوگوں کی آمدورفت بھی شروع ہوگئی۔ ان میں اسکولوں کے استاد، جرنلسٹ یعنی اخبار نویس، وکیل، اسمبلی کے نمائندے غرض سبھی طرح کے لوگ تھے۔ یہ لوگ اری کی تحریک کے بارے میں سوال کرتے تھے اور اری ان لوگوں کو اپنا نصب العین اپنا مقصد سمجھاتے تھے۔

آپ جانئے چھوٹے سے ملک میں چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بڑے لوگوں کے کانوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ ان کے اسکول سے نکالے جانے کی بات سیلون کی رحم دل خاتون اور وزیر اعظم مسز بندرا نائک تک پہنچی۔ انھیں احساس ہوا کہ ایک نیک عنتا کے ہمدرد اور مخلص کارکن کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ انھوں نے فوراً ان کی دوبارہ تقرری کے احکام جاری کر دیئے۔ اس طرح ان کے اچھے کاموں کا سرٹیفکیٹ وقت کی حکومت کی طرف سے مل گیا۔

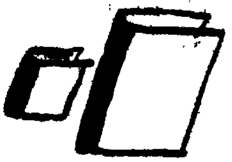
اور مسز بندرا نائک نے وزیر اعظم کی حیثیت سے ان کے کام میں مداخلت کی تو ان کے کارنامے کی اور بھی شہرت ہوئی۔ اب ایک تو وہ اپنی نوکری پر بحال ہوگئے۔ دوسرے اخباروں نے ان کے کام کے بارے میں خوب خوب مضمون لکھے۔ اری نے بھی محسوس کیا کہ خدا نے ان کی کوششوں کو قبولیت کی نظر سے دیکھا ہے۔

اس شہرت کے بعد تو یہ عالم ہوگیا کہ ملک کے ہر حصے سے خطوں کا تانتا بندھ گیا۔ لوگ ان سے درخواستیں کرنے لگے کہ انھیں اپنے اس نیک کام میں بلا اجرت بلا معاوضہ شریک ہونے کا موقع دیں۔ خط بھیجنے والوں میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ مثلاً رضا کار یونیورسٹی کے طالب علم نوجوان، ملازمت پیشہ وغیرہ اور تو اور ان لوگوں نے بھی اپنی خدمات پیش کیں جو بیروزگاری کا شکار تھے۔

دوسری طرف دیہات کے غریب لوگوں کو جب پتہ چلا کہ دنیا میں کوئی ایسا آدمی ہے۔ جسے ان سے ہمدردی ہے۔ اور ان کی زندگی کی دشواریوں اور مصیبتوں، پریشانیوں کو دور کرنا جس نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔ تو یہ بھی چار طرف سے اپنی مدد کے لئے خط بھیجنے لگے۔ اری صاحب اپنے دوستوں سے کہتے تھے۔ نیک کام کرنے کے شوقین موقع کی تلاش میں اور مدد چاہنے والے کام کرنے والوں کے انتظار میں ہیں۔ اب کام بس اشارہ جاتا ہے کہ دونوں کے درمیان رابطہ قائم ہو جائے۔

(باقی)

پروفیسر آفاق احمد





کتابوں کی باتیں

جانتے ہو دنیا کے سارے انسانوں کو قریب لانے میں جہاں دوسری ایجادوں کا بڑا ہاتھ ہے وہاں کتابوں کا بھی کچھ کم احسان نہیں ہے۔ یہ کتابیں ہی ہیں جو گھر بیٹھے ہمیں ساری دنیا کی سیر کرا دیتی ہیں۔

کتابیں ہر زبان میں ہوتی ہیں اور جو جس زبان کو جانتا ہے وہ اسی زبان میں انہیں پڑھتا ہے اور مزے لیتا ہے۔ بہت سے لوگ ایک سے زیادہ زبانیں بھی جانتے ہیں اُن کے بڑے ٹھاٹ ہیں۔ اپنی زبان میں تو جو کچھ پڑھا وہ تو پڑھا ہی دوسری زبان میں بھی جو لکھا ہے اسے بھی پڑھ ڈالا۔ گویا انھوں نے دوسروں سے زیادہ دنیا دیکھ لی۔

دیکھو اب جو بار بار دنیا کی بات آئی ہے تو ہمیں اردو میں لکھی ایک کتاب یاد آرہی ہے۔ اس کا نام ہے "ہماری آباد دنیا" اسے فصاحت حسین صاحب نے لکھا ہے اور دنیا کی ہر چیز کے بارے میں بتا دیا ہے جانداروں کے بارے میں۔ بے جانوں کے بارے میں پودوں کے بارے میں۔ جانوروں۔ کیڑوں مکوڑوں پرندوں، مچھلیوں، کسی کو بھی تو نہیں چھوڑا۔ اس کتاب کو پڑھنے سے ہمیں ایک مزے کی بات کا پتہ چلا۔ تم کہوگے صاحب یہ کیا خود غرضی ہے۔ اکیلے اکیلے آپ نے پتہ چلا لیا ہمیں نہیں بتا رہے ہیں۔ نہیں بھئی ایسا نہیں ہے۔ تمھیں بھی بتائیں گے۔ سنو!

اس میں لکھا ہے کہ بعض پودے ایسے ہوتے ہیں جو کیڑوں مکوڑوں کو کھاتے ہیں۔ کیوں ہے نا حیرانی کی بات۔ مگر ہے سچ! ایسے پودوں میں سے ایک کا نام ہے (SUN DEW PLANT) (سن ڈیو پلانٹ) یہ پودا مکھیوں اور کیڑوں مکوڑوں کو پکڑ کر انھیں کھاتا ہے۔ اس کی پتیاں خوب بڑی بڑی اور پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہر پتی پر لگ بھگ دو سو بال ہوتے ہیں۔ اور ہر بال کی نوک پر اوس یا بوند کی طرح ایک قطرہ یا بوند ہوتی ہے۔ یہ بوند بال کی نوک پر اس طرح ہوتی ہے جیسے پتی پر شبنم۔ اسی لئے اسے سن ڈیو کہتے ہیں۔ جوں ہی کوئی مکھی یا کیڑا لالچ میں آکر پتی پر بیٹھتا ہے۔ بال اسے جکڑ لیتے ہیں۔ اور پودے صاحب اپنی پتی کو بند کر لیتے ہیں اور اس کا عرق پیتے ہیں۔ جب عرق ختم ہو جاتا ہے تو پتی کھل جاتی ہے اور پھر سے شکار کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ پرتگال میں کسان اسے گھروں میں اگاتے ہیں تاکہ مکھیوں اور کیڑوں سے چھٹکارا ملے۔

اسی طرح کتابوں سے ہمیں ساری دنیا کی معلومات اور گیان حاصل ہوتا ہے۔ اتنا ہی نہیں کتابوں میں قصے کہانیاں بھی تو ہوتی ہیں۔ انھیں پڑھ کر ہم صرف لطف ہی نہیں لیتے، ان سے نصیحت بھی ملتی ہے۔ اچھے کام کرنے کا حوصلہ بھی ملتا ہے۔ اور ہمارا دل بہلتا ہے وہ الگ۔ گویا آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ کیوں؟ کہانی کا نام سن کر تمھارے منہ میں پانی آیا ہے یا آم کا نام سن کر۔ اچھا دونوں کا ہی نام سن کر۔"

ٹھیک ہے آم کے ساتھ مرزا غالب کا نام بھی ضرور یاد آیا ہوگا۔ انھیں آم بہت پسند تھے کسی نے پوچھا۔

" مرزا صاحب بتائیے۔ آم کی تعریف کیا ہے ۔"

کہنے لگے۔

" بھئی میٹھے ہوں اور بہت سے ہوں۔ "

" ہاں۔ یوں تو اردو میں مرزا صاحب پر بہت سی کتابیں ہیں۔ بلکہ دنیا کی بہت سی زبانوں میں ہیں۔ لیکن بچوں کے لئے دو کتابیں خاص ہیں۔

ایک بچوں کے ماموں جان محمد حسین حسان ندوی صاحب کی ہے۔ تم کہو گے نام جب اتنا مشکل ہے تو ماموں جان خود کتنا مشکل لکھتے ہوں گے۔ ارے نہیں، ایسا نہیں ہے۔ تمھارے ماموں جان ندوی صاحب بہت برسوں سے بچوں کے لئے لکھ رہے ہیں۔ بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ بڑا پیارا رسالہ "پیام تعلیم" نکالتے ہیں اور انھیں بچے چاہتے بھی بہت ہیں۔ ان کی غالب پر کتاب کا نام ہے "چچا غالب" اس میں انھوں نے غالب پر، ان کی زندگی پر، ان کی شاعری، ان کے لطیفوں، سب پر مضمون جمع کئے ہیں۔ گویا ان کی مرتب کی ہوئی یہ کتاب کیا پڑھی سمجھو پورا غالب سمجھ میں آگیا۔

ویسے ندوی صاحب نے ایک کتاب "دنیا کے بچے" بھی لکھی ہے۔ بیسیوں بار چھپ چکی ہے۔ بس یہ کتابیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

دوسری کتاب لکھی ہے بچوں کے چچا جان شفیع الدین صاحب نیر نے۔ "غالب کی کہانی" اس میں بھی غالب کی ہر چیز پر بڑے پیارے انداز میں نیر صاحب نے روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر ذاکر حسین کی فرمائش پر نیر صاحب نے لکھی ہے اور اسے ذاکر صاحب نے اپنے بہت پسند کیا تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو تو تم سب جانتے ہی ہو۔ انھیں اس سے بڑی دلچسپی تھی کہ ہر زبان میں بچوں کے لئے کتابیں لکھی جائیں خود انھوں نے بھی بچوں کے لئے ایک بڑی پیاری کتاب لکھی ہے۔ اس کا نام ہے ابو خاں کی بکری۔ اس میں سب ملا کر ۵ کہانیاں ہیں۔ ہر کہانی اپنی جگہ دلچسپ ہے اور اسے پڑھ کر کوئی نہ کوئی اچھی نصیحت ضرور ملتی ہے۔ پھر مزا یہ ہے کہ ایک دفعہ کوئی بچہ اسے پڑھنا شروع کر دے۔ تو جب تک ختم نہ ہو جائے ہاتھ سے نہ رکھے گا۔ "مرغی اچھی چلی" "آؤ گھر گھر کھیلیں۔" "جولاہا اور بنیا۔" "کا تو کیا کہنا۔ ایک کہانی "آخری قدم" بھی ہے۔ اس میں ایک ایسے آدمی کا قصہ ہے جو بڑا اچھا ہے۔ خود برا کھاتا، برا پہنتا مگر دوسروں کی مدد کرتا۔ لیکن جن کی وہ مدد کرتا صرف وہی جانتے تھے کیوں کہ یہ نیکی اور بھلائی وہ سب سے چھپ کر کرتا تھا۔ لوگ اسے کنجوس مکھی چوس کہتے تھے۔ مگر یہ تو کوئی ان سے پوچھے کہ وہ کتنا نیک اور بھلا تھا۔ جن کی اس نے مدد کی

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

اِدھر اُدھر سے

میونخ کے اولمپک کھیلوں کے آخری نتیجے

میونخ کے اولمپک کھیلوں کا شاندار میلا ۱۱ ستمبر کو ختم ہوگیا اس میلے کے لیے میونخ میں برسوں سے تیاری ہو رہی تھی۔ امید کے مطابق کھیلوں کا یہ سب سے بڑا عالمی میلا بہت شان و شوکت سے منعقد ہوا۔ ۱۶ - ۱۷ دن خوب گہما گہمی خوب ہما ہمی رہی بس دو تین باتیں کچھ ایسی ویسی ہوگئیں، بالکل انوکھی، اولمپک کھیلوں کی تاریخ میں پہلی بار، ایک تو جنوبی امریکہ کو اولمپک کھیلوں میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ملی۔ دوسری بات اس سے بھی بدنما ہوئی۔ فلسطین کے گوریلا مجاہدوں نے اچانک چند یہودی کھلاڑیوں کو یرغمال کے طور پر پکڑ لیا۔ اور کچھ ایسا ہوا کہ یہ یہودی کھلاڑی اور کئی گوریلا مجاہد موت کا نشانہ بن گئے۔ تیسری بات یہ کہ پاکستان کی ہاکی ٹیم فائنل میں مغربی جرمنی سے ہار گئی۔ ہارنے کے بعد اس نے کچھ نامناسب باتیں کیں اور اولمپک کے کرتا دھرتا لوگوں نے فیصلہ کیا کہ پاکستان کی موجودہ ہاکی ٹیم کے کھلاڑیوں کو آئندہ اولمپک کھیلوں میں حصہ لینے کی اجازت نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ آئندہ چار سال کے لیے ان کا داخلہ اولمپک کھیلوں میں ممنوع قرار دیا گیا یعنی وہ چار سال بعد ہونے والے اولمپک کھیلوں میں حصہ نہ لے سکیں گے۔

اس مرتبہ اولمپک میں امریکہ کے ایک کھلاڑی نے سونے کے تمغے حاصل کرنے کا ریکارڈ توڑ دیا۔ اب تک اولمپک کھیلوں میں ایک کھلاڑی زیادہ سے زیادہ پانچ تمغے حاصل کر سکا تھا۔ اس کھلاڑی نے اس مرتبہ سونے کے سات تمغے حاصل کیے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ تمغے جیتنے کی دوڑ میں روس نے امریکہ کو پیچھے چھوڑ دیا۔ روس کو سونے کے پچاس میڈل ملے ہیں۔ امریکہ کو صرف ۳۳۔ گویا ۱۷ تمغوں کا فرق ہے۔ مشرقی جرمنی (۲۰) اور مغربی جرمنی (۱۳) کو ملا کر کل ۳۳ ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ امریکہ کے برابر ہوگیا۔ مغربی جرمنی نے ہاکی کے کھیل میں پاکستان کو ہرا کر پہلی بار اس کھیل میں چمپئن ہونے کی عزت حاصل کی ہے یوں بھی یورپ کا یہ پہلا ملک ہے جس نے اس کھیل میں یہ شاندار کامیابی حاصل کی ہے۔

نیچے ہم تمغے جیتنے والوں کے نام دیتے ہیں۔ ان میں پہلا دوسرا تیسرا یعنی سونے، چاندی کانسے کے تمغے یا میڈل جیتنے والے سبھی ملکوں کے نام ہیں۔

نمبر شمار	نام ملک	سونے کا تمغہ	چاندی کا تمغہ	کانسے کا تمغہ	کل میزان
۱	روس	۵۰	۲۷	۲۲	۹۹
۲	امریکہ	۳۳	۳۱	۳۰	۹۴
۳	مشرقی جرمنی	۲۰	۲۳	۲۳	۶۶
۴	مغربی جرمنی	۱۳	۱۱	۱۶	۴۰
۵	جاپان	۱۳	۸	۸	۲۹
۶	آسٹریلیا	۸	۷	۲	۱۷
۷	پولینڈ	۷	۵	۱۰	۲۲
۸	ہنگری	۶	۱۳	۱۶	۳۵
۹	بلغاریہ	۶	۱۰	۵	۲۱

نمبر شمار	نام ملک	سونے کا تمغہ	چاندی کا تمغہ	کانسے کا تمغہ	کل میزان	نمبر شمار	نام ملک	سونے کا تمغہ	چاندی کا تمغہ	کانسے کا تمغہ	کل میزان
۱۰	اٹلی	۵	۳	۱۰	۱۸	۲۹	یونان	-	۲	-	۲
۱۱	سویڈن	۴	۶	۶	۱۶	۳۰	آسٹریلیا	-	۱	۲	۳
۱۲	برطانیہ	۴	۵	۹	۱۸	۳۱	کولمبیا	-	۱	۲	۳
۱۳	رومانیہ	۳	۶	۹	۱۸	۳۲	میکسیکو	-	۱	-	۱
۱۴	کیوبا	۳	۱	۴	۸	۳۳	پاکستان	-	۱	-	۱
۱۵	ہالینڈ	۳	۱	۱	۵	۳۴	ٹیونس	-	۱	-	۱
۱۶	فرانس	۲	۴	۷	۱۳	۳۵	ارجنٹائن	-	۱	-	۱
۱۷	چیکوسلواکیہ	۲	۴	۲	۸	۳۶	جنوبی کوریا	+	+	-	۱
۱۸	کینیا	۲	۳	۴	۹	۳۷	لبنان	-	۱	-	۱
۱۹	یوگوسلاویہ	۲	۱	۴	۷	۳۸	ترکی	-	۱	-	۱
۲۰	ناروے	۲	۱	۱	۴	۳۹	منگولیا	-	۱	-	۱
۲۱	شمالی کوریا	۱	۱	۳	۵	۴۰	برازیل	-	-	۲	۲
۲۲	نیوزی لینڈ	۱	۱	۱	۳	۴۱	ایتھوپیا	-	-	۲	۲
۲۳	یوگنڈا	۱	۱	-	۲	۴۲	اسپین	-	-	۲	۲
۲۴	ڈنمارک	۱	-	-	۱	۴۳	ہندوستان	-	-	۱	۱
۲۵	سوئٹزرلینڈ	-	۳	-	۳	۴۴	جمائیکا	-	-	۱	۱
۲۶	کناڈا	-	۲	۳	۵	۴۵	ناگر	-	-	۱	۱
۲۷	ایران	-	۲	۱	۳	۴۶	گھانا	-	-	۱	۱
۲۸	بلجیم	-	۲	-	۲	۴۷	نائجیریا	-	-	۱	۱

اعداد و شمار ہندوستان ٹائمز سے لیے گئے

جلدی کیجیے

آپ کا کہانی نمبر نومبر کے پہلے ہفتے میں شائع ہو جائے گا، یقیناً شائع ہو جائے گا۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ یہ نمبر کہانی نمبر ہے اور اس کی ہر کہانی ہر مضمون اتنا دلچسپ اتنا مزے دار ہے کہ انھیں پڑھ کر آپ کا جی خوش ہو جائے گا۔ دیکھیے اگر آپ اس کے خریدار نہیں ہیں تو جلدی کیجیے۔ کہانی نمبر کی قیمت ڈیڑھ روپے ہے مگر سالانہ خریداروں سے اس کی قیمت الگ سے نہیں لی جائے گی۔

PAYAM-I-TALEEM
NEW DELHI-25

برلی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)
۱۵۲۸ پٹودی ہاؤس، دریا گنج۔ دلی ۶

پیامِ تعلیم

(۱۱)

کہانی نمبر

مکتبہ جامعہ ملیہ نئی دہلی

ماہنامہ
پیامِ تعلیم
نئی دہلی ۲۵

(کہانی نمبر)

ایڈیٹر

جلد نمبر ۹ —— محمد حسین حسّان ندوی —— شمارہ ۱۱

نومبر ۱۹۷۲ء

صدر دفتر مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دلّی ۲۵

شاخ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ اُردو بازار دلّی ۶

شاخ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ ۲

قیمت کہانی نمبر ۱/۵۰ —— سالانہ چندہ چھ روپے —— فی پرچہ ۶۰ پیسے

فہرست مضامین (کہانی نمبر)

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے مکتبہ جامعہ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

بچوں سے باتیں

پیامیوں کو پیام تعلیم کی طرف سے میٹھی عید مبارک

لیجیے بھئی خدا خدا کرکے آپ کا کہانی نمبر آخر شائع
ہوگیا۔ آپ کو سچ مچ بہت ہی انتظار کرنا پڑا۔

اور اب اتنے انتظار کے بعد یہ نمبر آپ کے ہاتھوں
ں جا رہا ہے تو خدا کرے آپ کی امیدوں کے مطابق ہو۔
پ اس کی کہانیاں پڑھیں۔ مضمون پڑھیں۔ نظمیں پڑھیں
شوق سے، دل چسپی سے پڑھیں۔ یاد رکھیے آپ کی پسندیدگی
ی ہماری محنتوں کا سب سے بڑا صلہ ہے۔

اس عرصے میں پیام تعلیم کے دفتر میں خطوں کے ڈھیر
لگ گئے۔ بہت سے خطوں میں کہانی نمبر جلد سے جلد شائع
رنے کی مانگ تھی۔ بہت سے بچوں نے تاخیر کی یا اتنی دیر
ہو جانے کی وجہ پوچھی تھی۔ تو بھئی ایک وجہ تو میری بیماری
تھی اتفاق کی بات اس کا سلسلہ بہت دنوں تک رہا۔ پھر اس
رصے میں کاتبوں کی وجہ سے بڑی پریشانی رہی۔ اوّل تو
برڑ تو بہت سی کتابیں لکھوائی جا رہی تھیں بہت سے کا
سی کام میں لگے ہوئے تھے مجبوراً دلّی شہر کے کاتبوں سے
ہ کام کرایا گیا۔ اتفاق کی بات ان میں سے ایک صاحب
ادثے کا شکار ہوگئے۔ کہانی نمبر کے کئی مضمون لے گئے تھے
لیٔ جیسے بعد وطن سے لوٹے تو کچھ مضمون اور کہانیاں تو
مل گئیں باقی کھو گئیں

مگر ایک بات اور بھی تھی بہت اہم اور بنیادی بات
دن تو ہم جتنی اور جیسی کچھ کہانیاں دفتر میں آئی تھیں ان
سب کو چھاپ چھوپ آپ کے پاس بھیج دیتے۔ لیجیے صاحب
ہوگیا کہانی نمبر۔ پر بھئی ہم تو ایسی چیز شائع کرنا چاہتے تھے
جو پیام تعلیم کے معیار کے مطابق ہو اس میں دلچسپی ہی دلچسپی
نہ ہو کچھ ایسی باتیں بھی ہوں جو آپ کے لیے مفید ہوں کار آمد
ہوں یہ بھی طے کیا گیا کہ دوسرے ملکوں کی کہانیاں اپنے ہی
دیس کی مختلف زبانوں کی کہانیاں زیادہ سے زیادہ
جمع کی جائیں۔

یہ بات ہم نے طے کرنے کو تو کرلی۔ پر بھئی سچ جانو بڑی
پریشانی اٹھانا پڑی بہت دقت پیش آئی۔ نہ جانے کہاں
کہاں خط لکھے پر مشکل حل ہوتی نظر نہ آئی۔ پر ہم نے بھی ہمت
نہیں ہاری۔ کوشش اور تگ و دو کا سلسلہ جاری رہا آخر
ہمارے نئے پرانے ساتھیوں بزرگوں نے ہماری مدد کی اور
جیسے تیسے یہ مسئلہ تھوڑا بہت حل ہوگیا۔

اس سلسلے میں ہم حمید عثمانی صاحب (الہ آباد) اقبال
امروہوی صاحب (بمبئی) مناظر عاشق صاحب (ہرگانواں
بہار) عادل جعفری صاحب (اندور) کے خاص طور پر
احسان مند ہیں۔

اس میں سب سے بڑی رکاوٹ تو مختلف زبانیں جاننے
کی ہے۔ اپنے دیس کی زبانیں جاننے کی اور دوسرے ملکوں
کی زبانیں جاننے کی۔ اسی لیے ہمارے مددگاروں کو زیادہ تر
انگریزی زبان کا سہارا لینا پڑا۔

ہمیں سب سے زیادہ مدد عزیزی خلیق انجم سلمہٗ
سے ملی۔ عزیز موصوف نے باوجود حد سے زیادہ مصروفیت

کے۔ خود اپنے دیس کی زبانوں کی بہت سی کہانیاں مرحمت فرمائیں۔ یہ سبھی کہانیاں انگریزی سے لی گئی ہیں۔ ایک ہی مضمون نگار کی کئی کئی چیزیں شائع کرنا ہمیں پسند نہیں۔ ہم نے اس کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔ مگر اس وقت مجبوراً اس اصول میں لوچ پیدا کرنی پڑی۔ نہیں تو مختلف زبانوں کی اتنی کہانیاں آپ کو پڑھنے کو نہ ملتیں۔

ان کہانیوں کو فراہم کرنے کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ آپ کو دوسرے ملکوں اور اپنے دیس کی دوسری زبانوں کے بچوں کے ادب سے واقفیت ہو اور آپ کی نظر میں وسعت پیدا ہو۔ شکر ہے کہ اس مقصد میں ہمیں اچھی خاصی کامیابی ہوئی ہے۔

اور بھی ہم نے اسی پر بس نہیں کیا۔ کہانیوں کے سلسلے میں مضمون بھی لکھوائے ہیں۔ غلام حیدر صاحب کا مضمون "کہانی کی بات" پڑھ کر دیکھیے کتنا دلچسپ اور مفید ہے۔ اقبال ارشد صاحب نے اپنے مضمون "آؤ کہانی لکھیں" میں کہانی لکھنے کے گر بتائے ہیں۔ آپ بھی ان کی بتائی ہوئی باتیں، اشارے، پیش سامنے رکھ کر کہانی لکھنے کی کوشش تو کیجیے۔ خلیق انجم صاحب نے "بچوں کے مشہور کہانی کار" کے عنوان سے چند اچھے اور مشہور کہانی لکھنے والوں کا تھوڑا تھوڑا حال لکھا ہے۔ ان کا ایک مضمون "کہانی کار کی کہانی" افسوس ہے کہ شامل نہ ہو سکا اگلے پرچے میں پڑھیے گا۔

عام کہانیوں کے سلسلے میں محترمہ رضیہ سجاد ظہیر صاحبہ، محترم غلام ربانی صاحب، محترم سہیل عظیم آبادی صاحب، ناظم سیوانی صاحب۔ پروفیسر آفاق صاحب، شاہد عظیم صاحب، فرحت قمر صاحب نے خاص طور پر نوازش فرمائی۔ افسوس ہے کہ ناوک حمزہ پوری صاحب، خواجہ معین الدین صاحب، خاور جبل پوری صاحب، سلیم تمنائی صاحب کی اچھی اچھی کہانیاں اس نمبر میں شامل نہ ہو سکیں۔ وجہ وہی جگہ کی کمی۔ یہ بھی اگلے پرچوں کی زینت بنیں گی۔

اب رہی نظموں کی بات تو بھئی محترم شفیع الدین نیر، ڈاکٹر امانت، محترم حرمت الاکرام صاحب، جناب ناوک حمزہ پوری، جناب عبداللہ شرقی، جناب عبدالمتین نیاز کی اچھی اچھی نظمیں پڑھیے۔ کئی اور اچھی نظمیں جو ہم اس پرچے میں شامل نہ کر سکے اگلے پرچے میں چھپیں گی۔

ایک مضمون اور کچھ نظمیں اس سلسلے میں نہیں آتیں حاجی عبدالملک صاحب نے مدینہ منورہ سے "مکے مدینے کی عید" پر بہت ہی پیارا مضمون بھیجا ہے۔ کہانی نمبر آپ کو اس وقت ملے گا جب عید کی آمد آمد ہوگی۔ یہ مضمون اسی مناسبت سے شائع ہو رہا ہے۔ اسی کے ساتھ ایک نظم بھی ہے۔ ہمارے چاچا نہرو (پنڈت جواہر لال نہرو) نومبر میں پیدا ہوئے تھے محترم شفیع الدین نیر نے ان پر بڑی اچھی نظم مرحمت فرمائی ہے۔ وقت کی چیز ہے اس لیے شائع کی جا رہی ہے۔

غرض یہ خاص نمبر ہم طرح طرح کے پھولوں کا گلدستہ بنا کر آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ گلدستہ بڑی محنت سے تیار ہوا ہے۔ خدا کرے آپ کو پسند آئے اور ہماری دن رات کی محنت سوارت ہو۔

کیا آپ اس نمبر کے بارے میں اپنی رائے سے ہمیں ممنون فرمائیں گے؟

(باقی ص ۸۹ پر)

چھوٹے بچوں کے لیے

رانی کی مُرغی

محمد شفیع الدین نیّر

ایک تھا راجہ ایک تھی رانی رانی نے یہ دل میں ٹھانی
کوئی نئی سی چیز منگاؤں اُس سے اپنا دل بہلاؤں
لیکن ہو یہ چیز نرالی ہو نہ کسی کی دیکھی بھالی
چیزیں آتی اور جاتی تھیں لیکن اُس کو نہیں بھاتی تھیں
رانی جی کو چین نہ مِلتا
اُن کے مَن کا پھول نہ کِھلتا
اک دن اک سوداگر آیا ایک انوکھی مرغی لایا
مرغی تھی وہ پیاری پیاری روپ میں اپنے، نیاری نیاری
کیسی تھی وہ کیا کرتی تھی انڈا روز دیا کرتی تھی
انڈا بھی سونے کا انڈا پیلا پیلا، ٹھنڈا ٹھنڈا
ایسی نرالی ذات تھی اُس کی ایک نئی یہ بات تھی اُس کی
روز پری بن جاتی تھی وہ اپنا ناچ دکھاتی تھی وہ
چھئی چھم چھئی چھم چھک چھیّا
دھئی دھم دھئی دھم دھمک دھیا
رانی نے یہ مُرغی لے لی سوداگر کو قیمت دے دی
پھر اُس نے مُرغی کی خاطر بنوایا سونے کا اک گھر

مُرغی کُٹ کُٹ کرتی رہتی   ہاں بِلّی سے ڈرتی رہتی
بِلّی تھی اک راحب جی کی   رنگ برنگی موٹی موٹی
یُوں تو یہ بِلّی تھی بڑھیا   لیکن تھی آفت کی پڑیا
جادُو کے سے کام تھے اُس کے   ایک نہیں دو نام تھے اُس کے
چُنّی مُنّی کہلاتی تھی   رنگ پہ اپنے اتراتی تھی
سر پر رکھ کر پھول کی تھالی   اُڑتی پھرتی ڈالی ڈالی
خوب بجا لیتی تھی ڈھولک
ڈھم ڈھم ڈھم ڈھم ڈھمک ڈھمک
اک دن کا ہے ذکر ہوا کیا   بِلّی نے مُرغی کو دیکھا
دوڑی، دوڑ کے اُس کو پکڑا   پھر اپنے پنجوں میں جکڑا
جھٹ پٹ توڑا اور مروڑا   گوشت تو کیا اک پر بھی نہ چھوڑا
پَل بھر ہی میں کھا گئی اُس کو   دم بھر ہی میں چبا گئی اُس کو
کھا کر اُس کو جلدی جلدی   بِلّی اپنے رستے چل دی
یہ سُن کر رانی گھبرائی   گھر سے باہر دوڑی آئی
بِلّی کا مُرغی کو کھانا   اس پر رانی کا پچھتانا
رانی رو رو کر یُوں بولی   میری مُرغی! بھولی بھالی
آجا آجا، آجا آجا!   آجا میرا دل بہلا جا
اس پر جھٹ پٹ آئی مُرغی   رانی جی نے پائی مُرغی
چاند میں بیٹھی تارا رانی
اے لو بچو! ختم کہانی

جناب غلام حیدر

کہانی کی بات

کہانی بھی کیا چیز ہے! اس کا شوق انسان کو ہر عمر میں ہوتا ہے بچے اپنی نانی اماں، یا دادی اماں سے کہانی سنتے ہیں۔ ذرا کچھ بڑے ہوئے تو چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی کتابیں خود پڑھتے ہیں اور بڑے ہوئے تو یہ کہانیاں افسانوں میں بدل جاتی ہیں اور پھر آدمی بڑے بڑے ناول پڑھنے لگتا ہے۔ مگر کہانیاں پڑھنے یا سننے کا شوق کبھی نہیں جاتا۔

بہت سے بادشاہ تو اپنے دربار میں داستان گو یا کہانی کہنے والے رکھا کرتے تھے ان کا کام صرف مزے مزے کی چٹپٹی کہانیاں سنانا ہوتا۔ رات کو بغیر کہانی سنے سوتے ہی نہ تھے بالکل بچوں کی طرح، کہ جب تک ان کی امی انھیں ایک دو کہانیاں نہ سنا دیں انھیں نیند ہی نہیں آتی۔

ان بادشاہوں کے اس شوق سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ ان کہانیوں کی کتنی ہی اچھی اچھی کتابیں جمع ہو گئیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور کتاب کا نام تم نے ضرور سنا ہوگا "الف لیلہ" الف عربی میں ہزار کو کہتے ہیں۔ لیلہ رات کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہزار رات کے لیے تو اس میں کہانیاں موجود ہی ہیں۔ کہانیوں کا ایک سلسلہ تم نے خود پیام تعلیم میں بھی پڑھا تھا۔ "پنچ تنتر کی کہانیاں" تھیں نا کتنے مزے کی کہانیاں!

تم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ کہانی میں وہ کون سی چیز ہوتی ہے جو بچوں کو، جوانوں کو اور بڈھوں کو، غرض ہر ایک کو اپنی طرف لگا لیتی ہے۔ شاید یہ نئی نئی باتیں جاننے کا شوق ہے بھٹیک ہے لیکن اگر نئی نئی باتیں جاننے کا شوق ہی سب کچھ ہوتا۔ تو یہ تو اور بھی بہت سی باتوں سے پورا ہو سکتا ہے۔ نئی باتیں تو تمھیں ہر جماعت بلکہ ہر گھنٹہ میں بتائی جاتی ہیں۔

دیکھو بھائی سچ سچ بتانا۔ کیا تم اپنے کلاس میں ماسٹر صاحب کی ہر بات اتنے ہی شوق سے سنتے ہو جتنے شوق سے رات کو نانی اماں سے کہانی سنتے ہو؟ بس نانی اماں نے کہا "ایک بادشاہ تھا، ہمارا تمھارا خدا بادشاہ" اور تم سب کام چھوڑ ان سے لپٹ گئے۔

اب اگر وہ پان کھانے کے لیے بھی رکیں تو تم ان کا ناک میں دم کیے ہوئے ہو۔ "ہاں نانی اماں پھر کیا ہوا؟"

تو بھائی پھر اس نئی نئی باتیں سننے اور جاننے کے علاوہ بھی کوئی چیز ایسی ضرور ہے جس میں تمھارا دل لگتا ہے میرا خیال تو یہ ہے کہ اس میں اصلی مزہ کہانی سنانے والے کے انداز میں بھی چھپا ہوتا ہے۔ وہ کس طرح ایک ہی بات کو مزے لے لے کر نئے نئے لفظوں میں نئے نئے ڈھنگ سے کہتا ہے۔

وہ کہتا ہے "گھپ اندھیرا، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے ہوا کی سائیں سائیں جیسے ہر طرف سے سانپ پھنکاریں مار رہے ہوں۔ کہ ایک دم کسی طرف 'دھم' سے کسی کے کودنے کی آواز آئی ...."

اور تم ڈر کر کہانی کہنے والے سے لپٹ گئے۔ تمھیں لگتا ہے

جیسے تم ہی اس اندھیرے میں کھوئے ہوئے ہو۔

پھر کبھی وہ کہتا ہے کہ ہر طرف رنگین پھولوں کے تختے بچھے ہوئے۔ ایسی ہریالی کہ جس کی نرمی اور ہریالی دل تک پہنچ جائے وہ سامنے جھرنا گر رہا ہے پانی موتی بن بن کر پہاڑ سے ٹپک رہا ہے۔ پھولوں کی خوشبو ہے کہ ہر جگہ بسی ہوئی ہے۔ اور اس میں کہیں دور سے بانسری کی مدھم سی آواز کان میں پڑی ۔۔ تمھیں لگا کہ جیسے اتنی .. خوبصورت جگہ تم بھی تتلی بنے اڑتے پھر رہے ہو — میرا تو خیال یہ ہے کہ بات چاہے کچھ بھی ہو کہنے والا اس کو اپنے انداز سے ایسا بنا دیتا ہے کہ سننے والے کا دل کھینچ لیتا ہے۔ لیکن پھر وہی بات کہ اگر تمھیں کہانی کی ساری باتیں معلوم ہوں اور ہر بات کے سننے سے پہلے ہی تمھیں یاد آنے لگے کہ آگے کیا ہوگا تو کیا تم اتنے ہی مزے سے کہانی سنوگے جیسے کوئی بالکل نئی کہانی سنتے ہو؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کہانی میں نئی باتیں بھی ہونی ضروری ہیں۔ وہ باتیں جو تمھیں معلوم نہ ہوں اور ان کے ساتھ ہی ان کو سنانے کا ڈھنگ بھی اتنا اچھا ہو کہ تمھارا دل لگا رہے۔ کہانی میں تب ہی مزہ آئے گا۔

پھر کہانی سنانے والا ہر بات کو سیدھی طرح ایک ساتھ ہی بیان نہیں کر دیتا کبھی کبھی وہ کچھ باتوں کو تھوڑی دیر کے لیے چھپا لیتا ہے کچھ دیر بعد بتانے کے لیے۔ اور تم ہو کہ تڑپتے رہتے ہو۔

ایک غریب آدمی کو کسی نے بتایا کہ فلاں فلاں جنگل میں ایک بڑے سے درخت کے جڑ میں ایک خط رکھا ہے اگر وہ اس خط کو پڑھ لے تو اسے ایک دم امیر ہو جانے کی ترکیب مل جائےگی۔ اب کہانی سنانے والا ہے کہ پہلے اس کی غریبی کا حال سنا رہا ہے پھر اپنے بیوی بچوں سے مل کر سفر پہ جانے کا حال سنا رہا ہے۔ پھر سفر کا حال آیا اس میں ہر روز نئے خطرے اور پریشانیاں سامنے آ رہی ہیں — اور تم تڑپ رہے ہو کہ کب وہ غریب خط پڑھتا ہے اور امیر آدمی بنتا ہے۔ لیجیے وہ پہنچ گیا اس درخت تک۔ اب جو اس نے خط نکالا تو کسی ایسی زبان میں نکلا جو اسے آتی ہی نہ تھی۔ لیجئے اب آپ کا شوق اور بڑھا۔ اب اگر کہانی کہنے والے کا انداز چنچل نہیں ہے۔ تو سننے والا اس گورکھ دھندے سے تھک جائےگا۔ اور کہانی میں دلچسپی نہیں رہے گی۔

تو ہماری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ کہانی میں جب تک تین باتیں نہ ہوں اس میں مزہ نہیں آتا۔ پہلی بات یہ کہ کہنے والا کہانی مزے دار اور چٹپٹے انداز میں سنائے، دوسری بات یہ کہ کہانی میں سننے کو کوئی نئی بات ضرور ہو اور تیسری بات یہ کہ اس کو اس طرح کہا جائے کہ اس کی آخری بات ایک دم بتلائی بھی نہ جائے اور سننے والا اتنا تھک بھی نہ جائے کہ اس کا دل ہی کہانی سے اچاٹ ہو جائے۔

اچھا اب جب تم کبھی کہانی لکھنے کی کوشش کرو تو ان تینوں باتوں کا خیال رکھنا، پھر دیکھنا کہ کتنے مزے کی کہانی تم لکھ سکتے ہو۔

اب تم کہو گے کہ ہر کہانی ہر آدمی کو تو ایک سی پسند نہیں آتی میاں بھائی یہ بات تو ٹھیک کہی تم نے، پھر یہی بات نہیں، عمر بدلنے کے ساتھ ساتھ کہانی کا مزہ بھی بدلنے لگتا ہے۔ بچپن میں جو کہانیاں اچھی لگتی ہیں وہ بڑے ہو کر اتنی اچھی نہیں لگتیں، پھر اور بڑے ہو کر شوق اور بھی بدل جاتا ہے۔ اچھا تمھیں یاد ہے تم نے سب سے پہلی کون سی کہانی سنی تھی؟ بھائی ہمیں تو یاد ہے۔ صحیح تو نہیں بتا سکتے مگر شاید زیادہ سے زیادہ دو یا تین سال کی عمر ہو گی ہماری۔ ایک چڑیا تھی ایک چڑا تھا۔ چڑیا لائی دال کا دانہ، چڑا لایا

چاول کا دانہ دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی... اب میں پوری کہانی کیا دہراؤں تم نے خود بہت سنی ہوگی۔ اور اگر نہیں سنی تو اپنے گھر میں امّی سے یا نانی اماں سے سن لو، انھیں ضرور یاد۔ ہوگی

اب ایسا وقت بھی آیا جب مجھے خود کہانی سنانی پڑی اور یہ ابھی چند ہی دنوں کی بات ہے جب یاد کرنے کی.. کوشش کی تو پتہ چلا کہ اب بچوں کی کوئی ایسی کہانی یاد نہیں جو میں خود اپنے بچوں کو سنا دوں۔

ایسی بات نہیں کہ میں کہانیاں نہیں پڑھتا! خوب پڑھتا ہوں، مگر میں نے کہا نا کہ اب بچوں کی کہانیوں کی بجائے بڑوں کی کہانیوں میں مزہ آتا ہے اب سب سے پہلے میں تمھیں وہ کہانی سناؤں جو مجھے اپنے ڈھائی سال کے بچے کو سنانی پڑی۔ میں جانتا ہوں تمھیں اس میں خاک مزہ نہیں آئے گا مجھے خود بھی یقین نہیں تھا سناتے وقت کہ ڈھائی سال کے بچے کو کوئی کہانی پسند آئے گی۔ یا یوں کہوں کہ میں اس کی پسند کی کہانی بنا بھی سکوں گا یا نہیں

بات یہ تھی میرا بچہ بیماری کے بعد ذرا چڑچڑا ہو گیا تھا۔ بات بات پر روتا تھا، زمین پر لیٹ جاتا تھا اور بہت سی گندی باتیں کرتا تھا۔

خیر تو میں وہ چھوٹی سی کہانی تمھیں بھی سنا دوں

ایک بچہ تھا شمو اور ایک تھا مٹو۔ شمو بہت اچھا بچہ تھا۔ صبح سویرے اٹھ جاتا۔ سب کو سلام کرتا پھر ابا سے کہتا۔ ابا میرا منہ دھلا دیجئے۔ پھر وہ سب کے ساتھ ناشتہ کرتا۔ شمو اتنا اچھا بچہ تھا کہ کھانے وقت تو کبھی روتا ہی نہیں تھا۔ گھر کے اور پڑوس کے سارے لوگ شمو کو خوب پیار کرتے

کہانی کے اس ٹکڑے میں گھر کے ہر آدمی کے نام ضرور لیے جاتے۔ ناشتے میں ہر مزے کی چیز کا ذکر ہوتا۔ انڈا دلیا، مٹھائی، پراٹھا، غرض مزے دار چیزوں کو چٹخارے لے لے کر بیان کیا جاتا۔

اس کے ابا جان نے ایک دن اپنے دفتر سے آتے ہوئے سوچا کہ کیوں نہ شمو کے لیے کوئی چیز لے جائیں۔ ابا جان مٹھائی والے کی دکان پر گئے اور کہا "بھائی ہمیں کچھ چیز دے دو۔" دکان دار نے پوچھا کس کے لیے؟ ابا جان نے کہا ہمارے بیٹے شمو کے لیے۔ دکان دار بولا۔ شمو تو اچھا بچہ ہے۔

پھر اس نے ایک بہت بڑا سا ڈبا لیا۔ اور اس میں برفی، لڈو پیڑا، امرتی، گلاب جامن، بالوشاہی، ٹافی، بسکٹ، اور بہت سے پھل رکھ دیئے۔ ابا وہ ڈبا لے کر گھر آگئے۔ اور اسے شمو کو دے دیا۔ اب جو شمو نے دیکھا تو اس ڈبے میں لڈو، پیڑا برفی..... رکھے تھے۔ وہ تو بہت خوش ہوا۔ اس نے بہت سی مٹھائی خود کھائی اور بہت سی سب کو بانٹی۔

اس ٹکڑے کا سارا مزہ مٹھائی کے نام گنانے میں ہے۔ خوب مزے لے لے کر مٹھائیوں کے نام گنائے جیسے بس انھیں کھا ہی رہے ہوں۔

اور میاں وہ جو گندہ بچہ "مٹو" تھا نا، وہ تو ہر بات پر روتا تھا۔ زمین پر لیٹ لیٹ جاتا تھا۔ نل کھول کر پانی میں.. گھس جاتا۔ کپڑے گیلے کر لیتا۔ اپنی منی بہن کو مارتا۔ اور ہر وقت گندی باتیں کرتا۔

یہاں میں نے اس گندے بچے کی ایسی تصویر کھینچی کہ بچے کو اپنی ساری باتیں یاد آ گئیں۔

ایک دن مٹو کے ابا نے بھی سوچا کہ میں مٹو کے لیے کچھ لے جاؤں۔ جب مٹھائی والے کے پاس پہنچے تو اس نے پوچھا، آپ کو کس کے لیے مٹھائی چاہیئے؟

ابا نے کہا۔ اپنے بچے کے لیے۔ اس نے کہا آپ کے بچے

کا نام تو مٹو ہے نا؟ ابا نے کہا "ہاں" ۔ اور مٹھائی والے نے ایک بڑا سا ڈبا دے دیا۔ جیسے ہی ابا گھر میں آئے، مٹو نے جھپٹ کر ڈبا ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ ابا نے کہا۔ بیٹے اس میں سے سب کو دینا۔ مگر مٹو خود اُڑ رونے لگا۔ نہیں ہم نہیں دیں گے۔ ہم تو ساری مٹھائی کھائیں گے،

مٹو سوچ رہا تھا، اس میں لڈو ہوں گے، پیڑے ہوں گے، برفی ہو گی، گلابی جامن ہو گی اور بھی ٹافیاں نکلیں گی، مگر بس اس نے ڈبا کھولا ہی تھا کہ اس میں سے ایک مینڈھک نکل کر اس کے سر پر آ گیا۔ ڈبا مٹو کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ ارے! اس میں تو بہت سے پتھر، مٹی، کوڑا، گندے گندے کاغذ بھرے ہوئے تھے اور سب سے اوپر ایک بڑا سا ڈھنڈار رکھا ہوا تھا۔

اس کہانی میں تو اور بھی بہت کچھ تھا۔ پھر مٹو بھی اچھا بچہ ہو گیا۔ اس کے ابا ایک دن پھر ڈبا لائے جس میں اب کی بار سچ مچ کی مٹھائیاں، ٹافی اور بسکٹ رکھے تھے۔

میں کیا بتاؤں اس کہانی کا اس پر کتنا اثر ہوا۔ اس وقت تو خیر سنی ہی تھی کہانی اس نے بڑے شوق سے، مگر میں نے اگلی صبح دیکھا کہ میاں لپو دسے جا جا کر اچھی باتیں کر رہے تھے۔ رونے کی بات ہوتی بھی ہے تو روتے نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ اثر شام تک بہت کم رہ گیا اور مجھ پر مٹھائی لانے کی مانگ لاد دی گئی۔ خیر یہ تو تھی وہ کہانی جس میں صرف کہانی کہنے کا ڈھنگ ہی کام میں لایا گیا تھا۔ اب میں تمہیں ایسی کہانی سناؤں جس میں کہنے کے ڈھنگ کے علاوہ بھی بہت کچھ اور بات موجود تھی۔ یہ کہانی میں نے اپنے پانچ سال سے بھی کم عمر کے بچے کو سنائی تھی۔

ایک جنگل تھا۔ اس میں ایک شیر اور ایک بندر رہتے تھے اور بھی بہت سے جانور وہاں رہتے تھے۔ گھوڑے، گدھے، اونٹ، ہاتھی، سکٹے، بلی، توتا، مینا، کبوتر، کچھو، گلہری، چوہا، لومڑی، بھیڑیا، گائے، بھینس، بیل، بھیڑ، بکری اور نہ جانے کون کون۔

تم جانتے ہی ہو کہ شیر جنگل کا راجا ہوتا ہے۔ جنگل کا ہر جانور اس کا حکم مانتا ہے۔ مگر اس شیر کو تو بہت ہی غصہ آتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر جانوروں سے بگڑ بیٹھتا۔ سارے جانور اس سے بری طرح ڈرتے تھے۔ اس کی آواز بھی سن لیتے تو تھر تھر کانپنے لگتے۔

اور وہ بندر جو اس جنگل میں رہتا تھا، تھوڑا بڈھا تو ضرور ہو گیا تھا مگر تھا بڑا اچھا بندر، سب کو اچھی اچھی باتیں بتاتا۔ جب کوئی جانور بیمار ہو جاتا تو یہ اسے دیکھنے جاتا۔ اس کے لیے دوا لا کر دیتا اور جنگل کے سارے جانوروں کے بچوں کو جمع کر کے انھیں اچھے اچھے کھیل کھلاتا۔ اور کہانیاں سناتا۔

آہستہ آہستہ بہت سے جانور اس بندر کے پاس جانے لگے۔ ہر روز شام کو اس کے گھر کے پاس بھیڑ لگ جاتی۔ وہ کسی درخت کے ٹھنٹھ پر بیٹھ جاتا۔ سارے جانور اس کے چاروں طرف جمع ہو جاتے۔ اور وہ سب کو اچھی اچھی باتیں بتاتا رہتا۔

اور بھائی لومڑی تو مکار ہوتی ہی ہے۔ پھر وہ کیسے بندر کے پاس اتنے بہت سے جانوروں کا آنا جانا دیکھ سکتی تھی۔ اسے یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی۔

ایک دن وہ شیر کے پاس پہنچی اور اسے جھک کر سلام کیا

شیر نے پوچھا۔ کیا بات ہے بھابی لومڑی؟"

تو لومڑی نے کہا "حضور مجھے آپ سے بہت ڈر لگتا ہے

اگر آپ کو میری کوئی بات اچھی نہ لگی اور غصہ آگیا تو آپ مجھے ایک جھپٹے میں مار ڈالیں گے۔"

شیر نے کہا: "نہیں اس وقت ہمیں غصہ نہیں آرہا ہے۔ تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو کہو۔"

لومڑی نے ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور وہ جو بندر ہے نا جو جامن کے درخت پر رہتا ہے۔ وہ بہت خراب ہوگیا ہے۔ ہر روز جنگل کے سارے جانور اس کے پاس جاتے ہیں اور وہ بہت دیر تک انھیں کچھ سمجھاتا رہتا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ وہ جنگل کا راجہ بننا چاہتا ہے۔ اسی لیے وہ اتنے بہت سے جانور جمع کر رہا ہے۔ ایک دن وہ ان سب جانوروں کے ساتھ آپ سے لڑنے آئے گا۔ اور آپ کو مار کر جنگل کا راجہ خود بن جائے گا۔"

بس اتنا سننا تھا کہ شیر غصّے سے پاگل ہوگیا۔ وہ مارے غصے کے اپنے پنجے زور زور سے زمین پر پٹخنے لگا۔ پھر وہ بڑے زور سے چیخا، اس کی آواز غصے کے مارے بھرّا گئی تھی۔ "میں جنگل کا راجہ ہوں۔ میں بندر کو راجہ کبھی نہیں بننے دوں گا۔ میں بندر کو مار ڈالوں گا۔"

شیر۔ "میں جنگل کا راجہ ہوں، میں بندر کو راجہ کبھی نہیں بننے دونگا، میں بندر کو مار ڈالوں گا۔۔۔" چیختا ہوا جامن کے پیڑ کی طرف چلا۔ ایک خرگوش نے جو شیر کی یہ آواز سُنی تو وہ فوراً سمجھ گیا۔ اور تم جانتے ہی ہو خرگوش بہت تیز بھاگتا ہے۔

بس ایک منٹ میں وہ بندر کے پاس پہنچ گیا اور اس نے بندر کو بتایا۔ شیر بہت غصے میں ادھر آرہا ہے اس کی آواز غصے کے مارے بھرّا رہی ہے "میں جنگل کا راجہ ہوں، میں بندر کو راجہ کبھی نہیں بننے دوں گا۔ میں بندر کو مار ڈالوں گا۔"

یہ سن کر بندر نے جواب دیا۔ "مگر میں تو جنگل کا راجہ کبھی نہیں بننا چاہتا۔ میں شیر کو یہ بات بتا دوں گا۔ پھر وہ مجھے کیوں مارے گا۔" بندر کو بہت سے جانوروں نے سمجھایا۔ کہ شیر کو بہت غصہ آتا ہے۔ اور جب وہ غصے میں ہوتا ہے تو وہ کسی کی کوئی بات نہیں سنتا۔ پہلے تو بندر نہ مانا لیکن جب جنگل کے کئی بوڑھے جانوروں نے سمجھایا تو بندر نے ان کا کہنا مان لیا۔

اب سب نے مل کر یہ سوچنا شروع کیا کہ کس ترکیب سے بندر کی جان بھی بچائی جائے۔ اور شیر کو اس کی برائی کا مزہ بھی چکھایا جائے۔ یہ بات ایک چھوٹی سی چڑیا کی سمجھ میں آئی۔ جو روز ہی خالہ بلی کے حملوں سے بچ نکلتی تھی چھوٹی چڑیا نے کہا "دیکھو بھائی بندر تم جانتے ہو شیر بہت بھاری ہوتا ہے پھر غصے میں تو اس کا ویسے بھی برا حال ہوتا ہے اور تم بہت چست و چالاک بندر ہو تم چاہو تو ذرا سی دیر میں اسے تھکا سکتے ہو۔"

پھر وہ بندر کے کان میں تھوڑی دیر تک کچھ کھسر پھسر کرتی رہی۔ شاید اس لیے کہ بندر کی ترکیب کو کوئی جانور شیر کو نہ بتا دے اور پھر بی لومڑی بھی تو وہاں پہنچ گئی تھیں۔

بس اتنے میں شیر کے گرجنے اور دہاڑنے کی آواز آئی۔ اس کی آواز غصے میں کانپنے لگی تھی۔ "میں۔۔۔ جنگل کا راجہ ہوں۔۔۔ میں بندر کو راجہ کبھی نہیں بننے دوں گا میں بندر کو مار ڈالوں گا۔" اس کی آواز سنتے ہی مارے ڈر کے سارے جانور ادھر اُدھر بھاگ گئے، بس اکیلا بندر ایک پیڑ پر بیٹھا رہا۔

شیر بڑے زور سے دہاڑا "میں جنگل کا راجہ ہوں" اور اچھل کر پیڑ کی ایک موٹی سی شاخ پکڑ کر جھول گیا، لیکن

پیڑ بڑے زور سے ہلا اور وہ شاخ چرچرا کر ٹوٹ گئی۔ مگر بندر بہت تیز تھا وہ چھلانگ لگا کر دوسری شاخ پر کود گیا۔

شیر پھر غصے میں چیخا "میں بندر کو راجہ کبھی نہیں بننے دوں گا۔" اور اب اس شاخ کو پکڑ کر جھول گیا۔ وہ بھی چرچرا کر ٹوٹ گئی اور بندر نے ایک زور کی چھلانگ لگائی۔ اب وہ دوسرے پیڑ کی شاخ پر بیٹھا تھا۔ شیر بھی ہانپتا چیختا۔ غصے میں پاگل اس درخت کے نیچے پہنچا۔ اسی طرح اس کی بھی کئی شاخیں توڑ ڈالیں مگر اب بندر اگلے درخت پر تھا

شیر بالکل پاگلوں کی طرح ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ کے نیچے، اور پھر تیسرے پیڑ کے نیچے اور پھر چوتھے پیڑ کے نیچے ناچتا رہا، چیختا رہا "میں ...... جنگل کا ...... راجہ ہوں —— میں بندر کو ...... کبھی راجہ ...... نہیں بننے دوں گا ...... میں بندر کو ...... مار ڈالوں گا۔

اب اُسے غصے کے مارے نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ اور پھر بندر ایک ایسے پیڑ پر کود گیا جس کے نیچے ایک بہت گہرا گڈھا تھا۔ شیر نے بھی دور سے چھلانگ لگائی —— "میں جنگل کا راجہ —— " چ ...... ڑ ...... دھم! شیر بڑے زور کے دھماکے کے ساتھ گڈھے میں دھم سے گر پڑا۔ اس کے بہت سخت چوٹیں آئیں اور اب وہ نکل بھی نہیں سکتا تھا۔

اس دھماکے کی آواز سن کر سارے جانور جو ادھر اُدھر بھاگ گئے تھے اس گڈھے کے پاس آ گئے اور زخمی شیر کو دیکھنے لگے۔ شیر کی آنکھیں بند تھیں۔

سارے جانور یہی کہہ رہے تھے کہ اب اسے یہیں پڑا رہنے دیا جائے۔ یہیں پڑے پڑے یہ کچھ دن میں مر جائے گا۔ مگر بندر بہت رحم دل تھا۔ اس نے سب کو سمجھایا کہ اسے اپنی غلطی کی سزا خوب مل چکی ہے۔ اب اسے نکال لینا چاہیئے۔ اب یہ کبھی ایسی بات نہیں کرے گا۔

بندر کے بہت سمجھانے کے بعد جانور اسے نکالنے پر راضی تو ہو گئے۔ مگر شرط یہ تھی کہ شیر پہلے وعدہ کرے کہ اب وہ کسی کے کبھی بہکانے میں نہیں آئے گا۔ اب مشکل یہ تھی کہ یہ ساری بات اس سے جا کر کہے کون؟

شیر سے سارے جانور ڈرتے تھے۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ گڈھے میں اتر کر شیر سے یہ بات کہے۔ مگر بندر کو اس کا یقین تھا کہ اگر وہ شیر کو سمجھائے گا تو شیر ضرور اُس کی بات مان لے گا۔ بندر کو سب جانوروں نے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانا اور گڈھے میں کود گیا۔

بندر نے شیر سے کہا کہ میں جنگل کا راجہ کبھی نہیں بننا چاہتا۔ جنگل کا راجہ تو ہمیشہ شیر ہی رہے گا۔ یہ جانور تو کچھ باتیں سننے آ جاتے ہیں۔ میں انھیں ہمیشہ اچھی اچھی باتیں بتاتا ہوں۔

جب تھوڑی دیر بعد شیر کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ بندر بہت اچھا جانور ہے تو اس نے بندر سے کہا۔ اچھا بھائی اب مجھے اس گڈھے سے باہر نکالنے کی ترکیب کرو۔

بندر تھا بہت ہشیار جانور۔ اس نے سوچا کہ اگر کچھ اوپر سے زور لگایا جائے اور کچھ خود شیر زور کرے تو اسے نکالا جا سکتا ہے

تو بس اس نے نکل کر سارے جانوروں سے کہا کہ وہ جنگل میں سے ڈھونڈ کر مضبوط مضبوط اور لمبی لمبی بیلیں توڑ لائیں جنگلی بیلیں بہت مضبوط ہوتی ہیں۔ اور اگر انھیں رسّی کی طرح بٹ لیا جائے تو ان سے بہت ہی مضبوط رسی بن جاتی ہے۔ تھوڑی سی دیر میں بہت لمبی لمبی اور موٹی موٹی بیلیں جمع ہو گئیں اور شام تک کئی مضبوط رسّیاں تیار ہو گئیں۔

ندر ایک بار پھر گڈھے میں اترا۔ شیر کی بغلوں، کمر اور کئی .. ںگھوں پر رسی باندھ دی اور بس جنگل کے سارے جانور شیر ینچنے میں لگ گئے۔

"شاباش جانا، ہیئی سا زور لگا کے ہیئی سا" شاباش ہوا ہیئی سا کے نعروں سے جنگل گونج اٹھا۔ سب نے مل کر شیر وگڈھے سے باہر نکال لیا۔ شیر بہت خوش تھا۔ آج اس نے عدہ کرلیا کہ وہ کبھی کسی جانور پر غصہ نہیں کرے گا۔ اور بندر ے تو وہ بہت ہی خوش تھا۔ بس جس جانور سے سب جانور ور شیر ناراض تھے وہ بی لومڑی تھیں جنھوں نے یہ سارا جھگڑا ھڑا کیا تھا۔

اچھا بھائی تو سنی تم نے یہ کہانی۔ میں نے اسے سناتے رقت اس میں اور نمک مرچ لگایا تھا۔ اور میرے بچے کو بہت مزہ آیا تھا۔

بس اب تمھیں آخر میں ایک کہانی ایسی سناؤں جس کا اصل مزہ صرف تیزی سے سنانے میں ہے ایسا کرو کہ تم اسے یاد کرلو، پھر اگر تم اسے بغیر رکے کسی کو سناؤگے تو اسے ضرور ہنسی آئے گی۔

میرا خیال ہے کہ بچوں کو کبھی کبھی ایسی کہانیاں بھی پسند آتی ہیں جن میں مطلب تو کوئی خاص نہیں ہوتا مگر ان میں کچھ باتیں بہت جلدی جلدی یا بار بار کہی جاتی ہیں اور ان کو سننے میں بچوں کو بہت مزہ آتا ہے۔ خیر تو لو سنو کہانی اور جب یاد ہو جائے تو اس میں ہر ہر لفظ کو سوچنا کہ اس کے کیا معنی ہیں۔

"ایک تھی کہانی، کہانی کی بہن نہانی، نہانی کا بھتیجا لبسولا لبسولا نے بسائے تین گاؤں، ایک اوجڑ، ایک کھوجڑ، ایک بسا ہی نہ تھا۔ جو لبسا نہ تھا اس میں تھے تین کمہار۔ ایک لنگڑا، ایک لولا، ایک کے ہاتھ پیر ہی نہ تھے، جس کے ہاتھ پیر نہ تھے اس نے بنائیں تین ہنڈیا۔ ایک اوجھری، ایک جھوجری ایک کا پیندا ہی نہ تھا۔ جس کا پیندا نہ تھا اس میں پکے تین چاول۔ ایک اوٹڑا، ایک لوٹڑا، ایک گلا ہی نہ تھا۔ جو گلا نہ تھا اس کو کھانے کے لیے بلائے تین فقیر۔ ایک اٹک گیا، ایک بھٹک گیا۔ ایک آیا ہی نہ تھا۔ جو آیا نہ تھا اس کے لگائے تین ڈنڈے۔ ایک اوک گیا، ایک چوک گیا، ایک لگا ہی نہ تھا — چلو اچھا ہوا۔ کہانی ختم اور پیسہ ہضم۔

(بقیہ ستارے کہاں ص ۱۱)

گاؤں کے اس نوجوان گڈریے کی آنکھوں میں جب وہ الاؤ کے سامنے بیٹھ کر الغوزہ بجاتا ہے اور اس کی محبوبہ ناچتی ہے۔ یہاں کی سب سے بوڑھی کسان عورت کی آنکھوں میں، جب مستی میں ناچتی بالیوں کو دیکھ کر کہتی ہے "بالیاں پھر پک گئیں، نیا اناج آگیا۔

مجھے بھی دو۔ نہیں، بہت سے ستارے دمکتے دکھائی دیئے۔ اس لڑکے کی آنکھوں سے لے کر ان سب ازبیک لوگوں کی آنکھوں میں جن کے یہاں میں مہمان تھی۔ جو بڑے پیار سے کبھی مجھے اور کبھی اس لڑکے کو تک رہے تھے۔ وہ لڑکا جو شاید کبھی بہت بڑا افسانہ نگار بنے گا۔

رضیہ سجاد ظہیر

ستارے کہاں گئے؟

کوئی سات سال ہوئے ہیں۔ میں ایک ادبی کانفرنس میں مشرقی جرمنی گئی واپسی پر ماسکو اور تاشقند کا بھی پروگرام بھی بنا۔ آپ لوگوں کو معلوم ہوگا کہ تاشقند ازبکستان میں ہے۔ جو مشرقی روس کا حصہ ہے۔ بابر ازبکی تھا مرزا غالب بھی ازبکی تھے۔ ازبکی قوم کے لوگ مہمان نواز، محبت شعار اور شاعر مزاج ہوتے ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیاں بھی ادیبوں سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ اور ان سے ملنے کا شوق رکھتے ہیں۔

میں ایک بار ایک خاندان میں مہمان ہوئی۔ ان کے بچے بچیوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں افسانہ نگار ہوں تو مجھ سے کہانی کی فرمائش کی۔ جب میں سنا چکی تو ایک دس گیارہ سال کے لڑکے نے مجھے ایک کہانی سنائی جو اس نے اپنی ماں سے سنی تھی وہ تو چھوٹا سا تھا رک رک کر سناتا اور بیچ بیچ میں اپنی چمکیلی ذہین آنکھوں سے میری طرف دیکھتا جاتا۔ میں اور باقی پندرہ بیس لوگ جو وہاں تھے کہتے: "ہاں ہاں" "پھر کیا ہوا؟" تو وہ پھر سنانے لگتا۔

میں یہاں تمہیں وہ کہانی سناتی ہوں۔ تم دیکھو اس نے مجھے سنانے کے لئے کتنی پیاری کہانی چنی تھی۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ خدا کو خیال آیا کہ بیچارے فرشتے سارے وقت عبادت کرتے تھک بھی جاتے ہوں گے اور اکتا بھی جاتے ہوں گے ان کی تفریح کے لئے بھی کچھ ہونا چاہئے تو پھر خدا نے بڑے فرشتوں سے صلاح کی اور آخر میں یہ طے ہوا کہ فرشتے شام کو تھوڑی دیر کے لئے فٹ بال کھیلا کریں (تمہیں شاید معلوم ہوگا کہ روسی بچوں کو فٹ بال کا کھیل سب کھیلوں سے زیادہ پسند ہے) لیکن یہ بھی سوال تھا کہ فٹ بال آئے کہاں سے۔ آسمان پر تو فٹ بال بنتی نہیں۔ ایک عقلمند فرشتے نے یہ تجویز پیش کی کہ ستارے کی بنالی جائے۔ یہ تجویز خدا کو بہت پسند آئی اور پھر آسمان پر یہ اعلان کر دیا گیا کہ شام کو دن چھپنے سے پہلے گھنٹہ بھر فرشتے ستاروں سے فٹ بال کھیل سکتے ہیں۔ مگر رات کو کھیل بند کر دیا جائے کیوں کہ رات کو ستاروں کے لئے آسمان پر اپنی جگہ حاضری دینی ہوتی ہے تاکہ دنیا میں اندھیرا نہ ہو جائے۔"

سب فرشتے بہت خوش ہوئے اور روزانہ آسمان پر فٹ بال ہونے لگی۔ ایک بڑا فرشتہ انچارج بنا دیا گیا کہ روز کھیل ختم ہونے پر ساری فٹ بالیں یعنی تمام ستاروں کی گنتی کر لے اور انہیں اپنی اپنی جگہ جانے کا حکم دے دے۔"

"ایک دن ایسا ہوا کہ دو فرشتے دو ستاروں سے کھیل رہے تھے بڑے زوروں کی ہٹیں لگا رہے تھے۔ دو ایک اور فرشتوں نے انہیں منع بھی کیا کہ تم لوگ آسمان کے بالکل کنارے پر کھیل رہے ہو فٹ بالیں دنیا میں جا گریں گی۔ پر وہ نہیں مانے، اور ایک بار جو دونوں نے مقابلہ کر کے زور کی کِکیں ماریں تو دونوں ستارے نیچے گر گئے۔ وہ فرشتے ڈر کے مارے بھاگ کے اودے انگوروں کی بیلوں میں چھپ گئے۔ (ازبکستان میں انگور کی سینکڑوں قسمیں ہوتی ہیں اور وہاں کے اودے انگور شہد کی طرح میٹھے اور بے حد رسیلے ہوتے ہیں۔)

"سورج چھپے جب گنتی ہونے لگی تو دو ستارے ندارد اور دو فرشتے بھی غائب۔ بڑی گڑبڑ مچی، پھر کسی طرح انہیں ڈھونڈ

ٹالا گیا۔ ان سے پوچھ گچھ ہوئی تب انھوں نے قبولا کہ ہاں ہم دو ستاروں سے کھیل رہے تھے وہ آسمان کے کنارے سے ین پر گر گئے۔ جلدی جلدی ان ستاروں کی جگہ آسمان پر بادلوں نے کچھ آڑ کر لی اور ان فرشتوں سے کہا گیا کہ آپ فوراً ین پر جایئے اور ڈھونڈ کر لایئے۔"

"فرشتے انسان کا بھیس بدل کر زمین پر اترے اور تمام ں ڈھونڈا۔ ایک ایک سے پوچھا، پر کسی نے بھی وہ ستارے ہیں دیکھے تھے۔ آخر ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک گاؤں میں نچے۔ وہاں ایک نیک دل غریب بڑھیا نے انھیں کھانا کھلایا وران کو پیڑ کی چھاؤں کے نیچے بٹھا کر ان سے پوچھا کہ وہ کون یں۔ کہاں سے آئے ہیں کہاں جا رہے ہیں؟ انھوں نے اپنی ت بیان کی تو بڑھیا بولی: "یہاں گاؤں کے سرے پر ایک دمی رہتا ہے۔ وہ بھی ہماری طرح غریب ہے۔ مگر پڑھا لکھا ہے وہ افسانے لکھتا ہے اور کبھی کبھی گاؤں کی چوپال میں افسانے ناتا بھی ہے اُسے بڑے پتے کی باتیں معلوم ہیں۔ یہاں تک کہ جب ہ ہماری بڑی ہمیں کو بھی دکھاتا ہے۔ تو ہم اپنی غریبی اور مصیبتیں ل کھول جاتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں امید کی جوت جاگ ٹی ہے اور ہم سوچنے لگتے ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتا تو ہماری زندگی تنی پھیکی ہو جاتی میرے خیال میں تم اس سے پوچھو۔"

اتنا کہہ کر اس ازبیک لڑکے نے پھر میری طرف دیکھا۔ اس کی وزن آنکھیں چمکنے لگیں۔ مسکرا کے بولا: "یہاں سے کہانی اس نسانہ نگار کی زبانی ہے۔"

سب لوگ بولے: "اچھا؟" کچھ بہت بزرگ مہمانوں نے ہ بھری کچھ عورتیں مسکرائیں۔ مگر میں چپ رہی، لڑکا مسکرایا، بولا، "آپ بھی تو افسانہ نگار ہیں۔ آپ ان ستاروں کو ڈھونڈ سکتی ہیں۔؟"

میں نے کہا: "میں اکیلی نہیں ڈھونڈ سکتی اگر میں اور دنیا کے اور بھی کئی افسانہ نگار مل کر تلاش کریں تو ہو سکتا ہے۔"

وہ سوچنے لگا۔ پھر ایکدم سر اٹھا کر بولا۔ "یہ بات ٹھیک ہے۔ اچھا تو میں یہ کہانی تو آپ کو سنا دوں! یہاں سے افسانہ نگار کی زبانی ہے!"

اور اس نے کہانی پھر شروع کی۔ "میں اپنے کمرے میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ میں نے کھڑکی میں سے دو آدمیوں کو پھاٹک کھول کر اندر آتے دیکھا۔ دونوں خوبصورت تو تھے۔ مگر پریشان لگ رہے تھے دونوں بہت قیمتی کپڑے پہنے تھے ان کپڑوں پر جا بجا ہیرے دمک رہے تھے۔ قمیصوں کے بٹن بھی قیمتی جواہرات کے تھے۔ اس بات سے میں نے یہی جانا کہ وہ کہیں باہر کے ہیں۔ کیونکہ ہمارے گاؤں میں اور آس پاس تو بہت غریبی ہے۔ اتنے قیمتی کپڑے کون پہن سکتا ہے۔" پھر کچھ بزرگوں نے آہ بھری۔ باقی لوگ سنجیدہ رہے۔

پھر انھوں نے اپنا حال سنایا اور میں نے ان سے پوچھا کہ انھوں نے اب تک کہاں کہاں ڈھونڈا اور مجھے یہ معلوم کر کے ہنسی آئی کہ وہ صرف ایسی جگہوں پر ڈھونڈتے رہے تھے جہاں اوپری چمک دمک تھی۔ اب تک کسی غریب کی جھونپڑی میں جھانکے ہی نہیں تھے۔ ایسے لباس پہننے والوں سے اور امید بھی کیا ہو سکتی تھی۔ خیر۔ وہ کافی تھکے تھے۔ میری بیوی نے ان کو چائے پلائی۔ پھر میں نے بڑی معذرت کے ساتھ ان سے کہا کہ ویسے تو یہ اس بڑھیا کی مہربانی تھی جو اس نے میری اتنی تعریفیں کیں۔ مگر مجھے سخت افسوس ہے کہ ان ستاروں کا پتہ میں بھی نہیں بتا سکتا۔"

"جب وہ دونوں پھاٹک سے باہر جا رہے تھے تو میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ کیونکہ میں نے وہ ستارے دیکھے ہیں کئی بار دیکھے ہیں۔ اپنی بیوی کی دونوں آنکھوں میں جب وہ اپنے بچے کو پیار سے کھانا کھلاتی ہے اور میری طرف دیکھتی جاتی ہے۔"

(باقی صفحہ ۱۲۳ پر)

راغب نعیم (ہزاری باغ)

عید آئی ہے

مسرّت کے ترانے گنگناؤ عید آئی ہے
اب اپنے درد و غم کو بھول جاؤ عید آئی ہے
وفا کی خوشبوئیں دل میں بساؤ عید آئی ہے
گلے سے دردمندوں کو لگاؤ عید آئی ہے
بطرزِ نو سجاؤ بام و در کو ہم نشینو تم
جہاں کو اک حسیں جنّت بناؤ عید آئی ہے
کرو نیکی زیادہ ہے یہی پیغامِ رحمت بھی
گناہوں سے بچو سب کو بچاؤ عید آئی ہے
یہ ضد اچھی نہیں مل جائیں جو کپڑے پہن لو تم
عبادت کے لیے خوش ہو کے جاؤ عید آئی ہے
سبھی بغض و عداوت دوستوں کے بھولنا اچھا
ہر اک کے دل میں اپنا گھر بناؤ عید آئی ہے
سوئیاں، دودھ، لچھے زردہ، فرنی جو میسر ہو
خوشی سے کھاؤ اور سب کو کھلاؤ عید آئی ہے
تم ان کے درد کو بانٹو انھیں راحت ذرا مل جائے
یتیموں میں خوشی اپنی لٹاؤ عید آئی ہے
سبق آموز اچھے شعر کہہ کے آج پھر راغب
ذرا بچوں کو جا کر تم سناؤ عید آئی ہے



جنگل کی شہزادی

جناب غلام ربانی

بہت دنوں کی بات ہے. کسی
لک میں ایک بادشاہ تھا۔ اس کے بیٹے
شکار کا شوق تھا۔ ایک دن وہ جنگل
، بہت دور نکل گیا۔ وہاں اسے ایک
ن نظر آیا۔ شہزادے نے اس کے پیچھے
وڑا ڈالا۔ ہرن بہت تیز بھاگ رہا
ا۔ گھوڑا بھی سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ کہ
نے ٹھوکر کھائی اور اس بری طرح گرا
ں کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ شہزادے
بہت معمولی چوٹ آئی اور وہ اٹھ کر
طرف چلنے لگا۔ چلتے چلتے ایک
پڑی کی نظر پڑی وہ وہاں گیا۔ اور
ا۔ "کوئی ہے؟"

اس کی آواز پر ایک لڑکی جھونپڑی
کلی۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ شہزادہ
و دیکھ کر حیران رہ گیا۔ لڑکی نے پوچھا
ہتے ہو؟" اس نے کہا۔ "مجھے پیاس
رہی ہے پانی پلاؤ تو مہربانی ہوگی" لڑکی
ئی اور ایک مٹی کے آبخورے میں پانی بھر
ئی

زادہ پانی پی کر کہا کیا تم یہاں اکیلی
رہتی ہو۔؟"

لڑکی "نہیں، میں اپنے بابا کے ساتھ
رہتی ہوں"

شہزادہ۔ "تمھارے بابا کہاں ہیں۔؟"

لڑکی۔ "وہ جنگل کو گئے ہیں۔"

شہزادہ۔ "جنگل کیوں گئے ہیں۔"

لڑکی۔ "لکڑیاں لانے، مگر تم کھڑے
کیوں ہو۔ ہاتھ منہ دھوؤ، مرے
بابا اب آتے ہی ہوں گے۔ ان کے
ساتھ کھانا کھا کر جانا۔ اگر تم بغیر
کھائے چلے گئے تو وہ مجھ پر خفا ہوں
گے..... اے لو وہ بابا بھی آگئے

شہزادہ نے بابا کو ادب سے سلام
کیا۔ بابا نے دعا دی۔

شہزادہ "بابا۔ تمہاری بیٹی بہت اچھی
ہیں

بابا۔ "یہ خدا کی مہربانی ہے۔"

شہزادہ۔ ان کی شادی ہوگئی ہے۔"

بابا۔ نہیں۔ ابھی نہیں ہوئی ہے۔

شہزادہ۔ میری شادی بھی نہیں ہوئی
ہے۔"

بابا "کیا مطلب۔؟"

شہزادہ۔ "یہ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں
میں ان سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

بابا۔ "تم بھی مجھے بہت اچھے لگتے ہو
مگر پہلے یہ بتاؤ کوئی ہنر بھی جانتے
ہو تم۔؟"

شہزادہ۔ "ہنر۔ جی میں کوئی ہنر نہیں
جانتا۔"

بابا۔ "تو تم اس سے شادی نہیں کر سکتے

شہزادہ۔ "بابا مجھے ہنر سیکھنے کی ضرورت
ہی نہیں ہے۔ "میں یہاں کے
بادشاہ کا بیٹا ہوں

بابا۔ "شہزادے یہ تمہاری بھول ہے
ہر آدمی کے ہاتھ میں ہنر ہونا چاہیئے
خدا برا وقت نہ لائے ایسے وقت
میں ہنر ہی کام آتا ہے۔

شہزادہ۔ "برے وقت سے آپ کی
کیا مراد ہے۔؟"

بابا۔ (ایک ٹھنڈا سانس لے کر)
"اچھا تو سنو۔ میں بھی ایک بادشاہ
تھا۔ میرے پاس فوج ہاتھی،

گھوڑے، خدا کا دیا سب کچھ تھا بڑی شان سے حکومت کرتا تھا کہ برا وقت آگیا۔ ایک بادشاہ نے بہت بڑے لشکر سے میرے ملک پر چڑھائی کی۔ ہم بہادری سے لڑے مگر فوج کم تھی ہم کو شکست ہوئی۔ ہماری فوج تباہ ہوگئی۔ ہمارے ساتھی تتر بتر ہوگئے اور میں جان بچا کر ملک سے دور نکل گیا۔ اب یہاں رہتا ہوں مجھے کوئی ہنر نہیں آتا تھا جنگل سے لکڑیاں لاتا ہوں اور اسی پر ہم دونوں کی گزر ہے۔ دس برس سے اس حالت میں ہوں جس میں تم دیکھ رہے ہو۔

شہزادہ۔ لیکن جب ہماری شادی ہو جائے گی تو آپ ہمارے ساتھ محلوں میں رہیں گے

بابا۔ "مگر تم میری بیٹی سے شادی نہیں کر سکتے کیونکہ تم کوئی ہنر نہیں جانتے۔"

شہزادہ۔ "بابا! کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔

بابا۔ "ہاں۔"

شہزادہ "اچھا بابا، خدا حافظ۔"

اس کے بعد شہزادہ چلا گیا۔ مگر ... محل کو نہیں گیا۔ جنگل میں چلتا رہا اور ایک گاؤں میں پہنچا۔ وہاں ایک جلاہا کھڈے پر بیٹھا ہوا کپڑا بن رہا تھا۔

شہزادہ نے اسے سلام کیا اور کہا بابا تم مجھے نوکر رکھ لو۔ مجھے تنخواہ نہیں چاہئے۔ بس کھانا کھا لیا کروں۔ اس جلاہے کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس نے خوشی سے اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔ اور شہزادہ اس کے ساتھ رہنے لگا۔ یہ جلاہا اپنے کام میں بہت ہوشیار تھا۔ اس نے شہزادے کو کپڑا بننا سکھایا۔ اس نے جی لگا کر کام سیکھا اور چھ مہینے میں بہت اچھا کپڑا بننے لگا۔ ایک دن شہزادے نے کہا بابا اب میں اپنے گھر جاؤں گا۔ مجھے اجازت دیجئے۔ جلاہے نے کہا بیٹا جی تو نہیں چاہتا کہ تم کو چھوڑ دوں۔ مگر تم اپنے ماں باپ کے پاس جا رہے ہو شوق سے جاؤ۔"

شہزادہ نے کہا "بابا ایک تھان میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں اسے میں نے بڑی محنت سے بنا ہے۔"

جلاہے نے کہا "بیٹے ضرور لے جاؤ۔"

شہزادہ وہاں سے رخصت ہو کر اس جھونپڑی پر پہنچا یہاں باپ بیٹی دونوں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ سلام دعا کے بعد شہزادہ کھانے میں شریک ہوگیا۔ اس کے بعد شہزادے نے کپڑے کا تھان بابا کے سامنے رکھا اور پوچھا۔ "بابا یہ کیسا ہے۔

بابا۔ "بہت اچھا ہے۔"

شہزادہ۔ یہ تھان آپ کو پسند ہے

بابا۔ ہاں کسی استاد کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے۔

شہزادہ۔ اچھا تو اسے لے لو۔

بابا۔ "مگر میرے پاس اس کی قیمت بھر دام نہیں ہیں۔

شہزادہ۔ داموں کی ضرورت نہیں۔ یہ تھان میں آپ کو تحفہ کے طور پر دے رہا ہوں۔"

بابا۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔

شہزادہ۔ (مسکراتے ہوئے) بابا یہ تھان میرے ہاتھ کا بنا ہوا ہے

پھر اس نے سارا حال بیان کیا۔ کس طرح اس نے جلاہے سے کپڑا بننا سیکھا۔

بابا نے خوش ہو کر اسے گلے لگا لیا

شہزادے نے کہا۔ تو اب آپ میرے ساتھ چلنے کی تیاری کیجئے میری اماں جان آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ اور ہماری شادی بڑی دھوم سے ہوگی۔ پھر وہ چلے گئے شہزادے اور شہزادی کی شادی بڑی دھوم سے ہوئی اور وہ ہنسی خوشی سے رہنے لگے

سہیل عظیم آبادی

علم اور سچائی کی بدولت

بغداد میں ایک حجام رہتا تھا۔ اس کا نام حسن تھا۔ ہر روز سویرے اٹھ کر ہاتھ میں جھولی لٹکا کر شہر میں گھومنے جاتا تھا۔ کوئی حجامت بنواتا اور وہ مزدوری لے کر آگے بڑھ جاتا ——!

حسن نے مزدوری کر کے کچھ پیسے جمع کر لیے تو شادی بھی کر لی اپنے رشتہ داروں کو دعوت دے کر بلایا اور دل کھول کر انھیں کھلایا پلایا سب نے اس کی تعریف کی لیکن بے چارے حسن کی ساری پونجی ختم ہو گئی اور اسے پھر سے پیسے جمع کرنے کے لیے کافی محنت کرنی پڑی۔ وہ دن بھر سارے شہر میں گھوم کر لوگوں کی حجامت بناتا پیسے کماتا اور اپنی بیوی کے ہاتھ میں لاکر دے دیتا۔

ایک دن وہ دن بھر سارے شہر میں گھومتا رہا لیکن اسے ایک گاہک بھی نہ ملا۔ شام کو گھر لوٹا۔ بیوی نے اداس دیکھا تو سمجھ گئی کہ آج کوئی آمدنی نہیں ہوئی ہے۔ پھر بھی رونسا نہ کی طرح اس نے ہاتھ منہ دھونے کے لیے پانی دیا۔ پھر جو کچھ تیار تھا کھانے کے لیے سامنے لاکر رکھ دیا اور بولی۔ "آج چپ کیوں ہو؟" حسن نے کہا —— "کچھ نہیں۔" آج کوئی مزدوری نہیں ملی۔"

بیوی نے حسن کا دل بڑھانے کو کہا —— "تو اس میں اداس ہونے کی کیا بات ہے۔ آدمی کا کام صرف محنت کرنا ہے مزدوری تو خدا دیتا ہے۔ تم نے تو اپنا کام کر دیا شہر میں گھومتے رہے تمھیں تو مطمئن رہنا چاہیے کہ اپنا وقت بیکار نہیں گنوایا۔ اگر آج کسی کو حجامت بنوانے کی ضرورت نہیں تھی تو تمھارا کیا قصور!

حسن نے جو کچھ تھا چپ چاپ کھا لیا۔ اسے اپنی بیوی کی بات بڑی اچھی لگی سوچنے لگا کہ ٹھیک ہی تو کہتی ہے میں نے تو اپنا وقت برباد نہیں کیا۔ دل ہی دل میں شرمندہ ہوا کہ یہ عورت ہو کر کتنی اچھی عقل رکھتی ہے۔ اور میں مرد ہو کر بھی گھبرا گیا۔ اب اس نے طے کر لیا کہ مصیبتوں اور پریشانیوں کا پہاڑ بھی سر پر گرے تب بھی ہمت نہ ہاروں گا۔

دوسرے دن وہ پھر شہر میں نکلا۔ سوچنے لگا جب محنت ہی کرنی ہے تو کوئی ایسا کام کیوں نہ کیا جائے جس سے کچھ زیادہ پیسے ملیں۔ اس حجامت کے کام میں تو کچھ زیادہ کمانے کی امید نہیں۔ لیکن اس نے اپنا وقت خراب نہیں کیا۔ بلکہ سوچتا رہا کہ آخر کون سا کام کیا جائے۔ جس سے زیادہ آمدنی ہو لیکن اس وقت اس کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔

جب وہ کام کرنے کے بعد گھر آیا اور ہاتھ منہ دھو کر کھانے کے لیے بیٹھا تو یہی بات اس کے دماغ میں تھی۔ اس کی بیوی نے پوچھا "آج کیا سوچ رہے ہو۔

حسن نے کہا ۔۔۔ "سوچ رہا ہوں کہ کوئی دوسرا کام کروں جس میں زیادہ پیسے ملیں۔"

اس کی بیوی نے کہا۔ "اپنا کام کیے جاؤ دوسرا کون سا کام کروگے؟ دوسرا کام سیکھنے میں ہی برسوں لگ جائیں گے۔ پڑھے لکھے بھی تو نہیں ہو کہ کام بدل ڈالو۔"

حسن کی جیسے آنکھیں کھل گئیں۔ اور اس نے دل ہی دل میں کہا کہ عورت ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ اگر پڑھا لکھا ہوتا تو کوئی اچھا کام مل جاتا۔ اور پیسے بھی کافی ملتے۔ تھوڑی ہی دیر تک وہ یہی سوچتا رہا۔ پھر اس نے ٹھان لی کہ کل ہی سے پڑھنا شروع کر دے گا۔

اب دن بھر تو وہ محنت مزدوری کرتا لیکن شام ہوتے ہی منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھا لیتا اور اس کے بعد پاس کی مسجد میں کتاب لے کر مولوی صاحب کے پاس چلا جاتا اور خوب دل لگا کر پڑھتا۔ اس کی بیوی یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی لیکن اس کے دوسرے یار دوست دیکھ کر ہنسنے لگے۔ ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اب قینچی اور استرا چھوڑ کر پڑھنے کیا چلے ہو؟ کیا اب بغداد کے قاضی بننے کی ٹھانی ہے۔

حسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور برابر دل لگا کر پڑھتا رہا۔ دن بھر محنت کر کے کماتا۔ رات کو پڑھتا اس طرح اس نے بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اب اس کے مولوی نے اس سے کہا کہ اب وہ بڑے مدرسے میں پڑھنے کے لیے جایا کرے۔

حسن صبح اٹھ کر جب شہر میں گیا تو گھومتا پھرتا بڑے مدرسے میں پڑھنے پہنچ گیا۔ وہاں لوگوں کی حجامت بھی بنائی۔ پھر مدرسے کے بڑے مولوی صاحب سے ملا۔ اور اپنے دل کی بات کہی۔ مولوی صاحب اس کی باتیں سن کر اچنبھے میں پڑ گئے۔ مگر اس نے بتایا کہ مسجد میں بیٹھ کر مولوی صاحب سے اس نے چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھی ہیں۔ تو مولوی صاحب نے رات میں پڑھانے کا وعدہ کر لیا۔

جیسے جیسے حسن کتابیں ختم کرتا گیا۔ پڑھنے کی طرف اس کا دل مائل ہوتا گیا۔ مولوی صاحب نے دیکھا کہ وہ دل لگا کر پڑھتا ہے اور کافی ہوشیار بھی ہے تو اور دل لگا کر پڑھانے لگے۔

اسی طرح دن گزرتے گئے۔ حسن دن بھر محنت مزدوری کرتا اور رات کو مدرسے پہنچ جاتا۔ مدرسہ اس کے گھر سے دور تھا۔ پر رات اندھیاری ہوتی یا چاندنی چھٹکی ہوتی۔ حسن وقت پر مدرسے پہنچ جاتا۔

حسن کئی برسوں تک پڑھتا رہا۔ اس بیچ میں اس کے دو بچے بھی پیدا ہوئے۔ اور بچے جب کچھ بڑے ہوئے تو انہیں اپنا کام سکھانے کے بدلے محلے کی مسجد میں مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا۔ حسن کی برادری کے لوگ اس پر ہنستے۔ لیکن اس نے کسی کے ہنسنے کی پرواہ نہ کی۔ بعض منچلے اسے چڑھانے کے لیے قاضی جی کے نام سے پکارنے لگے پر اس نے اس ٹھٹھے (مذاق) کی کچھ پرواہ نہ کی۔

مدرسے کے مولوی صاحب بڑے عالم تھے شہر میں اور خلیفہ کے یہاں بھی ان کی کافی عزت تھی۔ سبھی لوگ ان کی باتوں کو مانتے تھے۔ لیکن جب مولوی صاحب نے کچھ لڑکوں کو حسن حجام سے پڑھنے کے لیے کہا تو لوگ چونکے۔ اور لوگوں نے سمجھا کہ شاید مولوی صاحب بگڑ کر ایسا کہہ رہے ہیں۔ لیکن مولوی صاحب نے حسن کی تعریف کی اور لڑکے جب حسن سے پڑھنے کے لیے گئے تو اس کی علم سے بھری باتیں سن کر دنگ رہ گئے۔

اب بغداد کے پڑھے لکھے لوگوں میں حسن کا نام لیا جانے لگا۔ لیکن ابھی تک اس نے اپنا کام نہیں چھوڑا

(باقی صفحہ پر)

خالد عرفان ایم ایس سی (بنگلور)

وعدہ

کنڑ لوک کہانی

ہمارا دیش (ہندوستان) ہے۔ اسی بھارت کے جنوب میں ایک صوبہ ہے کرناٹک، اسے میسور بھی کہتے ہیں۔ اونچی اونچی چوٹیوں والے پہاڑوں، گھنے سرسبز جنگلوں اور پانی سے بھرپور ندیوں کے اس علاقے کے کیا کہنے!

اس زرخیز ریاست میں پہاڑیوں کا ایک سلسلہ تھا آروناڈری جس کے دامن میں ایک شاداب جنگل تھا۔ اس جنگل کے نکاس پر ایک گوالے نے اپنا مکان بنا یا تھا۔ اس کا نام تھا کالنگا۔

ہاں تو اس کالنگا نے اپنے مکان کے ایک طرف باڑھ لگا کر جگہ روک لی تھی یہاں اس کے مویشیوں کو باندھا جاتا تھا۔ کالنگا کے پاس اتنی پیاری گائیں اور ان کے موہنے بچھڑے تھے کہ بس دیکھا کرو۔

وہ ہر دن صبح تڑکے اٹھتا، پاس کی ندی کے ٹھنڈے ٹھنڈے تازہ پانی میں نہاتا، اپنے بال باندھتا، ماتھے پر تلک لگاتا اور بھگوان کی پوجا کرتا۔ پھر وہ قریب کے ٹیلے پر چڑھ جاتا آم کے درخت کے سائے میں کھڑا ہو جاتا اور آواز لگاتا۔

آؤ گنگا، آؤ گوری۔
آؤ تنگبھدرا مائی
کامادھینو آؤ تم بھی

کالنگا کی آواز کے ساتھ ہی گنگا، گوری، تنگبھدرا، کامادھینوا اور دوسری گائیں اس طرح کھنچی چلی آتیں جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف یہ سب اس سے لگ کر کھڑی ہو جاتیں، ان کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیاں بجنے لگتیں — ٹن، ٹن، ٹن، اور اس موسیقی کو سن کر ان کے بچھڑے مچلنے لگتے، وہ خوشی خوشی سے اندر جاتیں اور بچھڑے چپڑ چپڑ دودھ پینے لگتے پیٹ بھر جاتا تو الگ ہو جاتے۔ اب میاں کالنگا آگے بڑھتے اور ان کا دودھ دوہنے لگتے اتنا دودھ نکلتا کہ برتن بھر جاتے۔ گوالے کالنگا کا ہر دن صبح کو یہی معمول تھا۔

انہی گاؤں میں ایک گائے تھی پنیا۔ کوٹی، نام تھا۔ اس کا بڑی سیدھی گائے تھی اس کے بھی ایک بچھڑا تھا! اسے وہ بہت چاہتی تھی، ہر ماں کی طرح۔

چراگاہ سے دور بہت دور، آروناڈری پہاڑیوں کی ایک کھوہ میں ایک شیر رہتا تھا بڑا ظالم اور خونخوار تھا۔ اس کا نام تھا ارگھنت

ایک مرتبہ میاں اربھت کو چار یا پانچ دن ہو گئے اور کھانے کو کچھ نہ ملا تو نیچے چراگاہ کے قریب اتر آیا۔ بھوک سے نڈھال ہو کر وہ بڑا خونخوار بن گیا تھا۔ اس کو غصہ آ رہا تھا۔ وہ آپ سے آپ جھنجھلا رہا تھا اور نظریں چاروں طرف لگی ہوئی تھیں۔

کرنا خدا کا، پنیا کوٹی، چرتے چرتے ان پہاڑیوں کی طرف آ نکلی۔ اس کو پتہ ہی نہ چلا کہ وہ چراگاہ سے بہت دور چلی آئی ہے۔ شام ہونے کو آئی تو اس کو اپنا پیارا پیارا ننھا منا سا، سفید، ناچتا ہوا بچھڑا یاد آیا۔ اور اب جو اس نے گردن اٹھائی تو اس کو اندازہ ہوا کہ وہ کہاں چلی آئی ہے وہ جلد جلد واپس ہونے لگی اور ابھی وہ چالیس قدم اٹھا پائی تھی کہ اربھت دہاڑتا ہوا ٹیلوں کے پیچھے سے نمودار ہوا اور پنیا کوٹی کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اپنی غذا کو دیکھ کر اس کی طاقت لوٹ آئی تھی۔

"اب تیری خیر نہیں، میں تجھے کھاؤں گا تیری تکا بوٹی کر دوں گا" اربھت دہاڑا۔

پنیا کوٹی کی جان ہی تو نکل گئی کاٹو تو لہو نہیں بدن میں وہ دم سادھے کھڑی ہو گئی، پھر اس کی نگاہوں کے سامنے اس کا ننھا منا ناچا تو اس نے اپنے حواس درست کئے ہمت کی اور گڑگڑا کر کہنے لگی: "بادشاہ سلامت آپ کا اقبال بلند ہو، میری ایک چھوٹی سی گذارش سن لیجئے آپ شوق سے مجھے چیر پھاڑ دیجئے، لیکن بس اتنی مہلت دیجئے کہ میں اپنے ٹھکانے پر جا کر اپنے منے سے مل آؤں، اس کو دودھ پلا آؤں۔"

اربھت کو ہنسی آئی۔ اس نے قہقہہ لگایا "خوب کیا خوب! یہاں پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں اور مہارانی چاہتی ہیں کہ میں انتظار کروں کیا میں تمہاری چالیں نہیں جانتا اس بہانے تم یہاں سے کھسکنا چاہتی ہو، جان بچانا چاہتی ہو"

پنیا کوٹی نے باادب جواب دیا: "حضور سچ کہنا آن ہے، "سچائی میری" ماتا جی سمان ہے، سچائی میرے پتا جی جیسی مہان ہے" اور سچ کو چھوڑ دوں تو کیا اوپر والا مجھے یونہی چھوڑ دے گا!"

نہ جانے کیسے اربھت کا دل ان جملوں پر پسیج گیا وہ چند لمحے پنیا کوٹی کو گھورتا رہا اور پھر اس نے اجازت دے دی "اچھا جا!"

اب تم ادھر کی سنو، سانجھ ہو گئی تو بچھڑے میاں کی نظریں بار بار باہر کی طرف اٹھنے لگیں، ان کو اپنی امی یاد آ رہی تھیں بھوک بھی لگی تھی "آخر کیا بات ہے امی اب تک کیوں نہ آئیں۔ اتنی دیر تو انھوں نے کبھی نہ لگائی تھی" ان کا جی گھبرانے لگا۔ "کہیں کوئی حادثہ تو نہیں ہو گیا میری امی کے ساتھ"۔ اور ان کا چہرہ لٹک گیا۔ خون خشک ہوتا معلوم ہوا۔ اور وہ پکارنے لگے، "امی، امی، امی جی کہاں ہو تم؟" پنیا کوٹی کے کانوں میں یہ آواز پڑی تو اس نے وہیں سے جواب دیا: "آئی بیٹا، میں آئی"۔ اور دوڑتی ہوئی اپنے جگر کے ٹکڑے کے پاس پہنچ گئیں۔

"امی، امی، تم کہاں رہیں اب تک ارے ارے تمہارا چہرہ کیوں پیلا پڑا ہوا ہے، کیا بات ہے، بتاؤ نا امی، میری اچھی امی"۔

پنیا کوٹی نے پیار سے اپنے منے کا منہ چوما، پیار کیا اور بولی: "بیٹا، جنگل کے اندر سے ہو کر آ رہی تھی کہ شیر نے میرا راستہ روک لیا، چیر پھاڑ کر کھانے والا تھا، تم کو دودھ پلا کر لوٹنے کا وعدہ کر آئی ہوں، بڑی مشکل سے اس نے اجازت دی ہے۔"

منے نے کہا: "امی یہ تم کیا کہہ رہی ہو، آخر تم کیوں مرنا

چاہتی ہو جو مجھے کسی کے سہارے چھوڑ جاؤ گی؟ — تم یہیں رہ جاؤ نا، وہ کہاں ڈھونڈتا پھرے گا۔"

بینیا کوٹی نے اپنے بچھڑے کو اور قریب کر لیا اور کہنے لگی "بیٹا، اپنے قول سے نہیں پھرا کرتے، چاہے جان ہی چلی جائے۔ نہ دل میں وسوسے پیدا کیے جاتے ہیں۔ اس طرح دل کو میلا نہیں کرنا ہے۔ میں اپنے وعدے کے مطابق اسی کے پاس جاؤں گی ضرور جاؤں گی یہ میرا فیصلہ ہے۔"

بچھڑے نے درد بھرے لہجے میں کہا: "امی بتاؤ، میں کس کا دودھ پیوں گا؟ کس کی گود میں سوؤں گا؟ کون مجھے پیار کرے گا، ممتا بھری نظروں سے کون دیکھے گا مجھے؟"

ماں نے تسلی دی: "فکر نہیں کرتے بیٹا، یہ جو چاروں طرف اتنی بہنیں کھڑی ہیں میری، یہ سب تجھے پیار کریں گی تجھے پالیں گی، ان کے ساتھ مل جل کر رہنا ان سے علیحدہ ہو کر کہیں دور نہ چلے جانا، اور کبھی اس پہاڑی کی طرف نہ جانا۔ وہاں خونخوار شیر گھات لگائے بیٹھا رہتا ہے اپنوں کے ساتھ ہی رہنا ہمیشہ۔"

اب بینیا کوٹی نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور بولی "میری بہنو، میں جا رہی ہوں اپنے منے کو تم سب کے حوالے کر کے جا رہی ہوں وہ تمہارے آگے آئے تو اس کے سینگ نہ مارنا پیچھے آئے تو لات نہ مارنا، تم اس یتیم بے سہارا بچے کو اپنا بچہ سمجھنا، اس کو سہارا دینا"

بینیا کوٹی نے اپنے بچھڑے کو سینے سے لگایا: "اچھا بیٹا اب میں چلتی ہوں، دیکھو تم اپنے فرض کو ہمیشہ یاد رکھنا، اس سے کبھی پیچھے نہ ہٹنا۔

بینیا کوٹی کی آنکھوں سے آنسو امڈ رہے تھے۔ وہ انھیں روک نہیں پا رہی تھی، اس نے جلد جلد قدم اٹھائے اور پہاڑیوں کی طرف چل دی۔

اربھت کی کھوہ کے دہانے پر پہنچ کر اس نے آواز لگائی: "آؤ، لو، میرے گوشت پر دعوت اڑاؤ، میرا گرم گرم ابلتا خون پیو، اے خونخوار ظالم اربھت آؤ اور مزے اڑاؤ۔"

اربھت نے سوچا نہیں تھا کہ بینیا کوٹی واپس چلی آئے گی۔ اپنے قول کا اتنا پاس کرے گی، اب وہ لوٹ آئی تو اس کو بڑا اچنبھا ہوا اس پر بجلی سی گری، اس کی آنکھوں کے آگے وہ تمام ظلم اور پاپ ناچنے لگے جو اس نے کیے تھے اس کے من میں درد سا اٹھا، وہ کہنے لگا: "تم ستیہ وتی، محض قول کی پاسداری کے لیے تم اپنی جان تک دینے کے لیے چلی آئی ہو، میں تم کو کیسے مار سکتا ہوں! تم تو میری ماں جائی بہن ہو، تمہاری جیسی بات کی پکی اور سچائی کی پالنہار کو مار کر کھاؤں تو کیا مجھے بھگوان یونہی چھوڑ دیں گے — نہیں! نہیں۔ اب میں کسی جاندار کو تکلیف نہیں دوں گا اور اب تک میں نے جو ظلم کیے ہیں اس کے لیے لو، اپنی جان دیتا ہوں۔"

اور اربھت نے پہاڑی سے چھلانگ لگا دی۔

بینیا کوٹی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اسکو اربھت پر بڑا ترس آیا، اس نے پرارتھنا کی کہ مرنے والے کو نجات ملے اور اپنے استھان پر لوٹ آئی۔ بچھڑے کا چہرہ کھل اٹھا، وہ اپنی امی سے لپٹ گیا۔

کرناٹک میں یہ لوک کہانی آج بھی گھر گھر سنائی جاتی ہے۔ یہ بچوں کی من بھاتی کہانی ہے۔

محمد شفیع الدین نیّر

یادِ جواہر

بچّوں کے چاچا

موتی لال کے راج دلارے بھارت کی آنکھوں کے تارے
نام تھا پیارا ان کا جواہر تھے وہ جواہر سے بھی بڑھ کر
عقل و خرد کی جان تھے نہرو علم و ادب کی کان تھے نہرو
دل میں شرافت اُن کے بھری تھی آدمیت بھی ان کی کھری تھی
دیس کی خدمت راحت اُن کی خُلق و مرُوت عادت اُن کی
دنیا بھر سے کام تھا اُن کا دنیا بھر میں نام تھا اُن کا

بھارت کے اچھّے نیتا تھے
بچوں کے نہرو چاچا تھے

پڑھ لکھ کر جب چھُٹی پائی ملک کی خدمت کر کے دکھائی
دولت کے بندھن کو توڑا عیش سے عشرت سے منہ موڑا
پیرو بن کر گاندھی جی کے خدمت کے میدان میں آئے
دیس کی خاطر گھر گھر پھرنا گھر گھر پھرنا در در پھرنا
قید کی ہر تکلیف اُٹھائی پیٹھ پہ اپنے لاٹھی کھائی

اُن کا تو بس کام یہی تھا
خدمت کا انعام یہی تھا

آزادی کے پروانے تھے اِس دیوی کے دیوانے تھے
اِس کارن سب دکھ یہ اٹھائے دیس کہیں آزادی پائے
اپنے وطن کی رنگت بدلے اہلِ وطن کی حالت بدلے
خوش حالی کا دور نیا ہو سُکھ میں بھارت کی جنتا ہو
آخر کو وہ دن بھی آیا دیس سے اُٹھا راج پرایا
آئے دن اچھے دیس کے بارے
انگریز انگلستان سدھارے
خدمت اُن کی عظمت لائی سب سے بڑی کُرسی دلوائی
بن کے وزیروں کے وہ مکھیا کرتے رہے بھارت کی سیوا
کام جو اچھا دھیان میں آیا
اپنے بس بھر کر دکھلایا
بچّوں سے تھی الفت اُن کو خاص تھی ان کی چاہت ان کو
وہ اُن سے کھل کر ملتے تھے کھل کر اور گُھل کر ملتے تھے
گود میں لیتے بار پنھاتے خوش خوش اُن کے ناز اُٹھاتے
پیار سے، ہنس کر باتیں کرتے پیش انھیں سوغاتیں کرتے
اِس سے، اُن کو راحت ملتی دل کو خاص مسرت ملتی
کام غرض جو بھی بن آئے
نہرو جی نے کر کے دکھائے
آج مگر وہ ہم میں نہیں ہیں پھر بھی ہمارے دل کے قریں ہیں
یادِ جواہر شام و سحر ہے
ذکر اُن کا نیّر گھر گھر ہے

ردار کار

عادل جعفری

ترکی کا ایک بادشاہ اکثر بھیس بدل کر اپنی حکومت میں جگہ بہ جگہ گھل جاتا تھا اور لوگوں کی باتیں سن آیا کرتا تھا۔ اپنے اس بھید کو وہ اتنا پوشیدہ رکھتا تھا کہ دو ایک مصاحبوں کے علاوہ کسی کو اس کا علم نہ تھا۔ محل کے نوکر بھی یہ نہیں جان پاتے تھے کہ وہ کب، کس بھیس میں اور کیسے کپڑے پہن کر کہاں جائے گا۔

ایک بار اُس نے سوچا کہ اُس کا راز اسکے علاوہ کوئی اور نہ جانے۔ دو ایک مصاحب بھی نہیں۔ اُس نے کچھ ایسے کپڑے سلوانے کا ارادہ کیا جس کا راز وہ جانے یا خدا۔ تیسرا کوئی نہیں۔ اب تک وہ اپنے کپڑے کبھی ایک درزی سے سلواتا تھا کبھی دوسرے سے۔ اس مرتبہ اس نے اپنے مصاحب منصوری سے کہا "جا کر کسی بالکل نئے درزی کو بلا لاؤ۔ سمجھ گئے نا۔ ایسا درزی جسے کوئی نہ جانتا ہو۔ اُسے آدھی رات کے وقت محل میں چھپا کر لے آنا تو میں خود سمجھا دوں گا کیسے سلواتا اور کیا سلوانا ہے۔"

منصوری فوراً درزی کی تلاش میں چل پڑا۔ بازار میں اُسے ایک درزی کی بہت چھوٹی سی دکان نظر پڑی۔ یہ دکان اتنی تنگ تھی کہ منصوری جیسا موٹا تازہ آدمی اُس میں آسانی سے داخل بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ درزی اس کے اندر جھکا ہوا بیٹھا تھا اور ایک پرانے، بوسیدہ کوٹ کی مرمت کر رہا تھا۔ اسے شاید نظر بھی بہت کم آتا تھا کیونکہ اس نے اپنا چشمہ اپنی ناک کی نوک پر لگا رکھا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی منصوری نے خوش ہو کر سوچا "مجھے ایسا ہی آدمی چاہیئے۔ اسے کوئی نہیں جانتا ہوگا" یہ خیال کر کے اُس نے دکان کے باہر ہی سے کہا۔ "السلام علیکم۔"

درزی شاید کچھ کم ہی سنتا تھا۔ وہ بدستور اپنے کام میں لگا رہا۔ منصوری نے دوسری بار ذرا بلند آواز سے سلام کیا۔ اس بار درزی نے اپنا سر اٹھایا، منصوری کی طرف دیکھا اور یہ سوچ کر پھر اپنے کام میں لگ گیا کہ اتنے اچھے کپڑے پہننے والا آدمی بھلا مجھے سلام کیوں کرنے لگا لیکن جب منصوری نے تیسری بار پھر سلام کیا تو اُسے شک نہیں رہا اور اس نے اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔

"تمہارا نام کیا ہے" منصوری نے دریافت کیا۔

"جی، عبداللہ" اُس نے جواب دیا "میرا نام عبداللہ ہے لیکن مجھے جاننے پہچاننے والے بابا عبدل

کہہ کر پکارتے ہیں حضور کا غلام ہوں۔"

"تم درزی ہو نا؟" منصوری نے سوال کیا۔

"جی حضور۔ میں درزی ہوں۔ میرے باپ درزی تھے۔ اور دادا بھی درزی تھے۔ ویسے میں مچھلی بازار والی مسجد میں اذان بھی دیتا ہوں۔"

"تھوڑی سلائی کروگے؟"

"کیوں نہیں کروں گا۔ بتائیے کیا سلوانا ہے؟"

"اتنی جلدی مت کرو" منصوری نے کہا۔ "پہلے پوری بات سمجھ لو کام پانے کے لیے تمہیں آج آدھی رات کے وقت آنکھوں پر پٹی باندھ کر میرے ساتھ چلنا ہوگا تو بتاؤ چلوگے؟"

"پیسے اچھے ملیں گے تو ضرور چلوں گا۔" درزی نے کہا منصوری نے فوراً دو گنیاں اس کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ اور کہا "تو بات پکی رہی۔ یہ پیشگی ہیں آدھی رات کے وقت تمہیں لینے یہیں آؤں گا۔ تیار رہنا۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔

بابا عبدل نے ایک ساتھ دو گنیاں زندگی میں آج پہلی مرتبہ دیکھی تھیں۔ پھولا نہیں سما رہا تھا اپنی بیوی کو سارا حال بتانے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر وہ بیٹھا اپنا کام کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن بالکل جی نہ لگا تو کام ادھورا چھوڑ کر شام ہونے سے پہلے ہی دکان بند کر، گھر کے راستے پر چل پڑا۔

اس کی بیوی دلفریب سنہری گنیاں دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور جب بابا عبدل نے اسے بتایا کہ کام پورا ہونے پر کم سے کم دو گنیاں اور ملیں گی تو وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ اسی خوشی میں اس نے بابا عبدل کی پوری دعوت کر ڈالی۔

گرم گرم کباب، شوربا، کشمش اور کئی طرح کی مٹھائیوں کی دعوت اڑا کر بابا عبدل وقت سے پہلے اپنی دکان پر پہنچ گیا۔ آدھی رات کو منصوری بھی وہاں آ پہنچا اس نے بغیر کچھ کہے سنے بابا عبدل کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور بابا عبدل نے خاموشی سے پٹی بندھوائی۔

اس کے بعد منصوری نے بابا عبدل کا ہاتھ پکڑا اور آگے آگے چلنا شروع کیا چلتے چلتے نہ جانے کتنی سڑکیں اور گلیاں پار کر کے دونوں شاہی محل میں پہنچے۔ منصوری نے دروازہ کھولا اور دونوں محل میں داخل ہوگئے۔ محل میں پہنچ کر منصوری نے بابا عبدل کی آنکھوں پر سے پٹی کھول دی۔

کمرہ بہت بڑا تھا اور اس میں صرف ایک چراغ جل رہا تھا۔ پٹی کھل جانے پر بھی بابا عبدل کو اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی لگ رہا تھا۔

منصوری اسے وہاں بٹھا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب لوٹ کر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پوٹلی تھی۔ اس نے پوٹلی کھول کر بابا عبدل کو ایک پوشاک دکھائی جو بالکل درویشوں جیسی تھی، اس کے بعد وہ بولا "اسے خوب اچھی طرح دیکھ لو سمجھ لو اور حساب لگا کر بتاؤ کہ ٹھیک ایسی پوشاک تم کتنے دن میں تیار کر سکتے ہو۔ دیکھ کر پوٹلی کو ایسے ہی باندھ دینا اور میرے لوٹنے تک یہیں بیٹھے رہنا۔" یہ کہہ کر وہ پھر باہر چلا گیا۔

بابا عبدل نے پوشاک کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا اسے جوں کا توں پوٹلی میں باندھ دیا اور منصوری کا انتظار کرنے لگا۔ منصوری کے آنے سے پہلے ایک نہایت رعب دار آدمی کمرے میں داخل ہوا اور وہ اتنے

قیمتی کپڑے پہنے تھا کہ بے چارہ درزی اُسے دیکھ کر سہم گیا وہ پوٹلی لے کر چپ چاپ کمرے سے باہر چلا گیا۔ بابا عبدل حیرت زدہ بیٹھا رہا۔

تھوڑی دیر بعد ایک تیسرا آدمی کمرے میں آیا۔ وہ بھی بڑے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور ہاتھوں میں اتنی ہی بڑی ویسی ہی پوٹلی لیے تھا۔ وہ بغیر کچھ بولے بغیر ایک بار آنکھیں اوپر کئے بابا عبدل کے قریب آگیا سر جھکا کر بابا عبدل کو سلام کیا اور پوٹلی اس کے پیروں کے پاس رکھ دی اور بغیر کچھ کہے سُنے، بغیر سر اوپر اٹھائے کمرے سے باہر نکل گیا۔

بابا عبدل کی حیرانی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اتنے میں منصوری پھر کمرے میں آیا اور بولا۔ "پوٹلی اٹھا لو"

بابا عبدل نے چپ چاپ پوٹلی اٹھائی منصور نے اس کی آنکھوں پر پھر پہلے کی طرح پٹی باندھ دی اور دونوں چپ چاپ محل سے باہر نکلے۔ دکان پر پہنچ کر منصور نے پٹی کھول دی اور کہا، "پوشاک تین دن میں تیار ہو جانی چاہیے میں خود یہاں آکر لے جاؤں گا۔ کام پورا ہو جانے پر تمہیں دس گنیاں اور ملیں گی۔"

منصوری کی پیٹھ پھرتے ہی بابا عبدل بھی اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ دس گنیاں! پوری دس! وہ اس وقت بہت خوش تھا اس نے پہلے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ بڑھاپے میں اس کی تقدیر اس طرح چمکے گی۔ وہ جلد سے جلد گھر پہنچ گیا۔ دس گنیوں والی بات اپنی بیوی کو بتانے کے لیے بے چین جو ہو رہا تھا۔

بابا عبدل گھر پہنچا تو رات کے دو بج رہے تھے اس کی بیوی بیٹھی اس کی راہ دیکھ رہی تھی اور پریشان تھی۔

بابا عبدل نے گھر میں داخل ہوتے ہی پوٹلی اسے دکھاتے ہوئے کہا "منہ میٹھا کراؤ" بی بی ایسی خبر سناؤں گا کہ مارے خوشی کے اچھل پڑو گی۔ کام لے آیا ہوں۔ پورا ہونے پر دس گنیاں اور ملیں گی دس۔"

دلفریب کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ ہاتھ پھیلا کر بولی۔ "پوٹلی ذرا ادھر لاؤ۔ دیکھوں تو کپڑا کیسا ہے۔"

"سویرے دیکھ لینا" بابا عبدل نے اسکی بے تابی کو اور بڑھاتے ہوئے چڑھانے کے انداز میں کہا۔

"ہونہہ، سویرے دیکھنا تم۔ میں تو ابھی اسی وقت دیکھوں گی۔ جب تک دیکھ نہیں لوں گی مجھے نیند نہیں آئے گی" یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر بابا عبدل کے ہاتھوں سے پوٹلی جھپٹ لی۔

"ارے یہ کیا؟" اس کی زبان سے ایک دم نکل پڑا۔ پوٹلی کھلتے ہی دونوں کے چہرے فق ہو گئے دل دہل اٹھا پوٹلی میں کپڑے کی جگہ ایک آدمی کا کٹا ہوا سر تھا۔ دلفریب نے اُسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور چیخ مار کر اس طرح دور پھینک دیا جیسے جلتا ہوا انگارا ہو۔ سر گیند کی طرح زمین پر لڑھکتا ہوا ایک کونے میں جا کر رک گیا۔ دونوں ایک دوسرے کی صورت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے پھر دلفریب نے کہا۔ "یہی تمہارا کام ہے؟ اس کا کیا سیو گے۔؟ یہی آفت گھر لانے کے لیے آدھی رات کو اتنی دور گئے تھے۔"

اب بابا عبدل کے منہ سے بھی آواز نکلی اور اس نے منصوری کے ماں باپ کو کوسنا شروع کر دیا۔ بولا، "اس بد معاش پر خدا کی مار۔ اسی نے ہمیں اس مصیبت میں ڈالا ہے اس کی داڑھی جلے۔ اس کے گھر کو آگ لگے۔ جب اُس شیطان کے بچے نے آنکھوں

پر پٹی باندھنے کی بات کہی تھی تبھی مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ یا میرے اللہ! اب میں کیا کروں کہاں جاؤں؟ بدمعاش کے گھر کا پتہ بھی نہیں جانتا ہوں ورنہ ابھی جاکر اُس کی چیز اُس کی کھوپڑی پر پٹک آتا۔ یا خدا کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں؟ اب کروں بھی تو کیا کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

دلفریب بولی، "میری سمجھ میں تو یہ آرہا ہے کہ اس آفت کو اپنے گھر سے نکال کر کہیں اور ڈال آؤ۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" بابا عبدل نے کہا۔ "ہمیں فوراً اسے اپنے گھر سے ہٹا دینا چاہیے۔ تھوڑی دیر میں سویرا ہو جائے گا، پھر بڑی مشکل ہوگی۔"

دلفریب نے کہا "ہاں، ایک ترکیب میں نے سوچ لی ہے۔"

"کیا؟" بابا عبدل کی زبان سے اس طرح نکلا جیسے وہ اسی انتظار میں ہو کہ بیوی اسے کوئی ترکیب بتائے۔

دلفریب نے آہستہ سے کہا "اپنا پڑوسی حسن روٹی والا ہے نا۔ وہ اس وقت تک اپنی بھٹی سلگا چکا ہوگا اور تھوڑی دیر میں سویرے کے گاہکوں کے لیے روٹیاں پکانا شروع کر دے گا۔ پاس پڑوس کی عورتیں اکثر رات میں اپنی اپنی چیزیں اس کی بھٹی کے پاس پکنے کے لیے رکھ آتی ہیں۔ میں سوچتی ہوں میں بھی اسے بڑی ہانڈی میں رکھ کر وہیں چھوڑ آؤں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔"

بابا عبدل نے اپنی بیوی کی ہوشیاری کا لوہا مان لیا۔ اس کی بیوی فوراً اس کٹے ہوئے سر کو ایک چوڑے منھ والی ہانڈی میں رکھ کر چپ چاپ حسن کی بھٹی کے پاس پکنے کے لیے چھوڑ آئی۔ اس کے بعد میاں بیوی اپنے گھر میں اندر سے تالا بند کر کے سو گئے۔

ادھر حسن اور اُس کے بیٹے محمود نے اپنی بھٹی دھونکنی شروع کی۔ اُن کی آواز سن کر دوکان کے باہر بیٹھا ہوا ایک کتا بھی اندر آگیا۔ یہ کتا ان کا پالتو نہیں تھا لیکن ہمیشہ دکان کے آس پاس ہی رہتا تھا۔ حسن اپنی جلی ہوئی اور باسی روٹیاں اسے دے دیا کرتا تھا۔ آج کتے نے دکان میں داخل ہوتے ہی پہلے ادھر ادھر سونگھنا شروع کیا اور اس کے بعد غرّاتا اور تھوڑی دیر کے بعد بھونکنا شروع کیا۔ یہ دیکھ کر حسن نے اپنے لڑکے سے کہا "ذرا دیکھنا تو محمود! یہ کتا اس طرح کیوں بھونک رہا ہے؟ کہیں کچھ ہے کیا؟"

محمود نے ایک بار اِدھر اُدھر دیکھ کر جواب دیا۔ "کچھ نہیں ہے" اور کتے کو دکان سے باہر نکال دیا۔

لیکن کتا باہر جاکر فوراً پھر لوٹ آیا اور پہلے سے زیادہ تیز آواز میں بھونکنے لگا۔ اس بار حسن نے خود اٹھ کر اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ اُس کو یہ دیکھنے میں دیر نہ لگی کہ کتا ایک ہانڈی کو سونگھ سونگھ کر بھونک رہا ہے۔ کتے کو بھگا کر وہ ہانڈی کے پاس یہ دیکھنے کے لیے گیا کہ اُس میں کیا چیز ہے۔ اُس نے آہستہ سے ڈھکن اٹھایا اور ہانڈی میں آنکھیں گاڑ دیں۔ اور کوئی ہوتا تو ہانڈی میں جھانک کر دیکھتے ہی اس کا برا حال ہو جاتا لیکن حسن بڑے دِل گردے والا آدمی تھا۔ اُس نے ہانڈی کو پھر پہلے کی طرح ڈھک دیا اور اپنے لڑکے سے کہا "محمود! یہ دنیا بڑی خراب ہے اور اِس میں نہ جانے کیسے کیسے لوگ بھرے پڑے ہیں۔ اب یہی دیکھو کوئی بدمعاش ہماری بھٹی میں پکنے کے لیے آدمی کا کٹا ہوا سر رکھ گیا ہے۔ وہ تو کہو کہ ہماری قسمت اچھی تھی کہ اِس کتے نے ہمیں بچا لیا ورنہ بھٹی ناپاک

ہو جاتی اور ہمارا سارا کاروبار چوپٹ ہو جاتا۔ اب بھی اگر کسی کو پتہ لگ گیا کہ اس بھٹی میں آدمی کے سر پکائے جاتے ہیں تو ہمارے سارے گاہک ٹوٹ جائیں گے۔ اس لیے اس بلا کو فوراً یہاں سے ہٹا دینا چاہیے۔"

لڑکا بولا "مجھے تو ایسا لگتا ہے ابّا کہ کسی نے ہمارے ساتھ مذاق کیا ہے۔ جیسا ہمارے ساتھ کیا گیا ہے ہم بھی وہی کسی اور کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس سر کو سامنے علی حجّام کی دکان میں رکھ دیا جائے۔ وہ اس وقت دکان کھول ہی رہا ہوگا۔ ابھی ٹھیک سے اجالا نہیں ہوا ہے میں دھیرے سے اسے رکھ آتا ہوں۔ اُسے آہٹ بھی نہ ملنے پائے گی۔"

حسن کو یہ ترکیب پسند آئی۔ محمود کو اس نے اجازت دے دی۔ وہ سر کو لے کر چوروں کی طرح اپنی دکان سے باہر نکلا۔ اس کی قسمت اچھی تھی۔ علی دکان کھلی ہوئی چھوڑ کر کہیں گیا ہوا تھا۔ موقع پا کر محمود نے کٹے ہوئے سر کو چپ چاپ اونچی کرسی پر رکھ دیا اور اسے تولیے سے اس طرح لپیٹ دیا جیسے کوئی آدمی بال کٹانے کے لیے تیار بیٹھا ہو اس کے بعد وہ دبے پاؤں اپنی دکان میں واپس آ گیا۔

علی تھوڑی دیر میں لوٹا۔ وہ پاس کی گلی میں پیشاب کرنے گیا تھا۔ اُس وقت تک اچھی طرح اجالا نہیں ہوا تھا دکان میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہ سامنے کی کرسی پر پڑی۔ اتنے سویرے گاہک کو بیٹھا ہوا دیکھ کر وہ خوش ہو گیا اور بولا "السلام علیکم" "آپ کب تشریف لائے۔ میں تو دیکھ بھی نہیں پایا۔ خیر ابھی پانی گرم کرتا ہوں۔ دیر نہیں لگے گی۔ آپ شاید سر منڈانا چاہتے ہیں۔ میں ابھی حاضر ہوا۔ ذرا استرا تیز کر لوں۔ آپ نے ابھی سے ٹوپی کیوں اتار دی ہے۔ سردی لگ جائے گی جناب"۔

یہ کہہ کر علی خاموش ہو گیا اور سوچنے لگا "عجیب آدمی ہے کسی بات کا جواب نہیں دیتا۔ شاید گونگا ہے۔ ہو سکتا ہے بہرا بھی ہو" یہ سوچتا ہوا وہ اپنی تیاریوں میں لگا رہا۔ اس نے ٹین کے ایک ڈبّے میں پانی گرم کیا، صابن ٹھیک کیا، اپنے چمڑے کے تسمے پر استرا تیز کیا۔ اس کے بعد ایک ہاتھ میں پانی کا ڈبّا لیے کرسی کے پاس پہنچا۔ اس نے جیسے ہی کٹے ہوئے سر پر ہاتھ رکھا وہ لڑھک کر زمین پر آ گرا۔ یہ دیکھ کر علی کے حواس جاتے رہے۔ وہ سمجھا کہ کوئی بھوت یا جن اُسے ستانے کے لیے دکان میں آ گیا ہے۔ گڑگڑا کر کہنے لگا۔ "میرے اوپر رحم کرو۔ میں بہت غریب ہوں مجھ پر ترس کھاؤ۔ میرے سب استرے لے لو۔ سارے تولیے لے جاؤ۔ ساری دکان اٹھا لے جاؤ۔ میں کچھ نہ بولوں گا مگر میری جان نہ لو۔"

لیکن جب وہ سر نہ کچھ بولا اور نہ ہلا ڈلا تو اس کا ڈر کم ہو گیا اور اُسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ بھوت یا جن نہیں ہے۔ اس نے سر کو بال پکڑ کر اٹھا لیا اور اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "تو آپ ہیں۔ اگر ذرا یہ تو بتائیے کہ آپ میری دکان میں کیسے آ گئے اور آپ کا ارادہ کیا ہے۔ مجھے برباد کرنا چاہتے ہیں مگر یہاں آپ کی دال نہیں گلے گی۔ اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ اور جناب کو یہاں ٹھہرنے نہیں دوں گا۔ ویسے تو سامنے حسن روٹی والے کی بھٹی میں ڈال آتا مگر اس کا لڑکا جاگ رہا ہے اور اسی طرف دیکھ رہا ہے اس لیے میں جناب کو بیتین کباب والے کے یہاں لیے چل رہا ہوں اور چپکے سے اس کے

گوشت میں ملادوں گا۔ وہ سویرا ہوتے ہی آپ کو کاٹ کاٹ کر ٹھکانے لگا دے گا۔" یہ کہہ کر علی نے اپنے کپڑوں کے نیچے اُسے چھپا لیا۔ اپنا حقّہ اٹھایا اور یٰسین کباب والے کی دکان کا رخ کیا۔

یٰسین کباب بہت اچھے بناتا تھا۔ علی کو کباب بہت پسند تھے وہ اکثر اس کی دکان پر جایا کرتا تھا اور جانتا تھا کہ کچا گوشت کہاں رکھا جاتا ہے۔

آج جب اُس نے دکان میں قدم رکھا تو یٰسین دکان کے دروازے کی طرف پیٹھ کیے ہوئے انگیٹھی سلگا رہا تھا علی نے دبے پاؤں جا کر وہ کٹا ہوا سر گوشت کے ڈھیر میں ڈال دیا۔ اس کے بعد اس نے یٰسین کے پاس جا کر اسے سلام کیا۔ اپنا حقّہ سلگایا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر اپنی دکان چلا گیا۔

اُدھر یٰسین نے انگیٹھی سلگانے کے بعد دکان میں جھاڑو دی اور اپنے برتن صاف کیے۔ اب کافی اجالا ہوگیا تھا۔ وہ گوشت کے ڈھیر کے پاس آیا۔ اُسے آدمی کی دو آنکھیں جھانکتی ہوئی نظر آئیں وہ ٹھٹھک کر رہ گیا

"آپ کون صاحب ہیں" اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ جواب نہ پا کر اس نے ہاتھ بڑھا کر اُس کٹے ہوئے سر کو ٹٹولا اور ہمت کر کے اٹھا لیا۔ غور سے دیکھتے ہوئے وہ سوچنے لگا۔ "اگر کسی نے اسے یہاں دیکھ لیا تو یہی کہا جائے گا کہ میں نے اسے مارا ہے اور پھر لوگ مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے اس لیے اس بلا کو فوراً یہاں سے ہٹا دینا چاہیے لیکن ہٹایا بھی جائے تو کیسے اور لے کہاں جایا جائے" وہ سوچتے سوچتے یکا یک ایک ترکیب اُس کی سمجھ میں آگئی اور وہ چلّا اٹھا۔ "بن گیا کام بن گیا۔" یہ کہہ کر اس نے جلدی سے سر کو اپنے لبادہ

میں چھپا لیا اور جوتے پہن کر دکان کے باہر سڑک پر آگیا۔

دو دن پہلے شہر میں ایک یہودی کو موت کی سزا دی گئی تھی۔ اُسے چوری کرتے پکڑا گیا تھا اور یہ شک بھی تھا کہ اُس نے ایک مسلمان لڑکے کو مار ڈالا ہے اس لیے خود بادشاہ نے حکم دیا تھا کہ چوراہے پر سب کے سامنے اس کا سر کاٹ لیا جائے اور اُس کی لاش کو تین دن تک وہیں پڑا رہنے دیا جائے جس سے لوگ اسے دیکھیں اور سمجھیں کہ چوری کی سزا کیا ہوتی ہے۔ وہ لاش ابھی وہیں پڑی ہوئی تھی۔

یٰسین لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اسی جگہ جا پہنچا ابھی سویرا ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اور سڑک پر کہیں کہیں ایک دو آدمی آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنے لبادے کے نیچے سے وہ سر نکالا اور چپکے سے اُسے بھی لاش کے پاس رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ آہستہ سے وہاں سے کھسک گیا۔

جب دن اچھی طرح نکل آیا اور سڑک پر چہل پہل بڑھی تو کسی کی نگاہ لاش کے پاس رکھے ہوئے دو سروں پر پڑی۔ اُس نے دوسرے کو دوسرے نے تیسرے کو یہ عجوبہ دکھایا اور بات کی بات میں لاش کے چاروں طرف بھیڑ لگ گئی۔ اور لوگ بھاگ بھاگ کر دو سروں والی اس عجیب لاش کو دیکھنے کو آنے لگے۔

انھی میں شاہی فوج کا ایک سپاہی بھی تھا اس نے دیکھتے ہی دوسرے سر کو پہچان لیا وہ اس کے سردار کا سر تھا۔ وہ بھاگا بھاگا گیا اور اپنے کچھ ساتھیوں کو بلا لایا پھر وہ لوگ گئے اور فوج کے دوسرے سپاہیوں کو بلا لائے۔ اس طرح تھوڑی سی دیر میں آدھی فوج اُس چوراہے پر جمع ہوگئی۔

اپنے سردار کا سر کٹا ہوا دیکھ کر سارے سپاہی آپے سے باہر ہو گئے۔ نعرے لگا لگا کر کہہ رہے تھے کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ ہمارے سردار کو دھوکے سے مارا گیا ہے اور جان بوجھ کر بے عزتی کرنے کے لیے ان کے سر کو یہودی چور کی لاش کے پاس ڈال دیا گیا ہے۔ یہ ہماری سب کی بے عزتی ہے۔ سارے مسلمانوں کی بے عزتی ہے۔ ہم اس کا بدلہ لیں گے یہ کام کسی یہودی کا ہو سکتا ہے ہم یہودیوں کو مٹا کر دم لیں گے۔ انھیں نیست و نابود کر ڈالیں گے۔ ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔

پھر تو سارے شہر میں بھگدڑ مچ گئی جو لوگ دوڑ دوڑ کر دوسروں والی لاش کو دیکھنے کے لیے آ رہے تھے وہ وہاں سے بھاگ بھاگ کر اپنے اپنے گھروں کے دروازے بند کرنے لگے۔ یہودی اپنی جان بچانے کے لیے جگہ بہ جگہ چھپنے لگے بہت سے تو شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ شاہی فوج کے سپاہی جھنڈ کے جھنڈ تلواریں اور پستولیں لیے ہوئے سڑکوں پر اور گلیوں میں گھومنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شہر میں اتنا بڑا ہنگامہ ہو جائے گا کہ روکے نہ رکے گا۔

ادھر شاہی محل میں بھی اس وقت بڑے زوروں کی دوڑ دھوپ ہو رہی تھی اور جو غلطی ہو گئی تھی اسے سدھارنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

ہوا یہ تھا کہ بادشاہ نے درزی کو بلانے سے پہلے اپنے ایک آدمی کو فوج کے سردار کا سر کاٹ کر لانے کا حکم دیا تھا کیونکہ انھیں خبر ملی تھی کہ سردار سپاہیوں کو بھڑکا کر فوج کو بادشاہ کے خلاف کر رہا تھا۔ جب وہ آدمی سردار کا سر لے آیا تو کمرے میں بادشاہ کی جگہ درزی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اندھیرے میں درزی ہی کو بادشاہ سمجھا اور بغیر آنکھ اٹھا کر دیکھے سر اس کے حوالے کر دیا اس سے کچھ پہلے بادشاہ خود کپڑوں کی پوٹلی درزی کے پاس سے اٹھا کر لے گئے تھے ان کا ارادہ اس پوٹلی کو بدل دینے کا تھا جس سے منصوری کو بھی پتہ نہ لگ سکے کہ کون سے کپڑے سلائے گئے ہیں لیکن انھیں ایسا کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ ان کے لوٹنے سے پہلے ہی منصوری وہاں آ گیا اور درزی کو سردار کے سر والی پوٹلی کے ساتھ اس کی دکان تک واپس چھوڑنے چلا گیا۔

بادشاہ جب دوسرے کپڑوں کی پوٹلی لے کر کمرے میں آئے تو وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ وہیں بیٹھ کر منصوری کے لوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔ انھوں نے اس آدمی کو بھی بلوایا جسے سردار کا سر لانا تھا۔ اس نے آ کر کہا کہ میں تو سر ابھی ابھی حضور کے قدموں پر رکھ گیا ہوں۔ بادشاہ کا ماتھا ٹھنکا اور وہ سمجھ گئے کہ درزی سر کی پوٹلی کو کپڑوں کی پوٹلی سمجھ کر لے گیا۔ وہ چلا اٹھے "غضب ہو گیا۔ سردار کا سر وہ درزی کا بچہ لے گیا۔ یا خدا اب کیا ہو گا۔"

منصوری کے لوٹتے ہی بادشاہ اس پر برس پڑے چلا کر بولے "اے منصوری کے بچے۔ دوڑ کر پھر اسی درزی کے پاس جا۔ وہ کپڑے کی جگہ سردار کا سر لے گیا ہے اسے فوراً واپس لا ورنہ غضب ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر انھوں نے جلدی جلدی منصوری کو بتایا کہ سردار خفیہ بغاوت پر آمادہ تھا لہٰذا اس کا سر کٹوا کر منگایا تھا۔ جو لانے والے نے میرے بجائے درزی کے حوالے کر دیا اور وہ کپڑے کی پوٹلی سمجھ کر اپنے ساتھ لیتا گیا۔

منصوری الٹے پاؤں بھاگا اس نے بابا عبدل کا گھر نہیں دیکھا تھا۔ دوکان دیکھی تھی جو اس وقت بند تھی

ت ہیں دکان کے آس پاس کوئی ایسا آدمی بھی نہیں ملا
ں سے کچھ معلوم ہو سکے۔" لیکن بغیر پتہ لگائے یہ دوکانیں درزی
رسردار کا سر ساتھ لیے بغیر واپس جاتے۔ وہ انجام بھی اس کے
ے تھا اس لیے وہ بابا عبدل کی دوکان کے سامنے بیٹھ کر
یر اہوتے اور اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

انتظار کرتے کرتے اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ سو گیا
ے ہی پاس کی مسجد میں اذان ہوئی اس کی آنکھ خود بخود
ں گئی اور آنکھ کھلتے ہی اُسے یاد آیا کہ درزی نے بتایا
اکہ وہ پچھلی بازار والی مسجد میں اذان دیتا ہے۔ وہ اٹھ
ھڑا ہوا اور پچھلی بازار کی طرف تیز قدموں سے چل پڑا
ی قسمت اچھی تھی۔ بابا عبدل اذان دینے اور نماز
ھنے کے بعد مسجد سے نکل رہا تھا۔ منصوری نے اُسے دیکھ کر
ن کا سانس لیا۔ منصوری کو سامنے کھڑا دیکھ کر بابا عبدل
ن خشک ہو گیا۔ اُس نے سمجھ لیا کہ اب بچنے کی کوئی امید
یں ہے اس لیے اس نے اپنی صفائی میں منصوری کو
ے ہاتھوں لینا شروع کیا۔ اُس نے کہا "آپ بھی
ب آدمی ہیں جناب! آخر آپ نے سمجھ کیا رکھا ہے؟
گھر کیا بوچڑ خانہ ہے؟ ایک شریف آدمی کو کیا اس
پریشان کرنا چاہیے۔ مذاق کی بھی ایک حد ہوتی ہے
ب!"

منصوری نے کہا، "ایسی بات نہیں ہے بھائی
ی ہوئی ہے"

"غلطی ہوئی"؟ بابا عبدل نے اور گرم ہو کر کہا۔
ط ہے بالکل غلط ہے۔ غلطی کی گئی جان بوجھ کر ایک
ے سادے، شریف آدمی کو پھنسانے کے لیے
ی۔ ایک آکر کہتا ہے کہ کپڑے سلوانے ہیں۔ دوسرا
نمونے کے کپڑے اٹھائے جاتا ہے اور تیسرا اس

کی جگہ آدمی کا سر رکھ جاتا ہے اور آپ فرما رہے ہیں غلطی
ہوئی۔ یا اللہ کیسے کمینوں سے پالا پڑا ہے"۔

اس پر منصوری کو بھی غصہ آگیا۔ اُس نے ڈانٹ
کر کہا، "خبردار! اب اور کچھ کہا تو زبان کھینچ لوں گا
جانتا ہے تو یہ گالیاں کسے دے رہا ہے"

"نہ جانتا ہوں، نہ جاننا چاہتا ہوں" بابا عبدل
نے جواب دیا۔ "مگر جس نے میرے ساتھ یہ حرکت کی ہے
اُسے میں کمینہ اور بدمعاش ضرور کہوں گا۔"

منصوری نے چلّا کر کہا "تو بادشاہ سلامت کو
کمینہ کہے گا، سور کہیں کا، درزی کا بچہ ہو کر جہاں پناہ
کو بدمعاش کہے گا؟ تیری زبان کاٹ کر پھینک دی
جائے گی۔ چل فوراً بتا وہ سر کہاں ہے نہیں تو میں ابھی
تیرا سر دھڑ سے الگ کرتا ہوں"۔

یہ سن کر بابا عبدل کے ہوش اڑ گئے۔ وہ تھوڑی
دیر تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر منصوری کو دیکھتا رہا پھر
گڑگڑا کر بولا، "رحم کیجئے سرکار میں بہت غریب ہوں
میرے اوپر رحم کیجئے۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا۔ مجھ سے غلطی ہوئی
میں سور ہوں، گدھا ہوں، بدمعاش ہوں کمینہ ہوں
میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ سرکار غریب کی جھونپڑی
میں تشریف لے چلیں میں ساری بات صاف صاف
بتا دوں گا"

"میں اس وقت جلدی میں ہوں۔ بہت جلدی
میں ہوں۔ وہ سر کہاں ہے؟ شاہی فوج کے سردار کا
سر کہاں ہے؟"

بابا عبدل نے جب یہ سنا کہ وہ سر شاہی فوج
کے سردار کا تھا تو اس کے ہوش جاتے رہے۔ خوف سے
پیر کانپنے لگے سر سے پیر تک پسینے پسینے ہو گیا۔ گھبر [illegible]

میں بولا "کہاں ہے؟ کیا بتاؤں کہاں ہے؟ یا اللہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ قسمت یہ کون سا دن دکھا رہی ہے؟"

منصوری نے ڈانٹ کر کہا "میں پوچھتا ہوں وہ سر کہاں ہے۔ بتاتا ہے کہ نہیں؟"

لیکن بابا عبدل چپ کھڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔

"وہ سر کہاں ہے؟ جلا دیا گیا" منصوری نے پھر پوچھا۔

"نہیں" بابا عبدل نے بہت دھیرے سے کہا۔

"پھر؟ کہیں پھینک آئے ہو"

"نہیں"۔

"تو پھر کیا کیا؟ کھا لیا گیا؟"

"نہیں"۔

"گھر پہ ہے"

"نہیں"۔

"کسی کے یہاں چھپا دیا ہے"۔

"نہیں"۔

منصور آپے سے باہر ہو گیا "نہیں، نہیں، ہر سوال کا جواب نہیں" اور یہ کہہ کر اُس نے جھپٹ کر بابا عبدل کی داڑھی پکڑ لی اور اُسے ہلاتے ہوئے کہا "کسی سوال کا جواب ہاں بھی ہوگا؟ بول کہاں گیا سر؟"

"پک رہا ہوگا" بابا عبدل نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا کہا؟ پک رہا ہوگا" منصوری چیخ اٹھا۔

"ہاں پک رہا ہوگا" بابا عبدل نے جواب دیا اور اس کے بعد شروع سے پورا قصہ کہہ سنایا منصوری نے بڑے غور سے اُس کا ایک ایک لفظ سُنا اور کہا "تو چل مجھے اُس روٹی والے کے یہاں لے چل۔ پکا ہوا ہی سہی۔ سر تو ملے"

بابا عبدل فوراً آگے آگے چل پڑا۔ دونوں جلد ہی روٹی والے کی دوکان پر پہونچ گئے۔ حسن نے اُس وقت روٹیاں پکانا شروع کر دی تھیں منصوری نے اُسے پوری بات سمجھائی۔ اس نے ایک سچے آدمی کی طرح بغیر کسی ہچکچاہٹ سے کہا کہ اُس کا لڑکا سردار کے سر کو علی کی دکان میں رکھ آیا تھا۔

وہاں سے چل کر سب علی کی دکان میں پہنچے۔ حجّام نے اپنی صفائی دیتے ہوئے کہا "میری سمجھ میں یہ آیا کہ خود شیطان اُس سر کو میرے یہاں رکھ گیا تھا اس لیے میں اُسے چپکے سے یسین کباب والے کے وہاں ڈال آیا۔ میں سمجھتا ہوں اُس نے اب تک سردار کے سر کو کاٹ کوٹ کر گرم گرم کبابوں میں تبدیل کر دیا ہوگا۔

اب حجّام بھی ساتھ ہو لیا اور سب بہت تیز تیز قدموں سے کباب والے کے یہاں پہنچے۔ کباب والا گھبرا گیا۔ اُس نے قسمیں کھانی شروع کر دیں اور کہا "کیا سر؟ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں"

اس پر علی حجّام نے جگہ دکھا کر قسم کھائی اور کہا کہ میں وہ سر خود اپنے ہاتھ سے یہاں رکھ گیا تھا۔

منصوری نے رُخ بدل کر کچھ کہنا چاہا کہ اتنے میں باہر سڑک پر بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شاہی فوج کے سردار کا سر چوراہے پر یہود کی لاش کے پاس کٹا ہوا پایا گیا ہے اور سارا شہر اسے دیکھنے کے لیے بھاگا چلا جا رہا ہے۔ یہ سنتے ہی منصوری۔

کباب والے کی دکان سے نکل کر نیر کی طرح چورا ہے کا رخ کیا سردار کا تھا۔ اب بھی یہودی کی لاش کے پاس اسی طرح پڑا ہوا تھا شاہی فوج کے بہت سے سپاہی اس کے چاروں طرف کھڑے تھے اور غصہ میں طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔

یہ دیکھ کر منصوری نے کہا " معاملہ بہت خراب ہو گیا ہے فوراً بادشاہ سلامت کو خبر کرنی چاہیئے۔"

بادشاہ کو منصوری سے یہ تمام باتیں معلوم ہوئیں تو وہ بڑے فکر مند ہوتے۔ بات بہت بڑھ گئی تھی اور کسی نہ کسی طرح اس سے چھٹکارا پانے کی ضرورت تھی لیکن کیسے؟ یہ بادشاہ کی سمجھ میں بہت سوچنے کے بعد بھی نہیں آ رہا تھا انہوں نے اپنے وزیر اعظم کو بلایا اور ایک ہی سانس میں سب کہہ سنایا۔ وہ بڑے سمجھدار آدمی تھے انہوں نے ساری باتیں غور سے سنیں کہیں کہیں بیچ میں کچھ سوال کئے اور ساری باتیں سننے کے بعد فیصلہ سنا دیا انھوں نے کہا۔ بابا عبدل، روٹی والا حسن اور علی حجّام نے سردار کے سر کو چوروں کی طرح ایک دوسرے کے یہاں پہنچایا کسی نے صحیح بات معلوم کرنے کی پرواہ نہیں کی۔ ان میں سے کسی نے ایماندار شہری کا فرض ادا نہیں کیا اس لیے ان تینوں پر مقدمہ چلایا جانا چاہیئے سردار کے سر کو یہودی کی لاش کے پاس رکھ کر سارا بکھیڑا لیسین کباب والے نے کھڑا کیا اس لیے شاہی حکم نکال دیا جاتے کہ وہ جب اور جہاں ملے وہیں اور اسی وقت اس کا سر کاٹ لیا جائے اور اسی جگہ ڈال دیا جائے جہاں اس نے سردار کا سر ڈالا تھا۔

سردار ایک بہت اچھا اور بادشاہ سلامت کا خاص آدمی تھا اس لیے اس کو لاش کو شاہی عزت کے ساتھ دفنایا جائے اور اس کی موت سے شاہی فوج کا جو نقصان ہوا ہے اُسے پورا کرنے کے لیے سارے سپاہیوں کی پسند کے کسی آدمی کو اُن کا نیا سردار مقرر کیا جائے۔

اس فیصلے سے بادشاہ کی ساری پریشانی دور ہو گئی انھوں نے اپنے وزیر اعظم کی بہت تعریف کی اور حکم دیا کہ فیصلے میں جیسا کہا گیا ہے ویسا ہی کیا جائے۔ سارے کام اُسی طرح کئے بھی گئے۔

صرف لیسین کباب والے کا سر نہیں کاٹا جا سکا۔ کیونکہ وہ اپنی جان بچا کر کسی ایسی جگہ بھاگ گیا جہاں سے اُس کا پتہ لگانا ممکن نہ ہوا۔

بابا عبدل، حسن اور علی پر مقدمہ چلایا گیا اور جرمانہ کیا گیا کیونکہ سردار کوئی معمولی آدمی نہیں تھا ان تینوں کا جرمانہ خود بادشاہ نے ادا کیا۔

اسے بادشاہ کی شرافت کہیئے یا یہ احساس کہ اصل مجرم تو خود وہ تھا مقدمہ اُس پر چلایا جانا چاہیئے تھا سزا اُسے ملنی چاہیئے تھی۔ کچھ بھی ہو بادشاہ نے انھیں کثیر رقم ادا کرنے کی پریشانی سے بچا لیا اور اس طرح خود اپنے اوپر جرمانہ لگا کر اسے ادا کر دیا۔

(جیمس موریر کی مشہور انگریزی کی کتاب کے فارسی متن حاجی بابا اصفہانی کے ایک باب کا ترجمہ)

حرمت الاکرام

دھرتی کا سیارہ

رات کا یہ ننھا سا فرشتہ
نور لٹاتا اپنے دل کا
یہ تاروں کی گود کا پالا
نکلا ہے دھرتی کے سفر پر
جلتی بجھتی شمع سنبھالے
کھیل دکھاتا ہے جادو کا
یہ پریوں کا اڑن کھٹولا
بچوں کی دنیا کا راکٹ
جگنو دھرتی کا سیارہ
لہراتا ہے چمک چمک کر
چھلکاتا ہے نور کا ساغر
شب کی انگوٹھی کا یہ نگینہ
روشن ہوا پر اُڑتا موتی
اُجیاروں کے محل کا پرچم
نور کی منزل کا یہ راہی
جلووں کے لشکر کا سپاہی
جگنو ہے یا اک شہزادہ
کاہکشاں کے روپ نگر کا
روشنی اس کا جیون بھی ہے
روشنی اس کا درپن بھی ہے
تن کی جوت لیے پھرتا ہے
من کی جوت کا متوالا ہے

[illegible]

غلام یزدانی

بہت دنوں کی بات ہے ایک گھنے جنگل کے کنارے چھوٹا سا ایک گاؤں تھا۔ جس میں ایک بڑھئی رہتا تھا۔ تھا تو وہ دبلا پتلا کمزور سا آدمی مگر اپنے کام میں بڑا ہوشیار تھا آس پاس کے گاؤں میں جہاں لکڑی کا کوئی کام ہوتا لوگ اسی کو بلاتے تھے۔ ایک دفعہ اسے دور کے گاؤں میں کام ملا۔ گاؤں کا راستہ جنگل میں سے تھا۔ اپنے سارے اوزار تھیلے میں ڈال کر وہ بہت سویرے اپنے گھر سے نکل پڑا۔ چلتے چلتے جب وہ جنگل میں پہنچا تو اک دم ایک جھاڑی میں سے ایک زبردست شیر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ شیر کو دیکھتے ہی بیچارے بڑھئی کے ہوش جاتے رہے۔ مگر وہ فوراً سنبھل گیا۔ اور اپنا تھیلا زمین پر رکھ کر اطمینان سے کھڑا ہو گیا۔ جیسے وہ شیر سے ذرا بھی نہ گھبرایا ہو۔ شیر اپنے دونوں پیروں اور دم کے سہارے بیٹھ گیا۔ اور بڑھئی کو گھورنے لگا۔ پھر بولا۔

میں نے جنگل کے سارے جانور دیکھے اور ان کا شکار بھی کیا ہے۔ مگر تم پہلی دفعہ نظر آئے ہو۔ تم کون ہو۔

بڑھئی۔ میں ۔۔۔۔ میں آدمی ہوں۔"

شیر۔ آدمی! اچھا۔ اچھا۔ تو تم آدمی ہو۔ تمہارا نام میں نے بہت سنا ہے۔ مگر ۔۔۔۔۔ مگر تم آدمی نہیں ہو سکتے۔

بڑھئی۔ مگر میں ہی آدمی ہوں۔"

شیر۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میرے ابا جان جھوٹ نہیں بول سکتے۔ وہ کہا کرتے تھے آدمی سب سے زبردست جانور ہوتا ہے جس کی برابری کوئی نہیں کر سکتا۔ وہ ہاتھی سے بھی اونچا ہوتا ہے۔ اور بڑے سے بڑے درخت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے اس کی طاقت کا کچھ ٹھکانا نہیں۔

بڑھئی نے دل ہی دل میں خوش ہو کر شیر کی بات کاٹی اور کہا۔

بڑھئی۔ معلوم ہوتا ہے تمہارے ابا جان بڑے سمجھدار تھے وہ بالکل ٹھیک کہتے تھے میں وہی آدمی ہوں۔

شیر۔ مگر تم تو اتنے ذرا سے ہو کہ ایک تھپڑ ماروں تو تین قلابازیاں کھاؤ۔ تمہارے شکار سے میرے ایک وقت کا پیٹ بھی نہ بھرے بھلا اتنا سا جانور اتنا بڑا اور ایسا طاقت ور کیسے ہو سکتا ہے۔

بڑھئی نے جواب دیا: "تم نے پہلی دفعہ مجھے دیکھا ہے اس لئے نہیں جانتے۔ میں دیکھنے میں اتنا چھوٹا دکھائی دیتا ہوں مگر ہوں بہت بڑا۔ اور اسی میں میرا فائدہ ہے جنگل کے جانور مجھے چھوٹا اور کمزور سمجھ کر مجھ پر حملہ کر دیتے ہیں اور میں آسانی سے ان کا شکار کر لیتا ہوں۔"

شیر بولا: "تو کیا تم بہت بڑے ہو ہاتھی سے بھی بڑے۔"

بڑھئی نے کہا: "ہاتھی تو میرا نوکر ہے۔ میرے سام کام کرتا ہے۔ اور میں اس پر سواری کرتا ہوں میں اس پیپل سے بھی اونچا ہوں جس کے نیچے تم کھڑے ہو۔"

شیر: "اس پیپل سے بھی اونچے ہو۔"

بڑھئی: "ہاں اس پیپل سے بھی اونچا ہوں۔"

شیر یہ سنکر ذرا گھبرایا اور بولا: "پھر تم اتنے اونچے دکھائی کیوں نہیں دیتے۔" بڑھئی نے جواب دیا۔ "کیا تم مجھے بڑا دیکھنا

چاہتے ہو۔" شیر نے کہا۔ ہاں۔ اس پر بڑھئی بولا۔ اگر تم دوربین سے دیکھو تو میں تمہیں بہت ہی بڑا دکھائی دوں گا جتنا بڑا اصل میں ہوں۔ شیر نے پوچھا "یہ دوربین کیا ہوتی ہے۔" بڑھئی نے اسے سمجھایا کہ دوربین ایک آلہ ہوتا ہے جس میں سے دیکھنے پر چیز بڑی اور اپنی اصلی حالت میں دکھائی دینے لگتی ہے۔

شیر نے بڑھئی سے کہا۔ دوربین لاؤ میں اس بات کو دیکھوں کہ تم کتنے بڑے ہو۔ بڑھئی نے جواب دیا "دوربین تو میرے گھر پر ہے۔ مگر یہیں میں ایک دوربین بنائے دیتا ہوں بس دس منٹ میں تیار ہو جائے گی۔ شیر نے کہا اچھی بات ہے

بڑھئی نے کیا کیا۔ تھیلے میں سے بسولہ نکالا آری اور دوسرے اوزار نکالے۔ رسی پھینک کر پیپل کا ایک بڑا ٹہنا نیچے جھکایا اور اسی کے دوسرے سرے کو کھینچ کر زمین پر ایک کھونٹے سے باندھ دیا۔ پھر ٹہنے کے سرے کو بیچ سے کچھ دور تک چیر کر دونوں چرے ہوئے حصوں کے بیچ میں ایک کیل اٹکا دی تاکہ دونوں حصے کھلے رہیں اور شیر کی گردن ان کے بیچ میں آسکے جب سب کچھ ہو گیا تو بڑھئی نے شیر سے کہا لو دوربین تیار ہے۔ تم اس کیل کے پاس ان دونوں تختوں کے بیچ میں سے سر ڈال کر مجھے دیکھو تو تمہیں دکھائی دے گا کہ میں کتنا بڑا ہوں۔ شیر آگے بڑھا اور جوں ہی اس نے اپنی گردن چرے ہوئے تختوں کے بیچ میں ڈالی بڑھئی نے فوراً بیچ میں اٹکی ہوئی کیل نکال لی۔ اور اوپر سے دونوں تختوں کو ملا کر ٹھونک دی جس سے شیر کی گردن دونوں تختوں کے درمیان پھنس کر رہ گئی۔ پھر بڑھئی نے زمین سے بندھی ہوئی رسی کاٹ دی اور ٹہنا ایک جھٹکے سے اوپر اٹھ گیا۔ ٹہنے کے ایک سرے پر شیر کی گردن پھنسی ہوئی تھی اور وہ ہوا میں ہاتھ پاؤں مارتا ہوا جھول رہا تھا۔ بڑھئی نے شیر سے کہا۔ "دیکھا تم نے آدمی کتنا بڑا ہوتا ہے۔ اور جلدی جلدی اپنا سامان تھیلے میں ڈال کر گاؤں کی طرف چل دیا۔

(بقایا صفحہ ۲ کا)

تھا۔ صبح سے شام تک وہ ہاتھ میں استرے اور قینچی کی جھولی شہر میں گھوما کرتا۔ اور محنت مزدوری کرتا۔ پر اب لوگ اس عزت کرتے تھے۔ کبھی کبھی لوگ اس سے کہتے کہ اب وہ حجامت بنانے کا کام چھوڑ دے تو وہ جواب دیتا۔ کہ دنیا کا کوئی کام خراب اور برا نہیں کام کرنے والا اپنی کرنی سے اسے برا بنا دیتا ہے ـــ !

کچھ دنوں کے بعد بغداد کا قاضی مر گیا۔ خلیفہ کو فکر ہوئی کہ کسی اچھے آدمی کو قاضی مقرر کر دے۔ قاضی کے عہدے کے لائق اسے کوئی آدمی ہی نہیں ملتا تھا۔ بڑے بڑے مولویوں اور عالموں نے قاضی بننے کے لیے خلیفہ کے پاس پیروی کی لیکن خلیفہ کو کوئی بھی آدمی پسند نہ آیا۔ اور اس نے مدرسے کے بڑے مولوی صاحب سے کہا کہ قاضی کے عہدے کے لیے کوئی اچھا آدمی نہیں مل رہا ہے۔ اس لیے آپ ہی قاضی بن جائیں۔

مولوی صاحب نے کہا ـــ " یہ عہدہ اس آدمی کو سونپا جاتا ہے جو عالم ہو پر اس کے ساتھ ہی ساتھ ایماندار بھی ہو اس کے دل میں کسی طرح کا لالچ نہ ہو اور وہ سچائی کا پجاری ہو۔ اور یہ ساری خوبیاں اور اچھائیاں مجھے حسن حجام کے سوا اور کسی میں نظر نہیں آتیں آپ اس کو قاضی بنائیں۔

خلیفہ کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ پر اس نے مولوی صاحب کی بات مان لی وہ سمجھتا تھا کہ مولوی صاحب غلط نہیں کہہ سکتے۔

دوسرے دن حسن حجام کے گھر خلیفہ کے آدمی سواری لے کر پہنچے اور بہت عزت و احترام کے ساتھ خلیفہ کے دربار میں لے گئے۔ خلیفہ نے حسن کو عزت کے ساتھ دربار میں جگہ دی اور اُسے بغداد کا قاضی بنا دیا۔ حسن نے قاضی کے عہدہ پر آنے کے بعد اتنا اچھا کام کیا کہ سبھی لوگ دنگ رہ گئے۔

مولانا عبدالملک بی۔اے جامعہ مقیم مدینہ منورہ

مکہ مدینہ کی عید

مکہ کے رمضان کا حال آپ سن چکے اب عید کا حال سنیں پہلی بات تو یہ کہ یہاں عید ایک ہوتی ہے دو نہیں ہوتیں۔ ہمارے ہاں ایک عید رمضان کی ہوتی ہے اس کو عید الفطر بھی کہتے ہیں اور میٹھی عید اور چھوٹی عید بھی کہتے ہیں دوسری عید وہ ہوتی ہے جس میں قربانی کی جاتی ہے اس کو عید قربان بھی کہتے ہیں۔ عید اضحیٰ بھی کہتے ہیں اور عام طور پر بڑی عید کہتے ہیں یہاں مکہ مدینہ میں بڑی عید نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ یہ حج کے دنوں میں آتی ہے اور ساری دنیا اسی دن حج کے میدان میں جمع ہوتی ہے۔ اپنے گھر لوگ ہوتے ہی نہیں تو عید کیا منائیں۔ مکہ تو اس روز بالکل ہی خالی ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ تو حج کا شہر ہے لیکن مدینہ شریف جو مکہ سے تین سو میل دور ہے وہاں بھی اس زمانے میں لوگ اتنے کم ہوتے ہیں کہ عید کی کوئی خاص شکل نہیں بنتی یوں نماز ہوتی ہے اور ہاں قربانی کرنے والے اپنے گھروں میں قربانی بھی کرتے ہیں۔

عید الفطر بے شک دونوں شہروں میں بڑی دھوم دھام کی ہوتی ہے رات سے تیاریاں ہوتی ہے بلکہ رات بھر تیاریاں ہوتی ہیں، خاص طور پر اس لئے کہ یہاں جب لوگ فجر کی نماز میں آتے ہیں تو پھر واپس نہیں جاتے، فجر کے بعد بس سورج نکلنے تک وقفہ ہوتا ہے اور پھر فوراً عید کی نماز کھڑی ہو جاتی ہے اور فجر بھی یہاں پر جلدی ہوتی ہے اس لیے بچے اور بڑے سب لوگ مونہہ اندھیرے ہی تیار ہو کر آجاتے ہیں۔ یوں آدمیوں کا سلسلہ آخر تک جاری رہتا ہے۔ فجر کی نماز کے بعد اور عید کی نماز کے درمیان جو وقفہ ہوتا ہے اس میں عید کی تکبیریں پڑھی جاتی ہیں حرم شریف کے جو موذن ہیں وہ بڑی اچھی لے کے ساتھ، تھوڑا تھوڑا وقفہ کرتے ہوئے بلند آواز سے تکبیریں پڑھتے ہیں۔ پہلے ایک پڑھتا ہے پھر سارے موذن اسی کو دہراتے ہیں عید کا یہ نغمہ اس دن بڑا پیارا معلوم ہوتا ہے، تکبیریں تو آپ لوگ بھی جانتے ہونگے لیک دفعہ اور سن لیں۔ "اللہ اکبر، اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر و للہ الحمد" اللہ سب سے بڑا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور ساری تعریفیں اسی کے لیے ہیں آپ جانتے ہیں اسلام توحید کا دین ہے اس کو ہر وقت اس بات کی فکر رہتی ہے کہ آدمی کے دل میں اللہ کی بڑائی اور بزرگی بڑھتی چلی جائے۔ اس لیے کہ اللہ کی بزرگی دل میں جتنی بڑھتی جائے گی دنیا کی اُن چیزوں کی قیمت گھٹتی چلی جائے گی جن کی وجہ سے دنیا میں فساد پیدا ہوتا

ہے اور انسان ایک دوسرے کا دشمن بن جاتا ہے۔ نماز کا اصل مقصود بھی یہی ہے مگر بہت کم لوگ ہیں جو نماز کو نماز کی طرح پڑھتے ہیں مگر نماز پڑھنا ہر حال میں ضروری ہے کہ شاید آدمی نقل سے اصل کی طرف چلا جائے۔

ہاں عید کی نماز میں بھی ایک فرق ہوتا ہے ہمارے ہاں عید کی نماز میں کل چھ تکبیریں ہوتی ہیں تین پہلی رکعت میں تین دوسری رکعت میں۔ اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر لوگوں کو اس کی گنتی میں بھول ہو جاتی ہے مگر یہاں چھ کی بجائے بارہ تکبیریں ہوتی ہیں، ہر رکعت میں چھ، یہ فرق کوئی خاص فرق نہیں ہے، ایک حدیث میں چھ کا عدد آتا ہے ایک میں بارہ کا عدد آتا ہے، بہرحال نماز ختم ہو جاتی ہے اور ختم ہوتے ہی گولے چلتے ہیں۔ خاص حکومت کی طرف سے ہوتے ہیں، نماز کے بعد لوگ ایک دوسرے سے ملنا شروع کر دیتے ہیں مگر یہ صرف مصافحہ ہوتا ہے معانقہ (گلے ملنا) نہیں ہوتا۔ مبارک بادی کے لیے ایک خاص جملہ ہے اس کو آپس میں ایک دوسرے سے کہتے ہیں، پہلا کہے گا، "من العائدین" عید مبارک ہو دوسرا جواب دے گا، "کل عام و انتم بخیر" ہر سال آ کے اور تم خیر و عافیت کے ساتھ ہو، عید کے بعد عموماً لوگ اپنے گھروں پر واپس چلے آتے ہیں اور ناشتہ وغیرہ کر کے عزیزوں دوستوں میں عید ملنے جاتے ہیں، عید کا پہلا دن عید کی ملاقات کے اعتبار سے مشترک دن ہوتا ہے اس میں آنے جانے کی کوئی قید نہیں ہوتی مگر اسی کے بعد آنے والے تین دن شہر کے تین حصوں پر تقسیم ہو جاتے ہیں، آج ہمارے محلے کی عید ہے، کل آپ کے محلے کی عید ہوگی پرسوں باقی تیسرے علاقے کی عید ہوگی یہ علاقے باقاعدہ سرکاری طور پر معین ہیں، جس دن ہمارے محلہ کی عید ہے ہم اپنے گھر رہ کر آنے والوں کا انتظار کریں گے، کل آپ کے ہاں عید ہے اس لیے آپ کل نہیں جائیں گے، دن بھر گھر رہیں گے اس لیے کہ آج آپ کے ہاں آنے والے ہیں اسی طرح تیسرے دن علاقہ والے لوگ باقی سارے شہر کا اپنے گھر انتظار کریں مگر چوتھے دن عید ختم ہو جائے گی۔ عید کی ملاقات کے اوقات بس ظہر کی نماز تک ہوتے ہیں، ظہر کے بعد آدمی آزاد ہوتا ہے جہاں چاہے جائے۔ اس زمانہ میں بچوں کی سب سے بڑی تفریح "گھوڑا سواری" ہوتی ہے، جا بجا اور ہر موڑ پہ گھوڑوں کی ایک تعداد تیار کھڑی ہوتی ہے لڑکے آتے ہیں اور اپنے اپنے مناسب قد کے جانور انتخاب کر لیتے ہیں، پھر آپس میں بے تحاشا دوڑ ہوتی ہے لیکن اب یہ شوق کم ہوتا جا رہا ہے، یا یوں کہ اس کے ساتھ اب سائیکل اور دباب (موٹر سائیکل) دوڑ بھی شروع ہو گئی ہے، میں نے جس چیز کو گھوڑا کہا دراصل گھوڑا نہیں ہوتا، گدھا ہوتا ہے مگر اتنا خوبصورت اتنا موزوں جیسے بالکل دل دل اور اتنا تندرست کہ آپ اس کو گدھا کہہ نہیں سکتے۔ یہ یہاں کی عام شہسواری ہے مکہ معظمہ کے سب سے پرانے اور سب سے مشہور مدرسہ صولتیہ کے ایک استاد ہمیشہ اسی سواری پر تشریف لایا کرتے تھے اس گھوڑا سواری کے علاوہ بچوں کی سب سے بڑی دلچسپی جھولا ہے، کرسی دار جھولے عموماً ہر جگہ شہر میں سیکڑوں جگہ لگے ہوتے ہیں اور صبح سے لے کر مغرب تک بچے ان میں جھولا کرتے ہیں عرب اس کو مدریہ (مدری ہ) کہتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں جو مداری کا لفظ بولتے ہیں وہ یہیں سے ہی لیا گیا ہے۔

آپس میں ایک دوسرے کے گھر جانے اور ملنے

ملانے کا طریقہ بہت سادہ ہے۔ ہر آدمی اپنے مردانے کمرے میں یا کسی بھی کمرے کو عید کے لیے مخصوص کر کے وہاں عیدی لگا دیتا ہے — اس میز پر عطردان ہوتا ہے اور حلاوہ دان ہوتا ہے۔ حلاوہ۔ حلوہ کو کہتے ہیں یہ لفظ یہاں عام ہے ہر میٹھی چیز اور ہر مٹھائی حلاوہ کہلاتی ہے۔ سوجی کے حلوہ کو بھی حلاوہ کہتے ہیں۔ اگر کیک کو بھی حلاوہ کہتے ہیں اور چاکلیٹ اور لیمن ڈراپ کو بھی حلاوہ کہتے ہیں، عید کے دن اسی حلاوہ دان میں ہی لیمن ڈراپ اور چاکلیٹ ہوتے ہیں آدمی گھر میں داخل ہوتا ہے۔ سلام کرتا ہے، من العائدین اور کل عام وانتم بخیر کی لین دین ہوتی ہے مہمان بیٹھتا ہے اور بعض وقت نہیں بھی بیٹھتا، کھڑے کھڑے عطر لگاتا اور حلاوہ کے دو ایک دانے اٹھاتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے، گھر والا کھڑے ہو کر اس کا استقبال کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ خود ہی عطر لگائے اور خود ہی حلاوہ پیش کرے لیکن یہ سب ضروری نہیں ہوتا، اس معاملے میں دونوں بے تکلف ہوتے ہیں۔

میں ایک دفعہ مدینے کے مشہور بزرگ مولانا عبدالغفور صاحب کے ساتھ نکلا، عید کی ملاقات میں یہی رواں دواں ملاقات، سوچا، ہر گھر سے صرف ایک دانہ لوں گا تاکہ حساب میں آسانی ہو۔ شاید دو گھنٹے ہم پھرے، واپس آکر میں نے حلاوے گنے تو چالیس تھے معلوم ہوا کہ ہم کم و بیش چالیس گھروں میں ہو آئے۔

سید محمود صاحب مولینا حسین احمد صاحب مدنی کے چھوٹے بھائی) یہاں کے بہت بڑے بلکہ سب سے بڑے آدمی ہیں۔ گذشتہ سال میں عید کو گیا، حلاوہ کا ایک دانہ اٹھا لیا فرمایا نہیں یہ تین قسم کا ہے ہر قسم میں سے ایک ایک دانہ ضرور لیجئے۔ امیر لوگوں کے یہاں حلاوہ کی اقسام بھی اعلیٰ ہوتی ہیں اور بازار میں دوکانوں پر اس سے زیادہ کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

روس کے مہاجر مسلمان جو یہاں بخاری کہلاتے ہیں، مکہ مدینہ طائف ہر جگہ آباد ہیں لیکن طائف میں سب سے زیادہ ہیں، وہ گویا اُن کی بستی ہے وہاں دیکھا کہ میز نہیں ہوتی کمرے میں دسترخوان بچھا رہتا ہے، چوبیس گھنٹے بچھا رہتا ہے رات دن برابر لوگ آتے ہیں بیٹھتے ہیں، کھاتے ہیں پیتے ہیں، عموماً میٹھی چیزیں ہوتی ہیں اسی لئے آدمی کے جانے کے بعد اس پر ایک جالی کا کپڑا ڈال دیتے ہیں جب کوئی آتا ہے پھر اٹھا دیتے ہیں ایک طریقہ اور بھی ہے آپ کسی کے ہاں گئے، وہ نہیں ملا، آپ اسی کے کاغذ پر اپنا نام لکھ آئے ہیں اب اس پر آپ کے ہاں آنا واجب ہو گیا۔ چاہے وہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو ان باتوں کا عرب لوگ بہت لحاظ رکھتے ہیں۔

عید کے دن عید کی نماز کے بعد قبرستان جانا سنت ہے تاکہ آدمی اپنے جانے والے بزرگوں دوستوں کو یاد کرے اور اس لئے بھی کہ اس کو اس سب سے بڑی خوشی میں اپنی موت یاد آئے کہ وہ بہر حال آنے والی ہے، دیندار طبقہ اور اصلی عرب لوگ اکثر و بیشتر حرم شریف سے سیدھے جنت البقیع جاتے ہیں، یہ مدینہ پاک کا وہ قبرستان ہے جہاں دس ہزار صحابہ دفن ہیں اور ہر آدمی جہاں دفن ہونے کی تمنا رکھتا ہے۔

ناظم سیوانی سہسرامی



کلوادھوبی : " اری' او بدھنا کی ماں ! سنتی ہے
ری ! یہ کیا لائی ہے حاجی احمد بابا کے گھر سے؟"

بدھنا کی ماں : " لائی کیا ؟" (روٹی توے پر ڈالتے ہوئے) "کپڑے لائی ہوں اور کیا لائی !"

کلوا : " یہ دیکھ ، یہ جیب بہت بھاری ہے اری او بدھنا کی ماں ! نہ معلوم کیا ہے اس میں"

بدھنا کی ماں : " تو ہوگا کچھ "

کلوا : " تو لے ، رکھ اسے ، کل یاد سے ، ان کے گھر دے آنا "

بدھنا کی ماں : " ذرا کھول کر بھی تو دیکھو ، اتنے بڑے گھر کی جیب میں آخر یہ بھاری سی کیا چیز آگئی ہے ؟ "

کلوا : ہوگی ، کوئی ایسی ویسی چیز ! ، چل ، پھینک ' اسے کنارے رکھ "

بدھنا کی ماں : ارے ذرا کھول کر بھی تو دیکھو آخر یہ ہے کیا چیز ؟

کلوا دھوبی نے دھوبن کے اصرار پر رومال کا پلندا کھولا تو اس کی آنکھیں چکا چوندھ ہوگئیں چوندھیا کر پکار اٹھا۔

" یہ تو سونا ہے ری او بدھنا کی ماں ! یہ دیکھ ' یہ تو سونا ہے سونا ، اتنا ڈھیر سا سونا ہم نے بھلا کبھی کاہی کو دیکھا تھا "

بدھنا کی ماں : " آئیں ! سونا !! ذرا میں بھی تو دیکھوں تیرا سونا ، آخر کیسا ہے یہ سونا ! کہیں پیتل تو نہیں '

کلوا : " یہ لے دیکھ پگلی ! اتنا ڈھیر سا سونا تو تو نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کبھی "

بدھنا کی ماں نے جو سونے کی گلی دیکھی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ حیرت و مسرت کے ملے جلے انداز میں بولی

بدھنا کی ماں : " باپ رے باپ ! اتنا سونا !! آج ہم راجہ ہوگئے بدھنا کے باپ - راجہ "

کلوا : " اری کیا راجہ راجہ بک رہی ؟ کیا حاجی بابا کا سونا دیکھ کر تو نے اپنا دین و ایمان بھی دھو ڈالا ؟ جا ، حاجی بابا کی چیز انھیں دے آ ، وہ خود ہی خوش ہوکر تجھے بہت کچھ انعام اکرام دیں گے "

بدھنا کی ماں : بدھنا کے باپ ! تم بدھو ہو بدھو ! تمہاری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا - کپڑوں کی دھلائی صفائی کرتے کرتے تم نے اپنی عقل کا بھی صفایا کرلیا ہے - بھلا آئی دولت بھی کہیں ٹھکرائی جاتی ہے - خود سے آئے ہوئے دھن کو لات نہیں ملا

کرتے۔ ایسا کروگے تو عمر بھر پچھتاؤ گے میاں! عمر بھر — "

کلوا: نہیں ری بدھنا کی ماں! نہیں، یہ بات اچھی نہیں۔ ان کی چیز ان کے حوالے کر آ۔"

"بڑے آئے سمجھانے، چلو، چلو، میں یہ دھن اپنے بچوں کی قسمت سے لائی ہوں۔ اسے میں رکھوں گی، تم کون ہوتے ہو بولنے والے اس معاملے میں؟

کلوا: نہیں ری، او بدھنا کی ماں! نہیں بے ایمانی ٹھیک نہیں۔

کلوا کی ماں: ٹھیک نہیں ٹھیک نہیں۔ " بڑے آئے ایمان والے۔

"چھی اد چھی او، کرکے خون پسینہ ایک کرتے رہے پھر بھی سکھ چین کی روٹی نصیب نہ ہوئی۔ آج جب ہمارا خدا بے مانگے چھپر پھاڑ کے ہمیں دے رہا ہے تو لگے دین و ایمان کی بگھارنے۔ تمہارے لیے ٹھیک نہیں تو نہ سہی، میں تو ضرور رکھوں گی اسے۔"

کلوا: " اور اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو کیا ہوگا ری، بدھنا کی ماں! کچھ سوچا بھی ہے تو نے؟"

بدھنا کی ماں: سوچا کیوں نہیں، آخر کسی کو معلوم ہوگا تو کیسے؟ چلو، یہ دیکھو، یہ رہی تمہاری گلی، سر میں لپیٹ لیتی ہے) اب رہ گئے ایک تم؟ تو تم بس اتنا ہی کہہ دینا کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ جو کچھ پوچھنا ہو بدھنا کی ماں سے پوچھو۔ وہی جانے سب کچھ پھر تو میں سمجھ لوں گی سب۔"

(۲)

حاجی احمد: "بیگم! ارے او بیگم! سنتی بھی ہو کچھ، او بیگم!

بیگم: " ہاں!، جی ہاں، فرمایئے "

حاجی احمد: " ذرا ادھر تو آنا "

بیگم: " ابھی آئی، فرمایئے کیا بات ہے؟ (شوہر کا چہرہ دیکھ کر) ارے، ارے، یہ کیا ہو گیا آپ کو؟ آپ کے چہرے کا رنگ کیوں اڑ گیا ہے؟ آخر ہوا کیا ہے؟"

حاجی احمد: " ہوا کیا؟ — ہوا کیا؟ اس ہینگر پر — جلد بتلاؤ، میرا کرتا — ؟"

بیگم: "کرتا؟ سوچتی ہے، ارے ہاں وہ کرتا! وہ تو کلوا دھوبی کی عورت آئی تھی نا کل شام، وہ اسے دے دیا ہے۔ بہت گندہ ہو گیا تھا۔ اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ یہاں کوئی چور اچکا بسا ہے جو آپ اتنا پریشان ہو رہے ہیں؟"

حاجی احمد: " چور اچکے کی بات نہیں بیگم! تم نہیں جانتیں کہ میں کیوں پریشان ہوں۔"

بیگم: " آخر کچھ بتایئے بھی ذرا "

حاجی احمد: اس کرتے کی جیب میں سونے کی ایک گلی رکھ چھوڑی تھی میں نے — گلی۔ اب سمجھیں۔"

بیگم: " آئیں! گلی!! سونے کی گلی!!! یہ کیا غضب ہو گیا میرے اللہ —! اور آپ کی عقل پر بھی شاید پتھر ہی پڑ گئے تھے۔"

حاجی احمد: "کیا کہوں بیگم! کل ایک ضرورت سے جیب میں رکھ چھوڑی تھی وہ گلی — پہل قد کو جاتے وقت یہ بات ذہن سے بالکل ہی نکل گئی اور دوسرا کرتا پہن کر چلا گیا۔"

بیگم: "اچھا تو دوڑ کے جلو ہے کلوا کے گھر — شاید —"

حاجی احمد: شاید کی کیا بیگم! آج تو خوش حال آدمی کے ہاں بھی ایمان نہیں وہ تو بے چارہ غریب، کلوا دھوبی ہے — دھوبی ہے"

بیگم: "یہ تو میں بھی سمجھتی ہوں۔ لیکن شاید ہماری قسمت ٹھیک ہو اور اس نے وہ کرتا اب تک چھوا بھی نہ ہو"

"ہاں بھئی، ابھی جاتا ہوں۔"

"تو ہماری جلدی کیجئے۔"

(۳)

حاجی احمد: "ارے، او میاں کلوا سنتے ہو؟ او میاں کلو!"

کلوا: "کون؟ حاجی بابا!"

حاجی احمد: "ہاں۔ ہاں"

کلوا: سلام سرکار! سلام، سلام"

حاجی احمد: "سلام، سلام"

کلوا: "خیریت تو ہے سرکار! آپ اور اس غریب کے گھر! اور وہ بھی بے وقت!"

حاجی احمد: "خیریت کیا پوچھتے ہو؟ کلو میاں! وقت سب کچھ کراتا ہے"

کلوا: "جی! تو کچھ حکم سرکار!"

حاجی احمد: "حکم کیا؟ کل تمہاری گھر والی میرے کپڑے لائی ہے؟"

کلوا: جی سرکار! اری او بدھنا کی ماں! او بدھنا کی ماں! سنتی بھی ہے کچھ؟ دیکھ ہمارے حاجی بابا آئے ہیں ری حاجی بابا — ارے یہ مبارک قدم اور یہاں! ہم تو ترس گئے ری، او بدھنا کی ماں! ترے لئے"

بدھنا کی ماں: آئی بابا! ابھی آئی (بہت تیزی سے آئی) کہئے بابا کیسے یاد کیا ہم غریبوں کو۔ کہاں بٹھاؤں بابا آپ کو! ہمارے پاس تو آپ کے لائق کوئی جگہ بھی نہیں ہے!"

حاجی احمد: "یہ بیٹھنے بٹھانے کا موقع نہیں بدھنا کی ماں!"

بدھنا کی ماں: "تو پھر حکم سرکار! ہم حاضر ہیں"

حاجی احمد: "حکم کیا، کل شام کو میرا کرتا لائی تھی نا؟"

"ہاں، ہاں، لائی ہوں بابا! لائی ہوں۔ وہ تو، وہ تو، وہ دیکھئے نا یونہی مسالہ لگا کر رکھا ہے کیا ضرورت ہے؟ حکم ہو تو میں اسے ابھی دھو ڈالوں"

حاجی احمد: "نہیں، نہیں، میرا مطلب ہے کہ اسے ذرا اٹھا تو لانا۔"

بدھنا کی ماں: "ابھی لائی سرکار! ابھی"

(وہ جونہی کرتا لائی، حاجی احمد نے بڑی تیزی سے لپک کر جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر اسے ہلکا اور خالی پا کر انتہائی مایوسی کے عالم میں ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ کلوا دھوبی کو بھی ان کے حالِ زار پر ترس آ گیا۔ وہ کچھ مدد تو کر نہیں سکتا تھا۔ مگر پھر بھی بے چارہ پوچھ بیٹھا۔)

کلوا: "کیا بات ہے بابا!"

حاجی احمد: کیا کہوں بھائی کلوا! بات یہ ہے اس کرتے کی جیب میں سونے کی انگوٹھی تھی۔

کلوا: آئیں! سونے کی گلی!!

حاجی احمد: "ہاں! بھئی کلو! سونے کی گلی تھی سونے کی۔ دیکھو، بھئی کلو! ایمان بڑی دولت ہے۔ اگر ملی ہو تو کہو۔"

کلوا: جی، (حلق سے تھوک اتارتے ہوئے ایسا معلوم ہوا اب وہ اقرار کیا ہی چاہتا ہے۔ بدھنا کی ماں سمجھ گئی اور فوراً بیچ میں کود پڑی)

بدھنا کی ماں: نہ سرکار! نا، نا، ہمیں تو کوئی چیز نہیں ملی۔"

حاجی احمد: "تم نہ بولو، میں کلو سے پوچھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بے ایمان نہیں ہے۔ وہ جھوٹ بھی نہیں بول سکتا۔"

بدھنا کی ماں: نہ سرکار! وہ کیا جانے، کپڑے تو میں لائی وہ کیا جانے۔ وہ تو بدھو ہے بدھو۔

حاجی احمد: اچھا، تو تم ہی کہو، تم ہی کہو بدھنا کی ماں! سونے کی گلی ایمان اور دیانت داری سے بڑی دولت نہیں۔ بدھنا کی ماں! تم چاہو تو وہ سب دے دوں کہو تو۔ تمھیں عمر بھر کی محنت مشقت سے نجات دلا دوں، چلو، تم میرے گھر میں رہو، لیکن ذرا ایمان کی بات ہے۔ اپنا ایمان سنبھال لو۔ ایمان ہے تو سب کچھ ہے۔ ایمان نہیں تو کچھ بھی نہیں۔"

بدھنا کی ماں: "نا، بابا! نا، نا۔ ہم نے گلی نہیں رکھی ہے۔ ہمارے سر اتنا بڑا الزام نہ دھرو حاجی بابا! اگر وہ چیز ملی ہوتی تو ہم ضرور لوٹا دیتے آپ کو۔ ہم بے ایمان نہیں بابا! ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ گاہک کا سامان لوٹا دینا تو ہم دھوبیوں کا دھرم ہے بابا دھرم۔"

حاجی احمد نے بہت کچھ سمجھایا۔ بہت سارے انعام و اکرام کا لالچ بھی دیا لیکن اس دھوبن نے ایک نہ سنی۔ بات بنتی نظر نہ آئی تو وہ مایوس گھر لوٹے۔

(۴)

قاضی: حاجی احمد! تمھارے مقدمے میں [illegible] مدعا علیہ نے انکار کر دیا۔ اب کچھ سمجھانا بجھانا بھی بے کار ہے۔ تمھاری طرف سے نہ تو آنکھوں دیکھی کوئی گواہی ہے نہ کوئی دوسرا ثبوت۔ ایسے میں قانون تمھاری مدد نہیں کر سکتا۔ ہاں، تمھاری بے زبان پریشانی البتہ تمھارے دل کا حال کھول رہی ہے۔ اس لیے تم پر ترس آتا ہے اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ اب اس مقدمے کا فیصلہ ایک ہی ڈھنگ سے ہو سکتا ہے۔"

"حضور والا! میں آپ [illegible] ہوں۔ آپ کے عدل و انصاف اور آپ کی ذہانت و فطانت کی شہرت سن چکا ہوں۔ اس لیے امید ہی نہیں بلکہ ایک یقین سے حاضر خدمت ہوا ہوں۔ آپ کوشش کیجیے۔ شاید خدا مہربان ہو جائے اور کچھ صورت نکل آئے۔"

قاضی نے بہت غور و خوض کیا۔ دھوبی کو طلب کیا اور نئے ڈھنگ سے جرح شروع کر دی۔

قاضی: "ہاں، تو کلو! تمھاری بات [illegible] پچھلے بیانات سے اچھی طرح سمجھ گیا کہ تم نے گلی نہیں رکھی ہے۔ تم بھی تو یہی کہنا چاہتے ہو نا؟"

کلوا: "جی سرکار!"

قاضی: "اب کچھ دوسری باتیں دریافت طلب ہیں، ٹھیک ٹھیک جواب دوگے نا؟"

کلوا: "جی ہاں، حضور والا!"

قاضی: ہاں تو یہ بتاؤ کہ حاجی احمد کا کرتا تم نے مسالے میں کب ڈالا؟"

کلوا: "حضور والا! پرسوں شام ہی کو"

قاضی: اس وقت وہاں پر کون کون تھا؟"

کلوا: حضور والا! میرا چھوٹا بچہ اور میری بیوی"

قاضی: "تمھارا بچہ کیا کر رہا تھا؟"

کلوا: "وہ ماں کے پاس زمین پر کھیل رہا تھا"

قاضی: "اس کی ماں کیا کر رہی تھی؟"

کلوا: "سامنے والے دالان میں روٹی پکا رہی تھی"

قاضی: "اور بھی تھا کوئی گھر میں؟"

کلوا: "ہاں، میرا ممیرا بھائی مہمانی میں آیا تھا"

قاضی: "وہ کہاں تھا؟"

کلوا: "وہ باہر دروازے پر پلنگ ڈالے آرام کر رہا تھا"

قاضی: اس وقت کوئی گاہک بھی آیا تھا؟"

کلوا: "جی، ذلو بنیئے کا نوکر کپڑے لینے آیا تھا"

قاضی: "کیا اس نے دھلائی میں کچھ دیا بھی تھا؟"

کلوا: "جی سرکار سوا روپئے"

قاضی: "اور بھی کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

کلوا: "جی، نہیں سرکار! مجھے کچھ نہیں کہنا ہے"

قاضی: "اچھا تو تم یہیں رہو۔ میں تمھارے بیان کی تصدیق کے لیے آدمی بھیج رہا ہوں"

(قاضی نے اپنے ایک نہایت معتبر کارندے کو خلوت میں بہت کچھ سمجھایا اور دھوبی کے گھر بھیج دیا۔)

(۵)

کارندہ: "دھوبن! او دھوبن! اری او دھوبن! کیا کلو دھوبی کا یہی گھر ہے؟"

بدھنا کی ماں: "جی سرکار!"

کارندہ: "تو کیا تو کلوا دھوبی کی عورت ہے؟"

بدھنا کی ماں: "جی سرکار!"

کارندہ: "تو آ، اب تیرا بھی بیان لے لوں، آخر اس نے تو تم سبھوں کو پھنسا ہی دیا"

بدھنا کی ماں: "یہ کیسے سرکار!"

کارندہ: "اس نے حاجی احمد کے سونے کا اقرار کرلیا ہے اور تجھے بھی پھنسا دیا ہے"

بدھنا کی ماں: "یہ نہیں ہو سکتا سرکار!"

کارندہ: "ہو کیوں نہیں سکتا؟ تیری سمجھ میں نہیں آیا تو اچھا تو ہی بتا کہ اس کی بیان کی ہوئی کون سی بات غلط ہے۔ بول، پرسوں شام کو اس نے وہ کرتا مسالے میں ڈالا تھا نا"

بدھنا کی ماں: "جی ہاں سرکار!"

کارندہ: "اس وقت تیرا بچہ تیرے پاس ہی کھیل رہا تھا نا؟"

بدھنا کی ماں: "جی ہاں حضور!"

کارندہ: "اس دن کلوا کا ممیرا بھائی آیا تھا نا؟"

بدھنا کی ماں: جی ہاں حضور! آپ کو یہ کیسے معلوم

کارندہ: "اور، اور وہ اس وقت باہر دروازے پر آرام کر رہا تھا نا"

بدھنا کی ماں: یہ بھی ٹھیک بات ہے سرکار!"

کارندہ: اور اسی شام کو دِلّو بنیئے کا نوکر آیا تھا نا؟"

بدھنا کی ماں: جی سرکار! یہ آپ کو کیسے معلوم؟"

کارندہ: اب تو خود ہی سمجھ۔ اور ہاں بتا وہ دھلائی کا سوا روپیہ بھی دے گیا تھا!"

بُدھنا کی ماں: "جی ہاں سرکار! بالکل ٹھیک"

کارندہ: "تو پھر، بالکل ٹھیک کی بچی! اب تو ہی بتا کہ یہ ساری باتیں جو اس نے بیان کی ہیں جب ٹھیک ہی ہیں تو پھر ایک سونے کی گِلّی والی بات غلط کیوں ہو جائے گی؟ یہی وجہ ہے کہ میں کہہ رہا ہوں کہ تم سب کے سب بہت برے پھنسے۔

وہ تو یہ کہو کہ قاضی کا رخ بہت سخت دیکھ کر مجھے ترس آگیا۔ اور بیان کی تصدیق کا بہانہ کر کے چلا آیا۔ دیکھو بی دھوبن! ابھی کچھ زیادہ نہیں بگڑا ہے۔ اب بھی تم چاہو تو میں معاملہ سنبھال لوں اور سب کو بچا لوں۔ شرط صرف یہ ہے کہ تو گِلّی میرے حوالے کر دے میں قاضی سے سفارش کر کے سب کچھ ٹھیک کرا دوں گا۔ ورنہ تیرا کلوا تو گیا ہی۔ اب تیری اور تیرے بال بچوں کی بھی خیر نہیں"

دھوبن کو کلوا پہ پہلے بھی کچھ زیادہ اعتماد اور بھروسا نہ تھا۔ وہ اسے بدھو ہی سمجھتی۔ کارندے کی باتوں سے اسے یقین ہو گیا کہ کلوا نے ضرور اقرارِ جرم کر لیا ہے اور ہم سب کے سب برے پھنسے۔ وہ اندر ہی اندر گھبرانے لگی اور انجام کو سوچ کر ڈر گئی۔ اس نے گھر سے سونے کی گِلّی نکالی اور کارندے کے سامنے پیش کرتی ہوئی بولی "لو بابا! لو! یہ ہے حاجی بابا کی چیز۔ ہم باز آئے ایسے دھن سے۔ جس طرح میں آپ کی بات مان گئی اسی طرح خدا کے لیے آپ بھی ہم پر ترس کھائیں اور اور قاضی سے رحم کی سفارش کریں۔ اب اسی میں ہے میری بھی خیر اور میرے کلوا کی بھی خیر"

ایک آدمی گھبرایا ہوا تھانے میں آیا اور تھانے دار سے بولا "جناب میری جان خطرے میں ہے"

"کیوں کیا بات ہے"

"جناب مجھے ایک گم نام خط ملا ہے کہ اگر آئندہ میری مرغیاں چراؤ گے تو تمہاری جان کی خیر نہیں"

تھانے دار نے کہا۔ "پھر تم مرغیاں چراتے ہی کیوں ہو؟"

"لیکن جناب۔ خط لکھنے والے نے اپنا پتہ بھی نہیں لکھا۔ مجھے کیسے معلوم ہو گا کہ کس کی مرغیاں نہ چراؤں"

ڈاکٹر: بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ نے مجھے جو چیک دیا وہ بینک نے واپس کر دیا۔

مریض:۔ اس میں افسوس یا شکایت کی کیا بات ہے۔ میری کمر کا درد بھی تو واپس آگیا ہے۔

"بابا اس غریب اندھے کو دس پیسے دے دو"

"مگر تمہاری تو ایک ہی آنکھ خراب ہے"

"اچھا بابا تو پھر پانچ ہی پیسے دے دو"

جناب محمد شاہد عظیم

خوب چھٹی منائی

(مرکزی خیال ولیم کوپر کی انگریزی نظم سے لیا گیا)

صبح وہ اسے ایک بیکار سی بات کہہ کر ٹال گیا تھا اس کی نظروں میں تفریح صرف بیکار آدمیوں کا مشغلہ تھی۔ دراصل وہ بے حد درجہ تنہائی پسند واقع ہوا تھا اس کی شادی کو بیس برس ہو چکے تھے لیکن اس نے ایک سال بھی کہیں سیر کو جانے کا پروگرام نہیں بنایا۔

ایک دو بار اس کی بیوی نے خواہش ضرور کی کہ وہ چھٹی کا دن کہیں کسی اچھے تفریحی مقام پر گزاریں لیکن پھر وہ اپنے شوہر کی مرضی نہ پا کر چپ رہی اگر کبھی اصرار بھی کرتی تو وہ سختی کے ساتھ ٹال جاتا۔

رات کے کھانے پر اس کی بیوی نے یہی بات چھیڑ دی۔ وہ کہنے لگی۔ جان، آج تو خدا کے لیے مان بھی جاؤ۔ روزی نے دعوت دی ہے۔ اس نے چھٹی منانے کے لیے ایڈمنٹن (ایک قصبے کا نام) کو پسند کیا ہے تم بھی چلو نا۔ بہت اصرار کرنے پر اسے اپنی بیوی کی بات ماننی ہی پڑی۔

لیکن جان — تم ہمارے ساتھ بگھی میں کیسے بیٹھ سکو گے۔ پہلے ہی جگہ کم ہے اور پھر روزی کے دونوں بچے بھی تو ساتھ رہیں گے۔ بات ٹھیک ہی تھی۔ ان کا گھوڑا پہلے ہی بیمار پڑا تھا۔ جان کی لاپرواہی نے اسے موت کے قریب کر دیا تھا۔ اگر اب اس پر سواری کی جاتی وہ شاید مر ہی جاتا۔ بہت دیر سوچنے کے بعد بھی کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی۔ جان اپنے دوستوں کا احسان مند بننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک رشتہ دار کے پاس اس نے اپنے نوکر کو روانہ کیا لیکن وہ مایوس لوٹ آیا۔

"جان — تم والڈ کو تو بھول ہی گئے تمہارا بڑا بھائی۔" اس کے پاس دو تین بہترین قسم کے گھوڑے ہیں کیا وہ ایک دن کے لیے بھی اپنا کوئی گھوڑا نہیں دے گا۔" اس کی بیوی بولی۔ "ارے ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا۔ ابھی نوکر بھیجتا ہوں، صبح ہوتے ہوتے وہ کوئی بھی گھوڑا لے کر واپس آ جائے گا" جان نے جواب دیا اس کی بیوی مطمئن ہو گئی۔

صبح گھوڑے کے آنے پر وہ اس پر بیٹھ کر ایڈمنٹن روانہ ہو گیا گھوڑا شاید نیا تھا۔ پہلے تو وہ آہستہ آہستہ چلتا رہا کیونکہ راستے میں پتھر پڑے ہوئے تھے۔ مگر جونہی راستہ صاف ملا

نا سرپٹ دوڑنے۔ جان کے حواس گم ہوگئے۔ اسی
براہٹ میں باگ بھی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اب
موڑا بالکل آزاد تھا۔ اُس نے رفتار تیز کردی۔

باگ تو کب کی چھوٹ چکی تھی وہ گھبرا کر اس
ی گردن سے چمٹ گیا راستے میں ایک جگہ اس کی ٹوپی
چھل کر دور جا پڑی اور اس کے ساتھ ہی نقلی بالوں
ی "وگ" جو اس نے اپنے گنجے سر کو چھپانے کے
لیے پہن رکھی تھی۔ پر بھی ٹوپی اور بالوں کی فکر کون
کرتا یہاں تو جان کے لالے پڑے تھے۔ اور گھوڑا
تھا کہ ان تمام باتوں سے بے خبر اڑا چلا جا رہا تھا
ہ پہلے یہ نہیں سمجھ سکا کہ گھوڑا اپنے مالک کے
گھر "ڈیر" جا رہا ہے۔

عام راستوں پر بھلا دوڑ کس نے دیکھی تھی لوگ
س دلیری پر حوصلہ افزا نعرے لگائے بغیر نہ رہ سکے۔
"بہت اچھے"، "بہت خوب" جان اس حد تک بدحواس
ہو چکا تھا کہ اس نے ایک مرتبہ بھی پلٹ کر نہ دیکھا جب
وہ ایڈمنٹن سے گزرا تو اس کی بیوی نے آواز دی
"ٹھیرو۔ ٹھیرو جان، تمہیں یہیں رُکنا ہے۔"

جان نے بھی چیخ کر کچھ کہا لیکن وہ نہ سن سکی
کیونکہ گھوڑا چشم زدن میں اس کے سامنے سے گزر
گیا تھا۔

اپنے کان پیچھے چپکائے اور طوفانی رفتار سے
اپنے پاؤں تلے زمین کو روندتا ہوا وہ رفتار مسلسل
تیز کرتا جا رہا تھا۔ سامنے ایک ٹیلے پر ہوا چکی اپنے ہاتھ
پھیلائے کھڑی تھی گویا اس کا راستہ روکنا چاہتی ہو
داہنی طرف ندی کے کنارے چراگاہیں تھیں
اور بائیں طرف رائی کا ایک کھیت اونچی نیچی سطح پر
آفق تک پھیلا ہوا تھا پکی ہوئی رائی کی بالیاں ہوا میں
جھوم رہی تھیں۔

سڑک کے کنارے پوست کے سُرخ پھول
کھلے ہوئے تھے۔ چاروں طرف مکمل خاموشی اور نا قابل
برداشت گرمی تھی۔ لیکن دور، جہاں دریا کی سنہری
مٹی سورج کی دھوپ کا مزہ لے رہی تھی۔

لوگوں کا شور و غل سنائی دے رہا تھا۔ گھوڑا اسی
برق رفتاری کے ساتھ نیچے چراگاہوں کی طرف چلا جا رہا
تھا۔ "گھوڑا اگر کہیں لڑ گیا تو ہم لوگوں کا خاتمہ یقینی
ہے۔" ایک لمحے کے لیے یہ خیال جان کے ذہن میں بجلی
کی طرح کوند گیا لیکن اب رکنے کا کوئی سوال ہی
نہیں تھا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر جھک کر چپ چاپ
سنسناتی ہوئی ہوا کی سیٹیاں سننے کے علاوہ اب
اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ ادھر گھوڑے نے
ٹھان لی تھی کہ وہ اپنے مالک کے گھر "ڈیر" پہنچ کر ہی
دم لے گا، جو وہاں سے ابھی آٹھ نو میل دور تھا۔

والٹر جان کو اس حالت میں دیکھ کر ہنسے بغیر نہ رہ
سکا۔ جب وہ چپ ہوا تو جان نے اس سے کوئی دوسرا
گھوڑا مانگا لیکن اس کے پاس اس وقت اصطبل
میں کوئی دوسرا گھوڑا موجود نہیں تھا۔ البتہ اس نے
جان کو ٹوپی اور نقلی بالوں کی وگ ضرور دی اور اسے
گرم گرم چائے کی ایک پیالی دی کہ وہ اسے پی کر اپنی
تھکن دور کر سکے۔ جان نے گھوڑے کی پیٹھ تھپتھپائی
اور اسے چمکارا۔ گھوڑا پندرہ میل کی لمبی دوڑ کے باعث
ہانپنے لگا تھا۔ اس وقت دن کے تقریباً بارہ بجے تھے
اور دھوپ میں تیزی سختی آگئی تھی۔ جان واپس

لہ قصبے کا نام

ے بیٹے گھوڑے پر چڑھا اور ابھی وہ گھوڑے
تھا کہ پیچھے گلی میں کھڑے ایک گدھے نے
رع کیا۔ گھوڑا پہلے ہی کافی گھبرایا ہوا تھا
خوفزدہ ہوگیا اور سمجھا کہ پیچھے سے کوئی بلا
ہے اور بہتر اسی میں ہے کہ بھاگ نکلے۔
موڑا اب دوبارہ دیرے ایڈمنٹن جانے
ک پر برق رفتاری سے دوڑ رہا تھا.....
ھر اس کی بیوی دھوپ میں ٹہلتی ہوئی گھڑی
ہر کا انتظار کر رہی تھی۔ گھوڑے کو بے تحاشہ
دیکھ کر اس نے پہلے ہی تاڑ لیا تھا کہ گھوڑا
ہا ہے۔ اس نے جو جان کو گھوڑے پر سوار
نے آتے دیکھا تو سمجھی کہ کوچوان کو آواز دی
بلندی اس نے سارا معاملہ سمجھایا۔ وہ گھوڑا
ر جان کے قریب ہوگیا۔

دچوان گھوڑے کو تو نہیں روک سکا۔ البتہ
ور بھی خوفزدہ ہوگیا۔ جان آگے اور وہ
اس کے پیچھے روکو، روکو، چیختا جا رہا
گوں نے اس مرتبہ بہت اچھے، بہت خوب
ے تو نہیں لگائے لیکن وہ چلا اٹھے چور چور
راستہ پیچھے اس قسم کی آواز سے گونج اٹھا۔
بنا پیچھا نہ چھوڑنے پائے۔

س کی حالت ہی کچھ ایسی ہو رہی تھی کہ لوگ
ر سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ پہلے کی طرح
ر نقلی بال اس دوڑ کی نذر ہو گئے تھے۔ وہ
ے کی گردن سے چپٹا بیٹھا تھا اور پیچھے وہ
وان کوچوان اسے مسلسل روکنے کے لیے کہہ
چور چور کی آواز سن کر لوگ اپنی اپنی

کھڑکیوں سے جھانکنے لگے تھے۔ گھوڑا اب تنگ گلی کوچوں سے نکل کر لندن کی ایک کھلی سڑک پر آ گیا تھا۔ اور سرپٹ دوڑ رہا تھا۔

لوگوں نے دیکھا کہ چور ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے تو دو تین گھوڑے سوار مل کر جان کا پیچھا کرنے لگے۔ گھوڑا دوڑ لگاتے ہوئے جان اپنے بنگلے کے قریب پہنچا تو چوکیدار نے لپک کر گیٹ کھول دیا۔ گھوڑا برآمدے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

پیچھا کرنے والوں کو جب اصل بات کا پتہ لگا تو ہنستے ہوئے چلے گئے۔ جان گھوڑے سے اتر کر بمشکل چلتا ہوا اپنے کمرے تک پہنچا اور ایک آرام کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گیا۔ اس کا ایک ایک جوڑ دکھ رہا تھا۔ کپڑے گرد آلود ہو گئے تھے اور گھوڑا الگ کھڑا ہانپ رہا تھا۔ گھوڑے کا خیال آتے ہی وہ بس دانت کچکچا کر رہ گیا۔

قیمت

از: پرم سکھ دیسائی

ایک گجراتی کہانی

ترجمہ: اقبال امروہوی

گجرات کے شہر راجکوٹ میں ایک ٹھاکر رہتا تھا لوگ اُسے دیوان صاحب کہتے تھے اس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ بیوی بھی مرچکی تھی۔ بالکل اکیلا تھا۔ دن بھر کوئی کام نہیں تھا۔ تھوڑی بہت زمین تھی۔ اُس میں مزدوروں کے ذریعے کھیتی کروا لیا کرتا تھا بیکار اور نِٹھلوے لوگوں کی طرح وہ دن بھر اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا یا لوگوں کے پاس بیٹھ کر اپنا وقت کاٹ دیتا لیکن لوگ اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اس میں ڈینگیں مارنے کی عادت تھی ہر وقت اپنی اور اپنے خاندان والوں کی بڑائی اور من گھڑت قصّے سُنا سنا کر لوگوں کا وقت ضائع کرتا تھا۔

ایک دن دیوان سڑک کے کنارے کھڑا ایک امیر آدمی سے باتیں کر رہا تھا۔ سڑک پر دور سے ایک گاڑی اس طرف آتی دکھائی دی۔ گاڑی میں اناج کے بورے اوپر تک بھرے تھے۔ شام ہو چلی تھی اور عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے دیوان کو کچھ کم نظر آتا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے سڑک پر ہاتھی آرہا ہے امیر سے کہنے لگا "واہ کتنا بڑا ہاتھی ہے۔ میرے دادا کے پاس بھی بالکل ایسا ہی ایک ہاتھی تھا وہ ہاتھی راجہ کو بہت پسند تھا اس نے بہت کوشش کی کہ میرے دادا یہ ہاتھی راجہ کے ہاتھ فروخت کر دیں مگر دادا نے راجہ کی بات نہ مانی۔"

امیر نے مڑ کر دیکھا ارے! وہ تو بیل گاڑی تھی امیر آدمی ہنس کر کہنے لگا۔

"دیوان صاحب ہاتھی کہاں ہے؟ وہ تو اناج کے بوروں سے لدی ہوئی بیل گاڑی ہے۔"

دیوان نے کہا:۔

"اجی حضرت شاید بڑھاپے کی وجہ سے آپ کی نظر کمزور ہو گئی ہے ہاتھی تو صاف دکھائی دے رہا ہے۔"

امیر نے پھر کہا "معاف کیجئے دیوان صاحب ہاتھی نہیں گاڑی ہے اندھیرے میں آپ کو ہاتھی جیسی دکھائی دیتی ہے۔"

یہ سُن کر دیوان کو غصہ آگیا طیش میں آکر بولا "اچھی بات ہے۔ اگر ہاتھی ہوا تو میں آپ کا سر کاٹ لوں گا۔ گاڑی ہوئی تو آپ میرا سر کاٹ لینا! یہی ہماری آپ کی شرط ہے۔"

امیر ہنسا اور بولا یہ شرط مجھے منظور ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد گاڑی قریب آئی تو دیوان نے

غور سے دیکھا تو سچ مچ بوروں سے لدی ہوئی بیل گاڑی تھی
اب تو دیوان بہت شرمندہ ہوا امیر نے کہا "دیکھا آپ نے ہے نا گاڑی اب آپ ہار گئے دیوان صاحب"۔

"خیر کوئی بات نہیں جانے دیجیے" امیر نے کہا

امیر کو یہ امید تھی کہ اس طرح دیوان شرمندہ ہو کر چلا جائے گا اور آئندہ اس طرح ڈینگیں مارنا چھوڑ دے گا لیکن دیوان نے کہا۔

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اپنی زبان کے پکے ہوتے ہیں آپ کو میرا سر کاٹنا پڑے گا۔

امیر نے کہا" ٹھیک ہے لیکن شرط میں جیتا ہوں میں آپ کو معاف کرتا ہوں"

دیوان نے کہا: " مجھے معافی کی ضرورت نہیں۔ میرے خاندان کے کسی آدمی نے آج تک کسی کا احسان نہیں لیا آپ کو میرا سر کاٹنا ہوگا"

اس طرح بات بڑھتی گئی لوگ جمع ہو گئے مگر سب پریشان تھے کہ فیصلہ کس طرح ہو آخر طے ہوا کہ یہ مقدمہ گاؤں کے سرپنچ کے پاس لے جائیں۔"

دونوں سرپنچ کے پاس پہنچے سرپنچ نے دونوں کی بات سن کر بہت غور کیا اور یہ فیصلہ سنایا۔

"یہ سچ ہے کہ دیوان صاحب شرط ہار گئے اور ان کا سر امیر کی ملکیت ہو گیا ہے لیکن وہ اپنی خواہش کے مطابق جب چاہے اسے کاٹ سکتا ہے اس پر دباؤ ڈالنے کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے۔

یہ فیصلہ سن کر امیر تو خاموش ہو گیا مگر دیوان صاحب نے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا انھوں نے کہا میرا سر آج سے امیر کی ملکیت ہو گیا ہے اس کی حفاظت اور دیکھ بھال بھی انھی کے ذمے ہے میں آج سے اپنے سر کی ذمہ داری سے چھوٹ گیا۔

امیر نے لاچار ہو کر دیوان کی بات مان لی اور وعدہ کیا کہ وہ ان کے سر کی حفاظت کرے گا۔

اب دیوان صاحب ہر وقت امیر کے پیچھے رہتے وہ طرح طرح سے امیر سے رقم وصول کرتے اور ہر وقت امیر کو یاد دلاتے رہتے کہ ان کے سر کی دیکھ بھال امیر کے ذمے ہے۔

امیر اس روز روز کی مصیبت سے تنگ آ گیا ایک دن اس نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا کہ کس طرح اس دیوان سے پیچھا چھڑایا جائے۔ امیر کے دوستوں نے مل کر ایک ترکیب سوچی اور امیر سے اس کا ذکر کیا۔ امیر یہ ترکیب سن کر بہت خوش ہوا۔

دوسرے دن ان کے منصوبے کے مطابق ایک شخص اپنے ہاتھ میں ایک تیز چھری لئے اور ایک خون میں بھیگی ہوئی چمڑے کی تھیلی کندھے پر ڈالے اس گلی میں آیا جس میں امیر کا گھر تھا۔ وہ زور زور سے آواز لگا رہا تھا

" میں کان اور ناک خریدتا ہوں" اپنی ناک اور اپنے کان ہزاروں روپے میں بیچ دیجیے۔

امیر نے یہ آواز سنی تو اسے بلایا اس وقت دیوان صاحب امیر کے پاس بیٹھے تھے۔ امیر نے اس شخص سے پوچھا "تم کیا کیا خریدتے ہو"

اس آدمی نے کہا" میں ناک اور کان خریدتا ہوں"۔

"ناک اور کان —" امیر نے کچھ بن کر تعجب سے پوچھ "کیا قیمت دیتے ہو"

اس شخص نے کہا" اگر کوئی بڑے گھر کا انسان ہو تو اس کی ناک کے دو ہزار روپے اور کانوں کے ایک ہزار روپے دیتا ہوں"

یہ سن کر امیر نے دیوان صاحب کی طرف اشارہ کیا اور

کہا "یہ دیکھو یہ ٹھاکر صاحب ہیں بہت اونچے خاندان کے ہیں فی الحال ان کا سر میری ملکیت ہے تم ان کے کان اور ناک کاٹ لو اور مجھے تین ہزار روپے دے دو۔"

دیوان نے یہ سن کر بہت گھبرایا۔ اس نے کہا "یہ کیا غضب کر رہے ہو میری ناک اور کان کٹوا رہے ہو۔؟"

امیر نے کہا دیوان صاحب آپ کا سر میری ملکیت ہے اس پر میرا حق ہے میں جو چاہوں کروں اس کی حفاظت پر میں خرچ کرتا ہوں اب اس سے جو آمدنی ہوگی وہ بھی میری ہوگی

دیوان صاحب نے امیر سے درخواست کی کہ آج کا دن رہنے دو ہم پھر سرپنچ کے پاس چلتے ہیں۔ امیر نے کہا اچھی بات ہے۔ اس کے بعد امیر نے کہا "تم کل اسی وقت اسی جگہ پر آجانا اور اٹھ کر سرپنچ کے گھر چل دیا۔

سرپنچ نے پورا واقعہ سنا تو وہ من ہی من میں ہنسنے لگا اس نے غور کیا اور فیصلہ سنایا۔

"دیوان کا سر امیر کی ملکیت ہے امیر جو چاہے کر سکتا ہے۔ اسے پورا پورا اختیار ہے چاہے پورا سر کاٹ لے یا اس کا کچھ حصہ کاٹ کر فروخت کرے۔"

اب تو دیوان صاحب بہت گھبرائے انھوں نے چیخ کر کہا کہ یہ میرے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔

سرپنچ نے انھیں سمجھایا اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے تمہارا سر امیر کی ملکیت ہے تم اس سے اپنا سر خرید لو وہ تین ہزار روپے میں صرف ناک اور کان فروخت کر رہا ہے۔ بولو تم پورے سر کی کیا قیمت دوگے اب دیوان صاحب کو عقل آئی سوچنے لگے کہ برے پھنسے۔

آخرکار دیوان کو اپنے سر کا سودا پانچ ہزار روپے میں طے کرنا پڑا انھوں نے اپنی تمام جائداد فروخت کرکے امیر کو پانچ ہزار روپے ادا کئے اور ہمیشہ کے لیے اس گاؤں سے چلے گئے۔

(یہ کہانی چندا ماما (گجراتی) سے لی گئی ہے)

والدین کی نافرمانی کا انجام

نادکؔ حمزہ پوری

پیپل کی اونچی ٹہنی پر   چڑیا اور چڑے کا تھا گھر
ان کے دو ننھے بچے تھے   چینو چنی نام تھے ان کے
دانہ چگ کر وہ لاتے تھے   بچے خوش ہو کر کھاتے تھے
جب دونوں کچھ ہوئے سیانے   ماں اک روز لگی سمجھانے
"دیکھو ہم جاتے ہیں باہر   چین سے رہنا گھر کے اندر
جلدی واپس آئیں گے ہم   ڈھیر سی چیزیں لائیں گے ہم
آپس میں مل جل کر رہنا   گھر کے باہر قدم نہ رکھنا"
گھر سے ہوئی روانہ چڑیا   لانے دُنکا دانہ چڑیا
تھوڑی دیر رہے چپ دونوں   آنکھیں میچے تھے چپ دونوں
منی تھی لیکن کچھ چنچل   گھر میں اسے نہ پڑتی تھی کل
بولی چینو سے "چل باہر   دیکھیں اغل بغل کا منظر"
"چپ بیٹھی رہ" چینو نے ڈانٹا   "ماں کا کہنا یاد نہیں کیا"
لیکن وہ نٹ کھٹ دیوانی   کر بیٹھی اپنی من مانی
لگی دیکھنے اچک کر   من بھاون تھا موہک منظر
جوش میں آ کر زور سے اچھلی   لیکن سنبھل نہ پائی پگلی
گر کر جان گنوائی اپنی   جیسی کرنی ویسی بھرنی

ماں کا کہنا جو کرتی ناداں !!
مفت میں کیوں کھوتی اپنی جان

ناق احمد

تین کہانیاں

ہر بچے کو شوق ہوتا ہے کہ وہ کہانی سنے ۔ اور اس کا یہ شوق بہت پرانا ہے ۔ ہزاروں سال پرانا ۔ جب سے دنیا بنی ہے تب سے کہانیاں سننا اور سنانا بڑا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے ۔ جو ملک کہانیوں کے سلسلے میں بہت پرانے مانے جاتے ہیں ان میں مصر، ہندوستان یونان اور عرب شامل ہیں ۔ ان ملکوں میں بڑے پرانے زمانے سے کہانیاں سنانے کا شوق رہا ہے ۔

یونان میں ایک غلام تھا جس کا نام ایسپ AESOP تھا ۔ اس کی کہانیاں بڑی مشہور ہیں ۔ ۲ ہزار سال بیت گئے مگر آج بھی اس کی کہانیاں بڑی دلچسپی سے پڑھی اور سنی جاتی ہیں ۔ ایسپ کو جب اس کے آقا نے آزاد کر دیا تو اسے بادشاہوں کے دربار میں بڑے عہدے ملے ۔ اس نے بادشاہوں کو جو کہانیاں سنائیں ان سے انھوں نے بڑے سبق حاصل کئے ۔ ایسپ کی کہانیوں میں جانور، درخت، پتھر سب ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں اور یہ باتیں بڑی دلچسپ اور نصیحت دینے والی ہوتی ہیں ۔

اردو میں ان کہانیوں کو "حکایات لقمان" کہا جاتا ہے ۔ آؤ آج تمھیں ہم ایسپ کی دو کہانیاں اور ایک عربی کہانی سنائیں ۔ (آفاق احمد)

پہلی کہانی ایک درخت کی ہے جو اپنے آس پاس کے سارے درختوں سے اونچا تھا اور بڑی شیخی بگھارا کرتا تھا ، کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا ۔ اس کے نیچے ایک کروندے کی جھاڑی تھی ۔ وہ جب اس کی شیخی سے تنگ آ گئی تو بولی

"میں اگر تم جیسی اس طرح لمبی ہوتی تو بھی اس طرح بڑھ بڑھ کر باتیں نہ کرتی ۔"

اونچے درخت نے حقارت سے جواب دیا "تجھ جیسی گری پڑی اور حقیر جھاڑی اس درخت کی باتوں اور راز ان کو کیا سمجھے گی جس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں ۔"

کروندے کی جھاڑی کہنے لگی : "میاں اتنا

اتراؤ نہیں۔ وہ وقت دور نہیں ہے جب لکڑ ہارا آئے گا اور اپنی تیز کلہاڑی سب سے پہلے تم پر چلائے گا سب سے زیادہ لکڑی تم ہی میں ہے۔ میں تب بھی یہاں باقی اور زندہ رہوں گی مگر تم کہاں! اور تب تم سوچو گے کہ کاش تم بھی میری طرح کرو ندے کی جھاڑی ہوتے۔"

اور ایک دن ایسا ہی ہوا بھی "درخت لکڑہارے کی کلہاڑی سے نہ بچ سکا۔ سچ ہے غرور کا سر نیچا!

ایسپ کی یہ دوسری کہانی ایک چالاک لومڑی اور بلی کی ہے

لومڑی بڑی شیخی خور تھی۔ اُسے اپنی عقل پر بڑا ناز تھا مگر دونوں ہی کتوں کے مارے بڑی پریشان تھیں۔

ایک دن لومڑی بولی۔ "بی میاؤں مجھے سو طریقے آتے ہیں اپنے دشمن کتوں سے بچنے کے۔ بھلا کیا سمجھتی ہو تم مجھے!"

بلی نے کہا: "ہائے غضب! مجھے تو صرف ایک ہی طریقہ آتا ہے۔ بی لومڑی ہمیں بھی دو چار گر بتا دو۔"

لومڑی نے نخرے دکھاتے ہوئے کہا: "اچھا کسی دن جب مجھے کوئی کام نہ ہوگا تو ایک دو گر تمہیں ضرور بتاؤں گی۔"

اور ان دونوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ انہیں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آئیں اور پھر انہیں کتوں کا ایک جھنڈ اپنی طرف آتا نظر آیا۔ بلی نے جیسے ہی ان کتوں کو اپنی طرف آتے دیکھا وہ بجلی کی سی تیزی سے قریب کے ایک گھنے درخت پر چڑھ گئی۔ اپنے کو پتوں میں چھپا لیا۔ اور وہاں سے جھانکتے ہوئے لومڑی سے بولی!

"بس میرے پاس تو یہی ایک گر تھا میں نے آزما لیا۔ اب تم بتاؤ تم اپنے گروں میں سے کون سا آزما رہی ہو۔"

"سوچتی ہوں" لومڑی بولی۔

اور پھر وہ سوچنے لگی کہ اس وقت کون سا گر بچنے کے لیے مناسب رہے گا۔ وہ سوچتی رہی۔ کتے قریب آ گئے۔ اور آخر لومڑی نے فیصلہ کیا کہ اُسے فوراً بھاگ کر جان بچانی چاہیے۔

لیکن اس نے سوچنے میں بہت دیر کر دی تھی۔ کتوں نے اُسے دبوچ لیا اور اس کا خاتمہ کر دیا

امریکہ میں جب بچوں کو یہ کہانی سناتے ہیں تو بچوں کو یہ بھی سمجھاتے ہیں کہ ایک کارآمد گر آزمانا ہی اچھا ہے۔ ورنہ سیکڑوں بیکار گروں کو سوچنے میں تو جان ہی جاتی ہے

آخر میں ہم آپ کو ایک عربی کہانی سناتے ہیں۔ عرب میں بچوں کو یہ کہانی ان کی مائیں ضرور سناتی ہیں تاکہ وہ ایماندار بنیں اور جو وعدہ کریں پورا کریں

کئی ہزار سال گزرے عرب میں ایک شخص سموئل بن عادیہ رہتا تھا۔ وہ بڑی آن بان والا تھا۔

ان دنوں عرب کا ایک سردار بیمار ہوا اور اس نے اپنے ہتھیار سموئل کو دئے اور کہا جب اس کا بیٹا آئے تو یہ امانت اُسے دے دینا۔ سموئل نے وعدہ کیا۔

سردار مرگیا۔ مگر سردار کے یہ ہتھیار بڑے مشہور تھے بادشاہ کو خبر ملی تو اُس نے سموئل سے کہلا بھیجا کہ وہ ہتھیار اسے دے دے۔

سموئل نے انکار کیا تو بادشاہ نے سموئل کے قلعے پر دھاوا بول دیا اور اس کے بیٹے کو گرفتار کر لیا اور کہا کہ اگر ہتھیار نہ دیئے تو وہ اُسے مار ڈالے گا۔

سموئل نے کہا، "کچھ بھی کر و میں وعدہ نہ توڑونگا"

بادشاہ بہت ناراض ہوا اور اُس نے سموئل کے سامنے اس کے بیٹے کو مار ڈالا۔ مگر سموئل نے ہتیار نہ دینا تھے نہ دیئے۔

بادشاہ پر اس کا بڑا اثر ہوا اور وہ یونہی ہتھیار لیے واپس ہو گیا۔

آخر سردار کا بیٹا آیا تو سموئل نے سردار کی اس کے بیٹے کو سونپ دی۔ اپنا وعدہ پورا کیا نب کا دن ہے اور آج کا دن ہے عرب جب کوئی وعدہ کرتا ہے اور کسی کی امانت رکھتا تو لوگ دعا دیتے ہیں کہ اُسے سموئل بن عادیہ ہمت ملے جو اپنے وعدہ کو پورا کرنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے نہیں چوکا۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو بھوپال)

تصنیف:- نیما یوشیج

ترجمہ: حمید عثمانی

ہرن اور چڑیاں

(فارسی کہانی)

ایک بہت بڑا جنگل تھا اُس جنگل میں بہت سی چڑیاں ہرن، وغیرہ رہا کرتے تھے وہاں ایک بڑا سا تالاب بھی تھا۔ اس تالاب کے کنارے سب چڑیاں اور چوپائے اکٹھے ہوا کرتے تھے۔

جنگل میں چڑیوں اور چوپایوں کے سوا اور کوئی جانور نہیں رہتا تھا۔ چڑیوں اور چوپایوں کی خوش حالی اور زندگی کا دارومدار تالاب پر تھا۔

بہار کے زمانے میں تالاب کا پانی بڑھ جاتا تھا اور اس کے چاروں طرف رنگ برنگے پھول جیسے: مرغِ کیس، پوپی، کارن فلاور اگ آیا کرتے تھے ۔۔۔!

چڑیاں اور چوپائے اِن کی پتیاں اور دانے کھایا کرتے تھے اور جب انھیں پیاس لگتی تو تالاب پر چلے جاتے تھے۔

رات کو آسمان پر بجلی چمکتی پھر بارش ہونے لگتی تھی اور جنگل ہریالی اور تازگی سے بھر جاتا تھا ان دنوں بولنے والی چڑیوں کی چہکار سے جنگل گونجنے لگتا تھا۔ چڑیوں اور ہرن وغیرہ میں بڑی دوستی تھی۔

ایک سال اِس سے پہلے کہ بارش ہو یا برف گرے اور تالاب پانی سے بھر جائے ہاتھیوں کا ایک جھنڈ اس جنگل سے گزرا۔ ہاتھی تالاب کے پاس پہنچے انھوں نے اپنی سونڈ سے کھینچ کھینچ کے سب پانی پی ڈالا۔ ہاتھیوں کے چلے جانے کے بعد تالاب میں نہ تو ایک بوند پانی بچا نہ اس کے آس پاس ایک بھی ایسا پودا جس میں چارہ دانے بھی باقی رہ گئے ہوں۔

صرف ناگ پھنی اور کانٹے دار جھاڑیاں بچیں ہر چیز خشک ہو گئی اور جل گئی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ جینا دوبھر ہو گیا پیاس سے چڑیوں اور چوپایوں کے جگر جلنے لگے اور وہ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔

اس دوران سب چڑیاں اور چوپائے تنگ آکر کونے کھترے میں جا چھپے مرغابی کوّے اور قمری اس سوکھے ہوئے تالاب کے کنارے جمع ہوئے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

آخر انھوں نے طے کیا کہ ہنس خالہ کے پاس کیوں نہ چلیں وہ ہم سب سے عمر میں زیادہ ہیں اور ہم

لوگوں سے زیادہ تجربے کار ہیں چلو انھی سے کوئی ترکیب پوچھیں۔

وہ لوگ چل پڑے اور ہنس خالہ کے پاس پہنچے ہنس خالہ اونگھ رہی تھیں انھوں نے اتنا کھا لیا تھا کہ ان سے اڑا نہ جاتا تھا۔

جنگل کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی تھیں انھوں نے جب دیکھا کہ مرغابی، کوا اور قمری ان کی طرف آ رہے ہیں تو آہستہ آہستہ سامنے آ گئیں۔

مرغابی نے کہا "لمبی گردن والی ہنس خالہ میری! پانی کہاں مل سکتا ہے؟"

کوے نے کہا "تم ہم سب سے بڑی ہو اور زیادہ دیکھے ہوئے ہو بتاؤ پانی کدھر ہے؟"

ہرن نے کہا "ہنس خالہ یہاں نہ تو پانی بچا ہے نہ دانہ نظر آتا ہے۔ بتائیے ہم کیا کریں؟"

قمری نے کہا "میرا پوٹا صرف پتھروں سے بھرا ہوا ہے بتاؤ کیا کروں؟"

ہنس خالہ نے ان لوگوں کی طرف دیکھا اور سر ہلا کر کہنے لگیں "میں جانتی ہوں کہ پانی اور دانہ کہاں مل سکتا ہے چلو میں تم سب کو ساتھ لے چلوں اور بتا دوں تم لوگ میرے ساتھ چلو سب سے کہہ دو کہ میرے پیچھے پیچھے آئیں۔"

مرغابی بولی "لمبی گردن والی ہنس خالہ میری! ہم لوگ اسی کام کے لیے تمہارے پاس آئے ہیں۔"

کوے نے کہا "تم ہم لوگوں کو راستہ دکھاؤ بتاؤ ہم لوگ کیا کریں۔"

ہرن نے کہا "ہم لوگوں کو پانی تک پہنچنے کی راہ بتاؤ ہم سب تمہارے پیچھے پیچھے چلیں گے۔"

قمری نے کہا "جھٹ پٹ بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

ہنس خالہ نے اپنی لمبی گردن اوپر اٹھائی اپنے بھاری پروں کو ہلایا جلایا اور بولیں "مجھ کو معلوم ہے پانی کہاں ہے اس طرف پانی دانہ سب کچھ ہے تم لوگوں کو چاہیے کہ ڈھونڈنے چلیں میں اڑ نہیں سکتی اس لیے پیدل چلوں گی اور اپنی لمبی گردن سے چاروں طرف دیکھتی رہوں گی کوئی میرے آگے نہ چلے سب میرے پیچھے پیچھے رہیں کوے کو چاہیے کہ وہ اڑنا بھول جائے ہرن کو چاہیے کہ وہ دوڑنا بھول جائے سب میرے پیچھے آئیں اور کھانے کی جو بھی چیز ملے وہ مجھ کو دیں تاکہ میں اچھی خاصی رہوں اور تم لوگوں کو راستہ دکھا سکوں۔"

کوے نے مرغابی کی طرف دیکھا مرغابی نے ہرن کی طرف دیکھا ہرن نے قمری کی طرف دیکھا سب چپ رہ گئے کوئی چارہ ہی نہ تھا وہ لوگ راستہ نہیں جانتے تھے۔ مجبوراً ایک آواز میں بولے "یہی سہی تم راستہ بتاتی چلو ہم تمہارے پیچھے پیچھے آتے ہیں بس اب دیر نہ کرو۔"

جب سے یہ قافلہ روانہ ہوا تھا لمبی گردن والی ہنس خالہ آگے آگے چل رہی تھیں اور ان کے پیچھے ہرن دھیرے دھیرے چل رہا تھا کوا اور مرغابی تیز تیز دوڑ رہے تھے تاکہ پیچھے نہ رہ جائیں۔

راستے میں کئی دن بیت گئے کئی راتیں بیت گئیں سب کی نظریں ہنس پر لگی ہوئی تھیں کبھی کبھی ان لوگوں کو بڑی امیدیں ہو جاتی تھیں۔

مرغابی کہتی "مجھے پانی کی خوشبو آ رہی ہے۔"

ہرن کہتا "میں نے جو جھاڑی ابھی کھائی ہے اس میں نمی تھی۔"

قمری کہتی "مجھے جسم پر پانی کی ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔"

کوا کہتا "مجھے ہنس سے بہت امیدیں ہیں۔"

ہنس سے سب آس لگائے ہوئے تھے۔ کسی کو کوئی ذرا سی ہری پتی ملتی تو وہ ہنس کو دے دیتا۔ خود بھوک سہتا تھا تاکہ راستہ دکھانے والا آرام سے رہے۔ خود پیاس برداشت کرتا تھا تاکہ راستہ دکھانے والا خوش رہے اسی طرح راستہ کٹتا گیا دن رات گزرتے گئے ہنس پر اتنا زیادہ بھروسا کیا گیا اتنا لمبا راستہ طے کیا گیا اس قدر بھوک سہی گئی اتنی پیاس برداشت کی گئی کہ ہرن یہ بھول گیا کہ وہ اس قدر تیز دوڑ سکتا ہے کوا بھول گیا کہ وہ اتنا اچھا اڑ سکتا ہے مرغابی بھول گئی کہ اس کے پر بھی ہیں اور قمری بھول گئی کہ وہ اس قدر تیز اڑ سکتی ہے۔

ایک روز ہرن نے کہا "میرے کھر بے کار ہوگئے ہیں۔"

مرغابی نے کہا "میرے پر سوکھ گئے ہیں۔"

قمری نے کہا "میرا پورا جسم پتھروں سے بھر گیا ہے"

کوے نے کہا "مجھ سے اب ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا جاتا۔"

سب رک گئے۔

خالہ ہنس نے کہا "آگے کیوں نہیں بڑھتے اتنے پریشان کیوں ہو گئے ہو اٹھو آگے چکر لگاؤ جو چیزیں ملیں مجھے دو تو میں کھاؤں۔"

اس سے پہلے کہ ہرن یا چڑیاں کچھ جواب دیں انہیں اپنے سروں پر ایک بڑی سی چڑیا کی پرچھائیں نظر آئی۔

ہرن نے سر اٹھایا اور پکارنے لگا "قاز قاز سفید قاز بڑی والی قاز کہاں سے آرہی ہو" تم کتنا اچھا اڑتی ہو۔"

سفید قاز نے جب اپنا نام سنا تو نیچے اتر آئی اور بولی "اچھا تم لوگ ہو میں برابر تمہاری تلاش میں گھوم رہی ہوں۔ کیا تمہارے پر گر گئے ہیں تم لوگوں نے اپنے پروں کو اس قدر بے کار کیوں ہو جانے دیا۔"

ہنس خالہ نے کہا "اس چڑیا کی بات نہ سنو میں تم لوگوں کو راستہ دکھاتی ہوں تم کو چاہئے کہ میں جو کہوں بس وہی سنو۔"

مرغابی بولی "اب تک جتنا سنا ہے وہی بہت ہے"

کوے نے کہا "مجھے چاہئے کہ دیکھوں اب بھی اڑ سکتا ہوں یا نہیں۔"

قمری نے کہا "میں بھی کوشش کروں اڑ پاتی ہوں یا نہیں۔"

ہرن نے کہا "پہلے سنو تو سہی سفید قاز کیا کہتی ہے۔"

سفید قاز نے کہا "جب تم لوگ چلے آئے تو میں نے تھوڑی بہت مصیبتیں اٹھائیں بھوک سہی پیاس برداشت کی مگر جو جگہ مجھے عزیز تھی میں وہیں رہی آخرکار گرمیوں کا موسم گزر گیا اور بارش کا زمانہ آگیا جنگل پھر اسی طرح ہرا بھرا ہو گیا۔ میں تم لوگوں کو ڈھونڈنے نکلی کہ دیکھوں تم لوگ کیا کر رہے ہو۔"

(باقی صـ۷۱)

خلیق انجم اشرفی

بچوں کے مشہور کہانی کار





۱۔ جگت دادی اماں: "ممی۔ کہانی سنائیے نا!" ننھی اپنی ماں کی گود میں چڑھ کر بولی۔

"کہانی، کہانی۔ ہر وقت کہانی" ماں غصّہ سے بولیں "اب تم اپنے پاپا کے دوستوں کو بھی تنگ کرتی ہو اور ان سے زبردستی کہانیاں سنتی ہو۔"

"جی ممی کیا کروں! مجھے کہانی سننے میں مزا جو بڑا آتا ہے" ننھی اپنی بھولے پن سے بولی۔ ماں کو اس پر بے اختیار پیار آگیا اور انھوں نے اس کی فرمائش پوری کرنے کے لیے شروع کر دی ایک کہانی۔ "بہت زمانے کی بات ہے......"

ننّھی اپنی بڑی ہوئی تو کہانیاں سننے کا یہ شوق کہانیاں سنانے کے شوق میں بدل گیا۔ فرصت کے وقت پاس پڑوس کے بچّے اسے گھیر لیتے اور وہ بڑے پیار سے انھیں پریوں۔ جادوگروں اور بہادر مہم بازوں کی کہانیاں سناتی تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اندازہ لگاتی کہ کس قسم کی کہانیاں وہ زیادہ پسند کرتے ہیں اور کہانی کے بیچ میں ان کا ننھا ذہن کیسے کیسے عجیب سوال اٹھاتا ہے۔ اس تجربے سے فائدہ اٹھا کر اس نے کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔

آپ نے پہچانا؟ یہ اپنی کون تھیں؟ کوئی اور نہیں۔

نیا بھر کے بچوّں کی محبوب کہانی کار اینی بلائٹن جنھوں نے بچوّں کے لیے چار سو سے زیادہ کہانیوں کی کتابیں لکھیں اور کہانیاں انھوں نے لکھی تو تھیں انگریزی میں۔ مگر آج دنیا بھر کی ۹۳ (ترانوے) مشہور زبانوں میں ان کے ۳۹۹ (تین سو ننانوے) ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ اور اب تک ان کی تین کروڑ سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ ان میں "ناڈی" نامی سلسلے کی کتابیں تو اتنی پسند کی گئی ہیں کہ صرف دو سال کے اندر اندر ان کی ایک کروڑ بیس لاکھ جلدیں بک گئیں۔

کہتے ہیں کہ انگلینڈ کے بچپن اور دوسرے ملکوں کے ایسی کتابیں چھاپنے والے انھیں لگاتار چھاپتے رہتے ہیں پھر بھی ان کی مانگ پوری نہیں ہوتی۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا بھر میں بارہویں اور انگلینڈ میں تیسرے نمبر پر بلائٹن کی کتابیں سب سے زیادہ ترجمہ ہوتی اور بکتی ہیں۔

تو بھئی ایسی کیا خاص بات ہے ان کہانیوں میں جو یہ اتنی تعداد میں چھپتی ہیں اور وہ بھی اتنی ڈھیر ساری زبانوں میں؟

یہ کہانیاں ایسے پیارے ڈھنگ میں لکھی گئی ہیں کہ انھیں پڑھتے وقت بچوّں کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دادی اماں یا نانی اماں کی گود میں بیٹھے کہانیاں سن رہے ہوں۔ کبھی تو اینی بلائٹن کو دنیا بھر کے بچوّں کی "دادی اماں" کہا جاتا ہے۔

یہ کہانیاں بچوّں کو نئے جہانوں کی سیر کراتی ہیں۔ پریوں کے پیارے پیارے دیس کی، چڑیلوں کی عجیب غریب بستیوں کی، ایسی دلچسپ ہوتی ہیں یہ کہانیاں کہ بچےّ تو بچےّ بڑے بھی ایک بار شروع کردیں تو کتاب ہاتھ سے نہ رکھیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ کہانی کہانی میں کام کی باتیں بھی ملتی ہیں۔

ان کہانیوں میں اڑن کھٹولے ہیں، پریاں ہیں، جادوگر ہیں، دیو ہیں، بھتنے اور چڑیلیں ہیں، ہنسی کی پھلجھڑیاں ہیں اور پھر مذہب۔ تہذیب، ہمّت و جرأت کے سبق بھی ہیں[1]۔

اینی بلائٹن کہانیاں لکھنے کے علاوہ بچوّں کے لیے انگریزی کا ایک پیارا سا رسالہ بھی نکالتی تھیں اس کا نام تھا "سنّی اسٹوریز (SUNNY STORIES) بچےّ اسے بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ اس کے بعد اپنے نام پر وہ ایک اور رسالہ "اینی بلائٹن میگزین" بھی چلاتی رہیں۔

دُنیا کے ہر کونے سے بچے اپنی دادی امّاں کو ہر روز سینکڑوں خط لکھتے۔ اور مزے کی بات یہ تھی کہ دادی اماں اینی بلائٹن اپنے کسی پوتے یا پوتی کو مایوس نہ کرتیں۔ اس کام کے لیے انھوں نے اپنے گھر میں ایک الگ دفتر کھول رکھا تھا جہاں سے وہ کسی دادی اماں ہی جیسے محبت بھرے انداز میں ان ان دیکھے ان جانے پوتوں پوتیوں کو پیارے پیارے جواب لکھواتیں۔

ان کے خوبصورت اور پرسکون گھر کا نام تھا "(GREEN HEDGES) یعنی "ہری جھاڑیوں کی باڑ" بچےّ سمجھتے تھے کہ شاید یہ بھی کوئی پری دیس ہے اور اینی بلائٹن اس میں رہنے والی جادوگرنی۔ اور واقعی اینی بلائٹن جادوگرنی تھیں۔ ان کی پیاری پیاری کہانیاں

---

[1] اینی بلائٹن کی کہانی اسی کہانی نمبر میں پڑھیے اور اندازہ لگائیے کہ ان کی کہانی میں کیا خاص بات ہے۔

ان کے منتر ہی تو ہیں۔ جن سے وہ ننھے منّے بچوں پر جادو کر دیتی تھیں۔

۲۸ نومبر ۱۹۶۸ء کو وادی اماں اینٹی بلائٹن جو ۱۹۰۰ء میں لندن میں پیدا ہوئی تھیں، اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ اب وہ اپنے نام آئے ہوئے خطوط کے جواب تو نہیں دیتیں لیکن اپنی چھوڑی ہوئی دو سو تعلیمی اور چار سو کہانیوں کی کتابوں کے ذریعے وہ اب بھی بچوں سے بڑی میٹھی زبان میں گفتگو کرتی رہیں گی۔

موچی کا بیٹا:- آتش دان میں لکڑیاں جل جل کر چٹخ رہی تھیں۔ ننھا ہنس دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ لیے غور سے اپنے ابا جان کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ ایک ڈراما پڑھ کر اسے سنا رہے تھے۔

"ابا جان۔ میں بھی ڈرامے لکھوں"۔ ننھے ہنس نے کہا۔

ابا جان کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"ضرور میرے بچے"۔ لیکن تم ذرا بڑے تو ہو جاؤ"۔ لیکن بڑے ہونے کا انتظار کون کرتا۔ کچھ اور نہیں، تو ہنس نے ان کٹھ پتلیوں ہی پر جو اس کے پیارے ابا جان نے اس کا دل بہلانے کو بنائی تھیں ڈرامے لکھ ڈالے۔ ان ڈراموں کے اداکار وہی بے جان کھلونے تھے۔

آٹھ نو سال کی چھوٹی سی عمر میں ڈرامے لکھنے والا ننھا سا ہنس کوئی اور نہیں، ڈنمارک کا مشہور کہانی کار ہنس کرسچین اینڈرسن تھا۔ جی ہاں وہی اینڈرسن جو آج دنیا بھر کے بچّوں کا پیارا کہانی کار ہے۔ ہنس نے بڑے غریب گھرانے میں جنم لیا تھا۔ اس کے باپ ایک غریب موچی تھے اور ماں کپڑے دھونے کا کام کرتی تھیں

اس کے باپ کو خود بھی پڑھنے کا شوق تھا اور وہ اپنے بچّے کو بھی پڑھا لکھا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ جب موقع ملتا اسے انجیل مقدس۔ تاریخی کتابیں اور ڈرامے پڑھ پڑھ کر سناتے۔ یہی سن سن کر ہنس کو ڈرامے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ گیارہ برس کی عمر میں اس نے پچیس ڈراموں کی فہرست بنائی تھی۔ اس کا یہ ارادہ یہ سب ڈرامے لکھنے کا تھا۔

اینڈرسن کو مطالعے کا شوق اتنا زیادہ تھا کہ جو کتاب ہاتھ آتی پڑھے بغیر نہ چھوڑتا اگر پتہ لگتا کہ قصبے میں فلاں آدمی کے پاس کوئی کتاب ہے تو وہ فوراً جا کر اس سے پڑھنے کے لیے مانگ لاتا اور لوگ بھی اس کے شوق اور چھوٹی عمر کو دیکھ کر خوشی خوشی کتابیں دے دیتے۔ رفتہ رفتہ اس نے مشہور انگریزی ڈرامہ نگار شیکسپیر کے سارے ڈرامے پڑھ ڈالے۔ ان ڈراموں کے منظر اسے زبانی یاد تھے۔ کبھی کبھی وہ ندی کنارے بیٹھ کر اپنی صاف اور بلند آواز میں انھیں گاتا تو سننے والوں کی بھیڑ اکٹھا ہو جاتی۔ اینڈرسن کی ایک نانی بھی تھیں۔ انھیں اپنے نواسے پر بڑا فخر تھا اور وہ بڑے پیار سے اُسے بھوتوں کی کہانیاں سنایا کرتیں۔

اینڈرسن کی تمنا تھی کہ بڑا ہو کر وہ اداکار بنے۔ لیکن ابھی وہ دس برس کا تھا کہ اس کے پیارے ابا جان اس دنیا سے رخصت ہو گئے ماں نے گھر کے حالات سے مجبور ہو کر اسے ایک درزی کی دکان پر کام سیکھنے بٹھا دیا۔ لیکن اس کام میں ہنس کا جی نہ لگا اور وہ ڈنمارک کی راجدھانی کوپن ہیگن پہنچا۔ وہاں اس کی ذہانت سے متاثر ہو کر بادشاہ فریڈرک نے سرکاری خرچ پر اسے اسکول میں داخل کرا دیا اور اس طرح

ہنس کی زندگی میں ایک نیا دور شروع ہوا۔

۱۸۳۵ء میں ۳۰ سال کی عمر میں اینڈرسن نے بچوں کے لیے چار کہانیاں لکھیں پھر ایک کتاب۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ڈرامے بھی لکھتا رہا۔ اس کے بعد ہر سال اس کی کہانیوں کی کوئی نہ کوئی کتاب شائع ہونے لگی۔

آہستہ آہستہ اس کی شہرت ڈنمارک کے علاوہ دوسرے ملکوں میں پھیلنے لگی۔ شروع شروع میں تو اس نے اپنے بچپن میں سنی ہوئی کہانیاں لکھیں لیکن بعد میں وہ خود سوچ سوچ کر کہانیاں لکھنے لگا۔ اپنے بچپن کے واقعات پر بھی اس نے ڈھیر ساری کہانیاں لکھی ہیں۔

اس کی کہانیاں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔ ایسی کہانیاں جو بظاہر تو محض دلچسپ اور تفریحی کہانیاں معلوم ہوتی ہیں لیکن ان میں ایک سبق پوشیدہ ہوتا ہے۔ اور یہی اس کی کہانیوں کی خوبی ہے اور پھر ان کہانیوں کا انداز اتنا پیارا اور زبان اتنی میٹھی اور رسیلی ہوتی ہے کہ پڑھنے والا اس کے ماحول میں کھو سا جاتا ہے۔

اس کہانی نمبر میں آپ اس کی ایک کہانی "دیا سلائی کی لو" اور پھر پیام تعلیم کی شائع کی ہوئی کتاب "سونے کا پنجرہ" پڑھیے آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا اس کی کہانیوں کی ان خوبیوں کا۔

اینڈرسن کی سترویں سالگرہ پر اس کی ایک کہانی "راجہ کے نئے کپڑے" پچیس زبانوں میں اسے نذر کی گئی۔ اس کتاب کی تصویریں مختلف ملکوں کے مشہور مصوروں نے بنائی تھیں اسی سال یعنی اگست ۱۸۷۵ء میں ۷۰ سال کی عمر میں یہ مشہور کہانی کار جس نے ۲ اپریل ۱۸۰۵ء کو جنم لیا تھا اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ لیکن غریبی اور پریشانیوں میں پلا ہوا یہ یتیم بچہ آج دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس کی زندگی بذاتِ خود ایک سبق ہے۔ سبق ہمت کا، لگن کا اور مشکلوں کے سامنے ہتھیار نہ ڈالنے کا۔

۲۔ الائس کے انکل :-

"انکل ڈیر" الائس بڑے پیار سے بولی کل پکنک پر چلیے نا۔ بوٹنگ کریں گے۔ بڑا پیارا موسم چل رہا ہے آج کل۔

"بہت اچھا۔ جیسی ہماری گڑیا کی مرضی۔" انکل چارلس کو بھلا اعتراض کیسے ہو سکتا تھا۔

"آہا ہا۔ خوب مزا آئے گا۔ میں لورینا اور ایڈتھ کو بھی ساتھ لے چلوں گی۔ الائس خوشی سے اچھلتی ہوئی بولی۔

"اچھا تو تم اپنی دونوں بہنوں کو لے چلو گی تو ہم بھی اپنے ایک دوست کو ساتھ لے چلیں گے۔" انکل چارلس شرارت سے مسکرائے۔

"ضرور ضرور انکل۔ تب تو بہت ہی مزا آئے گا۔" ننھی الائس خوشی سے تالیاں بجانے لگی۔

پکنک واقعی بڑے مزے دار رہی۔ انکل چارلس۔ ان کے دوست اور تینوں لڑکیاں کشتی میں بیٹھے لطف لے رہے تھے کہ اچانک تیز آندھی آگئی اور وہ لوگ کشتی چھوڑ کر بھاگے۔ قریب کے ایک مکان میں سب نے پناہ لی۔ چائے پیتے پیتے الائس بولی "انکل کوئی کہانی سنائیے نا۔ ذرا دل بھی بہلے اور وقت بھی کٹے یہ کمبخت آندھی اور طوفان تو ابھی رکتے نظر نہیں آتے۔"

سب نے اس کی تائید کی اور انکل چارلس نے سوچا

سوچ کر ایک کہانی کہنی شروع کی۔

اس دن رات ہو گئی اور سب نے گھر چلنے کی تیاری کی تو اچانک الائس کو کچھ خیال آیا۔ وہ بولی "انکل۔ اگر آپ یہ کہانی لکھ کر مجھے دے دیں تو کتنا مزا آئے !"

انکل چارلس بھلا الائس کی فرمائش کیسے ٹالتے۔ انھوں نے کہانی لکھ کر دے دی۔ اس وقت انکل چارلس کو خیال بھی نہ تھا کہ کبھی یہ کہانی چھپے گی اور نہ صرف چھپے گی بلکہ دنیا بھر کے کیا بچے کیا بڑے سب شوق سے اسے پڑھیں گے۔

یہ کہانی تھی۔ "الائس ان ونڈر لینڈ" (ALICE IN WONDER LAND) (الائس دنیائے حیرت میں) اور انکل چارلس کوئی اور نہیں، اس کہانی کے مصنف اور بچوں کے مشہور کہانی کار لوئی کیرل تھے۔ چارلس ڈاڈسن، لوئی کیرل کا اصلی نام تھا۔

لوئی کیرل کہانی کار نہیں تھے وہ تو ایک کالج میں حساب پڑھاتے تھے لیکن بچوں سے انھیں اتنا پیار تھا کہ وہ انھیں سوچ سوچ کر کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ چارلس کے باپ دادا پادری تھے۔ ۲۷۔ جنوری ۱۸۳۲ء کو انگلینڈ میں ان کا جنم ہوا۔ بچپن کے دن بڑے آرام سے بیتے۔ حالانکہ ان کے تین بھائی اور سات بہنیں تھیں لیکن بچپن میں انھیں الگ تھلگ رہنے کی عادت تھی۔ ہر وقت وہ کسی خیالی دنیا میں ڈوبے رہتے۔

حساب سیکھنے کے علاوہ انھیں فوٹو گرافی کا بھی شوق تھا۔ اس زمانے میں کیمرہ نیا نیا ایجاد ہوا تھا لیکن بچوں کے فوٹو اتارا کرتے۔ بچوں کا سنگ ساتھ انھیں بہت بھلا لگتا۔ جہاں جاتے بچوں کے ساتھ بیٹھ جاتے۔ ہنستے کھیلتے۔ ان کی تصویریں اتارتے۔ انھیں کہانیاں سناتے اور حسابی پہیلیاں[1] حل کرنے کو دیتے۔ انھیں پکنک پر لے جاتے۔ غرض طرح طرح سے ان کا اور ان کے ساتھ اپنا دل بہلاتے۔ جس کالج میں وہ حساب پڑھاتے تھے اس کے پرنسپل کی تینوں بچیوں سے وہ بہت گھل مل گئے تھے۔ یہی تینوں بچیاں تھیں لورینا۔ الائس اور ایڈتھ۔ جنھیں ان کے انکل چارلس نے وہ لمبی کہانی سنائی جو بعد میں "الائس ان ونڈر لینڈ" کے نام سے دنیا بھر میں مشہور ہوئی۔ یہ ۱۸۶۲ء کا واقعہ ہے۔

بعد میں دو مشہور ادیبوں کے زور دینے پر لوئی کیرل نے اس کتاب میں کچھ رد و بدل کے بعد اسے شائع کرا دیا اور اتنی مقبول ہوئی کہ آج دنیا کی کتنی ہی مشہور زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اور یہ بچوں کو پسندیدہ کتاب ہے۔

بچوں کا یہ دوست ۱۴۔ جنوری ۱۸۹۸ء میں انھیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گیا لیکن اس کی یہ کتاب اس کی یاد بچوں کے دلوں میں سدا باقی رکھے گی۔

---

[1] لوئی کیرل کی حسابی پہیلیوں پر میرا ایک مضمون "حسابی جادوگر کے جادو" پیام تعلیم کے نومبر ۱۹۶۳ء کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے

جناب عبداللہ شرقی

ایک اندھا اور لنگڑا

یہ بہت پرانی کہانی ہے۔ آپ نے بھی پڑھی ہوگی۔ نصاب کی کتابوں میں بھی اکثر چھپتی رہتی ہے شرقی صاحب محترم نے اسے نظم کا لباس پہنا دیا ہے۔ ایک نیا لطف پیدا کر دیا ہے ہمیں تو یہ بہت اچھی لگی۔ آپ بھی پڑھئے اور مزے لیجئے ——— (ایڈیٹر)

ایک قصبے میں کوئی اندھا تھا ۔۔۔ دوست اندھے کا کوئی لنگڑا تھا
دوستی ان کی تھی باہم ۔۔۔ دونوں ایک دوسرے کے تھے ہمدم
جب بھی درپیش کوئی حاجت ہو! ۔۔۔ دوست کو دوست کی ضرورت ہو
لنگڑا اندھے کے کندھے پر چڑھتا ۔۔۔ آگے اندھے کا پھر قدم بڑھتا
لنگڑا اندھے کی رہبری کرتا ۔۔۔ شکر خالق کا ہر گھڑی کرتا
کام لنگڑے کو پیش اگر آتا ۔۔۔ اندھا کندھوں پر اس کو لے جاتا
مدتوں یہ عمل رہا جاری ۔۔۔ قابلِ آفریں[1] ہے غم خواری

نیک ہے جو کسی کے کام آئے
آدمی آدمی کے کام آئے

---

[1] قابلِ تعریف۔

انفاق ایک دن ہوا ایسا — کام اندھے کو ایک پیش آیا
حسبِ دستور دوش[1] پر لنگڑا — رہبری کے لیے سوار ہوا
راہ میں شام آ گئی سر پر — جا رہے تھے وہ کھیت سے ہو کر
کھیت کے پاس تھا کنواں ایسا — اس کنویں کا کوئی حصار نہ تھا
آسماں پر سیاہی پھیلی تھی — ہر طرف تیرگی[2] ہی چھائی تھی
کھیت سے وہ گزرتے جاتے تھے — باتیں آپس میں کرتے جاتے تھے
پاؤں اندھے کا جب کنویں میں پڑا — ساتھ اندھے کے گر گیا لنگڑا
ہو گئے غرقِ چاہ[3] یہ دونوں — ہو گئے خود تباہ یہ دونوں

زندگانی سے ہاتھ دھو بیٹھے
مفت میں اپنی جان کھو بیٹھے

زندگانی کا یہ شعار نہیں — غیر کا کوئی اعتبار نہیں!
لے کے اندھا عصا[4] اگر چلتا (ق) — راستہ دیکھ بھال کر چلتا
تو وہ اندھا تباہ کیوں ہوتا — جان اپنی نہ اس طرح کھوتا
چلتا گھٹنوں کے بل اگر لنگڑا — کیوں بھروسا وہ غیر پر کرتا

اپنی طاقت پہ اعتماد رہے
بات ہمرقی کی اتنی یاد رہے

---

[1] کندھا یا کاندھا [2] اندھیرا [3] کنواں یعنی دونوں کنویں میں ڈوب گئے۔ [4] ڈنڈا - چھڑی

نہرو بال پستکالیہ

ہندوستان کی اہم زبانوں اور انگریزی میں بچوں کے لیے بہترین اور سستی کتابیں شائع کرنے کے لیے کتابوں کے اس سلسلے کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے جاننے والوں کے لیے ایک ہی سا ادب پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو سکیں اور اس سے قومی ایکتا مضبوط ہو۔

اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوئی ہیں جو اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں۔ ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے (۱/۵۰) ہے۔ یہ سب کتابیں رنگین تصویروں کے ساتھ فوٹو آفسیٹ پر شائع ہوئی ہیں۔

۱۔ باپو حصّہ اوّل مُصنّف ایف سی فری مَاس مترجم صالحہ عابد حسین
۲۔ ” دوم ” ” ” ” ”
۳۔ کشمیر ” مالا سنگھ مترجم خدیجہ بیگم تصاویر پربھا نند
۴۔ پرندوں کی دنیا ” جمال آرا ” محمد شفیع الدین نیّر
۵۔ ہمالیہ کی چوٹیوں پر ” بریگیڈیر گیان سنگھ ” محمد ذاکر
۶۔ ہماری ندیاں کی کہانی ” لیلا مجمدار ” رضیہ سجّاد ظہیر
۷۔ جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں ” لیلا بھاگوت ” ”
۸۔ رسیلی کہانیاں ” منوج داس ” صغرا مہدی
۹۔ آزادی کی کہانی حصّہ اوّل ” وشنو پربھاکر ” انور کمال حسینی
۱۰۔ ہماری ریلیں ” جگ جیت سنگھ ” عرش ملسیانی
۱۱۔ ہندوستان میں غیر ملکی سیّاح ” کے سی کھنّہ ” تصاویر کرشن کھنّہ
۱۲۔ آؤ ناٹک کھیلیں مُصنّف اوما نند مترجم رفیعہ منظور الامین
۱۳۔ خالہ بلّی کا خاندان ” منوہر داس چترویدی ” محمد شفیع الدین نیّر
۱۴۔ بہت دن ہوئے حصّہ اوّل ” جوشی بی۔ ام جوشی ” رضیہ سجّاد ظہیر
۱۵۔ بہادروں کی کہانیاں ” راجندر اوستھی ” انور کمال حسینی
۱۶۔ دو ہنت وندیہ ” کرشن چیتنیہ ” ”
۱۷۔ سدا بہار کہانیاں ” شانتا رنگا چاری ” ”

ذاکر حسین سیریز

۱۸۔ ابو خاں کی بکری ” ڈاکٹر ذاکر حسین قیمت ۳/-
۱۹۔ انوکھی دکان ” قدسیہ زیدی ” ۲/۵۰
۲۰۔ گلا بو چوہیا اور پری زاد ” ” ” ۲/-
۲۱۔ دنیا کے جانور ” ” ” ۲/۵۰
۲۲۔ راجہ رام موہن رائے عرش ملسیانی زیرِ طبع

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ ۔ اُردو بازار دہلی ۶ ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳ ۔ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ ۲

عقل سلیم

دوپہر کا وقت تھا۔ تھوڑی تھوڑی گرمی ہو گئی تھی۔ کمال نیم کے نیچے لیٹا سوچ رہا تھا بھلا یہ پریاں کیسی ہوتی ہیں۔ آج ہی اس نے اسکول میں ایک گیت پڑھا تھا۔

اگر تم کسی پری سے ملو، نہ بھاگو نہ دوڑو نہ اس سے ڈرو کھیلے گی تم سے کرے گی دلار، مگر رہنا ایک بات سے ہوشیار جو مانگو گے بے شک وہ مل جائے گا، ہوئی جس سے غلطی وہ پچھتائے گا۔

وہ بھی پری سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا۔ اس سے کچھ مانگنا چاہتا تھا۔ کیا مانگنا ہے یہ بھی اس نے اچھی طرح سوچ رکھا تھا۔ اس کی آپا اس کو بار بار ٹوکتی ہیں من مانی کرنے سے روکتی ہیں۔ وہ انھیں خوب نچانا چاہتا تھا پری سے کوئی ایسی چیز مانگنا چاہتا تھا جس کے استعمال سے بس آپا جان ناچتی رہیں۔۔۔ ناچتی رہیں۔۔۔ جب تک اس کا جی چاہے وہ ان کو نچاتا رہے۔ وہ سوچ رہا تھا پری سے مانگے گا کہ بس وہ ایک دن کے لیے اس کو ایسی طاقت دیدے کہ وہ جو کچھ مانگے مل جائے۔ ابا جان بار بار کہنے پر بھی سائیکل نہیں لاتے، امی آئس کریم کو پیسے نہیں دیتیں۔ بس سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ پری سے ایک ملاقات تو ہو جائے نیم کے نیچے لیٹے لیٹے اس کی آنکھوں کے سامنے جیسے ناچ رہی تھیں اس کی آپا اور آئس کریم کی بیسیوں پلیٹیں۔

ابھی وہ اس خیالی دنیا میں محو تھا کہ نیم کے پتوں میں سے اچانک ایک پری باہر نکلی۔ کمال کچھ ڈرا مگر ڈر سے زیادہ تو اس کے دل میں تعجب تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس خوبصورت عورت کو دیکھ رہا تھا جو اپنے پروں کے سہارے اڑتی ہوئی دھیرے دھیرے اس کی طرف آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم نے آج ایک پریوں کا گیت پڑھا اور سوچا کہ کتنا اچھا ہو اگر ایک پری سے ملاقات ہو جائے۔ لو میں آ گئی" پری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کمال کا ڈر دور ہو چکا تھا۔ وہ بولا "میرے ساتھ کھیلیں گی آپ؟"

"کیوں نہیں" اور پری وہیں گھاس پر بیٹھ گئی۔

کمال کے ابا دفتر میں تھے۔ ماں اور آپا دونوں اندر سو رہی تھیں کمال دیر تک پری کے ساتھ نئے نئے کھیل کھیلتا رہا۔

"اچھا اب میں چلوں" کوئی گھنٹہ بھر بعد پری بولی۔

"اچھا۔۔۔" کمال نے بے دلی اور اداسی سے کہا "میں۔۔۔ میں۔۔۔"

"ہاں! ہاں! بولو۔ تم ایک اچھے لڑکے ہو۔ بولو کیا چاہتے ہو؟" پری پھر مسکرائی۔

"میں چاہتا ہوں کہ بس آج آج کے لیے مجھ میں ایسی قوت پیدا ہو جائے کہ میں جو کچھ بھی اپنی زبان سے کہوں، پورا ہو جائے" کمال بولا۔

"یہ طاقت تمہیں مل جائے گی مگر سوچ لو۔"

"بس سوچ لیا۔ آپ یہ طاقت مجھے دے ہی دیجیے۔"

"اچھا تو سنو۔ یہ تحفہ تم کو صرف آج شام سورج چھپنے تک ملے گا۔ دوسرے یہ کہ اس قوت کو ذرا سنبھال کے استعمال کرنا۔ ایک چیز کے بارے میں اگر تم کوئی غلطی جلد بازی میں کر گئے

تو پھر اس کو بیچ میں روک نہیں سکتے؟" پری نے کہا۔

"ٹھیک ہے" کمال کے جوش کا ٹھکانا نہ تھا۔

"ٹھیک ہے تو بسم اللہ مجھے بھی دیکھنا ہے کہ تم کو۔۔ تمہاری مرضی پر چھوڑ دیا جائے تو تم کیا کرتے ہو!" یہ کہہ کر پری نے کمال کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور نیم کی شاخوں میں غائب ہوگئی۔

کمال میاں سوچنے لگے سب سے پہلے کیا کیا جائے پہلے آپا جان کو نچایا جائے؟ نہیں وہ تو ابھی سو رہی ہیں۔ یہ کام بعد کا ہے۔ پھر؟ ارے بھئی اتنی گرمی ہو رہی ہے پہلے آئس کریم۔۔ کھائی جائے" اس نے اپنے جی میں سوچا۔ اور پھر آئس کریم۔۔ کہ دیا۔

کہنے کی دیر تھی کہ آئس کریم کی ایک بڑی سی پلیٹ ہوا میں تیرتی ہوئی اس کے سامنے آگئی جی بھر کر آئس کریم کھانے کے بعد وہ اچھلتا کودتا گھر میں چلا گیا۔ اماں جاگ چکی تھیں۔ انھوں نے کمال کو دیکھا تو پہلے تو اس کو خوب ڈانٹا کہ اس جلتی دوپہر میں ذرا سا بھی آرام نہ کیا پھر بولیں" اچھا جاؤ، دن ڈھل گیا ہے بھی کے یہاں دعوت میں چلنے کو تیار ہو جاؤ۔"

کمال دوڑ کر اپنے کمرہ میں گیا۔ آج اس کو نئی بش شرٹ اور نیا نیکر ملا تھا۔ اور ہاں نئے جوتے بھی تو تھے۔ جلدی جلدی اس نے قمیص پہنی اور نیکر ٹانگوں پر چڑھایا۔۔۔ مگر یہ کیا؟ بٹن تو نہ قمیص کے لگ رہے تھے نہ نیکر کے۔ اس نے بہت کوشش کی۔ انگلیاں دُکھنے لگیں مگر بٹن نہ لگنے تھے نہ لگے۔۔ اسے غصہ آگیا

"جہنم میں جائیں ایسے کپڑے" اس نے کہا اور۔۔۔ اور قمیص اور نیکر اس کے بدن سے خود بخود اتر کر ہوا میں تیرتے ہوئے کھڑکی سے باہر نکل گئے۔۔۔ شاید جہنم کی طرف! اور کمال میاں ننگے اور حیران کھڑے تھے۔ انہوں نے جلدی سے پرانی قمیص اور پتلون ہی پہنی۔ جانتے تھے کہ پری کی دی ہوئی طاقت بھی انھیں اب نئی قمیص اور نیا نیکر نہیں دلا سکتی۔ ایک چیز کے بارے میں صرف ایک بار خواہش کرنی تھی نا!

اس کے بعد آئی جوتوں کی باری۔ یہ بھی نئے تھے اور تنگ تھے۔ اگرچہ کمال کو پچھلے تجربہ سے سبق ملا تھا مگر جوتا پہننے کی۔۔ کوشش میں کمال کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اور پیر بری طرح۔۔ دکھنے لگے تو بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا" ہونہہ! اتنے تنگ جوتے بھی کوئی پہننے کی چیز ہیں۔ ڈھیلے ہوتے"۔۔۔۔ اور جوتے فوراً ڈھیلے ہوگئے۔ اتنے ڈھیلے ہوگئے کہ فیتہ۔۔ باندھنے کے بعد بھی ایک قدم چل کر پیر سے نکلے پڑتے تھے جوتے بھی کمال کو پرانے ہی پہننے پڑے۔

پری کے چکر میں کمال کو نہانے کا ہوش نہ رہا تھا۔ اس لیے سر کے بال کافی ابھر رہے تھے۔ کنگھا کرنے میں بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ تکلیف میں وہ سب کچھ بھول گیا اور منہ غصہ سے کہہ بیٹھا

"سر پر کمبخت یہ بال نہ ہوتے تو کیا ہو جاتا۔" اور یہ کہتے ہی ان کے بال جھڑ جھڑ کر گرنے لگے چھت کے پنکھے کی ہوا سے سارے کمرے میں بال ہی بال پھیل گئے اور جب انھوں نے آئینہ میں صورت دیکھی تو بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تانبہ سا صاف شفاف سر۔۔ بے چارے کی صورت ہی بدل گئی تھی۔ پارٹی میں جانے کا سوال ہی نہ رہا تھا۔ آپا جان کو نچانے کی خواہش نے بھی دم توڑ دیا تھا۔ اور اداس اداس قدموں سے چل کر چپ چاپ صحن میں کھڑے نیم کے تنے سے کمر لگا کر بیٹھ گئے۔ اور سوچنے لگے رونے کے علاوہ ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

کافی دیر رونے کے بعد دل ذرا ہلکا ہوا تو نظر ڈوبتے سورج پر پڑی۔ پری کی دی ہوئی طاقت کا اثر ختم ہونے میں بس تھوڑی سی دیر رہ گئی تھی۔ اس نے رونا بند کر دیا اور سوچا

کچھ نہ کچھ اچھی چیز مانگنی چاہیئے۔
لیکن کیا؟ —— یہ سوال اس کے ذہن میں تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ اور کوئی معقول بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔
"پیسہ؟" اس نے اپنے سے سوال کیا۔ اور خود ہی "ہاں" میں جواب بھی دے لیا۔
کہنے کی دیر تھی کہ چاندی کے سکے چھنا چھن گرنے لگے... تیزی کے ساتھ —— اتنی تیزی کے ساتھ کہ کمال کو اپنی گنجی چاند پر ان کی چوٹ سے بچانے میں کافی دشواری ہوئی۔ تب اس نے سوچا چلو ایک دن کی تو تکلیف ہے۔ پھر تو مزے ہی مزے ہیں پیسہ سے آدمی سب کچھ حاصل کر سکتا ہے۔
وہ چوٹ سہتا رہا مگر ایک بڑا سکہ اس کی ناک کو بری طرح زخمی کر گیا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔
اور پھر؟ اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اسی نیم کے نیچے تھا جہاں چار گھنٹے پہلے وہ پری کے بارے میں سوچتا سوچتا سو گیا تھا بہت دیر سو یا وہ —— سورج ڈوب رہا تھا۔
اس نے آنکھیں ملیں اور اپنے پورے ہوش سے کام لیتے ہوئے بیٹھ کر اس خواب پر غور کرنے لگا۔ تھا تو وہ خواب لیکن اسے پتہ لگ گیا تھا کہ صرف اپنے آرام کی بات سوچنے سے آدمی کو تکلیف ہی اٹھانا پڑتی ہے اور بغیر سوچے سمجھے کچھ کر دینے سے بھی آدمی کو بڑا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔
"پھر —— اس دنیا میں وہ کون سی چیز ہے جو انسان مانگے؟" کمال نے خود سے سوال کیا اور اچانک ہی اس کے ذہن میں اس سوال کا جواب ابھرا —— "عقل سلیم"
اللہ میاں مجھے زندگی میں عقل سلیم دے۔ اس نے ہاتھ پھیلا کر بڑے خلوص سے دعا مانگی —— اور —— سورج دور مغرب میں ایک پہاڑ کے پیچھے غائب ہو گیا۔
(شکریہ آل انڈیا ریڈیو)

(بقایا صفحہ ۶)

"مجھے ہنس خالہ سے کوئی مطلب نہیں صرف تم لوگوں سے اتنا پوچھوں گی کہ چڑیا اڑ سکتی ہے کیوں نہیں اڑتی ہرن جو کہ تیز دوڑ سکتا ہے کیوں نہیں دوڑتا ہے"۔
خالہ ہنس نے جب یہ الفاظ سنے تو شرم سے اس کی گردن جھک گئی اور وہ جلدی سے بھاگ کر ایک پتھر کے پیچھے چھپ گئی۔
مرغابی نے اپنے پر کھولے کوا اوپر اڑ گیا قمری نے بھی اپنے پر پھڑ پھڑائے۔ شروع شروع میں دشواری (مشکل) ہوئی مگر بعد میں ان کے بازو وغیرہ کام کرنے لگے اور وہ تالاب کی طرف چل دیئے۔
ہرن نے اپنے پیروں سے کام لیا اور جتنا تیز دوڑ سکتا تھا دوڑا یہاں تک کہ سب اس سے پیچھے رہ گئے ہرن اور چڑیاں واپس لوٹتے وقت سوچتے رہے کہ جب تالاب کے کنارے پہنچیں گے تو اس قصے کو دوسری چڑیوں اور چوپایوں کو سنائیں گے ساتھ ہی انہیں یہ بھی فکر تھی کہ کیا ترکیب کی جائے کہ ہاتھی پھر کبھی تالاب تک نہ پہنچنے پائیں۔

باپ کا خواب

(ڈاکٹر امانت ایم اے)

علامہ اقبال کے پیدا ہونے سے کچھ دنوں پہلے ان کے والد بزرگوار نے ایک خواب دیکھا تھا نیچے اسی خواب کو نظم کی صورت میں پیش کیا گیا ہے

میں سویا جو اک شب تو دیکھا یہ خواب!

نکل کر سحد کو جو گھر سے چلا — تو خود کو اجالوں میں پایا گھرا
بڑا ہی حسیں تھا سماں چار سو — فرشتوں کو بھی جس کی ہو آرزو
زمیں نور میں تھی نہائی ہوئی — دلہن کی طرح سے سجائی ہوئی
تھے ہر طرف پھیلے ہوئے باغ و راغ[1] — فروزاں[2] تھے جن میں گلوں کے چراغ
بڑھا کچھ تو بھیڑ آئی مجھ کو نظر — تگ و دو[3] میں مصروف تھا ہر بشر
حسیں مور سا، طائرِ خوشنما، — لگا ہوں کا سب کی نشانہ بنا
فضا ہی میں مصروف پرواز تھا — لبھاتی تھی دل اس کی اک اک ادا
حریصانہ نظروں سے تکتے ہوئے — سبھی چاہتے تھے، پکڑ لیں اُسے
وہ شاہیں تھا بلبل تھا یا اک چکور — یا اڑتا پتنگ، جس کی غائب تھی ڈور
بڑا خوبصورت، حسیں، لاجواب — پَر اس کے تھے رنگین جیسے گلاب
سروں پر مسلسل وہ اڑتا رہا — اِدھر سے اُدھر یونہی مڑتا رہا
خدا کا کرشمہ ہی کہیے اسے — وہ شاید تھا بے تاب میرے لیے
مجھے دیکھتے ہی پھڑکنے لگا! — پھڑکتے پھڑکتے بہکنے لگا!
یکایک وہ پھر پھڑ پھڑاتا ہوا — فضا سے مری گود میں آگرا
وہاں تھا جو لوگوں کا میلا لگا — وہ چٹکی بجاتے میں غائب ہوا
بڑے شوق سے میں نے پکڑا اسے — محبت کے پھندے میں جکڑا اسے
کلی دل کی بے ساختہ کھل گئی — مجھے دولتِ دو جہاں مل گئی

—(۲)—

عطا چاند سا مجھ کو بیٹا ہوا — کہ اقبال نام اُس کا میں نے رکھا
بڑھا باپ دادا کا اس سے وقار[4] — چلی آئی گلشن میں میرے بہار

حقیقت بنا اس طرح میرا خواب!

---

[1] سبزہ زار، گھاس کا میدان [2] روشن [3] دوڑ دھوپ [4] قدر و منزلت، عزت۔

اقبال امروہوی

حسد کا انجام

جاپانی لوک کہانی

جاپان دیس کے ایک گاؤں میں ایک غریب کسان رہتا تھا اس کے کوئی اولاد نہیں تھی اسی لیے میاں بیوی ہمیشہ اداس رہتے تھے! ایک دن دونوں رات کا کھانا کھا رہے تھے اچانک ایک کتے کے رونے کی آواز آئی شروع میں تو انھوں نے اس آواز کی طرف کوئی توجہ نہ کی لیکن وہ کتا روتا رہا۔

کسان کی بیوی نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو دیکھا ایک بہت لاغر کتا ان کے دروازے پر بیٹھا ہے سردی کے مارے بے چارہ کانپ رہا ہے۔ عورت کو کتے پر رحم آیا اسے گھر میں لے آئی۔ اسے کھانے کو دیا اور گھر کے پھٹے پرانے کپڑے اس پر ڈال دئے

کتا اب ان کے گھر رہنے لگا۔ دونوں اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتے، اسے پیٹ بھر کے کھانا دیتے کچھ ہی دنوں میں وہ خوب تندرست ہو گیا۔

ایک دن دونوں اپنے صحن میں بیٹھے تھے کتا بھی ان کے قریب بیٹھا تھا، صحن کے ایک کونے میں ایک بڑا درخت تھا۔ اچانک کتا اٹھ کر اس درخت کی طرف گیا اس نے اس درخت کے آس پاس کئی چکر لگائے جیسے کوئی چیز ڈھونڈھ رہا ہو۔ درخت کی جڑ کے قریب سونگھا اور ایک جگہ اپنے اگلے پنجوں سے زمین کھودنے لگا۔

کسان اور اس کی بیوی اس کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے کتا انھیں بلا رہا ہو کسان اپنا پھاوڑا لے کر وہاں پہنچا اور اس جگہ کو کھودنے لگا اچانک وہاں ایک بڑا گھڑا نظر آیا اس کو جو کھول کر دیکھا تو اس میں چاندی کے سکے تھے۔ کسان خوش خوش اس گھڑے کو لے کر گھر میں گیا

کسان اور اس کی بیوی دونوں بڑی اچھی عادت کے تھے۔ انھوں نے اپنے پڑوسیوں کو بلایا اور وہ گھڑا دکھایا۔ سب نے اس وفادار کتے کی تعریف کی۔

لیکن ان میں سے ایک پڑوسی کو بہت دکھ ہوا وہ سوچنے لگا کہ اب یہ لوگ بہت مالدار ہو جائیں گے اور ہمیں ان کے پڑوس میں رہتے ہوئے شرم آئے گی گھر آ کر اس پڑوسی نے سب واقعہ اپنی بیوی کو سنایا۔ بیوی بھی یہ سن کر حسد کے مارے جل گئی۔ آخر دونوں نے سوچا کہ ہم اس کتے کو ایک دو دن کے لیے اپنے گھر لے آئیں۔ کیا عجب جو ہمارے باغ یا گھر میں کوئی خزانہ ہو اور کتا بتا دے۔

دونوں اس کسان کے ہاں گئے اور ایک دو دن

کے لیے کتے کو مانگ لائے ایک دن وہ کتے کو لے کر اپنے باغ میں گئے کتے نے ایک درخت کے آس پاس چکر لگانے شروع کیے اور ایک جگہ زمین کھودنے لگا۔ اب دونوں خوش ہو گئے اور پھاوڑا لا کر اس جگہ کو کھودنے لگے۔ بہت دیر کی کھدائی کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں تو ٹوٹے پھوٹے برتنوں اور جانوروں کی ہڈیوں کا ڈھیر ہے۔ اب تو دونوں کو بہت غصہ آیا انھوں نے کتے کو اتنا مارا اتنا مارا کہ اس نے وہیں دم توڑ دیا۔ انھوں نے اس کی لاش اس گڑھے میں پھینک دی اور اوپر سے مٹی ڈال دی۔

دوسرے دن جب کسان اپنا کتا لینے آیا تو انھوں نے کہہ دیا کہ وہ نہ جانے کہاں چلا گیا۔ کسان اور اس کی بیوی کو کتے سے بہت محبت ہو گئی تھی۔ دونوں کو اس کے اس طرح گم ہونے کا سخت افسوس ہوا۔ اس رات کسان نے اس کتے کو خواب میں دیکھا وہ انسانوں کی طرح باتیں کر رہا تھا۔ اس نے کہا "میرے مالک ہمارے گھر کے پیچھے ایک درخت ہے اسے کاٹ کر اس سے ایک اوکھلی بنا لو اور ایک موسل اور انھیں استعمال کرو" کسان نے ایسا ہی کیا اور محنت کرنے کے بعد اوکھلی اور موسل بن گیا تو اس کی بیوی چاول چھڑنے کے لیے بیٹھی۔ اس کے تعجب کی انتہا نہ رہی [illegible] کہ وہ چاول سونے کے دانے بن گئے۔ کسان بھاگا بھاگا گیا اور اپنے پڑوسی کو یہ ماجرا دکھایا۔ اب تو اس کے پڑوسی حیران رہ گئے۔

اس حاسد پڑوسی نے ایک دن [illegible] لیے اوکھلی اور موسل کسان سے مانگ لیا۔ دوسرے دن اس نے گھر کا [illegible] کے بدلے چاول خریدے اور چاول چھڑنے کے لیے بیٹھے سونے کے چاول بننا تو دور کی بات تھی وہاں تو اصلی چاولوں کی جگہ خاک اور مٹی تھی۔

اب تو انھیں اور بھی غصہ آیا۔ وہ سمجھے ہمارا پڑوسی ہمیں دھوکا دیتا ہے۔ غصے میں آ کر انھوں نے اوکھلی اور موسل دونوں کو جلا دیا۔ کسان کو جب یہ پتہ چلا تو اسے بہت دکھ ہوا مگر اس نے صبر کیا اپنے پڑوسی سے کچھ نہ کہا۔

اس رات پھر اس نے کتے کو خواب میں دیکھا کتے نے پھر کسان سے بات چیت کی اس نے بتایا کہ اس اوکھلی کی راکھ تم مرجھائے ہوئے اور جلے ہوئے پیڑ پر چھڑک دو وہ پھر ہرا بھرا ہو جائے گا۔

دوسرے دن کسان اپنے پڑوسی کے گھر جا کر راکھ لے آیا۔ باغ میں کئی درخت مرجھا گئے تھے دھوپ کی تیزی سے جل گئے تھے اس نے تھوڑی تھوڑی راکھ ان درختوں پر چھڑک دی۔ تمام درخت دیکھتے دیکھتے ہرے بھرے ہو گئے۔

تھوڑے ہی دنوں میں یہ بات سب جگہ پھیل گئی کہ کسان کے پاس ایسی راکھ ہے جو مرجھائے ہوئے درختوں کو ایک پل میں ہرا بھرا کر دیتی ہے اڑتے اڑتے یہ خبر بادشاہ تک پہنچی بادشاہ نے اس کسان کو بلایا اور کہا میرے باغ میں کچھ درخت بہت قیمتی ہیں اب وہ مرجھا گئے ہیں تم اپنی جادوئی راکھ سے انھیں پھر زندہ کر دو۔ کسان نے تھوڑی تھوڑی راکھ ان درختوں پر چھڑک دی مرجھائے ہوئے درخت پل بھر میں ہرے بھرے ہو گئے بادشاہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کسان کو بہت انعام دیا۔

یہ بات پڑوسی کو معلوم ہوئی اس نے بھی ہوئی
(باقی ص۲۴ پر)

جناب رشید الوحیدی ایم اے ذاکر مین
اسلامک انسٹی ٹیوٹ جامعہ

مجاہد

(عربی کہانی)

یہ ٹیونس دیس کی کہانی ہے۔ اس دیس کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک بچہ رہتا تھا۔ اس کا نام مجاہد تھا اس کے ماں باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ بے چارہ اپنے گاؤں والوں کے ساتھ اس گاؤں میں رہتا تھا۔ ایک بار اس کے گاؤں پر قریب کے بڑے قصبے کے لوگوں نے حملہ کر دیا حملہ بڑا سخت تھا، بوڑھے بچے، عورت مرد سبھی کا قتل عام ہوا۔ وہ گاؤں سے کچھ دور ایک پہاڑی علاقے میں بھاگ گئے ننھے مجاہد کے پاس سامان ہی کیا تھا ایک اونٹ، چند بکریاں، ایک خیمہ، دن بھر وہ اونٹ اور بکریاں چراتا رات کو ان کا دودھ پی کر کسی جگہ خیمہ لگا کر سو رہتا۔ اسی طرح روکھی پھیکی زندگی گزر رہی تھی۔

اس نے دیکھا کہ گاؤں والے بھاگ رہے ہیں اور حملہ آور سب کو لوٹ رہے ہیں تو اُسے بھی خیال ہوا کہ اپنا مختصر سامان لے کر چلا جائے۔ مگر گاؤں کی محبت نے پیر پکڑ لیے۔ اس نے سوچا کہ جیو ں گا تو اسی گاؤں میں مروں گا تو اسی گاؤں میں۔ یہ سوچ کر بھاگنے کا خیال دل سے نکال دیا، ادھر حملہ آوروں نے سوچا ایک غریب فاقہ مست بچہ ہمارا کیا بگاڑے گا، اسے چھوڑ دو، پڑا رہنے دو۔ مجاہد جانتا تھا کہ میرے گاؤں والے قریب کے پہاڑوں پر بس گئے ہیں اور موقع پا کر حملہ آوروں سے بدلہ ضرور لیں گے۔ اپنی سوجھ بوجھ کی بدولت اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ دشمن بھی انتظام کر کے میرے گاؤں والوں کو پہاڑ پر سے بھگا کر دم لیں گے تاکہ آئندہ حملے کا خطرہ ہی نہ رہے۔ مجاہد روزانہ صبح کو گاؤں سے باہر نکلتا ادھر اُدھر گھوم کر پتہ لگاتا کہ کہیں کوئی خطرہ تو نہیں ہے۔

گاؤں سے باہر اس گاؤں کے چودھری کا مکان تھا۔ چودھری تو مکان چھوڑ کر پہاڑ پر جا بسا تھا مگر اس کا مکان، باغ اور خوشنما چمن گاؤں والوں کی تفریح گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

اس باغ میں ایک گہرا حوض تھا اس کا پانی نہایت صاف اور ٹھنڈا تھا۔ اس حوض میں اترنے کے لیے کوئی زینہ نہ تھا بس لکڑی کی ایک سیڑھی ایک طرف رکھی رہتی تھی، نہانے والے اس کے ذریعے حوض میں اترتے اور نہا کر واپس آ جاتے۔

مجاہد روزانہ وہاں جاتا، تفریح کرتا اور نہا دھو کر
بس آجاتا۔

ایک دن صبح ہی صبح وہ حوض میں نہا کر ایک
(در)خت کے نیچے بیٹھا تھا اچانک دور سے ایک اجنبی آتا
دکھائی دیا۔ مجاہد ڈر کر ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا
جب آنے والے پر اس نے دیکھا کہ وہ حملہ آور قبیلے کا ایک
(سپا)ہی تھا کچھ سامان لے کر اپنے آقا کے پاس آیا تھا
(سا)مان دینے سے پہلے وہ غسل کرنا چاہتا تھا۔ ابھی وہ
(سپ)اہی کپڑے اتار کر حوض میں گھسا ہی تھا کہ مجاہد
چپکے اس کے سامان کے پاس گیا۔

(آپ) یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ ننھا مجاہد چوری کی غرض سے
(سپ)اہی کے سامان کے پاس گیا تھا وہ تو اپنے گاؤں
سرزمین کی خدمت کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا اسی
(لیے وہ اس)میں ہر وقت کچھ تلاش کرتا رہتا ہے اور ہمیشہ اسی
(دھن میں مگن ر)ہتا تھا۔ چپکے سے اپنے گاؤں والوں سے
(پ)ہاڑ پر جاتا اور ان سے کہتا کہ میں ایک نہ ایک
(دن) تم سب کو پھر گاؤں واپس بلاؤں گا۔ آج خوش
(قسمتی) سے اس بات کا موقع مل گیا۔

جب مجاہد سامان کے پاس پہنچا تو اسے ایک
(مہر ب)ند لفافہ نظر آیا۔ مجاہد نے کچھ سوچے سمجھے بغیر پہلے
لفافہ قبضے میں کیا پھر چپکے سے کھسکتا کھسکتا
(حوض) کے کنارے آیا۔ بکری کی سیڑھی ایک دم اٹھا لی
(ا)ور پھینک دی۔

اب وہ ایک منٹ ضائع کئے بغیر اپنے گاؤں
(وال)وں کے پاس پہاڑ کی طرف بھاگا۔ پہلے تو گاؤں
(والے) ڈرے کہ کہیں دشمنوں کا کوئی سپاہی تو نہیں
(مگر) مجاہد کو دیکھ کر اور پہچان کر سب اس کے
چاروں طرف جمع ہو گئے۔ اس نے جھٹ وہ لفافہ چودھری کو
دے دیا۔

چودھری نے لفافے کی مہر توڑی اور پڑھا تو پہلے تو اس
کا چہرہ پیلا پڑ گیا، پھر ایک دم ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے
لگی اور خوش ہو گیا۔ تم سوچتے ہو گے آخر اس لفافے میں کیا تھا
تو لو سنو ننھے مجاہد نے کتنا بڑا کام کیا تھا۔

دراصل دشمنوں نے ان پہاڑوں کو اور گاؤں والوں
کو تباہ کرنے کا ارادہ کیا تھا یہ کام اپنے ان ساتھیوں کی مدد
سے کرنا چاہتے تھے جو پہلے سے اس گاؤں میں تھے یہ لفافہ
اسی مقصد سے بھیجا گیا تھا۔ اس میں حملہ کرنے کا طریقہ اور
جن جن راستوں سے حملہ کرنا تھا، سب لکھ دئے تھے، مجاہد
نے ان کا سارا پروگرام اپنے گاؤں والوں کو بتا کر فیل کر دیا

گاؤں والوں نے جلدی جلدی تیاری شروع کر دی
پہاڑ کے چاروں طرف اپنے آدمی مقرر کر دیئے جگہ جگہ
خطرناک ہتھیار چھپا دیئے چاروں طرف گڑھے کھود کر
ان میں بارود بھر دی اور ایک راستہ چھوڑ دیا۔

جب دشمن نے پروگرام کے مطابق اپنے مقرر کئے ہوئے
وقت پر حملہ کیا تو راستہ بند پایا۔ یہ سمجھ کر کہ گاؤں والوں سے ڈر
کر یہ انتظام کیا گیا ہے۔ وہ راستہ ڈھونڈھنے لگے اور ایک
طرف سے سب کے سب ایک میدان میں گھس گئے اب
تو سبھی دشمن گھر گئے زوردار حملہ شروع ہوا سارے دشمن
بھون کر رکھ دئے گئے۔ واہ بھئی ننھے میاں تم تو سچ مچ مجاہد
نکلے ـــ!

مصنف:۔ ہینس اینڈرسن
مترجم:۔ خلیق انجم اشرفی

دیاسلائی کی لو

بچوں کے مشہور کہانی کار ہینس اینڈرسن کی ایک خوبصورت کہانی

غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ سڑکیں برف سے ڈھک گئی تھیں، شام کا وقت تھا اور سال کا آخری دن

ایسی سخت سردی میں ایک غریب بچی ننگے پیر سڑکوں پر بھٹک رہی تھی۔ گھر سے تو وہ اپنی اماں کے سلیپر پہن کر چلی تھی لیکن وہ راستے ہی میں کہیں کھو گئے تھے۔ ہوا یہ کہ سڑک پر تیزی سے آتی گھوڑا گاڑی سے بچنے کے لیے وہ تیزی سے ایک طرف دوڑی تو سلیپر پیچھے سڑک ہی پر چھوٹ گئے۔ جب وہ انہیں اٹھانے لپکی تو ایک سلیپر برف میں دب کر گم ہو چکا تھا اور دوسرا ایک شریر لڑکا اٹھا کر بھاگ گیا۔ بے چاری ننگے پیر ہی چل دی۔ برف پر چلتے چلتے اس کے ننھے منے پیر نیلے پڑ چکے تھے اس کی جھولی میں دیا سلائی کی چند ڈبیاں تھیں۔ دن بھر ماری ماری پھرتی رہی لیکن کسی نے ایک ڈبیا بھی تو نہیں خریدی۔ ٹھنڈ اور بھوک سے بے چین وہ گلی گلی بھٹکتی رہی۔ اسے یہ بھی تو ڈر تھا کہ اگر خالی ہاتھ گھر لوٹی تو ابا پٹائی کریں گے۔

بازار میں خوب چہل پہل تھی۔ دکانیں سجی ہوئی تھیں، جگہ جگہ طرح طرح کی مزے دار چیزیں بک رہی تھیں۔ بھینی بھینی خوشبو سے اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔

جب اندھیرا گھر آیا تو بازار اور گلیاں سونی ہو گئیں دکانیں بھی بند ہو گئیں۔ لوگ آرام کرنے کے لیے اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیے صرف وہ لڑکی اکیلی کھڑی رہ گئی۔ سردی سے ٹھٹھری جا رہی تھی اور بھوک کے مارے اس کا برا حال تھا تھک بھی بہت گئی تھی

اب ایک قدم چلنا بھی اس کے لیے دوبھر تھا۔

ابھی تک اس کی ایک ڈبیا بھی نہ بکی تھی۔

وہ بڑی الجھن میں تھی۔ اچانک اس کی نظر دو مکان کے بیچ میں ایک خالی جگہ پر پڑی اس نے سوچا کہ اس کونے میں بیٹھ کر تھوڑی دیر سستا لیا جائے۔ یہ بات ذہن میں آتے ہی وہ لپک کر اس جگہ پہنچی اور بیٹھ گئی۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے پیر سکوڑ کر کپڑوں میں چھپا لیے اور ہاتھوں کو رگڑ رگڑ کر گرمی پہنچانے لگی۔

لیکن سب بے کار تھا

اچانک اسے دھیان آیا کہ میرے پاس تو دیا سلائی کی ڈبیاں ہیں سوچنے لگی "کیوں نہ ایک دیا سلائی جلا کر دیکھوں۔" لیکن وہ ڈر بھی رہی تھی کہ کہیں ابا کو پتہ چل گیا

یں نے دیا سلائی پھونکی ہے تو جانے کتنی مار پڑے! نا پھر یہ سوچ کر کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا اس نے ایک بیا کھول کر دیا سلائی نکال لی۔

ہلکی سی رگڑ کھاتے ہی دیا سلائی جل اٹھی۔ بڑی چمکدار ر تیز روشنی ہوئی۔ وہ ایک ٹک دیا سلائی کی لو دیکھنے ی۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ ایک بڑی انگیٹھی کے س بیٹھی ہو اور انگیٹھی میں تیز آگ دہک رہی ہو لیکن یسے ہی اس نے آگ تاپنے کے لیے اپنے ننھے ننھے ہاتھ بڑھائے دیا سلائی بجھ گئی۔ انگیٹھی اور آگ جانے کہاں غائب ہو گئیں۔

پھر اس نے دوسری دیا سلائی جلائی۔ دیوار پر جہاں جہاں دیا سلائی کی روشنی پڑی وہاں سے دیوار غائب ہو گئی اور ایک کمرہ ظاہر ہوا جس میں رکھی ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ایک طرف انگیٹھی میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ میز پر کھانے کی مزے دار چیزیں رکھی تھیں۔ میز کے بیچوں بیچ ایک بڑا سا کیک بھی رکھا تھا۔ اور اچانک ایک انوکھی بات ہوئی۔ میز پر رکھا ہوا کیک اڑا اور سیدھا اس کی طرف آنے لگا۔ جیسے ہی اس نے کیک کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھائے، دیا سلائی بجھ گئی فوراً ہی سب کچھ غائب ہو گیا۔ اب اس کے سامنے صرف اینٹوں کی سخت دیوار تھی۔

وہ بڑی حیران ہوئی۔ اس نے تیسری دیا سلائی جلائی دیا سلائی جلتے ہی اس کی روشنی میں اسے کرسمس کا پیڑ دکھائی دیا۔ بڑا انوکھا پیڑ تھا بہت بڑا اور خوبصورت اس پیڑ پر جگہ جگہ رنگ برنگی موم بتیاں جل رہی تھیں۔ اس کی شاخوں سے بہت سی خوبصورت چیزیں لٹک رہی تھیں اس میں ایک پیاری پیاری سفید گڑیا بھی تھی جب اس نے گڑیا اتارنے کو ہاتھ بڑھایا تو دیا سلائی پھر بجھ گئی۔

پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ پیڑ پر لگی موم بتیاں تیزی سے آسمان کی طرف اڑنے لگیں اور جگمگاتے ستارے بن گئیں۔ اس میں سے ایک ستارا روشنی کی ایک لمبی سی چمکدار لکیر بناتا ہوا ٹوٹ کر گرا۔

لڑکی کے منہ سے نکلا "اوہ! ابھی ابھی کوئی مرا ہے۔"

اس کی دادی کہا کرتی تھیں کہ جب بھی کوئی ستارا ٹوٹ کر گرتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کوئی بڑا آدمی جنت کی طرف جا رہا ہے۔

اس نے ایک اور دیا سلائی جلائی۔ اس بار دیا سلائی کی تیز روشنی میں اسے اپنی دادی دکھائی دیں اس کی دادی کا انتقال اسی رات ہوا تھا اور اب وہ جنت کی طرف جا رہی تھیں۔

"دادی" وہ یکایک چلائی "دادی۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ مجھے ساتھ نہیں لے چلو گی تو دیا سلائی بجھتے ہی تم بھی غائب ہو جاؤ گی۔ جیسے انگیٹھی کیک اور کرسمس کا پیڑ غائب ہو گیا۔"

لڑکی نے ایک دم ساری دیا سلائیاں نکالیں اور ایک ساتھ جلا دیں۔ تیز روشنی ہوئی اس روشنی میں اس کی دادی اور بھی خوبصورت لگنے لگیں۔

دادی بولیں "بیٹی چل میرے ساتھ۔ میں تیری دیکھ بھال کروں گی تجھے کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گی" یہ کہتے کہتے دادی نے اسے اپنی باہوں میں بھر لیا اور دادی پوتی دونوں جنت کی طرف . . . . . .

. . . . نئے سال ــ

دن صبح سویرے لوگوں نے دیکھا کہ برف میں ایک چھوٹی سی خوبصورت لڑکی کا بے جان جسم پڑا تھا۔ اس

(باقی صفحہ پر)

آؤ کہانی لکھیں

جناب
اقبال امروہوی

اس وقت آپ کے ہاتھ میں پیام تعلیم کا کہانی نمبر ہے، اس کا آپ کو بہت دنوں سے انتظار ہوگا اور آپ مزے دار کہانیاں پڑھنے کے لیے بے چین ہوں گے۔ اس کہانی نمبر کی کہانیاں ضرور پسند آئی ہوں گی۔ چھوٹی چھوٹی کتابیں جن میں بچوں کے لیے اچھی اچھی کہانیاں ہوتی ہیں۔ سبھی بچے پسند کرتے ہیں لیکن یہ کہانیاں پڑھ کر کچھ بچے یہ بھی سوچتے ہیں کہ کاش وہ بھی ایسی کہانیاں لکھ سکتے کچھ بچے جنہیں کہانی لکھنے کا شوق ہوتا ہے، کوشش بھی کرتے ہیں لیکن لکھ نہیں پاتے۔ وہ کہانی لکھنا شروع کر دیتے ہیں:۔ ایک تھا راجہ اور ایک تھی رانی۔ "اب اس کے آگے کیا لکھیں ان کے ذہن میں نہیں آتا پھر اس سطر کو کاٹ کر دوسری شروع کر دیتے ہیں: "ایک تھا بکرا ایک تھا بندر دونوں میں بہت دوستی تھی۔" اب سوچ رہے ہیں کہ پھر کیا ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اس کو بھی کاٹ دیا۔ اسی طرح کئی مرتبہ کوشش کی مگر چونکہ ان کے ذہن میں کوئی کہانی تو تھی نہیں اس لیے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس کے بعد ان کی ہمت ٹوٹ گئی۔ سوچنے لگے بھئی کہانی لکھنا تو بہت مشکل کام ہے!"

تو بھئی یہ تو صحیح ہے کہ بچوں کو شروع میں کہانی لکھنا مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن آج وہ جو کہانیاں رسالوں اور کتابوں میں پڑھتے ہیں اس کے لکھنے والے بھی کبھی انہی کی طرح بچے تھے۔ وہ بھی اسی طرح کوشش کرتے تھے لیکن ناامید نہ ہوتے تھے پھر ان کے استاد نے انہیں کہانیاں لکھنے کے لیے کچھ اصول بتلائے ہوں گے۔ اور وہ محنت اور مشق کے ذریعہ کہانیاں لکھنے لگے۔

اگر آپ کو کہانی لکھنے کا شوق ہے تو آئیے آپ کو بتائیں کہ کس طرح مشق کریں، کس طرح کہانی لکھنے کی کوشش کریں تاکہ بڑے ہو کر آپ بھی اچھی اچھی کہانیاں لکھ سکیں۔

کہانی لکھنے کے لیے دو باتیں بہت ضروری ہیں اول تو یہ کہ آپ اچھی اچھی کہانیاں سوچ سکیں۔ اور دوسرے یہ کہ جو آپ سوچتے ہیں اسے دلچسپ انداز میں اور مناسب الفاظ میں لکھ سکیں،

(صفحہ ۸ سے سلسلہ ملا لیجئے)

میں لکھنے کی کوشش کرو لیکن یہ خیال رہے کہ کہانی لکھتے وقت وہ کتاب بالکل نہیں دیکھنا چاہیے جس سے تم نے وہ کہانی لی ہے۔ کوشش یہی کرو کہ اگر کہانی کا خیال دوسرے کا ہے تو وہ کہانی تمہارے اپنے لفاظ میں لکھی جائے۔ اس طرح دونوں طریقوں سے تم بہت جلد مشق مکمل کر لوگے اور پھر کسی خیال کو اپنے لفاظ میں لکھنے میں تمہیں وقت نہیں ہوگی۔

اب کچھ بچے یہ سوچ رہے ہوں گے کہ اچھی اچھی ہانیاں کس طرح سوجھ جائیں ایسا کون طریقہ ہے کہ ہانیاں ذہن میں پیدا ہوں۔ تو بھئی اس کے لیے ۔ئی خاص طریقہ نہیں بتایا جا سکتا اس کے لیے تو مطالعے کی ضرورت ہے تم جتنا پڑھوگے اتنا ہی تمہارا ربہ بڑھے گا۔

اسکول کے کام سے نمٹ جانے کے بعد تمہیں جو قت ملتا ہے اسے پڑھنے میں صرف کرو اچھی اچھی ا بیں پڑھو۔ جب تمہارا مطالعہ بڑھے گا تو تم آسانی ے اپنے اردگرد کے کاموں میں کہانیوں کو ڈھونڈ تے ہو۔ اگر ہم سے پوچھو تو آج کل کی دنیا میں تو ہر جگہ نیاں بکھری ہوئی ہیں جس چیز کو دیکھو غور کرو اور ، بارے میں سوچو تو ایک کہانی ذہن میں آسکتی لیکن یہ سب تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ۔تا ہے کہ ہم کوئی ایسا معمولی سا واقعہ دیکھتے ہیں راسے نظرانداز کر دیتے ہیں حالانکہ اگر اس پر غور ہیں سوچیں تو اس کی مدد سے ایک کہانی لکھی جا سکتی ے۔

مثال کے طور پر آپ نے ایک توتے کو پنجرے ، دیکھا۔ اب آپ اس کے بارے میں سوچنا شروع کیجیے تو آپ کے ذہن میں یہ خیال آئے گا کہ یہ توتا اس پنجرے میں لانے سے پہلے جنگل میں آزادی سے اڑتا پھرتا ہوگا۔ ایک دن کسی شکاری کے جال میں پھنس گیا ہوگا۔

اب اس بارے میں اور غور کیجیے گا تو آپ کے ذہن میں آجائے گا کہ وہ کس طرح شکاری کے ہاتھ لگا ہوگا۔ ہو سکتا ہے آپ کے ذہن میں یہ بات آئے کہ شاید اس نے کچھ نادانی کی ہوگی جس کی اسے آج تک سزا مل رہی ہے اب نادانی کا خیال آتے ہی آپ سوچیں کہ شاید اس نے اپنے ماں باپ کا حکم نہیں مانا اس لیے وہ جال میں پھنس گیا۔ اب اس کو اس طرح سوچا جا سکتا ہے کہ جب یہ توتا بچہ تھا نئے نئے پر نکلے تھے تو ماں باپ نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ گھونسلے سے باہر نہ جائے۔ ایک مرتبہ اس کی ماں اس کے لیے دانہ چگنے گئی تو توتے میاں کو جنگل کی ہوا کھانے کی سوجھی۔ اپنے گھونسلے سے نکل، برابر کے پیڑ کی ایک شاخ پر جا بیٹھے گھونسلے کے باہر کی فضا کچھ ایسی بھائی کہ وہ اپنی ماں کی نصیحت بھول گئے اور ایک درخت سے دوسرے درخت پر جا بیٹھے اور پھر دوسرے سے تیسرے پیڑ پر اس طرح آہستہ آہستہ اپنے گھونسلے سے بہت دور نکل گئے اب جو بھوک لگی تو ماں یاد آئیں نظر اٹھا کر دیکھا تو بہت پریشان اب وہ راستہ بھول گئے کہ گھونسلا کس طرف تھا بہت کوشش کی مگر گھونسلا نہیں ملا۔ چار و ناچار ایک درخت پر جہاں بہت سے توتے بیٹھے تھے، پہنچے کہ شاید وہاں ان کے ماں باپ ہوں مگر وہاں تو سب توتے اجنبی تھے۔ اتنے میں ایک

(صفحہ ۸۲ سے سلسلہ ملائیے)

اگر ان دونوں باتوں کی مشق ہو جائے تو کہانی لکھنا آپ کے لیے مشکل کام نہیں رہے گا۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی گھر یا عمارت بنانا ہوتی ہے تو سب سے پہلے اس کے لیے زمین کا انتظام کرنا ہوتا ہے پھر زمین کی مناسبت سے گھر کا نقشہ یا خاکہ تیار کیا جاتا ہے اور اس نقشے کے مطابق گھر کی بنیاد رکھی جاتی ہے پھر اس بنیاد پر دیواریں اٹھائی جاتی ہیں دروازے بنائے جاتے ہیں اور اس طرح عمارت تیار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کہانی لکھنے کے لیے سب سے پہلے کہانی کا پلاٹ یعنی زمین آپ کے ذہن میں ہونا چاہیے۔ پھر اس کہانی کا ایک خاکہ تیار کرنا چاہیے جس کی مدد سے آپ کہانی مکمل کر سکیں خاکہ تیار کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ آپ کے اسکول میں اردو مضمون کے گھنٹے میں یا امتحانوں میں کہانیوں کے اشارے دیے جاتے ہیں۔ اور ان اشاروں کی مدد سے آپ سے کہانی لکھنے کو کہا جاتا ہے ایسے سوالات میں کہانی کا خیال کسی اور کا ہوتا ہے اور اس خیال کو اشاروں کے ذریعے آپ پر واضح کیا جاتا ہے تاکہ آپ اپنے الفاظ میں اس کہانی کو لکھ سکیں۔ اس طرح آپ اپنی سوچی ہوئی کہانی کے پہلے اشارے تیار کر لیجیے ان اشاروں کی مدد سے کہانی مکمل کرنا آسان ہو جائے گا۔

اشارے تیار کرنے کے بعد اس کہانی کی مدد سے اپنے الفاظ میں لکھنا ہے۔ اس کام کے لیے مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ جتنا لکھنے کی مشق کی جائے گی اسی قدر آپ کی تحریر اچھی ہوگی۔ لکھنے کی مشق کرنے سے مطلب یہ نہیں کہ کسی عبارت کی نقل کر لی جائے۔ اس طرح تو املا درست ہو سکتا ہے لیکن کسی واقعے کو یا سوچے ہوئے خیال کو اپنے الفاظ میں لکھنے کی مشق کرنا ضروری ہے۔ اس کے لیے ایک طریقہ تمہیں بتاتے ہیں۔

تمہارے گھر میں، پڑوس میں، اسکول میں یا راستے میں کبھی کوئی ایسا واقعہ ہو جاتا ہے جسے تم اپنے دوستوں سے بیان کرتے ہو مثلاً اگر گھر یا پڑوس میں کوئی واقعہ ہوا تو تم اسے اپنے مدرسے کے دوستوں سے بیان کرو گے اور اگر اسکول میں یا راستہ میں کوئی واقعہ تم نے دیکھا تو گھر جا کر اپنے بھائی بہن سے اس کا ذکر کرو گے آئندہ اگر ایسا کوئی واقعہ تم دیکھو کہ اس کو کسی دوست سے بیان کرنا ہے تو اس کو زبانی سنانے کے بجائے ایک کاغذ پر تحریر کر دو۔ اس میں تمہیں زیادہ تکلیف نہیں ہوگی بس یہ سمجھو کہ تمہارا دوست تمہارے سامنے بیٹھا ہے اور تم اسے وہ واقعہ سنا رہے ہو جن الفاظ میں تم اسے سناتے انہی الفاظ میں اس کو کاغذ پر لکھ ڈالو۔ لو بھئی یہ ایک سیدھی سادی سی کہانی ہو گئی جو تم نے اپنے الفاظ میں لکھی ہے اس طرح بار بار مشق کرنے سے تمہیں کافی مہارت ہو جائے گی اور تم اپنے خیالات کو اپنے الفاظ میں اچھی طرح لکھنا سیکھ جاؤ گے۔

یا اس قسم کی مشق کے لیے ایک دوسرا طریقہ بھی استعمال کر سکتے ہو۔

اگر تم کسی کتاب میں کوئی کہانی پڑھ رہے ہو اور وہ تمہیں اچھی لگتی ہے تو اسے ایک دو بار پڑھ لو تاکہ اس کہانی کا خلاصہ تمہارے ذہن میں رہ جائے۔ پھر اس کہانی کے اشارے تیار کر لو۔ اب ان اشاروں کی مدد سے اس کہانی کو اپنے الفاظ

[illegible]

شکاری آگیا۔ اسے دیکھ کر سب توتے اڑ گئے۔ مگر
ن میاں کے پر بھی ابھی اچھی طرح نہیں آئے تھے اس لئے
یہ نہ اڑ سکے اور شکاری کے ہاتھ لگ گئے۔ اب
ج تک پنجرے میں اپنی غلطی کی سزا بھگت رہے
ہیں۔

دیکھا آپ نے بات میں بات پیدا ہو جاتی ہے
یک بات کی مدد سے دوسری بات ذہن میں آتی
ہے اور اس طرح کہانی آگے بڑھتی ہے۔ اسی
رح آپ کہانیاں سوچئے اور لکھنے کی مشق کیجئے
لیکن یہ خیال رہے کہ ابتدا میں ہلکی پھلکی آسان اور
چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنی چاہئیں۔ دوسرے
یہ کہ کہانی لکھنے میں جلد بازی نہیں کرنا چاہئے۔ یہ
ت سوچئے کہ آپ روز ایک کہانی لکھنا ہی فی الحال
ر مہینے میں ایک اچھی کہانی مکمل کر لی تو بہت ہے

ایک بات کا اور خیال رہے اس سلسلہ میں
پنے ماسٹر صاحب کی صلاح ضرور لیجئے گا۔ آپ
کہانی لکھیں انہیں دکھالیں تاکہ اگر کوئی خامی
کمی انھیں نظر آئے اُسے دور کرنے میں وہ آپ
ی مدد کر سکیں۔

تو کیوں اس طرح وہ بچے کہانی لکھنے کی
مشق کر سکتے ہیں جو کہانی لکھنے کے شوقین ہیں
چاہتے ہیں کہ بہت جلد اُن کی کہانیاں پیامِ
تعلیم میں چھپیں۔

(بقایا صـ)

راکھ کو سنبھال کر رکھ لیا اور اپنی بیوی کو لے کر بادشاہ
کے دربار میں گیا اور بادشاہ سے کہا "میرے پاس بھی
ایسی راکھ ہے جو جلے ہوئے درختوں کو پل بھر میں ہرا
بھرا کر دیتی ہے۔

بادشاہ کو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ اس کی حکومت
میں اور بھی ایسے لوگ ہیں اس نے سوچا کہ اب میرے
ملک میں کوئی درخت نہ مرجھائے گا نہ جلے گا

وہ اپنے درباریوں کو اپنے ساتھ لے کر کسان کے
پڑوسی کے باغ میں گیا۔ وہاں کچھ پرانے درخت تھے
بادشاہ نے کہا: "ان درختوں کو تم پھر زندہ کر دو" پڑوسی
نے ایک ایک مٹھی راکھ درختوں پر چھڑک دی لیکن
ایک بھی درخت ہرا نہ ہوا۔ بلکہ راکھ اڑ کر جس آدمی کے
آنکھوں میں گئی وہ اندھا ہو گیا۔ بادشاہ بہت ناراض
ہوا اور اس نے ان دونوں کو پکڑ کر قید میں ڈال دیا
اب انہیں احساس ہوا کہ حسد کا انجام کیا ہوتا ہے

(بقایا صـ)

گالوں پر سرخی تھی۔ بال سنہرے تھے اور چہرے پر میٹھی
میٹھی سی مسکراہٹ تھی

لوگوں کو بڑا دکھ ہوا نئے سال کے دن ایک ننھی
سی بچی سردی سے ٹھٹھر کر مر گئی لیکن یہ بات کسی نے رات
کو نہیں سوچی تھی جب وہ بچی دیا سلائیاں بیچنے کے لیے
گلی گلی بھٹکتی رہی۔ انھیں کیا پتہ کہ اس لڑکی نے رات
کو کیسے خوبصورت نظارے دیکھے تھے اور اس انوکھی
شان سے وہ اپنی دادی کے ساتھ جنّت کو سدھاری
تھی۔

محمد امین صاحب ایم اے

سچ اور جھوٹ کی کہانی

ایتھوپیا کی لوک کہانی

ایتھوپیا کی سرزمین بہت پرانی ہے یہاں گھاس کے میدان ہیں میلوں پھیلے ہوئے پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں جو آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ وادیاں ہیں تنگ اور پیچ دار۔ بارش موسلا دھار ہوتی ہے اور بہار کے موسم میں دریاؤں میں طغیانی آجاتی ہے۔ سورج کی کرنیں بھی سیدھی اور تیز پڑتی ہیں خشکی بھی اتنے غضب کی ہوتی ہے کہ زمین چٹخ جاتی ہے اور دراریں پڑ جاتی ہیں خزاں کے موسم میں گرد و غبار کچھ کم نہیں رہتا اور آندھیوں سے فضا مکدر ہو جاتی ہے۔ غرض انسان یہاں ایسے حالات سے دوچار رہتا ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

بارش شروع ہوتے ہی کسان اپنے کھیتوں میں ہل چلاتا ہے۔ پھر وہ مکّا اور تفسا کے بیج بوتا ہے۔ چند مہینوں میں بارش ختم ہو جاتی ہے اور فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ وہ انھیں کاٹتا ہے۔ کھلیان بناتا ہے۔ ڈنٹھل کو سکھا کر، دل کر اور اُسا کر دانے الگ کرتا ہے اناج کے ان دانوں کو مٹی کے بھاری برتنوں میں جمع کر لیتا ہے اور دیوار سے لگا کر شہد کی مکھی کے چھتوں کی طرح بھوسے کو گانج دیتا ہے۔

گاؤں ندی وادیوں کے کنارے کنارے پہاڑ کی بلندیوں پر دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں سے نیچے کھیت صاف نظر آتے ہیں۔ ہر روز صبح ہوتے ہی بچے اور لڑکے اپنے مویشی اور بکریوں کے ریوڑ چرانے کے لیے چراگاہوں میں نکل جاتے ہیں۔ شام کو ڈھلان سے اوپر لوٹ آتے ہیں اور مویشیوں کو ان باڑوں میں بند کر دیتے ہیں تاکہ چیتے، شیر اور لکڑ بگھے سے محفوظ رہیں۔ عورتیں اپنا کام خود کرتی ہیں۔ صبح کو چشمے پر جاتی ہیں بڑے بڑے مٹکے پانی سے بھر کر لاتی ہیں۔ لڑکیاں ایندھن کے لیے لکڑی ڈھونڈھ لاتی ہیں۔ ایتھوپیا کی سرزمین سے بارہا قبیلے ہو کر گزرے ہیں۔ ان میں سے بعض نے گھاٹیوں میں رہائش اختیار کر لی ہے۔ دوسرے اپنے مویشی چراتے چراتے اِدھر سے اُدھر نکل گئے۔ اپنا نام و نشان بھی چھوڑنا بھول گئے۔

پہاڑوں پر اور پٹھاروں میں زندگی گزارنا ہنسی کھیل نہیں۔ دن ملوں میں اور راتیں خطرے میں گزرتی ہیں۔ پھر بھی لوگ رہتے بستے ہیں۔ کٹھنائیاں اٹھاتے ہیں اور جمے ہوئے ہیں آج سے نہیں ہزارہا برس سے رہتے چلے آئے ہیں۔

مغرب میں گھاس کی لق و دق چراگاہیں ہیں یہاں لوگ بہت مویشی پالتے ہیں۔ موسم بدلنے کے بعد گھاس سوکھ جاتی ہے، پانی کے سوتے خشک ہونے لگتے ہیں تو گلے بان اور چرواہے اپنے ریوڑ لیے چارے کی تلاش میں جگہ جگہ گھومتے پھرتے ہیں۔ خشک موسم میں مختلف قبیلوں کے چرواہے اپنے مویشی لے کر گئے چنے پانی کے نالوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ان میں مڈبھیڑ اور جھڑپ بھی ہو جاتی ہے اور ایک گلے کو یا پھر دوسرے گلے کو پیچھے ہٹنا پڑتا ہے لیکن قدرت مہربان ہوتی ہے اور گھاس کی فراوانی ہوتی ہے تو امن و امان کا دور دورہ رہتا ہے۔ پہاڑ میں رہنے والوں کو جس طرح ڈھلان اور چوٹیاں عزیز ہیں اسی طرح میدان کے چرواہوں کو چراگاہوں سے انس ہے محبت ہے۔

پہاڑ میں رہنے والوں کو 'امہرا' اور تگرنس کہتے ہیں، ان کا مذہب عموماً عیسائی ہے۔ گورج قبیلے کے لوگ بھی رہتے ہیں ان میں کچھ عیسائی کچھ مسلمان اور کچھ پاگن (قدرت کی پرستش کرنے والے) ہیں۔ حراری، گالاز اور شمالی بھی ہیں یہ سب کے سب مسلمان ہیں جھیل تنا کے قریب فلاشا بھی رہتے ہیں جو یہودی ہیں۔ چراگاہوں میں رہنے والے افاما، بوگو حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی اولاد اور کچھ ایسے قبیلے ہیں جن کے کوئی خاص نام نہیں۔ ان کی زبانیں بھی بھانت بھانت کی ہیں۔ ان کی تاریخ میں ان کی روایات میں گوناگوں رنگ ہیں لیکن یہ سبھی ایتھوپین ہیں، ان کے آبا و اجداد برسہا برس سے یہیں رہتے چلے آئے ہیں۔ اس ماحول میں رچ بس گئے ہیں۔

شہر دل جیسے عدلیس ابابا، اکسوم اسمرا حرار، گونڈار، دیسی، میکلے میں مختلف قبیلوں کے لوگ مل جل کر امن چین سے رہتے ہیں انھوں نے کئی نئے پیشے اختیار کر لیے ہیں بعض سوداگر ہیں، کچھ چمڑے کے کاریگر، کچھ سنار، فنکار، کتب فروش اور کچھ لکڑی کا سامان فرنیچر بناتے ہیں شہر میں بڑے بازار لگتے ہیں یہاں کسان بیچنے کے لیے غلہ اور گرم مصالحہ لاتے ہیں، لوہار برچھے، چھری اور کلہاڑیاں لاتے ہیں۔

غرض یہاں بہت سے قبیلے آباد ہیں ان کی زبانیں بھی مختلف ہیں لیکن شام کو جب یہ اکٹھا ہوتے ہیں جلتی ہوئی آگ کے اردگرد بیٹھتے ہیں تو کہانیاں جو وہ سناتے ہیں وہ کم و بیش ایک جیسی ہوتی ہیں شاید پرانے زمانے میں ایسا نہ تھا۔

اب حالات بدل چکے ہیں، امہرا قبیلے کے گاؤں میں جو کہانیاں سننے کو ملیں گی وہی کہانیاں گالاز اور گورج بلکہ ایتھوپیا کی سرحد کے پار رشیلکس اور رونکا کے علاقوں میں بھی سننے کو ملیں گی۔

دراصل یہ کہانیاں خلط ملط ہوتی رہی ہیں۔ گلے بان صدیوں سے ادھر سے اُدھر آتے جاتے رہے ہیں اونٹ کے کارواں (قافلے) بھی گزرتے رہے ہیں۔ تاجروں کی بھی کثرت سے آمد و رفت رہی ہے اور وہ پہاڑوں سے گزر کر زیور، چھریاں، برچھے اور دوسرا سامان بیچنے کے لیے پھرتے ہیں اس طرح کہانیاں ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں پہنچتی رہی ہیں۔

کہانیوں کی ابتدا کیسے ہوئی اس کا تو پتہ نہیں کچھ تو شاید ہندوستان اور عرب سے یہاں پہنچی ہوں گی، کچھ سوڈان اور کانگو سے لیکن ایسا بھی ہوا ہے کہ بہت سی کہانیوں کی ابتدا یہیں ایتھوپیا

کی سرزمین سے ہوئی ہے۔ ایتھوپیا کے پہاڑوں اور بٹھاروں میں جو گاؤں بسے ہیں ان کی جھونپڑیوں اور گھاس کے بنے ٹوکل میں ہوشیار اور عقلمند لوگ بھی رہتے ہیں۔ کہانیاں مرتب کرنا، سننا اور سنانا وہ بھی جانتے ہیں۔

کہانیوں کے کردار الگ الگ ہیں۔ بسا اوقات ہیرو اور اس کا مدمقابل انسان کے روپ میں دکھائی دیتا ہے کبھی وہ جانوروں کا روپ اختیار کرلیتا ہے پھر یہ کردار انتہائی ذہانت اور ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہیں اور بعض حالات میں ان میں سے کچھ بدھو اور بے ڈھب دکھائی دیتے ہیں۔

بہرحال یہ کہانیاں انسان کی کمزوریوں اور ان کی خامیوں کی عکاسی کرتی ہیں یا سچ اور جھوٹ کا پردہ فاش کرتی ہیں۔ کئی کہانیاں لکڑبگھے، ہاتھی، شیر اور چیتے کے متعلق ہیں جو مضبوط قسم کے جانور ہیں اور گاؤں کے قرب و جوار میں آزادی کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں۔ چھوٹے جانور بھی کہانیوں میں نمایاں ہیں جیسے خرگوش، بندر اور گیدڑ جو شاطر اور ہوشیار ہیں اور موقع شناس، مصلحت آمیز اور حاضر جواب اس بلا کے کہ محض چالاکی سے اپنے آپ کو خطرناک جانوروں سے بچائے رکھتے ہیں۔

تو لیجئے آپ بھی ان کہانیوں کا مزہ چکھئے کہانیاں جو ایتھوپیا کے سبھی باشندوں کو پسند ہیں۔ ایک کہانی گورج کے علاقے کے ایک ملازم کی ہے جس نے داد و فریاد کے ذریعہ زمین کا قطعہ جیتا۔ ٹوٹا نام کے نخنی (کمزور) سے بندر کی بھی ایک کہانی ہے جس نے چیتے اور گیدڑ دونوں کو بے وقوف بنایا۔ ایک سفید چوہے کی بھی کہانی ہے جسے ایک لائق دلہن ملی اسی طرح اور بہت سی کہانیاں ہیں۔ انھیں پڑھ کر دیکھئے کیسا مزہ آتا ہے:-

اچھا تو آیئے اس وقت آگ اور پانی سچ اور جھوٹ کی مزیدار کہانی سنئے۔ چھوٹی سی ہے مگر دلچسپ ہے۔

آگ اور پانی، سچ اور جھوٹ:-

سچ اور جھوٹ، آگ اور پانی شوا[1] (SHOA) کے علاقے میں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ چاروں دوست ایک دن ساتھ ساتھ شکار کھیلنے نکل گئے قسمت نے ساتھ دیا۔ بہت سا شکار ملا اور بے شمار مویشی بھی، چاروں دوستوں نے آپس میں طے کیا کہ شکار اور مویشی برابر برابر تقسیم کرلیں۔

جھوٹ موقع کی تلاش میں تھا اور وہ شکار کے زیادہ حصے پر ہاتھ مارنا چاہتا تھا اس لیے وہ چھپ کر پانی کے پاس گیا اور اس سے کہا۔

"تم بڑے طاقتور ہو پانی بھائی۔ تم میں اور بھی ہزار خوبیاں ہیں۔ آگ کو بجھانا تمھارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پھر دیر کس بات کی۔ آگے بڑھو اور آگ بجھا دو۔ اس طرح ہم اس کے حصے پر قبضہ کرلیں گے۔"

پانی جھوٹ کے بہکانے میں آ گیا۔ دیکھتے دیکھتے آگ پر چڑھ دوڑا اور منٹوں میں اسے بجھا کر ٹھنڈا کر دیا

---

[1] شوا (SHOA) ایتھوپیا کے چودہ صوبوں میں سے ایک صوبہ ہے جو وسطی علاقے میں واقع ہے۔ امہرا قبیلے کے لوگ زیادہ تر شوا میں رہتے ہیں اور امہرا قبیلہ ہی ان دنوں ایتھوپیا میں حکومت کرتا ہے اگرچہ دوسرے قبیلوں کا تعاون بھی حاصل ہے

اس کے بعد جھوٹ نے دوسری ترکیب سوچی اب وہ سچ کے پاس گیا اس سے کہا!۔

"آگ ٹھنڈی پڑ چکی ہے۔ پانی نے اسے بجھا دیا۔ پر اس نے کچھ اچھی حرکت نہیں کی ایسا لگتا ہے کہ اس کی نیت صاف نہیں ہے۔ چلو ہم لوگ سارا شکار اور مویشی لے کر پہاڑ کے اوپر بھاگ چلیں۔"

سچ بھی جھوٹ کے بہکائے میں آگیا اور دونوں شکار اور مویشی کو لے کر پہاڑ کی طرف بھاگے۔ پانی نے جو دیکھا کہ یہ دونوں بھاگے جا رہے ہیں۔ تو اس نے ان کا پیچھا کرنے کی کوشش کی لیکن پہاڑ کی کچھ بلندی تک چڑھ جانے کے بعد نیچے بہہ آیا۔ ظاہر ہے بے چارا کیا کر سکتا تھا۔ دونوں دوست صاف بچ کر نکل گئے۔ وہ ان کا منہ دیکھتا رہ گیا اور کچھ نہ کر سکا۔

غرض دونوں دوست پہاڑ کی بلندی پر چڑھ گئے اور اطمینان سے ایک جگہ بیٹھ گئے تو جھوٹ نے سچ سے کہا — !

"تم بدھو ہو۔ دیکھتے نہیں میں کتنا مضبوط ہوں اور تم کتنے نحیف (کمزور) اور لاغر (دبلے)۔ اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ تم مجھے اپنا آقا تسلیم کرو۔ تمہاری حیثیت نوکر کی ہوگی۔ نوکر کو شکار اور مویشی سے کیا سروکار۔ لہٰذا یہ سارا مال میرا ہے۔"

"نہیں" سچ نے جواب دیا "میں ہرگز تمہارا غلام نہیں ہوں بلکہ طاقت کا جہاں تک تعلق ہے میں تم سے کہیں طاقتور ہوں اس لیے تمہارا دعویٰ سراسر غلط ہے۔ آج سے تم میرے غلام ہو اور میں تمہارا آقا۔"

میں غصے کے مارے سچ کا چہرا سرخ ہو گیا۔ وہ غصے سے اٹھا اور جھوٹ سے بھڑ گیا۔ دونوں میں کافی دیر تک ہاتھا پائی ہوتی رہی۔ دونوں تھک کر چور ہو گئے اور کوئی بھی ایک دوسرے کو چت نہ کر سکا۔

آخر طے پایا کہ دونوں ہوا کے پاس چلیں اور اس سے کہیں کہ ہمارا جھگڑا آ چکا دے، اور یہ بتا دے کہ ہم دونوں میں سے اصلیت پر کون ہے۔

دونوں نے باری باری اپنا مقدمہ پیش کیا۔

ساری باتیں سننے کے بعد ہوا نے کہا۔

"بھئی دیکھو! میرا فیصلہ یہ ہے کہ سچ کو جھوٹ کے خلاف مسلسل جدوجہد کرنی ہے۔ جیت سچ کی ہوگی لیکن جھوٹ خاموش بیٹھنے والا نہیں۔ وہ پھر خم ٹھوک کر میدان میں آئے گا اور سچ کو لڑنا پڑے گا۔ اس لیے جب تک دنیا قائم ہے سچ کو جھوٹ کے خلاف لڑتے رہنا پڑے گا۔ اگر اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو خیریت نہیں اور جھوٹ غالب آجائے گا جو ہرگز ہرگز مناسب نہیں۔"

(بقیہ بچوں سے باتیں)

ہمارے عزیز دوست اور پرانے ساتھی محمد امین کا بڑا بچہ پرویز امین زیمبیا میں حادثے کا شکار ہوگیا اِنّا لِلّٰہِ واِنّا اِلَیہِ راجِعُون۔ امین صاحب آجکل چھٹیوں آئے ہوئے ہیں۔ جامعہ نگر میں مقیم ہیں۔ حادثے کی اچانک تار کے ذریعے ملی۔ پھر معلوم ہوا کہ عزیز موصو زخموں کی تاب نہ لاکر اللہ کو پیارا ہوا

ماں باپ کے دل پر اس اچانک حادثے بہت اثر ہے۔ ادارہ پیام تعلیم ان کے غم میں شریک ہے۔

دو بنّو

عبدالمتین نیاز

ایک تھا منّا ایک تھی منّی
ایک جیون تھے دو ہمجولی
گاڑھی چھنتی تھی دونوں میں
کھوئے رہتے تھے کھیلوں میں
دونوں کے تھے دو ہی کھلونے
جیسے رادھا شام سلونے
منّے کا گڈا تھا بھواری
منّی کی تھی گڑیا پیاری
دونوں نے اک دن یہ سوچا
بیاہ کریں گڈی گڈے کا
دونوں نے تاریخ نکالی
شبھ دن نکلا ڈولی آئی
دھوم مچی شادی کی گھر گھر
جاگ اٹھا خوشیوں کا ساگر

منّے نے بارات اٹھائی
منّی نے بھی رخصت گائی
عین وقت پر منّا منّی
لڑنے لگے بن کے سمبندھی
منّی نے گڑیا کو چھپایا
منّے نے گڈے کو اٹھایا
دونوں اپنے گھر کو بھاگے
ٹوٹ گئے رشتوں کے دھاگے

بچّوں تم یہ بات نہ کرنا
ہمجولی سے گھات نہ کرنا
دوست بنو تو پیار نبھانا
ہوگا تمھارا سارا زمانا

مصنف: یے۔ پمریاک
ترجمہ: خلیق انجم اشرقی

پچوگن کا پُل

(روسی کہانی)

اسکول جانے والے بچے راستہ چلتے طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ مثلاً وہ کیا کام کرنا چاہتے ہیں یا کیا بننا چاہتے ہیں ایک کہتا "جلتی آگ میں سے کسی بچے کو نکال لانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہے نا؟" دوسرا کہتا "بھائی بہت بڑی مچھلی پکڑنا بھی بڑی بات ہے۔ لوگوں میں نام ہو جاتا ہے"۔ اتنے میں تیسرا بول پڑا "چھوڑو یار سب سے بڑا کام تو چاند پر سب سے پہلے اترنا ہے۔ راتوں رات دنیا میں نام ہو جاتا ہے"۔ یہ کہ وہ آسمان کی طرف یوں تکنے لگتا گویا اس نے بڑے ہو کر چاند پر اترنے کا پکا ارادہ کر لیا ہو۔ اسی طرح باتیں کرتے ہوئے بچے اسکول پہنچ جاتے لیکن پچوگن زیادہ تر چپ ہی رہتا۔

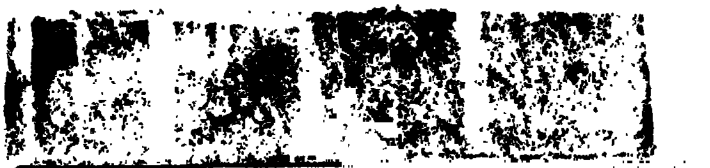
اسکول کے راستے میں ایک چھوٹی سی ندی پڑتی تھی۔ یہ ندی تھی تو چھوٹی سی لیکن اس کے کنارے بڑے ڈھلوان تھے اسے بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے پار کرنا پڑتا تھا گذشتہ سال ہی ایک بچے کا پیر پھسل گیا تھا اور وہ بیچ دھارے میں گر کر زخمی ہو گیا تھا۔ بے چارے کو کئی دن اسپتال میں گزارنے پڑے۔ جاڑوں میں سردی سے اس کی برف جم گئی تھی ـــــ دو لڑکیاں اس پر جا رہی تھیں یکا یک پرت ٹوٹ گئی اور بے چاری لڑکیاں ڈوبتے ڈوبتے بچیں۔ یہی وجہ تھی کہ اب بچے ندی پار کرتے ڈرتے تھے۔

بچوں کو ندی پار کرنا منع تھا لیکن ندی کا راستہ سیدھا تھا پھر بھلا کون چکر کاٹ کر لمبے راستے سے اسکول جاتا۔

ایک دن پچوگن نے سوچا "کیوں نہ کنارے والے پرانے پیڑ کو کاٹ کر ندی کے آر پار لٹا دیا جائے۔ یہ کم سے کم "کام چلاؤ پل" کا کام تو دے گا ہی!" بس یہ سوچ کر وہ اپنی کلہاڑی لے آیا اور لگا پیڑ کو کاٹنے لیکن یہ کام اتنا آسان تو نہیں تھا جتنا کہ پچوگن نے سوچا تھا۔ درخت کا تنا خاصا موٹا تھا۔ کاٹتے کاٹتے دو دن لگ گئے۔ آخر پیڑ کٹ کر ندی پر گر پڑا لیکن ابھی اس کی شاخوں کا کاٹنا چھانٹنا باقی تھا۔ اور یہ بھی شاخوں کے کٹ جانے کے بعد تو اس پر سے گزرنا اور بھی مشکل ہو گیا۔ پار کرتے وقت پکڑنے کے لیے اب کوئی سہارا ہی نہیں رہ گیا تھا خاص کر سردیوں میں برف جم جانے پر تو پھسلن بھی ہو جاتی تھی۔

باقی صفحہ ۹۰ پر

مناظر عاشق ہرگانوی



کوڑا کنرن اور ویٹرا کنرن

(تامل لوک کہانی)

تامل ناڈو (مدراس) کے ایک خوبصورت گاؤں کا نام "پلاڈو" تھا۔ اس کے چاروں طرف گھنا جنگل اونچے، اونچے پہاڑ تھے۔ گاؤں میں بہت سے باغ باغیچے تھے لیکن اس ہرے بھرے گاؤں میں دھان کی کھیتی نہیں ہوتی تھی۔ جدھر نظر جاتی کٹھل کے درخت دکھائی دیتے تھے تامل زبان میں کٹھل کو 'پلا' اور جنگل کو 'کاڈو' کہتے ہیں۔ اسی لیے گاؤں کا نام 'پلاکاڈو' پڑ گیا تھا

پلاکاڈو میں 'کوڑا کنرن' نام کا ایک سیٹھ رہتا تھا۔ کوڑا کنرن کا مطلب ہے وہ آدمی جو کسی کو کچھ نہ دے۔ گاؤں والے اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن اسے اور اس کی بیوی کو کسی کی پرواہ نہیں تھی۔

پلاکاڈو کے پڑوس کے ایک دوسرے گاؤں میں کوڑا کنرن کا چھوٹا بھائی "ویٹرا کنرن" رہتا تھا۔ ویٹرا کنرن کا مطلب ہے جو زبردستی دوسرے کا مال نکال لے۔

ایک دن شام کو ویٹرا کنرن، کوڑا کنرن کے گھر پہنچا۔ ویٹرا کنرن ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ رات ہوگئی تو ویٹرا کنرن نے کہا "اب میں گھر کیسے جاؤں! اکیلے جانا مناسب نہیں ہے۔ صبح سویرے اٹھ کر چلا جاؤں گا۔"

کوڑا کنرن کو فکر لاحق ہوگئی۔ چھوٹا بھائی رات کو ٹھہر گیا تو اس کو کھانا کھلانا پڑے گا۔ وہ گھر کے اندر گیا اور دھیمے لہجے میں اپنی بیوی سے کہنے لگا "دیکھو! چھوٹا بھائی رات کو یہیں ٹھہرنا چاہتا ہے۔ کوئی ایسی ترکیب کرو کہ اسے کھانا کھلائے بغیر ہی یہاں سے چلتا کر دیں۔"

کوڑا کنرن کی بیوی کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی "ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے۔ اپنے بھائی سے باتیں ختم کر کے وہاں سے اٹھ کر، تم اندر آتے ہوئے کہنا۔ "ہم دونوں کے لیے کھانا نکالو۔ ہم ابھی کھانے کے لیے آتے ہیں۔ میں کہوں گی۔ گھر میں تو ایک دانا بھی نہیں ہے۔ میں کیا کروں۔" تم غصہ ہو کر کہنا۔ گھر میں مہمان آتے ہیں اور تم کہتی ہو کہ ایک دانا بھی نہیں ہے۔ پہلے جو چاول لایا تھا وہ کیا ہوئے۔ اتنا کہہ کر تم چھڑی کو زور زور سے دیوار پر اس طرح مارنا کہ ویٹرا کنرن سمجھے کہ تم مجھے مار رہے ہو۔ وہ شرمندہ ہو کر چپ چاپ گھر سے چلا جائے گا۔"

کوڑا کنرن کو یہ بات پسند آگئی اور وہ

باہر بھائی کے پاس آ بیٹھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر اندر گیا اور زور سے اپنی بیوی سے کہنے لگا "ہم دونوں کے لیے کھانا نکالو۔ ہم ابھی کھانے کے لیے آتے ہیں۔"

بیوی اندر سے بولی "گھر میں تو ایک دانا بھی نہیں ہے۔" کوڑا کنسٹن غصیلی آواز میں بولا "تجھے معلوم ہے کہ گھر میں مہمان آئے ہیں اور تو کہتی ہے کہ ایک دانا بھی نہیں ہے۔ میں پوچھوں جو چاول لایا تھا وہ کیا ہوئے؟" پھر وہ ایک موٹی چھڑی سے کر زور زور سے دیوار پر مارنے لگا۔

دیوار پر چھڑی برسانے کے بعد جب وہ باہر آیا تو ویڈا کنسٹن وہاں سے غائب تھا۔ کوڑا کنسٹن کو بہت اچنبھا ہوا۔ حیرت ظاہر کرنے لگا۔ اس کی بیوی بھی باہر نکل آئی۔ وہ بولی "شاید ہم دونوں کو جھگڑتے دیکھ کر ویڈا کنسٹن اپنے گھر چلا گیا۔"

بیوی بولی "جب تم دیوار پر چھڑی برسا رہے تھے تب میں اس طرح روتی تھی جیسے مجھ پر چھڑی پڑ رہی ہو۔ تمہارا چھوٹا بھائی ڈر کر بھاگ گیا۔"

باہر کا دروازہ بند کر کے دونوں اندر چلے گئے اور کوڑا کنسٹن کی بیوی کھانا نکالنے لگی۔ جب کھانا نکل گیا اور دونوں آمنے سامنے کھانے کے لیے بیٹھ گئے تو اسی وقت کواڑ کی اوٹ سے ویڈا کنسٹن نکلا اور بغیر ایک لفظ بولے ان دونوں کے برابر آ کر بیٹھ گیا۔

میاں بیوی کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ دونوں حیران پریشان اسے دیکھتے رہے۔ پھر کوڑا کنسٹن ویڈا کنسٹن سے کہنے لگا "بھائی! باہر جا کر کسی سے یہ بات نہ کہنا۔ ورنہ بڑی رسوائی ہوگی۔"

مگر ویڈا کنسٹن چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔

(بقایا ۸۵)

پچو گن نے سوچا کہ نہر میں چار پتلے پتلے کھمبے گاڑ دیے جائیں اور ان پر آر پار پیڑ کی ایک سیدھی سی شاخ فٹ کر دی جائے تو یہ مشکل دور ہو جائے گی۔ اس کے آبا جان نے بھی اس کام میں ان کی مدد کی۔ اب بڑی اچھی پلیا تیار ہو گئی۔ پار کرتے وقت پانی میں گرنے کا خطرہ بھی دور ہو گیا تھا۔ اب بچے تو بچے آس پاس کے سبھی لوگ اس پلیا پر سے ہو کر آنے جانے لگے۔ اگر کوئی دوسرے لمبے راستے سے ہو کر جاتا دکھائی دیتا تو لوگ پکار کر کہتے "ارے بھائی! اتنا لمبا چکر کاٹنے سے کیا فائدہ! سیدھے 'پچو کی پلیا' پر سے ہو کر نکل جاؤ۔" پچو گن کی پلیا کو لوگ پیار سے 'پچو کی پلیا' کہنے لگے تھے۔

کچھ عرصے بعد یہ پلیا گل گئی اور اس پر سے آنا جانا مشکل ہو گیا۔ گاؤں کے لوگوں نے مل جل کر لکڑی کا بہت عمدہ اور مضبوط پل بنا دیا لیکن نئے پل کا نام وہی پرانا رہا یعنی "پچو کی پلیا"۔

کچھ زمانہ اور گزر گیا۔ سرکار نے ندی پر پکی سڑک اور پختہ پل بنانے کا فیصلہ کیا۔ ندی پر پل بنانے کے لیے سب سے مناسب مقام وہی تھا جہاں 'پچو کی پلیا' بنی ہوئی تھی۔ اب اس کی جگہ لوہے اور کنکریٹ کا پکا اور مضبوط پل بن گیا۔ اس پل کا کوئی اور بھی نام رکھا جا سکتا تھا لیکن پرانا نام ہی چلتا رہا۔ نئے پل کو آج بھی "پچو گن کا پل" کہتے ہیں۔

پچو گن نے یہ کام سب کی بھلائی کے لیے کیا اور [illegible] کے ذریعے [illegible] کے لیے لوگوں کے دل [illegible]

اڑیا کہانی

مصنف: گردھر رائے

مترجم: خلیق انجم اشرفی

وید اور حکیم

کالی پور گاوں میں ایک حکیم جی رہتے تھے۔ ان کا نام پنڈت شیام سندر مشر تھا۔ آس پاس کے گاوں میں ان کی حکمت کی بڑی دھوم تھی۔ وہ اپنے کو دھنونتری کا اوتار کہتے تھے۔ حکیم جی کو اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا شوق زیادہ تھا اس لیے ان کی تعریف دوسروں کی زبانی کم لیکن خود ان کی زبانی خوب سننے کو ملتی تھی۔

ایک بار پاٹھ پور گاوں کے وید حکمت رائے حکیم جی کے گھر آئے۔ حکمت رائے بھی مشر جی کی طرح باتوں کے دھنی تھے۔ اس لیے نمسکار کے فوراً بعد ہی انھوں نے اپنی تعریف شروع کردی "حکیم صاحب، آپ ہی بتائیے۔ بھلا میرے سامنے کون وید ٹک سکتا ہے۔ بڑے بڑے ڈاکٹر اور سول سرجن میں نے دیکھے ہیں۔ اب کل ہی کی بات سنیے۔ ایک مریض میرے پاس آیا۔ ڈاکٹروں اور ویدوں اور دوسرے مریضوں کی بتائی دوائیاں کھاتے کھاتے بے دم ہو گیا تھا۔ ہزار روپے خرچ کر دیے لیکن اچھا نہیں ہوا۔

حکیم جی بول اٹھے "اچھا ویدجی! اسے بیماری کون سی تھی؟"

"پیٹ میں درد تھا" ویدجی نے جواب دیا "اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھتا تھا اور دھیرے دھیرے [illegible]

اس کی ناڑی دیکھی تو بات ٹھیک سے سمجھ میں آئی۔ اس کے پیٹ کے بائیں حصے میں دو زندہ کچھوے تھے۔ یہ کچھوے اس کے جسم کا خون پی جاتے تھے"

حکیم جی نے پوچھا "تو آپ نے اسے ٹھیک کیسے کیا؟"

سر کھجاتے ہوئے ویدجی بولے۔ "بس صرف دو گولیاں میں نے اسے کھانے کو دیں۔ گولیاں کھانے کے بعد اسے زور کا دست آیا اور اس کے بعد دونوں کچھوے نکل کر تڑپنے لگے۔ اس کے بعد میں نے ان دونوں کچھووں کو قریب کے تالاب میں چھوڑ دیا۔ اب بتایے صاحب ہے کوئی میرے جیسا وید اس دنیا میں؟"

باتوں میں حکیم جی ویدجی کے استاد تھے۔ دل کی بات دل میں رکھ کر اپنی لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور تھوک نگل کر بولے "میں نے ایسے کئی کارنامے اپنی زندگی میں انجام دیے ہیں ویدجی۔ ایک دن ایک مریض میرے پاس آیا۔ صاحب وہ کم بخت مرغی کا ثابت انڈا نگل گیا تھا جس سے اس کے پیٹ میں خوب درد ہوا۔ ہونا ہی تھا۔ سات آٹھ دن تک بے چارہ ڈاکٹروں اور حکیموں کے یہاں ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ لیکن جب جوں دوا کی

۹۴

جے سنگھ شندے
مترجم: سلام بن رزاق

تحفہ

(مرہٹی کہانی)

جے سنگھ شندے ـــ پیدائش ۱۹۳۲ء مرہٹی کے مشہور صحافی ہیں۔ انھوں نے بچّوں کے لیے بہت سی کہانیوں اور مضامین بھی لکھے ہیں، 'تحفہ' کہانی کا لڑکا انتہائی محنت اور تکلیف میں تعلیم حاصل کر رہا ہے اُس نے کونسا تحفہ دیا اور کیوں ؟ یہ آگے کہانی میں پڑھیئے۔ سلام بن رزاق

ایک عرصے بعد مجھے دوبارہ دلّی جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک دن گھومتا پھرتا، پُرانی دِلّی کی طرف جا نکلا چاندنی چوک اور اُس کی آس پاس کی بہت سی جگہوں سے میں واقف تھا۔ وہاں کے مندر، گلیاں اور دُکانیں سب دیکھی بھالی تھیں۔ مجھے کچھ چیزیں خریدنی تھیں۔ جنہیں میں پہلے ہی خرید چکا تھا۔ میری بڑی بیٹی ابھی انگریزی اسکول میں جانے لگی تھی۔ اُس سے میں نے انگریزی کی پہلی پرائمر لانے کا وعدہ کیا تھا۔ کتابوں کی ایک چھوٹی سی دکان سے میں نے کتاب خریدی اور گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

سڑک کے دونوں طرف فٹ پاتھ سے لگی ہوئی چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ لکڑی کے خالی ڈبوں پر خوانچے والے، پوری کچوری، چاٹ، کھجور، مٹھائی وغیرہ کے خوانچے لگائے بیٹھے تھے۔ بے چارے بہت سے غریب اُسی پر اپنا گزارہ کرتے تھے اُن کی غریبی دیکھ کر دل بھر آیا۔ فٹ پاتھ پر اُن خوانچے والوں کو دیکھتا دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہا تھا۔

ابھی دس پندرہ قدم چلا تھا کہ میری نظریں ایک ٹھیلا گاڑی پر رُک گئیں۔ ایک چار پہیّوں والی ٹھیلا گاڑی پر بہت سی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ گاڑی ایک درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ اور گاڑی کے پیچھے چھاؤں میں دس بارہ سال کا ایک تندرست لڑکا، لکڑی کے ڈبّے پر گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ اُس کی گود میں ایک میلی سی کتاب کھلی تھی۔ وہ بیچ بیچ میں اُس کتاب میں دیکھ دیکھ کر اپنے سامنے رکھی ہوئی تختی پر کچھ نقل بھی کر رہا تھا۔ لکھنے میں بری طرح کھویا ہوا تھا کھیلنے، کھانے اور ہنسنے ہنسانے کی عمر تھی اس کی مگر اس عمر میں اُس میں کتنی سمجھ آگئی تھی۔ اس کم عمری میں پیٹ کی خاطر دکانداری کی ذمہ داری اُس کے کاندھوں پر آ پڑی تھی۔ ساتھ ہی اُسے پڑھنے کا بھی کتنا شوق تھا۔ اُس کے اسی شوق اور سمجھداری نے میرے قدم جیسے باندھ لیے۔ میں ٹھٹھک

ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

جی میں آیا اس لڑکے سے کچھ باتیں کرنی چاہئیں۔ یہ سوچ کر میں آگے بڑھا اور اس کی گاڑی کے سامنے جا کر رک گیا۔ اس نے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"کیا چاہیے بابوجی؟" اور پھر فوراً کئی کھلونوں اور دوسری چیزوں کے نام گنا دیئے۔ "چار چار آنے" ہر چیز کے دام چار آنے" وہ بار بار دہرا رہا تھا۔

چھوٹی بے بی کے لیے ایک آدھ کھلونا لینے کے خیال سے میں نے ایک کتا اٹھایا۔ کتے کے گلے میں لال ریشمی فیتا بندھا تھا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے بہت سی ریزگاری میری مٹھی میں تھی میں نے اس میں سے پچیس پیسے کا ایک سکہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس کا دھیان میرے ہاتھ کی طرف نہیں ہے۔ اس کی نظریں میرے دوسرے ہاتھ میں دبی پرائمر بک پر جمی تھیں۔ "بابوجی!" اس نے کہا۔ "کیا وہ پرائمر بک میں دیکھ سکتا ہوں؟" میں نے کتاب اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں، لو دیکھو۔"

اس نے کتاب ہاتھ میں لے کر اس پر لکھا ہوا نام پڑھا اور پھر اس میلی کتاب کو کھولا جس میں دیکھ دیکھ کر وہ کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کتاب کا آدھا ورق پھٹا ہوا تھا میرے پاس سے لی ہوئی کتاب میں دیکھ دیکھ کر وہ اپنی نوٹ بک میں جلدی جلدی کچھ لکھنے لگا۔ یہ دیکھ کر میں نے پوچھا۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

اس نے بغیر گردن اٹھائے لکھتے لکھتے کہا۔ "میری کتاب کا یہ ورق پھٹا ہوا ہے۔ میں اسے نوٹ بک میں نقل کر رہا ہوں۔ ورنہ مجھے اس نصف ورق کے لئے نئی کتاب خریدنا پڑے گی۔ معاف کیجئے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ دوبارہ جلدی جلدی لکھنے لگا۔"

مجھے اس کی معصوم ڈھٹائی اور خود اعتمادی سے بات کرنے کا یہ انداز کافی پسند آیا۔ میں اس کی طرف پیار اور تعریفی نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔ میرے دل میں ایک خیال اور آیا اور میں نے اس سے کہا۔

"ٹھہرو! وہ کتاب مجھے دو۔" میں نے اسے درمیان ہی میں روک کر کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی۔ اور پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"اندرجیت سنگھ۔"

میں نے جیب سے قلم نکال کر کتاب کے پہلے کورے صفحے پر لکھ دیا۔ "اندرجیت سنگھ کو پُرخلوص تحفہ۔" اس کے نیچے میں نے اپنے دستخط کر دیئے۔ میری اس حرکت کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ "آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟"

میں نے وہ کتاب اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا "یہ کتاب تمہارے شوق کا انعام ہے۔"

"نہیں بابوجی! کسی سے مفت کوئی چیز لینا میری ماں کو پسند نہیں۔"

"میں تمہیں یہ کتاب مفت نہیں تحفے کے طور پر دے رہا ہوں کسی کے تحفے کو رد نہیں کرنا چاہیے۔"

میرے سمجھانے پر اس نے وہ کتاب ہاتھ میں لے لی اور خوش ہوتا ہوا بولا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

پھر اس نے کھلونے (کتے) کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

"یہ کتاب آپ کس کے لیے خرید رہے ہیں؟"
میں نے جواب دیا "میری ایک چھوٹی سی منی ہے۔ اُسی کے لیے۔"

"کیا یہ کتاب بھی اُسی کے لیے خریدی تھی؟"

"نہیں اپنی بڑی بچی کے لیے جو اُس سے دو سال بڑی ہے۔ اسے میرا ایک تحفہ دیجیے" اُس نے گاڑی سے ایک ٹین کا بلا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اُس پر منیا کی تیماش چندر بوس کی تصویر کھدی تھی (اس) نے پوچھا۔

"کیا آپ کی بے بی کو یہ کھلونا پسند آئے گا؟"

میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا "ہاں ہاں ضرور پسند آئے گا۔"

"آپ نے اُس کی کتاب مجھے دے دی، وہ آپ سے ناراض تو نہیں ہوگی؟"

"نہیں نہیں اُس کے لیے دوسری کتاب خرید لونگا تم کس جماعت میں پڑھتے ہو؟"

"ابھی ابھی انگریزی پڑھنا شروع کی ہے پہلی پہلی جماعت میں ہوں۔"

"تمھیں سبق یاد کرنے کے لیے کون کہتا ہے۔"

"کوئی نہیں، میں اکیلا ہوں۔ امی چاہتی ہیں کہ میں خوب پڑھ لکھ کر اپنے باپ کی طرح وکیل بنوں میرے باپ مر چکے ہیں۔" اُس کے لہجے میں اُداسی تھی۔

میں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جلدی سے کہا "پڑھو، پڑھو، خوب پڑھو، ایک دن تم ضرور بڑے آدمی بنو گے۔" اتنا کہہ کر میں اُس سے رخصت ہوا۔ چند قدم جانے کے بعد میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میری دی ہوئی کتاب اُس کے سامنے کھلی تھی۔ اور وہ اُسے پڑھنے میں محو تھا۔

بقیہ وید اور حکیم ص۹۱

کھاتا درد بڑھتا ہی جاتا۔ پھر کسی نے اسے میرا نام بتا دیا۔ اس نے زیادہ دیر نہ لگائی اور سویرے ہی میرے پاس پہنچا اور رو کر بولا "حکیم جی۔ مجھے بچا لیجئے۔" میں نے اس کی نبض دیکھی اور پوچھا "کیا تم نے مرغی کا انڈا کھایا تھا؟" اس نے جواب دیا۔ "آج سے سات دن پہلے مرغی کا انڈا نگل لیا تھا اس کے بعد سے یہ حال ہے۔"

میں نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا "حوصلہ رکھو بیٹا۔ میں جلد ہی تمہارا درد ٹھیک کر دوں گا۔ تقدیر اچھی تھی جو مرنے سے پہلے میرے پاس آ پہنچے" اس کے بعد میں نے اسے ایک پڑیا کھلائی اور کہا "جب تک تمہارا درد کم نہ ہو۔ یہاں سے مت جانا۔" کیا بتاؤں ویدجی۔ پڑیا نے پیٹ میں جاتے ہی اپنا کمال دکھانا شروع کر دیا۔ پانچ منٹ کے بعد اسے ایک دست ہوا۔ دوائی کی گرمی سے انڈا پیٹ کے اندر ہی پھوٹ گیا اور مرغی کا بچہ پھڑ پھڑاتا ہوا باہر نکل آیا بیچارے کے پیٹ کا درد منٹوں ہی میں غائب ہو گیا۔"

حکیم صاحب کی بات سُن کر بیچارے ویدجی کی عقل گم ہو گئی۔ انہوں نے سنجیدہ لہجہ میں حکیم صاحب سے بولے۔ "حکیم صاحب میری رائے میں۔ ہم دونوں سے بڑا کوئی نہیں۔ ویدک میں میں اور حکمت میں آپ؟"

حکیم صاحب نے فرمایا "اس میں کیا شک ہے" اور داڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

●●

سندھی لوک کہانی

مصنف : امدورات بھوانی

مترجم : خلیق انجم اشرفی



چوہے کا کرتا

ایک تھا چوہا۔ ٹرانٹ کمٹ بڑا شریر۔ ایک دن اسے راستے میں ایک کپڑے کا ٹکڑا ملا۔ چوہے نے ایسا خوبصورت اور چمکدار کپڑا کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ اس نے جھٹ کپڑا اٹھایا اور چلتا بنا۔ چلتے چلتے اس کے دماغ میں خیال آیا۔ کیوں نہ اس کپڑے کا ایک کرتا سلوایا جائے۔ سامنے ہی ایک درزی کی دکان تھی۔ چوہا درزی کے پاس پہنچا اور بولا۔ "بھائی درزی۔ میرا ایک کام کردو۔ جلدی سے اس کپڑے کا ایک کرتا میرے لیے سی دو۔ کرتا پہن کر میں راجا بن جاؤں گا۔"

درزی بھلا آدمی تھا۔ اس نے سوچا اس ننھے سے چوہے کا کرتا سینے میں دیر ہی کتنی لگے گی، کیوں نہ خواہش پوری کردی جائے۔ چند ہی منٹوں میں کرتا تیار ہوگیا اور درزی کا شکریہ ادا کرتا ہوا چوہا آگے چل دیا۔

کرتا پہن کر چوہا راجہ کے محل کے پاس پہنچا اور چلا چلا کر کہنے لگا۔ "سنو بھائیو۔ سنو بہنو۔ میرے جیسا خوبصورت کرتا راجہ کے پاس بھی نہیں ہے۔ ہاں ہاں راجہ کے پاس بھی نہیں ہے۔ ڈم۔ ڈم۔ ڈم۔"

کسی اور نے تو چوہے کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ ہاں راجہ کی نیند حرام ہوگئی۔ وہ سوچنے لگا، اتنا سا چوہا، اور اس کے پاس اتنا اچھا کرتا!" اس نے نوکروں کو حکم دیا "جاؤ اور اس بدمعاش چوہے کا کرتا چھین لاؤ۔" نوکر گئے اور چوہے کا کرتا چھین لائے۔

چوہے کو غصہ آگیا اور وہ زور زور سے چلا کر کہنے لگا "سنو بھائیو۔ سنو بہنو۔ میرے جیسا خوبصورت کرتا راجہ کے پاس کبھی نہیں ہے۔ راجہ کو جلن ہوئی۔ میرا کرتا چھین لیا۔ میرا کرتا چھین لیا۔ ڈم۔ ڈم۔ ڈم۔۔۔"

چوہا سارا دن راج محل کے چکر لگاتا اور گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتا رہا۔ راجہ کے تو جیسے کان پک گئے چوہے کی بکواس سن سن کر۔ اسے خاموش کرنے کے لیے راجہ نے تنگ آکر اس کا کرتا لوٹا دیا۔

کرتا پاکر چوہا خوش ہوگیا۔ لیکن شرارت سے باز نہ آیا۔ پہن کر بولا۔ "دیکھو۔ راجہ مجھ سے ڈر گیا۔ میرا کرتا لوٹا دیا۔ راجہ مجھ سے ڈر گیا۔ ڈم۔ ڈم۔ ڈم۔۔۔۔" اور اس طرح شور مچاتا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

مناظر عاشق ہرگانوی

آئینے والا بندر

(اینڈ بلائٹن کی ایک کہانی کا ترجمہ)

(ننھے پیامیوں کے لیے)

ایک چڑیا گھر کے ایک پنجڑے میں چھ بندر رہتے تھے سبھی بھورے رنگ کے تھے لمبی دم والے تھے۔ ان میں سے پانچ تو بہت ہی اچھے تھے۔ آپس میں مل جل کر رہتے تھے اور مل کر کھاتے پیتے تھے۔

مگر چھٹا بندر بڑا نٹ کھٹ تھا ان پانچوں سے طاقتور بھی تھا۔ سبھی اس سے ڈرتے تھے۔ اس کا نام بولا تھا۔

بولا بہت لالچی بھی تھا۔ چڑیا گھر میں آنے والے سیلانی کیلا، سنترہ اور کھیرا پنجڑے میں پھینکتے تو بولا کسی کو کچھ نہ دیتا اور سب خود ہڑپ کر جاتا۔ اور جب کچھ کھانے کو نہ ملتا تو دوسرے بندروں کے پیچھے پنجڑے میں بھاگتا اور ان کے بال نوچتا سبھی بولا سے ڈرتے تھے۔ بولا اپنے ساتھیوں کی دم پکڑ کر اینٹھتا وہ تکلیف سے چلاتے تو وہ خوب دانت نکالتا۔

ایک دن ان کے منتظم نے بولا کو سدھارنے کی ایک ترکیب نکالی۔ جب سبھی بندر سو رہے تھے تو اس نے موٹے شیشے کا ایک بڑا سا آئینہ ان کے پنجڑے میں رکھ دیا۔

صبح ایک بندر اٹھا اور آئینہ کے سامنے گیا۔ وہاں دوسرے بندر کو دیکھ کر بڑا حیران ہوا ایسا بندر تو ان کے پنجڑے میں نہ تھا۔ یہ بات اس نے دوسرے بندروں کو بھی جگا کر بتائی۔

بولا سو رہا تھا۔ اسے کسی نے نہیں جگایا۔ سبھی باری باری سے آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھ کر یہی سوچا کہ یہ کوئی دوسرا بندر ہے۔

سب سے چھوٹا بندر بولا۔ "بولا اس نئے بندر کو دیکھ کر بہت ناراض ہوگا۔ وہ تو پہلے ہی کہتا ہے کہ اس پنجڑے میں بہت بھیڑ ہے۔"

"وہ اس بندر سے خوب لڑے جھگڑے گا" دوسرے بندر نے کہا۔

"شاید یہ بندر بولا سے طاقتور ہو اور اسے ہرا دے۔" چوتھے بندر نے کہا۔

"چلو، بولا کو جگا کر بتائیں گے کہ ایک نیا تگڑا بندر اس سے لڑنے آیا ہے۔ بھئی واہ!

جب یہ لڑیں گے تو کتنا مزہ آئے گا۔" تیسرے بندر نے کہا
سبھی بولا کے پاس گئے اور اسے جگانے لگے
"کیا بات ہے؟" وہ ناراض ہو کر بولا۔
"بولا! ایک نیا بندر ہمارے پنجرے میں آیا ہے وہ تم سے بھی طاقتور ہے خوب بڑا ہے۔ وہ لڑائی میں تمہیں ہرا دے گا اور یہاں راجا بن کر رہے گا تمہاری کھانے کی چیزیں چھینے گا اور تمہاری دم بھی کھینچے گا۔" پانچویں بندر نے کہا۔

وہ غصے سے منہ بناتا ہوا آئینہ کے پاس گیا۔ اس نے اپنی شکل آئینہ میں دیکھی۔ اس نے سمجھا کہ وہ کوئی دوسرا بندر ہے۔

"بدصورت! موٹے! کتنی چھوٹی آنکھیں ہیں تمہاری! اپنا گندا منہ تو دیکھو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے نہیں تو میں تمہاری ناک کاٹ لوں گا۔" وہ غصے سے آئینہ میں اپنے آپ سے بولا۔

آئینہ میں اسے اپنا چہرہ غصے سے دانت پیستا ہوا نظر آیا۔ اس نے مٹھی کسی تو دوسرے بندر نے بھی ایسا ہی کیا۔ بولا نے طیش میں آکر آئینہ والے بندر کو ایک گھونسہ مارا اور اچھل کر اس بندر پر کودا۔ بولا کو درد کا احساس ہوا۔ اس نے سمجھا دوسرے بندر کا بدن بہت سخت ہے۔ آئینہ پر مارنے سے بولا کے ہاتھ اور سر پر سخت چوٹ آئی۔ وہ درد کی وجہ سے اور ڈر کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا "میں اس بندر کو نہیں مار سکتا!" اس شرم سے وہ غمگین ہو گیا۔

تبھی پانچوں بندروں نے آئینہ کے سامنے اس بندر کو شاباش دینے لگے۔ پانچوں اپنی شکل دیکھ کر حیران ہوئے کہ اب پانچ بندر کہاں سے آ گئے
"یہ کیسا بندر ہے؟ پانچ شکلیں اختیار کر لی۔"
تبھی تو اس نے بولا کو ہرا دیا۔" سبھی بندر خوشی سے چلائے۔ اس کے بعد بولا اس آئینہ والے بندر کے پاس کبھی نہیں گیا۔ اس دن سے وہ ساری شیطانی بھول گیا۔ اب وہ کسی کو تنگ نہیں کرتا اور آئینہ کا راز تو بس چڑیا گھر کے منتظم کو ہی معلوم تھا۔

جناب اقبال امروہوی

ادھنی کا راجہ

(مہاتما بدھ کے زمانے کی ایک لوک کہانی)

بہت پرانی بات ہے ایک شہر میں ایک راجہ راج کرتا تھا۔ اس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اپنی پرجا ہی کو اپنی اولاد سمجھتا پرجا بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ جس شہر میں وہ رہتا تھا وہ اونچی اونچی دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ شہر میں داخل ہونے کے لیے ایک بڑا دروازہ مشرق میں تھا دوسرا مغرب میں شہر کے بیچوں بیچ بادشاہ کا محل تھا۔

مغربی دروازے کے قریب ایک سقہ بھشتی رہتا تھا وہ ایک سرائے میں پانی بھرنے پر ملازم تھا اس زمانے میں ہر چیز بہت سستی تھی ایک ایک پائی اہمیت رکھتی تھی۔ اس سقے کو سرائے سے کھانا مل جاتا تھا اور پہننے کو کپڑا بس یہی اس کی تنخواہ تھی کبھی کبھی انعام میں کوئی اسے ایک دو پائیاں دے دیتا تو وہ بہت خوش ہوتا تھا۔

غرض اس طرح وہ اپنی زندگی گزار رہا تھا اس کی شادی ایک سقے کی لڑکی سے ہوئی تھی وہ بھی ایک بڑے گھر میں پانی بھرنے پر ملازم تھی۔ اور شہر کے مشرقی دروازے پر رہتی تھی۔

دونوں کو اتنی تنخواہ تو ملتی نہیں تھی کہ ایک جگہ رہتے اس لیے سقہ مغربی دروازے پر رہتا اور اس کی بیوی مشرقی دروازے پر دونوں دروازوں میں بہت فاصلہ تھا جانے آنے میں ۶ گھنٹے لگتے تھے اس لیے سقہ کبھی کبھار ہی مشرقی دروازے پر جاتا تھا۔

ایک دن سقہ چھٹی لے کر اپنی بیوی سے ملنے صبح سویرے مغربی دروازے سے چلا۔ سورج نکلتے نکلتے وہ مشرقی دروازے پر پہونچ گیا اسے دیکھ کر اس کی بیوی بہت خوش ہوئی بیوی نے سقے سے کہا کہ آج بہت بڑا تیہوار ہے آج ہم گھر رہ کر تیہوار منائیں گے۔

سقہ تیہوار کا نام سن کر دکھی ہو گیا۔ اس نے کہا "ہمارے پاس نئے کپڑے نہیں ہیں پیسے نہیں ہیں تیہوار کیسے منائیں۔

اس کی بیوی نے کہا اس میں دکھی ہونے کی کیا بات ہے میرے پاس ایک ادھنی ہے یہ میں نے بہت دنوں میں جمع کی ہے ہم اس ادھنی کو خرچ کر دیں۔

ادھنی کا نام سن کر سقے کو بھی یاد آیا اس نے "ایک ادھنی تو میرے پاس بھی ہے میں نے دروا...

کے پاس دیوار میں چھپا کر رکھی ہے میں اس کو لے آتا ہوں س طرح ہمارے پاس ایک آنہ ہو جائے گا ہم اس یں کھیر پکائیں گے اور کچھ پھول خریدیں گے اس طرح ج کا تہوار منائیں گے۔" بیوی یہ سن کر خوش ہو گئی سقے ے کہا کہ تم اپنی ادھنی میں سے کھیر کا سامان لے آؤ۔ میں مغربی دروازے جا کر اپنی ادھنی لے آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ جھومتا جھامتا اور تہوار کی خوشی میں گاتا غربی دروازے کی طرف چل دیا۔

گرمی کا موسم تھا دھوپ بہت تیز ہو گئی تھی سقہ ننگے ؤں ننگے سر اپنی خوشی میں مست گنگناتا ہوا مغربی روازے کی طرف جا رہا تھا۔ محل کے قریب سے گزر رہا ھا تو اس پر راجہ کی نظر پڑی۔

راجہ کو یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ یہ شخص ننگے سر ننگے ؤں اس سخت دھوپ اور گرمی میں گنگناتا جا رہا ہے۔ خر ایسی کونسی بات ہے جس نے اسے اتنا خوش کیا ہے اجہ نے فوراً اپنے ملازم کو بھیج کر سقے کو اوپر بلایا۔

سقے کو یہ سن کر بہت تعجب ہوا کہ اسے راجہ نے بلایا ہے ساتھ ہی اسے یہ بھی فکر بھی تھی کہ شام سے پہلے اسے غربی دروازے واپس جانا ہے۔

راجہ نے سقے سے پوچھا کہ "تم اس گرمی اور دھوپ یں کہاں جا رہے ہو۔"

سقہ نے کہا "آج تہوار ہے نا! میں نے ایک ادھنی مغربی دروازے کے قریب چھپا کر رکھی ہے وہ لینے جا رہا ہوں میں اور میری بیوی آج تہوار منائیں گے وہ مشرقی دروازے پر میرا انتظار کر رہی ہوگی۔"

راجہ یہ سن کر دل ہی دل میں ہنسا۔ اس نے سقے سے کہا:۔

"دوپہر تو اب ہو رہی ہے تم کب مغربی دروازے پر پہنچو گے اور کب اپنی ادھنی لے کر واپس مشرقی دروازے پر جاؤ گے۔ جب تک تو شام بھی ہو جائے گی تم ایسا کرو ادھنی میرے پاس سے لے جاؤ اور جا کر تہوار منا لو۔"

سقہ یہ سن کر بہت خوش ہوا اس نے کہا "مہاراج تو دے دیجئے ادھنی۔"

راجہ نے ایک وزیر کو بلا کر ایک ادھنی سقہ کو دینے کا حکم دیا۔

سقہ ادھنی لے کر چلنے لگا اس نے آہستہ سے کہا اب تو ڈیڑھ آنہ ہو گیا۔ ایک ادھنی یہ ہے ایک ادھنی میری مغربی دروازے کے پاس ہے اور ایک ادھنی میری بیوی کے پاس ہے۔"

راجہ نے یہ بات سن لی اور سقے سے کہا تم اپنی ادھنی کو پھر لے لینا اب تم واپس چلے جاؤ میں تمہیں ۴ آنے دے دیتا ہوں۔

چار آنے کی بات سن کر سقہ اور بھی خوش ہوا اور کہنے لگا "جلدی سے دے دیجئے ۴ آنے پھر میں اپنی ادھنی لے کر چلا جاؤں گا تو پانچ آنے ہو جائیں گے۔"

راجہ یہ سن کر مسکرایا اس نے سوچا کہ اسے کیا لالچ دینا چاہیئے کہ یہ اپنی ادھنی کو بھول جائے راجہ نے کہا۔ "اچھا تم ایک روپیہ لے لو اور جا کر تہوار مناؤ۔"

اب تو بھلا میاں سقے کی خوشی کا کیا ٹھکانا بولے "اچھا آپ ایک روپیہ دے دیجئے اور میں اپنی ادھنی بھی لے آتا ہوں اس طرح ایک روپیہ ایک آنہ ہو جائے گا ہم آج اچھا اچھا کھانا پکا کر تہوار منائیں گے۔"

راجہ سقے کی باتوں سے دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا

ں نے سوچا ان غریب لوگوں کے لیے ایک ایک پائی
تی اہمیت رکھتی ہے۔

راجہ نے پھر سقّے سے کہا "تم میرے پاس سے
ں روپے لے جاؤ اور ابھی مشرقی دروازے پر واپس
اکر تہوار کی تیاری کرو۔"

سقّے نے یہ سن کر راجہ کے آگے ہاتھ جوڑے اور
ہا، "مہاراج بہت مہربانی ہوگی اس طرح تو ہم دونوں
ے اچھے اچھے کپڑے بن جائیں گے اور مٹھائی بھی آئے گی
س روپے ایک آنے میں تو ہم بہت خوشی سے اپنا تہوار
نا سکتے ہیں۔"

اب راجہ بہت حیران ہوا۔ اس نے سقّے کو سو روپے
ِانچ سو روپے ہزار روپے دس ہزار روپے اور یہاں
ے کہ ایک لاکھ روپے کا لالچ دیا لیکن سقّہ ہر مرتبہ
پنی ادھنی کا ذکر کر دیتا۔ وہ بہت بے چین تھا آسمان
ی طرف سورج کو دیکھ کر وقت کا اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ
ب تک مغربی دروازے جا کر واپس مشرقی دروازے
ہنچ سکتا ہے آخر راجہ تنگ آ گیا اس نے کہا "اچھا میں
میں اپنا آدھا راج دیتا ہوں تم اپنی بیوی کو بلا کر اس
ں میں تہوار مناؤ اور آدھے شہر پر حکومت کرو۔"

اب تو سقّہ بہت حیران ہوا۔ اچانک راجہ بن جانے
ی اسے بالکل خوشی نہ تھی اسے تو محنت سے جمع کی ہوئی اپنی
ادھنی کی فکر تھی بادشاہ نے فوراً اپنے وزیروں کو بلا کر
حکم دیا کہ اس شہر کا آدھا حصّہ اس سقّے کے نام کر دو اور
ج سے آدھے شہر کا یہ راجہ ہوگیا۔

سقّے نے راجہ سے کہا کہ مہاراجہ ان سے کہہ دیجئے
ہ شہر کا مغربی حصّہ میرے نام لکھ دیں کیونکہ میری ادھنی
مغربی دروازے کے قریب دیوار میں چھپی ہوئی ہے۔

راجہ یہ سن کر بہت ہنسا اور اس نے حقیقت میں
آدھا شہر اس سقّے کے نام لکھ دیا اور اس طرح سقّہ "ادھنی
کا راجہ" کے نام سے مشہور ہوا۔

(بقایا صفحہ ۱)

ی ہمّت نہ تھی۔ واقعی وہ کسی کام کے لائق نہیں اسی
لیے اُسے اپنے سے چھوٹے بیرو کے سامنے جھوٹ
بولنا پڑا۔ یہ سوچ کر اس کا دل بھر آیا اور وہ پھر رونے
لگی۔

"یہ دیکھ کر بیرو بولا "ارے بوا۔ تم رو رہی ہو؟
تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ کہ سوتالی اپنے ماں باپ
کے پاس جا کر خوشیاں منا رہی ہوگی۔ کھیل کود رہی
ہوگی۔ آؤ، اب ہم دونوں بھی اپنے ننھے پلّوں
کے ساتھ کھیلیں۔" یہ کہہ کر وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک
طرف کھینچنے لگا۔ ••

(بقیہ "کچھ نہیں" صفحہ ۱۱)

پردیسی نے اپنی ہتھیلی دیکھی۔ وہ بالکل خالی
تھی۔ "کیا ہے اس میں؟" مولوی صاحب نے اپنا
سوال دہرایا۔

"پردیسی کے منہ سے جھٹ نکلا "کچھ نہیں"

"یہ وہی 'کچھ نہیں' ہے جو تمہیں لینا تھا۔ بس اب
چلتے بنو" مولوی نے کہا اور وہ پردیسی خاموشی
سے سر جھکائے رخصت ہوگیا ••

چینی کہانی :

مصنف :- کوچی لان

مترجم : خلیق انجم اشرفی

سب نے اچھے کام کیے

آ۔ لان کی عمر دس سال ہے۔ وہ چوتھی جماعت میں پڑھتی ہے۔ آ۔ چنگ کی عمر نو سال ہے اور وہ تیسری جماعت پاس کر چکا ہے۔ آ۔ فن ابھی صرف چھ برس کی ہے اور ابھی سال پہلی جماعت میں داخل ہوئی ہے۔

روز کی طرح آج بھی آ۔ لان ۔ آ چنگ اور آ فن اسکول سے لوٹے تو امّی نے دن کا سبق پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ انھیں ایک ایک لفظ کر کے سمجھانے لگیں۔ انھوں نے آ۔ فن کو بھی ایک لفظ بتا کر یاد کرنے کو کہا۔

یہ روز کا معمول تھا۔ جس ہفتے بچے دھیان سے اپنا سبق یاد کرتے ۔ امّی انھیں اتوار کو گھمانے لے جاتیں یا سنیما دکھاتیں۔ سبق یاد نہ کرتے تو تفریح تو بند رہتی کھیلنے کی اجازت تک نہ ملتی۔ اتوار کو بھی گھر میں بیٹھ کر سبق یاد کرنا پڑتا۔

پچھلے ہفتے تینوں نے دل لگا کر اپنے اپنے سبق یاد کیے تھے۔ لیکن اس اتوار کو امّی کو کوئی کام تھا وہ انھیں گھمانے کے لیے نہیں لے جا سکتی تھیں۔ لیکن بچے بھلا اپنا انعام کیسے بھول جاتے۔ آ۔ لان اور آ۔ چنگ سنیما دیکھنے کے لیے مچلنے لگے اور آ۔ فن باغ کی سیر کے لیے ضد کرنے لگی۔

امّی انھیں منع بھی نہ کر سکتی تھیں۔ آخر انھیں ایک بات سوجھی تینوں کو ایک ایک روپیہ کھلونا خریدنے کے لیے دیا اور بولیں "دیکھیں سب سے اچھی چیز کون لاتا ہے!"

آ۔ لان ، آ۔ چنگ اور آ۔ فن نے خوشی خوشی روپے لیے اور اچھلتے کودتے بازار کی طرف چل دیے۔

گھر سے تھوڑی ہی دور بہت سے لوگ سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ تینوں اس بھیڑ میں گھس گئے۔ ایک بڑھیا دو کمزور سے بچوں کو لیے بھیک مانگ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "ان بچوں کا باپ مر گیا ہے۔ ماں بیمار پڑی ہے۔ یہ بچے کل سے بھوکے ہیں۔ کچھ دیتے جاؤ۔"

بڑھیا بھیک کے لیے گڑگڑا رہی تھی اور بچے بھوک سے بے تاب ہو کر رو رہے تھے۔ بھیڑ میں کھڑے سارے لوگ تماشا دیکھتے رہے کسی نے بڑھیا کو ایک پیسہ بھی نہ دیا۔ آ لان ۔ آ۔ چنگ اور آ۔ فن دیر تک وہیں کھڑے رہے لیکن بڑھیا کے سامنے پڑا کٹورا خالی کا خالی رہا۔

آ۔ لان نے آ چنگ اور آ فن سے کہا۔ "چلو ہمیں کھلونے بھی خریدنے ہیں۔"

آ۔ فن بولی "نہیں میں کھلونے نہیں خریدنا چاہتی۔ میرے پیسے اس بڑھیا اور اس کے بچوں کو دے دو۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا روپیہ آ لان سے لے کر بڑھیا کے خالی کٹورے میں ڈال دیا۔

آ۔ لان کو غصہ آ گیا زور سے بولی: "دیکھو گھر جا کر امّی

سے کہوں گی۔ تجھ پر خوب ڈانٹ پڑے گی۔

بہن کی دھمکی سن کر آ۔فن سہم گئی۔

آ۔لان نے کہانی کی کتاب خریدی اور آ۔چنگ نے ایک چھوٹی سی کار۔

تینوں گھر لوٹ آئے۔ امّی نے آ۔فن کے خالی ہاتھ دیکھ کر پوچھا "تم نے اپنے پیسوں کا کیا کیا؟"

آ۔فن تو ڈر کے مارے خاموش رہی لیکن آ۔لان جھٹ بول اٹھی۔ "امّی۔ امّی اس نے اپنے پیسے ایک بھکارن بڑھیا کو دے دیئے"۔

آ۔فن نے جواب دیا "امی۔ اس بڑھیا اور اس کے ساتھ کے بچّوں کی حالت بڑی خراب تھی۔ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ معافی مانگتے ہوئے بولی "امّی۔ لوگوں کے پاس کھانے کے لیے پیسے نہیں۔ تب کیا ہمیں کھلونے خریدنے چاہئیں؟ امّی اگر میں نے غلطی کی ہو تو اب نہ کروں گی امّی نے۔ آ۔فن کو گود میں اٹھا لیا اور بولیں "کوئی غلطی نہیں کی تم نے بہت اچھا کام کیا۔ غریبوں پر رحم کرنا تو بڑی اچھی بات ہے۔"

آ۔فن اپنی تعریف سن کر کھل اٹھی لیکن اس کے آنسو ابھی خشک نہ ہوئے تھے۔ آ۔لان اور آ۔چنگ جو چپ چاپ کھڑے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ آگے بڑھے اور بولے "امی۔ ہمیں دو روپے دے دیجئے لگے ہاتھ ہم نہیں مانگیں گے۔"

"کیوں۔ اب روپیوں کا کیا کرو گے؟" امی نے حیران ہو کر پوچھا۔

آ۔لان اور آ۔چنگ بولے "آ۔فن نے اپنا روپیہ بڑھیا کو دے دیا۔ ہم اپنے روپے قحط کے مارے لوگوں کے لیے بھیجیں گے"۔

امّی ان کی یہ بات سن کر خوش ہوگئیں اور ان کے پیسے قحط زدہ لوگوں کے امدادی فنڈ میں بھیج دیے گئے۔

وعدہ

صحیفہ خانم

جامن کے پیڑ کے نیچے، بھری دوپہری میں ایک ہنگامہ برپا تھا عرفان ساجد کی پیٹھ پر بیٹھا مُکّے برسا رہا تھا، اردگرد کھڑے ہوئے بچّے تالیاں بجا رہے تھے ان میں سب سے زیادہ خوشی کا اظہار خالد کی تالیوں سے ہو رہا تھا دھوپ میں اس کا گورا چہرا کچھ زیادہ سرخ ہو رہا تھا۔

ساجد نے بے بسی سے سب کی طرف دیکھا اور جیسے ہی خالد پر نظر پڑی ایکدم نہ جانے اس میں کہاں سے قوّت آگئی دیکھتے دیکھتے دیکھتے عرفان نیچے ہو گیا اور ساجد اس کی پیٹھ پر چڑھ بیٹھا۔

بچّے شاید اس بات کے لیے تیار نہ تھے ایک دم سے سناٹا سا چھا گیا ساجد نے مارنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھایا نہ جانے کیوں اس کا ہاتھ ایک دم نیچا ہو گیا اور وہ اپنی آستینوں سے پسینہ پونچھتے ہوئے ایک دم الگ کھڑا ہو گیا اور کہا عرفی تم میرے دوست ہو دوست پر ہاتھ اٹھانا بزدلی ہے مجھے میری آپا نے یہی بتایا ہے کہ کسی سے بدلہ نہ لیا کرو اور اپنے دوست سے تو کبھی بھی نہیں۔ عرفان خاموش کھڑا ساجد کو دیکھتا رہا۔

ساجد جیسے ہی گھر پہنچا اس کی آپا نے کہا کیا ہوا راجا تمہاری کیا حالت ہو رہی ہے ساجد ایک دم آپا سے لپٹ کر کہنے لگا آپا میں نے آپ کی بات یاد رکھی میں نے اسے معاف کر دیا بدلہ نہیں لیا حالانکہ خالد مجھے حقارت سے دیکھ رہا تھا۔ اب تو تم کبھی نہیں کہو گی کہ تم میری بات نہیں مانتے اب تو تم کبھی نہیں روؤ گی نا؟

آپا کی آنکھوں میں ایک دم چمک آگئی۔ اس نے ساجد کو لپٹا کر کہا۔ اب میں کبھی نہیں روؤں گی کبھی نہیں۔

جناب خواجہ معین الدین

نہ بولتا نہ مارا جاتا

ایک بادشاہ تھا۔ اس کی بہت بڑی سلطنت تھی۔ اللہ نے اسے ہر چیز دے رکھی تھی۔ جاں نثار سپاہی تھے۔ وفادار نوکر چاکر تھے۔ ایماندار وزیر اور عہدیدار تھے۔ خزانہ ہیرے جواہرات سے بھرپور۔ رعایا مال و دولت سے مالا مال اور خوشحال، اور وقت پڑے تو بادشاہ پہ جان دینے تیار۔ ملک میں ہر طرف امن ہی امن تھا۔

مگر بادشاہ کے پاس ایک چیز کی کمی تھی۔ وہ تھی اولاد۔ بے چارہ اولاد کو ترستا تھا۔ حکیموں، طبیبوں، ڈاکٹروں اور ویدوں سے دوائیں کھائیں۔ بزرگوں سے دعائیں کروائیں۔ درگاہوں کی زیارتیں ہوئیں۔ نذر نیاز ہوئی، منتیں مرادیں مانگی گئیں۔ تعویذ گنڈے اور وظیفے ہوئے۔ صدقے اور ٹوٹکے مارے گئے سب کچھ ہوا پر اولاد نہ ہوئی۔

بادشاہ بوڑھا ہونے آیا۔ مگر اللہ میاں کی ذات سے مایوس نہ ہوا۔ جو لوگ اللہ کی ذات سے آس لگائے رہتے ہیں۔ اور اس پر پورا پورا بھروسا رکھتے ہیں ضرور من کی مراد پاتے ہیں۔ دیر سویر ہمارے کہنے کی باتیں ہیں۔ لیکن ہر کام اپنے وقت پہ ہوتا ہے۔ اس میں ایک سیکنڈ کی دیر ہوتی ہے اور نہ جلدی۔ اس عمر میں بھی اسے اللہ نے ایک پھول سا بیٹا دے ہی دیا۔

اب کیا تھا، بیٹے کی خوشی میں بادشاہ نے اپنے خزانے کا منہ کھول دیا اور جی کھول کر اسے لٹا دیا۔ چالیس دن تک غریبوں، یتیموں اور بیواؤں میں خیرات بٹتی رہی، لنگڑوں لولوں معذوروں اور محتاجوں میں کھانا کپڑا تقسیم ہوا۔ ملک کے تمام قیدی رہا کر دیئے گئے۔ جلسے ہوئے جلوس نکالے گئے۔ شاہی جشن ہوئے۔ اور درباریوں کو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ رعایا نے اپنے گھروں میں گھی کے چراغ جلائے مختصر یہ کہ بادشاہ کی خوشی سب کی خوشی تھی۔

خوشی کی گھڑیاں جلد گزر جاتی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے شہزادہ بڑا ہو گیا۔ کافی لمبا چوڑا، گورا چٹا، خوبصورت توانا اور تنومند — مگر خدا کی قدرت خدا ہی جانے۔ اس کے بھی کھیل نیارے ہوتے ہیں۔ شہزادہ دس برس کا ہو گیا لیکن بات نہیں کرتا تھا۔ کھاتا پیتا تھا۔ کھیلتا کودتا تھا۔ ہنستا تھا مسکراتا تھا۔ زبان سے کبھی دادا نکلا اور نہ نانا۔ کبھی اس نے بابا کہا نہ امی، نہ ہوں نہ ہاں۔ جب دیکھو منہ لٹکا جیسے گونگے کا گڑ کھایا ہو یا زبان پہ گرہ لگی ہو۔ یا پھر منہ پر تالے پڑے ہوں۔

بادشاہ کی ساری خوشیاں پھر رنج میں بدل گئیں۔ دو برس کی عمر سے علاج معالجے ہوئے۔ دعائیں ہوئیں۔ نذر نیاز ہوئی۔ غرض وہ سب کچھ ہوا جو اولاد کے لیے بادشاہ نے پہلے کیا تھا مگر شہزادہ کی زبان نہ کھلنا تھی نہ کھلی۔ اب شہزادہ بارہ برس کا ہو گیا تھا۔

ایک دن بادشاہ اپنے محل میں وزیروں کے درمیان بیٹھا تھا اور ملک کے بارے میں صلاح و مشورہ کر رہا تھا۔ وزیروں نے محسوس کیا کہ بادشاہ کی اداسی بڑھتی جا رہی ہے۔ کوشش کے باوجود اس کی توجہ ملک کے کاموں سے ہٹتی ہی جا رہی ہے۔

یک وزیر نے عرض کیا "بادشاہ سلامت! آپ پر ہماری ن قربان، شہزادے کے بارے میں ایک اور کوشش کرنے اجازت دیجیے۔"

بادشاہ نے کہا "یعنی"؟ وزیر نے کہا "مجھے اجازت دیجیے شہزادے کو شہر سے باہر بہت دور جنگل میں سیر و تفریح کے یے لے جاؤں۔ ساتھ فوج کا ایک دستہ رہے گا، دو چار مہینے بس میں گزار کر دیکھیں گے۔ شائد شہزادے کا جی لگ جائے ور زبان کھل جائے۔"

سبھوں نے اس رائے کو پسند کیا اور بادشاہ سے .. زارش کی کہ اسے منظور کیا جائے۔ چنانچہ حکم ہوا، تیاریاں شروع ہوئیں، ایک دن شہزادہ فوج کے دستے کے ساتھ وزیر کی نگرانی میں شہر سے نکل کر جنگل کی طرف روانہ ہوا۔ دن میں سفر ہوتا اور رات میں آرام کے لیے ایسے مقام پر ڈیرے لگا.. دیئے جاتے۔ جہاں کوئی خطرہ نہ ہوتا۔ دو مہینے گذر گئے۔ شہزادہ اشاروں ہی میں دل کی بات کہتا لیکن زبان سے ایک لفظ نہ نکالتا۔ جیسے جیسے شہر سے دور ہوتے جا رہے تھے ویسے ویسے وزیر کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔

ایک دن کی بات ہے کہ چلتے چلتے شام ہو گئی اور قافلہ ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں ایک کھلا میدان تھا، اس کے بیچوں بیچ ایک اونچا اور ہرا بھرا درخت تھا جس کی ٹہنیاں خوب پھیلی ہوئی تھیں پہاڑ کا دامن تھا اور چاروں طرف گنجان جنگل۔ وزیر نے حکم دیا۔ کہ رات وہیں گزاری جائے اور شہزادے کا بستر اس گھنے درخت کے نیچے لگا دیا جائے، تمام سپاہی میدان میں ادھر ادھر پھیل جائیں اور وقفے وقفے سے ایک ایک سپاہی شہزادے کے پلنگ کے قریب ٹھہر کر پہرہ دے۔ شہزادہ پلنگ پر لیٹ گیا، اس کی نظر چو طرف گھوم رہی تھی۔

سورج ڈوبنے کو تھا۔ آسمان پر ایک طرف سے سرخی اور دوسری طرف سے سیاہی پھیل رہی تھی۔ درختوں پر پرندوں کا جمگھٹا تھا اور وہ اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ دور سے جنگلی جانوروں کی آوازیں وقفے وقفے سے سنائی دے رہی تھیں۔ شہزادہ کبھی آسمان کی طرف تو کبھی جنگل کی طرف نظر دوڑا رہا تھا۔

پہرہ دار نے دیکھا کہ شہزادہ کی نظر ایک طرف جم گئی ہے اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا ہے۔ ایسے میں ایک بڑا پرندہ اڑ کر آیا اور اسی ٹہنی پر بیٹھ کر "چیں چیں چیں چیں" کرنے لگا جس کے نیچے شہزادہ لیٹا گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

پرندے کی یہ گستاخی پہرہ دار سے دیکھی نہ گئی، اس نے اپنی بندوق اٹھائی اور "ٹھائیں" سے اس پر گولی چلا دی۔ گولی پرندے کے سینے میں لگی اور وہ پھڑ پھڑا کے شہزادے کی گود میں آ گرا۔

تب شہزادہ بستر سے اٹھا اور زخمی پرندے کو ہاتھ میں لے کر کہنے لگا: "کمبخت نہ بولتا نہ مارا جاتا"

یہ سنکر وزیر کی باچھیں کھل گئیں، اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ شہزادہ بولنے لگا ہے اور ساتھ ہی حیران بھی تھا کہ اس نے کیا پتے کی بات کہی ہے۔ شہزادے کے پاس جا کر عرض کیا شہزادہ سلامت! آپ نے ابھی جو بات کہی تھی۔ اسے ذرا.. دہرا تو دیجیے۔ شہزادے نے کہا: "زبان ہی ہے جو ہمیں مصیبت میں گرفتار کراتی ہے۔ اگر پرندہ ٹہنی پر خاموش بیٹھا رہتا۔ تو اس پر نہ گولی چلتی اور نہ وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔"

دوسرے دن وزیر شہزادے کو لے کر شہر کی طرف لوٹا۔ سپاہی راستے میں "شہزادہ زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ اور شہزادہ انہیں بار بار روکتا تھا۔

ہو گئی کہانی، کہانی پر پتھر
پڑھنے والوں کے سر پہ اللہ میاں کا چھتر

آسامی کہانی

لکشمی ناتھ بیجوروا
ترجمہ
خلیق انجم اشرفی





تیجی مالا

ایک سوداگر تھا۔ اس کی دو بیویاں تھیں۔ بڑی بیوی سے ایک لڑکی تھی اس کا نام تھا تیجی مالا۔ چھوٹی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی۔ تیجی مالا کی ماں کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ اس لیے سوتیلی ماں نے ہی اس کی پرورش کی تھی۔ اکلوتی لڑکی تھی اس لیے تیجی مالا کا لاڈ پیار کچھ زیادہ ہی ہوتا۔ سوداگر اسے بہت پیار کرتا تھا۔

تیجی مالا دس گیارہ سال کی ہوئی تو سوداگر نے اس کی دوستی گاؤں کے ایک شریف گھرانے کی لڑکی سے کرادی۔ سوداگر کو کاروبار کے سلسلے میں دور دراز کا سفر کرنا ہوتا۔ ایک بار نکل جانے پر چھ سات مہینے وہ باہر ہی رہتا۔ سفر پہ جاتے وقت سوداگر ہمیشہ بیوی سے کہہ کر جاتا "دیکھو میں تیجی مالا کو تمھارے پاس چھوڑے جا رہا ہوں۔ اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنا۔ تم جانتی ہی ہو کہ میں اس سے کتنا پیار کرتا ہوں۔" سوداگر کے چلے جانے کے بعد اس کی بیوی سوچا کرتی "اب میں تیجی مالا کے ساتھ جیسا برتاؤ چاہوں کر سکتی ہوں۔" لیکن اس نے تیجی مالا کے ساتھ برا برتاؤ کرنے یا اسے مارنے پیٹنے کے بجائے اسے ختم کر دینے کی ٹھانی۔ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔ سوتیلی ماں نے یہ اس لیے سوچا کہ اگر تیجی مالا بڑی ہو گئی تو اس کی شادی کرنی ہوگی اور اس میں ظاہر تھا کہ سوداگر دل کھول کر خرچ کرے گا۔ تیجی مالا کو ختم کر کے ہی یہ خرچ بچایا جا سکتا تھا۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی سوتیلی ماں اس چکر میں پڑ گئی کہ کب تیجی مالا کوئی غلطی کرے اور کب وہ اسے سزا دے۔

جلد ہی موقع بھی مل گیا۔ ایک رشتہ دار کی لڑکی کی شادی تھی۔ سوتیلی ماں نے سوچا کہ موقع اچھا ہے تیجی مالا کو شادی میں جانا تھا۔ سوتیلی ماں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ بیٹی کی شادی میں شرکت سے بہت خوش ہے اس کے لیے زری کا خوبصورت لباس تیار کرایا اور اس سے کہا "بیٹی۔ شادی کے دن یہی کپڑے پہننا۔ میں انھیں

کیے دیتی ہوں گھر سے تم سادے کپڑے پہن کر جاؤ۔
جاکر ہی بدلنا ورنہ راستے میں میلے ہو جائیں گے۔ یہ
ر اس نے سارے کپڑے ایک گٹھری میں باندھ دیے
گٹھری کے اندر ایک چوہا ڈال دیا اور دوسرے کونے
ایک جلتا ہوا کوئلہ بھی رکھ دیا۔

سہیلی کے گھر پہنچ کر تیجی مالا نے کپڑے بدلنے کے
ے گٹھری کھولی تو اس میں چوہا نکل کر بھاگا۔ کچھ کپڑے
ہے نے کتر ڈالے تھے۔ کچھ کپڑے جل گئے تھے ــــ
مالا بڑی پریشان اور افسردہ ہوئی۔ بہرحال کسی طرح
سے مانگ کر کام چلایا۔ گھر لوٹنے پر تیجی نے ساری
ت ماں کو بتادی کہ کس طرح گٹھری سے جلے اور کترے
ے کپڑے نکلے۔ سوتیلی ماں کو تو انتظار ہی اس بات کا
ما۔ وہ تیجی مالا پر برس پڑی اور اسے مارنے لگی۔ اتنا
ا کہ وہ گر پڑی۔ پھر اسے کھینچتی ہوئی چاول کوٹنے
ڈھینکی کے پاس لے گئی اور خود ڈھینکی چلانے لگی اور
سے حکم دیا کہ ہاتھ ڈال کر چاول کٹواے۔ ڈھینکی چلاتے
لاتے اس نے ڈھینکی اس طرح ماری کہ تیجی مالا کا داہنا
تھ زخمی ہو گیا۔

تیجی مالا سے درد برداشت نہیں ہو رہا تھا ــــ
وتیلی ماں نے اسی پر بس نہ کیا اسے جھاڑوؤں سے
ٹنا شروع کر دیا اور کہا " ایک تو کام کرنا نہیں آتا اوپر
سے روتی بھی ہے۔ چل داہنا ہاتھ گیا تو بائیں ہاتھ سے
کام کر۔"

وہ کراہتی ہوئی کام کرنے لگی تو اس کا بایاں ہاتھ بھی
سی طرح زخمی کر دیا۔ اسی طرح کرتے کرتے اس کے دونوں
پاؤں، اور آخر میں سر بھی کچل ڈالا اور تیجی مالا مر گئی ــــ
سوتیلی ماں نے قریب ہی ایک جگہ اسے دفن کر دیا۔

کچھ دن بعد اس جگہ جہاں تیجی مالا کو اس کی سوتیلی ماں نے دفن کیا تھا، لوکی کا ایک پودا اگ آیا اور اس میں لمبی لمبی لوکیاں لگنے لگیں۔ ایک دن ایک بھکارن سوداگر کی بیوی کے پاس آئی اور اس سے لوکی مانگنے لگی۔ اس کا سوال سن کر سوداگر کی بیوی کو بڑا تعجب ہوا، بولی "بڑھیا۔ تو کیسی بات کرتی ہے۔ ہمارے یہاں لوکی کہاں سے آئی؟" تب بھکارن نے بتایا ــــ "بی بی۔ تمہارے گھر میں چاول کوٹنے کی ڈھینکی کے پاس ہی لوکی کا پودا لگا ہے۔"

"اگر یہ سچ ہے تو جا کر لے لو" سوداگر کی بیوی بولی۔

اجازت پا کر بھکارن پودے کے پاس پہنچی لیکن جونہی اس نے پودے کو ہاتھ لگایا، اس میں سے آواز آئی "نہ تو ہاتھ بڑھاؤ، نہ لوکی توڑو۔ سوتیلی ماں نے کچل کر مجھے مار ڈالا! میں ہوں تیجی مالا" بھکارن یہ سن کر گھبرا گئی اور سوداگر کی بیوی کے پاس جا کر بولی "مجھے نہیں چاہیے لوکی۔ یہ لوکی کا پودا تو بولتا ہے۔ کہتا ہے کہ سوتیلی ماں نے کچل کر مجھے مار ڈالا، میں ہوں تیجی مالا" یہ کہہ کر بھکارن تو چلی گئی اور سوتیلی ماں نے لوکی کے پودے کو جڑ سمیت کاٹ کر اپنے باغ کے کنارے ڈال دیا۔

چند روز گزرے اور اس جگہ ایک نارنگی کا پیڑ نکل آیا اور اس میں خوب صورت پھل لگنے لگے۔ یہ دیکھ کر محلے کے بچے اکٹھا ہو گئے۔ ان لڑکوں نے سوداگر کی بیوی سے پوچھا "آپ کے پیڑ سے نارنگی توڑ لیں؟"

"ہمارے یہاں نارنگیاں کہاں؟ تمھیں دکھائی دیتی ہیں تو توڑ لو۔ میں منع نہیں کرتی" سوداگ

کی بیوی بولی۔

لڑکے نارنگی توڑنے پیڑ کی طرف بڑھے تو پیڑ میں سے آواز آئی "میرے گاؤں کے بھائیو۔ نہ تو ہاتھ بڑھاؤ، نہ پھل توڑو، اپنے اپنے گھر جاؤ۔ میں ہوں تیجی مالا، جسے سوتیلی ماں نے کچل کر مار ڈالا۔"

پیڑ کو بولتے سُن کر بچے خوف زدہ ہو گئے۔ بھاگے بھاگے سوداگر کی بیوی کے پاس پہنچے اور بولے "اس پیڑ پر کوئی بھوت رہتا ہے۔" یہ سُن کر سوداگر کی بیوی نے غصّے میں آکر اس پیڑ کو کٹوا کر ندی میں بہا دیا۔

بہتے بہتے پیڑ ندی میں ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں پانی کم تھا۔ وہاں کچھ کنول کھل گئے۔ چند روز بعد سوداگر اسی راستے سے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔ ندی میں کنول کے خوبصورت پھول دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور سوچنے لگا "کتنے خوبصورت کنول ہیں۔ میں انھیں اپنی بیٹی کے لیے لے جاؤں گا۔ وہ انھیں دیکھ کر کیسی خوش ہو گی۔" اسی وقت کنول کے پھولوں میں سے آواز آئی "پیارے پتاجی۔ نہ تو ہاتھ بڑھاؤ، نہ کنول توڑو۔ میں ہوں تیجی مالا جسے سوتیلی ماں نے مار ڈالا۔" یہ سُن کر سوداگر کے ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے۔ پھر بھی بات کو پکا کرنے کے لیے سوداگر نے منہ میں سے سپاری کا ٹکڑا جو وہ چبا رہا تھا، نکال کر اپنی بائیں ہتھیلی پر اور ایک لڈو دائیں ہتھیلی پر رکھا اور بولا "اگر تم واقعی میری پیاری تیجی مالا ہو تو مینا کے روپ میں آکر بائیں ہتھیلی پر رکھی سپاری کھا جاؤ اور اگر تم کوئی دوسری ہو تو لڈو کھا جاؤ۔" سوداگر کی بات سنتے ہی کنول نے مینا کا روپ بدلا اور آکر سوداگر کے ہاتھ پر بیٹھ کر سپاری کھانے لگی۔ اب سوداگر کو یقین ہو گیا کہ یہ اس کی بیٹی تیجی مالا ہی ہے۔ اس نے پنجرہ منگا کر اس میں اس مینا کو رکھا اور گھر کو روانہ ہوا۔ گھر پہنچ کر اس نے اپنی بیوی سے پہلا سوال یہی کیا کہ "تیجی مالا کہاں ہے؟" نئی بیوی نے جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ وہ تو اپنے چچا کے گھر گئی ہوئی ہے لیکن جب سوداگر نے زور دے کر پوچھا تو سچائی ظاہر ہی ہو گئی۔ سوداگر نے اپنا گمچھا (بڑا رومال جو عام طور پر دیہاتی استعمال کرتے ہیں) پنجرے پر ڈال دیا اور بولا "اگر تم میری تیجی مالا ہو اور مجھ سے پیار کرتی ہو تو پھر سے میری بیٹی بن جاؤ اور یہ گمچھا پہن کر ظاہر ہو جاؤ۔" یہ الفاظ ختم ہوتے ہی تیجی مالا گمچھا پہن کر ظاہر ہو گئی۔ سوداگر نے دوڑ کر بیٹی کو گلے لگا لیا۔ اور اپنی بدمعاش بیوی کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔

●●

بچوں کی مذہبی کتابیں

ارکانِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۰/۵۰
آں حضرتؐ	الیاس احمد مجیبی	-/۶۵
پاک کہانیاں (دو حصّوں میں)	مقبول احمد سیوہاروی	۲/۳۵
خلفاءِ اربعہ	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۲/۲۵
عقائدِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	-/۵۰
مسلمان بیبیاں	مولانا اعجاز الحق قدوسی	-/۷۵
نبیوں کے قصّے	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۱/۲۵
ہمارے رسول	،، ،، ،،	۱/۶۵
ہمارے نبیؐ	سیّد نواب علی رضوی	۲/۲۵
کتاب و سنّت کے جواہر پارے		۲/۲۵

بنگلا کہانی

مصنف : آرتی مکھو پادھیائے

مترجم : خلیق انجم اشرفی

پپو اور سونالی

پپو بڑی دیر سے اس جار کو تکے جا رہا تھا جس میں سونالی بڑے ہی پیارے اور عجیب ڈھنگ سے ایک بار اوپر اور ایک بار نیچے آ جا رہی تھی۔ کرسی پر بیٹھا، دونوں ہاتھ گالوں پر رکھے وہ بڑی محویت سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ بابا نے پچھلی سالگرہ کا تحفہ کیسا عمدہ دیا ہے۔

خود پپو کو ایک عرصہ سے آرزو تھی کہ وہ ایک مچھلی پالے۔ اور اسے شیشے کے جار میں بند کر کے اپنے پلنگ کے پاس رکھے۔ اس کی خواہش تھی کہ سمندر کی ایک حسین مخلوق کو دیکھے کہ وہ سارا دن کیسے مزے سے کھیلتے ہوئے گزارتی ہے۔ پاپا کو اس کی خواہش معلوم ہوئی تو انھوں نے اس کی پچھلی سالگرہ پر یہ سونالی لا کر اسے تحفے میں دی تھی۔

یہ مچھلی واقعتاً بڑی پیاری تھی۔ سونے جیسا رنگ چاندی جیسی چمک۔ جب ہو کر وہ پانی میں کھیلتی تو اس پر سے نظر نہ ہٹائے نہ ہٹتی۔ اس کے سنہرے رنگ کو دیکھ کر ہی پپو نے اس کا نام 'سونالی' رکھا تھا۔

صبح اٹھ کر اسے تکتے تکتے پپو بھول جاتا کہ اس کے اسکول کا وقت ہو گیا ہے۔ وہ تو ممی آ کر پیار سے اسے اٹھاتیں اور یاد دلاتیں وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ "ابھی تیار ہو کر آتا ہوں۔ ممی" یہ کہہ کر وہ بھاگ جاتا۔ سونالی پپو کو اتنی پیاری تھی کہ شام کو پارک سے گھوم کر آنے یا اسکول سے واپس یا باہر کھیلنے جانے سے پہلے وہ ایک نظر سونالی پر ضرور ڈالتا۔ وہ سوچتا "جانے سونالی اس وقت کیا کر رہی ہوگی؟ ذرا ایک نظر دیکھتا ہی چلوں!" پپو کو ساتھیوں کے ساتھ کھیلنے میں اتنا لطف نہ آتا جتنا سونالی کو گھنٹوں پانی میں کھیلتے دیکھ کر۔ تبھی تو بڑے بھیا اتیندر اس دن پوچھ رہے تھے "کیوں رے پپو! کیا تجھے سارا دن مچھلی کے پاس بیٹھا رہنا ہی اچھا لگتا ہے؟"

بڑے بھیا کی بات پپو کے دل کو لگی۔ لیکن وہ بڑے فخر بھرے لہجے میں بولا "ہاں بھیا! ہم کو اچھا لگتا ہے جانتے ہیں کیوں؟ سونالی کا کوئی دوست نہیں پھر وہ اپنے ماں باپ کے پاس بھی تو نہیں۔ بیچاری ماں سے کتنی تکلیف ہوتی ہوگی۔ ہمارے تو یہاں سب کوئی ہیں۔ اسی لیے اس کا ساتھ دے کر کوشش کرتا ہوں کہ وہ اپنا دکھ بھول جائے اور ہمیں اپنا بھائی سمجھے۔"

یہ کہتے کہتے سونالی کے دکھ سے پپو کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اتیندر بھیا تو یہ دیکھ کر ہو۔ ہو کر کے ہنس پڑے اور بولے "واہ میاں واہ۔ ایک چھوٹی سی مچھلی اور اس کے لیے اتنا لاڈ پیار!"

یہ سن کر پپو کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے اٹھ کر کمرے

سے نکل گیا اور سونالی کے پاس چلا آیا۔ دیکھا، سونالی جار کے ایک کونے میں پڑی ہے۔ یہ دیکھ کر اُسے بڑا دکھ ہوا۔ پپو کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ وہ کسی طرح سونالی کا دُکھ کم کرے۔ لیکن وہ آج تک کچھ کر نہ سکا تھا اسی لیے پپو کی بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے سونالی کو دیکھے جا رہا تھا۔

کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ سونالی بھی اپنی ننھی ننھی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی ہے اور اسے اپنا ساتھی سمجھ رہی ہے۔ یہ خیال پپو کو بڑا اچھا لگتا۔ اس وقت وہ سونالی سے اس طرح باتیں کرنے لگتا گویا اس کا ہم عمر ساتھی ہو۔ وہ کہتا "سونالی۔ میں پپو ہوں۔ تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔ میں جو ہوں! میں تمہارا دوست ہوں نا!"

پپو کو یوں محسوس ہوتا کہ سونالی یہ سن کر، جار کے چکر لگانا چھوڑ کر، پیار بھری نظروں سے اسے تک رہی ہے۔

اُس دن صبح اُٹھنے پر پپو کے ذہن میں ایک خیال آیا: کہ سونالی کے لیے ایک چھوٹا سا تالاب بنوا دے۔ اس طرح اسے جار کی قیدی بن کر نہیں رہنا پڑے گا اور تب شاید وہ خوش ہو کر اچھی طرح کھیل کود سکے۔ یہ سوچ کر اس نے باغیچے میں چار ہاتھ چوڑا ایک گڑھا کھدوا کر تالاب بنوا لیا۔ شام کو اسکول سے لوٹ کر اس نے سونالی کو اس میں چھوڑ دیا۔ سونالی کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ بے تکلیف وہ قید خانے سے نجات پاتے ہی وہ تو تالاب میں اچھلنے کودنے لگی۔ پپو بھی تالیاں بجا بجا کر سونالی کا جوش بڑھانے لگا۔ اور کبھی وہ اپنی سوجھ بوجھ کے لیے خود کو دل ہی دل میں شاباشی بھی دینے لگا۔

دونوں ساتھیوں کا یہ کھیل خوب جما لیکن اسی دن اچانک پپو کو پتا چلا کہ ممی کے ساتھ اسے اپنے ننیہال اچانک جانا ہے اور وہاں پورے دو دن رہنا ہوگا۔

پپو بڑی الجھن میں پھنس گیا۔ سونالی کو ساتھ لے جانا بھی مشکل تھا اور یہاں کس پر چھوڑے! آخر بہت سوچ بچار کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ سونالی کو اپنی چھوٹی بوا ٹونی کے پاس چھوڑ جائے گا۔

ٹونی بوا بھی سونالی کو بہت پیار کرتی تھی وہی اُسے حفاظت اور پیار سے رکھ سکتی تھی۔ چھوٹی بوا کو آواز دے کر پپو بولا "بوا۔ تم سونالی کی دیکھ بھال کرنا۔ میں تو ننیہال جا رہا ہوں۔ بیچ بیچ میں اسے تالاب میں چھوڑتی رہنا۔ اور ہاں دیکھو! کہیں ایسا نہ ہو کہ محلّے کا وہ بدمعاش بلّا اس کو مار ڈالے۔ تم سونالی کو پیار کرتی ہو یہ میں جانتا ہوں۔ اسی لیے تمہارے پاس چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

ٹونی کی خوشی کا کیا پوچھنا! مارے خوشی کے اس نے ناچنا شروع کر دیا۔ بولی۔ "پپو! تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔ میں سونالی کو بڑی حفاظت اور بڑی محبت سے رکھوں گی۔ لوٹنے پر تم خود ہی دیکھ لوگے کہ سونالی پہلے سے کتنی خوبصورت ہو گئی۔ تم سونالی کو بے فکر ہو کر میرے پاس چھوڑ جاؤ۔"

یہ کہتے کہتے اس نے اپنے گھنگرالے بالوں پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔

پپو کو اطمینان ہو گیا۔ بوا کے اوپر اُسے پورا بھروسا تھا۔ وہ سونالی کو بہت اچھی طرح رکھے گی یہ سوچ کر پپو خوش خوش ممی کے ساتھ ننیہال چلا گیا۔ راستے میں وہ سوچتا رہا کہ وہاں پہنچ کر اپنی ممیری بہن سے سونالی کی باتیں بتائے گا۔

پپو کے ننیہال چلے جانے کے بعد ٹونی بڑے جوش سے سونالی کی دیکھ بھال کرنے لگی۔ سونالی کو کوئی تکلیف نہ ہو یہ سوچ کر وہ زیادہ تر اس کے پاس ہی بیٹھی رہتی۔ بیچ بیچ میں وہ اسے تالاب میں بھی چھوڑ آتی تھی۔

اس دن بھی شام کو حسبِ معمول اس نے سونالی کو

لے جاکر تالاب میں چھوڑ دیا۔ سونالی بڑے مزے سے تیرنے لگی۔ ٹونی پاس بیٹھی اس کا کھیل دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت نہ جانے کہاں سے سبز رنگ کے دو ٹیما آکر سامنے کے درخت کی ایک شاخ پر بیٹھ گئے۔ پرندوں کے اس خوبصورت جوڑے کو دیکھتے وقت وہ چند لمحوں کے لیے سونالی کو بھول سی گئی۔ ادھر محلّے کا وہ شیطان بلّا جو کئی دن سے سونالی کی تاک میں تھا لیکن پپو کی ہوشیاری کے سبب اس کے نزدیک بھی نہ پھٹک پاتا تھا موقع غنیمت جان کر دبے پاؤں تالاب کے پاس آیا اور سونالی کو منہ میں دبا، یہ جا وہ جا!

اسی لمحہ ٹونی نے ادھر منہ گھمایا تو سن سے رہ گئی۔ سونالی بلّے کے منہ میں تھی۔

وہ بلّے کے پیچھے دوڑی۔ مارے ڈر کے بلّے نے سونالی کو وہیں زمین پر گرا دیا اور خود نو دو گیارہ ہو گیا۔ ٹونی جلدی سے سونالی کو اٹھانے دوڑی۔ لیکن اس وقت تک سونالی اپنے پپو اور ٹونی کو چھوڑ کر بہت دور جا چکی تھی۔ ٹونی کے ہاتھ میں اب محض اس کی سنہری لاش تھی۔

سونالی کو مردہ دیکھ کر ٹونی ایکدم چیخ پڑی۔ اب پپو آکر کیا کہے گا! پپو اسی بھروسے پر تو مچھلی اس کے پاس چھوڑ گیا تھا کہ وہ اس کی پوری پوری حفاظت کرے گی۔ اور ہوا کیا! یہ سوچتے سوچتے ٹونی کے بڑے بڑے نینوں سے نیسرا بہہ نکلی۔

پانک پاڑا سے آتے ہی دروازے کے پاس ہی سے پپو نے آواز لگائی "بوا۔ سونالی کیسی ہے؟"

لیکن کوئی جواب نہیں!

پپو دھک سے رہ گیا۔ وہ گھر کے اندر ادھر اُدھر بوا کو ڈھونڈنے لگا۔ آخر اس نے اسے پا ہی لیا۔ بوا باغیچے کے ایک کونے میں اکیلی کھڑی تھی دونوں آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ یہ دیکھ کر پپو گھبرا گیا۔ بولا "کیا ہوا بوا؟ کیا کسی نے تمھیں مارا ہے؟ تم رو کیوں رہی ہو؟ سونالی کہاں ہے؟"

"چند لمحوں کے بعد بھرائے ہوئے لہجہ میں ٹونی نے جواب دیا "پپو۔ سونالی ہمیں چھوڑ کر۔ بہت دور چلی گئی ہے"

"پپو نے گمبھیر لہجے میں پوچھا "کہاں؟"

"سورگ میں" ٹونی بولی

پپو بولا "کیوں؟"

ٹونی سر جھکا کر بولی "جانتے ہو وہ اپنے ماں باپ کے پاس سورگ چلی گئی ہے۔ تمھی بتاؤ، کتنے دنوں سے وہ ہمارے پاس تھی سونالی مجھ سے بولی ٹونی بہن۔ میں جا رہی ہوں۔ پپو کے رہتے میرا جانا مشکل تھا، اسے بڑا دکھ ہوتا۔ شاید روتا۔ تبھی میں اس کے پیچھے جا رہی ہوں۔ پپو اگر یہ بات سمجھ سکے تو سمجھا دینا۔"

یہ سن کر پپو کو بڑا دکھ ہوا۔ سونالی اسے کتنا چاہتی تھی اور اب وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ "ٹپ ٹپ" آنسو اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ اداس نظروں سے آسمان کی طرف تکتا ہوا وہ بولا "چلو اچھا ہی ہوا۔ سچ مچ وہ بڑی تکلیف میں تھی۔ اپنے ماں باپ کو نہیں دیکھ سکتی تھی میں تو اگر ایک دن بھی ممّی پاپا کو نہ دیکھوں تو مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے اور اس نے نہ جانے کتنے دنوں سے نہیں دیکھا تھا۔ ہے نہ بوا؟"

ٹونی نے سر ہلا کر اس کی تصدیق کی۔ لیکن دل ہی دل میں ٹونی کو اپنے جھوٹ پر بڑی شرمندگی اور دکھ محسوس ہو رہا تھا۔ سر اٹھا کر پپو سے نظریں

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

تیلگو کہانی

مصنفہ: ایم۔ نلنی موہن
مترجم: خلیق انجم اشرفی

کچھ نہیں

مولوی نصرالدین جس گاؤں میں رہتا تھا اس گاؤں میں ایک بوڑھا لکڑہارا بھی رہتا تھا۔ روزانہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا اور انھیں بیچ کر روکھی سوکھی کھاتا ایک دن جوش میں بوڑھے نے ڈھیر سی لکڑیاں کاٹ ڈالیں بڑا سا گٹھا بنایا اُسے اُٹھانا چاہا پر وہ تو اتنا بھاری تھا کہ اس سے اُٹھ نہ سکا۔ اب تو بوڑھا بڑا پریشان ہوا کہ کیا کرے وہ ابھی اِس سوچ بچار میں تھا کہ کسی طرف سے پڑوس کے گاؤں والا آنکلا۔ اسے دیکھ کر بوڑھے کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا "بھائی، ذرا اس گٹھے کو میرے سر پر تو رکھوا دو۔" بڑی مہربانی ہوگی" وہ اس سے بولا۔

"اٹھوائے دیتا ہوں لیکن تم اس کے بدلے مجھے کیا دوگے؟" اس آدمی نے کہا۔

اس آدمی کی ظاہری حالت سے بوڑھے نے اندازہ لگایا کہ اسے واقعی اس معمولی سے کام کے لیے کسی معاوضہ کی تمنّا نہیں، یونہی مذاق کر رہا ہے۔ یہ سوچ کر لکڑہارا بولا "ارے بھائی۔ میرے پاس کیا دھرا ہے تمھیں دینے کو! کچھ نہیں ہے"

یہ سُن کر اس آدمی نے خاموشی سے گٹھا بوڑھے کے سر پہ رکھوا دیا اور پھر بولا۔

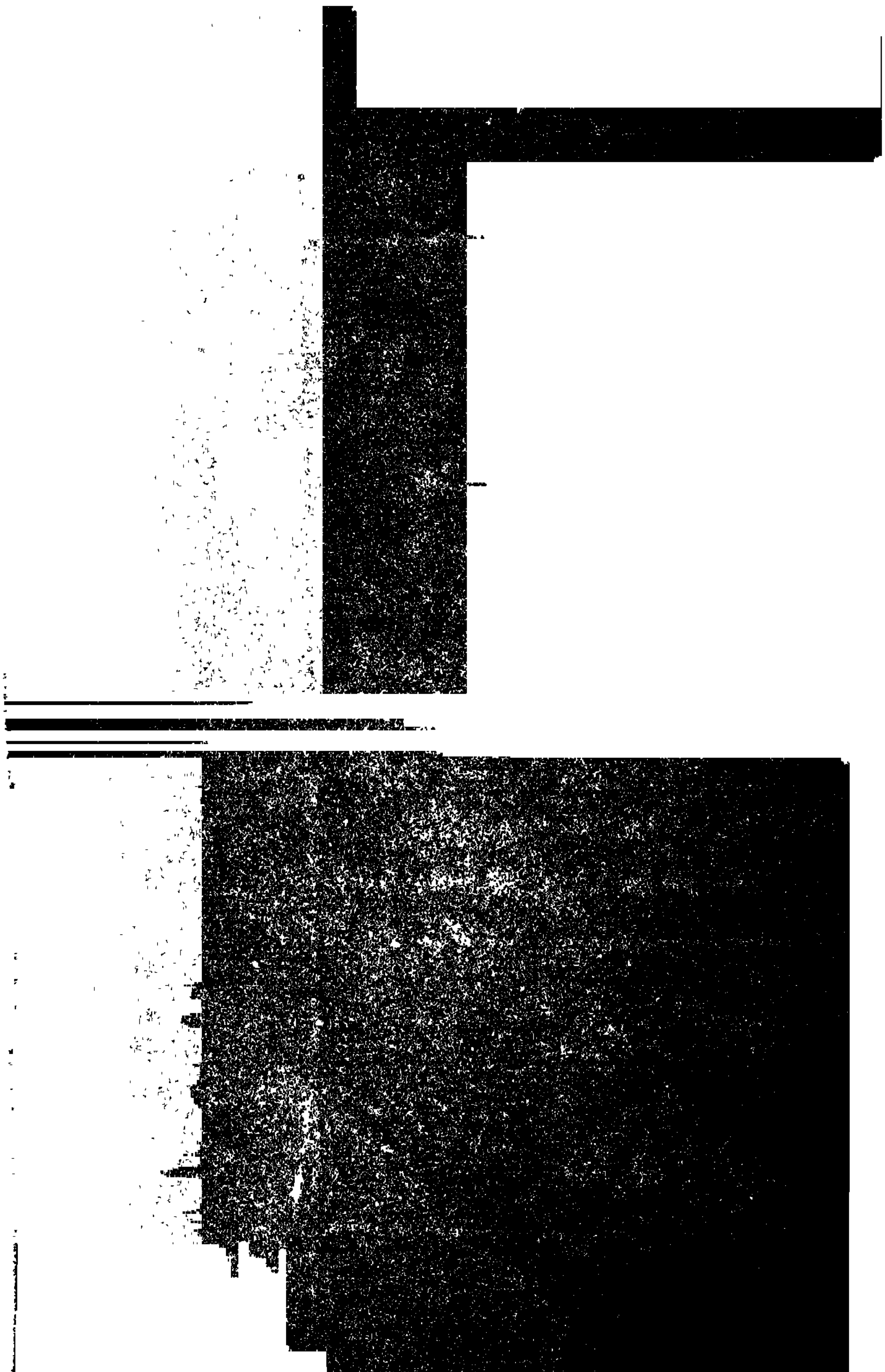
"لاؤ۔ تم نے مجھے دینے کا وعدہ کیا ہے نہ "کچھ نہیں"! تو لاؤ 'کچھ نہیں'، فوراً!" یہ سُن کر لکڑہارا لکڑہارا چکر میں پڑ گیا اور اُس آدمی کی منّت خوشامد کرنے لگا، بولا "مجھے چھوڑ دو بابا! میں پڑھا لکھا نہیں گنوار آدمی ہوں۔"

مگر وہ آدمی بھی ہٹ کا پکّا تھا۔ اس نے لکڑہارے کا پیچھا نہ چھوڑا اور برابر 'کچھ نہیں' کا مطالبہ کرتا رہا۔ بولا "میں نے پہلے پوچھا تھا کہ مجھے کیا دوگے! تم نے کہا 'کچھ نہیں'، تمھاری بات مان کر میں نے گٹھا اٹھایا تھا۔ اب 'کچھ نہیں' میرے حوالے کرو۔ پھر میں اپنا راستہ پکڑوں گا تم اپنا راستہ پکڑنا۔"

بوڑھے نے پھر بڑی عاجزی سے درخواست کی لیکن پڑوسی نے اس کی ایک نہ سُنی۔ آخر دونوں گاؤں کے قاضی کے پاس پہنچے۔ یہ انوکھا مقدمہ ایسا چکرانے والا تھا کہ قاضی جی بھی کوئی فیصلہ نہ کرسکے اور تب مولوی نصرالدین کو بلوایا گیا۔ مولوی نصرالدین نے دونوں کے بیان سُنے اور پردیسی سے بولے "تمھارا کہنا درست ہے۔ وعدہ کرنے کے بعد اسے نبھانا ہی چاہیے لیکن یہ تو بڑا غریب ہے بے چارا "کچھ نہیں" اس کے پاس کہاں ملے گا۔ اس کے بدلے اگر میں تمھیں 'کچھ نہیں' دے دوں تو؟"

پردیسی راضی ہوگیا۔ مولوی صاحب نے کہا۔
نکالو اپنی ہتھیلی۔ دیکھو اس میں کیا ہے؟"

باقی [illegible] پر



PAYAM-I-TA

NEW DELHI-25

پیامِ تعلیم

نئی دہلی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی

جلد ۹ شمارہ ۱۲

دسمبر ۱۹۷۲ء

ایڈیٹر

محمد حسین حسّان ندوی

صدر دفتر :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دلّی ۲۵
شاخ :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اُردو بازار دلّی ۶
شاخ :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳
شاخ :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ ۲

قیمت فی پرچہ

۶۰ پیسے

سالانہ چندہ چھ روپے

پرنٹر پبلشر سیّد احمد علی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دلّی ۲۵ سے شائع کیا

فہرست مضامین

بچّوں سے باتیں

کہانی نمبر آپ کو پسند آیا۔ آپ کے بزرگوں کو پسند آیا۔ بعض پیامیوں نے تو تعریفوں کے پل باندھ دیئے ہیں۔ یہ باتیں میں مہینے کے شروع میں کر رہا ہوں۔ مہینے کے ختم ہوتے ہوتے تو خطوں کا ڈھیر لگ جائے گا۔ پر ہم تو چاہتے ہیں کہ پیامی خالی تعریف ہی نہ کریں کچھ اچھے اچھے مشورے بھی دیں۔ اپنے پیامیوں کی رائے کو ہم نے ہمیشہ اہمیت دی ہے۔ اپنے بس بھر ان پر عمل کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

پیامیوں نے یوں تو سبھی کہانیاں بہت پسند کی ہیں خصوصاً محترمہ رضیہ سجاد ظہیر، محترم سہیل عظیم آبادی، محترم غلام ربانی، جناب ناظم میواتی کی کہانیوں کی لیکن دوسرے ملکوں کی کہانیاں اور اپنے ہی دیس کی دوسری زبانوں کی کہانیاں بھی بہت ہی اچھی لگی ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی کہانیوں کو جن میں سے کچھ تو بہت ہی ننھی منی ہیں۔ پیامیوں نے خاص طور سے پسند کیا ہے۔

شروع شروع میں تو ہماری اسکیم یہ تھی کہ کہانی نمبر کی ضخامت زیادہ سے زیادہ چھیانوے صفحوں کی ہو اور قیمت ڈیڑھ روپیہ ہو مگر کہانیاں اور کہانیوں کے بارے میں مضمون اتنے اچھے اچھے آگئے کہ اکٹھے سولہ صفحے اور بڑھانا پڑے۔ باوجود اس کے قیمت وہی ڈیڑھ روپے رکھی گئی ہے باوجود اس کے بہت سی کہانیاں اور ایک بہت اچھا مضمون (کہانی کار کی کہانی) پھر بھی شامل نہ ہو سکا۔ کاتب صاحب کی مہربانی سے کھوئی ہوئی کہانیاں ان کے علاوہ ہیں۔

ان میں سے اکثر کہانیاں کاتب صاحب کی لکھی ہوئی (کتابت شدہ) ہیں اور سب پیام تعلیم میں شائع ہوں گی۔ یہ سب ہم اس پرچے میں شائع کر دیتے پھر ہمارے مستقل مضمون بہت پیچھے پڑ جاتے۔ پھر بھی اس سلسلے کا ایک مضمون اور کئی کہانیاں اس پرچے میں شامل ہیں۔ دو منظوم کہانیاں ایک لڑکا اور چاول

نثر والی کہانیوں کے علاوہ اس سلسلے کی تین منظوم کہانیاں بھی ہیں وہ اس پرچے میں شامل ہیں۔

لنکا کے گاندھی اور مونگے کا جزیرہ دو مسلسل مضمون ہیں۔ نومبر میں ان کے لیے گنجایش نہ نکل سکی تھی۔ آپ کو اکتوبر کے پرچے سے ان کا سلسلہ ملانا ہوگا "مونگے کا جزیرہ" والی کہانی اچھی خاصی لمبی ہے بہت دلچسپ بھی ہے کئی نمبروں میں چلے گی۔

محترم رشید حسن خاں صاحب کے مضامین کئی مہینے سے پیام تعلیم میں شائع ہو رہے ہیں۔ کیا بچوں میں کیا بڑوں میں بہت پسند کیے جا رہے ہیں۔ اور بھئی یہ مضمون کچھ ایسے ہیں کہ ان کی کتابت بالکل صحیح ہو ہم نے تو صاحب کوشش بھی بہت کی۔ کاتب صاحب بھی بس بھر احتیاط بھی کرتے ہیں، پر کیا کریں بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔

اصل میں اردو لکھنے کے قاعدے اور اصول ابھی تک نہیں بنے ہیں۔ ہندوستان کی تقسیم سے پہلے انجمن ترقی اردو نے ادھر توجہ کی تھی کچھ قاعدے بنائے بھی تھے۔ لوگ ان کی پابندی بھی کرنے لگے تھے۔ مگر تقسیم کے بعد فضا ہی بدل گئی مضمون نگار اور کاتب اپنی اپنی سمجھ کے مطابق لکھتے تھے اب ادھر رشید حسن صاحب نے توجہ فرمائی ہے۔ ان کا خط ہم اس مقصد سے شائع کر رہے ہیں کہ کاتب حضرات اور زیادہ احتیاط کریں۔

خط کتابت اردو کورس جامعہ ملیہ کا ذکر اس سے پہلے بھی ان صفحوں میں آچکا ہے۔ اس ادارے کو قائم ہوئے ابھی دو برس بھی پورے نہیں ہوئے ہیں۔ اتنی کم مدت کو دیکھتے ہوئے اس کی ترقی کی رفتار اچنبھے میں ڈالنے والی ہے۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۷۲ء تک اس کے اراکین کی تعداد ۴۳۰۵ تک پہنچ گئی۔ ہندوستان تو ہندوستان باہر کے ملکوں میں بھی اس کی آواز پہنچ گئی ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی کہ اردو سیکھنے کا شوق لوگوں میں کس قدر زیادہ ہے نیچے کے اعداد و شمار سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ سوائے دو ایک کے ہندوستان کے سبھی صوبوں میں ایسے شوقین مل جائیں گے۔ جو اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔

دہلی ۱۱۰۰۔ اترپردیش ۷۹۰۔ راجستھان ۳۸۹ پنجاب ۳۷۳، مدھیہ پردیش ۳۴۲۔ مہاراشٹر ۲۸۸۔ ہریانہ ۲۴۷۔ بہار ۱۳۹۔ مغربی بنگال ۱۳۱۔ گجرات ۱۰۴۔ ہماچل پردیش ۵۸۔ میسور ۶۰۔ تامل ناڈو ۴۴۔ اے پی۔ او (ج خ) ۲۲۴۔ آندھرا پردیش ۹۴۔ جموں کشمیر ۳۳۔ کیرل ۳۶۔ آسام ۲۰۔ گوا ۱۷۔ اڑیسہ ۵۔ ناگالینڈ اینگمالیہ ۱۔ پانڈیچری ۲۔ اور دوسرے ملکوں میں نیپال ۱۔ بھوٹان ۲۔ جنوبی افریقہ ۲۔

ترقی کی یہ رفتار دیکھ کر سچ مچ جی خوش ہوتا ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ عبدالغفار مدھولی صاحب جو کام بھی اپنے ذمے لیتے ہیں پوری ذمے داری سے اسے انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں رات دن ایک کر دیتے ہیں۔ اپنی بیماری کا عمر کی زیادتی کا بھی خیال نہیں کرتے جیسے کام ہی ان کی زندگی ہے۔ ایسے دھن کے پکے اپنے کام سے ایسا شغف رکھنے والے ہم لوگوں میں کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔

ویسے اردو کا دم بھرنے والے اس کی حمایت کرنے والے اس کا مرثیہ پڑھنے والے اس کے غم میں لال لال آنسو بہانے والے بے شمار ہیں۔ لاتعداد ہیں۔ ان گنت ہیں۔ مگر اردو کو تو غفار مدھولی جیسے لگن سے کام کرنے والوں کی تلاش ہے۔ یہی لوگ اس کی کشتی کو پار لگائیں گے۔

ہماری خواہش ہے کہ آپ بھی محترم غفار مدھولی صاحب کے کام میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ اپنے اپنے صوبوں میں اردو سیکھنے کے شوقینوں کو اس ادارے کا پتہ بتائیں۔ اگر ہم آپ کام کی اور کام کرنے والوں کی قدر نہ کریں گے تو اور کون کرے گا، اور قدر دانی کا مطلب یہی ہے کہ ان کے کام کو آگے بڑھانے کے جتن کیے جائیں۔ اس ادارے کا پتہ یاد رکھیے خط کتابت اردو کورس جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

بلّی کی شادی





محمد شفیع الدین نیّر، جامع نگر، نئی دہلی

بلی کی اس شادی کا — حال سنو، منّے بھیّا
دولھا اور براتی تھے — دولھا کے سب ساتھی تھے
ڈھم ڈھم بجتی تھی ڈھولک — ڈھم ڈھم ڈھم ڈھمک ڈھمک
بلّے ڈھول بجاتے تھے — چوہے گانا گاتے تھے
دھم دھم گولے چھٹتے تھے — پھول ہوا میں لٹتے تھے
کیسا دھوم دھڑکّا تھا — کیسا دھکّم دھکّا تھا
دولھا ہاتھی پر چڑھ کر — آیا دلہن کے گھر پر
چاند سا مکھڑا دلہن کا — ماتھے پر اس کے ٹیکا
کھانا خوب مزے کا تھا — کیا بتلائیں کیا کیا تھا
پکوان اور مٹھائی تھی — برفی دودھ ملائی تھی!
قابوں میں تھا گوشت بھرا — سب نے وہ ڈٹ کر کھایا

آن نئی تھی شادی کی
شان نئی تھی شادی کی

کہانی کار کی کہانی

خلیق انجم اشرفی

مہینے کا دوسرا سنیچر تھا۔ میں ناشتہ کر کے آرام سے بستر پر لیٹا ایک دلچسپ کتاب پڑھ رہا تھا کہ اچانک رعنا کی آواز آئی "بھائی صاحب نو بج گئے۔ آج دفتر نہیں جائیے گا کیا؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا۔

"کیوں کیا آج چھٹی کا ارادہ ہے؟ کل تو چھٹی ہے ہی!"

"ارے بھئی۔ آج دوسرا سنیچر ہے" میں نے کہا

"آہا نبھی تو— پھر تو ٹھیک ہے کام بن گیا۔" اس نے سر ہلا کر کہا۔

"کیا کام بن گیا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"آپ سے کہانی سننے کے پروگرام پر آج ہی عمل ہو جائے گا۔"

"نہیں بھئی اس وقت تو میں بڑی مزے دار کتاب پڑھ رہا ہوں۔"

لیکن اتنی دیر میں حسین، کنی اور شائستہ جو باہر کھڑے تھے گھس آئے اور ایک آواز ہو کر رعنا کی حمایت کرنے لگے۔ ان کی اس نرالی ضد کے آگے مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ "بھئی دیوؤں، جنوں اور بھوتوں اور پریوں کی کہانی تو تم لوگ روز ہی سنتے اور پڑھتے ہو۔ آج میں تمھیں ایک کہانی کار کی کہانی سناتا ہوں۔ الیسپ (AESOP) کی بہت سی کہانیاں تم لوگوں نے پڑھی اور سنی ہوں گی!"

"نہیں تو" سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔

"بھئی تم لوگوں نے الیسپ کی کہانیاں پڑھی بھی ہیں سنی بھی ہیں لیکن تمھیں یہ نہیں معلوم کہ یہ کہانیاں الیسپ کی ہیں۔ یہ سب کی سب کہانیاں اصلاحی اور سبق آموز ہیں۔ ان کے کردار باتیں کرنے والے جانور ہیں۔ مثلاً وہ کہانی "انگور کھٹے ہیں" جس میں ایک لومڑی پکے پکے انگوروں کو دیکھ کر للچاتی ہے لیکن ان تک پہونچنے کی کوشش میں ناکام رہ کر کھسیا جاتی ہے اور یہ کہہ کر چل دیتی ہے کہ انگور کھٹے ہیں یا پھر دوسری کہانی "بھیڑیا اور میمنا" ہے اس میں ایک بھیڑیا ایک میمنے کو کھانے کے مختلف بہانے تلاش کرتا ہے اور آخر اسے کھا جاتا ہے۔ تیسری کہانی لومڑی اور کوّے کی ہے جس میں کوّے کے

گانے کی تعریف کرکے لومڑی اس کے منہ میں دبا ہوا روٹی کا ٹکڑا حاصل کر لیتی ہے۔ چوتھی کہانی چیونٹی اور ٹڈے کی ہے جس میں ٹڈا جو گرمی بھر گاتا رہا جاڑے میں بھوک سے مرنے لگتا ہے اور مجبور ہو کر چیونٹی سے کھانے کو مانگتا ہے اور چیونٹی ٹکا سا جواب دے دیتی ہے کہ جس طرح تم گرمی بھر گاتے رہے اب اسی طرح جاڑے بھر ناچتے رہو۔ یہ اور اسی قسم کی بے شمار کہانیاں ایسپ ہی کی ہیں" اتنا کہہ کر میں رک گیا۔

"ارے" سب کے منہ سے نکلا "یہ تو ہمیں معلوم ہی نہ تھا کہ یہ کہانیاں ایسپ کی ہیں۔"

"تو پھر بھائی صاحب۔ جلدی سے ایسپ صاحب کی کہانی سنائیے نا" چھوٹی شائستہ جلدی سے بول اٹھی۔

"یہ کہانیاں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا اور اسی طرح کی بہت سی دوسری کہانیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ یونان میں رہنے والے ایک غلام ایسپ نے کہی ہیں۔ یہ ساری کہانیاں اصلاحی ہیں اور ان سب میں بولنے والے پرندے اور جانور دکھائے ہیں جن کی حرکتوں اور باتوں سے اچھی باتوں اور عادتوں کو اختیار کرنے اور بری باتیں اور عادتیں چھوڑنے کا سبق ملتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ کہانیاں تو اتنی مشہور رہیں لیکن ان کے کہنے والے کے بارے میں بہت کم باتیں معلوم ہیں اور ان میں سے بھی بہت سی ایسی ہیں جن کی سچائی کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی وجہ سے بہت سے عالموں کا خیال ہے کہ ایسپ کی کوئی حقیقت نہ تھی اور وہ محض ایک خیالی اور فرضی کردار ہے۔

ایسپ کے بارے میں قابلِ قبول باتیں صرف مشہور یونانی مورخ ہیروڈوٹس (HERDOTUS) نے بتائی ہیں۔ اس کے بیان کے مطابق ایسپ چھٹی صدی قبل مسیح کے آخری پچاس برسوں میں موجود تھا یعنی اس کا زمانہ آج سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پیدائشی غلام تھا اور اس نے بہت سے لوگوں کی غلامی کی آخر اس کے ایک مالک جاڈمن آف سیمس (JADMON OF SAMOS) نے اس کی کسی بات سے متاثر ہو کر اسے آزاد کر دیا۔

آزادی پانے کے بعد وہ لیڈیا (LYDIA) کے بادشاہ کروسس (CROEISUS) سے ملا جس نے اسے کسی کام سے ڈلفی (DELPHI) بھیجا ڈلفی میں دیوتا اپالو کے پجاری ایسپ سے سخت ناراض تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسپ ان کے بارے میں غلط قسم کی افواہیں پھیلاتا ہے۔ آخر ایک دن موقع پا کر انھوں نے اسے ایک ڈھلوان پر سے پھینک کر ہلاک کر دیا اور اس طرح دنیا ایک اچھے انسان اور ایک اچھے کہانی کار سے محروم ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ وہ کبڑا اور بے ہنگم تھا لیکن اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔

پرانے مصنفوں کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسپ کی کہانیاں خود اس کے زمانے میں بہت مقبول تھیں۔ اس کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی یہ کہانیاں سیاسی مقصد کے لیے استعمال ہوتی رہیں۔

ساتویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح میں یونان کے
دشاہ انتہائی ظالم اور بے رحم تھے۔ ان کے ظلم کے
خلاف صاف صاف آواز اٹھانا جان سے ہاتھ
دھونا تھا۔ تقریر کی آزادی کا سوال ہی نہ تھا۔
ں لیے اس کی برائیوں کی طرف توجہ دلانے کے
یے وہ باتیں جانوروں کی زبانی حکایتوں کی شکل
یں کہلوائی گئیں۔ اور اس طرح ایسپ کی حکایتیں
جود میں آئیں۔ آہستہ آہستہ یہ حکایتیں اتنی مشہور
ہوئیں کہ یونانی ادب کی ہر حکایت کو ایسپ ہی کے
م سے منسوب کر دیا گیا لیکن بعد میں چھان بین
ے بعد پتہ چلا کہ بہت سی ایسی کہانیاں جو ایسپ کے
م سے مشہور ہیں اس سے پہلے کہی گئی تھیں اور ان
یں سے کچھ قدیم مصری پیپری (PAPYRI) پر
ائی جانے والی حکایتوں سے ملتی جلتی ہیں۔

"پیپری کیا ہے؟" حسنین نے ایکدم سوال کر دیا۔

"قدیم مصری لوگ پیپائرس (PAPYRUS)
امی ایک دریائی پودے کے تنے سے لکھنے کے لیے
یک کاغذ جیسی چیز بنایا کرتے تھے۔ انگریزی لفظ
PAPE بمعنی کاغذ اسی سے نکلا ہے" میں نے بتایا
ور اپنی بات کا سلسلہ جوڑتے ہوئے کہنا شروع کیا
انوروں کی کہانیوں سے اچھی باتوں کی تعلیم دینے کا
سلسلہ مشرق خصوصاً ہندوستان میں بھی عام
تھا۔ تم لوگوں نے پنج تنتر کی کہانیاں تو پڑھی ہی
وں گی۔"

"جی ہاں پیام تعلیم میں اس کے بارے میں بہت
ی معلومات دی گئی تھیں اور بہت ساری کہانیاں
ی قسط وار شائع ہوئی تھیں" کنی بول پڑی۔

[illegible]
کی کہانیاں ایسپ کی کہی ہیں۔ ایک عجیب بات یہ
ہے کہ ایسپ کی کوئی حکایت ہم تک یونانی زبان
میں نہیں پہونچی۔ ویسے کہا جاتا ہے کہ اس کی دو
سو کہانیوں کا پہلا مجموعہ ڈے می ٹرائس فیلاریس
(DEMETRIUS PHALAREUS) نامی
یونانی مصنف دو سو سال قبل مسیح منظر عام پر
لایا۔ بابریس (BABRIUS) نام کے ایک
یونانی شاعر نے ان حکایتوں کو نظم کیا۔ اس کا
زمانہ کئی سو سال قبل مسیح کا ہے۔ فیڈریس
(PHAEDRUS) نام کے ایک غلام نے ان
منظوم حکایتوں کو بعد میں یونانی سے لاطینی زبان
میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی کہانیاں
بھی اس مجموعہ میں شامل کر دیں۔

زمانہ وسطیٰ میں فیڈریس کا ترتیب دیا ہوا
یہ مجموعہ عربی میں ترجمہ ہوا تیسری صلیبی جنگ کے
بعد رچرڈ اوّل یہ عربی مجموعہ اپنے ساتھ انگلینڈ لے
گیا۔ سنہ ۱۲۰۰ء (بارہ سو) عیسوی میں اس عربی مجموعے
کے ایک حصّہ کا ایک فرانسیسی مصنّف میری ڈی فرانس
نے فرانسیسی میں ترجمہ کیا سنہ ۱۳۰۰ء کے لگ بھگ ایک
جرمن مصنّف ہنرچ اسٹین ہاول نے ایسپ
کی بہت سی کہانیاں جمع کیں اور سنہ ۱۴۷۶ء میں ان
کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کے چند ہی سال
بعد ولیم کیکسٹن نے ان کہانیوں کا انگریزی ترجمہ
کیا۔ اس کے بعد اس جرمن مجموعہ کا فرانسیسی اور
دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوا اور بعد میں تو یہ
کہانیاں اتنی مقبول ہوئیں کہ نہ صرف یورپ بلکہ

دنیا کی بیشتر زبانوں میں ان کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ معلوم نہیں کہ انگریزی سے اردو یا ہندی میں ان کہانیوں کا سب سے پہلا ترجمہ کس نے کیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس وقت اردو اور ہندی کے علاوہ ہندوستان کی تقریباً سبھی ترقی یافتہ زبانوں میں ایسپ کی کہانیوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

ایسپ تھا تو ایک غلام لیکن بڑا عقل مند، دین دار اور پرہیزگار آدمی تھا اور لوگوں کو اپنی اصلاحی کہانیاں سنا سنا کر خدا کی عبادت کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کہانی کار کے بارے میں بھی بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ اب تم لوگ اس کی زندگی کی کہانی کے ساتھ ساتھ اس کے بارے میں مشہور ایک کہانی بھی سن لو

اتنا کہہ کر میں رکا تو سب بے چینی اور اشتیاق بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ ذرا سا رک کر میں نے کہنا شروع کیا:۔

"ایک بار ایسپ کو ایک کسان نے خریدا اور اسے گھر لے گیا۔ جب رات ہوئی تو معمول کے مطابق ایسپ ایک کونے میں بیٹھ کر خدا کی عبادت کرنے لگا۔ جب وہ عبادت کر کے واپس آیا تو دیکھا کہ اس کا مالک گہری نیند سو رہا ہے۔ ایسپ نے اسے جگایا اور بولا "مالک اٹھو اور اگر مرنے کے بعد جنت میں جانا چاہتے ہو تو خدا کی عبادت میں لگ جاؤ۔"

"بھاگ جاؤ بے وقوف کہیں کے" کسان غصے سے بے قابو ہو کر چلایا۔ "مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔ خدا بہت مہربان ہے اور وہ کبھی مجھ پر سختی نہ کرے گا۔" یہ سن کر ایسپ چپ چاپ وہاں سے چلا گیا۔

دوسری صبح ایسپ سویرے اٹھ گیا اور پھر حسب معمول خدا کی حمد گانے اور عبادت کرنے لگا لیکن جب وہ واپس آیا تو دیکھا کہ اس کا نیا مالک ابھی تک پڑا سو رہا ہے۔ اس نے جگایا اور بولا "مالک، سورج نکل رہا ہے۔ تمام پرندے اور جانور تک جاگ کر خدا کی عبادت میں مشغول ہو گئے۔ آپ بھی جلدی سے اٹھ کر عبادت کر لیں تاکہ پھر ہم اپنا کام شروع کر دیں۔" لیکن کسان نے دوسری طرف کروٹ لے لی اور بولا "مجھے تنگ نہ کرو۔ میں اتنے سویرے سے نہیں اٹھنا چاہتا۔"

دو تین گھنٹے بعد کاہل کسان انگڑائیاں لیتا اٹھا اور ایسپ کو بلا کر اس سے بولا "ہل بیل سنبھالو اور ندی کے پاس والا چھوٹا کھیت جوتنا شروع کر دو اور دیکھو یہ بوری میں جو رکھے ہیں یہی اس کھیت میں بونے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد میں آ کر دیکھوں گا کہ تم نے کتنا کام کر لیا۔"

"بہت اچھا مالک" ایسپ نے بوری اٹھاتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد اس نے ہل کندھے پر رکھا اور بیلوں کو ہنکاتا ہوا کھیت کی طرف نکل گیا۔

راستے میں اس نے سوچا کہ اب موقع ہے کہ میں اپنے اس خدا کے نافرمان اور کاہل مالک کو ایک سبق دوں۔ میں کھیت میں جو کے بجائے کچھ اور بو دوں گا اور پھر دیکھوں گا کہ مالک کیا کہتا ہے۔

راستے میں ایک کسان سے اس نے جو کے بدلے باجرہ لیا اور کھیت جوت کر اس میں باجرہ بو دیا۔ دوپہر ہو چکی تھی لیکن مالک کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کا کام ختم ہو چکا تھا اس لیے ایسپ ہل بیل لے کر واپس گھر کی طرف چل دیا۔"

چند ہفتوں کے بعد کسان نے اس سے کہا "آؤ آج ذرا کھیت دیکھیں کہ تمہارا بویا ہوا جو کیسا اگ رہا ہے۔"

دونوں کھیت پر پہنچے۔ وہاں باجرے کے چھوٹے چھوٹے ہرے ہرے پودے لہلہا رہے تھے۔ "ارے" کسان نے پودوں کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔ "یہ تو عجیب قسم کا جو ہے۔ مجھے تو یہ بالکل باجرے جیسا لگتا ہے۔"

"یقیناً یہ باجرہ ہی ہے۔" ایسپ بولا۔

"کیا مطلب"؟ کسان چلایا "کیا میں نے تمہیں بونے کے لیے جو نہیں دیے تھے؟"

"بالکل مالک! آپ نے مجھے بے شک جو دیے تھے لیکن شاید یہ باجرہ بن گیا ہے۔"

ایسپ نے جواب دیا۔

"کیسی بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو تم" کسان کو غصہ آ گیا "صاف صاف بتاؤ کہ تم نے باجرہ بویا تھا یا جو؟"

"میں نے تو باجرہ ہی بویا تھا مالک" ایسپ بولا "لیکن ناراض نہ ہوں۔ خدا بہت مہربان ہے اور بہت ممکن ہے کہ وہ اس باجرے کو جو میں تبدیل کر دے۔"

"تمہارا مطلب کیا ہے بیوقوف آدمی!"

کسان غصے سے تلملا کر کہنے لگا۔ "صاف صاف بات بتاؤ ورنہ میں تمہیں بری طرح پیٹوں گا۔ اگر تم نے باجرہ بویا ہے تو تم جو کس طرح کاٹ سکتے ہو؟"

"جیسے آپ کاہل اور بے دین ہونے کے باوجود خدا کا وہ انعام حاصل کر لیں گے جو وہ اپنے نیک اور عبادت گزار بندوں کو عطا کرتا ہے۔"

کہانی نگار کو نہیں معلوم کہ کسان پر اس بات کا کیا اثر ہوا لیکن ہمیں یہ فرض کر لینا چاہیے کہ کسان نے ایسپ کی اس بات سے نصیحت حاصل کی ہوگی اور آئندہ کے لیے خدا ترس اور عبادت گزار بن گیا ہوگا۔

اتنا کہہ کر میں چپ ہو گیا۔ بچے ایک ایک کر کے کمرے سے نکل گئے اور میں اپنی کتاب اٹھا کر پڑھنے لگا۔

بقیہ صـ ۳۷

نگاروں کی بیش قیمت و گرانمایہ تخلیقات آئے دن بڑھتی جا رہی ہیں۔ یہ مستحسن اقدام ہے۔ جدید سائنسی معلوماتی مضامین بھی بڑے قابل قدر ہیں۔ اللہ تعالی اس آٹھ سالہ بلکہ تقریباً نو سالہ نوخیز نوعمر نونہال کو پروان چڑھائے اور اس کے ترقیاتی منصوبوں میں کامیابی عطا فرمائے۔ "زندہ بھوت" (مزاحیہ ڈرامہ) کا کارٹون پسند خاطر نہیں۔ عبدالغفور احمد

"پیام تعلیم" ہر ماہ اچھا ہی ہوتا جا رہا ہے رشید صاحب کا حرفوں کا جادو بہت پسند آیا۔ "منگے کا جزیرہ" ایک سے تین بھلے بہت پسند آئی۔ مشرف عالم ذوقی

کیسے کیسے پھول

حرمت الاکرام

صبح کی سیر کو ہم جو گئے تو دیکھے کیسے کیسے پھول
کانوں اور آنکھوں کی جنت گاتی کلیاں ہنستے پھول

کیا کیا اٹھلاتی ہے چنبیلی، گیندا ہے کتنا مغرور
رنگ گلاب کا سب سے تیکھا، پیلے کے البیلے پھول

گھر سے نکلو، کتنا سہانا موسم ہے، دیکھو تو سہی
دھوم مچی ہے گلشن گلشن آئی بہار اور مہکے پھول

جھکے ہوئے ہیں ندی کے آئینے میں دیکھنے کو چہرہ
مہک سمیٹے آنچل میں رنگوں کی چنری پہنے پھول

دنیا کی پھلواری میں جینے کا ڈھنگ آ جائے تو
آ جاتی ہے پھبن کانٹوں پر، بن جاتے ہیں شعلے پھول

رنگ چڑھا لیتے ہیں لیکن باس نہیں پیدا ہوتی
دیکھا ہوگا تم نے لوگ بناتے ہیں کاغذ کے پھول

رستے کے یہ کانٹے چن لو، ان سے ڈرنا ٹھیک نہیں
اوروں کو تحفے میں دے دو، دامن میں ہیں جتنے پھول

دلوں کو ٹھنڈک ملتی ہے اور آنکھوں کو ملتا ہے نور
گھر کے چمن کا کیا کہنا ہے جس کے ہیں یہ بچے پھول

کھلو تو مہکے ساری دھرتی، نام وطن کا ہو اونچا
بچو! تم بھی اسی طرح ہو باغیچے میں جیسے پھول

[redacted]شید حسن خاں صاحب کا

ایک خط

پیام تعلیم کا نیا شمارہ ملا۔ اس نئے شمارے کا سرورق دیکھ
لر آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی۔ خوب صورتی اور سادگی و پرکاری
کا حسین امتزاج۔

اب داستانِ غم بھی سن لیجیے پچھلی مرتبہ کاتب صاحب
کو خدا اور بھگوان دونوں کا واسطہ دیا تھا کہ نقل مطابق اصل
لیا کریں۔ نیا شمارہ دیکھ کر سر پیٹ لیا۔ اب کس کا واسطہ
دوں ایک شیطان صاحب کی ذاتِ بابرکات بچی ہے۔ آخر
یں انھی کا واسطہ دیا جا سکتا ہے۔ فرمائیے آپ کا کیا حکم ہے!
یا اجازت ہے؟

ارے صاحب! کاتب صاحب نے اب کے جی بھر کے
ی نہیں پیٹ بھر کے اصلاحیں فرمائی ہیں۔ اب یہ میرا مضمون
رہا نہیں بلکہ کسی گناہ گار کا نامۂ اعمال معلوم ہوتا ہے اور گناہ گار
ی کون؟ جس کا تعلق آج کل کے اشتہاری "مسلم ترقی پسند گروہ"
سے ہو"

غالب کو عمر بھر ارمان ہی رہا کہ "ناکردہ گناہوں کی حسرت
ی داد ملے"۔ یہاں ان سے زیادہ "ناکردہ اغلاط کی داد" مل گئی
رق یہ ہے کہ غالب کے مخاطب اللہ میاں تھے اور میرے
رم فرما حضرت کاتب ہیں۔ اگر یہ صاحب کاتبِ اعمال ہوتے
و اللہ جانے وہاں کے حساب کتاب کی کیا گت بنتی اور کیسے
کیسے معصوم لوگ کیا سے کیا ہو جاتے

وہ جو کہتے ہیں نا کہ بسم اللہ ہی غلط ہوئی سو اس
کا بہترین نمونہ شروع ہی میں موجود ہے۔ مضمون کے شروع
میں ہی جو "اطلاع نامہ" آپ نے شائع کیا ہے اس کی
آخری سطر میں میرا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ میرے مضمون
میں ہر جگہ "یہہ" لکھیں۔

پہلے ایک اور بات سن لیجیے۔ غالب سے کسی نے ان
کے اس شعر کی تعریف کی۔ ؎

اسد، اس جفا پر بتوں سے وفا کی
میرے شیر شاباش، رحمت خدا کی

مرزا صاحب نے کچھ اس طرح کی بات کہی تھی کہ بھائی!
جس کا یہ شعر ہے۔ اس پر واقعی خدا کی رحمت ہو۔ ہاں اگر
یہ میرا شعر ہو تو مجھ پر خدا کی لعنت۔

تو صاحب اگر میں نے یہ لکھا ہو کہ میرے مضمون میں
"یہہ" لکھیے تو مجھ پر خدا کی لعنت۔ (مرزا غالب کی تقلید میں)
ارے صاحب! اس لفظ میں صرف دو حروف ہیں: ایک
یؔ اور ایک ہؔ۔ اس کی صحیح صورت ہوئی: یہ۔ اب اگر آپ
اسے "یہہ" لکھتے ہیں تو یہ تو تین حرفی لفظ بن گیا۔ ایک یؔ
اور دو ہؔ۔ ایک ہؔ کہنی دار ہے اور ایک ہا کے مخلوق کی

صورت میں ہے۔ آپ مجھے جلا کوکوس لیجیے، بددعا دے دیجیے، اس پر قناعت نہ ہو سکے تو تبرا بھی بھیج لیجیے، مگر میرے اوپر یہ الزام تو نہ لگائیے کہ میں "یہہ" کو صحیح مانتا ہوں۔ غالب ہی کے الفاظ میں:

آخر گناہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں!

جان کی اماں پاؤں تو یہ بھی عرض کروں کہ ہ جب آخر لفظ میں آتی ہے تو اس کی تین صورتیں ہوتی ہیں:
(۱) ہائے مخلوط، جیسے: پوچھ۔ (۲) ہائے مختفی، جیسے: کعبہ
(۳) ہائے ملفوظ، جیسے: یہ، پہ (ماہ کا مخفف)

اب اگر کوئی صاحب پوچھ کو پوچھہ لکھیں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انھوں نے ایک ہائے مخلوط کے ساتھ ایک ہائے مختفی بھی شامل کر دی ہے۔ اس طرح دو ہ جمع ہو گئیں، جب کہ ضرورت صرف ایک ہائے مخلوط (یا ہائے دوچشمی) کی تھی اور یہ وہی بات ہوئی جیسے کہا جائے کہ سن لائٹ سوپ صابن، یا آئس کریم کا برف، یا عرقِ گلاب کا پانی، یا لیلۃ القدر کی رات۔

ہائے مختفی صرف اپنے سے پہلے حرف کی حرکت کو ظاہر کرنے کے کام آتی ہے، جیسے کعبہ۔ اس کے برخلاف ہائے ملفوظ، تلفظ میں ایک مستقل حرف کی طرح ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے: جگہ، یہ، تہ، کہ، منہ، مُنہ، وجہ۔ یہی وجہ ہے کہ اس ہائے ملفوظ کے نیچے ایک لٹکن آئے گا۔ اور یہ پہچان ہوگی اس بات کی کہ یہاں ہائے ملفوظ ہے۔ اور یہی فرق ہے آخر لفظ میں آنے والی اور ملا کر لکھے جانے والی ہائے مختفی اور ہائے ملفوظ میں۔

اب اگر آپ ان ہائے ملفوظ والے لفظوں کو مثلاً (بلکہ خدانخواستہ) اس طرح لکھیں۔ یہہ، مہہ، مُنہہ، جگہہ، کہہ تو اس کا مطلب بھی یہی ہوا کہ ایک ہ کی جگہ دو ہ آ گئیں ایک ملفوظ اور ایک مختفی جب کہ ضرورت صرف ایک کی تھی۔

اب آپ ہی خدا کو حاضر و ناظر جان کر، ایمان داری کے سر پر ہاتھ رکھ کر، صحتِ املا کا چشمہ لگا کر، اور مجھ غریب پر رحم کر کے فرمائیے کہ میرے مضمون میں یہ "کو" "یہہ" لکھنا اور یہ فرض کر لینا کہ اس کی فرمائش میں نے کی ہے، ستم ہے یا نہیں؟ اور اس بات پر مجھے گریبان چاک کر لینا چاہیے یا نہیں؟ اس مہنگائی کے زمانے میں غالب کی طرح میرا بھی دیوالا نکل جائے گا حضرت! کیا جائے گا۔

اب دوسری فریاد سنیے۔ میں نے لکھا تھا کہ: کاتب حضرات ہمزہ اپنی طرف سے اکثر بڑھا دیتے ہیں جیسے: چاہیئے:

اس عرضِ نیاز کے جرم میں اب کے میرے بھائی نے ایک دو جگہ نہیں، تیرہ جگہ یہ اضافہ فرمایا ہے۔ سارا مضمون تین تیرہ ہو گیا! صرف دو مقامات کی نشان دہی کرتا ہوں۔ باقی جگہوں کو آپ خود ڈھونڈھ لیجیے (۱) صفحہ ۶ کالم ۲، سطر ۲: بجائے (۲) صفحہ ۶، کالم ۲، سطر ۷ داؤ۔ ان کی صحیح صورت بجائے اور واو ہے۔ یہی نہیں، ص ۸ کے پہلے کالم کی دسویں سطر میں "کیجیئے" بھی موجود ہے، یعنی سمجھوتا اس پر ہوا کہ میری خاطر سے ایک "ی" بھی لکھیں اور اپنی روایات کے تحت اب اس پر ہمزہ کو بھی مسلط فرمائیں۔ اب میرا وہی حال ہے جو مرزا غالب کا ہوا تھا کہ

حیران ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں۔

اسی صفحے کے دوسرے کالم کی چودھویں سطر میں "اشیاے خورد و نوش" دانت نکال کر بلکہ نکوس کر ہنس رہا ہے یہ "اشیاے خورد و نوش کی مٹی عزیز ہوئی ہے۔

اس کے دو سطروں بعد (غ۔ ر۔ ڈ) براجمان ہے اور یہاں پر یہ لوگ گنڈاسے آئے ہوئے پناہ گزیں کی طرح بے گھر اور بے ٹھکانے ہے۔ اصل مضمون میں یہ کہیں اور

پر آیا ہے۔

اب اس کے بعد جو پیراگراف شروع ہوتا ہے اس کا شروع کا حصہ غائب ہو گیا ہے یعنی "خود بین بنا ہے" اس سے پہلے کیا تھا معلوم نہیں۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ سر کٹے شہید کبھی کبھی نظر آجایا کرتے تھے، سو یہ جملہ بھی سر کٹا شہید بن کر رہ گیا ہے۔

اور ہاں، اسی آٹھویں صفحے کے پہلے کالم میں ایک ہی پیراگراف میں چھ جگہ "منہہ" چھپا ہوا ہے۔ یہ غضب ہے یا نہیں۔ سر پیٹ رہا ہوں کہ جب میں نے اس پیراگراف کو پڑھا تھا، تو آنکھوں میں کالا چشمہ کیوں نہیں لگا لیا تھا۔ اب اُس وقت سے جو آنکھوں میں کھٹک پیدا ہوئی ہے تو اِس وقت تک چبھن موجود ہے۔ شیخ سدّو اور میراں سید کی دہائی ہے کہ "منہ" کو "منہہ" بنا دیا گیا۔ اللہ میاں کا واسطہ تو کام آیا نہیں۔ مجبوراً شیخ اور میراں کی دہائی دے رہا ہوں۔ شاید یہی کچھ کر سکیں۔ اس "منہہ" کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی معقول لڑکے اچانک منہ چڑانے لگیں اور ان کا منہ اس طرح بگڑنے بننے لگے جیسے بچپن کے زمانے میں بعض خاص اوقات میں بگڑ بگڑ جایا کرتا ہے۔

اور ہاں بیانیہ نشان پھر کیوں دراز دستی سے محفوظ رہ جاتا۔ چھٹے صفحے کے دوسرے کالم کو دیکھیے۔ معلوم ہو جائے گا۔

آپ نے چھٹی قسط کی فرمائش کی ہے، مگر میرا حال تو عشرۂ محرم کے ماتم گزاروں کا سا ہو کے رہ گیا ہے سر اور سینہ پیٹتے پیٹتے ہاتھ شل ہیں اور سر تو چھل۔ لہٰذا اب کے اسی خط پر اکتفا کیجیے۔ خیال تو یہ ہے کہ دس پندرہ دن میں اس مضمون کی بے رنگی اور کاتب صاحب کی دراز دستی کا غم غلط ہو جائے گا تب کچھ سے باتیں کی جائیں گی۔ ابھی معلوم نہیں کہ کیا کہوں اور کیا قلم سے نکلے۔ بچوں سے معذرت اور آپ جیسے بزرگوں سے دست بستہ معافی۔

اصل بات ایک اور ہے۔ وہ جو آپ کے یہاں ایک سید صاحب قبلہ تشریف فرما ہیں، یہ ساری کرامت ان کی ہے۔ برکت والے بزرگ ہیں۔ سید خواہ ایران کا خواہ ہندوستان کا ہے سید، پٹھانوں سے تو ان حضرات کو اللہ واسطے کا بیر ہوتا ہے جبکہ کم بخت پٹھانوں کا حال یہ ہے کہ انتہائی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے مزار تک اپنے یہاں بنا لیا کرتے ہیں کہ برکت کہیں نکل بھاگنے پائے۔ تو یہ سید صاحب جو ہیں نا، یہی بنگو اپنی کرامت کے زور سے یہ کرشمے دکھایا کرتے ہیں اور گویا اس طرح تنبیہ کیا کرتے ہیں کہ دیکھو، برخوردار سعادت آثار! آٹھویں دن سلام کرنے نہ آئے تو یہی حشر ہوگا۔ آپ کا کچھ قصور نہیں۔ آپ تو حسین بھی ہیں اور ندوی بھی اور حسان کی نسبتِ پاک بھی شاملِ حال ہے۔

تو جناب جب تک ان سید صاحب کا علاج نہیں کریں گے آپ، تب تک یہی ہوتا رہے گا۔ نہ تو سپاہیاں پڑھا کریں گے اور نہ آپ کی مدد کیا کریں گے۔ الٹے کاتب کو شہ دیا کریں گے کہ کان بند کیے، آنکھیں جھکائے اور سر نہوڑائے ہوئے اسی طرح قلم چلاتے رہو اور جیسے تھانے میں رپٹ لکھی جاتی ہیں، اسی طرح رشید حسن کے مضمون کو بھی لکھا کرو۔ کیونکہ یہ صاحب شور بھی بہت مچایا کرتے ہیں اور میں میخ نکالا کرتے ہیں اور عافیت آشوبی کو گویا اپنا پیشہ بنائے ہوئے ہیں۔ ان کا یہی علاج ہے۔

مترجمہ — ملیحہ انجم اشرف

مونگے کا جزیرہ

ناشتہ کرکے ہم نے اپنی سب چیزیں ایک چھوٹے سے غار کی دیوار میں بنے ہوئے ایک سوراخ میں رکھ دیں۔ یہ غار ہمارے عارضی مکان کے قریب ہی تھا۔ اسے دیکھتے ہی ہم نے سوچا تھا۔ یہ بڑا اچھا اسٹور روم ہے۔ چیزیں چھپا کر ایک درخت سے لکڑی کاٹی۔ دو بڑی بڑی لاٹھیاں بنائیں۔ ایک پیٹرکن کو دی گئی دوسری میرے حصّہ میں آئی۔ رہا جیک تو اس نے کلہاڑی کندھے پر رکھ لی۔ ہمارا ارادہ تھا کہ جزیرے کے اونچے پہاڑوں کی چوٹی پر پہنچ کر پورے جزیرے کو ایک نظر دیکھیں، ظاہر ہے کہ ایسے سفر میں ان جانے خطرے بھی پیش آسکتے ہیں اس لیے ہم نے ہتھیار بند ہو کر چلنا ہی مناسب سمجھا۔

پوری تیاری کے بعد ہم نے آگ بجھائی اور سمندر کے کنارے کنارے چلنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دور چل کر ایسی جگہ پہنچے جہاں سے وادی میں داخل ہو سکتے تھے۔ یہاں ایک بڑا خوبصورت سا چشمہ کل کل کا مدھر سنگیت سناتا ہوا بہہ رہا تھا۔

وادی میں داخل ہوئے تو ایک بڑا شاندار منظر ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ دونوں طرف زمین اونچی ہوتی چلی گئی تھی۔ اور اس طرح وادی کے دونوں طرف دو پہاڑیاں بن گئی تھیں، کوئی ایک میل تک پھیلی ہوئی یہ پہاڑیاں اور وادی کی زمین طرح طرح کے پیڑوں اور جھاڑیوں سے پوری طرح ڈھکی ہوئی تھی۔

آگے چل کر یہ پہاڑیاں ایک چھوٹے سے پہاڑ سے مل گئی تھیں۔ یہ پہاڑ وادی کے بیچ و بیچ میں تھا۔ اور پہاڑیوں کی طرح یہ بھی درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ صرف بائیں طرف کچھ زمین پتھریلی اور بنجر تھی اس پہاڑ کے آگے ہم نہیں دیکھ سکتے تھے اس لیے ہم نے چشمے کے کنارے کنارے چل کر اس جگہ تک پہنچنے کا فیصلہ کیا جہاں سے یہ چشمہ پھوٹ رہا تھا

ہمارا سب سے عقلمند بہادر سپاہی جیک کندھے پر کلہاڑی رکھے، سب سے آگے تھا۔ پیٹرکن ہاتھوں میں اپنے قد سے اونچی لاٹھی سنبھالے دوسرے نمبر پر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ خدا نخواستہ مجھے کوئی خطرہ پیش آیا تو وہ آگے رہ کر میری حفاظت کرے گا۔ میں سب سے پیچھے تھا۔ اور خالی ہاتھ۔ اسے میری بے وقوفی ہی سمجھیے کہ میں حیرت انگیز اور عجیب نظاروں میں کچھ ایسا کھو گیا۔ کہ لاٹھی پیچھے ہی چھوڑ آیا۔

جھاڑیاں اور درخت حالانکہ کافی گھنے تھے پھر بھی اتنے پاس پاس بھی نہ تھے کہ ہمارا راستہ روک لیتے۔ ہم جلد ہی ایک پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے۔ اور اس پر چڑھنے کی تیاری کرنے لگے۔ یہاں جیک نے ایک ایسا انکشاف کیا

میری طبیعت خوش ہو گئی۔ یہ نخلستان ایک خوبصورت تھا اور جیک کے کہنے کے مطابق یہ مشہور بریڈ فروٹ ٹری (ڈبل روٹی والا پیڑ) تھا۔

"یہ مشہور درخت ہے؟" پیٹرکن نے بڑی سادگی سے پوچھا۔

"بالکل!" جیک نے سر ہلایا۔

"بڑی عجیب بات ہے۔" پیٹرکن بولا: "میں نے تو اس کے بارے میں کبھی سنا ہی نہیں۔"

"تب یہ اتنا مشہور نہ ہوگا جتنا میں اسے سمجھتا تھا۔" پیٹرکن کا ہیٹ اس کی آنکھوں پر کھینچتا ہوا بولا: "لیکن تم اب تو اس کے بارے میں سن لو۔"

پیٹرکن نے اپنا ہیٹ ٹھیک کیا اور میری طرح دلچسپی سے جیک کی باتیں سننے لگا۔ جیک نے ہمیں بتایا کہ یہ درخت ان جزیروں میں بڑا اہم اور قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ سال میں یہ درخت کبھی تین بار پھل دیتا ہے۔ اس کا پھل روٹی سے بہت ملتا ہے اور یہ ان جزیروں کے باسیوں کا من بھاتا کھاجا ہے۔

"تو" پیٹرکن نے دخل اندازی کی: "اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس حیرت انگیز جزیرے میں ہمیں ہر چیز تیار ملے گی۔ پانی ناریل کی بوتلوں میں بھرا ہوا اور روٹی درختوں پر اگی ہوئی۔ واہ واہ!"

"اس کے علاوہ" جیک نے پیٹرکن کی بات پر دھیان دیتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی: "اس درخت کی نرم نرم شاخوں کی چھال سے ان جزیروں کے باسی کپڑے بناتے ہیں اور اس کی سخت اور خوش رنگ لکڑی سے مکان ـــــ تو تم نے دیکھا لڑکو کہ ہم ذرا عقل سے کام لیں تو ہمیں اپنی ضرورت کے سامان کی کمی نہ ہوگی۔"

"لیکن کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ یہ وہی درخت ہے؟" پیٹرکن نے پھر ایک سوال داغ دیا۔

"بالکل ٹھیک" جیک نے جواب دیا [illegible] میں اس کا تذکرہ پڑھ کر [illegible] ساری باتیں مجھے آج بھی یاد ہیں۔ افسوس بس اس بات کا ہے کہ اس کتاب میں دو عجیب درختوں کا جو ذکر تھا وہ مجھے یاد نہیں رہا۔ حالانکہ جو درخت آج ہم نے دیکھے ہیں ان میں سے کسی ایک کا بیان اس کتاب میں ضرور تھا ـــ تو دیکھا تم نے ماسٹر پیٹرکن کہ تم بہت ساری چیزیں نہیں جانتے۔"

"تم فکر نہ کرو میرے دوست" پیٹرکن اپنے [illegible] کے شانے تھپتھپاتا ہوا بولا: "عمر کے اعتبار سے تمہاری معلومات کافی ہیں۔ تم یقیناً بڑے ہوشیار بچے ہو۔ ہونہار ہو اور اگر تم اسی طرح ترقی کرتے رہے تو تم ۔۔۔۔۔"

اور اس تقریر کا اچانک اختتام اس طرح ہوا کہ جیک نے پیٹرکن کو جھاڑیوں کے ایک گھنے جھنڈ میں دھکا دے دیا۔ اور پیٹرکن بڑے مزے سے اس پر لمبا لمبا لیٹ کر دھوپ کا مزہ لینے لگا۔ میں اور جیک روٹی والے پیڑ کا معائنہ کرنے لگے۔

اس کی چوڑی چوڑی پتیاں گہرے سبز رنگ کی تھیں۔ ان کی لمبائی بارہ سے اٹھارہ انچ تھی۔ وہ گلاب کی پتیوں کی طرح کٹی ہوئی لیکن بڑی چکنی تھیں۔ اس کا پھل تقریباً گول کھردرا اور بیچ سے چھ انچ قطر کا ہوگا۔ یہ مختلف رنگوں کا تھا۔ ہلکا ہرا، بھورا اور گہرا پیلا۔ جیک نے بتایا کہ پیلے والے پکے تھے۔ اس درخت کی چھال سخت اور ہلکے رنگ کی تھی۔ تنا دو فٹ موٹا اور درخت کی لمبائی بیس فٹ کے قریب تھی۔ اس میں تاڑ کے درخت کی طرح اوپر تک کوئی شاخ نہ تھی۔ بس اوپر جا کر شاخوں اور پتیوں کی ایک خوبصورت سی چھتری بن گئی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ پھل دو دو اور تین تین کے گچھوں میں شاخوں پر لگے تھے۔ ہمیں

چونکہ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس لیے ہم نے انھیں توڑنے کی کوشش نہ کی۔

ہمارے دل اب بہت مطمئن تھے۔ اور اسی اطمینان کے عالم میں ہم تیزی سے قدم بڑھاتے چوٹی کی چڑھائی چڑھنے لگے۔ چوٹی پر پہنچ کر ایک نیا اور شاندار منظر ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔ ہمیں پتہ چلا کہ یہ جزیرے کا سب سے اونچا حصہ نہ تھا۔ بلکہ اس کے پیچھے ایک اور پہاڑ تھا۔ اور اس کے اور اس پہاڑی کے درمیان جس پر ہم کھڑے تھے ایک لمبی چوڑی سر سبز وادی تھی۔ اس وادی میں بہت سے روئی والے درخت اور ناریل کے پیڑ بھی دکھائی دیے۔ اس منظر کو دیکھ کر ہم نیچے اترے۔ اور دوسرے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ یوں تو سارا راستہ درختوں سے بھرا پڑا تھا۔ لیکن اس پہاڑ کی چوٹی ننگی اور کہیں کہیں سے ٹوٹی ہوئی تھی۔

یہ چوٹی جزیرہ کا سب سے اونچا حصہ تھا۔ اور یہاں سے نیچے کا تمام جزیرہ کسی نقشے کی مانند ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ دو پہاڑ تھے۔ ایک کی اونچائی کے بارے میں ہمارا اندازہ پانچ سو فیٹ تھا۔ اور دوسرا جس پر ہم اس وقت ہم کھڑے تھے۔ کوئی ہزار فٹ اونچا رہا ہوگا ان دونوں کے درمیان ایک حسین سر سبز وادی پھیلی ہوئی تھی یہ وادی جزیرے کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک چلی گئی تھی۔ درمیان میں بلند اور دونوں طرف تبدریج کسی ڈھلوان کی طرح اترتی ہوئی یہ سمندر تک پھیلی ہوئی تھی۔

بڑا والا پہاڑ بھی دوسری طرف سمندر تک اترتا چلا گیا تھا۔ ایک نظر میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ڈھلان بالکل ہموار ہے۔ لیکن زیادہ غور سے دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا تھا۔ کہ جگہ جگہ اس میں چھوٹی چھوٹی وادیاں بھی تھیں اور پتھریلے ٹیلے بھی۔ ادھر ادھر کھڑی چٹانیں بھی تھیں۔ ان چٹانوں سے چشمے پھوٹ پھوٹ کر ان کی .. ڈھلانوں پر بہتے، جھاگ اڑاتے تھے سے سفید دریا کی شکل اختیار کرتے ہوئے نیچے وادی میں پہنچ رہے تھے۔ کہیں کہیں روئی والے پیڑ یا ناریل کی چوڑی پتیوں سے ان کی ایک سفید چمکدار جھلک نظر آجاتی تھی اور کہیں کہیں یہ گھنی جھاڑیوں میں بالکل ہی چھپ جاتے تھے۔

پہاڑ کے قدموں میں ایک تنگ سا میدان تھا جس میں گہری ہری گھاس اگی ہوئی تھی۔ یہ میدان ساحل پر جا کر ختم ہو جاتا تھا۔ جزیرے کی دوسری سمت میں جدھر سے ہم آئے تھے وہ چھوٹا والا پہاڑ کھڑا تھا جس کے قدموں سے تین وادیاں شروع ہوئی تھیں۔ ایک تو وہ جس سے ہم داخل ہوئے تھے۔ اسی کے دونوں جانب دوسری دو چھوٹی چھوٹی وادیاں تھیں۔ جنھیں وہ پہاڑیاں جن کا ذکر میں کر چکا ہوں اس بڑی وادی سے الگ کرتی تھیں۔ ان دونوں چھوٹی وادیوں میں ایک بھی چشمہ نہ تھا۔ لیکن .. جھاڑیوں اور درختوں کی یہاں بھی بہتات تھی۔

یہ جزیرہ کوئی دس میل لمبا اور اتنا ہی چوڑا معلوم ہوتا تھا اور اس کی شکل قریب قریب دائرہ جیسی تھی۔ اس لیے اس کی گولائی اندازاً تیس میل ہوگی یا شاید کچھ زیادہ ہو جائے اگر ہم کھاڑیوں کو بھی اسمیں شامل کر لیں۔ پورا جزیرہ انتہائی سفید اور چمکدار ریت کی ایک پٹی سے گھرا ہوا تھا۔ اب ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ مونگے کی چٹان نے پورے جزیرے کو اپنے حلقے میں لے رکھا تھا لیکن جزیرے سے اس کا فاصلہ ہر جگہ برابر نہیں تھا۔ کہیں تو یہ جزیرہ سے ایک میل کے فاصلہ پر تھی اور کہیں محض چند سو گز۔ لیکن زیادہ تر جگہوں پر ساحل سے اس کا فاصلہ آدھ

میل تھا۔ یہ چٹان کافی نیچی تھی۔ اور موجیں کے تھلتے ہوئے پانی کے بادل اس کے اوپر سے گزرتے تھے۔ ان موجوں کی جنگ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ موسم کتنا ہی پرسکون کیوں نہ ہو بحرالکاہل میں ہمیشہ ایک ہلکا سا تموج رہتا ہے۔ اس تموج کا سمندر میں تو شاید پتہ بھی نہ چلتا ہو لیکن ساحل پر اس کا نتیجہ بڑی بڑی موجوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ہاں لگون کا پانی (جیسا کہ میں پہلے بتا کہہ چکا ہوں) بالکل خاموش اور پرسکون تھا۔ مونگے کی چٹان میں تین گزرگاہیں تھیں۔ دو تو اس وادی کے جو جزیرے کے بیچوں بیچ سے گزرتی تھی۔ دونوں سمت میں اور تیسری ہماری وادی کے سامنے۔ (اسی وادی کا نام ہم نے بعد میں 'وادیٔ جہاز' رکھ دیا تھا۔ ان گزرگاہوں کے دونوں طرف چٹان ابھر کر ننھے منے جزیروں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ جھاڑیوں سے ڈھکے ان جزیروں پر اکا دکا ناریل کے پیڑ بھی تھے۔ یہ جزیرے یوں تھے بڑے عجیب۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے انھیں لگون میں داخل ہونے کے راستے کی نشان دہی کرنے کے لیے بنا دیا ہو۔ جس دن ہمارا جہاز ٹکرایا تھا۔ ہمارے کپتان نے ان ہی میں سے ایک گزرگاہ میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ اور میرا تو خیال ہے کہ اگر جہاز تباہ نہ ہوتا تو وہ اس میں کامیاب ہو گیا ہوتا۔

لگون کے اندر بہت سے ننھے ننھے اور ننھے جزیرے تھے بالکل ہمارے مکان کے سامنے اور ان کے بعد تو اس میں سے دس میل کی دوری کے اندر کوئی ایک درجن اور جزیرے پھیلے ہوئے تھے لیکن یہ سب کے سب ہمارے جزیرے سے چھوٹے تھے۔ اور بظاہر ان پر آبادی کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ یہ سب جزیرے پانی کی سطح سے بس تھوڑے ہی اوپر تھے۔ اور ہوتے بھی کیسے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ یہ سب کے سب ناریل کے درختوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔

یہ سب اور بہت سی دوسری باتیں ہم نے پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے بیٹھے نوٹ کیں۔ اور معلومات کا یہ ذخیرہ دماغ میں بھرے ہم اپنے گھر کی طرف چلے۔ راستے میں ہمیں کسی چوپائے کے پیروں کے نشان ملے۔ لیکن ہم میں سے کوئی یہ نہ بتا سکا۔ کہ یہ نشان تازہ تھے یا پرانے۔ ہاں اس سے یہ امید ضرور بندھ گئی۔ کہ ہماری غذا میں شاید جانوروں کا گوشت بھی ہو۔ ہم گھر پہنچے تو بہت خوش تھے اپنے اس سفر سے پوری طرح مطمئن اور رات کے کھانے کے لیے تیار۔

ایک طویل گفتگو کے بعد جس میں پیٹرکن نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ اس جزیرے پر کوئی آبادی نہیں اور پھر لمبی تان کر پڑ گئے۔

(باقی آئندہ)

بقیہ ص ۲۸

یہ اچھائیاں بنیادی طور پر اس کی اپنی فطرت میں چھپی ہوئی ہیں۔

آج کل سماجی کاموں کے سلسلے میں اری کی شخصیت بہت اہم مان لی گئی ہے۔ بہت سے ملک انھیں اپنے ملکوں میں آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان سے تقریریں کراتے ہیں۔ سماجی کاموں کے سلسلے میں ان سے مشورے لیتے ہیں۔ کناڈا۔ بلجیم اور ہالینڈ وغیرہ کی حکومتوں نے اس سلسلے میں ان کی خدمات حاصل کی ہیں اور لوگ عام طور پر انھیں سیلون کا گاندھی کہتے ہیں ۔۔۔ ☆

جناب عبداللہ شرقی

صبح کا ترانہ

اٹھو، سونے والو خدارا اٹھو
ہُوا زرد اب ہر ستارا اٹھو

اندھیرا جہاں سے سدھارا اٹھو
وہ دیکھو سحر کا نظارا اٹھو

الٹ دی ہے لیلائے شب نے نقاب
مگر تم کہ اب تک بھی ہو محوِ خواب

وہ دیکھو ہے زیبِ اُفق آفتاب
تمہیں کر رہا ہے اشارا اٹھو

یہ برکت کا ہے وقت سب کے لیے
سعادت کا ہے وقت سب کے لیے

عبادت کا ہے وقت سب کے لیے
ہے رحمت کا دل کش نظارا اٹھو

کرو اپنے رب کی عبادت کرو
کلامِ خدا کی تلاوت کرو

کرو زندگی کی حفاظت کرو
بہت سو چکے، اب خدارا اٹھو

رہے دل میں مذہب کا سوز و گداز
رہے پاسِ فرمانِ شاہِ حجاز

کہ ہے خوابِ راحت سے بہتر تماز
مؤذن نے تم کو پکارا اٹھو!

نہیں صبح کے وقت سونا بھلا
نہیں ایسی نعمت کا کھونا بھلا

نہیں چور غفلت میں ہونا بھلا
ہے نورِ سحر آشکارا اٹھو

چرند و پرند اب عبادت میں ہیں
زمیں آسماں سب اطاعت میں ہیں

یہ انساں مگر خوابِ راحت میں ہیں
یہ کہتا ہے شرقی، خدارا اٹھو

محترمہ ساجدہ خالد بنگلور

انعام

گن پور نام کے ایک گاؤں میں دین دیالو اور دیو داس نام کے دو دوست رہتے تھے۔ دین دیالو بہت لالچی خود غرض اور بے رحم تھا۔ دیو داس بہت ہی نیک اور رحم دل تھا۔ یہ دونوں دوست پجاری تھے۔ بھگوان گن پتی کے سچے بھگت۔

اس گاؤں میں صرف ایک ہی مندر تھا۔ گنیش چترتھی کا تیوہار آیا۔ اور ہر برس کی طرح اس سال بھی لوگوں نے بڑی دھوم دھام سے تیوہار منایا۔ دین دیالو اور دیو داس نے بھی اپنی پوجا اور بھگتی میں کوئی کمی نہیں کی گنپتی مہاراج کا دل بہت خوش ہوا۔

اسی رات جب دین دیالو کھانا کھا کر سو رہا تھا، کسی نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ نیند ٹوٹنے کی وجہ سے وہ ہڑبڑاتا ہوا اٹھا اور دروازہ کھولا۔ اپنے سامنے ایک بھکاری کو کھڑا دیکھ کر دین دیالو کو بہت غصہ آیا۔ بھکاری کو گالیاں دے کر بھگا دیا۔

بھکاری نے اگلے دروازے پر آواز دی اور وہ گھر دیو داس کا تھا۔ دیو داس کو بھکاری پر بہت ترس آیا۔ اس نے اسے اندر بلایا، کھانا کھلایا اور رات گزارنے کے لیے جگہ بھی دی۔

صبح جب دیو داس کی آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہے کہ بھکاری کی جگہ بھگوان گنپتی کھڑے ہیں۔ فوراً بھگوان کے قدموں پر گر پڑا۔ گنپتی مہاراج بولے "میں تمہاری پوجا سے بہت خوش ہوں۔ جو چاہے مانگو۔ ملے گا۔"

دیو داس سر جھکا کر بولا "مہاراج یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ نے مجھ غریب کے گھر میں قدم رنجہ فرمایا۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

مہاراج یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ پلک جھپکتے ہی دیو داس کی جھونپڑی سی کٹیا ایک عالیشان کوٹھی میں بدل گئی جہاں کھانے پینے اور عیش و آرام کی ہر چیز تھی کچھ ہی دیر میں یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔

یہ بات جب دین دیالو کو معلوم ہوئی تو وہ بہت پچھتایا اور بھگوان گنیش کی تلاش میں نکل پڑا۔ گاؤں سے کچھ دور ان سے ملاقات ہو گئی۔ وہ گڑگڑاتے ہوئے کہنے لگا۔ "گنپتی مہاراج مجھے معاف کر دو۔ کل مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ بھگوان، میں نے ساری عمر آپ کی پوجا کی ہے۔ میرے گھر بھی آ کر مجھ پر کرم کیجیے۔"

گنپتی مہاراج بولے "نہیں میں اب تمہارے گھر نہیں آ سکتا۔ ہاں جو مانگنا ہو مانگ لو۔ وہ تم کو ملے گا۔"

لالچی دین دیالو نے کہا "بھگوان میں سوچ کر بتاؤں گا کہ مجھے کیا چاہیے۔"

بھگوان گنیش بولے: "اچھا تمھاری تین مرادیں پوری ہوں گی. جاؤ، جو چاہو مانگ لو۔"

دین دیالو خوش خوش گاؤں کی طرف چل پڑا۔ اسے جلد سے جلد گھر پہنچ کر اپنی بیوی کو سارا حال سنانا تھا۔ اس نے سوچا کاش میرے پر ہوتے تو میں اڑ کر گھر پہنچتا۔ اس خیال کے آتے ہی اسے پر لگ گئے اور وہ ہوا میں اڑنے لگا۔ اس کی ایک مراد پوری ہو گئی.

اب دین دیالو کو محسوس ہونے لگا کہ گاؤں کے لوگ اسے اڑتا دیکھ کر بھوت نہ سمجھ لیں اور مار نہ بیٹھیں. یہ سوچ کر اس نے دوسری خواہش کا اظہار کیا: بھگوان میرے پر واپس لے لو اور مجھے میرے گھر کے سامنے کھڑا کر دو۔

گھر کے آنگن میں دین دیالو کی بیوی کچھ کام کر رہی تھی، بیوی سے اس نے سارا حال کہہ سنایا۔ بیوی نے کہا یہ سب تمہارے کرموں کا پھل ہے۔ اب وہاں کھڑے کیا کر رہے ہو اندر آؤ، توبہ کرو اور اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔

دین دیالو نے چلنے کے لیے قدم اٹھائے تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس کے پیر وہیں گڑ گئے ہیں اور وہ انھیں اٹھا نہیں سکتا۔ تب اسے خیال آیا کہ اس نے صرف گھر کے سامنے کھڑے ہونے کی خواہش کی تھی۔ اب بے چارے دین دیالو کو تیسری مانگ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس لیے تیسری مانگ کو استعمال کرتے ہوئے اس نے اپنے پیر واپس مانگ لیے۔

اس طرح لالچی دین دیالو کے تینوں وردان بے کار گئے۔ اور اسے کچھ نہ ملا۔

نہرو بال پستکالیہ

ہندوستان کی اہم زبانوں اور انگریزی میں بچوں کے لیے بہترین اور سستی کتابیں شائع کرنے کے لیے کتابوں کے اس سلسلے کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے جاننے والوں کے لیے ایک ہی سا ادب پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو سکیں اور اس سے قومی ایکتا مضبوط ہو۔

اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوئی ہیں جو اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں۔ ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے (۱/۵۰) ہے۔ یہ سب کتابیں رنگین تصویروں کے ساتھ فوٹو آفسیٹ پر شائع ہوئی ہیں۔

۱۔ بالو حصہ اول مصنف ایف سی فری تاس مترجم صالحہ عابد حسین
۲۔ بالو 〃 دوم 〃 〃 〃 〃
۳۔ کشمیر 〃 مالا سنگھ 〃 خدیجہ بیگم تصاویر پریانند
۴۔ پرندوں کی دنیا 〃 جمال آرا 〃 محمد شفیع الدین نیر
۵۔ ہمالیہ کی چوٹیوں پر 〃 برگیڈیر گیان سنگھ 〃 محمد ذاکر
۶۔ ہماری ندیوں کی کہانی 〃 لیلا مجمدار 〃 رضیہ سجاد ظہیر
۷۔ جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں میلا سہاگوت مترجم 〃
۸۔ رسیلی کہانیاں 〃 منوج داس 〃 صغرا مہدی
۹۔ آزادی کی کہانی حصہ اول 〃 دستو پربھاکر 〃 انور کمال حسینی
۱۰۔ ہماری ریلیں 〃 جگ جیت سنگھ 〃 عرش ملسیانی
۱۱۔ ہندوستان میں غیر ملکی سیاح 〃 کے سی کھنہ، تصاویر کرشن کھنہ
۱۲۔ آؤ ناٹک کھیلیں مصنف اوما نند مترجم رفیعہ منظور الامین
۱۳۔ خالہ بلی کا خاندان 〃 منوہر داس چترویدی 〃 محمد شفیع الدین نیر
۱۴۔ بہت دن ہوئے حصہ اول 〃 چوکسی بی۔ ام جوشی 〃 رضیہ سجاد ظہیر
۱۵۔ بہادروں کی کہانیاں 〃 راجندر اوستھی 〃 انور کمال حسینی
۱۶۔ روہنت ونندیہ 〃 کرشن چیتنیہ 〃 〃
۱۷۔ سدا بہار کہانیاں 〃 شانتا رنگا چاری 〃 〃

ذاکر حسین سیریز

۱۸۔ ابو خاں کی بکری 〃 ڈاکٹر ذاکر حسین قیمت ۲/۰
۱۹۔ انوکھی دوکان 〃 قدسیہ زیدی 〃 ۲/۵۰
۲۰۔ گلابو چوہیا اور پرنیاد 〃 〃 ۲/۰
۲۱۔ دنیا کے جانور 〃 〃 ۲/۵۰
۲۲۔ راجہ رام موہن رائے عرش ملسیانی (زیر طبع)

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ (۲) اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ (۳) پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

گوہر شیخ پوروی

ایک لڑکا اور چاول

تھا کسی گاؤں میں کوئی لڑکا
بھولا بھالا تھا اور کم سن تھا
بھات تو وہ ہمیشہ کھاتا تھا
اس کو گیہوں کبھی نہ بھاتا تھا

اس کا مرغوب تھا یہی دانا
ایک دن کھا رہا تھا وہ کھانا

اس نے چاول سے یہ کہا اس دن
چین پاتا نہیں میں کیوں تجھ بن

یہ بتا تو کہاں سے آتا ہے
اس قدر کیوں تو مجھ کو بھاتا ہے

بولا چاول ذرا قریب آؤ
آج تم میرا ماجرا سن لو

نسل میری بہت پرانی ہے
اور لمبی مری کہانی ہے

جب سے دنیا میں آدمی آیا
مجھ کو جنت سے ساتھ ہی لایا

بن کے امرت میں خاک سے نکلا
کھیت کی گود میں ہوا پیدا

پانی برسا کے کچھ گھٹاؤں نے
پرورش کی مری ہواؤں نے

جب ہوا کچھ بڑا مرا پودا
کھیت کی گود میں بڑھا پودا

کاشت کاروں نے ایک جا ہو کر
اور کھیتوں میں رکھ دیا لا کر

اور اُن سب نے اپنی محنت سے
مجھ کو سینچا بڑی مشقت سے

سردی گرمی کا کہیں ہو اثر
س لیے میں نے اوڑھ لی چادر

ہو گئی زیست پائمال وہاں
کھنچ گئی تھی بدن کی کھال وہاں

میں جو پل پل کے یوں جوان ہوا
نام لوگوں میں میرا دھان ہوا

کل نے جب کر دیا مجھے بے کل
دھان سے نام ہو گیا چاول

د اُس کے جو مجھ پہ گزری ہے
کہوں وہ جفا جو جھیلی ہے

تم نے مجھ کو پسند فرمایا
اپنی اماں سے مجھ کو پکوایا

جن کو ہمدرد میں نے سمجھا تھا
ان میں ہر ایک بے وفا نکلا

پھر مصیبت میں مجھ کو لایا گیا
آگ پر مجھ کو اب چڑھایا گیا

خ کسانوں نے اپنے موڑے ہیں
ہر ستم کے پہاڑ توڑے ہیں

پک کے جب کام ہو گیا میرا
بھات پھر نام ہو گیا میرا

میری گردن پکڑ کے ہنسوے سے
ہو کے بے درد کاٹ ڈالا مجھے

خوب جی بھر کے مجھ کو کھاتے ہو
اپنا لقمہ مجھے بناتے ہو

بب سے نکلا ہوں اپنی محفل سے
غم لپٹا ہوا مرے دل سے

قدر کب میری تم نے جانی ہے
اس لیے تو مری گرانی ہے

ایک جا کر دیا مرا خرمن
میرا کھلیان بن گیا مسکن

نہیں پہنچا کسی کو مجھ سے گزند
سب مجھے کرتے ہیں اسی سے پسند

پھر وہاں بھی مجھے سکوں نہ ملا
ہر طرح کی مصیبتوں کو سہا

جس نے آدم کو کر دیا مضطر[1]
غصہ آتا ہے مجھ کو گیہوں پر

ایک تختہ پر خوب ہی جھٹکا
جسم کو میرے خوب ہی پٹکا

بزمِ جنت میں یوں سرِ محفل
مجھ سے آدم کبھی ہوئے نہ خجل[2]

پھر دیا زخم تازہ سینوں میں
دے دیا مجھ کو پھر مشینوں میں

پیار کرتا ہے میرا رب مجھ کو
فخر اس بات کا ہے اب مجھ کو

جو کہ دنیا میں غم کو سہتا ہے
بن کے گوہر وہی تو رہتا ہے

[1] پریشان [2] شرمندہ

جناب شعیب حسّان

لنکا کے گاندھی

(۲)

باوجود اتنی شہرت اور کام میں غیر معمولی مشغولیت کے اری صاحب کبھی اپنے مقصد سے نہیں ہٹے۔ دوسرے کام ان کے اسکول کے کام میں کبھی حائل نہیں ہوئے۔ سوشل ویلفیئر یا سماج سدھار کا کام وہ اسکول کے بعد کرتے تھے۔

اور جب کام اور مدد مانگنے والوں کے خط کثرت سے آنے لگے تو انھیں بھی اپنے کام کو باقاعدہ اور منظم شکل دینے کا خیال آیا۔ کئی راتیں خراب کرنے کے بعد انھوں نے اپنے کام کا خاکہ بنایا۔ ایسا خاکہ جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نہ اس کا مقصد کسی طرح کا نفع حاصل کرنا تھا۔

اس مجلس، تنظیم، انجمن یا آرگنائزیشن کا نام انھوں نے "سرووڈے شرم دان" رکھا۔ سیلون کی زبان میں اس کے معنی ہیں "سب کے لئے بھلائی اور" طاقت میں سب کا برابر کا حصہ"۔

اس مجلس تنظیم، انجمن یا آرگنائزیشن کی اہمیت بڑھانے اور اس کو اور زیادہ مشہور کرنے کے لئے انھوں نے پندرہ آدمیوں کی انتظامی یا اگزی کیوٹو کمیٹی بنائی اس کے صدر ملکی سرکار کے صدر مقرر ہوئے۔ اس کمیٹی میں ملک کے چنے ہوئے اور منتخب لوگ تھے۔ یہ کمیٹی اعزازی ہے۔ ممبر حضرات بغیر ایک پیسہ لیے اعزازی طور پر کام کرتے ہیں۔

اور جناب اس کمیٹی کے بنتے ہی جیسے اس تحریک کے پر لگ گئے۔ اس کے عام ممبر چند ہی دنوں میں ایک ہزار اور پھر بڑھتے بڑھتے دس ہزار تک پہنچ گئے۔ یہ ممبر پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔

اس سرودے تحریک نے کام کی غیر معمولی صلاحیت کی بدولت لوگوں پر ثابت کر دیا کہ یہ تحریک فلاح و بہبود کے کاموں میں آپ ہی اپنا جواب ہے سرودے کے رضا اپنے ہی خرچ پر کام کی جگہ پہنچتے ہیں۔ وہاں رہنے سہنے ا کھانے پینے کا انتظام اس گاؤں کے لوگ کرتے ہیں۔ جن گاؤں میں یہ کام کرتے ہیں۔

کام کرنے کے لیے سامان کی ضرورت ہوتی ہے تو اسے خریدنے کے لیے چندہ جمع کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں ایک بار ایک غریب دیہاتی عورت نے سوا دو روپے چندہ دیا یہ اس کی دن بھر کی مزدوری کا آدھا تھا۔ گاؤں والوں کو معلوم ہے کہ یہ چندہ انھی کی مدد کے لیے ہو رہا ہے اس لیے وہ دل کھول کر چندہ دیتے ہیں۔ اری صاحب کا کہنا ہے کہ کسی جگہ بھی چندے کی کمی کی وجہ سے کام روکنے کی نوبت نہیں آئی۔

لیکن ان کی اصل دولت اور اصل طاقت تو ان کے رضاکار ہیں۔ اپنے ہاتھوں اپنے اوزار اور اپنی طاقت

کے بل بوتے پر سرودے رضاکار وہ کارنامے انجام دیتے ہیں جو دوسروں سے ناممکن ہیں۔ اس کی تازہ مثال دیپاکانڈا گاؤں کی ہے۔

دیپاکانڈا گاؤں ایک پہاڑی پر آباد ہے۔ سطح سمندر سے ۸۰۰ میٹر اونچا ہے۔ سڑک سے [illegible] گاؤں تک پہنچنے کے لیے صرف ۳۰۰ میٹر تک فٹ پاتھ سا بنا ہوا تھا باقی راستہ بہت لمبا اور کھابڑ تھا۔ گاؤں تک پہنچنے میں کافی وقت، کافی پریشانی ہوتی تھی۔

گاؤں والوں نے بار بار پکی سڑک بنوانے کی درخواست کی۔ حکومت کے انجینئروں نے حساب لگا کر بتایا کہ پکی سڑک بنانے پر بہت روپیہ لگے گا۔ اور حکومت کے لیے یہ مشکل ہے۔

گاؤں والے ہر طرف سے ناامید ہو گئے تو سرودے میں ان کو امید کی کرن نظر آئی۔ وہ اری صاحب کے پاس گئے اور انھیں اپنی بپتا سنائی۔ اری صاحب نے بہت ہمدردی سے ان کی باتیں سنیں اور پھر فیصلہ سنا دیا "ہم لوگ کل سے آپ کے یہاں کام شروع کر رہے ہیں۔"

اتفاق سے اسی زمانے میں ایک سرکاری افسر اس علاقے کا دورہ کر رہا تھا۔ اسے اری صاحب کے اس ارادے کی خبر ملی تو بہت حیران ہوا۔ اس کے خیال میں گاؤں تک سڑک بننا بالکل ناممکن تھا۔ اس نے کہا "آپ گاؤں والوں کو خواہ مخواہ جھوٹی تسلی دے کر بہلا رہے ہیں۔"

اری کے لیے یہ گویا چیلنج تھا۔ اس نے اس افسر سے کہا "اچھا تو ہم شرط لگاتے ہیں۔ اگر آپ ایک مہینے کے بعد اپنی کار پر پہاڑی تک پہنچ جائیں تو آپ اس سڑک کو پکا کرا دیں گے۔"

سرکاری افسر نے یہ شرط خوشی سے مان لی اُسے یقین تھا کہ یہ کام ناممکن ہے۔ مگر صاحب اس شرط کی خبر ملتے ہی سرودے کے رضاکاروں میں اور گاؤں والوں میں کام کو ختم کرنے کا ایک خاص جذبہ اور جوش پیدا ہو گیا۔ سرودے کے سیکڑوں اور ہزار سے اوپر گاؤں کے لوگ دوسرے ہی دن کام پر جٹ گئے۔ ان کا جوش و خروش دیکھ کر آس پاس کے لوگ بھی ان کی مدد کو پہنچ گئے۔ دن تو دن رات میں بھی کام ہونے لگا۔ بجلی نہیں تو کیا۔ لالٹینیں جلائی جاتی تھیں۔

آخری دنوں میں اری اور ان کے رضاکار واپس چلے گئے۔ انھوں نے کام تقریباً ختم کر دیا تھا باقی تھوڑا بہت کام گاؤں کے لوگ آسانی سے کر سکتے تھے۔

لیجیے چار ہفتے بات کہتے میں گزر گئے۔ اور وہ دن آ پہنچا جس کا اری صاحب اور ان کے ساتھیوں کو انتظار تھا۔ مقررہ دن وہ سرکاری افسر بھی آ پہنچا اور اپنی کار پر سوار بڑے آرام سے پہاڑی تک چلا گیا۔ اسے حیرانی تھی کہ یہ ناممکن کام کیسے ممکن ہو گیا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ سرودے لیڈر نے جو بات کہی تھی۔ کتنے پختہ (پکے) ارادے سے کہی تھی اسے اپنے آدمیوں پر کتنا بھروسا تھا۔ اور اس کے ساتھیوں نے رات دن ایک کر کے مقررہ وقت میں سڑک بنا کر کس طرح اس کے بھروسے اس کے اعتماد کی لاج رکھی۔

سرکاری افسر نے اری صاحب سے کہا "اگر دوسروں کی مدد کے جذبے سے اس کٹھن پہاڑی راستے کو یہ بھلے لوگ کھرنجے کی شکل میں تبدیل کر سکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ میں شرط کے مطابق اسے پکا نہ بنا دوں۔"

اور جناب تھوڑے ہی دنوں میں اس افسر کی

بدولت یہ کھرنچے کی سڑک پکی بن گئی۔ گاؤں والوں نے اس سڑک کا نام بھی "اری کی سڑک" رکھ دیا ہے اور بھئی سچ مچ اس سڑک کی بدولت گاؤں والوں کو آنے جانے میں کتنی سہولت ہوگئی ہے۔ جبھی تو وہ اری صاحب کو سیلون کا گاندھی کہتے ہیں۔

اور بھئی یہ حقیقت بھی ہے کہ سیلون کے اس گاندھی (اری صاحب) نے گاندھی جی کے فلسفے اور ان کی زندگی کے کارناموں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ہمارے باپو (گاندھی جی) کی طرح وہ بھی اپنے دیس کے سچے دوست تھے۔ صحیح معنی میں محبّ وطن ہیں۔ اپنی سردودے تحریک کی بنیاد انھوں نے گاندھی جی کے اصولوں پر رکھی ہے۔ مثلاً نفس کی قربانی، عدم تشدد۔ پچھڑے ہوئے لوگوں کی ہر طرح مدد کرنا۔ انھیں اوپر اٹھانے سماج میں ان کی عزت بڑھانے کا جذبہ وغیرہ۔

اری باپو کی طرح تشدد کے مخالف ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عدم تشدد سے ٹھیک ٹھیک طریقے سے کام لیا گیا تو تخلیقی کاموں کے لیے اور سماج میں اچھی تبدیلی لانے کے لیے یہ ایک بڑی طاقت بن جاتی ہے۔

۱۹۶۷ء تک سردودے تحریک ملک کی سب سے بڑی والنٹری یا رضاکارانہ تحریک بن چکی تھی۔ اس کے دس ہزار رضاکار ہر وقت تیار رہتے تھے کہ کہیں سے بلاوا آئے اور وہ کام پر نکلیں۔ یہ تحریک جب اتنی بڑھ گئی تو اری صاحب نے ایک پلان بنایا۔ یہ پلان صحیح معنوں میں بہت بڑا پلان تھا۔ اس کا نام انہوں نے سو دیہاتوں کی فلاح و بہبود (ڈولپمنٹ) کے لیے رکھا۔

اس اسکیم ماتحت اری صاحب نے مختلف سماجی برائیوں، معاشی دشواریوں کو دور کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ مگر سب سے زیادہ زور تعلیم پر دیا تھا۔ اری کا یہ پروجیکٹ بھی دوسرے پروجیکٹوں کی طرح لوگوں میں بے حد مقبول ہوا۔ لوگ تن، من، دھن سے اسے پورا کرنے میں لگ گئے۔

اس پروگرام کے تحت اری صاحب اور ان کے ساتھی سب سے پہلے لوردالا گاؤں گئے۔ اس گاؤں میں نہ تو سڑکیں تھیں نہ کوئی مدرسہ تھا۔ صحت مند اور تندرست زندگی کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے، گاؤں والوں کے رہن سہن میں ان کی بہت کمی محسوس ہوئی۔ اری صاحب نے یہ بھی محسوس کیا کہ گاؤں والے آپس میں مل جل کر نہیں رہتے۔ تو بھئی اری صاحب نے اس گاؤں میں کام شروع کیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کی کایا پلٹ گئی۔ گاؤں والوں کی مدد سے اری صاحب اور ان کے ساتھیوں نے سڑکیں بنا دیں ان سڑکوں کے ذریعہ گاؤں کے لوگ اپنے کھیتوں کی پیداوار چاول وغیرہ اپنی بنائی چیزیں جیسے ناریل کے ریشے بازار میں پہنچانے لگے۔ اور ان کی آمدنی میں اچھا خاصہ اضافہ ہوگیا۔ اب ان کے بچے اسکول میں پڑھنے جاتے ہیں۔ ان کے رہن سہن کے طریقوں میں بھی بہت کچھ سدھار ہوگیا ہے۔

بڑی بات یہ کہ ان تبدیلیوں کا ان کی ماہوار آمدنی پر بھی خوش گوار اثر پڑا ہے۔ ۱۱۰ روپے ماہوار کمانے والا کنبہ آج ۲۲۰ روپے کما رہا ہے۔ سردودے رضاکاروں کے بنائے ہوئے اسکول کی بدولت تعلیم کی اہمیت دن پر دن بڑھتی جاتی ہے۔ گاؤں میں پڑھے لکھے لوگوں کا اوسط دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔

پور ووالا گاؤں کے ایک بزرگ کا کہنا ہے کہ سرودے تحریک نے ہمیں ہماری صلاحیتوں سے روشناس کرایا ہے۔ ہماری زندگی میں ہمارے رہن سہن میں انقلاب آگیا ہے۔ بہت بڑا انقلاب! آج اس گاؤں کا ہر آدمی اس تحریک کے گن گاتا ہے لوگ اٹھتے بیٹھتے اری صاحب اور ان کے ساتھیوں کو دعائیں دیتے ہیں۔

اری صاحب کے بہت سے پروگراموں کی وجہ سے ان کا سالانہ بجٹ لاکھوں تک پہنچ گیا اور برابر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ خرچ کی ضرورت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

پر اب دوسرے ملکوں میں بھی بین الاقوامی یا انٹرنیشنل ایجنسیوں یا اداروں تک اری صاحب کی پے در پے کامیابیوں کی خبریں پہنچ چکی تھیں اور انھیں اری صاحب کے کاموں سے دلچسپی ہو گئی تھی ان میں سے ایک ادارے کا نام ورلڈ اسمبلی آف یوتھ ہے۔ اس نے سرودے کی سو دیہاتوں کی ترقی کی اسکیم کو اپنے پروگرام میں شامل کر لیا

اپنی طرف سے روپے کی فراہمی اور سامان کی فراہمی کا بھی اطمینان دلایا۔ یہی نہیں یونسکو کو بھی ساری دنیا نے اری صاحب کی مدد پر آمادہ کیا۔ ان اداروں کی سرپرستی اور مدد سے ساری دنیا سے لگ بھگ پانچ لاکھ روپیہ جمع ہو گیا۔ اس طرح دیس میں ابتدائی تعلیم کا پروگرام شروع کرنے کے لیے خرچ کا انتظام ہو گیا۔

اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بہت سی چلتی پھرتی لائبریریاں بھی قائم کی گئی ہیں۔ یہ لائبریریاں گاؤں گاؤں جا کر کتابیں تقسیم کریں گی اور لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا کریں گی۔

سو دیہاتوں کی فلاح کی اسکیم [illegible]
زیادہ ہو گئی ہے مگر اری صاحب کی نظر میں یہ صرف ابتدا ہے۔ انھیں امید ہے کہ ۱۹۷۲ء تک پانچ سو گاؤں اور ۱۹۷۵ء تک ایک ہزار گاؤں اس پروگرام میں شامل کریں گے۔

اب تک اری صاحب ۱۰۰ اسکول اور کمیونٹی سینٹر مختلف علاقوں میں کھول چکے ہیں۔ اتنی ہی تعداد بچوں کی لائبریریوں کی ہے۔ یہ بھی بہت کامیابی سے چل رہی ہیں۔ لگ بھگ آٹھ سو کلومیٹر لمبی سڑکیں سرودے رضاکاروں کی مدد سے بن چکی ہیں۔ یہ سڑکیں زیادہ تر دشوار گزار علاقوں میں بنائی گئی ہیں۔

مختصر یہ کہ سرودے کے ان گنت رضاکاروں نے سیلون کے چالیس ہزار خاندانوں کی تعلیم اور سماجی اور معاشی ترقی کے سلسلے میں مدد کی ہے۔

آج تک جتنے بھی پروجیکٹ بنائے گئے، جتنے بھی پروگرام چلائے گئے ان کا مرکز یا ہیڈ کوارٹر کولمبو کے ایک بہت پر رونق بازار کے پیچھے کے حصے میں ہے۔ اری صاحب یہیں رہتے ہیں۔ ان کی بیوی "نیتھیا" اور ان کے تینوں بچے دفتر سے ملے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں ہنسی خوشی گزر کرتے ہیں اس چھوٹے سے کنبے نے کبھی جگہ تنگی کی شکایت نہیں کی بلکہ وہ اری کے تمام پروگراموں کے چلانے میں دوسرے رضاکاروں کی طرح پیش پیش رہتے ہیں۔ نیتھیا (اری صاحب کی بیوی) رضاکاروں کے لیے مزے مزے کے کھانے تیار کرتی ہیں۔ اور بچے دیہاتوں کے بچوں کو اچھے اچھے دلچسپ گیت اور طرح طرح کے کھیل سکھاتے ہیں۔

اری صاحب کو اس بات پر یقین ہے کہ بڑے سے بڑے آدمی کو بھی ہم صحیح طریقے سے اور مناسب وقت پر
[illegible]

جناب شوکت پردیسی

سچ کی عزت

پیارے بچو!! جھوٹ نہ بولو
جھوٹ ہے لعنت اُس کو چھوڑ دو

سچ جو کہو گے راحت ہو گی
ہر محفل میں عزت ہو گی

کام جو بگڑے خوف ہٹا دو
جھوٹ نہ بولو صاف بتا دو

صاف کہو گے ڈر نہ رہے گا
نیچا ہرگز سر نہ رہے گا

پیار کریں گے اپنے پرائے
تم سے رہیں گے خوش ہمسائے



انساں کی کہانی حیوان کی زبانی



محترمہ رشیدہ بی بی ام شیخ

ایک بکری تھی، ایک بلّی تھی
لومڑی ان کی ایک ننھی خالہ
اور ہمسائے گی میں ایک کُتّا
ایک دن چاروں مل کے بیٹھ گئے
کہا بلّی نے میری خالہ جان
باتیں ہم نے سنی ہیں اس کی بہت
مجھ سے کمبخت بد گماں سا ہے
تلخ باتوں کو اس کی سہنا تھا
اِک زمانہ تھا مجھ پہ وارثی تھے
اسی بستی میں تھا ہزاروں کا
ظلم ایسے کیے ہیں انسان نے
کِس طرح اس کو بھول جاؤں حضور
چاہتی ہوں اِسے کھلا دوں سم
جب یہ باتیں ہوئیں تو بول اُٹھا
مائی بھومی ہر اک کی دِلّی تھی
بِس کی جڑ آفتوں کی پرکالہ
پاس ہی والے گھر میں رہتا تھا
باتوں باتوں میں اپنے خوب کھُلے
کچھ بتاؤ تو کیسا ہے انسان ؟
محفلیں اس سے گرم کی ہیں بہت
بھائی کتّے پہ مہرباں سا ہے
اپنی قسمت میں یہ بھی لکھا تھا
مصر والے مرے پجاری تھے
ان کا ٹولہ تھا بلّی ماروں کا
کہ سُنے ہوں کبھی نہ حیواں نے
گربہ کشتن تھا روز کا دستور
کیا بتاؤں تمہیں خدا کی قسم
کان کو پھڑ پھڑا کے وہ کُتّا

بس بہن بس کرو کہ تاب نہیں … کونسا دل ہے جو کباب نہیں
مجھ پہ یہ مہرباں! ارے توبہ … جو رہے پاس وہ کرے توبہ
ہے وفادار مجھ کو بتلاتا … پھر کبھی کہتا ہے مجھ کو یہ کتا
نام میرا ہے اس کی اک گالی … جس پہ بگڑا اسی پہ بک ڈالی
مجھ کو دیکھو کہ بُردبار ہوں میں … خادمِ خلق، خاکسار ہوں میں
کون ہے؟ جس کو یہ نہیں ہے پتا … سگِ اصحابِ کہف تھا کتا
ہیں فرنگی جو میرے بھائی بہن … ایسے رہتے ہیں جیسے کوئی دلھن
دودھ انڈے غذا میں ملتے ہیں … فرشِ مخمل پہ پاؤں چلتے ہیں
جب میں جاں بازیاں دکھاتا ہوں … شیر چیتے کو گھیر لاتا ہوں
کوئی دم ہے کہ مجھ کو کام نہیں؟ … آدمی سا نمک حرام نہیں
پیار کرتا ہوں دُم ہلاتا ہوں … ٹھوکریں پھر بھی اس کی کھاتا ہوں
سچ کہوں ایک اپنے دل کی بات … ہے جہاں میں یہ ننگِ مخلوقات
بولی بکری کہ بھائی چپ بھی رہو … اپنی کہتے ہو کچھ مری بھی سنو
میرا اس کے یہاں ٹھکانا ہے … اس سے رشتہ بہت پُرانا ہے
دودھ پیتا ہے موج اڑاتا ہے … میرے بچوں کو پھاڑ کھاتا ہے
اس کے بچوں کو پالتی ہوں میں … دیکھتی اور بھالتی ہوں میں
بربریت میں جو نہ ہو کامل … یہ کہے گا اُسے سدا بُزدل
ٹوپیاں سب کی یہ اتارے ہے … اپنے ہم جنس کو بھی مارے ہے
رحم اس میں نہیں ہے ایک رتی … ایسے انساں سے قل اعوذ بھلی
یہ میرا ظرف ہے کہ رہتی ہوں … مار کھاتی ہوں، ظلم سہتی ہوں
جھوٹ مکر و فریب ظلم دغا … اس کو بخشے خدا معاذ اللہ

لومڑی نے یہ جب سنا قصہ — حسن کے اس کو بھی آگیا غصہ
بولی تینوں سے اے میرے پیارو — آفتابِ ازل کے سہ پارو
جانتے بھی ہو مجھ کو کیا ہوں میں — دشتِ ظلمت کا اک دیا ہوں میں
زندگی اپنی کیف و کم سے ہے — شانِ تدبیر میرے دم سے ہے
کیا قیامت ہے خالقِ باری — کہ ہو مشہور میری مکاری
کسی مقصد میں میرا دخل نہیں — میں رہینِ کتاب و عقل نہیں
کوئی لیڈر نہیں وکیل نہیں — میں کسی "ازم" میں اسیر نہیں
نہ کمیٹی، نہ میں کمیشن میں — نہ الکشن، نہ کمپٹیشن میں
جانچ پڑتال مجھ کو بھاتی نہیں — بھوک ہڑتال مجھ کو آتی نہیں
ایک صحرا ہے ایک وادی ہے — زندگی اپنی سیدھی سادی ہے
پھر بھی انساں مجھے کہے مکار — اس پہ لعنت کرو ہزاروں بار

لومڑی بولی آؤ میرے قریں — میرے ہر بول پر کہو آمین
کی دعا سب نے پھر برائے نجات — اپنے رب کی طرف اٹھا کے ہاتھ
مہربانی نہیں ہے کم سب پر — تیرا کتنا کرم ہے ہم سب پر
تو نے حیوان و ملخ و مور کیا — شرِ انسانیت سے دور کیا
ہم بھی ہر دورِ پر فتن سے بچے — دوست احباب مکر و فن سے بچے
جو کرے اپنے دوستوں پر وار — ایسے انسان پر خدا کی مار

ہائے قسمت! یہ شکلِ انساں ہے
جس سے حیوان بھی گریزاں ہے

۱؎ اندھیرا یا تاریک جنگل

اینگلو اردو ہائی اسکول دھولیہ اسکول پارلیمنٹ

اس سال بھی اسکول پارلیمنٹ کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس انتخاب میں تمام طلباء وطالبات نے اپنے حق رائے دہی کا استعمال کیا اور پارلیمنٹ کے وزیر اعظم اور اسپیکر کو منتخب کیا۔ اس انتخاب میں دو طالب علم وزیر اعظم کے لیے اور دو طلبا اسپیکر کے لیے امیدوار تھے۔ اس انتخاب میں اسکول کے صدر مدرس عالی جناب محمد ایوب صدیقی صاحب نے ذاتی طور پر دلچسپی لی اور اپنے سامنے ہی انھوں نے تمام رائے دہندوں سے اس بات کی اپیل کی کہ وہ بغیر کسی دباؤ کے اپنے حق کا استعمال اپنی پسند کے امیدوار کے لیے کریں۔ نتیجے کے اعلان کے وقت سارے طلباء اسکول گراؤنڈ میں نتیجہ جاننے کے لیے بے چین تھے۔ ووٹوں کی گنتی ہو جانے کے بعد نتیجہ کا اعلان کیا گیا۔ اس انتخاب میں جماعت دہم کے طالب علم اختر خاں سکندر خاں وزیر اعظم کے لیے اور اسپیکر کے لیے شکیل احمد عباس عبدالرشید کو کامیاب قرار دیا گیا۔ تیسرے دن وزیر اعظم نے اپنی کیبنٹ کے لیے وزراء اور نائب وزراء کا انتخاب کیا۔ علاوہ ازیں طالبات نے اپنی نمائندگی کے لیے حمیدہ بانو عبدالرزاق یازدہم الف اور قمر النساء عباس علی یازدہم ب کو منتخب کیا۔ حزب مخالف کے نمائندوں کا نام وزیر اعظم کو پیش کیا۔ اسکول پارلیمنٹ کے وزراء اور نائب وزراء حسب ذیل ہیں۔ (۱) وزیر اطلاعات ونشریات حبیب الرحمن عبدالمجید دہم الف نائب وزیر دستگیر احمد عثمان دہم ب (۲) وزیر کھیل کود ریاض احمد محمد صغر الف نائب وزیر اختر حسین شبیر احمد (۳) وزیر تہذیب وثقافت رفیع الدین صدر الدین دہم ب۔ نائب وزیر محمد اقبال شیخ لقمان دہم ب (۴) وزیر تعلیم محمد امین نہم الف نائب وزیر محمد الیاس شیخ رسول (۵) وزیر مالیات عبدالوہاب عبدالمجید نہم ب (۶) جلال الدین عبدالبشیر نہم الف (۷) وزیر نظم ونسق غلام ربانی یازدہم الف نائب وزیر شبیر حسین (۸) وزیر سیر وسیاحت محمد فاروق عبدالغنی یازد وزیر جلیل احمد عبدالرشید نہم (۱۰) وزیر صحت محمد اقبال عبدالقیوم دہم ب نائب وزیر عبد عبدالعزیز نہم الف (۱۱) وزیر داخلہ شیخ عثمان دہم الف نائب وزیر محمد کلیم عبدالمالک نہم الف

حزب مخالف کے لیڈر

۱۔ شیخ سلیم غلام رسول یازدہم الف (۲) شبیر نبی یازدہم ب (۳) عبدالقیوم محمد بشیر یازدہم مقبول حسن عبدالوہاب دہم ب (۵) ملک عزیز یازدہم ب (۶) شوکت علی صابر علی دہم ب (۷) عثمان غنی دہم ب (۸) مختار احمد نور نبی یازد (۹) عبدالرؤف شیخ حمید یازدہم ب (۱) عبد محمد عثمان یازدہم الف۔

اسکول پارلیمنٹ کا افتتاح ۱۵ اگست کی ایک مشہور شخصیت عبدالحمید الازہری کے دست مبارک سے صدارت میں ساڑھے ۳ بجے عمل میں آیا۔ اس افتتا

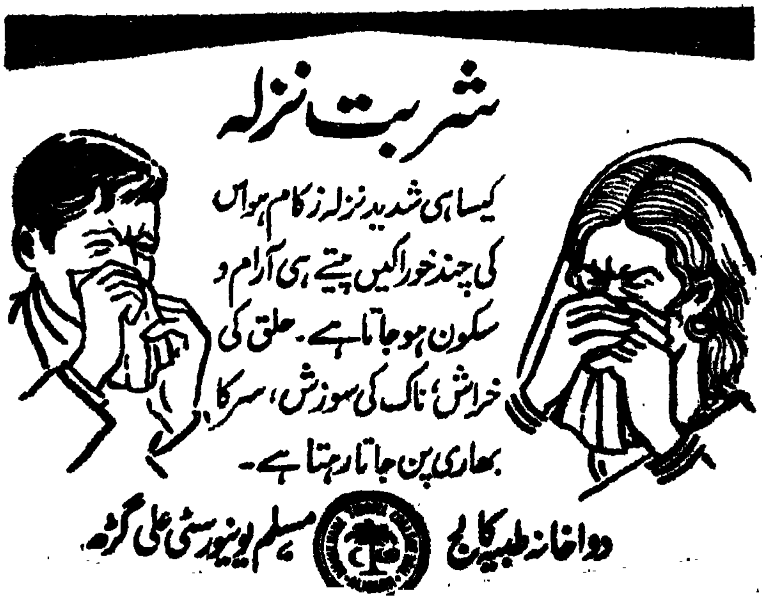
... اساتذہ حضرات کے علاوہ طلباء و طالبات کی کثیر تعداد بھی موجود تھی. پارلیمنٹ ہاؤس کا تعارف کرایا گیا اور سال گزشتہ کی طرح وزیر اعظم اختر خان سکندر خان نے ... بہتر سے بہتر کام کرنے کا وعدہ اور یقین دلایا. پارلیمنٹ کی طرف سے طلبا یا مولانا موصوف محسن کی صدارت میں یہ افتتاحیہ جلسہ ہو رہا تھا. اپنی خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بہتر تعلقات کے ساتھ ساتھ پارلیمنٹ کی کامیابی اور کامرانی کے لیے دعا کی.

اسپیکر شکیل احمد عبدالرشید دہم الف وزیر اعظم اختر خان سکندر خان دہم الف وزیر اطلاعات و نشریات حبیب الرحمٰن.

انجمن اسلام کے متعدد اسکولوں کے شاندار نتائج

ایس ایس سی بورڈ کے زیر اہتمام منعقدہ حالیہ امتحانات میں بھی انجمن اسلام کے متعدد تعلیمی اداروں کا رزلٹ نہایت ہی شاندار رہا ہے. مندرجہ ذیل اعداد و شمار ان اداروں کی تعلیمی صورت حال کا خاکہ پیش کرتے ہیں.

احمد سیلر ہائی اسکول	٩٥٫٢٢ فیصدی
انجمن اسلام پنج گنی ہائی اسکول	٩٣٫٣٣ فیصدی
گرلز ہائی اسکول بلاسس روڈ	٨٤ فیصدی
صابو صدیق پالی ٹکنیک	٧٨٫١٢ فیصدی
گرلز ہائی اسکول باندرہ	٧٨٫٨ "
انجمن اسلام ہائی اسکول بوری بندر	٧٧٫٥ "
کرلا ہائی اسکول	٧٢٫٢ "
جان محمد قاسم ہائی اسکول	٦١ "
جان محمد قاسم نائٹ ہائی اسکول	٥٠ "



آدھی ملاقات

یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ میرا ناول
"مونگے کا جزیرہ" پیارے بچے بہت پسند کر رہے ہیں
اس پسندیدگی سے کچھ یہ بھی اندازہ ہوا ہے کہ
اب اردو والوں کا ذوق نکھر رہا ہے۔ اور حوصلہ
بھی بڑھا ہے۔ پیامیوں کو ان شاء اللہ اب آئندہ
شکایت نہ ہوگی اور میں پابندی سے قسطیں روانہ
کرتا رہوں گا۔

اگست کے شمارہ کا حصہ نظم بہت اچھا رہا ہے۔
... ظفر صاحب کا ڈرامہ "وہاں بھوت" بہت
دلچسپ ہے۔ لیکن مجھے بادشاہ کو "دونوں جہاں
کے آقا یا مالک" سے خطاب کیے جانے پر اعتراض ہے
کیونکہ دو جہاں عموماً خدا کیلیے استعمال ہوتا ہے۔
مضامین بہت دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ محترم راج نرائن
صاحب کا مضمون پڑھ کر پہلی بار "آسمان گھر کے بارے
معلومات حاصل ہوئیں۔

ستمبر کا شمارہ وقت سے بہت پہلے پا کر حیرت
ہوئی اور مسرت بھی۔ سرورق آپ ہر ماہ بدل کر

بہت اچھا کر رہے ہیں۔ اس بار کا سرورق تو
بہت ہی پیارا ہے۔ بچوں کو تو بہت پسند
آیا۔ محترم عبدالغفور صاحب نے بالکل درست
فرمایا ہے کہ محترم رشید حسن خاں صاحب کا
مضمون نہ صرف بچوں کے لیے کارآمد و مفید ہے
بلکہ بڑوں کی بھی خامیوں و غلطیوں کی اصلاح و
درستی کرتا ہے۔ اس بار کا شمارہ مجموعی طور پر
بڑا دلکش، رنگا رنگ اور مفید ہے۔ اس بار تصویریں
بھی ہیں جنھوں نے رسالے کی جاذبیت میں
اضافہ کیا ہے۔

محترم شوکت پردیسی صاحب کو "پیام تعلیم"
کی بزم میں رونق افروز دیکھ کر بڑی مسرت
ہوئی۔ "آدھی ملاقات" میں انھوں نے محض انکسار
سے کام لیا ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان
کے "ماحول سے اکتائے ہوئے لمحوں کا مجموعہ" تمام
اکتاہٹ دور کر دیتا ہے۔ وہ بچوں کی نفسیات
سے واقف ہیں۔ اور ان کی نظمیں واقعتاً بچوں

مطلب کی ہوتی ہیں ۔ خدا کرے کہ وہ یونہی "پیام تعلیم" کو نوازتے رہیں ۔ آپ کا مضمون، "پھل یا مٹھائی" کہانی کی کہانی اور مضمون کا مضمون ۔ زبان و بیان کی دلچسپی کا ذکر ہی لاحاصل ہے ۔

سعید نواز صاحب کی کہانی "ہم نے چور پکڑا" اس سے پہلے کھلونا کے ۱۹۷۱ء کے کسی شمارہ میں شائع ہو چکی ہے کسی اور نام سے ۔

آزاد بارانوی کی نظم "نہرو جی کی یاد" نومبر ۱۹۷۱ء کے شمارہ میں بھی شائع ہو چکی ہے ملاحظہ ہو صفحہ (پیام تعلیم نومبر ۱۹۷۱ء) اور اب یہ ستمبر ۱۹۷۲ء کے شمارہ میں بھی شائع ہوئی ہے ۔ پتہ نہیں یہ کیسے ہوا ۔ ؟

ایک ناچیز رائے یہ ہے کہ کہانی نمبر میں تمام مضمون و کہانی نگاروں کے پتے ضرور شائع کیجیے ۔ بہت پہلے ۔ تجویز محترم اقبال مہدی صاحب نے پیش فرمائی تھی ۔ اور میں نے صاد کیا تھا ۔ لیکن پتہ نہیں کیوں اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا ۔ کہانی نمبر سے ابتداء کر دیجیے ۔

فقط آپ کا خادم
خلیق انجم اشرفی

آپ کی علالت کے بارے میں پڑھ کر افسوس ہوا ۔ امید ہے کہ اب مزاج بخیر ہوں گے خدا آپ کو مکمل طور سے صحت مند کرے آپ کی صحت و سلامتی کے لیے ہر وہ شخص دعا کرے گا جسے یہ احساس ہے کہ آپ اردو میں بچوں کے ادب کی جو خدمت کر رہے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے علالت کے باوجود کہانی نمبر کو ہر طرح مکمل بنانے کی دُھن اور فکر آپ کے خلوص نیت اور اس جذبہ کی غماز ہے جو آپ کو ہر لمحہ بچوں کے لیے بہتر سے بہتر ادب پیش کرنے پر اکساتا رہتا ہے ۔

آفاق احمد بھوپال

ابن بطوطہ کا سفر نامہ مسلسل مضمون بڑا دلچسپ ہے ۔ مجھے مسلسل مضمون ابتداء سے پڑھنے کو نہ مل سکا ۔ ۱۹۷۰ء سے "پیام تعلیم" کی خریداری شروع ہوئی ۔ ہندوستان کے سفر کے حالات کتابی صورت میں (بچوں کے لیے ہی سہی) چھپوانے کا انتظام جلد ہو جائے تو ہم بھی اس سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں ۔

جناب محمد امین ۔ ایم ۔ اے ۔ کے مضمون "اڈوالا (زمبیا) سے نئی دہلی کی پہلی قسط جغرافیائی حالات پر مشتمل خوب معلوماتی ہونے کی وجہ سے دلچسپی سے خالی نہیں ہے ۔ "پیام تعلیم" کے لیے قابل مضمون

ادھر اُدھر سے

ٹیلیفون پر لکھا پڑھی

اب تک تو ٹیلی فون پر ہم آپ بات چیت ہی کرتے تھے پر اب ایک نئی بات ہوگئی ہے۔ دستی پیغام بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجے جا سکیں گے۔ ایک چھوٹا سا آلہ جس کا نام لوکیشن انڈی کیٹر ہے ٹیلی فون کے ساتھ لگا دیا جاتا ہے۔ اور ٹیلی فون کرنے والا قلم یا پنسل اس آلے کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ لکھنے والا جو کچھ لکھتا ہے۔ اس کے قلم یا پنسل کی یہ حرکات بجلی کی لہروں میں منتقل ہوکر ٹیلی فون کی لائن کے ذریعے دوسرے مقامات پر نشر کی جا سکتی ہیں۔ ٹیلیفون سے آنے والی بجلی کی لہریں ایک خود ڈویلپ ہونے والے فلم فوٹو اسٹیٹ فلم کے ذریعہ موصول کی جاتی ہیں۔ اور انھیں ایک اسکرین کے ذریعے پروجیکٹ کیا جاتا ہے جیسے ہی لکھنے والا لکھتا ہے۔ یہ خاکے بلا تاخیر دوسری طرف دکھائی دینے لگتے ہیں۔

نئے یادگاری ٹکٹ

ڈاک اور تار کے محکمے نے اس سال دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کے یادگاری ٹکٹ جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے پچھلے اکتوبر میں اس طرح کے چار ٹکٹ جاری کئے گئے (۱) دوان شاعر تیسری جنم صدی) (۲) قومی رہنما ٹی پرکاشم۔ (جنم صدی) (۳) مشہور فلاسفر برٹرانڈ رسل (جنم صدی) (۴) شاعر بھائی ویر سنگھ (جنم صدی)

دنیا چار کروڑ سال کے بعد

کیلی فورنیا کے ایک سائنس داں نے دعویٰ کیا ہے کہ چار کروڑ سال بعد زمین، زہرہ سیارے کی طرح گرم ہو جائے گی۔ اور اس کا درجہ حرارت ۸۰۰ سے ۹۰۰ فارن ہائٹ تک پہنچ جائے گا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمین کی انسانی آبادی مریخ پر منتقل ہو جائے۔ یہ سیارہ اس وقت تک رہنے کے قابل ہو چکا ہوگا۔

مٹھو میاں کس کے؟

جنیوا کی عدالت نے حکم دیا ہے کہ مٹھو میاں (توتے) کو عدالت میں حاضر کیا جائے۔ تاکہ مجسٹریٹ فیصلہ کر سکے کہ توتے کا اصل مالک کون ہے۔ ایک شخص نے دعویٰ کیا تھا کہ میرا توتا چار مہینے پہلے چھین لیا گیا تھا۔ اور یہ وہی توتا ہے اس نے اپنے دعوی کی ثبوت میں یہ بات پیش کی کہ میں نے اسے جرمن زبان کی ایک لوری سکھائی ہے۔ اور وہ اسے گاتا بھی ہے چنانچہ بہت بہلانے پھسلانے پر مٹھو میاں نے یہ لوری سنائی بھی مگر مجسٹریٹ نے یہ ثبوت ناکافی سمجھا اور مقدمہ اگلے مہینے کے لیے ملتوی ہوگیا۔

ایران میں کھدائی پر تین ہزار سال پرانی چیزیں ملیں۔

ایران کے پچھمی علاقے میں ایک جگہ کھدائی کرنے پر۔ تین ہزار سال پرانی تہذیب کے نمونے ملے ہیں۔ مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے۔ ٹوٹی ہوئی دیواروں کے ٹکڑے اور چار انسانی ڈھانچے بیٹھی ہوئی حالت میں ملے ہیں۔ خیال ہے کہ انھیں اسی حالت میں دفن کیا گیا ہوگا۔ ماہروں کا اندازہ ہے کہ یہ ڈھانچے کم سے کم تین ہزار سال پرانے ہیں۔

ایٹم کی تصویر کھینچ لی گئی

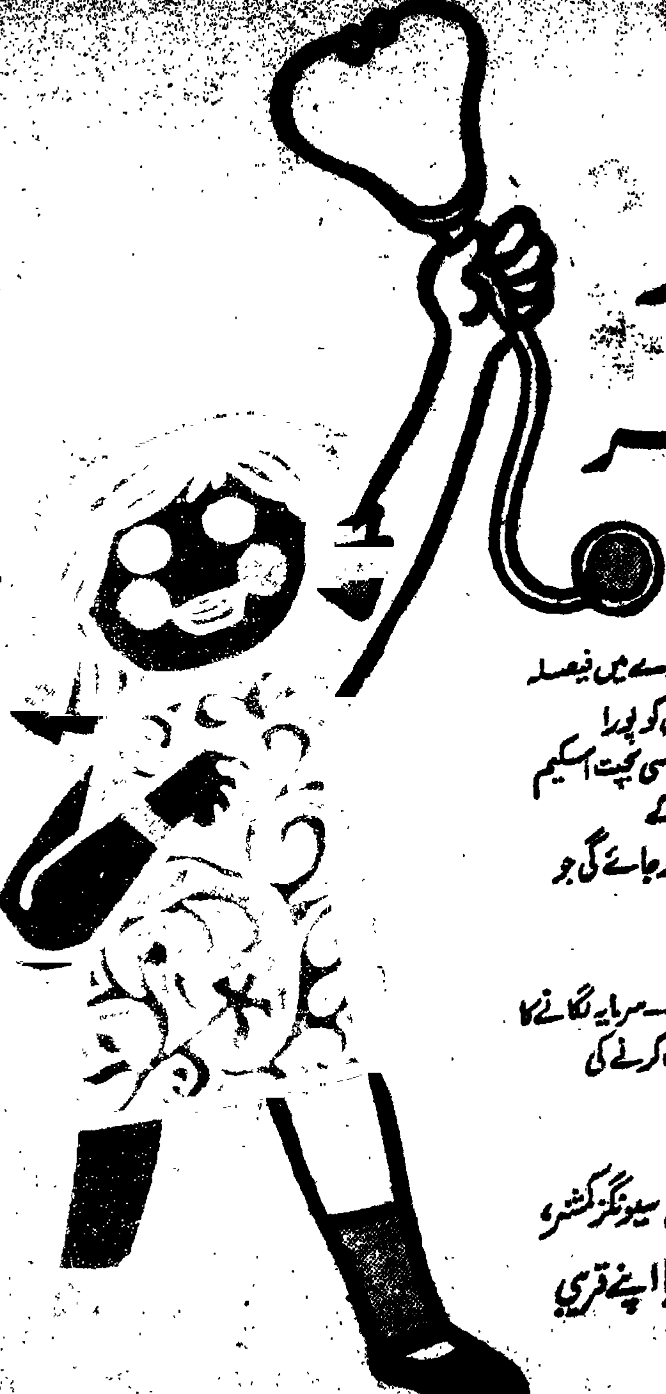
یہ وہی ذرہ ہے جس کے بارے میں عالموں کا خیال تھا کہ اس کے ٹکڑے نہیں کیے جا سکتے۔ پر اب سائنس داں اسے توڑ سکتے ہیں۔ البتہ اس کی تصویر لینا ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ایک جاپانی سائنس داں نے اس ناممکن کو بھی ممکن بنا دیا ہے۔ اس جاپانی.. سائنس داں نے بتایا ہے کہ اس نے ایک بہت ہی طاقت ور خوردبین کی مدد سے ایٹم کی تصویر لی ہے۔

سوویت روس کے کتب خانے

سوویت روس کے عام، بچوں کے، تکنیکی اور.. دوسری نوعیت کے کتب خانوں کی تعداد تین لاکھ ساٹھ ہزار ہے۔ ان کتب خانوں میں کتابوں کی مجموعی تعداد تین ارب تین کروڑ ہے۔ عام کتب خانوں کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار ہے۔ ان میں ایک ارب اکتیس کروڑ.. کتابیں اور رسالے ہیں۔ پڑھنے والے تمام کتابیں اپنی ضرورت کے مطابق آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں۔ بہت سے لوگ بذاتِ خود یا پھر ڈاک یا ٹیلی فون کے ذریعے بھی حاصل کرتے ہیں۔ کئی کتب خانے تعلیمی، ادبی، کھیتی باڑی، تکنیکی، بدیشی زبانوں وغیرہ کے حلقے چلاتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً کتابوں کی نمائشیں کی جاتی ہیں۔ مطالعے کے شوقین کانفرنسیں، لکچر اور سمپوزیم منعقد کرتے ہیں۔ گشتی کتب خانے بھی ہیں۔ اور مفت خدمت انجام دیتے ہیں۔

تیسری ایشیائی کانفرنس میں بچوں کی چیزیں۔

اس نمائش کا ذکر اس سے پہلے انھی صفحوں میں آچکا ہے۔ کہتے ہیں ہندوستان میں اب تک جتنی نمائشیں ہو چکی ہیں یہ ان سے زیادہ بڑی زیادہ عظیم الشان، زیادہ شاندار ہے۔ سب سے زیادہ شاندار چیز اس کا انٹرنیشنل ہال ہے۔ اپنے ملک کی ریاستوں کے علاوہ لگ بھگ ۴۷ دوسرے ملکوں کے پویلین ہیں۔ بچوں کے لیے سب سے دلچسپ چیز بچوں کا پارک ہے۔ اس میں جاپان کی بجلی سے چلنے والی ریل ہے۔ مختلف جانوروں کی شکلوں کی کاریں ہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔ تین نومبر کو محترمہ اندرا گاندھی نے اس کا افتتاح کیا۔ اگر ممکن ہوا تو کسی اگلے پرچے میں اس نمائش پر زیادہ تفصیلی مضمون ہم آپ کی خدمت میں پیش کرسکیں گے۔



...ے میسور، مدھیہ پردیش، جموں کشمیر اور ہریانہ
کے تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ پیام تعلیم نئی دہلی

شمارہ ۱ جنوری ۱۹۷۲ء جلد ۹

ایڈیٹر محمد حسین حسان ندوی

صدر دفتر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
شاخ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی ۶
شاخ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳
شاخ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے سالانہ چندہ چھ روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ کے لیے ... پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

فہرست

بچوں کی کتابیں

مذہب

کتاب	مصنف	قیمت
ارکانِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۵۰/-
آں حضرت (اردو، ہندی)	الیاس احمد مجیبی	۶۵/-
پاک کہانیاں (دو حصّوں میں)	مقبول احمد سیوہاروی	۲/۳۵
چار یار	الیاس احمد مجیبی	۱/۳۰
خلفاء اربعہ	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۲/۲۵
رسولِ پاکؐ	عبدالواحد سندھی	۱/۸۰
عقائدِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۵۰
مسلمان بیبیاں	مولانا مجاہد علی قدوسی	-/۷۵
نبیوں کے قصّے	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۱/۲۵
ارے رسولؐ	" " "	۱/۶۵
زرے نبی	سیّد نواب علی رضوی اُردو ۷۵/- ہندی	-/۴۰

معلومات

کتاب	مصنف	قیمت
.می کی کہانی	مشتاق احمد	۱/۲۵
.کھا عجائب خانہ (چار حصّے)	محمد حسین حسّان	۱/۸۰
.ا کی کہانی	علی احمد خاں	-/۵۰
.ادا کی کہانی	محمد عبدالغفور	-/۷۸
.ہند کی کہانیاں اوّل	خجستہ سلطان	-/۸۰
" " دوم	ضیاءالرحمٰن	۱/-
" " سوم	مشتاق احمد اعظمی	۱/۸۰
" " چہارم	" " "	-/۹۵
.ں کی کہانی	محمد امین	۱/۷۵
.ی کے طریقے	رقیہ منظورالامین	-/۸۵
کے بچے	محمد حسین حسّان	-/۸۰
کے بسنے والے	بشیر حسین زیدی	-/۷۵
دہلی	ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی	۱/۸۰
رابندر ناتھ ٹیگور	فدا حسین	۱/۲۵
سماجی زندگی اوّل	احمد ٹپیل و غلام ابرار	-/۶۵
" " دوم	" "	-/۸۰
" " سوم	" "	-/۸۱
" " چہارم	" "	-/۸۱
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	۱/۳۰
سمندر کے نیچے	"	۲/-
قدرت کے کرشمے	ادارہ	۱/۶۲
میرا جیس	محمد حسین حسّان	۱/۲۵
ہماری پارلیمنٹ	کیلاش چندر	۱/۵۰
گنگا کی کہانی	رفیع احمد	-/۶۰
باغ کے مالی	محمد قاسم صدیقی	-/۷۵

کہانیاں، ڈرامے اور ناول

کتاب	مصنف	قیمت
اس نے کیا کرنہ جانا (کہانیاں)	آصفہ مجیب	-/۳۷
پریم کی جیت (ڈراما)	اسداللہ کاظمی	-/۳۷
تابیل خاں (کہانی)	محمد حسین حسّان	-/۳۰
ترکوں کی کہانیاں (کہانیاں)	مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	-/۵۵
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول)	م ندیم	۱/۵۵
تین اناڑی (ناول)	عصمت چغتائی	۱/۴۰
چقماق کی ڈبیہ (کہانی)	برکت علی فراقؔ	-/۴۰
چھاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی)	محمد معین	-/۴۵
ستاروں کی سیر (ناول)	کرشن چندر	۱/۷۵
کوے دادا (سچا ناول)	مجیب احمد خاں	۱/۷۵
لال مرغی (کہانی)	عبدالواحد سندھی	-/۵۰

بچّوں سے باتیں

سب سے پہلے تو آپ نئے سال کی مبارک باد قبول کیجیے۔ آپ کا پیامِ تعلیم بھی خیر سے نویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ خدا سے دُعا ہے کہ آپ کو اور آپ کے پیامِ تعلیم کو ایسے بے شمار "نئے سال" دیکھنے نصیب ہوں۔ آمین

جنوری کی اہمیت ہمارے دیس میں ایک اور وجہ سے بھی ہے۔ اب سے بہت دنوں پہلے کی بات ہے، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سالانہ جلسے میں ہم نے دیس کو مکمل طور پر آزاد کرنے کا عہد کیا تھا۔ جس دن یہ عہد کیا تھا جنوری کی ۲۶ر تاریخ تھی۔ خدا نے ہماری مُراد پوری کر دی۔ ہمیں کامل آزادی نصیب ہوئی اور اب ہم یہ یادگار تاریخ بہت اہتمام سے مناتے ہیں، بہت شان سے مناتے ہیں۔ ہندوستان کے تمام بڑے چھوٹے شہروں میں پریڈیں ہوتی ہیں، جلسے ہوتے ہیں۔ رنگارنگ تقریبیں ہوتی ہیں۔ اور کبھی آپ جائیں دلّی تو راجدھانی ہے۔ یہاں کی فوجی پریڈ تو شاندار ہوتی ہے۔ فوج کا بہت بڑا جلوس نکلتا ہے زمینی فوج، سمندری فوج، ہوائی فوج کے جوان شریک ہوتے ہیں۔ ان فوجوں کے ساتھ ساتھ لڑائی کا سامان بھی ہوتا ہے۔ دلّی کے اسکولوں کالجوں کی لڑکیاں اور لڑکے بھی ان جلوسوں میں حصّہ لیتے ہیں۔ مختلف صوبوں کی جھانکیاں نکلتی ہیں، پھر ملک کے مختلف صوبوں کے عوامی ناچ یا فوک ڈانس کی نمایش ہوتی ہے۔ ایک ہفتے تک دلّی میں بڑی چہل پہل رہتی ہے۔

آپ کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ آپ کا ڈراما نمبر تیاری کی منزلوں میں ہے۔ خدا نے کیا تو فروری کی شروع کی تاریخوں میں یہ آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔ ہم نے پچھلے پرچے میں آپ سے کہا تھا نا کہ ہم اسے آپ کے لیے زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور مفید بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سو خدا کا شکر ہے ہمیں بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے۔

ہم ایک کوشش اور کر رہے ہیں۔ ہندوستان کی مشہور زبانوں میں اور دوسرے ملکوں کی زبانوں میں بچّوں کے لیے لکھے ہوئے ڈراموں کے ترجمے شایع کیے جائیں۔ اس سلسلے میں ہمارے کچھ مخلص دوست اور پیامِ تعلیم کے ہمدرد ہماری بہت مدد کر رہے ہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ دوسری زبانوں اور دوسرے ملکوں کے ڈرامے آپ دلچسپی سے پڑھیں اور اس طرح مختلف ملکوں کے رہن سہن سے تہذیب اور کلچر سے بھی واقف ہو جائیں۔

پچھلے پرچے میں ہم نے محترم غلام ربّانی صاحب سے ملاقات کا ذکر کیا تھا۔ یہ بھی بتایا تھا کہ دہلی نمبر نکالنے کی تجویز کو انھوں نے بہت پسند کیا تھا اور خود ایک مضمون بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ مضمون انھوں نے

[illegible]

بہت معلوماتی مضمون ہے۔ دلّی نمبر کی تیاری کے لیے بہت نیک شگون ہے۔ خیال ہے کہ ڈرامہ نمبر کے بعد ہی نمبر نکالا جائے گا۔ تیاری شروع کر دی گئی ہے

پیام تعلیم کے خاص نمبروں کے سلسلے میں ہمارے پاس بہت سی تجویزیں آئی ہیں۔ ایک تجویز یہ ہے کہ کہانی نمبر نکالا جائے۔ ہمارے خیال میں بہت مناسب تجویز آئی ہے آپ کو بھی پسند آئے گی۔

اور آخر میں ہم پیام تعلیم کے خریدار بڑھانے کی پھر درخواست کرتے ہیں۔ اور اس درخواست میں ہمارے منیجر صاحب بھی شریک ہیں۔ پچھلے مہینے انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ چھ خریدار بنانے والوں کو چھ مہینے تک پیام تعلیم مفت یا تین روپے نقد۔ محترم منیجر صاحب اپنے وعدے پر قائم ہیں۔ آپ نے ہماری پچھلی درخواست پر توجہ کی ہے مگر کام ذرا اور تیزی سے کرنے کی ضرورت ہے۔ ان تمام محسنوں کے نام بھی پیام تعلیم میں شایع کیے جائیں گے۔

افسوس ہے کہ اس مہینے (۱۲ دسمبر ۱۹۷۰ء) ہمارے ایک اور بزرگ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ غلام محمد صادق صاحب کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم ایک عرصے سے بیمار تھے۔ بیماری دل کی تھی۔ چنڈی گڑھ میں علاج ہو رہا تھا۔

صادق صاحب کا شمار کشمیر کے چند رہنماؤں میں سے تھا۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ آزادی کی لڑائی میں گذرا۔ کشمیر کے لوگوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کرنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ جامعہ سے مرحوم کا بہت گہرا [illegible] تھا۔ مکتبہ جامعہ کی انھوں نے ہمیشہ سرپرستی فرمائی۔ مکتبے نے حکومت کشمیر کی مدد سے بہت کتابیں شائع کی ہیں اس امداد میں مرحوم کی نوازش کو بہت دخل تھا۔ خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کے عزیزوں کو صبر کی توفیق دے۔

ایک اور اندوہناک خبر سنیے ۱۹ دسمبر کو سہ پہر کے وقت ہندوستان کے مشہور ماہر تعلیم جناب غلام السیدین صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرحوم کو دمے کی اور دل کی تکلیف تھی۔ دورے پڑتے رہتے تھے۔ علاج ہوتا تھا ٹھیک ہو جاتے تھے پر یہ دورہ جان لے کر ہی ٹلا۔ مرحوم مولانا حالی کے صاحبزادے کے نواسے تھے۔ پانی پت وطن تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ سے بی۔ اے کیا۔ لندن سے تعلیمی ڈگری لی واپسی پر ٹریننگ کالج علی گڑھ کے پرنسپل ہوئے پھر کشمیر، بمبئی وغیرہ میں تعلیمات کے ڈائرکٹر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں مولانا آزاد کے زمانے میں دلّی میں محکمۂ تعلیم کے سکریٹری تھے۔ اس عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی تعلیمی کاموں میں لگے رہے۔ ہندوستان کے سرکاری، غیر سرکاری اداروں سے تعلق رہا۔

۱۸ دسمبر کو اُن کی تقریر ریڈیو پر سنی کتنی معقول، کتنی مدلل ہوئی، کتنی پیاری تقریر تھی۔ گویا قوم کے نام مرحوم کا یہ آخری پیغام تھا۔ شائستگی، شرافت، خوش اخلاقی مرحوم کی خاندانی وراثت تھی اور مرحوم اس کا مثالی نمونہ تھے۔ افسوس کیسے کیسے ہیرے ہم میں سے اُٹھتے جا رہے ہیں۔ خدا محترمہ صالحہ عابد حسین صاحبہ، محترم عابد صاحب اور دوسرے قریبی عزیزوں کو صبر کی توفیق دے۔ آمین

انتظار کیجیے

آپ کا ڈراما نمبر

شروع فروری میں شائع ہوگا